

MAAR103CCT

تاریخ ادب عربی-1

(History of Arabic Literature-1)

ایم۔ اے، عربی

(سمسٹر-1)

پرچہ سوم

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

حیدرآباد، تلنگانہ، انڈیا-500032

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course: History of Arabic Literature-1

ISBN: 978-93-80322-56-8

First Edition: June 2020

Reprint: December, 2022

ناشر : رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
اشاعت : دسمبر، 2022
تعداد : 1000
سرورق : ڈاکٹر محمد اکمل خان، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
مطبع : اریہنت آفسیٹ، نئی دہلی

History of Arabic Literature-1

for

M.A. Arabic 1st Semester

Edited by:

Prof. Syed Alim Ashraf

Head, Department of Arabic, MANUU

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), Bharat

Director: dir.dde@manuu.edu.in **Publication:** ddepublishment@manuu.edu.in

Phone: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing from the publisher (registrar@manuu.edu.in)

کورس کوارڈی نیٹر

پروفیسر سید علیم اشرف

شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین:

اکائی نمبر

1,2	ڈاکٹر عبید الرحمن (جواہر لال نہرو یونیورسٹی)
3,9,10,11	ڈاکٹر ثناء فیصل (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)
4 (مشترکہ)	ڈاکٹر مفتی محمد شرف عالم (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)
4 (مشترکہ)	ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی (جامعہ ملیہ اسلامیہ)
5,6	ڈاکٹر وارث مظہری (جامعہ ہمدرد)
6,8 (مشترکہ)	ڈاکٹر غطریف ندوی
7	ڈاکٹر محمد مشتاق (جامعہ ملیہ اسلامیہ)
12	ڈاکٹر سعید محاشن (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)
13,14,16	ڈاکٹر جمشید احمد (یونیورسٹی آف ممبئی)
15	پروفیسر کیفیل احمد قاسمی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

مدیران

ڈاکٹر جمشید احمد	(یونیورسٹی آف ممبئی)
ڈاکٹر ثناء کوثر	(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)
ڈاکٹر محمد عبدالعلیم	(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)
ڈاکٹر سید محمد عمر فاروق	(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)
ڈاکٹر محمد رحمت حسین	(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)

فہرست

6	وائس چانسلر	پیغام
7	ڈائریکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم	ڈائریکٹر کا پیغام
8	کوآرڈینیٹر	کتاب کا تعارف
9	عصر جاہلی	بلاک I
8	جزیرہ نمائے عرب کا جغرافیہ: سامی اقوام اور زبانیں	اکائی 1
26	عربی زبان کا ارتقا: دور جاہلی میں عربوں کے سیاسی و سماجی حالات	اکائی 2
51	عہد جاہلی میں عربی ادب: نثر و شعر، اقسام و خصوصیات	اکائی 3
79	اصحاب معلقات، اصحاب مجھرات اور صالحیک شعرا	اکائی 4
116	عصر اسلامی	بلاک II
116	عصر اسلامی کا تعارف اور اس کی خصوصیات	اکائی 5
125	قرآن وحدیث کی تدوین اور ان کا ادبی مقام	اکائی 6
147	مختصر شعرا اور ان کی شعری خصوصیات	اکائی 7
169	عصر اسلامی میں خطابت	اکائی 8
184	عصر اموی	بلاک III
184	9- عصر اموی کے سیاسی و دینی حالات	اکائی 9
203	10- عصر اموی میں عربی خطابت کا ارتقا، اس کی اہم خصوصیات اور اہم شخصیات	اکائی 10
224	11- خطوط نویسی اور وصیتیں	اکائی 11
244	12- عصر اموی کی شاعری اور اس عہد کے مشہور شعرا	اکائی 12

278

عصر عباسی IV بلاک

278

اکائی 13۔ عباسی خلافت و حکومت پر ایک طائرانہ نظر

318

اکائی 14۔ عہد عباسی میں علوم فنون کا ارتقا

365

اکائی 15۔ عصر عباسی میں فنی نشر کا ارتقا

399

اکائی 16۔ عصر عباسی میں شاعری

428

ماڈل پیپر برائے امتحان

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی 1998 میں وطن عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔ اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1) اردو زبان کی ترویج و ترقی (2) اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3) روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اردو زبان سمٹ کر چند ”ادبی“ اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اردو قاری اور اردو سماج دور حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نا بلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر ان شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اسکولی سطح پر اردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہذا ان تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25 ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم از سر نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ دو برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ رو بہ عمل کیا ہے۔ میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلباء کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقہ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقہ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے اور اس طریقہ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اس طریقہ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈویژن سے ہوا اور اس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظام تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظام تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کما حقہ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلباء کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چونکہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرز تعلیم کی جامعہ ہے، لہذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظام تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کر کے خود اکتسابی مواد SLM از سر نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلباء کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جارہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی پی جی بی ایڈ ڈپلوما اور سر ٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز بنگلور، بھوپال، درہنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سر دست 144 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلباء کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامتِ فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کالنگ بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر محمد رضاء اللہ خان

ڈائریکٹر، نظامتِ فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

عربی زبان دنیا کی بڑی اور اہم زبانوں میں سے ایک ہے۔ سامی زبانیں جزیرہ عرب، عراق، شام اور حبشہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان زبانوں میں سے اب صرف عربی، عبرانی اور امہری زبانیں باقی رہ گئیں ہیں۔ عربی اقوام متحدہ میں دفتری کاموں کے لیے منظور شدہ چھ زبانوں میں سے ایک ہے۔ تمام عرب ملکوں کی سرکاری زبان ہے اور کئی دوسرے ملکوں میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ عہد وسطیٰ میں عربی زبان علوم و فنون اور فلسفہ اور سائنس کی زبان تھی اور اس نے دنیا کی بہت ساری زبانوں کو متاثر کیا جن میں سرفہرست اردو، فارسی اور ترکی زبانیں شامل ہیں۔ اس روشن تاریخ کے ساتھ ساتھ یہ زبان آج کے تناظر میں بھی ایک اہم زبان ہے اور اس میں مہارت طلبہ کے لیے امکانات کے نئے دروازے کھولتی ہے۔ زیر نظر کتاب فاصلاتی نظام تعلیم کے ایم اے عربی کے پہلے سمسٹر کے طلبہ کے لیے تیار کی گئی ہے جو نصابی یکسانیت کے سبب روایتی طرز تعلیم کے طلبہ کے لیے بھی مفید و معاون ہے۔ نصاب کی یکسانیت بیورو برائے فاصلاتی تعلیم (DEB) کی ہدایات مجریہ 2017-18 کے مطابق ہے جس کے بموجب روایتی اور فاصلاتی تعلیم کا نصاب یکساں ہونا چاہیے۔

یہ کتاب عربی ادب کی تاریخ پر مشتمل ہے جس میں عہد بہ عہد عربی زبان کا تعارف کرایا گیا ہے اور مختلف عہد میں عربی زبان کے احوال و رجال اور امتیازات و خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب چار بلاک اور سولہ اکائیوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بلاک میں جزیرہ نما عرب کے جغرافیائی احوال و ظروف کا بیان کیا گیا ہے، عرب اقوام اور ان کی مختلف بولیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز اسی بلاک میں اصحاب معالقات و مہجرات کی شاعری اور اس کی اہمیت و خاصیت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ معالقات و مہجرات کی اہمیت کے پیش نظر ابتداء انہیں دو علاحدہ اکائیوں میں لکھا گیا تھا لیکن بعض تکنیکی ضرورت کے پیش نظر باہم ضم کر دیا گیا ہے۔ دوسرے بلاک کا موضوع عصر اسلامی ہے، اس میں صدر اسلام میں عربی زبان اور اس کے امتیازات کو مختصر اور جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے جس میں سرفہرست قرآن و حدیث کے ادبی مقام اور ان کے فنی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس موضوع کو بھی دو الگ الگ اکائیوں میں تحریر کیا گیا تھا لیکن ضرورتاً انہیں ضم کر دیا گیا ہے۔ تیسرا بلاک عصر اموی میں عربی ادب کے ارتقا اور اس کی خصوصیات پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی دو اکائیوں کو باہم ضم کر دیا گیا ہے۔ چوتھا اور آخری بلاک عہد عباسی میں عربی ادب کی تاریخ سے عبارت ہے۔ اس عہد میں نئے نئے شعری و نثری موضوعات و اسالیب کے ظہور و ارتقا پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ فن ترجمہ سے متعلق اس بلاک میں ایک مستقل اکائی تھی جسے ضرورتاً حذف کر دیا گیا ہے اور اس کے ضروری مضامین کو اسی سمسٹر کی کتاب ترجمہ نگاری میں شامل کر دیا گیا ہے۔

یہ کتاب خود اکتسابی مواد (SLM) کے اصول و ضوابط کے مطابق تیار کی گئی ہے، لہذا اس کتاب میں اس بات کی پوری رعایت کی گئی ہے کہ اس میں ان امور کی پوری رعایت کی جائے جن کی روشنی میں خود اکتسابی مواد پر مشتمل درسی کتاب کو تیار کیا جاتا ہے تاکہ طلبہ کو ان اسباق کو پڑھنے اور سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

پروفیسر سید علیم اشرف جانیسی
کورس کوآرڈینیٹر

اکائی 1 جزیرہ نمائے عرب کا جغرافیہ: سامی اقوام اور سامی زبانیں

اکائی کے اجزا	
1.1 مقصد	
1.2 تمہید	
1.3 جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیائی احوال	
1.3.1 حدود اربعہ	
1.3.2 جزیرہ کے مختلف علاقے	
1.4 جزیرہ نمائے عرب کے طبعی احوال	
1.4.1 پہاڑ اور میدان	
1.4.2 صحرا اور نخلستان	
1.4.3 نباتات و حیوانات	
1.4.4 باشندگان	
1.5 سامی اقوام	
1.5.1 سامی اقوام کی اصل	
1.5.2 سامی اقوام جزیرہ عرب میں	
1.6 سامی زبانیں	
1.6.1 زبان کی تعریف	
1.6.2 زبان کا آغاز	
1.6.3 زبانوں کے خاندان	
1.6.4 شلیگل کی تقسیم کا نظریہ	
1.6.5 میکس مولر کی تقسیم کا نظریہ	
1.7 اکتسابی نتائج	
1.8 نمونے کے امتحانی سوالات	
1.9 مطالعے کے لیے معاون کتابیں	

- ۱- طلبہ اس سبق سے جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیہ سے واقف ہوں گے اور یہ جان سکیں گے کہ اسلام سے قبل اس کے حدود اربعہ کیا تھے اور اس وقت اس کے نواح میں آباد ممالک کون کون سے تھے۔
- ۲- جزیرہ نمائے عرب کے اندر پائے جانے والے اہم مقامات، پہاڑوں، وادیوں، نخلستانوں اور دیگر قابل ذکر مقامات و احوال کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کریں گے۔
- ۳- جزیرہ نمائے عرب میں پائے جانے والے حیوانات و نباتات سے واقفیت حاصل کریں گے اور اسلام سے قبل عرب دنیا کے ذریعہ معاش اور ان کے کھانے پینے کی چیزوں سے واقف ہوں گے۔
- ۴- طلبہ سامی اقوام کی اصل، ان کے مسکن، جزیرہ عرب میں ان کی سکونت اور جزیرہ عرب اور اس کے باہر سامی اقوام کی ہجرت کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے۔
- ۵- زبان کی تعریف اور زبانوں کے خاندان سے واقف ہوں گے۔
- ۶- زبانوں کی گروہ بندی اور اس سلسلے میں مختلف ماہرین لسانیات کی آرا سے واقف ہوں گے۔

علم جغرافیہ کسی مقام کے حدود کو متعین طور پر بتاتی ہے کہ کوئی بستی، کوئی شہر، کوئی ملک دنیا کے کس خطہ/علاقہ میں واقع ہے، اس کے ارد گرد دائیں بائیں، آگے پیچھے یا شمال و جنوب، مغرب و مشرق میں کون کون سے ممالک، سمندر، دریا اور پہاڑ واقع ہیں۔ جس سے اس علاقہ میں آباد لوگوں کے حالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ وہ گرم علاقہ ہے یا سرد، سرسبز و شاداب علاقہ ہے یا خشک، صحرا ہے یا ریگستان۔ اس سے ان کے کھانے پینے، رہن سہن، عادات و اطوار کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کی بولی اور زبان کو جاننے سمجھنے اور اس میں محفوظ انسانی تجربات، علمی ذخائر اور ان کے افکار و نظریات کو جاننے اور ان سے استفادہ کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اس لیے کسی بھی ملک یا علاقے کے جغرافیہ اور جغرافیائی حالات کو جاننا انتہائی ضروری ہے، اس کے بغیر ہم وہاں کے رہنے والے باشندوں کی نہ تو زبان سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے احوال و کوائف سے صحیح طور سے واقف ہو سکتے ہیں بلکہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ ہم ان کو سمجھنے میں غلطی کر بیٹھیں۔

جزیرہ نمائے عرب میں آباد اقوام کا تعلق سامی نسل سے مانا جاتا ہے اس لیے یہ جاننا گزیر ہو جاتا ہے کہ سامی اقوام کا اطلاق کن قوموں پر ہوتا ہے۔ جزیرہ نمائے عرب میں آباد سامی اقوام کا اصل وطن یہی جزیرہ تھا یا پھر کسی اور جگہ سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئیں اور پھر سرزمین عرب سے باہر کب کب ہجرت کی۔ وہ کون سی زبانیں بولتے تھے، سامی زبانوں میں کون کون سی زبانیں آتی ہیں۔ زبان کی تعریف کیا ہے اور ماہرین لسانیات نے مختلف زبانوں کے خاندان اور ان کی گروہ بندی کیسے کی ہے۔ یہ ساری معلومات ہمیں عربی زبان کی اصل تک پہنچنے، دوسری زبانوں سے اس کے تعلق، ایک دوسرے سے لسانی لین دین کو جاننے میں مدد دیں گی اور عربی کی قدامت، بقا، نشوونما اور پھیلاؤ کو سمجھنے میں انتہائی مدد و معاون ثابت ہوں گی۔ آنے والے صفحات میں جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیہ، وہاں کے طبعی حالات، سامی اقوام اور سامی

زبانوں سے بحث کی جائے گی۔

1.3 جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیائی احوال

1.3.1 حدود اربعہ

جزیرہ نمائے عرب دنیا کے نقشے پر ایک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں ایشیا اور افریقہ کی سرحدیں ملتی ہیں اور یورپ خشکی اور تری دونوں راستوں سے قریب ہے۔ عرب کو جزیرہ نما اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے تین طرف سے پانی اور ایک طرف خشکی ہے۔ مغرب میں بحیرہ قلزم اور بحیرہ روم ہے، مشرق میں بحر ہند، خلیج فارس اور بحر عمان، جنوب میں بحر ہند، شمال کے حدود بہت مختلف ہیں بعض جغرافیہ داں شام تک اس کے حدود کو وسعت دیتے ہیں۔

قدیم زمانے یا دور جاہلی میں جزیرہ نمائے عرب مختلف خطوں / علاقوں پر مشتمل تھا اور ان کے نام کچھ اس طرح تھے: حجاز (مکہ، مدینہ (یثرب)، طائف وغیرہ)، نجد، بحرین، یمن، تہامہ، شحر، ظفار، اور حضرموت۔ دور جاہلی سے لیکر دور جدید یعنی ۱۷۹۸ء سے پہلے تک جزیرہ عرب کے یہ علاقے انہی ناموں سے جانے جاتے تھے لیکن جب دور جدید میں قومی ریاستوں کا ظہور ہوا تو نئے نئے ممالک وجود میں آئے۔ اس طرح آج جزیرہ عرب کا اطلاق سعودی عرب (حجاز)، یمن، عمان، اردن، متحدہ عرب امارات، کویت، قطر اور بحرین پر ہوتا ہے۔

جزیرہ نمائے عرب کا رقبہ تقریباً دس لاکھ مربع میل ہے۔ جو فرانس کے رقبہ سے دو گنا ہے۔ اس کی سب سے طویل سرحد وہ ہے جو بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ اس کا طول چودہ سو میل ہے۔ اس کا سب سے زیادہ عریض وہ علاقہ ہے جو یمن سے عمان تک چلا گیا ہے۔ جس کی چوڑائی بارہ سو پچاس میل ہے۔

عرب کا لفظ عربیہ، عرب اور عرب سے مشتق ہے اس کے معنی فصیح اللسان ہونا، زبان دان ہونا۔ عرب چونکہ اپنے آپ کو اور قوموں کے بالمقابل فصیح اللسان سمجھتے تھے اس لیے غیر عربوں کے لیے عجم کا لفظ استعمال کرتے تھے جس کے معنی کلام میں غیر واضح ہونا، گونگا ہونا۔ کچھ لوگوں نے اس کے معنی دشت و صحرا کے بتائے ہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب دنیا کا بہت بڑا حصہ ریگستان پر مشتمل ہے۔

1.3.2 جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقے

علمائے جغرافیہ نے جزیرہ نمائے عرب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) تہامہ (۲) حجاز (۳) نجد (۴) عروض (۵) یمن

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن اپنی کتاب ”تاریخ الاسلام“ کی جلد اول میں اس تقسیم کی تفصیل کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

تہامہ: یہ وہ نشیبی علاقہ ہے جو بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ یمن سے نجران تک چلا گیا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ”التھم“ جو اس کا مادہ اشتقاق ہے اس کے معنی ہیں گرمی کی انتہائی شدت اور ہوا کا رک جانا۔ چونکہ اس علاقہ میں گرمی کی شدت ناقابل برداشت حد تک ہوتی ہے اور ہوا کی رہتی ہے جس سے اس کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کو تہامہ کہا جاتا ہے۔ اس علاقہ کا دوسرا نام ”الغور“ بھی ہے۔ چونکہ نجد کے مقابلہ میں یہ علاقہ نشیب میں واقع ہے اس لیے اسے اس نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

حجاز: یہ علاقہ یمن کے شمال اور تہامہ کے مشرق میں واقع ہے۔ یہ متعدد وادیوں کا مجموعہ ہے جن کے درمیان سے جبال السراة گزرتا ہے۔ یہ سلسلہ کوہ شام سے شروع ہوتا ہے اور یمن میں نجران تک جاتا ہے۔ اسی میں اسلام کے دو مقدس شہر آباد ہیں۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ۔ حجاز کو حجاز اس لیے کہتے ہیں کہ یہ تہامہ اور نجد کے درمیان حد فاصل ہے۔

نجد: یمن کے جنوب اور صحرا ”سماوہ“ کے شمال میں پھیلا ہوا علاقہ ہے۔ عروض اور عراق اس کے ایک جانب واقع ہیں۔ اس کو نجد اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی سطح اونچی ہے۔

یمن: یہ نجد کے علاقہ سے بحر ہند کے جنوب اور بحر احمر کے غرب سے گزرتا ہے اور مشرقی سمت سے یہ حضرموت اور اشعر اور عمان سے ملا ہوا ہے۔ یمن اور حضرموت کے میدانوں میں کئی داخلی لڑائیاں بھی لڑی گئیں اور بیرونی حملہ آوروں سے بھی معرکہ آرائی ہوئی ہیں۔ انہیں جنگوں اور فتنہ و فساد کی وجہ سے خاندان تبع تباہ و برباد ہوا جس کے بادشاہوں نے مآرب، ہمدان اور ظفار کے محلات تعمیر کیے اور اسی زمانہ میں مآرب کے مقام پر ایک ”سد“ ڈیم بنایا۔

عروض: یہ علاقہ یمامہ، عمان اور بحرین پر مشتمل ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یمن، نجد اور عراق کے درمیان حد فاصل ہے۔ عمان اور بحرین پہلے جزیرہ عرب سے علیحدہ تھے۔ اور اس کی دو جہیں تھیں، ایک فطری اور دوسری سیاسی۔ فطری وجہ تو یہ کہ ان کے درمیان اور جزیرہ عرب کے درمیان لبق و دوق صحرا، جنگل اور خشک ریگستان حائل تھے۔ سیاسی وجہ یہ کہ عمان اور بحرین حکومت ایران جو ایک غیر عرب مملکت تھی اس کے زیر نگیں تھے۔

آب و ہوا: جزیرہ نمائے عرب کی آب و ہوا مجموعی طور پر گرم اور خشک ہے، بارش بہت کم ہوتی ہے۔ اور وہ بھی ساحلی علاقوں تک محدود رہتی ہے۔ خاص طور پر جنوب اور جنوب مغرب میں زیادہ ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہاں آبادی زیادہ ہے۔ مشرقی ساحل کے بعض علاقے خصوصاً عمان کا علاقہ زیادہ سرسبز و شاداب ہے۔ لیکن بارش کی عام کمی کی وجہ سے علاقے بھر میں کوئی بڑا دریا نہیں ہے البتہ ندی نالے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مگر زیادہ تر صرف برسات کے موسم میں بہتے ہیں۔ گرمی اور لو چلنے کے باعث دن میں خاصی گرمی ہوتی ہے لیکن رات دن کے مقابلے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ (تاریخ عالم اسلامی، پروفیسر محمد نعیم صدیق، ص: ۵۰)

1.4 جزیرہ نمائے عرب کے طبعی حالات

1.4.1 پہاڑ اور میدان

جبال السراة: یہ پہاڑ شمال سے جنوب کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ شمال میں شام و فلسطین کے پہاڑوں سے اس کا سلسلہ ملتا ہے اور جنوب میں یمن سے جا ملتا ہے۔ شمالی حصہ کو جبال الحجاز اور جنوبی حصہ کو جبال العسیر اور جبال الیمن بھی کہتے ہیں۔ جبال الیمن سے متصل جبال حضرموت ہے جس کے بعد ظفار اور شحر مہرہ کے علاقے واقع ہیں۔ اسی کے پاس جنوب مشرقی علاقہ میں جبال عمان بھی پایا جاتا ہے۔ جبال السراة کی بلندی اوسطاً پانچ سے سات ہزار فٹ بتائی جاتی ہے اور اس کی چوڑائی بعض مقامات پر کئی سو میل ہے۔

جبال حجاز: خلیج عقبہ سے یمن کے قریب تک سارے پہاڑی علاقہ کو حجاز کہتے ہیں۔ یہ تہامہ و نجد کے درمیان ایک دیوار کا کام کرتا

ہے اس لیے اس کو حجاز کہا جاتا ہے۔ حجاز جبال السراة کا شمالی جز ہے جو سات سو میل لمبا اور ۲۷۵ میل چوڑا ہے اور اس کی اوسط اونچائی ۶ ہزار فٹ ہے۔ اسی پہاڑی سلسلہ پر مدینہ اور طائف، خیبر، تہامہ وغیرہ مشہور شہر ہیں۔ حجاز کے شمالی حصہ کو جو عقبہ سے الوجہ کے درمیان واقع ہے مدین کہتے ہیں۔ اس خطہ میں قوم مدین، اصحاب ایکہ اور اس کے جنوب میں قوم ثمود اور اصحاب الحجر آباد تھے جن کا تذکرہ قرآن میں بھی ہے۔

حرہ: جبال حجاز میں بعض ایسے خطے ہیں جن کے پتھر سیاہ خنجر کی طرح ہیں اس لیے ان کو حرہ کہتے ہیں۔ سطح سمندر سے ان کی بلندی بسا اوقات ۵۰۰۰ فٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ موسم سرما میں کبھی کبھی یہاں برف باری بھی ہوتی ہے۔ اپنی ناہمواری کی وجہ سے حرہ آبادی اور جانوروں کے لائق نہیں۔ اس کا زیادہ تر علاقہ مکہ و تبوک کے درمیان واقع ہے۔ سب سے بڑا حرہ حرہ عویرض ہے۔ مدینہ منورہ بھی دو حرات کے درمیان واقع ہے۔ اس کے مغرب میں حرہ الوبرہ اور مشرق میں حرہ داقم ہے۔ ان حرات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دراصل آتش فشانہ مادوں سے بنے ہیں۔

عمیر اور یمن: عمیر جبال السراة کا حصہ ہے۔ اس کی چوٹی اوسطاً دس ہزار فٹ بلند ہے۔ یہ جنوب مغرب میں واقع ہے۔ عمیر کے جنوب میں واقع جبال السراة کے پہاڑی سلسلہ کو یمن کہتے ہیں جس کی اوسطاً بلندی سب سے زیادہ یعنی تیرہ چودہ ہزار فٹ ہے۔ یہ دونوں پہاڑ بارش کی وجہ سے سرسبز و شاداب رہتے ہیں۔ یہ پہاڑ بادلوں کو جزیرہ نما کے اندر آنے سے روک لیتے ہیں۔ عمیر کے شمال مشرق میں نجران ہے جو کسی زمانے میں عیسائیت کا مرکز تھا۔ جزیرہ عرب میں سب سے زیادہ بارش یمن میں ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ سب سے زیادہ شاداب علاقہ ہے۔ حدیدہ، مخا اور عدن اس کے ساحلی شہر ہیں جو بندرگاہ بھی ہیں۔ اس کے علاوہ صعده، مأرب، زبید، ذمار اور ظفار وغیرہ بھی اس کے قابل ذکر شہر ہیں۔ یمن کے جنوب میں حضرموت کی مشہور وادی ہے۔ قدیم زمانے سے یہاں تجارت پیشہ لوگ آباد رہے ہیں۔ حضرموت سے متصل مشرق میں ایک میدانی علاقہ ہے جس میں شحر، مہرہ اور ظفار نامی خطے پائے جاتے ہیں۔ ظفار، شحر اور مہرہ کے بنسبت زیادہ شاداب ہے۔

1.4.2 صحرا اور ریگستان:

الربع الخالی: یہ جزیرہ عرب کا سب سے بڑا ریگستان ہے جو جنوبی حصے میں ساحل کے قریب قریب تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا کل رقبہ چار لاکھ مربع میل ہے۔ یہاں پانی تقریباً نایاب ہے اور ریت کے ٹیلے پھیلے ہوئے ہیں جو اپنی جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ یہاں ریت کا طوفان ایک عام بات ہے۔ الربع الخالی کے یمن سے متصل حصہ کو صہدہ اور حضرموت کے شمال مغربی کنارہ کو احقاف کہتے ہیں اور مہرہ کے شمالی جانب کے ریگستان کو ”وبار“ کہتے ہیں۔ الربع الخالی کے شمالی مشرقی گوشہ کو ’یبرین‘ کا نام دیا گیا ہے۔

النفوذ: یہ صحرائے نجد کے شمال میں واقع ہے۔ عربی میں ریت کے سرخ ٹیلوں کو النفوذ کہتے ہیں۔ یہ صحراء الربع الخالی سے آٹھ سو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ دراصل چھوٹے چھوٹے ریگستانی قطعوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کبھی کبھی بارش بھی ہو جاتی ہے جو یہاں کے لوگوں کے لیے کافی سود مند ہے۔ دومۃ الجندل کا مشہور ریگستان النفوذ کے شمالی جانب واقع ہے۔

الدھناء: النفوذ کے جنوبی حصہ سے ایک ریگستانی پٹی الربع الخالی تک چلی گئی ہے۔ اس کی ریت سرخی مائل ہے اس لیے اس کو الدھناء کہتے ہیں۔ اس میں کچھ وادیاں اور نشیبی زمینیں ہیں جن سے احساء و نجد کے راستے گزرتے ہیں۔ ان وادیوں میں تھوڑا بہت بارش کا پانی آجاتا ہے جس سے بدو فائدہ اٹھاتے ہیں۔

بادیۃ الشام: الدھناء سے متصل شمال میں ایک بڑا صحرا ہے جو مثلث کی صورت میں ہے۔ اس کے مشرق میں عراق، مغرب میں شام ہے۔ بادیۃ الشام میں پتھریلی مٹی کے میدان ہیں جو سفیدی مائل ہے۔ اس صحرا میں چند وادیاں ہیں جیسے سرحان اور حوران جو بہت مشہور ہیں۔ بادیۃ الشام کے مشرقی، مغربی اور شمالی کناروں پر بلند پہاڑوں کے سلسلے ہیں جو ایران اور ترکی کے پہاڑی سلسلوں سے مل جاتے ہیں۔ یہاں کھجور کی کاشت بکثرت ہوتی ہے۔ کسری کی راجدھانی مدائن بھی بادیۃ الشام میں واقع تھی۔ عراق کے مشہور دریا دجلہ اور فرات بھی اسی خطے سے گزرتے ہیں۔ اور ان دونوں دریاؤں کے سنگم کو شط العرب کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ اپنی زرخیزی کی وجہ سے ہمیشہ تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ اس میں نمبوی، بابل، مدائن اور حیرہ جیسے شہر آباد ہوئے اور آشوری، سومری اور کلدانی تہذیبیں یہاں پھیلی پھولیں۔ حضرت ابراہیم کا شہر ”ار“ عراق کے جنوبی حصہ میں تھا۔ وسطی عراق کے بادیۃ کو بادیۃ الجزیرہ یا خفاف بھی کہا جاتا ہے اور شط العرب کے مشرقی حصہ کو بادیۃ العراق یا سماوہ بھی کہتے ہیں۔ بادیۃ الشام کا مغربی حصہ پہاڑی سلسلہ سے گھرا ہوا ہے جو ترکی کے جبال طوروس سے ملتا ہے اور وہ جنوب میں جبال السراة سے متصل ہے۔ بادیۃ الشام کا مغربی کنارہ شام اور فلسطین پر مشتمل ہے جو تاریخی اعتبار سے بہت مشہور ہیں۔ کنعانی و فینیقی شام میں آباد ہوئے۔

مشرقی ساحلی علاقے:

قطر کا علاقہ الربع الخالی سے متصل ہے اور عمان کے شمال مغرب میں سمندر کے اندر دور تک پھیلا ہوا ہے جو سو میل لمبا اور چالیس میل چوڑا ہے۔ پٹرول کی دریافت نے اس علاقہ کی قسمت تبدیل کر دی ورنہ یہاں بہت غربت تھی اور لوگوں کا کام یہاں سمندر سے مچھلی پکڑنا اور موتی نکالنا تھا۔ زمانہ قدیم میں قطری کپڑوں کی کافی شہرت تھی۔

قطر کے شمال سرحد سے کویت کے جنوبی سرحد تک پھیلی ہوئی ساحلی پٹی کو احساء کہا جاتا ہے۔ یہ بہت زرخیز علاقہ ہے۔ یہاں کی کھجوریں بہت مشہور ہیں۔ اس علاقہ کے خطی نیزوں کا تذکرہ بھی جاہلی ادب میں خوب ملتا ہے۔ بحرین احساء کے مشرق میں چھ جزیروں پر مشتمل ایک مشہور علاقہ ہے جو تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح کویت بھی ایک مشہور علاقہ ہے جو احساء کا شمالی سرا ہے۔ اس کی زمین صحرائی اور پانی کمیاب ہے۔ تاریخ میں یہ علاقہ جہاز رانی اور جہاز سازی میں کافی مشہور تھا۔ پٹرول نے ان تمام علاقوں کو مالا مال کر دیا ہے۔

1.4.3 نباتات و حیوانات:

عسیر، یمن اور عمان کے پہاڑوں اور نجد کے بعض خطوں کو چھوڑ کر جزیرہ عرب عام طور سے خشک اور غیر مرطوب ہے اور پانی کی سخت قلت ہے۔ یہاں سخت سردی و گرمی دونوں پڑتی ہے اور خال خال بارش ہوتی ہے جو یہاں کی آبادی کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ یہاں پہاڑی نالے وغیرہ تو ہیں جس سے پہاڑوں کا پانی وادیوں میں پھیل جاتا ہے لیکن یہاں کوئی ندی نہیں ہے۔ اس طرح کی وادیاں سرسبز و شاداب ہوتی ہیں اور صحرائی علاقے میں یہ بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ان وادیوں میں وادی الرمتہ، وادی الدواسر، وادی حضرموت، وادی سرحان، وادی نجران، وادی عقیق اور وادی القری وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

عرب میں جنگلات نہیں پائے جاتے ہیں البتہ کھجور کے درخت بہت کثرت سے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ببول، بیری، مہدی، پیلو

اور جھاؤ وغیرہ کے درخت اور خاردار جھاڑیاں پائی جاتی ہیں۔ کچھ علاقوں میں انار، انگور اور سیب وغیرہ کے بھی درخت ہوتے ہیں۔ چند علاقوں خاص طور پر یمن، عمان، یمامہ وغیرہ میں کاشت کاری بھی ہوتی ہے۔ یمن کے لوگوں نے بند باندھ کر آبپاشی کا نظام بنا لیا تھا اور یہ علاقہ بہت زیادہ شاداب ہو گیا تھا۔

جزیرہ عرب کے حیوانات میں اونٹ بہت مشہور ہے جو صحرائی زندگی کے لیے انتہائی کارآمد ہے۔ عربی گھوڑا بھی پوری دنیا میں کافی مشہور ہے۔ اس کے علاوہ بھیڑ، بکری، ہرن، نیل گائے، نخچر، گدھا، شیر، چیتا، تیندوا، بچو، لومڑی، بھیڑیا، بندر، گائے، شتر مرغ، خرگوش اور پرندوں میں کبوتر، فاختہ، عقاب، چیل، گدھ، شکرہ اور کوا وغیرہ پائے جاتے ہیں۔

1.4.4 باشندگان:

جزیرہ عرب کے باشندوں کو نسلی و تہذیبی ترقی کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جنوبی عرب کے لوگ قحطانی نسل سے ہیں اور شمالی عرب کے لوگ عدنانی نسل سے۔ دونوں کے درمیان کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ جنوبی عرب کے باشندے عام طور پر تمدن اور مہذب ہوتے ہیں جب کہ شمالی عرب پر بدویانہ زندگی کا غلبہ ہے۔ دونوں کی زبان عربی ہے لیکن ان کے درمیان کافی فرق ہے۔ جنوبی لوگ زراعت و تجارت کرتے اور باہری دنیا سے ان کے گہرے تعلقات تھے جس کے اثرات ان کی زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ شمالی عرب عام طور سے باہری دنیا سے علیحدہ رہتے تھے اور ان کا میل جول دوسروں سے کم تھا۔ پھر جزیرہ عرب کے باشندوں کو طرز رہائش اور معیشت کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ بدوی یعنی دیہاتی عرب اور حضری یعنی شہری عرب۔ بدوی عرب کو اہل الہد اور حضری عرب کو اہل المدر بھی کہا جاتا ہے۔ جزیرہ عرب کے طبعی حالات کی وجہ سے وہاں شہری زندگی بہت کم پائی جاتی ہے عام طور سے بدویانہ زندگی گزارتے ہیں اور چارہ پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں۔ عرب باشندوں کے چند خصوصیات ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں:

قبائلی زندگی: عرب عام طور سے قبائلی زندگی گزارتے تھے۔ پورا عرب چھوٹے بڑے قبیلوں میں تقسیم تھا جو آپس میں سخت عصبیت رکھتے تھے اور ان کے درمیان چھوٹی چھوٹی باتوں پر جنگ بھڑک اٹھتی تھی۔ سردار قبیلہ کی اطاعت ہر حال میں واجب تھی اور قبیلہ کا ہر فرد فوجی کی ذمہ داری بھی نبھاتا تھا۔ کسی بھی مصیبت کی صورت میں افراد قبیلہ آپس میں مل کر اس کا مقابلہ کرتے تھے۔ قبائل سیاسی اور جنگی مسائل کی وجہ سے کبھی کبھی ایک دوسرے سے معاہدہ بھی کر لیتے تھے۔

عورت: عورت زندگی کے مختلف میدانوں میں مرد کے شانہ بشانہ کھڑی نظر آتی ہے اور اس کی ہر طرح مدد کرتی ہے لیکن اس کو سماج میں مرد سے کم درجہ حاصل ہوتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ میدان جنگ میں مرد کی طرح نہیں لڑ سکتی اور اپنا دفاع نہیں کر سکتی جس کی وجہ سے وہ ایک کمزور کڑی ثابت ہوتی ہے۔ بعض عرب لڑکیوں کو باعث ذلت سمجھتے تھے اور ان کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ عورتوں اور مردوں کے تعلقات کسی اصول یا مذہب کے پابند نہ تھے بلکہ رسوم و رواج پر عمل تھا۔ جنگ میں مفتوح قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا اور ان کو کسی طرح کے بنیادی انسانی حقوق حاصل نہ ہوتے تھے۔

مذہب: اہل عرب عام طور پر مشرک تھے اور بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ ان کا مذہب انتہائی سادہ تھا اور وہ غور و فکر نہیں کرتے تھے بلکہ تقلید اور رواجوں پر چلنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اہل عرب ابتدا میں بت پرست نہ تھے بلکہ ابراہیمؑ و اسمعیلؑ کے پیروکار اور توحید پرست تھے اور

خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے لیکن انقلاب زمانہ سے ان کے اندر آہستہ آہستہ بت پرستی پھیل گئی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد آتے آتے ہم دیکھتے ہیں کہ تین سو ساٹھ بت خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے۔ ہر قبیلہ کا ایک بت تھا جیسے قریش کا مشترکہ بت عزی وہبل، قبیلہ ثقیف کا بت لات، اوس و خزرج کا بت مناة، یمن میں اہل جرش کا یغوث، خیو میں حمدان کا یعتوق، قبیلہ ذوالکلاع حمیری کا بت نسر، دومۃ الجندل میں ہذیل کا بت سواع وغیرہ۔ عرب بتوں کو اصل خدا نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ ان کو خدا کا مقرب سمجھتے تھے اور ان کا ماننا تھا کہ وہ خدا کے سامنے ان کی سفارش کر دیں گے۔ کچھ عرب باشندے سورج، چاند اور ستاروں کی بھی پرستش کرتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ باہری دنیا کے اثرات سے ان کے اندر دیگر مذاہب بھی در کر آئے جیسے عیسائیت شمالی نجد کے بعض قبائل میں، حیرہ کے حکمرانوں میں اور یمن کے علاقہ نجران میں۔ یہودیت یمن اور مدینہ منورہ اور خیبر کے علاقوں میں، مجوسیت نجد میں قبیلہ کندہ کے آخری بادشاہ نے اس کو اختیار کر لیا تھا اور صابیت وغیرہ۔

معاشی زندگی:

عرب عام طور سے زراعت پیشہ نہ تھے البتہ کھجور کی پیداوار بکثرت ہوتی تھی اور وہ بھیڑ بکریاں اور اونٹ پالتے تھے جس کے دودھ، گوشت اور اون وغیرہ پر وہ اپنا گزارہ کرتے تھے۔ ان کی زندگی انتہائی سادہ ہوتی تھی۔ شہروں کے لوگوں میں جیسے مکہ، مدینہ، طائف اور یمن کے علاقوں میں تجارت کا بھی خوب رواج تھا۔ وہ سمندر کے ذریعہ چین، جاپان اور ہندوستان کا مال درآمد کرتے تھے اور پھر یمن و مکہ کے راستے اس کو شام و مصر کے بازاروں تک پہنچاتے تھے اور وہاں کا مال ہندوستان وغیرہ لے جا کر فروخت کرتے تھے۔ عربوں میں لوٹ مار بھی عام بات تھی اور اس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ذریعہ بھی وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔

میلے اور بازار: مختلف ضروریات اور خرید و فروخت کے لیے عربوں میں میلے کا رواج تھا جن کو اسواق العرب کہا جاتا ہے۔ یہ میلے سال میں ایک بار اپنی طے شدہ تاریخوں میں لگتے تھے اور مختلف طرح کے سامان یہاں بکتے تھے۔ اس طرح کے میلوں کی تعداد تقریباً تیرہ ہیں جن کے مقامات اس طرح ہیں، دومۃ الجندل، مشقر، صخار، دبا، شمر، عدن، صنعاء، الرابیع، عکاظ، ذوالحجاز، منی، نطاۃ اور حجر۔ عکاظ کا میلہ ان میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس میں تجارت و کاروبار کے علاوہ شعر و ادب کی محفلیں بھی سجتی تھیں اور شعرا اپنا اپنا کلام پیش کرتے تھے۔ فخر و مباحث کرتے تھے اور ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے پوری تنگ و دو کرتے تھے۔ ان قصائد کے حسن و قبح کو بیان کرنے کے لیے حکم ہوتا تھا جیسے نابغہ ذبیانی۔ اس میلے میں قریش، ہوازن، غطفان، عقیل، مصطلق وغیرہ قبائل خاص طور سے شریک ہوتے تھے۔ یہ سوق عکاظ مکہ سے شمالی رخ جانے والے راستے پر نصف ذیقعدہ سے آخری ذیقعدہ تک لگتا تھا۔

1.5 سامی اقوام

1.5.1 سامی اقوام کی اصل:

لفظ سامی کا اطلاق مشرق وسطیٰ کی ان قوموں پر ہوتا ہے جو سام بن نوح کی اولاد بتائے جاتے ہیں اور جن کی زبانوں کے درمیان پائی جانے والی قربت ظاہر کرتی ہے کہ یہ لوگ ماضی میں کبھی ایک جگہ رہتے تھے اور ایک زبان بولتے تھے لیکن گردش زمانہ نے جب ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا تو آہستہ آہستہ ان مختلف گروہوں کی زبانوں نے مستقل زبانوں کی شکل اختیار کر لیا لیکن اس کے باوجود بہت ساری

مشترکہ خصوصیات باقی رہیں جن کی بنا پر ان زبانوں کو سامی زبان اور ان کو بولنے والی قوموں کو سامی قوم کہا جاتا ہے۔

1.5.2 سامی اقوام جزیرہ عرب میں:

سامی زبان کا اصل وطن کیا ہے؟ وہ علاقہ کون سا ہے جہاں سامی اقوام علیحدہ ہونے سے پہلے رہتی تھیں؟ محققین اس سلسلے میں بہت ساری آرا رکھتے ہیں۔ شوقی ضیف لکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ حامی و سامی دونوں کا وطن ایک ہی تھا، یہ یا تو شمالی افریقہ ہو سکتا ہے یا صومالیہ جہاں سے سامی قومیں باب المندب یا صحرا سینا کے راستے بلاد عرب کی طرف ہجرت کر گئیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سامی اقوام کا اصل وطن شمالی شام ہے اور کچھ اس کو دجلہ و فرات کے درمیان کے علاقہ کو قرار دیتے ہیں۔ (شوقی ضیف، تاریخ الادب العربی، ج/۱، ص: ۲)

جواد علی اپنی مشہور کتاب ”تاریخ العرب قبل الاسلام“ میں لکھتے ہیں کہ ایک جماعت مانتی ہے کہ سامی کا مہداول بابل تھا، لیکن کچھ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ سامیوں کا مہداول جزیرہ عرب تھا اور ان میں سے ایک گروہ جزیرہ عرب کے ایک خاص علاقہ کی تحدید بھی کرتا ہے۔ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ سامیوں کا اصل وطن افریقہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سامی و حامی زبانوں میں ایک رشتہ پایا جاتا ہے۔ ایک جماعت آموریوں کی سرزمین کو ان کا اصل وطن قرار دیتی ہے تو ایک دوسری جماعت آرمینیا کے علاقہ کو ان کا وطن سمجھتی ہے۔ (جواد علی: تاریخ الاسلام قبل العرب، ج/۱، ص: ۲۲۹)

یہ بات تقریباً متفق علیہ ہے کہ تمام سامی اقوام ابتدا میں کسی ایک چھوٹے سے مقام پر رہتی تھیں، پھر آبادی کی کثرت، کھانے پینے کی قلت اور آپسی جھگڑے کی سبب وہ مختلف ادوار میں گروہوں کی صورت میں قرب و جوار کے علاقوں کی طرف ایک بہتر زندگی کی تلاش میں ہجرت کر گئیں۔ جزیرہ عرب کے طبعی حالات ایسے ہیں جو بڑی آبادی کے بود و باش کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اس لیے یہاں کی ایک بڑی آبادی قرب و جوار کے زرخیز علاقوں کی طرف (مثلاً عراق، شام، یمن) ہجرت کر گئی۔ مشہور مورخ فلپ حتی لکھتا ہے:

”تاریخ نے ہمارے لیے بابلی، آشوری، کلدانی اور آرامی وغیرہ قوموں کی خبروں کو محفوظ کر لیا۔ ان قوموں کے آبا و اجداد کی پرورش و پرداخت جزیرہ عرب میں ہوئی تھی پھر وہاں سے وہ قرب و جوار کے ملکوں میں ہجرت کر گئے جہاں انھوں نے عظیم سلطنتیں قائم کیں لیکن پھر یہ سلطنتیں روزگار زمانہ کی نذر ہو گئیں۔“ (فلپ حتی: العرب تاریخ موجز، ص: ۹، والعلم للملاہین، بیروت، ۱۹۹۱ء)۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اکادیوں (بابلی و آشوری) نے چوتھی صدی قبل مسیح کے اواخر یا تیسری صدی ق م کے اوائل میں جزیرہ عرب سے ہجرت کی اور عراق کو اپنا مسکن بنایا جہاں سومریوں کا بول بالا تھا۔ ایک زمانہ تک ان کی حکومت میں رہ کر اکادیوں نے ان کی زبان اور علوم سیکھے اور پھر اپنی مملکت قائم کر لی جس کی راجدھانی ”اکد“ تھی اور ان کا قابل ذکر بادشاہ ”سرجون اول“ تھا۔ جس کی سلطنت عراق، شام اور جزیرہ عرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے زوال کے بعد بابل کی سلطنت قائم ہوئی جس کا مشہور بادشاہ ”حمورابی“ اٹھارہویں صدی قبل مسیح میں بہت مشہور ہوا۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے اس کا دور بہت ممتاز ہے۔ پھر اس سلطنت کا کشیون اور حیشیون نے خاتمہ کر دیا۔ اسی دوران دجلہ و فرات کے درمیان اکادیوں سے تعلق رکھنے والے ایک گروہ آشوریوں نے چودھویں صدی قبل مسیح میں ایک سلطنت قائم کی اور نینوی کو راجدھانی بنایا۔ اس نے آہستہ آہستہ بابل، شام اور ایشائے کوچک پر قبضہ کر لیا اس کے زوال کے بعد کلدانی حکومت (۶۲۶-۵۳۸ ق م) قائم ہوئی جس کے بادشاہ بخت نصر نے بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اس کے بعد فرس اور سکندر اعظم کا یہاں

یکے بعد دیگرے قبضہ ہو گیا۔

جزیرہ عرب سے سامی قوم کی دوسری ہجرت کنعانیوں کی تھی انھوں نے دوسرے ہزار قبل مسیح کے اوائل میں ہجرت کرنا شروع کر دیا تھا اور شام و بحر ابیض کے ساحل پر آباد ہو گئے جہاں انھوں نے اپنے تجارتی مراکز قائم کر لیے مثلاً صیدا، صور، جبیل و بیروت۔ یونانی ان کو فنیقی کا نام دیتے ہیں۔ کنعانیوں نے افریقہ، ایشیا کوچک اور اندلس وغیرہ میں بھی اپنی بستیاں بسالیں تھیں۔ اوجرتی شمالی شام میں پھیلے جن کے آثار راس شمر میں پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک گروہ عبرانی لوگوں کا تھا جو تیرہویں صدی قبل مسیح میں فلسطین میں آباد ہوئے۔ بخت نصر شاہ بابل نے عبرانیوں کی راجدھانی یروشلم کو تباہ کر دیا اور آرامی زبان عبرانی زبان پر غالب آگئی۔

سامی قوم کی تیسری بڑی ہجرت جزیرہ عرب سے آرامیوں کی تھی پندرہویں صدی قبل مسیح کے آس پاس ان کی ہجرت شروع ہو گئی تھی اور انھوں نے بابل اور خلیج عربی کے درمیان اپنی حکومت ’کلد‘ کے نام سے قائم کر لیا تھا گیارہویں صدی اور دسویں صدی قبل مسیح ان کے عروج کا زمانہ ہے وہ شمالی شام پر قابض ہو گئے اور اپنی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر لیں۔ اس قوم کا تجارت میں بہت بڑا کردار تھا یہاں تک کہ آشوریوں نے ان کی حکومتوں کا خاتمہ کر دیا۔ آرامیوں نے فینیقیوں کے رسم الخط کو اپنا لیا جس کو بعد میں دوسرے لوگوں نے اپنایا اور یہی رسم الخط کچھ تغیرات کے ساتھ عربی زبان نے اپنا لیا۔ حواریوں نے انجیل کو آرامی رسم الخط میں لکھا تھا۔

سامی قوم کی آخری بڑی ہجرت جنوبی عرب کے بڑے لوگوں کی تھی جنھوں نے پندرہویں صدی قبل مسیح کے بعد ہجرت کرنا شروع کر دیا تھا کچھ تو جنوب اور بحر ہند کے ساحل کی طرف گئے اور کچھ نے حبشہ کا رخ کیا اور وہاں اپنی حکومت قائم کر لی جو ۵۲۵ عیسوی تک قائم رہی۔ خلاصہء کلام یہ کہ غالباً سامی اقوام کا اولین مسکن جزیرہ عرب تھا یہاں سے انھوں نے تاریخ کے مختلف کے ادوار میں آس پاس کے علاقوں شام، عراق اور فلسطین کی طرف ہجرت کیں۔ یہاں بود و باش اختیار کیا، حکومتیں و سلطنتیں قائم کیں، تہذیب و تمدن کو فروغ دیا۔ اور آخر میں عربی زبان ان سامی اقوام کی زبان ہو گئی۔

1.6 سامی زبانیں

1.6.1 زبان کی تعریف:

حضرت انسان کو حیوان ناطق بھی کہا جاتا ہے۔ وہ کرہ ارض کے دوسرے جانداروں سے اس لیے ممتاز ہے کہ اس کو نطق کی صلاحیت حاصل ہے۔ اس نے مختلف اصوات کو ایک خاص ترتیب میں پرو کر زبان کی تشکیل یا ایجاد کو تاریخ انسانی کا سب سے بڑا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ یہ زبان ہی ہے جس کے ذریعہ ہم اپنے جذبات، احساسات اور علوم فنون کو دوسروں تک منتقل کرتے ہیں تہذیب و تمدن اور ترقی کی جو معراج آج انسان کو نصیب ہوئی ہے وہ زبان کے بغیر ممکن نہ تھی۔

زبان کیا ہے؟ زبان مافی الضمیر کی ادائیگی کا ایک وسیلہ ہے۔ زبان کی تعریف کے بارے میں علماء لسانیات کے درمیان کافی اختلافات پائے جاتے ہیں اور متفق علیہ تعریف ابھی تک سامنے نہیں آئی ہے۔ چند تعریفات کو ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں جو خلیق صدیقی کی کتاب ”زبان کیا ہے؟“ سے ماخوذ ہیں:

”مولانا محمد حسین آزاد نے زبان کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ اظہار کا وسیلہ ہے جو متواتر آوازوں کے سلسلے میں ظاہر ہوتا ہے جنہیں تقریر

، یا سلسلہ الفاظ یا بیان یا عبارت کہتے ہیں۔۔۔“

ڈاکٹر محی الدین قادری کے الفاظ میں زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دہرا سکتا ہے۔ ہادی حسین زبان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زبان علامتوں کا ایک نظام ہے جو انسانوں کے درمیان ابلاغ کا ذریعہ ہوتا ہے یا بن سکتا ہے۔

”ہیگل (Hegel) کے مطابق زبان صحیح معنوں میں فطری ذہانت کا آرٹ ہے کیوں کہ وہ اس کا خارجی اظہار کرتی ہے۔“
”کینز (Kainz) کا کہنا ہے کہ زبان ان علامتوں کا ایک ڈھانچہ ہے جن کی مدد سے خیالات اور حقائق کو بیان کیا جاسکتا ہے جن اشیا کا وجود نہیں اور جو اس جن کا ادراک نہیں کر سکتے ان کا خاکہ کھینچا جاتا ہے۔“

دی ساسور (De Saussure) کے مطابق زبان خیالات اور افکار کا اظہار کرنے والی علامتوں کا نظام ہے“
(صدیقی، خلیل: زبان کیا ہے؟، ص: ۱۰-۱۳، عاکف بک ڈپو دہلی، ۱۹۹۴ء)

1.6.2 زبان کا آغاز:

زبان کب اور کیسے وجود میں آئی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا صحیح جواب کسی عالم لسانیات کے پاس نہیں۔ وہ محض قیاس آرائیوں کے ذریعہ اس میدان میں اپنے گھوڑے دوڑاتا ہے۔ مذاہب زبان کو خدا کا عطیہ سمجھتے ہیں جو انسان کے اندر ودیعت کی گئی ہے۔ چنانچہ زبان کو ’دیووانی‘ یا ’دیوبھاشا‘ بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو نطق کی صلاحیت جنت میں ہی عطا کر دیا تھا لیکن علما لسانیات مذاہب کی آراء کو قبول نہیں کرتے ہیں اور اپنی قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں۔
زبان کے آغاز کے بارے میں جو خیالات ظاہر کیے جاتے رہے ہیں میکس مولر نے ان کو جمع و ترتیب دینے کی کوشش کی ہے اور ان کو چار نظریوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔

۱- صوت تقلیدی نظریہ: اس نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ الفاظ فطری اصوات کی نقلیں ہیں انسان نے کتے کے بھونکنے کی نقل کی جس سے ابتدائی لفظ ’باو‘ (کتا) ’باآ‘ (بکری) جیسے لفظ بنے۔

۲- فحائی نظریہ: اس نظریہ کی بنیاد اس نفسیاتی خصوصیت پر ہے کہ مختلف چیزوں یا مظاہر کا مشاہد دل میں مختلف قسم کے احساسات اور جذبات پیدا کرتا ہے ان جذبات اور احساسات کو انسان مختلف قسم کی موزوں آوازوں کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے اس کی مثال ’دھت‘ ’اف‘ اور ’ہائے‘ وغیرہ ہیں جو مختلف قسم کے احساسات و جذبات کو ظاہر کرتے ہیں۔

۳- ابتلا زائی نظریہ: اس نظریہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ابتدائی زمانہ کا انسان جب خاص خاص چیزوں کا مشاہدہ کرتا تھا تو جوابی رد عمل کے طور پر اس کی زبان سے بے ساختہ کچھ آوازیں نکل جاتی تھیں، یہی آوازیں رفتہ رفتہ اس چیز کے نام کے طور پر مستعمل ہو گئیں، مثال کے لیے اردو کا لفظ ’جگ مگ‘ اور ’جھلا جھل‘ وغیرہ پیش کیے جاسکتے ہیں۔

۴- ہائی سون نظریہ: یہ ہمارے روزمرہ مشاہدے کی بات ہے کہ مزدور جب بھاری بوجھ اٹھاتے ہیں یا کسی کٹھن کام میں ان کو

جسمانی قوت سے کام لینا پڑتا ہے تو سب مل کر کچھ آوازیں بلند کرتے ہیں جس سے ان کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا ہے اسی طرح مغربی ملکوں میں ملاح جب جہازوں کے لنگر کو کھینچتے ہیں تو ”یو ہے ہو“ کی صدا بلند کرتے ہیں لیکن ہمارے یہاں عام طور پر مزدور اور ملاح ”ہائی سو“ کی صدا نکالتے ہیں یعنی الفاظ کے مادے انسانی افعال کو ظاہر کرتے ہیں۔ (سروری، پروفیسر عبدالقادر: زبان اور علم زبان، ص: ۲۰-۲۳، مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن، ۱۹۷۰ء)

حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے نظریے انفرادی یا مجموعی طور سے زبان کے آغاز پر پوری طرح روشنی ڈالنے سے عاجز ہیں اور کوئی ایسا تشفی بخش جواب دینے سے قاصر ہیں جس کو ذہن قبول کرے اور تمام زبانوں پر اس کی تطبیق کی جاسکے اور زبان کے آغاز کا صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔ ایک بات جو تمام علمائے لسانیات میں تقریباً متفق ہے وہ یہ ہے کہ یہ مانتے ہیں کہ ابتدا میں زبانیں سادہ روپ میں تھیں لیکن جیسے جیسے انسان کی زندگی نے پیچیدگیاں اختیار کیں اور تہذیب و تمدن کی طرف بڑھنے لگیں تو یہ زبانیں بھی سادہ حالت سے پیچیدہ حالت میں بدلنے لگیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زبان ہمیشہ تغیر پذیر رہتی ہے اور غیر شعوری طور پر اس میں تغیرات نمودار ہوتے ہیں تبدیلی زبان کی فطرت میں داخل ہے یہ تبدیلی زبان کے کسی بھی گوشہ میں پیدا ہو سکتی ہے وہ لفظ ہو یا معنی، ترکیب ہو یا ساخت اور جملہ وغیرہ۔ کسی بھی زبان کے سو دو سو سال قدیم لٹریچر کا موازنہ اس کے موجودہ لٹریچر سے کیا جائے تو اس کا مشاہدہ کھلی آنکھوں سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ تبدیلی ایسا ارتقائی عمل ہے جس میں چند عوامل کارفرما ہوتے ہیں مثلاً طبعی یا جغرافیائی اثرات، سیاسی و معاشی اسباب کی بنا پر دونوں زبانوں کا اختلاط زبان کے بولنے والوں کے ذہنی رجحانات اور تہذیبی اثرات۔

1.6.3 زبانوں کا خاندان:

زبان اپنے مسکن اول (خواہ جزیرہ عرب مانیں یا جنوبی افریقہ اور ایتھوپیا) میں پیدا ہوئی اور پھر مختلف اسباب و وجوہات سے وہ دوسرے علاقوں میں پھیل گئی۔ ان اسباب میں ہجرت، استعماریت اور تہذیبی ترقی وغیرہ شامل ہیں اپنے مرکز سے دوری کی وجہ سے اس میں تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں اور زبان سے بولی اور پھر بولی سے ایک مستقل زبان کی صورت اختیار کر گئی اور دوسروں کے لیے اس زبان کا سمجھنا دشوار ہو گیا۔ لیکن کثرت اختلاف اور مستقل زبان کی صورت اختیار کرنے کے باوجود ان زبانوں کے اندر کچھ مشترکہ خصوصیات باقی رہیں جن کی بنا پر آج علمائے لسانیات ان کی گروہ بندی کرتے ہیں یوں تو زبانوں کا مختلف علمائے مختلف گروہوں میں اپنے اصول کے مطابق تقسیم کیا ہے لیکن دو تقسیم زیادہ مشہور ہیں، ایک شلیگل (Schlegel) اور دوسری میکس مولر کی۔

1.6.4 شلیگل کی تقسیم:

شلیگل نے زبانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ متصرف یا تحلیلی زبانیں: ان زبانوں کی خصوصیت مورفولوجی (علم صرف) اور سینٹیکس (علم نحو) ہے اس طور پر کہ مادہ کی صورت میں تبدیلی آنے سے کلمات کے معانی میں تبدیلی آجاتی ہے اور دوسرے یہ کہ جملہ کے اجزاء چند مستقل روابط سے جڑے ہوتے ہیں (مثلاً عربی میں ’محمد، اس کلمہ کے اخیر میں واو قصیرہ اور نون ساکنہ ہے یعنی یہ ’محمد‘ ہے)۔ اور یہ چیز جملہ میں اس کی حیثیت کو متعین کرتی ہے اس میں عربی

زبان کے ساتھ فارسی، ہندی، لاطینی اور یونانی، جرمن اور عبرانی وغیرہ زبانیں شامل ہیں۔

۲۔ سبغلاچی یا وصلی زبانیں: مورفولوجی اور سینٹیکس ان زبانوں کی بھی خصوصیت ہے اس اعتبار سے کہ اس میں مادہ یا اصل کلمہ کے معنی میں تبدیلی اور جملہ میں اس کی حیثیت سابقہ (Prefixes) اور لاحقہ (Suffixes) حروف کی مدد سے ہوتی ہیں۔ اس میں ترکی منغولی، منشوری، جاپانی اور باسک زبانیں شامل ہیں۔

۳۔ یک رکنی یا غیر متصرفہ زبانیں: مورفولوجی کے اعتبار سے اس زبان کے کلمات غیر اشتقاقی یا یک رکنی ہوتے ہیں ان کے مادوں میں تبدیلی نہیں آتی اور نہ ہی سابقہ و لاحقہ حروف کی مدد سے ان کے معانی میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ ان زبانوں کا ہر کلمہ اپنی ایک مستقل صورت رکھتا ہے اور ایک مستقل معنی جس میں تغیر نہیں ہو سکتا جس اور سینٹیکس کے اعتبار سے ان میں اجزائے جملہ کے درمیان روابط (رابطہ کے حروف) نہیں پائے جاتے جو جملہ میں اس کے معنی اور حیثیت کو متعین کرے بلکہ یہ چیز کلمات کی ترتیب اور سیاق سباق سے سمجھی جاتی ہے اس میں چینی، سامی، برمی، تبتی زبانیں شامل ہیں۔

1.6.5 میکس مولر کی تقسیم:

میکس مولر نے زبانوں کی تقسیم میں قربت کی بنیاد پر اس کو تین خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ انڈو۔ یورپین خاندان

۲۔ سامی۔ حامی خاندان

۳۔ طورانی خاندان

۱۔ انڈو۔ یورپین خاندان:

لسانی خاندانوں میں یہ سب سے زیادہ معروف و مشہور خاندان ہے یہ خاندان آٹھ شاخوں پر مشتمل ہے:

۱۔ آریائی زبانیں: یہ دو ذیلی شاخوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی ہندوستانی زبانیں جس میں سنسکرت، پراکرت اور جدید ہندوستانی زبانیں شامل ہیں اور دوسری شاخ ایرانی زبانیں جس میں قدیم فارسی، اوستی، زنداوستی، پہلوی، جدید فارسی، کردی اور پشتو زبانیں شامل ہیں۔

ب۔ آرمینی زبان

ج۔ یونانی زبانیں جس میں قدیم یونانی اور جدید یونانی زبانیں شامل ہیں۔

د۔ البانی زبان

ر۔ اطالوی زبانیں جس میں سمٹی، لاطینی اور رومانی زبانیں شامل ہیں۔

س۔ سلتی زبانیں (Celtiques Languages)۔ یہ یورپ کی سلت قوم کی زبانیں ہیں جن پر فرانسیسی، انگریزی ہسپانوی

زبانوں کا غلبہ ہو گیا ہے لیکن پھر بھی اس کے کچھ آثار باقی ہیں۔

ص۔ جرمن زبانیں: یہ تین ذیلی شاخوں پر مشتمل ہے: مشرقی جرمن زبانیں، شمالی جرمن زبانیں اور مغربی جرمن زبانیں۔

ط۔ بلطیتی سلاوی زبانیں: یہ دو ذیلی شاخوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی شاخ بلطیتی زبانوں میں لیتوانی اور قدیم بروسی زبانیں ہیں اور دوسری شاخ سلاوی زبانیں ہیں جس میں سلاوی، روسی، پولونی، سربی اور جدید بلغاری زبانیں ہیں۔

۳۔ حامی۔ سامی زبانیں:

یہ خاندان دو شاخوں میں منقسم ہے سامی زبانیں اور حامی زبانیں۔

ا: سامی زبانیں: یہ دو ذیلی شاخوں میں منقسم ہو جاتی ہیں۔

۱۔ شمالی سامی زبانیں جن میں اکادی یا آشوری بابلی، کنعانی اور آرامی زبانیں شامل ہیں۔

۲۔ سامی جنوبی زبانیں جو عربی، قدیم یمنی اور حبشی شامی زبانوں پر مشتمل ہیں۔

ب۔ حامی زبانیں: جس کی تین ذیلی شاخیں ہیں۔

۱۔ مصری زبانیں جو قدیم مصری اور قبطی زبانوں پر مشتمل ہیں۔

۲۔ لیبی یا بربری زبانیں جو شمالی افریقہ کے اصل باشندوں کی زبانیں ہیں (لیبیا، تونس، جزائر، مراکش، صحراء) اس میں

تماشی، سلجی، زناجہ اور جوئی وغیرہ قبائلی زبانیں شامل ہیں۔

۳۔ کوشیتی زبانیں یہ مشرقی افریقہ کے اصل باشندوں کی زبانیں ہیں جس میں صومالیہ اور حبشہ کے علاقے شامل ہیں اس کے تحت

صومالی، جالد، بدجا اور دنقلہ وغیرہ زبانیں آتی ہیں۔

۴۔ طورانی زبانوں کا خاندان:

اس زبان میں وہ تمام ایشیائی اور یورپی زبانیں شامل ہیں جو سابقہ دونوں خاندان کے تحت نہیں آتیں مثلاً ترکی، ترکمانی، مغولی،

منشوری اور فینیقی وغیرہ۔ اس تقسیم کی کوئی اساس یا وجہ نہیں سوائے یہ کہ یہ سابقہ دونوں خاندانوں میں شامل نہیں ہے۔

1.7 اکتسابی نتائج

عرب کو جزیرہ نمائے عرب اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ تین طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں بحر احمر، جنوب میں خلیج عدن، بحیرہ عرب، شمال مشرق میں خلیج عمان اور خلیج فارس (خلیج عرب) واقع ہے۔ جزیرہ نمائے عرب کو مختصراً جزیرہ عرب بھی بولتے ہیں۔ قدیم زمانے میں جزیرہ نمائے عرب کا اطلاق حجاز (مکہ، مدینہ، طائف وغیرہ)، نجد، بحرین، یمن، تہامہ، شحر، ظفار اور حضرموت پر ہوتا تھا۔ دور جدید میں جب قومی ریاستوں کا ظہور ہوا تو نئے نئے ممالک وجود میں آئے اب جزیرہ عرب کا اطلاق سعودی عرب، یمن، عمان، اردن، متحدہ عرب امارات، کویت، قطر اور بحرین پر ہوتا ہے۔

جزیرہ عرب میں بہت سے پہاڑ، وادیاں، صحرا و نخلستان ہیں مثلاً جبال السراة، جبال الحجاز، حرات۔ پھر صحرا اور ریگستان میں الربع الخالی، النفوذ، الدهناء، بادية الشام وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ عرب دنیا میں ندیاں نہیں ہیں لیکن کچھ وادیاں ہیں جن کی وجہ سے بعض مقامات میں سرسبزی اور ہریالی رہتی ہے۔ مثلاً وادی الرمة، وادی الدواسر، وادی حضرموت، وادی سرحان، وادی نجران اور وادی ام القری

وغیرہ ہیں۔ عرب میں جنگلات نہیں ہوتے لیکن مختلف قسم کے درخت ضرور پائے جاتے ہیں۔ جیسے بول، بیرری اور مہدی وغیرہ۔ پھل دار درختوں میں کھجور سب سے اہم ہے۔ انار، انگور وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ جانوروں میں سب سے اہم جانور اونٹ پھر گھوڑا ہے۔ ان کے علاوہ بھیڑ، بکری، ہرن، نیل گائے، خچر، گدھا، شیر، چیتا، تیندوا، بھیڑیا، لومڑی، بندر، گائے خرگوش بھی پائے جاتے ہیں۔ پرندوں میں عقاب، چیل، گدھ، شکرہ، کبوتر، فاختہ اور کوا وغیرہ اہم ہیں۔

عرب باشندگان سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں یہ عام طور سے قبائلی زندگی گزارتے اور محدود علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ آپس میں جنگ و جدال بھی چلتا رہتا تھا۔ عورت کو بدوی ماحول میں اہم مقام حاصل تھا۔ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی اور ہر میدان میں موجود نظر آتی۔ عربوں کا اولین مذہب تو دین ابراہیمی تھا لیکن بت پرستی ان میں داخل ہوئی اور سینکڑوں دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنے لگے۔ اس کے علاوہ عربوں میں یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت بھی پائی جاتی تھی۔ عربوں کا ذریعہ معاش زیادہ تر بھیڑ بکریاں اور اونٹ پالنا اور صحرا نوردی کرنا تھا۔ کچھ لوگ زراعت کرتے اور کچھ تجارت بھی کرتے تھے۔ یمنیوں نے زراعت و تجارت میں کافی شہرت حاصل کی۔ پھر قریش مکہ اس میں آگے بڑھے۔ مکہ کے علاوہ بہت سے تجارتی مراکز یا بازار لگتے تھے۔ جیسے سوق عکاظ، دومۃ الجندل، منی، ذوالحجاز وغیرہ۔

سامی اقوام: مشرق وسطیٰ میں رہنے والی اقوام کو سام بن نوح کی اولاد بتایا جاتا ہے اور وہ کسی زمانے میں ایک جگہ رہتے تھے اور ایک ہی زبان بولتے تھے۔ پھر دھیرے دھیرے مختلف گروہوں میں بٹنے لگے اور زبانیں بھی مختلف ہوتی گئیں اور مستقل زبانوں کی حیثیت اختیار کر لیا۔ لیکن ان میں آپسی نسلی قربت، جغرافیائی قربت اور زبانوں میں بہت سی مشترک خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے انہیں سامی اقوام کہا جاتا ہے اور ان کی زبانوں کو سامی زبانیں۔

سامی اقوام کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں کہ ان کا اصل وطن کہاں تھا۔ کچھ نے شمالی افریقہ اور ایتھوپیا (حبشہ) کو بتایا ہے تو کچھ نے عراق کے قدیم شہر بابل کو اور کچھ نے آرمینیا کو بتایا ہے، لیکن شوقی ضیف نے جزیرۃ العرب کو بتایا ہے اور فلپ حتی نے مختلف شواہد کی روشنی میں جزیرۃ العرب کو ان کا اولین وطن قرار دیا ہے۔ پھر یہ سامی اقوام یہاں سے تاریخ کے مختلف ادوار میں ہجرت کر کے دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئیں۔

سامی زبانوں کے تعلق سے یہ بات یاد رہے کہ علمائے لسانیات نے جب سامی زبانوں کی گروہ بندی کی تو عربی زبان کو ان میں سب سے اہم مانا جو جزیرۃ عرب میں بولی جاتی تھی۔ اور شاید سامی خصوصیات جو قدیم سے عربی زبان میں پائی جاتی ہیں سامی گروپ کے کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتیں۔

زبان کی تعریف: مختلف ماہرین نے زبان کی تعریف اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ ہادی حسن زبان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”زبان علامتوں کا ایک نظام ہے جو انسانوں کے درمیان ابلاغ کا ذریعہ ہوتا ہے یا بن سکتا ہے۔“ دی ساسور کے مطابق ”زبان خیالات اور افکار کے اظہار کرنے والی علامتوں کا نظام ہے۔“

انسان نے کیسے بولنا شروع کیا؟ زبانیں کس طرح وجود میں آئیں۔ اس سلسلے میں بہت سارے نظریات پائے جاتے ہیں۔ میکس

مولر نے انہیں چار نظریات میں سمویا ہے:

۱- صوت تقلیدی نظریہ ۲- نجائی نظریہ ۳- ابتلازائی نظریہ ۴- ہائی سونظریہ
علمائے لسانیات نے پھر زبانوں کے خاندان بنائے اور ان کو مختلف انداز میں تقسیم کیا۔ شلیگل اور میکس مولر کی تقسیم کو زیادہ مقبولیت اور رواج ملا۔ شلیگل نے ان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا۔

۱- متصرفہ یا تحلیلی زبانیں ۲- سبقتاتی یا وصلی زبانیں ۳- یک رکنی یا متصرفہ زبانیں
میکس مولر نے زبانوں میں آپسی قربت کی بنیاد پر تین خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱- انڈو-یورپین خاندان، ۲- سامی-حامی خاندان، ۳- طورانی خاندان

پھر ان کو مزید شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔ عربی زبان سامی-حامی خاندان کے سامی خاندان کے تحت آتی ہے۔ عربی زبان سامی زبانوں میں مہتم باشان رہی۔ سامی خصوصیات کی حامل کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ عربی اپنے وجود سے لے کر آج تک کبھی مردہ نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ ایک زندہ زبان کی حیثیت بولی جاتی رہی۔ اس نے دنیا کی بیشتر زبانوں پر اپنے اثرات ڈالے، اور خود بھی دوسری زبانوں سے استفادہ کیا اور اپنے آپ کو مالا مال کرتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آج بھی دنیا کی زندہ اور ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک ہے اور خالق کائنات کی ضمانت ہے کہ تا قیامت زندہ رہے گی۔

1.8 نمونے کے امتحانی سوالات

- ۱- جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیائی احوال بیان کیجیے۔
- ۲- جزیرہ نمائے عرب کے طبعی حالات پر مختصر روشنی ڈالیے۔
- ۳- جزیرہ نمائے عرب کے قبائلی اور معاشی زندگی کے حالات تحریر کیجیے۔
- ۴- سامی قوم کی اصل کیا ہے؟ اور جزیرہ عرب میں اس کے وجود کے بارے میں بتائیے۔
- ۵- زبان کی تعریف کیا ہے؟ اور اس کا آغاز کب سے ہوا؟
- ۶- زبان کی تقسیم کو تفصیل کے ساتھ لکھیے۔

1.9 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

- ۱- تاریخ الأدب العربی، أحمد حسن الزیات: دار نهضة مصر للطباعة والنشر، القاهرة، سنہ طباعت غیر مذکور۔
- ۲- الجامع فی تاریخ الأدب العربی (قدیم ادب) حنا الفاخوری: دار الجیل۔ بیروت۔ ۱۹۸۶۔
- ۳- تاریخ الأدب العربی، ج ۱، عمر فروخ: دار العلم الملائین، بیروت، الطبعة الرابعة، ۱۹۸۱م۔
- ۴- تاریخ الأدب العربی، ج ۱، الدكتور شوقي ضيف، دار المعارف القاهرة، ۱۱/ ایدیشن، سنہ طباعت غیر مذکور۔
- ۵- موسوعة علوم اللغة العربية۔ ج ۷۔ یعقوب، امیل بدیع: دار الکتب العلمیة۔ بیروت۔ سنہ طباعت ۲۰۰۶۔

۶۔ نشأة اللغة الانسان والطفل، د/على عبدالواحد وافي، الناشر: نهضة مصر للطباعة والنشر والتوزيع، القاهرة، مصر، سنة الطباعة ۲۰۰۳م۔

۷۔ جزيرة العرب: مولانا محمد رابع ندوی، ناشر: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔ پانچواں ایڈیشن، سنہ ۲۰۰۴ء۔

۸۔ زبان کیا ہے؟، خلیل صدیقی، عاکف بک ڈپو دہلی، ۱۹۹۴ء۔

۹۔ زبان اور علم زبان، پروفیسر عبدالقادر سروری، مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن، ۱۹۷۰ء۔



اکائی 2 عربی زبان کا ارتقا: دور جاہلی میں عربوں کے سیاسی و سماجی حالات

اکائی کے اجزا	
2.1 مقصد	
2.2 تمہید	
2.3 دور جاہلی میں عربوں کے حالات	
2.3.1 سماجی حالات	
2.3.2 دینی حالات	
2.3.3 اقتصادی حالات	
2.3.4 سیاسی حالات	
2.3.4.1 جزیرہ عرب کی ریاستیں	
2.3.5 علمی حالات	
2.4 عربی زبان کا ارتقا	
2.4.1 عربی زبان کا خاندان	
2.4.2 قدیم لہجات	
2.4.3 شمالی اور جنوبی لہجہ یا عدنانی اور قحطانی لہجہ	
2.4.4 قرآن کریم کا نزول	
2.4.5 زبان اور لہجہ: تعریف اور فرق	
2.5 عربی رسم الخط	
2.6 اکتسابی نتائج	
2.7 نمونے کے امتحانی سوالات	
2.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں	

2.1 مقصد

- ۱۔ طلبہ اس سبق میں دور جاہلی میں عربوں کے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور علمی حالات سے واقف ہوں گے۔
- ۲۔ عربی زبان کے نشوونما اور ترقی کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے۔
- ۳۔ عربی زبان کے مختلف لہجات اور فصیح عربی کے فرق کو سمجھیں گے۔
- ۴۔ قرآن کے عربی زبان پر اثرات کو بھی سمجھیں گے۔
- ۵۔ عربی خط کے نشوونما اور اس کی موجودہ شکل سے واقفیت حاصل کریں گے۔

2.2 تمہید

انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ یہ شرف امتیاز شاید دو چیزوں میں مضمر ہے: قوت عقل و فہم اور قوت گویائی۔ دنیا کے دوسرے جانداروں میں بھی عقل و فہم پائی جاتی ہے لیکن انسان ان سے اس معنی میں منفرد و ممتاز ہے کہ وہ کسی چیز کو سمجھ کر اس کا تجزیہ کر سکتا ہے اور پھر اسے کیا کرنا چاہیے اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے دکلی بات اور مافی الضمیر کی ادائیگی اپنی زبان سے کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ انسان کے علاوہ دوسری ساری مخلوقات جو اس کائنات میں پائی جاتی ہیں وہ سب اس صفت سے یا تو مکمل طور سے عاری ہیں یا ان میں یہ ناقص شکل میں پائی جاتی ہے۔

انسان نے اس زمین پر قدم رکھنے کے بعد کس زبان میں بولنا شروع کیا؟ یہ بالکل مجہول اور نامعلوم ہے۔ اس سلسلے میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ اندازہ، قیاس یا اعتقاد و ایمان کی بنیاد پر کہا جاتا ہے۔ حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت نوحؑ تک کے احوال پردہ خفا میں ہیں۔ اولاد نوح کے دنیا میں پھلنے اور پھولنے اور پھر مختلف زبانوں کے وجود میں آنے کی تاریخ ملتی ہے یا یوں کہیے کہ ماہرین زبان نے ایسا ہی مان لیا ہے۔ بہر حال اولاد نوحؑ میں سام بن نوحؑ نے جزیرہ عرب کو اپنا مسکن بنایا۔ یہ سامی اقوام کا گہوارہ بنا اور ان کی زبان سامی زبان کہلائی۔ عربی زبان بھی سامی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا وطن جزیرہ عرب رہا۔ یہیں بچپن سے جوانی کا سفر طے کیا۔ زمانے کے مختلف انقلابات دیکھے جس سے عربی لہجے (بولی) سے فصیح عربی زبان بن گئی۔ یہ تاریخ کے کسی دور میں پڑمردہ زبان نہیں رہی۔ اس کی تفصیل ہم آئندہ صفحات میں ہم پڑھیں گے۔ یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ زبان جس خطے میں پیدا ہوئی اور بام عروج پر پہنچی وہاں کا جغرافیہ کیا تھا۔ اس کے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور علمی حالات کیا تھے۔ اس کی مدد سے ہم اس زبان کی اصل، اس کی اہمیت اور اس کے مقام کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ اس زبان کے کلمات، تعبیرات اور دیگر چیزوں کو بھی اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ اس لیے پہلے ہم جزیرہ عرب کے عمومی احوال جاننے کی کوشش کریں گے پھر عربی زبان کی نشوونما کا مطالعہ کریں گے۔

2.3 جزیرہ نمائے عرب کی سماجی حالات

2.3.1 عرب اقوام:

عرب قوم کا تعلق سامی نسل سے بتایا جاتا ہے۔ سامی اقوام کا مسکن جزیرہ عرب تھا۔ اس بات کو شوقی ضیف نے مدلل انداز میں لکھا

ہے۔ فلپ حتیٰ نے مختلف دلائل اور شواہد سے یہ ثابت کیا ہے کہ سامی اقوام کا اصل وطن جزیرہ عرب تھا۔ قدیم عرب مؤرخین نے جزیرہ عرب کی اقوام کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے: ۱۔ عرب باندہ، ۲۔ عرب عاربہ، ۳۔ عرب مستعربہ

عرب باندہ: اس سے مراد وہ عرب اقوام ہیں جن کا وجود مٹ چکا ہے۔ یہ سام بن نوح کے دو بیٹوں لوو اور ارم کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔ ان اقوام میں طسم، جدیس، عاد اور ثمود وغیرہ ہیں۔ جن کا تذکرہ قرآن وحدیث، جاہلی شاعری اور بائبل وغیرہ میں ملتا ہے۔ عاد و ثمود کے عروج وزوال کا قرآن میں جا بجا تذکرہ پایا جاتا ہے اور ان کے اندر پھیلی سماجی برائیوں اور ان کی تباہی پر خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔ {فاما ثمود فاهلکو بالطاغیة واما عاد فاهلکو بریح صرصر عاتیة} (الحاقۃ: ۶-۵) یعنی ’جہاں تک قوم ثمود کا تعلق ہے تو وہ ایک عذاب میں ہلاک کردیئے گئے اور جہاں تک قوم عاد کا تعلق ہے تو وہ ایک تیز و تند ہوا سے ہلاک کردیئے گئے‘۔

عرب عاربہ: یہ وہ عرب اقوام ہیں جن کی اصل زبان عربی تھی۔ اور ان کا مسکن یمن تھا یہ عرب باندہ کے باقی ماندہ لوگ بتائے جاتے ہیں۔ عرب عاربہ کو یعر بن قحطان کی طرف نسبت کر کے قحطانی بھی کہا جاتا ہے۔ اوس و خزرج اور غسانہ بھی عرب عاربہ میں سے ہیں۔ یمن کی مشہور ریاستیں سبا و حمیر کا انتساب بھی انہیں اقوام کی طرف ہے۔ حسان بن ثابت کہتے ہیں۔

تعلمتم من منطق الشیخ یعر ب
أبینا فصر تم معربین ذو نفر

اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم نے ہمارے دادا یعر سے زبان سیکھی اور پھر عرب قوم ہو گئے۔ (حسن الزیات، ص: ۷)

عرب مستعربہ: یہ وہ عرب اقوام ہیں جو اصلاً عرب نہ تھیں بلکہ باہر سے آ کر جزیرہ عرب میں آباد ہو گئی تھیں اور عربی زبان سیکھ لیا تھا۔ ان کو عدنان کی طرف نسبت کر کے عدنانی بھی کہا جاتا ہے۔ ان کو اسماعیل کی اولاد بھی کہا جاتا ہے جو انیسویں صدی قبل مسیح میں حجاز میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ربیعہ، مضر، انمار، قریش، ایاد وغیرہ قبائل عرب مستعربہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

2.3.2 سماجی حالات

عرب عاربہ اور عرب مستعربہ کی اولاد خوب پھیلی پھولی اور جزیرہ عرب کے مختلف حصوں کو آباد کیا۔ یہ قبائلی زندگی گذارتے۔ قبیلہ ہی ان کا محور اور مرکز تھا۔ وہ کسی بھی نظام حکومت اور بادشاہت سے نا آشنا تھے۔ قبیلے کے لیے جینا اور قبیلے کے لیے مرنا ان کا شعار تھا۔ ’انصرأ خاک ظالمنا أو مظلوما‘ یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ان کی طبیعت میں آزادی اور خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ امانت داری اور وفا شعاریت ان کے اندر بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ عہد شکنی اور بزدلی کو سخت معیوب سمجھتے تھے۔ فیاضی اور مہمان نوازی ان کی فطرت ثانیہ تھی۔

قبیلے کا اپنا نظام ہوتا۔ ہر قبیلے کا اپنا ایک سردار ہوتا تھا جو تجربہ کار، بہادری، فیاضی اور دیگر کاموں میں سب سے آگے رہتا۔ اس کے ایک اشارہ پر قبیلے کا ہر فرد جان دینے کے لیے تیار رہتا تھا۔ قبیلے کا کوئی فرد اگر کسی کو امان دے دے خواہ وہ دشمن ہی ہو تو قبیلے کا ہر فرد اس امان کی پاسداری کرتا۔ اگر قبیلے کے کسی فرد کا کوئی عزیز دشمن کے ہاتھوں مارا جائے اور وہ انتقام کا مطالبہ کرے تو انتقام لینا پورے قبیلے کی دے داری ہوتی تھی۔

عربوں کی ایک بہت اچھی خصوصیت سخاوت و مہمان نوازی تھی اور نخل کو انتہائی معیوب سمجھتے تھے۔ جو بھی ان کا مہمان بنتا چاہے وہ اجنبی یا دشمن قبیلے کا ہی کیوں نہ ہو، وہ اس کی مہمان نوازی کرتے۔ قحط سالی اور سردی کے موسم میں ان کی فیاضی اور مہمان نوازی میں اور اضافہ ہوجاتا۔ وہ ٹیلہ پر آگ جلاتے تاکہ مہمان اس کو دور سے دیکھ کر ان کے پاس آجائے۔ وہ شراب پیئے اور جو اکھیلے اور اس وقت خوب فیاضی کرتے۔

قبائلی عصبيت ان کی رگ رگ میں سرایت کی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے ان میں آئے دن آپس میں جنگ ہوا کرتی۔ بلکہ وہ ہمیشہ حالت جنگ میں رہتے۔ چھوٹی اور معمولی باتوں پر جنگ شروع ہو جاتی تو سالہا سال جاری رہتی۔ خون کے بدلہ خون کا زیادہ رواج تھا۔ اور خون بہا لینے کو معیوب سمجھتے۔ بستر پر مرنے کے بجائے جنگ میں مرنا افضل سمجھتے۔ حرام مہینوں میں جنگ بند کر دی جاتی اور ہر قبیلے اس کی سختی سے پابندی کرتا۔ عربوں کی دو جنگیں حرب بسوس اور حرب داحس وغیرا بہت مشہور ہیں۔ یہ قبائل بسا اوقات جنگ سے تنگ آ کر آپس میں صلح بھی کر لیتے۔ کچھ قبائل آپس میں معاہدہ کر لیتے کہ وہ ایک دوسرے کا جنگ اور امن میں ساتھ دیں گے۔ ایسے قبائل متخالف قبائل کہلاتے۔ پھر وہ ایک دوسرے کے لیے اپنی جان تو دے سکتے تھے لیکن اپنے عہد و پیمان سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ اسی طرح اگر کوئی فرد قبیلہ اگر قبیلے کی پاسداری نہیں کرتا اور دوسروں سے جنگ کر بیٹھتا تو اسے خلیج (نکالا ہوا) قرار دے دیتے پھر نہ تو اس کی حمایت کرتے اور نہ ہی اگر اسے کوئی قتل کر دیتا تو اس کے خون بہا کا دعویٰ کرتے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص آزادی حاصل کر لیتا تو پھر کسی نہ کسی قبیلے سے جڑ جاتا اور زیادہ تر اسی قبیلے سے جڑ جاتا جس نے اسے آزاد کیا۔ اس تعلق کو ولاء اور اس کو مولیٰ کہا جاتا۔

قبائلی سماج میں عربوں میں شعر اور خطبا کی بہت اہمیت حاصل تھی۔ شاعر اپنے قبیلے کا ترجمان ہوتا اور اپنے قبیلے کے کارناموں پر فخر کرتا اور اپنے دشمنوں کی جھوکتا، اپنے مقتولین کا مرثیہ کہتا اور جنگوں میں جوش دلاتا۔ خطیب بھی مختلف مناسبت سے تقریریں کرتا جس میں فخر و مہابا، جاں فروشی و بہادری اور حکمت و مواعظت کی باتیں ہوتیں۔ قبیلے میں ان کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔

بت پرستی عرب سماج میں سرایت کر چکی تھی اس کی وجہ سے بہت سی بد اعتقادات بھی سماج میں پھیل گئی تھیں۔ اس پر آگے کے صفحات میں تفصیل سے بات کی جائے گی۔

شادی بیاہ میں کوئی قانون و قاعدہ نہ تھا وہ جس قدر عورتوں سے چاہتے شادی کرتے۔ باپ کے مرنے پر اس کی بیویوں سے کبھی اس کے لڑکے بھی شادی کر لیتے۔ جنگ میں جس قدر مرد اور عورتیں پکڑی جاتیں وہ یا تو فدیہ دیکر اپنے آپ کو چھڑا لیتے یا مردوں کو غلام بنا لیا جاتا اور عورتوں کو باندیاں۔ ان سے تمتع اپنا حق سمجھتے۔ البتہ ان سے ہونے والی اولاد کو اپنی طرف منسوب کرنا اپنے لیے عار سمجھتے۔ دو سگی بہنوں سے بھی شادی کا رواج تھا۔ مرد بھی کسی عورت کو شادی کا پیغام دے سکتا تھا اور کوئی عورت بھی کسی مرد کو۔

عورت: جاہلی سماج میں عورت کو مرد کے مساوی حقوق حاصل تھے۔ وہ اپنی پسند سے کسی سے شادی کر سکتی تھی۔ کوئی تجارت کر سکتی تھی۔ وہ مرد کے شانہ بشانہ زندگی کے ہر میدان میں کام کرتی۔ جنگوں میں ساتھ ہوتی اور بوقت ضرورت تلوار بھی اٹھاتی۔ مرد کی طرح ہی وہ بھی کسی پریشان حال کو پناہ امان دے سکتی تھی۔ علم و فن کے میدان میں بھی وہ سب کے ساتھ ہوتی۔ خنساء جیسی شاعرہ دور جاہلی ہی کی پیداوار تھیں۔ آزاد بڑے گھرانے کی عورتوں کے خدمت گار بھی ہوتے۔ باندیاں ان کے گھر اور ان کی خدمت کرتیں۔

غلام اور لونڈیاں: عرب معاشرے میں بہت سی لونڈیاں اور باندیاں بھی تھیں یا تو وہ افریقہ وغیرہ سے خرید کر لائی جاتیں اور پھر عرب کے بازاروں میں بیچی جاتیں یا جنگوں میں پکڑ کر لائی جاتیں۔ ان کا سماج میں کوئی مقام نہ تھا۔ اپنے آقا کی خدمت کرنا بس۔ بعض لوگ لونڈیوں اور غلاموں کی تجارت کرتے تھے۔ کچھ لوگ ان سے گانے بجانے کا کام بھی لیتے اور بسا اوقات یہ معاملہ فاشی تک پہنچ جاتا۔

باندیوں کی طرح غلام بھی عرب معاشرے کا ایک اہم جزء تھے یہ بھی یا تو خرید کر لائے جاتے یا جنگوں میں پکڑے جاتے ان کو غلام

بنالیا جاتا۔ ان سے ہر طرح کا کام لیا جاتا۔ گھر، تجارت، گلہ بانی اور بسا اوقات جنگوں وغیرہ میں بھی۔ ان میں سے کوئی اگر اپنے مالک کو خوش کر لے یا پیسہ دے دے تو اسے وہ آزاد بھی کر دیتے۔ غلاموں کی بھی تجارت ہوتی تھی۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جاہلی دور میں عرب قبائلی زندگی گزارتے تھے اور عرب کی صحرائی زندگی کی خصوصیات جیسے حریت پسندی، حق گوئی، وفا شعاری، سخاوت اور مہمان نوازی ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ ساتھ ہی قبائلی عصبیت اور جنگ و جدال بھی ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ ان کا کوئی مذہب نہ تھا بلکہ اس وقت کے سارے ہی مذاہب عربوں میں پائے جاتے تھے۔ البتہ بت پرستی کا ان پر غلبہ تھا۔

2.3.3 دینی حالات

اللہ کے نبی حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ایک بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ میں آباد کیا۔ دونوں نے مل کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ ایک اللہ کی عبادت کی اور لوگوں کو توحید کی دعوت دی۔ لوگ دین ابراہیمی پر چلتے رہے۔ وقت گزرتا رہا بالآخر لوگ اصل دین کو دھیرے دھیرے بھولتے گئے۔ بت پرستی در آئی۔ اور پھر ایک وقت وہ آیا کہ خانہ کعبہ میں ہی سینکڑوں بت رکھ دیئے گئے۔ ان میں سب سے ممتاز بت لات، منات، عزی، یغوث، یعوق، نسر، وداور سواع تھے، ان میں سب سے پرانا بت منات تھا، یہ بت مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ نصب کیا ہوا تھا، یہاں آکر سارے عرب کے لوگ اس کی عبادت کرتے اور قربانی کے جانور ذبح کرتے۔ قبیلہ اوس و خزرج کا یہ محبوب بت تھا۔ اسی طرح سے لات قبیلہ ثقیف کا محترم بت تھا، جس کا طائف میں انھوں نے مندر بنا رکھا تھا، عربوں میں ان بتوں کے نام پر نام رکھنے کا بھی عام رواج تھا، چنانچہ عبد مناف، زید منات، زید اللات اور تیم اللات کے نام عام طور سے عربوں میں پائے جاتے تھے۔ عزی قریش کا محبوب ترین بت تھا، اس کے علاوہ قریش نے خانہ کعبہ میں بھی کئی بت رکھ رکھے تھے، ان میں سب سے بڑا ہبل تھا جو انسانی شکل کا تحقیق ہیرے کا بنا ہوا تھا۔

عربوں میں کچھ لوگ چاند اور سورج کی بھی پوجا کرتے تھے چنانچہ ان میں سے بعض سورج کی عبادت کرتے تھے اور اس کے نام پر عبد شمس یعنی سورج کا بندہ نام رکھتے تھے۔ اسی طرح سے بعض قبائل چاند کی پرستش کرتے تھے۔ قبیلہ لخم، خزاعہ اور قریش ”الشعری“ ستارہ کو اپنا معبود مانتے تھے۔ بعض لوگ ستاروں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مانتے اور ان کی پوجا کرتے۔ بعض قبائل جنوں کی بھی پرستش کرتے تھے۔

عربوں کی زندگی پر ان بتوں کا اثر اور ان کی کار فرمائی بہت نمایاں تھی۔ یہ لوگ ان سے برکت حاصل کرتے، مدد مانگتے۔ ان پر چڑھاوا چڑھاتے، فال نکالتے، سفر میں جاتے وقت اور واپس آکر ان کو چھوتے اور اپنے جسم پر ملتے، غرض کہ بت پرستی اور اس کے اثرات عربوں کی زندگی اور معاشرت میں بری طرح سرایت کر چکے تھے۔ دین ابراہیمی جس کا وہ اپنے آپ کو پیروکار بتاتے تھے۔ ایک بھولی بسری کہانی بن گیا تھا۔

یہودیت:

بت پرستی کے بعد عرب کا دوسرا اہم ترین مذہب یہودیت تھا۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں بخت نصر کے حملے کے نتیجے میں بہت سے یہودی قبائل نے جزیرہ عرب کا رخ کیا اور مختلف مقامات پر آباد ہو گئے خاص طور سے یثرب (مدینہ)، فدک اور خیبر وغیرہ۔ اس طرح یہودیت بھی جزیرہ عرب میں پھیل گئی۔ دھیرے دھیرے وہ تجارت و زراعت میں آگے بڑھے اور عربوں میں سے سب سے مالدار ہو گئے۔ یہ سود پر اپنا پیسہ لوگوں کو دیتے چنانچہ عربوں میں سودی کاروباری انہیں کے ذریعہ پھیلا۔ پھر اہل کتاب ہونے کے ناطے وہ لکھنے پڑھنے میں بھی

سب پر سبقت رکھتے تھے۔

عیسائیت:

تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیت عرب میں داخل ہوئی۔ اس وقت تک عیسائیت میں خرافات اور بدعات رواج پا چکی تھی۔ عیسائی اور رومی سلطنت کے عربوں سے قریب ہونے کی وجہ سے کافی لوگ اس سے متاثر ہوئے۔ جزیرہ عرب کے شمال مغرب و مشرق میں روم سے عیسائی مبلغین کے وفد کثرت سے آنے لگے۔ عیسائی بادشاہ ان کی خوب مدد اور حوصلہ افزائی کرتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ان علاقوں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا چاہتے تھے۔ حبشیوں کے درمیان اس مذہب کو بڑی مقبولیت ملی۔ ابرہہ کی قیادت میں یہ مذہب خوب پھلا پھولا۔ اس نے جگہ جگہ کنیہ بنوئے اور یمن میں نجران عیسائیت کا گڑھ بن گیا۔ شمالی عرب میں بھی یہ مذہب رواج پایا۔ قبیلہ عاملہ، جذام، کلب اور قضامہ کے لوگوں نے اس کو اپنایا۔ عراق میں قبیلہ تغلب، ایاد، بکر میں لوگوں نے عیسائیت اختیار کر لی۔ حیرہ میں عرب کے مختلف قبائل جن کو 'العباد' کہتے تھے مذہب عیسوی کے پیرو بن گئے۔ حجاز خاص طور سے مکہ میں جو غلام تھے وہ زیادہ تر عیسائیت کے ماننے والے تھے۔ مذکورہ بالا گفتگو سے یہ پتہ چلا کہ اسلام سے پہلے جزیرہ عرب میں عیسائیت کے ماننے والوں کی ایک اچھی تعداد پائی جاتی تھی۔

ایک اہم بات یہاں سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کیا نصرانیت، مسیحیت اور عیسائیت میں کوئی فرق ہے؟ کیا یہ تینوں ایک چیز کے تین مختلف نام ہیں یا یہ الگ الگ ہیں؟۔ نصرانی وہ فرقہ ہے جو یہود سے نکلا اور حضرت عیسیٰؑ پر ایمان رکھتا ہے کہ وہ ایک انسان تھے، اللہ کے نبی تھے اور ان کو سولی پر نہیں چڑھایا گیا بلکہ ایک دوسرے شخص کو چڑھایا گیا اور ان کو اللہ نے اپنے پاس بلا لیا اور قیامت سے پہلے ان کا ظہور ہوگا۔ ان اعتقادات کے مجموعہ کا نام نصرانیت اور ان کے ماننے والوں کو نصرانی کہتے ہیں۔ اس فرقہ کو مسیحی اپنے میں شامل نہیں کرتے۔ مسیحیت کا ماننا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے بیٹے اور نبی تھے ان کو پھانسی دی گئی پھر قبر سے تین دن بعد اٹھے اور اللہ کے پاس چلے گئے اور قیامت سے پہلے دوبارہ اس دنیا میں آئیں گے اور دنیا کو امن و سلامتی سے بھر دیں گے۔ جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے تو یہ اردو زبان میں مسیحیت کا مترادف ہے۔ موجودہ دور میں عام بول چال میں نصرانیت، مسیحیت اور عیسائیت میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا بلکہ ان تینوں سے مراد وہ دین سمجھا جاتا ہے جو حضرت عیسیٰؑ لیکر اس دنیا میں تشریف لائے۔ اور ان کے پیروکاروں کو نصرانی، مسیحی اور عیسائی کہتے ہیں۔

مجوسیت:

ایران اور عرب کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ ایرانی ایک عظیم سلطنت کے مالک تھے۔ ایرانی تہذیب و تمدن ایک زمانے میں بہت مشہور تھی۔ عرب ان کے ہمسایہ تھے۔ اس لیے عربوں پر ان کے اثرات پڑنا ایک فطری بات ہے۔ مجوسی عربی لفظ ہے اس کے معنی آتش پرست۔ مجوسیت کا بانی زرتسترہ تھا جو بلخ میں دو ہزار سال قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ ابتدائی زندگی وہیں گذاری۔ کہتے ہیں کہ کافی دنوں ریاضت و عبادت میں گذاری پھر خدا کا پیغام لیکر ایران کی بادشاہ کی خدمت میں پہنچا، اس نے اس کے مذہب کو قبول کر لیا۔ ایک جنگ میں بلخ میں مارا گیا۔ کوروش اعظم اور دارا اعظم نے زرتشتی مذہب کو ایران میں حکماً نافذ کیا۔ پھر یہ پورے ایران میں پھیل گیا۔ کہتے ہیں کہ ابتداء میں یہ مذہب بھی عقیدہ توحید کا پیغام لیکر اٹھا لیکن پھر اس میں ثنویت یعنی دو خدا کا تصور داخل ہو گیا۔ ایک خدا اہورامزدا (یزداں) خالق اعلیٰ جو حق و صداقت اور نیکی خدا ہے۔ دوسرا اہرمزدا بدی، جھوٹ اور تباہی کا خدا۔ ان دونوں میں ازل سے کشمکش چلی آرہی ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

جب اہورامزدا کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے تو دنیا امن و سکون اور خوشحالی کا گوارہ بن جاتی ہے اور جب اہرمن غالب آتا ہے تو دنیا فسق و فجور سے بھر جاتی ہے۔ لیکن بالآخر خدائے یزدان کی فتح ہوگی۔ اس مذہب میں آگ کو پاک اور ہرشیء کو پاک کرنے والی چیز سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اس مذہب کے ماننے والے ہر وقت اپنی عبادت گاہوں میں آگ روشن رکھتے ہیں بلکہ گھروں میں بھی آگ روشن کرتے ہیں اور پھر شاید یہیں سے اس میں آگ کی پرستش درآئی۔ عرب انہیں مجوسی کہتے ہیں اور ان کے مذہب کو مجوسیت کے نام سے پکارتے ہیں۔ آج کل اس مذہب کے ماننے والوں کو پارسی کہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ ایران عربوں کا پڑوسی ملک تھا اور اس کے اثرات اہل عرب پر پڑنا ایک فطری بات ہے۔ اسی لیے ایران و عراق کی سرحد کے قریب آباد عرب زرتشت کے آتش پرست مذہب سے متاثر ہوئے۔ یہ ایرانیوں کی طرح نیکی کا خدا یزدان اور بدی کے خدا اہرمن کے قائل تھے۔ یہ لوگ عموماً آگ کی پوجا کرتے تھے۔ حیرہ کی ریاست مجوسی عربوں کے زیر تسلط تھی۔ مکہ میں بھی کچھ لوگ دو خدا مانتے تھے، ایک نور کا اور دوسرا ظلمت و تاریکی کا۔ خدائے ظلمت کو فتنہ و فساد اور برائیوں کی جڑ مانتے تھے۔

دہریت:

عرب میں کچھ ایسے بھی لوگ تھے جنہوں نے مشرکانہ عقائد کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، یہ لوگ نہ تو بت پرست تھے اور نہ ہی کسی آسمانی مذہب کے پابند۔ وہ خدا اور حشر و نشر کے منکر تھے۔ وہ دنیا کو ہی ازلی اور ابدی خیال کرتے تھے، اس طبقہ کو دہریت کا پیرو کہا جاتا ہے۔

دین ابراہیمی:

مذکورہ مذاہب کے ماننے والوں کے علاوہ جزیرہ نمائے عرب میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جو صرف ایک خدا کی عبادت کرتی تھی اور بت پرستی، یہودیت یا نصرانیت کی قائل نہ تھی، یہ لوگ ”حنفاء“ (حنفی کی جمع یعنی خالصتاً ایک خدا کے ماننے والے) کہلاتے تھے۔ یہ لوگ قریشیوں کی بت پرستی کو خام خیالی اور اوہام پرستی سے تعبیر کرتے تھے، ان کے بتوں پر چڑھاوے کے جانوروں کے گوشت کو یہ لوگ حرام جانتے تھے۔ کچھ مشہور نام یہ ہیں: نزار بن معد بن عدنان، قریش بن کنانہ، عامر بن الظرب، ورقہ بن نوفل، قس بن ساعدہ ایادی، حرب بن امیہ، ادہم الیشکری وغیرہ۔

2.3.4 عربوں کی معاشی حالت

جزیرہ نمائے عرب کا بیشتر حصہ ریگستانوں اور صحراؤں پر مشتمل ہے۔ بارش کم ہوتی ہے۔ بڑی ندیاں نہیں پائی جاتی ہیں۔ کچھ چھوٹے چھوٹے ندی نالے پائے جاتے ہیں جہاں کبھی کبھار ہونے والی بارش کا پانی آکر گرتا ہے اور کچھ زرخیزی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اسی طرح پہاڑوں کا پانی بہہ کر وادیوں اور نخلستانوں میں پہنچتا ہے تو اس سے شادابی و ہریالی پیدا ہوتی ہے۔ ایسی جگہیں جہاں بارش ہوتی اور زمین کسی قدر زرخیز ہوتی وہاں کھیتی باڑی کی جاتی تھی بقیہ مقامات بنجر، صحرا اور ریگستان تھے جہاں نہ تو کھیتی ہوتی اور نہ ہی چلنا پھرنا آسان ہوتا۔ اس وجہ سے قدیم زمانے میں عربوں کی معیشت تین چیزوں: زراعت، تجارت اور گلہ بانی پر منحصر تھی۔

۱۔ زراعت:

یمن کی سرزمین سب سے زیادہ زرخیز تھی یہاں لوگ سیچائی کے لیے بند باندھ کر پانی روک لیتے اور حسب ضرورت سیچائی کرتے۔

اس طرح انھوں نے کھیتی باڑی میں بہت ترقی کی اور پھر ان کی تجارت بھی خوب پھیلی پھولی۔ یہاں چاول، گیہوں، روئی اور کافی coffee کی بہت اچھی کاشت ہوتی تھی۔ اسی طرح مکہ، مدینہ، طائف میں گیہوں، جو، کھجور، انگور کی کھیتی ہوتی۔ عرب میں سب سے اہم درخت کھجور ہے۔ کھجور اور دودھ کو مکمل غذا سمجھا جاتا۔ بدوی عرب کا خواب ہوتا Two blacks یعنی Water and dates یعنی پانی اور کھجور ہوتے تھے۔ مدینہ کی کھجور دنیا بھر میں سب سے عمدہ مانی جاتی ہے۔ مورخین نے مدینہ میں کھجور کی ۱۰۰۰ سے زائد انواع گنایا ہے۔ خیبر، فدک وغیرہ علاقوں میں بھی چاول، گیہوں، کھجور اور انگور کی اچھی کھیتی ہوتی۔

۲۔ تجارت:

شوقی ضیف نے جاہلی دور کی معاشی حالت پر بہت اچھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے: جاہلی زمانے میں عربوں کی معاشی حالت کسی ایک خاص طرز کی نہیں تھی۔ جنوبی و مشرقی عرب اور حجاز کے نخلستانوں جیسے یثرب اور خیبر، طائف اور وادی القریٰ میں زراعت کی جاتی تھی۔ مکہ والوں کی زندگی کا انحصار تجارت پر تھا۔ مکہ والوں کے تجارتی قافلے بحر ہند اور بحر متوسط کے درمیان اپنا تجارتی مال لیکر چلتے۔ اسی طرح خشکی میں شمال اور جنوب میں کچھ معلوم راستوں سے سفر کرتے۔ بحری اور بری دونوں سفروں میں ان کے ساتھ کچھ گائے اور محافظ ہوتے جو انھیں راستوں میں بھٹکنے اور بحری اور بری ڈاکوؤں سے بچاتے۔ چنانچہ یہ جنوب یعنی یمن، بحر ہند، مشرقی افریقہ سے لوبان، خوشبو، صندل، چڑے، عدن کے قیمتی کیڑے، ہندوستانی مسالہ جات، افریقی غلام، گوند، ہاتھی دانت وغیرہ۔ اسی طرح وہ طائف سے کشمش اور بنو سلیم کے کانوں سے سونا لے جاتے، یہ سب سامان وہ بحر متوسط کے علاقوں میں لے جاتے اور وہاں سے اسلحہ، گیہوں، تیل، شراب، مختلف قسم کے سوتی اور ریشم کے کیڑے لاتے۔

دور جاہلی میں مکہ ایک بڑا تجارتی منڈی تھا۔ کعبہ سب سے بڑا صنم خانہ۔ لوگ اس کا طواف کرتے، اپنے بتوں کی عبادت کرتے، قریش مختلف قسم کے بازار اور میلے لگواتے جیسے عکاظ کا بازار۔ یہ ادبی میلہ بھی ہوتا تھا۔ عکاظ سے قریب ہی ایک اور بازار لگتا جسے ذوالحجاز کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے بازار لگتے تھے جیسے نجد کے شمال میں دومۃ الجندل، خیبر، حیرہ، حجر یمامہ میں، صحار اور دبا عمان میں، المشقر، ہجر میں، شحر، حضر موت، صنعاء، عدن اور نجران کے بازار۔ یہ سب بازاروں کے کچھ متعین دن ہوتے انہیں دنوں میں لگائے جاتے تھے۔ قریش کے لوگ ان میں سے بعض بازاروں میں کمیشن رٹیکس بھی وصول کرتے۔ مذکورہ بالا باتوں سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اہل مکہ سب کے سب مالدار تھے بلکہ ایک بڑا طبقہ غریبوں، فقیروں اور غلاموں کا بھی وہاں رہتا تھا۔

۳۔ گلہ بانی:

عرب چونکہ قبائلی زندگی گزارتے اور کچھ قبائل چلتے پھرتے رہتے جہاں کہیں چارہ پانی ملتا ٹھہرتے اور جب پانی ختم ہوا وہاں سے نکل پڑے اور دوسری جگہ جہاں چارہ پانی ملا ٹھہر گئے۔ سارے ہی عرب مویشی پالتے خاص طور سے اونٹ اور بھیڑ بکری پالنا ان کی ضرورت اور ان کا اثاثہ تھا۔ البتہ چلتے پھرتے قبائل کی زندگی کا تو دار و مدار ہی گلہ بانی پر تھا۔ انہیں سے ان کو غذا ملتی اور وہی ان کی مال و جان داد تھے۔

شوقی ضیف لکھتے ہیں کہ مکہ کے علاوہ دوسری جگہوں جیسے تہامہ، نجد، صحرا نفوذ، وادی شام اور دھناء، اور بحرین میں بدوی زندگی گزارتے تھے ان کی معیشت کا دار و مدار اونٹ اور بکریاں پالنا اور ان کو چرانا تھا۔ وہ زراعت اور صنعت کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ حقارت کی

نظر سے دیکھتے۔ اور صحرا کی آزاد زندگی کو ہر چیز پر ترجیح دیتے۔ اس چیز نے ان کی زبان ان کے رسوم و رواج سب کو محفوظ رکھا۔ ان کا کھانا بہت معمولی اور سادہ ہوتا جیسے تھوڑا سا جوان کے لیے کافی ہوتا۔ کھجور اور دودھ ان کی سب سے عمدہ غذا ہوتی۔ اسی طرح ان کا لباس ایک لمبا کرتا (چنع) جس کو بیچ میں کمر کے پاس ایک عبا سے لپیٹ لیتے اور سر پر عقال باندھ لیتے۔

سارے ہی عرب جانور پالتے اور ان سے مختلف کام لیتے۔ البتہ عربوں میں ایک طبقہ ایسا تھا جس کی زندگی صرف اور صرف گلہ بانی پر منحصر تھی۔ پالتو جانوروں میں اونٹ، گدھا، کتا، تازی کتا، بلی، بھیڑ، بکری وغیرہ۔ گھوڑا، عربی گھوڑا بہت مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے عرب بدو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر ایک بچہ پانی مانگ رہا ہے اور دوسری طرف ان کا گھوڑا پیاسا ہے تو بدو گھوڑے کو پہلے پانی دے گا۔

عربوں کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اونٹ کی تھی۔ یہ ان کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی تھا۔ اونٹ بدوؤں کا صحرا کی کشتی، زمین کا دوست، اونٹ کا پالنے والا، شادی میں دہیز کا سامان، خون کا فدیہ اور جوئے بازی کا سکہ اور بدو کی سب سے قیمتی دولت ہوتا۔ بدو اس کی سواری کرتا، اس کا دودھ پیتا، اس کا گوشت کھاتا اور اس کے کھال سے نیمہ بناتا اور بال سے کمبل۔ اس کا پیشاب اس کے لیے ٹانگ اور اس کا گوبر اس کے کھاد کا کام کرتا۔ عرب اپنے آپ کو اہل البعیر (وہ اونٹ والے) کہنے میں فخر محسوس کرتے۔ کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر بدو اونٹ کے پیٹ سے پانی نکال کر پی جاتا۔ کہتے ہیں کہ عربی زبان میں ایک ہزار سے زائد الفاظ اونٹ کے لیے پائے جاتے ہیں۔ شاید اس کے بعد دوسرا لفظ سیف (تلوار) ہے جس کے لیے عربی میں کثرت سے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اونٹ جاڑے میں ۲۵ دنوں تک اور گرمی میں ۱۵ دنوں تک بغیر پانی کے رہ سکتا ہے۔ جزیرہ عرب ہی دنیا کا واحد خطہ ہے جہاں پر سب سے زیادہ اونٹوں کی پرورش و افزائش ہوتی ہے۔ نجد کے گھوڑے، اُحساء کے گدھے اور عُمان کی اونٹنی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

سیر و شکار اور لوٹ مار: عرب کی صحرائی زندگی بہت آسان نہ تھی بلکہ بہت سی دشواریوں اور خطرات سے پر تھی۔ جنگلی جانوروں اور سانپ سے مد بھیڑ، آپسی قبائلی لڑائیاں، بلکہ کچھ نے تو لڑائی اور ڈاکہ زنی کو اپنی روزی روٹی کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ اور پھر یہ تجارتی قافلوں پر حملہ کرتے، ان کے سامان چھین لیتے اور مزے لیکر کھاتے اور غریبوں میں بھی بانٹتے پھر اس پر فخر کرتے۔

سیر و شکار بھی ان کے یہاں کافی اہم سمجھا جاتا۔ بہت سے لوگ ہرن، گاؤخر، یہاں تک کہ شیر و تیندوئے کا شکار کرتے اور خوب فخر کرتے۔ اس کے لیے کچھ لوگ شکاری کتے بھی پالتے۔ ان کے کتوں اور جنگلی بیل اور گدھوں کے درمیان آئے دن خونیں معرکے ہوتے رہتے۔ جاہلی شعرا کے کلام میں گھوڑے دوڑانے اور شکار کرنے کا خوب ذکر ملتا ہے۔

یہ لوگ جنگلی ہرن، جنگلی بکرے و بکریوں کا بھی شکار کرتے۔ اس طرح ان عربوں میں سے کچھ لوگوں کی روزی روٹی کا ذریعہ جانوروں کا شکار تھا۔

2.3.5 سیاسی حالات

جزیرہ عرب کے باشندوں کی زندگی عموماً قبائلی تھی وہ آزاد زندگی گزارتے تھے۔ کسی طرح کے نظام حکومت اور بادشاہت سے نا آشنا تھے۔ مجموعی طور سے جزیرہ عرب میں کبھی کوئی حکومت نہ قائم ہوئی۔ البتہ ایران اور روم کے سرحدی علاقوں پر جیسے غسانہ اور منازرہ کی حکومتیں اور پھر یمن میں مختلف بادشاہتیں قائم ہوئیں لیکن حجاز وغیرہ میں کہیں بھی کوئی حکومت نہ بنی۔ آئندہ سطور میں انہیں حکومتوں کا ذکر کریں گے تاکہ

اس دور کے سیاسی حالات کا کسی قدر انداز لگایا جاسکے۔

2.3.5.1 جزیرہ عرب کی ریاستیں

جزیرہ عرب کے طبعی حالات اس کو بنیادی طور پر دو حصوں سے تقسیم کرتے ہیں۔ شمال اور جنوب جس کے درمیان میں بہت بڑا صحرا واقع ہے۔ جنوبی علاقہ کے لوگوں نے شہری زندگی اختیار کر لیا تھا اور بڑی بڑی عمارتیں اور قلعہ و برج وغیرہ تعمیر کر لیا تھا۔ یہاں تک ماُرب جیسا بند بھی بنا لیا تھا جس سے وہ سینچائی وغیرہ کا کام لیتے تھے۔ ان کے تجارتی قافلے عرب کے صحرا کو عبور کر کے شام و عراق تک ہندوستان اور افریقہ کا سامان پہنچاتے اور وہاں کا سامان ہندوستان اور افریقہ۔ جب کہ شمال میں واقع نجد و حجاز میں زیادہ تر لوگ بدویانہ زندگی گزارتے تھے اور چارے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے رہتے تھے۔ شام و عراق کے سرحدی علاقوں میں روم و فارس کے اثرات کی وجہ سے مدنی زندگی کے اثرات دکھائی پڑتے ہیں۔ لیکن وہ بہت کم ہیں۔ وہاں چند نیم مختار عرب ریاستیں بہت مشہور ہوئیں جیسے غسانی، حیرہ، اور کندہ کی ریاستیں۔ جنوبی عرب کے بارے میں بہت کم معلومات مہیا تھیں لیکن جب کھدائی ہوئی اور کنائس و قبور پر پائے گئے کتبات کو علمائے لغت نے پڑھنے میں کامیابی حاصل کر لی تو بہت کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔

ان کتبات سے جنوبی عرب کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں محققین کو پتہ چلا وہاں کے مختلف مذاہب، حکومتیں، سیاسی نظام اور بادشاہوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ جنوبی عرب میں پانچ ریاستیں وجود میں آئیں۔ حکومت معین جس کی راجدھانی جوف یمن کا شہر معین تھی۔ اس کے جنوب میں حکومت سبا جس کی راجدھانی مارب تھی۔ سبا کے جنوب مغرب میں حکومت قتبان تھی جس کی راجدھانی تمنع تھی اور قتبان کے جنوب میں اوسانی حکومت تھی حکومت حضرموت وہیں واقع تھی جس کی راجدھانی شبوہ تھی۔“ (ضیف، دکتور شوقی: تاریخ الادب العربی، ج ۱، ص: ۲۷)

2.3.5.2 شمالی ریاستیں:

جزیرہ عرب کی شمالی ریاستوں میں تین بہت مشہور ہیں: غسانی ریاست، ریاست حیرہ (ریاست منازرہ) اور ریاست کندہ۔ غسانی ریاست: غسانہ نے اس ریاست کو مشرقی اردن کے علاقہ میں قائم کیا تھا۔ اس کا بانی جضفہ بن عمرو بتایا جاتا ہے۔ یہ ریاست رومی سلطنت کے زیر اثر اور اس کی باج گزار تھی۔ اس میں جبلہ حارث بن جبلہ وغیرہ مشہور بادشاہ ہوئے ہیں۔ چوتھی صدی عیسوی میں حارث بن جبلہ کے عہد میں اس ریاست نے مجموعی طور سے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اس ریاست کے حکمرانوں نے علم فن اور شعر و ادب کی خوب قدردانی کی۔ نابغہ ذبیانی، اعشی قیس، علقمہ الفحل اور حسان بن ثابت اس کے دربار سے وابستہ تھے۔

ریاست حیرہ: (لحی ریاست/ ریاست منازرہ): غسانہ کی طرح قبیلہ لُحی بھی یمن سے ہجرت کر کے شمال میں آباد ہو گیا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ ریاست ایرانی سلطنت کے زیر اثر تھی اور اس کی باج گزار تھی۔ ریاست حیرہ تہذیب و تمدن سے آراستہ ریاست تھی۔ غسانہ زیادہ متمول، ترقی یافتہ اور شان و شوکت کی حامل تھی۔ اس پر ایرانی مذہب اور تہذیب کا غلبہ تھا۔ یہ ریاست بھی علم فن کے بہت قدردان تھی۔ حارث بن حلزہ الیشکری، عمرو بن کلثوم تغلبی، لبید بن ربیعہ، نابغہ ذبیانی اس کے دربار میں حاضر ہوتے تھے۔

ریاست کندہ: قبیلہ کندہ نے اس ریاست کو غسانی لُحی ریاستوں کے درمیان شمالی نجد میں چوتھی صدی عیسوی میں قائم کیا۔ یہ قبیلہ

یمن سے ہجرت کر کے شمال میں آباد ہو گیا تھا۔ اس کے مشہور حکمران حجر آکل المرار نے نجد کے قبیلہ بکر و تغلب پر قبضہ کر کے اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ اس کا بیٹا حارث بھی بہت مشہور حکمران ہوا جس نے حرب بسوس کی جنگ میں بکر و تغلب کے درمیان صلح کروائی۔ یہ ریاست بھی علم و فن کی سرپرستی کرتی اور شاعروں اور خطیبوں کو خوب نوازتی۔

2.3.5.3 جنوبی ریاستیں:

ریاست معین: یہ ایک مضبوط و مستحکم اور عربوں کی قدیم ترین حکومت تھی جس کا وجود ۱۰۰۰ صدی قبل مسیح میں پایا جاتا تھا۔ اس نے قبتانی اور حضرمی حکومتوں کو فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کر لیا بہت سے معینی کتبات حجاز کے دادان، حجر اور مدائن صالح میں پائے گئے ہیں جن سے شمالی عرب کے ساتھ اس مملکت کے گہرے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔

ریاست سبا: ساتویں صدی قبل مسیح اس سلطنت کے عروج کا زمانہ ہے جب اس نے ریاست معین پر غلبہ حاصل کر لیا اور سارے اہم تجارتی مراکز پر قابض ہو گئے۔ بند بنانے اور آپاشی کے نظام میں اس کو مہارت حاصل تھی جس نے اس علاقہ کو سرسبز و شاداب بنا دیا۔ سد مأرب کا نام تاریخ میں بہت ملتا ہے۔ اس ریاست اور اس کی شادابی کا تذکرہ قرآن میں بھی ہے۔ تجارت کے تباہ ہونے اور سد مأرب کے ٹوٹنے سے یہ ریاست تباہ ہو گئی۔

ریاست حمیر: ریاست سبأ پر قبضہ کر کے اس ریاست کو عروج ہوا۔ اس ریاست کی ابتدا ۱۱۵ ق م میں ہوتی ہے۔ حبشہ کی حکومت نے چوتھی صدی عیسوی کے نصف میں حملہ کر کے اس ریاست پر قبضہ کر لیا جو قبضہ بیس سال تک دراز رہا پھر حمیری ریاست دوبارہ قائم ہو گئی لیکن یہ کمزور ریاست ثابت ہوئی اور شمالی بدو قبائل اس پر حملہ آور ہونے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال کی جانب ہجرت کا سلسلہ جو سد مأرب کے ٹوٹنے سے شروع ہوا تھا اب تیز تر ہو گیا۔ آہستہ آہستہ یہ ریاست عیسائیت اور یہودیت کی کشمکش، اور رومی و سامانی حکمرانوں کی چپقلش کا میدان بن گئی یہاں تک کہ اس کے حکمران باذان اور یہاں کے باشندوں نے اسلام قبول کر لیا اور یہاں اسلامی اقتدار قائم ہو گیا۔

2.3.5.4 حجاز اور اہل حجاز:

شمالی عرب میں حجاز بھی داخل ہے لیکن اس کی دینی و سیاسی اہمیت کے پیش نظر یہاں خاص طور سے اس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ حجاز یعنی مکہ، یثرب (مدینہ)، اور طائف وغیرہ۔ یہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم علاقہ رہا ہے یہاں عام طور سے قبائلی زندگی تھی۔ البتہ قبیلہ قریش اور اس کے مختلف خاندانوں کو یہاں قیادت و سیادت حاصل تھی۔ ایک طرح سے وہ یہاں حکمرانی کر رہے تھے۔ کیونکہ وہ کعبہ کے متولی تھے اور عرب قبائل ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ حج کے محترم مہینوں میں قبائلی جھگڑوں کو حل کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ سد مأرب کے ٹوٹنے کے بعد عرب تجارت اور دوسرے ملکوں سے تجارت میں یمنیوں کی جگہ حجازیوں اور خاص طور سے قریشیوں نے لے لی۔ پھر قریش کے سرداروں نے ایرانی و رومی بادشاہوں اور یمن کے حکمرانوں سے تجارتی معاہدے یا اجازت نامے حاصل کر لیے اس طرح وہ بین العرب اور سرحدی ممالک کی تجارت پر کافی حد تک غالب ہو گئے۔ اسی وجہ سے عربوں میں ان کی قیادت و سیادت تسلیم کی جانے لگی اور ان پر ان کی ایک طرح کی حکومت قائم ہو گئی۔

2.3.6 علمی حالات

دور جاہلی میں عربوں میں جو علوم و معارف پائے جاتے تھے وہ بہت ہی محدود اور ناقص قسم کے تھے۔ یہ ان کے ذاتی تجربات پر مبنی

تھے، ان کی عقلی اور سائنٹفک کوئی بنیاد نہ تھی۔ چنانچہ وہ لکھنے پڑھنے کو اپنے لیے عار اور اپنے حافظہ کے لیے داغ تصور کرتے۔ گھوڑ سواری، تلوار زنی اور شعر و شاعری کرنا بھی ان کا سب سے زیادہ شہرہ تھا۔ شعر و ادب پر گفتگو بعد میں کریں گے البتہ محدود طور پر ہی سہی جو علوم و معارف ان کے یہاں رائج تھے وہ یہ ہیں۔

علم الانساب: (علم نسب نامہ یا شجرہ نسب کا علم) عرب قوم کا ایک طرہ امتیاز یہ بھی تھا کہ وہ اپنا نسب نامہ یاد رکھتی اور اس کو یاد رکھنے کا بڑا اہتمام کرتی۔ جس کی مثال دوسری قوموں میں نہیں ملتی۔ عربوں میں کچھ لوگ باقاعدہ اس کی روایت کرتے اور اپنے بچوں کو بھی یاد کراتے تھے۔ اس میں کچھ لوگوں کو کافی شہرت بھی ملی، انھیں میں سے حضرت ابو بکرؓ بھی تھے۔ وہ علم الانساب کے ماہر مانے جاتے تھے۔ عرب نہ صرف اپنے آباء و اجداد کا شجرہ نسب یاد رکھتے بلکہ اپنے جانوروں جیسے گھوڑوں اور اونٹوں کے نسب نامہ بھی یاد رکھتے تھے۔

علم النجوم (Astrology): عربوں کو صحرا نوردی، تجارتی اسفار اور بارش کے آنے اور رکنے کے اوقات معلوم کرنے وغیرہ ضروریات سے وہ ستاروں کے ڈوبنے، نکلنے اور چلنے اور ثابت رہنے کے اوقات معلوم کرتے۔ اس میں کچھ لوگوں کو کافی مہارت بھی تھی۔ ایک بدوی عورت سے پوچھا گیا کہ: أنتعرفین النجوم؟ قالت: سبحان الله أما أعرف أشباحاً وقوفاً على كل ليلة. یعنی کیا تم ستاروں کے بارے میں جانتی ہو تو اس نے کہا: سبحان الله، کیا میں ان سايوں کو نہیں جانتی جو ہمارے اوپر ہر رات پہریداروں کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔

صاعد بن احمد (المتوفى ۵۳۳ھ) نے لکھا ہے کہ ”عربوں کو ستاروں کا بڑا علم تھا۔ وہ ان کے ڈوبنے اور نکلنے کے اوقات اچھی طرح جانتے تھے۔ سیاروں کا بھی علم تھا۔ انھیں اس سے بارش کا علم ہو جاتا۔ یہ علم انھیں از حد توجہ اور کثرت تجربہ سے حاصل ہوا کیونکہ انھیں اپنی روزی روٹی کے حصول کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ وہ حقائق کے انکشاف یا علوم میں تجربہ کی غرض سے ایسا نہیں کرتے تھے۔“

علم طب: عربوں میں دیگر فنون کی طرح جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے کا فن قدیم زمانہ سے پایا جاتا تھا۔ اس کی بنیاد ان کے تجربات پر تھی۔ جیسے آگ سے سیکائی کرنا۔ اسی طرح مختلف نباتات کے خواص معلوم کر کے ان سے دوا کا کام لینا۔ اسی طرح علم جراحی سے ان کو اچھی واقفیت تھی۔ وہ خراب خون ہڈی کے ذریعہ نکال دیتے۔ اسی کے ساتھ ان میں جھاڑ پھونک اور دیگر خرافات بھی داخل ہو گئی تھیں۔ جیسے وہ کہتے تھے بدروہیں مریض کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ ”بدوی زندگی میں علم طب کی بنیاد زیادہ تر کچھ لوگوں کے محدود تجربات پر منحصر ہوتی ہے۔ اور یہ قبیلہ/خاندان کے بڑے بزرگوں سے وراثتاً منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس میں کچھ صحیح بھی ہوتی ہے البتہ اس کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہوتی۔ اس طرح کا طب عربوں کے یہاں بہت رائج تھا۔ اور اس سلسلے میں بہت لوگ مشہور تھے جیسے حارث بن کلدہ وغیرہ۔“

طب کی ایک شاخ بیطہرہ یعنی طب حیوانات۔ خاص طور پر گھوڑوں اور اونٹوں سے متعلق بیماریوں اور ان کا علاج۔ جیسے اونٹنی کا خارش زدہ ہونا اور اس کے علاج کا طریقہ، گھوڑوں کے پیروں کی بیماری وغیرہ۔ اس میں بھی عربوں کو بڑی مہارت تھی۔

الفراسة و القیافة (Physiognomy / Palmistry): یعنی ریت اور زمین میں نقوش پاکی پہچان کر کے آنے جانے والوں کا پتہ کرنا۔ جانوروں اور دشمنوں کے نقل و حرکت کا پتہ لگانا۔ اس کی بدوی معاشرہ میں خاص ضرورت تھی۔ اس کی مدد سے وہ اپنے ان دشمنوں کا پیچھا

کرتے جوان پر حملہ کرتے اور ان کے مال اور عورتوں کو ان کی غیر موجودگی میں اٹھالے جاتے۔

العیافہ: چڑیوں کے حرکات و سکنات سے شگون لینا۔ اس کے لیے بنو اسد اور بنو لہب بہت مشہور تھے۔ اگر چڑیا دائیں سے گزر جائے تو نیک شگون لیتے اور بائیں سے گزر جائے تو بد شگون لیتے۔ چڑیوں میں خاص طور سے کوئے سے زیادہ شگون لیتے۔

اقوال حکمت اور ضرب الأمثال: (کہاوتیں) حکمت سے مراد یہاں فلسفہ نہیں جو کہ اسلامی دور میں رائج ہوا بلکہ وہ مختصر اقوال جو کسی تجربہ کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے جملے کی شکل میں ظاہر ہوتے۔ جاہظ کا کہنا ہے کہ قدامت میں جن لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے ان کی عظمت، مہارت، فصاحت و بلاغت، حکمت، ذہانت و فطانت کے لیے ان میں لقمان بن عاد، مہاشع بن دارم، سلیط بن کعب بن یربوع، لوئی بن غالب، قس بن ساعدہ اور قسی بن کلاب ہیں۔ اور زبان آور خطیب اور حکم (فیصلہ کرنے والا) کی حیثیت سے جو لوگ مشہور ہوئے ان میں اکثم بن صیفی، ربیعہ بن حذار، ہرم بن قطبہ، عامر بن الظرف اور لبید بن ربیعہ وغیرہ ہیں۔ لقمان حکیم کا عربوں میں خاص چرچا تھا اور ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی حکمت و دانائی کی باتوں کو ایک ”مجلہ“ کی شکل میں کچھ لوگوں نے جمع کیا تھا۔

عربی ادب کی کتابیں ان حکماء کے اقوال سے بھری پڑی ہیں۔ بطور مثال چند اقوال یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ اکثم بن صیفی کا قول ہے ”مقتل الرجل بین فکیہ“ (اردو میں کہتے ہیں یہی زبان پان کھلائے اور یہی جوتا)، اسی طرح عامر بن الظرف کا قول ہے ”رب زارع لنفسه حاصد سواہ“، اسی طرح طرفہ کا ایک شعر ہے:

أرى العیش کزناقصاً کلّ لیلة و ماتنقص الأيام و الدهر ینفد

(میں دیکھ رہا ہوں کہ زندگی وہ خزانہ ہے جو دن و رات کم ہو رہا ہے اور زمانہ بذات خود فنا کی طرف رواں دواں ہے)

اور زہیر بن سلمیٰ کا قول ہے

و مهماتکن عند امرئ من خلیقة و ان خالها تخفی علی الناس تعلم

(کسی انسان کے اندر کوئی بھی خوب ہو اگر چہ وہ یہی سوچے کہ وہ لوگوں سے پوشیدہ رہے گی لیکن ایک دن ضرور لوگوں کو اس کا پتہ چل جائے گا)

اور قس بن ساعدہ

فی الذاہبین الأولین من القرون لنا بصائر

ورأیت قومی نحوها یسعی الأضاغر والأکابر

أیقنت أنى لا محالة حیث صار القوم صائر

(پہلے جانے والے لوگوں میں ہمارے لیے عبرت ہے۔ میں نے دیکھا کہ میری قوم کے سب چھوٹے بڑے دوڑتے ہوئے اس کی

طرف (موت) جا رہے ہیں۔ تو مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے بھی لامحالہ وہیں جانا ہے جہاں میری قوم گئی۔)

ادبی سرمایہ: دور جاہلی میں عربوں کے ادبی سرمایہ کا ذکر یہاں ممکن نہیں۔ اس کے لیے ایک کتاب یا کم از کم ایک الگ مضمون کی

ضرورت ہے۔ عربوں کے ادبی سرمایہ میں خطبے، وصیتیں، کہاوتیں، نصیحتیں اور سب سے اہم چیز شعر و شاعری ہے جس کا لاشعری اور بہت ہی قیمتی

سرمایہ ہمیں ملتا ہے۔ اس دور کا سب قیمتی سرمایہ المعلقات ہے جو آج تک پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔ یہ سات مشہور ترین جاہلی شعرا کے قصائد کا

مجموعہ ہے۔ ان کے نام یہ ہیں: امرؤ القیس، زہیر بن ابی سلمی، النابغہ الذبیانی، الأعمش قیس، عنترہ بن شداد، طرفہ بن العبد، اور عمرو بن کلثوم۔

2.4 عربی زبان کا ارتقا

عربی زبان سامی زبانوں میں سب سے بڑی زبان ہے۔ یہ ہمیشہ ایک زندہ زبان رہی ہے۔ ابتدا میں یہ مختلف لہجات یا بولیوں کی شکل میں رہی۔ مختلف علاقوں میں وہاں کی زبانوں کے اثرات بھی اس پر پڑے۔ لیکن ان میں سے بیشتر زبانیں وقت گزرنے کے ساتھ ناپید ہو گئیں۔ لیکن عربی زبان ترقی کرتی رہی۔ قدیم عربی لہجات / بولیاں جیسے شمودی، لہجانی، صفوی، اور حطی لہجات / بولیاں دھیرے دھیرے ختم ہو گئیں یا یہ کہیے کہ ان کی جگہ دوسری عربی بولیوں قحطانی یا جنوبی لہجہ اور عدنانی یا شمالی لہجہ نے لے لی۔ قحطانی لہجہ یمن میں خوب ترقی کیا یہاں تک کہ وہی مستند زبان سمجھا جانے لگا۔ عدنانی لہجہ حجاز میں خوب پھلا پھولا اور پھر سدآرب کے ٹوٹنے سے یمن میں جو تباہی آئی تو لوگ ادھر ادھر منتشر ہونے پر مجبور ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے حجاز کا رخ کیا اور پھر دونوں لہجات میں کشمکش جاری ہوئی۔ اسی اثناء میں قرآن کریم کا نزول شروع ہوا اور اس طرح حجازی لہجہ دھیرے دھیرے جاری و ساری ہو گیا اور یہی فصیح عربی کہلاتا ہے۔

2.4.1 زبانوں کا خاندان:

عام طور سے دنیا کی تمام زبانوں کو دو خاندانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ہند۔آریائی زبان اور حامی۔سامی زبان پھر ان دونوں خاندانوں کو ذیلی گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایسا ان زبانوں کے کلمات، تراکیب اور اسٹرکچر وغیرہ کے درمیان پائی جانے والی قربت اور مشابہت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔

۱۔ ہند۔آریائی زبان Indo-European Languages: دنیا میں یہ زبانیں سب سے زیادہ رائج ہوئیں۔ یہ زبانیں ہندوستان سے لے کر یورپ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کو آٹھ ذیلی گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں سنسکرت و دیگر ہندوستانی زبانیں۔ اطالوی، یونانی، اور جرمن وغیرہ زبانیں شامل ہیں۔ اس زبان کا وطن اصلی نامعلوم ہے۔ کچھ ترکستان کو اس کا اصل وطن قرار دیتے ہیں تو کچھ لوگ مشرقی یورپ اور بحر بالٹک کے علاقہ کو۔

حامی۔سامی زبان:

اس کو افریقی ایشیائی زبان بھی کہتے ہیں۔ اس زبان کا دائرہ کار ہند آریائی زبان کی طرح زیادہ وسیع نہیں ہے۔ یہ زبان عرب، شمالی افریقہ اور مشرقی افریقہ کے بعض علاقوں میں رائج تھی۔ اس کا بھی اصل وطن نامعلوم ہے۔ اس زبان کو دو ذیلی گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، حامی زبان اور سامی زبان۔ حامی زبان میں مصری، بربری اور کوشیتی زبانیں شامل ہیں اور سامی زبانوں میں آشوری، کنعانی، آرامی اور عربی شامل ہیں۔

اصل سامی زبان:

سامی زبانوں کی اصل کیا ہے اس میں علمائے لغت میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اکثر علمائے آرامی، کنعانی اور عربی زبان میں سے کسی ایک کو اصل قرار دیتے ہیں۔ لیکن دلائل و قرائن عربی کے سلسلے میں زیادہ قوی ہیں۔ ہم چند لوگوں کی آراء کو یہاں پیش کرتے ہیں:

۱۔ احمد حسن زیات: ان العربیة اقرب المصادر الثلاثة الى اللغة الام، لانها بانعزالها عن العالم سلمت مما اصاب غيرها من التطور والتغير تبعاً لحوال العمران (حسن زیات: ۱۵) یعنی عربی زبان مادری زبان سے تینوں مصادر میں سب سے قریب ہے۔ کیونکہ دوسری زبانیں انسانی آبادی میں گردش زمانہ کے ترقی اور تغیر سے جو تبدیلیاں آئیں ان کا شکار ہو گئیں لیکن عربی زبان دنیا سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے ان سے محفوظ رہی۔

۲۔ حنا فاخوری: والثابت ان بین اللغات السامیة قرابة واضحة وانها جميعا وليدة لغة سامیة عامة قديمت وصار من المتعذر علينا ان نعرف شيئاً يذکر منها (حنا فاخوری: ص: ۲۸) یعنی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سامی زبانوں میں ایک واضح قربت ہے۔ ساری زبانیں (عربی کے علاوہ) مٹ گئیں اور ہمارے لیے ان کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات کہنا مشکل ہو گیا ہے۔

۳۔ وإذا نحن اعتبرنا اللغة العربية وجدناها اكثر اخواتها الساميات مفردات واتمها صيغاً واكملها صرفاً ونحواً وارقاها بياناً وبلاغة واحسنها اسلوباً۔ من اجل ذلك لانستبعد ان تكون اللغة العربية هي اللغة السامیة الام الفصحی (عمر فروخ، ص: ۳۶) یعنی جب ہم عربی زبان پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ ملتا ہے کہ اس میں دیگر سامی زبانوں سے زیادہ مفرد الفاظ، اور مکمل صیغے ہیں، اور وہ صرف و نحو کے اعتبار سے زیادہ مکمل اور زیادہ فصیح و بلیغ ہے اور اس کا اسلوب زیادہ خوبصورت ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک یہ بات ناممکن نہیں کہ عربی زبان ہی اصل مادری فصیح سامی زبان ہے۔

اب یہ بات امر مسلم ہے کہ عربی ایک سامی زبان ہے اور پھر قرین قیاس یہ بھی ٹھہرا کہ عربی ہی سامی زبانوں کی اصل اور مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب آئیے عربی لہجات ر بولیوں سے فصیح عربی کے سفر کی کہانی پڑھتے ہیں۔

2.4.2 قدیم عربی بولیاں

ماہرین زبان کو عربی کے چار قدیم لہجات کے نقوش ملے ہیں۔ ان میں سے تین جنوبی خط مسند میں لکھے ہوئے ہیں اور وہ ہیں ثمودی لہجہ، لحيانی لہجہ اور صفوی لہجہ۔ اور ایک آرامی خط میں اور یہ نبطی لہجہ ہے۔

ثمودی لہجہ: قوم ثمود کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ وہ مدائن اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بستے تھے۔ اسی طرح یہ لہجہ طائف، طور سینا، مصر وغیرہ میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ تجارتی پیشہ لوگ تھے۔ ان کے نقوش چھوٹے ہیں۔ اور ان کا خط جنوبی مسند خط سے نکلا ہے۔ علامات، حرکات، زیر، زبر پیش اور تشدید وغیرہ سے خالی ہیں۔ اور تمام نقوش ضمیر غائب میں ہیں۔ وہ بہت سے حروف حذف کر دیتے تھے جیسے این سے نون گرا دیا، لئنا کوئی بنا دیا۔ اس میں آرامی اور عبرانی آثار بھی مل گئے ہیں۔

اگرچہ یہ نقوش جنوبی خط مسند میں ہیں لیکن یہ شمالی عربوں کے نقوش ہیں۔ یہ شمالی عربی زبان ہے چنانچہ ضمائر، اسمائے اشارہ، اسمائے موصولہ، ضمائر اور حروف جر وہی ہیں۔ البتہ کسی اسم کو معرفہ بنانے کے لیے ال کے بجائے ہا کا استعمال کرتے تھے جیسے الکتاب ہلکتاب۔ اسی طرح ثمودیوں اور لحيانیوں فعل ثلاثی سے فعل متعدی بناتے وقت 'ال' استعمال کرنے کا بجائے 'ہا' کا استعمال کرتے تھے مثلاً اکرم اور افلس کو ہکرم اور ہفلس لکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی مثال عبرانیوں اور سہمیوں جیسی ہے۔

لحيانی لہجہ: اس لہجہ کی نسبت بنولحيان کی طرف ہے جو کثرت سے ان کے نقوش میں ملتا ہے۔ سامی زبانوں کے ماہرین کو ان کے

نقوش حجاز کے شمال میں جو اس وقت العلا کے نام سے جانا جاتا ہے، ملے ہیں۔ ان کے نقوش میں بھی وہی ساری مشکلات ہیں جو کہ نمودیوں کے نقوش میں ہیں۔ مثلاً حرکات، اعراب، حروف علت، تشدید وغیرہ کی علامتیں نہ ہونا وغیرہ۔ یہ لوگ معارفہ بنانے کے لیے ال اور ہا دونوں کا استعمال کرتے تھے جیسے نمودیوں کے یہاں رائج تھا۔ اور کبھی کبھی دونوں کو یکجا کر دیتے مثال کے طور پر لہجی کو ھلجی لکھتے۔ اسی طرح افعال کے صیغوں میں ہفعل اور سفعل لکھتے اور فعل ماضی میں تائے تانیث بڑھا دیتے۔ اسی طرح اسمائے اشارہ ذ، ذہ، اور ذات استعمال کرتے تھے۔ ان کے یہاں اسمائے موصولہ من، ما اور ذو تھے جیسا کہ قبیلہ طئیء میں رائج تھا۔ ان کے دیوبی دیوتاؤں میں بلعل، عزلی، مناة، ود وغیرہ کے نام کثرت سے ملتے ہیں۔ اور اپنی کنیت اور نسبت کا اظہار اسی طرح کرتے تھے جیسا کہ فصیح عربی میں رائج ہے۔

صفوی لہجہ: اس لہجہ کی نسبت جبل صفاة کی طرف ہے جو کہ مشرقی حوران، بادیۃ الشام میں پایا جاتا ہے۔ اس کے نقوش نہیں پائے گئے ہیں۔ یہ اس حرہ میں پائے گئے ہیں جو کہ اس کے اور حوران، بادیۃ الشام کے درمیان ہے۔ اس کا خط جنوبی خط مسند سے نکلا ہے جیسا کہ پہلے دونوں لہجات کا معاملہ ہے۔ اس میں جو مشکلات ہیں وہ کثرت مشابہت ہے چنانچہ حرف ’ب‘ مشابہ ’ظ‘، اور ’خ‘ مشابہ ’ت‘ اور ’ل‘ مشابہ ’ن‘ اور ’ھ‘ مشابہ ’ص‘ ہے۔ اور لکھنے والا کبھی دائیں سے بائیں سے لکھنا شروع کرتا اور کبھی اس کے برعکس وہ بائیں سے دائیں لکھتا۔

معارفہ بنانے کے لیے وہ ’ھا‘ کا استعمال کرتے ہیں، ایسے بہت ہی کم اسماء ملے ہیں جو ’ال‘ سے معارفہ ہوں۔ یہ صفت کی طرف موصوف کو مضاف کرتے تھے جیسے وہ الجبل الاحمر کہنے کے بجائے جبل الاحمر کہتے۔ اسی طرح اسم اشارہ، مشار الیہ کے بعد لاتے، اس سے پہلے نہیں لاتے جیسے ہذا الکتاب کے بجائے الکتاب ہذا، چنانچہ وہ لکھتے ’’جو، ذ‘‘ ای ہذا الوادی جیسے مصری عامیہ (دیہاتی) ’’انہاردا‘‘ بولتے ہیں بجائے ہذا انہار کے۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ وہ قبیلہ طئیء کی طرح ذو کا استعمال بطور اسم موصول کرتے، اس کی مشہور مثال ہے ’’بثری ذو حفرت و ذو طویت‘‘ ای الذی حفرت و الذی طویت۔

نبطی لہجہ: یہ لہجہ بلاد شام میں رائج تھا۔ یہ دراصل آرامی زبان سے آیا۔ اسی طرح نبطی خط جو بعد میں عربی خط کے لیے بنیاد بنا، آرامی خط سے آیا۔ اس میں اور دیگر قدیم عربی لہجات میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ اس لہجہ میں حرف ’ز‘ کو ’س‘ سے بدل دیتے تھے جیسے زورق کو سورق لکھتے۔ اسی طرح عین کو ھمزہ میں اور کسرہ جہاں ہو اس کو فتح میں بدل دیتے۔ ’ز، ر، و، ا‘ کو الگ الگ لکھتے یعنی بائیں طرف کسی حرف سے ملا کر نہیں لکھتے جیسا کہ آج بھی لکھا جاتا ہے۔ نبطی میں آسان افعال استعمال کرتے جیسے ’ع، ب، د‘ بمعنی ’عمل‘ (کام کرنا) یا فعل مضارع ی ک ت ب بمعنی یکتب (وہ لکھتا ہے) وغیرہ۔

2.4.3 قحطانی اور عدنانی عربی:

سامی زبانوں کو مشرقی و مغربی زبان میں تقسیم کیا جاتا ہے مشرقی زبان میں اکادی زبانیں جیسے بابلی، آشوری زبانیں شامل ہیں۔ مغربی زبان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مغربی شمالی اور مغربی جنوبی۔ مغربی شمالی میں کنعانی و آرامی زبانیں ہیں۔ کنعانی زبان کئی زبانوں اور فنیقی لہجات کا مجموعہ ہے جو لبنان کے ساحلی علاقوں میں پائی جاتی تھی۔ کنعانی زبان کو اوجریتی، کنعانی قدیم، مؤابی، عبری قدیم اور فنیقی زبانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مغربی جنوبی زبانوں کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ شمالی عربی زبان جس کو حمیری زبان بھی کہتے ہیں اور جنوبی عربی زبان جو

جزیرہ عرب کے علاقہ یمن، عمان اور افریقہ کے بعض ساحلی علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ جنوبی عربی کو قحطان کی طرف نسبت کر کے قحطانی زبان بھی کہا جاتا ہے اور شمالی زبان کو عدنان کی طرف نسبت کر کے عدنانی زبان کہا جاتا ہے۔ جنوبی زبان اشتقاق، تصریف، اعراب اور ضما و غیرہ میں شمالی زبانوں سے مختلف ہے۔ اسی لیے ابو عمرو بن العلاء کہتا ہے: 'ما لسان حمیر بلساننا ولا لغتھم بلغتنا' یعنی حمیر کی زبان ہماری زبان نہیں ہے اور نہ ہی ان کا لہجہ ہمارا لہجہ ہے۔"

جنوبی عربی میں معینی، سبئی، حضرمی، قتبان، اور حبشی زبانیں شامل ہیں جب کہ شمالی عربی میں لحيانی، ثمودی، صفدی اور فصیح عربی زبانیں شامل ہیں۔ جنوبی عربی پر اکادی زبانوں کا اور شمالی عربی پر عبری و نبطی کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔

یمن میں سد ارم کے ٹوٹنے کے بعد جنوبی عرب کے قبائل نے شمال کی طرف ہجرت کرنا شروع کر دیا اور انھوں نے جلد ہی شمال میں اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ اس طرح شمال و جنوب کے درمیان تجارت کے ساتھ ساتھ سیاسی تعلقات بھی قائم ہو گئے۔ جس سے شمالی عربی اور جنوبی عربی کو قریب آنے کا موقع ملا، الفاظ، جملے، لہجے اور اسالیب میں قربت پیدا ہونے لگی لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ان میں سے کوئی زبان بھی دوسری زبان پر غالب نہ آسکی غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ جنوبی زبان کو بولنے والے لوگ سیاسی و معاشی اعتبار سے بہت طاقتور تھے تو دوسری طرف شمالی زبان بولنے والے لوگ بدویانہ زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن جلد ہی گردش ایام نے حالات کو بدل دیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں جنوبی عرب کے قبائل سے اقتدار و ثروت کی ڈور پھسل گئی اور شمالی قبائل طاقت ور ہو گئے اور سیاسی و لغوی اعتبار سے ان پر غالب آ گئے۔ حسن زیات شمالی عربی کا جنوبی عربی پر غالب آنے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اخذت دولة الحميرین تدول و سلطانهم یزول بتغلب الاحباش علی الیمن طورا و تسلط الفرس علیہ طورا آخر۔ وکان العدنانیون علی نقیض هؤلاء تنهياً لهم أسباب النهضة والألفة والوحدة والاستقلال، بفضل الأسواق والحج، و منافستهم للحميریین والفرس، واختلاطهم بالروم والحبشة من طریق الحرب والتجارة ففرضوا لغتهم وأدبهم علی حمیر الذلیلة المغلوبة۔ ثم جاء الاسلام فساعد العوامل المتقدمة علی محو اللهجات الجنوبية و ذهاب القومية الیمنية، فاندثرت لغة حمیر و آدابهم و اخبارهم حتی الیوم“ (حسن زیات: ۱۵) یعنی حمیریوں کی حکومت ڈانوا ڈول ہو گئی اور ان کی سلطنت زوال پذیر ہو گئی۔ کبھی حبشیوں کے ان پر غلبہ کی وجہ سے اور کبھی فارسیوں (ایرانیوں) کے۔ ان کے برعکس عدنانیوں کے اٹھان، ان میں یگانگت، اتحاد اور خود اختیاری کے اسباب مہیا ہوتے رہے۔ بازاروں اور حج، اور ان کی ایرانیوں اور حمیریوں سے مقابلہ آراء، اسی طرح رومیوں اور حبشیوں سے جنگ اور تجارت کی وجہ سے اختلاط بڑھا تو انھوں نے حمیریوں جو اس وقت مغلوب اور کمزور ہو چکے تھے پر اپنی زبان اور ادب تھوپ دیا و مسلط کر دیا۔ پھر اسلام کی آمد نے مذکورہ عوامل کو اور ہمیز دی جس سے جنوبی لہجات ختم ہونے لگے اور یعنی قومیت بھی مٹنے لگی۔ اس طرح حمیریوں کی زبان اور ان کا ادب اور ان کے قصے سب فنا ہوتے گئے۔“

جنوبی عربی پر غلبہ کے ساتھ ساتھ قدرت نے شمالی عربی کو کئی سارے عوامل مہیا کیے جس نے اس زبان کو مزید صیقل کرنے کا موقع فراہم کیا۔ تین اہم عوامل نے شمالی یا عدنانی عربی کے غلبہ کی راہ میں بنیادی کردار ادا کیا۔

عرب کے بازار: پورے عرب میں سال کے مختلف موسم میں کچھ متعین دنوں میں بازار لگتے۔ اس میں مختلف قبائل جمع ہوتے اور خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ لسانی تبادلے بھی کرتے۔ ان میں تین بازاروں کا خاص ذکر ملتا ہے: عکاظ، مجنہ اور ذوالحجاز۔ عکاظ میں تو سارے عرب سے لوگ جمع ہوتے اور یہاں سالانہ میلہ لگتا جس میں ایک شعری محفل منعقد ہوتی اور شعرا میں سے ایک معمر، قابل ثقہ اور زبان و شعر میں مہارت رکھنے والے شاعر کو حکم راج بنایا جاتا۔ وہ سب کے قصائد سننے کے بعد کسی ایک قصیدہ کو سال کا بہترین قصیدہ قرار دیتا پھر اس کی پورے عرب میں شہرت ہو جاتی۔ اس طرح شعر و شاعری اور عربی زبان خوب پروان چڑھتی۔

مکہ مکرمہ: یہ سب عربوں کا مشترکہ عبادت خانہ تھا۔ وہ ہر سال حج کے مہینے میں یہاں حج کے لیے آتے۔ عبادت کے ساتھ ساتھ وہ تجارت بھی کرتے اور آپسی جھگڑے اور لڑائیوں کا نپا رہ بھی کرتے۔ اس میں زبانوں کا تبادلہ وسیع پیمانے پر ہوتا۔

قریش مکہ: مکہ کے قبائل میں سب سے مشہور اور بااثر قبیلہ قریش کا تھا۔ انھوں نے تجارت میں کافی ترقی کی اور عرب کی تجارت پر چھا گئے۔ وہ مشرق میں ایران اور سند کے ساحلوں تک اور مغرب میں شام کی سرحدوں تک تجارت کرتے۔ اس سے ان کے تعلقات عرب کے مختلف علاقوں کے قبائل کے ساتھ ساتھ ہمسایہ ملکوں سے بھی استوار ہو گئے۔

قریش ہی کا قبیلہ خانہ کعبہ کی دیکھ رکھ کرتا۔ حاجیوں کو پانی پلانا، ان کے کھانے کا انتظام کرنا اور حج میں ان کی رہنمائی کرنا حتیٰ کہ قبائلی جھگڑوں میں ثالثی اور صلح کراتا۔ اس طرح تجارتی اور دینی سیادت و قیادت نے ان کے زبان و بیان کو قوت اور وسعت بخشی۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے لہجے کو قبولیت اور رواج ملا۔

2.4.4 قرآن کریم کا نزول:

جنوبی اور شمالی عربی کے درمیان یہ کشمکش جاری تھی کہ اسی دوران حضرت محمد ﷺ پر قرآن کا نزول شروع ہوا۔ آپ کا تعلق قریش سے تھا۔ قرآن نے قریش کی زبان یا شمالی عربی پر گویا مہر لگا دی پھر اسلام کا اقتدار جس قدر بڑھتا گیا یہ زبان دین اسلام اور حکومت و سلطنت کی زبان بنتی گئی اور اختلاف کی صورت میں قرآن کی زبان حکم اور فیصلہ ہو گئی۔ یہی نہیں بلکہ عربی زبان، مفردات اور مرکبات، عربی صرف و نحو، معانی و بلاغت سب کے لیے سند اور مرجع قرآن کی زبان بن گئی۔ اس طرح سے قرآن نے عربی کے لہجات کو متحد کرنے میں عظیم کردار ادا کیا۔ اور اسے پائیداری، استحکام اور ابدیت عطا کی۔

2.4.5 زبان، لہجہ: تعریف اور فرق

زبان کی تعریف: عربی لفظ لغت کے معنی زبان کے ہیں۔ متقدمین اور متاخرین علمائے لغت نے زبان کی تعریف اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ خلیل بن احمد فراہیدی نے ”کتاب العین“ میں زبان کی تعریف یوں کی ہے ”اختلاف الکلام فی معنی واحد“ یعنی ایک معنی کو مختلف انداز سے ادا کرنا۔ ابن حاجب نے کہا ”حد اللغۃ کل لفظ وضع لمعنی“ یعنی زبان کی تعریف یہ ہے کہ ہر لفظ کو اس معنی میں استعمال کرنا جس کے لیے اس کو وضع کیا گیا ہے۔ پھر ایک اور ماہر لسانیات ابن جنی نے زبان کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا: ”حد اللغۃ أصوات یعبّر بها کل قوم عن أغراضهم“ یعنی زبان کی تعریف یہ ہے کہ یہ ان آوازوں کا نام ہے جن کے ذریعہ ہر قوم اپنے مقاصد بیان کرتی ہے۔ اس میں ابن جنی نے

تین خاص باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے زبان اصوات یعنی آوازوں کا نام ہے۔ یہ انسانوں کے درمیان اظہار کا وسیلہ و ذریعہ ہے، اور اس سے سماجی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔ اسی چیز کو ابن خلدون نے ذرا اور کھول کر بیان کیا اور زبان کی تعریف یوں کی ”اعلم أن اللغة في المتعارف هي عبارة المتكلم عن مقصوده، وتلك العبارة فعل لسانی ناشئ عن القصد بافادة الكلام فلا بد أن تصير ملكة متقررة في العضو الفاعل لها وهو اللسان وهو في كل أمة بحسب اصطلاحاتهم“۔ زبان نام ہے اس عبارت کا جو متکلم اپنے مقصود کو بیان کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے اور یہ عبارت عضو زبان سے ارادۂ صادر ہونے والے اس عمل کا نام ہے جس کا مقصد کلام ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ عمل کرنے والے عضو میں یہ ملکہ (قوت گویائی) پائی جاتی ہو اور اس کا نام زبان ہے اور یہ ہر قوم میں ان کی اپنی اصطلاح کے مطابق ہوتی ہے۔

ابن خلدون کی تعریف کے بعد کسی اور نے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ مغربی ماہرین زبان میں سے یسبرن زبان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے ”زبان کو کان اور زبان (عضو) کے ذریعہ دیکھا جاتا ہے نہ کہ آنکھ اور قلم سے“۔

دائرة المعارف برطانیہ میں لکھا ہے۔ ”زبان صوتی رموز کے نظام کا نام ہے“۔ اسی سے ملتی جلتی تعریف دی ساسور (De Sussure) نے کی ہے ”زبان ایک منظم لسانی علامتوں کے مجموعہ کا نام ہے جو ایک خاص ترتیب سے ہوتے ہیں۔ ان کے وضع کرنے کا مقصد باہمی ابلاغ اور افہام و تفہیم ہوتا ہے۔“

اللہجہ: خلیل بن احمد فراہیدی نے لہجہ کی تعریف یوں کی ہے ”اللہجہ طرف اللسان، ويقال جرس الكلام“۔ لہجہ زبان کے کنارے کو کہتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لہجہ کلام کی جھنکار کا نام ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے ”فصح اللہجہ“، اس کا لہجہ فصیح ہے۔ اور لہجہ اس زبان کو کہتے ہیں جو انسان کی فطرت میں داخل ہوگئی پھر اس کی عادت بن گئی اور پھر اسی میں وہ نشوونما پایا۔“

عربی لغت میں لہجہ زبان کی ادائیگی کے طریقہ یا بولنے کے طریقہ کا نام ہے یا کلام کی آواز اور اس کی نغسگی کا نام لہجہ ہے۔ جدید ماہرین زبان نے لہجہ کی تعریف یوں کی ہے کہ یہ دراصل ان صفات یا خصوصیات کا نام ہے جس سے کوئی ماحول (علاقہ) زبان یا بولنے کے طریقے میں دوسرے سے نمایاں و ممتاز ہوتا ہے۔ دور جدید کے ایک ماہر لسانیات ڈاکٹر علی عبدالواحد وانی نے لکھا ہے کہ عربی زبان سارے عرب اقوام کی زبان ہے، لیکن اس زبان کی تطبیق ایک ملک سے دوسرے ملک میں مختلف ہوتی ہے حروف کی آواز، اور ان کی صفات مختلف ہوتی ہے تنفیم، ترقیق اور امالہ وغیرہ میں یعنی کسی حرف کو کہیں کھینچ کر بولتے ہیں کہیں ہلکی نرم آواز سے اور کہیں امالہ کرتے ہیں چنانچہ مصریوں کے بولنے کا طریقہ (کیفیت) مغارہ (عرب افریقی باشندوں)، عراقیوں سے مختلف ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

لہجہ کے یہ معنی قدیم زمانے میں رائج نہیں تھا۔ یہ تو ہر قوم کی زبان کی جھنکار اور اس کی مادری زبان کے طریقہ استعمال کا نام تھا۔ لیکن عربی کتابوں میں عربی لہجات کے عنوان سے مباحث ضرور ملتے ہیں مثلاً قبیلہ تمیم کا عنعنہ، اور قبیلہ ربیعہ کا کشکشہ وغیرہ۔ انہیں وہ لہجہ کے بجائے زبان کہتے تھے جیسا کہ کتاب العین میں خلیل احمد نے لکھا ہے ”النجع: الخبء فی لغة تمیم یجعلون بدل الهمزة عینا“، یعنی خبء کو قبیلہ تمیم کی زبان میں خنج ہمزہ کے بجائے عین سے بولا جاتا تھا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قدیم زمانے میں لغتہ فلان جب بولتے تھے تو اس سے مراد ان کی زبان یا جس کو ہم ان کا لہجہ کہیں مراد ہوتا تھا جیسا کہ ابو عمر و بن العلاء کہتا ہے ”ما لسان حمیر بلساننا ولا لغتہم بلغتنا“ یعنی حمیر کی زبان ہماری زبان نہیں ہے اور نہ ہی ان کا لہجہ ہمارا لہجہ ہے، یعنی ہماری زبان اور حمیر کی زبان میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب کہ دونوں ہی عربی زبان ہیں بس لہجہ کا

فرق تھا۔ بعض حروف کی ادائیگی، بولنے کا طریقہ، کسی حرف کو کسی اور حرف سے بدل کر بولنا۔ یہ دراصل مختلف قبائل میں رائج لہجات یعنی بولیاں تھیں۔

دور جدید میں اللہجہ کے وہی معنی ہیں جو اردو زبان میں لہجہ کے ہیں۔ یہ وہی ہے جس کو انگریزی میں Accent کہتے ہیں جب کہ قدیم زمانے میں یہ بولی کے معنی میں تھا جسے Dialect کہتے ہیں۔ ڈاکٹر مازن مبارک مجمع اللغة العربیة، دمشق کے بانی ممبر اور ایک ماہر لسانیات نے اپنے ایک خصوصی لیکچر بعنوان الفرق بين اللغة واللهجة في اللغة، اللهجة العامية (زبان، لہجہ اور عامیہ) کی بڑی خوبصورت تشریح کی ہے۔ ڈاکٹر مازن کہتے ہیں کہ زبان وہ ہے جس سے لوگ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور عامیہ سے بھی لوگ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ تو پھر لہجہ کیا ہے؟ لہجہ صرف اور صرف ایک صوتی صفت ہے۔ مثال کے طور پر اگر جاحظ کی کتاب البیان والتمییز کا ایک صفحہ ایک مصری، ایک عراقی، ایک جزائری اور ایک شامی کو دے دیجیے یہ سب فصیح عربی پڑھیں گے۔ لیکن ان میں سے ایک الف کو امالہ کے ساتھ، اور دوسرا میم کو مرقق اور تیسرا تنغیم کے ساتھ پڑھے گا۔ ایک اور مثال لیجیے ایک المانیا کو بھاری آواز سے، دوسرا المانیا کو باریک آواز سے اور اسی طرح جاپان کو، لفظ وہی رہا، معنی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ صرف اس کو بولنے اور اس کی آواز میں تبدیلی ہوئی۔ چنانچہ لہجات مختلف ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ”اللهجة عبارة من مجموع أو مجموعة صفات صوتية للغة من اللغات في بيئة من البيئات هذا الذي نسميه اللهجة“ یعنی کسی ماحول میں پائی جانے والی کسی زبان کے کچھ صوتی صفات کے مجموعہ کا نام لہجہ ہے۔ ڈاکٹر مازن نے زبان کو ایک زندہ شے بتایا ہے جس میں وقت اور حالات سے تبدیلی آتی رہتی ہے۔ کل کچھ الفاظ رائج تھے آج ان میں سے کچھ متروک ہو گئے اس کی مثال بالکل انسان کی طرح ہے آج سے کچھ سالوں پہلے ہم ایک الگ طرح کا لباس پہنتے تھے۔ وہ کپڑا الگ تھا، اس کا طرز الگ تھا پھر ہم نے ایک دوسرے طرح کے کپڑے پہننے شروع کیے اور آج ہم ایک نئے طرز کا کپڑا پہنتے ہیں لیکن حضرت انسان وہی ہے زبان وہی، کپڑے اس نے بدل لیے۔ زبان وہی ہے اس نے کچھ اپنے الفاظ اور کچھ کے معانی میں تبدیلی کر لی لیکن بقیہ سب وہی ہیں مثال کے طور پر امر و القیس کے شعر میں استعمال الفاظ

قفانبك من ذكرى حبيب و منزل × بسقط اللوى بين الدخول فحول

اس شعر میں قفا، قف، قفی، قفا، قفوا (ٹھہرو، رکو) آج بھی اسی معنی میں مستعمل ہے۔ اسی طرح بک بکی، بکاء (رونا)، ذکرى، ذکر بید کر (یاد کرنا) حبیب حب سحب (پیارا) وغیرہ۔ جہاں تک جگہوں کے نام جیسے سقط اللوى، الدخول اور حول کا ذکر ہے تو آج ہم اپنے شہر اور ملک کے مختلف جگہوں کے نام نہیں جانتے تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے اور یہ بدلتے رہتے ہیں۔

عامیہ: یہ بھی زبان ہے اور اس کا بھی موقع محل ہے۔ ہر جگہ الگ الگ ہے ایک عرب بھی دوسرے جگہ کی عامیہ نہیں بول سکتا ہے، نہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر مازن علم نحو کے ایک بڑے عالم اور ماہر لسانیات ہیں، عربی ان کی مادری زبان ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں مختلف ملکوں میں رہا، مصر، کویت، امارات، سعودی عربیہ وغیرہ وغیرہ لیکن اماراتی جس عامیہ میں بولتا ہے میں نہیں سمجھتا، سوڈانی یا جزائری جس عامیہ میں بولتا ہے میں نہیں سمجھتا۔

عامیہ کو الدر جتہ بھی کہتے ہیں۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اس کو دیہاتی زبان کہیں یا بولی کہیں۔ یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہے یہ روزمرہ کی عوامی زبان ہے اور ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ جزائر کی سڑکوں پر بولی جانے والی عامیہ، مصر کی سڑکوں پر نہیں سمجھی جاتی ہے۔

امارات کی گلیوں میں بولی جانے والی عامیہ یمن میں نہیں سمجھی جاتی۔ اس کے بالمقابل العربیۃ الفصحیۃ یا الفصحی ہے یعنی فصیح عربی ہے۔ ڈاکٹر مازن کہتے ہیں فصیح عربی وہی نہیں جو امرؤ القیس، زہیر، اعشی وغیرہ شعرا کے یہاں ہم دیکھتے ہیں۔ فصیح کلام وہ ہے جو عربی حروف سے بنایا گیا ہو، عربی اسلوب پر ہو، اور عربی قواعد کے مطابق ہو، وہ فصیح عربی ہے۔ چنانچہ آج ہم اور آپ جو اخبارات پڑھتے ہیں چاہے مراکش سے شائع ہو رہے ہیں یا سعودی عربیہ سے۔ اسی طرح ریڈیو اور ٹی وی کی نشریات جو ہم سنتے ہیں وہ سب فصیح عربی ہے۔

مذکورہ بالا گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ زبان ایک منظم کلام کے مجموعہ کا نام ہے جس کا مقصد افہام و تفہیم اور ابلاغ و تبلیغ ہوتا ہے۔ اللہجۃ قدیم زمانے میں زبان کے مترادف کے طور پر بھی بولا جاتا تھا اور بولی daialect کے معنی میں بھی بولا جاتا تھا۔ اس طرح اللہجات العربیۃ القدیمۃ کے معنی قدیم عربی بولیاں ہیں۔ بولی اور زبان کا فرق یہ ہے کہ بولی ایک محدود علاقے میں بولی جاتی ہے، گرامر کی پابندی ضروری نہیں، الفاظ کو بھی کبھی توڑ مروڑ کر بولا جاتا ہے۔ جب کہ زبان کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، گرامر کی پابندی ضروری ہے اور الفاظ کو توڑ مروڑ کر بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

دور جدید میں لہجہ کا معنی accent کے ہیں۔ یعنی کسی لفظ کے بولنے کا انداز، طریقہ یا اسلوب۔ عامیہ: دیہاتی زبان یا عوامی زبان جس میں کسی قاعدہ و قانون کی پابندی نہیں کی جاتی۔ ہر علاقے کے لوگ اپنی سہولت کے لحاظ سے اپنی مادری زبان کو جیسے چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔ اس میں ان کا اپنا لہجہ، اسلوب اور طریقہ نطق یا ادائیگی بالکل منفرد اور الگ ہوتی ہے۔

2.5 عربی رسم الخط

عربی زبان کی طرح عربی رسم الخط کے آغاز و ارتقا کی تاریخ بھی ماضی میں گم ہے۔ حال ہی میں بعض عرب علاقوں کی کھدائی میں کچھ کتبات اور نقوش دستیاب ہوئے ہیں جو تھوڑا بہت نفس مضمون پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کو بنیادی بنا کر محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ موجودہ عربی رسم الخط سے پہلے عربوں میں بنیادی طور پر دو رسم الخط رائج تھے جو امتداد زمانہ کے ساتھ ترقی کر کے موجودہ رسم الخط کی صورت میں نمودار ہوا۔

۱۔ خط مسند معینی، ۲۔ خط آرامی

خط مسند معینی: اس کا تعلق جنوبی عرب سے ہے جو تقریباً ۳۰۰ ق م میں جزیرہ پایا جاتا تھا۔ اس کو جزیرہ عرب کا سب سے قدیم رسم الخط مانا جاتا ہے۔ خط مسند معینی سے کچھ ذیلی رسم الخط پیدا ہوئے جیسے خط حمیری (خط سبئی) جو جنوبی عرب میں رائج ہوا اور خط شمودی، لحيانی اور صفوی خطوط جن کو شمالی عرب کے لوگوں نے اپنا یا بیشتر لحيانی کتبات العلاء کے مقام پر پائے گئے ہیں جن کا تعلق پہلی صدی عیسوی سے ہے۔ شمودی کتبات العلاء، خیبر، الجوف وغیرہ مقامات پر دریافت ہوئے ہیں اس میں سے ایک کتبہ ۱۰۶ ق م کا ہے۔ صفوی کتبات زیادہ تر جبل صفا کے علاقہ میں پائے گئے ہیں۔ سیاسی اور معاشی اور تہذیبی اعتبار سے جنوبی اقوام شمالی اقوام سے زیادہ طاقتور تھیں۔ اس لیے شمالی عرب کا جنوب سے متاثر ہونا ایک فطری امر تھا چنانچہ شمودی لحيانی اور صفوی رسم الخط کو شمال میں فروغ حاصل ہوا۔ خط مسند اور اس کے ذیلی خطوط آہستہ آہستہ ختم ہو گئے اور ان کی جگہ آرامی خط نے لے لیا۔

خط آرامی۔ خطی

شمالی عرب میں نبطی قوم جو خالصتاً عرب تھی اور عربی بولتی تھی، آرامیوں کو شکست دے کر ایک عظیم الشان ریاست قائم کر لیا اور الحجز کو راجدھانی بنایا۔ نبطی قوم سیاسی بالادستی کے باوجود آرامی رسم الخط سے مرعوب ہو کر اس کو اختیار کر لیا اور حسب موقع اس میں حذف و اضافہ کر کے اس کو خط آرامی نبطی کی شکل دے دیا۔ اس کو کبھی کبھی خط آرامی اور کبھی خط نبطی بھی کہا جاتا ہے۔ جب رومیوں نے اس سلطنت پر قبضہ کر لیا تو نبطی قوم حجاز و نجد کے علاقہ میں ہجرت کر کے آباد ہو گئی۔ وہ اپنے ساتھ خط نبطی کو بھی لائی تھی جس کو عربوں نے آہستہ آہستہ اختیار کر لیا اور خط مسند معینی اور اس کے ذیلی رسم الخطوط حمیری، ثمودی، لحيانی اور صفوی ماضی کا حصہ بن کر رہ گئے۔ موجودہ عربی رسم الخط اسی خط آرامی نبطی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ چنانچہ شوقی ضیف لکھتے ہیں کہ جب نبطیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور وہ نجد و حجاز میں پھیل گئے تو عرب شیوخ اور سرداروں نے نبطیوں کے خط کو اپنالیا اور لحيانی، ثمودی اور صفوی رسم الخط کو ترک کر دیا اور جلد ہی یہ آرامی نبطی رسم الخط ترقی کر کے عربی رسم الخط کی شکل میں ظاہر ہوا جس میں قرآن اور اسلامی مؤلفات لکھے گئے۔ (شوقی ضیف: ۳۴)

سب سے قدیم کتبہ حوران میں نمارہ کے مقام پر امرؤ القیس بن عمرو کی قبر پر پایا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خط آرامی نبطی شمالی عربی کے حروف کی شکل میں ڈھلنے لگے تھے اور یہ کتبہ ۳۲۸ عیسوی کا ہے۔ لیکن واضح عربی خط کو سب سے پہلی مرتبہ دو کتبات میں پایا گیا۔ ایک زبد کے کھنڈرات میں اور دوسرا قرآن اللجا میں۔ پہلا کتبہ مسیحیت سے متعلق سریانی، یونانی اور عربی زبان میں تھا جو ۵۱۳ء/۵۱۲ء کا تھا۔ اس میں آرامی نبطی رسم الخط اور عربی رسم الخط آپس میں مدغم ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ دوسرا کتبہ حران اللجا کے کنیہ کے دروازہ پر پایا گیا تھا جو یونانی اور عربی زبان میں لکھا گیا تھا۔ جو ۵۶۸ء کا تھا۔ یہ دونوں ہی کتبات نقطہ اور اعراب سے خالی تھے۔ (حنافا خوری: ۳۴)

2.6 اکتسابی نتائج

عربی زبان سامی زبانوں میں سب سے اہم زبان ہے۔ اس کا مسکن جزیرہ عرب ہے۔ اس زبان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جب سے وجود میں آئی کبھی مردہ نہیں ہوئی۔ ہمیشہ ایک زندہ زبان رہی۔ آج دنیا کے ۲۲ ملکوں کی سرکاری زبان ہے اور اقوام متحدہ کی چھ دفتری زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس کے نشوونما کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ اس کو جاننے کے لیے سب سے پہلے ہمیں جزیرہ عرب کے قدیم زمانے میں دور جاہلی کے جزیرہ عرب میں بسنے والی عرب قوم کے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور علمی حالات سے واقف ہونا ناگزیر ہے۔

عرب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ عرب کے معنی فصیح اللسان، زبان دان، اور دوسرے معنی صحرا اور ریگستان کے ہیں۔ یہ دونوں ہی درست ہیں کیونکہ عرب اپنے آپ کو دنیا کی ساری قوموں کے بالمقابل زبان داں سمجھتے تھے۔ اور پھر چونکہ عرب کا بیشتر حصہ صحرا اور ریگستان پر مشتمل ہے اس لیے یہ دوسرا معنی بھی صحیح ہے۔

عرب کا جغرافیہ: عرب کو جزیرہ نما عرب کہتے ہیں کیونکہ یہ تین طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے۔ مغرب میں بحیرہ قلزم اور بحیرہ روم ہے، مشرق میں بحر ہند، خلیج فارس اور بحر عمان، جنوب میں بحر ہند، شمال کے حدود بہت مختلف ہیں بعض جغرافیہ داں شام تک اس کے حدود کو وسعت دیتے ہیں۔

قدیم زمانے یا دور جاہلی میں جزیرہ نما عرب: حجاز (مکہ، مدینہ (یثرب)، طائف وغیرہ)، نجد، بحرین، یمن، تہامہ، شحر،

ظفار، اور حضرموت پر مشتمل تھا۔ لیکن آج کل جزیرہ عرب کا اطلاق سعودی عرب (حجاز)، یمن، عمان، اردن، متحدہ عرب امارات، کویت، قطر اور بحرین پر ہوتا ہے۔

عرب دنیا کی آب و ہوا گرم و خشک ہے۔ کچھ جگہوں جیسے یمن یا طائف وغیرہ میں قدرے بہتر ہوتی ہے۔

جزیرہ عرب میں بہت سے پہاڑ اور وادیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان میں جبال السراة، جبال حجاز، حرات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک صحرا اور ریگستان کا تعلق ہے تو ان میں الربع الخالی سب سے بڑا ریگستان ہے۔ پھر النفوذ، الدھناء، بادیتہ الشام وغیرہ آتے ہیں۔ جزیرہ عرب کی کچھ وادیوں کے نام یہ ہیں: وادی الرممہ، وادی الدواسر، وادی حضرموت، وادی سرحان، وادی نجران، وادی عقیق اور وادی القری وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

عرب دنیا میں جنگلات تو نہیں پائے جاتے البتہ کھجور کے درخت بہت کثرت سے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ، بول، بیری اور پیلو کے درخت بھی ہوتے ہیں۔ کچھ علاقوں میں انار، انگور اور سیب وغیرہ کے بھی درخت ہوتے ہیں۔ یہاں کے جانوروں میں اونٹ سب سے عمدہ اور کارآمد جانور ہوتا ہے۔ عربی گھوڑا بھی بہت شہرت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ بھیڑ بکری، ہرن، نیل گائے، خچر، گدھا، شیر، چیتا، لومڑی، بھیڑیا، بندر یا گائے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پرندوں میں کبوتر، فاختہ، شکرہ، عقاب، اور کوا وغیرہ جانے جاتے ہیں۔

عرب اقوام کو مورخین نے عرب باندہ، عرب عاربہ اور عرب مستعربہ میں تقسیم کیا ہے۔ یہ اقوام جزیرہ عرب کے مختلف حصوں میں پھیلیں پھولیں۔ کچھ حصوں میں حکومتیں اور بادشاہتیں بھی قائم ہوئیں جیسے یمن میں بہت سی بادشاہتیں قائم ہوئیں۔ اسی طرح سرحدی علاقوں میں منازرہ اور غسانہ کی بادشاہتیں قائم ہوئیں۔ عرب کے بیشتر حصوں میں قبائلی زندگی گزارتے تھے۔ حجاز میں بسنے والے زیادہ تر بدویانہ زندگی گزارتے تھے اور یمن میں شہری تھی۔ شمالی عرب میں بسنے والوں کا پیشہ تجارت اور زراعت تھا۔ اسی طرح یمن میں بسنے والوں نے زراعت اور تجارت دونوں میں بہت ترقی کی۔ عربوں میں ایک بڑا طبقہ گلہ بانی پر اپنا گزر بسر کرتا تھا۔ کچھ سیر و شکار بھی کرتے۔ عرب سماج میں عورتوں کو بہت اچھا مقام حاصل تھا۔ وہ زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتیں۔ ان کے یہاں غلاموں اور لونڈیوں کو رکھنے بلکہ تجارت کا بھی رواج تھا۔

عربوں میں تمام ادیان پائے جاتے تھے۔ بت پرستی عام تھی۔ یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت کے ماننے والے بھی پائے جاتے تھے۔ ایک چھوٹی سی جماعت دین ابراہیمی پر بھی قائم تھی۔

جہاں تک عربوں کے علوم و فنون کا تعلق ہے تو طب، جراحی، بیطری، علم الانساب، عیافہ، قیافہ وغیرہ وغیرہ علوم و معارف ان کے یہاں پائے جاتے تھے۔ اسی طرح ادب کی دنیا میں شعر و شاعری، خطابت وغیرہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ خاص طور سے شعر گوئی میں انھوں نے بڑا کمال حاصل کیا۔ المعلقات السبعۃ دور جاہلی کا شاہ کار مانا جاتا ہے۔

عربی زبان پہلے مختلف لہجات یا بولیوں کی شکل میں پائی جاتی تھی قدیم بولیاں لہجات یہ تھے شمودی، لحيانی، صفوی اور نبطی لہجہ۔ یہ بولیاں دھیرے دھیرے ختم ہوتی گئیں آخر میں دو بڑے لہجے بولیوں نے کافی ترقی کی۔ قحطانی یا جنوبی یا یمنی لہجہ اور دوسرا شمالی یا حجازی یا

عدناتی لہجہ۔ سدآرب کے ٹوٹنے پر یمینوں کی زندگی میں بڑا انتشار آیا۔ بہت سے لوگ ادھر ادھر نقل مکانی پر مجبور ہوئے پھر ان کی زراعت اور تجارت بھی تباہ ہوئی۔ اس اثناء میں جن لوگوں نے حجاز کی طرف رخ کیا انھوں نے اپنے لہجہ کو غالب کرنے کی کوشش کی۔ اہل مکہ خاص طور سے تجارت پیشہ لوگ تھے دوسری قوموں سے ان کے روابط تھے۔ پھر سوق عکاظ، ذوالحجہ اور مکہ مکرمہ یہ سب ان کی تجارت گاہیں تھیں یہاں شعر و شاعری کی محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ قریش تجارت میں آگے بڑھے۔ اہل عرب کی دینی قیادت کے ساتھ تجارت میں بھی ایک گونہ غلبہ حاصل کر لیا۔ شمال و جنوب کے لہجوں میں یہ کشمکش جاری تھی کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت اور ان پر وحی کے نزول نے شمالی یا عدناتی لہجہ کو غالب کر دیا اور اس طرح قریش کے لہجہ میں قرآن کے نزول نے فصیح عربی ایک کر دی۔ اب تک عرب دنیا نے کوئی مرتب کتاب نہیں دیکھی تھی انہیں کلام الہی ان کی زبان میں مل گیا جو ادب کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ پھر وہ اس پرفرہیت ہو گئے، اسے حرز جان بنا لیا۔ اس طرح قرآن نے عربی زبان کو نہ صرف متحد کر دیا بلکہ ایک سند عطا کر دی اور اسے تاقیامت کے لیے بقاء کی ضمانت دے دی۔

زبان ایک منظم کلام کا نام ہے جس کا مقصد افہام و تفہیم اور ابلاغ و تبلیغ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قدیم زمانے میں زبان کے مترادف کے طور پر بھی بولا جاتا تھا اور بولی daialect کے معنی میں بھی۔ اس طرح اللہجات العربیۃ القدیمیۃ کے معنی قدیم عربی بولیاں ہیں۔
دور جدید میں لہجہ کا معنی accent کے ہیں۔ یعنی کسی لفظ کے بولنے کا انداز، طریقہ یا اسلوب۔

عامیہ: دیہاتی زبان یا عوامی زبان جس میں کسی قاعدہ و قانون کی پابندی نہیں کی جاتی۔ ہر علاقے کے لوگ اپنی سہولت کے لحاظ سے اپنی مادری زبان کو جیسے چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔ اس میں ان کا اپنا لہجہ، اسلوب اور طریقہ نطق یا ادائیگی بالکل منفرد اور الگ ہوتی ہے۔
عربی رسم الخط: مختلف رسم الخط کا مطالعہ کرنے کے بعد مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ خط مسند معینی قدیم رسم الخط ہونے کی وجہ سے دیرپا ثابت نہیں ہوئی کیونکہ جنوبی اقوام شمالی اقوام سے اگرچہ زیادہ طاقتور تھیں لیکن روز زمانہ کے ساتھ ہی ان کے رسم الخط ماضی کا حصہ بن گئے اور اس کی جگہ خط آرامی یا خط نبطی نے لے لی جو بہت زیادہ طاقتور ثابت ہوئی اس نے مختلف علاقوں کو متاثر کیا اور جلد ہی یہ ترقی کرتے کرتے عربی رسم الخط کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اور اسی رسم الخط میں قرآن و حدیث اور دیگر اسلامی عربی تصانیف موجود ہیں۔

2.7 نمونے کے امتحانی سوالات

- ۱۔ دور جاہلی میں عربوں کے سماجی اور دینی حالات کا مختصراً جائزہ لیجیے۔
- ۲۔ دور جاہلی میں عربوں کے سیاسی اور معاشی حالات پر مختصراً روشنی ڈالیے۔
- ۳۔ قدیم عربی لہجات (بولیوں) کے بارے میں اپنی معلومات قلمبند کیجیے۔
- ۴۔ زبان، لہجہ، بولی اور عامیہ سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔ واضح لفظوں میں لکھیے۔
- ۵۔ عربی زبان کے ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

2.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

- ۱۔ تاریخ الأدب العربی، احمد حسن زیات، دار نهضة مصر للطبع والنشر، القاهرة۔ سن طباعت غیر مذکور
- ۲۔ الجامع فی تاریخ الأدب العربی (قدیم ادب)، حنا الفاخوری، دار الجیل بیروت، ۱۹۸۶ء
- ۳۔ تاریخ الأدب العربی، ج ۱، دار العلم للملایین، عمر فروخ، بیروت، بارچہارم، ۱۹۸۱ء
- ۴۔ تاریخ الأدب العربی، ج ۱، د۔ شوقی ضیف، دار المعارف قاہرہ، گیارہواں ایڈیشن، سن طباعت غیر مذکور
- ۵۔ موسوعۃ علوم اللغۃ العربیۃ، ج ۷، امیل بدیع یعقوب، دار الکتب العلمیۃ بیروت، سن طباعت ۲۰۰۶ء
- ۶۔ عربی ادب کی تاریخ، عبدالحلیم ندوی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

اکائی 3 عہد جاہلی میں عربی ادب: نثر و شعر، اقسام و خصوصیات

اکائی کے اجزا	
3.1 مقصد	
3.2 جاہلی ادب: شعر	
3.2 تمہید	
3.3 شعر جاہلی کی روایت اور تدوین	
3.5 شعر جاہلی کی اقسام	
3.6 شعر جاہلی کے موضوعات	
3.6.1 ہجائیہ شاعری	
3.6.2 شعر الحماسہ	
3.6.3 فخریہ شاعری	
3.6.4 مرثیہ گوئی	
3.6.5 مدحیہ شاعری	
3.6.6 غزلیہ شاعری	
3.6.7 وصفیہ شاعری	
3.7 شعر جاہلی کے خصائص	
3.8 جاہلی ادب: نثر	
3.8.1 نثر	
3.8.2 جاہلی دور میں فنِ قصہ	
3.8.3 امثال یا محاورے	
3.8.4 خطابت	

فُوس بن ساعده الاياوى	3.8.4.1
اُثم بن صيفى	3.8.4.2
عمرو بن معد يكرب	3.8.4.3
سبع الكهان	3.8.4.4
اكتسابى نتائج	3.9
فرهنگ	3.10
نمونے کے امتحانى سوالات	3.11
مطالعه کے لیے معاون كتابیں	3.12

اس اکائی کا اصل مقصد جاہلی دور میں عربی شاعری اور عربی نثر کی اقسام و موضوعات اور خصوصیات سے طلبہ و طالبات کو متعارف کرانا ہے۔ شعر و نثر کی مختلف اصناف میں دور جاہلی میں جو ارتقا ہوا اس کو ادبی نمونوں کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

کوئی بھی قوم جب تہذیب کی راہ پر گامزن ہوتی ہے تو اس کی فکری، علمی، ثقافتی اور سماجی ترقی کا ایک اہم مظہر اس کی شعر و شاعری کی شکل میں سامنے آتا ہے، چنانچہ جب یونانی قوم نے ترقی کی طرف قدم بڑھائے تو ان کی زبان میں بہترین شاعری نے جنم لیا، چنانچہ شعرا اکثر ہر محاذ پر اپنی قوم کا دفاع اور اس کی نمائندگی کرتے تھے، ان کے اشعار سے اس عہد کے سماجی و ثقافتی حالات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ہر دور کی شاعری اس دور کی بہترین عکاس ہو کرتی ہے۔ وہ اپنے دور کی بہترین تصویر کشی کرتی ہے۔ سماج میں موجود اچھائیاں اور برائیاں سب ہمیں شاعری میں نظر آتی ہیں۔ جاہلی دور کی جو بھی عربی شاعری ہم تک پہنچی ہے وہ بھی اس دور کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔

فن شاعری کا شمار فنون لطیفہ میں کیا جاتا ہے۔ عربی میں ان کو ”الفنون الجمیلہ“ کہا جاتا ہے۔ ان میں نقاشی، مصوری، موسیقی، اور شاعری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا اصل مقصد تو حسنِ فطرت کا مختلف طریقوں سے اظہار کرنا ہوتا ہے، لیکن دوسرے بہت سے اغراض و مقاصد کے لیے بھی ان کو استعمال کیا جاتا ہے۔ مشہور عربی اسکالر اور ”تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ“ کے مصنف جرجی زیدان کے مطابق شعر اور نظم میں ایک بنیادی فرق ہے جس کو یہاں ذکر کر دینا بیجا نہ ہوگا۔ ان کے مطابق نظم وہ کلام ہے جس میں وزن اور قافیہ کا پورا اہتمام کیا جانا چاہیے اس کا موضوع خواہ کچھ بھی ہو، جب کہ شعر وہ کلام ہے جس میں احساسات و جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے خواہ اس میں وزن و قافیہ کی پابندی موجود ہو یا نہ ہو۔ لہذا لفظی اعتبار سے نظم کا درجہ بلند ہے جب کہ معنوی اعتبار سے شعر زیادہ اعلیٰ و برتر ہے۔ البتہ اگر شعر کو وزن و قافیہ کی پابندی کے ساتھ کہا جائے تو یقیناً ایسا کلام بے انتہا مؤثر اور دلپزیر ثابت ہوتا ہے۔ جاہلی دور میں عربوں کی شاعری پر اگر ہم نظر ڈالیں تو اس میں ہمیں ایسے اشعار زیادہ ملتے ہیں جن میں شاعر کے سچے احساسات و جذبات کا اظہار نظر آتا ہے، جب کہ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں الفاظ کی خوبصورتی و چمکتی تو نظر آتی ہے لیکن معانی و مفاہیم کی گہرائی نظر نہیں آتی۔

جاہلی دور کی جو عربی شاعری ہم تک پہنچی ہے وہ یقیناً نہایت اعلیٰ معیار کی شاعری ہے۔ اس پر نظر ڈالنے سے ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ عربی شاعری نے اس سے پہلے اپنی نشوونما کے کئی مراحل طے کیے ہونگے تب کہیں جا کر اس اعلیٰ مقام و مرتبہ پر پہنچی ہوگی۔ لیکن عربی شاعری کے ان اولین مراحل کے بارے میں ہمارے پاس کوئی مستند اور اطمینان بخش معلومات نہیں ہے۔ کچھ اشارے اس سے متعلق ضرور ملتے ہیں جن سے برائے نام ہی معلومات مل پاتی ہے، جیسے امرؤ القیس نے اپنے ایک شعر میں ابن خذام نامی ایک شاعر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم دیار حبیب پر ایسے ہی آنسو بہاتے ہیں جیسے ہم سے پہلے ابن خذام نے بہائے تھے۔ لیکن یہ اشارے ان مراحل سے پردہ اٹھانے کے لیے ناکافی ہیں جن سے گزر کر عربی شاعری نے یہ بلند و بالا مقام و مرتبہ حاصل کیا۔ اوزان و قوافی کا اتنا دقیق اور پختہ استعمال یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ عربی شاعری دور جاہلی سے قبل ایک عرصہ دراز سے اپنا سفر طے کرتے ہوئے اس اعلیٰ مقام تک پہنچی ہوگی۔

ہر قبیلے میں کئی جید شعرا ہوا کرتے تھے، لیکن قبیلہ کے افراد کسی ایک شاعر کو زیادہ اہمیت دے کر اس کو اکثر آگے بڑھا دیا کرتے تھے اور اس کو ”شاعر القبیلہ“ کہا جاتا تھا۔ جب بھی کسی قبیلہ کے شاعر کو بہت زیادہ شہرت اور اہمیت نصیب ہوتی تھی تو اس قبیلہ کے افراد جشن منایا کرتے تھے، بلکہ دوسرے قبائل کے لوگ بھی آکر انہیں اس بات کی مبارک باد دیا کرتے تھے۔ اکثر شاعر کو ہی قبیلہ کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا کرتا تھا۔ حالانکہ اس دور کی شاعری کا ایک خاطر خواہ حصہ ضائع ہو گیا اور ہم تک نہیں پہنچ سکا، لیکن اس کے باوجود جو سرمایہ بھی محفوظ رہا اور ہم تک پہنچا وہ اس دور کی شاعری کے اعلیٰ معیار کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ یقیناً اس دور کے لوگ اپنی روزمرہ کی گفتگو کے لیے نثر کا ہی استعمال کرتے ہوں گے، لیکن ادبی اور فنی سطح پر نثر کے مقابلہ میں شعر کو زیادہ اہمیت حاصل تھی، اور اس کا رواج زیادہ تھا۔ نثر کے مقابلہ میں لوگ اپنے شعرا کے عمدہ اشعار کو لکھ لیا کرتے تھے، اور انہیں حفظ بھی کر لیا کرتے تھے جس کی وجہ سے اس عہد کے اشعار بڑی تعداد میں محفوظ رہے جب کہ نثر کا زیادہ تر حصہ ضائع ہو گیا۔ فطری طور بھی انسان شعر کو بآسانی یاد کر لیتا ہے، اور نثر کو حفظ کرنے میں اسے زیادہ وقت لگتا ہے، جس کی وجہ سے وہ شعر کے مقابلے میں نثر کو زیادہ مدت تک محفوظ نہیں رکھ پاتا۔

اگر عربوں کے یہاں مسجع و مقفی شاعری کے آغاز کی بات کریں تو قدیم عربی شاعری میں سب سے پہلے رجز کا وزن وجود میں آیا جس میں ہر شعر کا اپنا ایک الگ قافیہ ہوتا تھا۔ عربوں کا ماننا ہے کہ سب سے پہلے مضر بن نزار نے اس وزن کو استعمال کیا۔ کہا جاتا ہے کہ رجز کا استعمال عربوں نے سب سے پہلے اپنے اونٹوں کی رفتار تیز کرنے کے لیے کیا جسے عربی میں حداء کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی مقصد کے تحت اس وزن کو ایجاد بھی کیا گیا ہو۔ رجز کے بھی دو وزن تھے، ایک مشطور جس کا استعمال اونٹ کی ہلکی رفتار کے لیے ہوتا تھا، اور دوسرا منہوک جس کا استعمال اونٹ کو تیز دوڑانے کے لیے ہوا کرتا تھا۔ پھر شعر کے دوسرے اوزان بھی حسب ضرورت ایجاد ہوئے اور حماسہ، فخر، رثا، ہجا اور غزل وغیرہ کے لیے ان کے موضوعات کی مناسبت سے اوزان استعمال کیے گئے۔ البتہ سب سے قدیم عربی وزن رجز ہی مانا جاتا ہے۔ شروع میں شاعر اس میں دو چار اشعار ہی کہا کرتا تھا، بعد میں اس میں طویل قصیدے بھی کہے جانے لگے، بلکہ دیگر اوزان میں بھی شاعر شروع میں ایک وقت میں چند اشعار ہی کہا کرتا تھا، پھر بعد میں طویل قصیدے کہنے کا رواج عام ہوا۔

3.3 شعر جاہلی کی روایت اور تدوین

جاہلی دور میں شاعری کی بقا اور حفاظت کی بنیاد روایت پر تھی۔ قدیم یونان میں بھی شعر کی روایت کا رواج قائم تھا۔ ان کے یہاں بھی راویوں کی ایک جماعت اس کام کے لیے خاص تھی اور اشعار کو حفظ کر کے لوگوں کے سامنے بیان کرتی تھی۔ ان کی زبان میں راویوں کو Rhapodist کہا جاتا تھا۔ اہل یونان کی شاعری اور عربوں کی شاعری میں بنیادی فرق یہ ہے کہ یونان میں بعض ایسے شعرا پیدا ہوئے جو اس فن میں بہت ماہر تھے، جب کہ عربوں کے یہاں شاعری بالعموم ان کے مزاج اور ان کی فطرت میں شامل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں عربوں کے یہاں شاعروں کی حیرت انگیز کثرت نظر آتی ہے۔

جاہلی دور کے اشعار میں ہمیں اس بات کے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ اسی دور میں عربی اشعار کی تدوین و تحریر کا آغاز ہو چکا تھا، حالانکہ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس عہد کا زیادہ تر ادبی سرمایہ ہم تک حافظہ کی بنیاد پر ہی پہنچا ہے، کیونکہ اس دور کے عربوں میں خواندگی کا رواج بہت

کم تھا اور وہ لوگ اپنے ادبی سرمایہ اور دیگر معلومات کو محفوظ کرنے کے لیے اپنے حافظہ کا ہی سہارا لیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جاہلی شاعر المر قش ایک بار قید کر لیا گیا تو اس نے اپنا ایک قصیدہ اپنے اونٹ کے کجاوہ پر لکھ دیا۔ اس کے علاوہ اس دور کے بعض اشعار میں شعرا محبوب کے اُجڑے دیار کے باقی ماندہ آثار کو تحریروں اور نقوش سے تشبیہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ المر قش الاکبر اور لبید وغیرہ ہمیں دیا رحیب کے کھنڈرات کو پتھر پر نقش کی ہوئی تحریروں سے تشبیہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح کے نصوص سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جاہلی دور میں تحریر و تدوین کا رواج تھا، اگرچہ اس کا دائرہ محدود تھا، اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی شعرا اپنے اشعار کو قلم بند کیا کرتے تھے۔ اس دور میں جو اشعار یا قصائد تحریر کیے گئے تھے ان میں جو روایتوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ اس دور کے ادبی سرمایہ کا اصل کا دار و مدار راویوں کے قوتِ حافظہ پر تھا۔ ساتھ ہی یہ بات بھی یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس دور میں کوئی ایسا شعری مجموعہ یا کوئی ایسی کتاب وجود میں نہیں آئی تھی جس میں کسی خاص شاعر کے قصیدے جمع کر دیے گئے ہوں اور بعد کے عہد میں لوگوں نے اس پر اعتماد کر لیا ہو۔

معلقات کے حوالے سے جو یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ یہ لفظ علق سے ماخوذ ہے، یعنی اس دور کے وہ منتخب قصائد جنہیں لکھ کر خانہ کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیا گیا تھا، تو بہت سے محققین نے اس امر کو محض ایک من گھڑت کہانی قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں مشہور مصنف ابن الخاس کا یہ قول بطور خاص ذکر کیا جاتا ہے کہ ”(لم یثبت ما ذکرہ الناس من انھا کانت معلقۃ علی الکعبۃ)، یعنی لوگ جو یہ بات کہتے ہیں کہ ان قصائد کو خانہ کعبہ پر لٹکا دیا گیا تھا یہ ثابت نہیں ہے۔ جدید دور میں بھی شوقی ضیف وغیرہ نے یہی موقف اختیار کرتے ہوئے اسے محض ایک بے بنیاد کہانی قرار دیا ہے۔

جاہلی دور میں اشعار کی تحریروں و تدوین کے حوالے سے ایک اور واقعہ ذکر کیا جاتا ہے جس کو بھی بعض محققین نے بے بنیاد قرار دیا ہے۔ کوفہ کے مشہور راوی حماد الراوی نے بیان کیا ہے کہ جاہلی دور کے بادشاہ نعمان بن منذر نے اپنے دور تک کے مشہور عرب شعرا کے عمدہ قصائد کو جمع کر کے تحریر کرنے کا حکم دیا، پھر ان تحریروں کو اپنے محل کے نیچے دفن کروا دیا۔ پھر تقریباً ۱۷۰ھ میں مختار بن ابی عبید کو پتہ چلا کہ نعمان نے جاہلی دور کے قصائد جمع کروا کے اپنے محل کے نیچے دفن کروا دیے تھے تو اس نے محل میں کھدائی کروا کے وہ قصائد اہل کوفہ کے سپرد کر دیے۔ اس واقعہ کی بنیاد پر حماد الراوی نے جو کہ خود ایک کوفی عالم تھے یہ دعویٰ کر دیا کہ اسی خزانے کی بدولت اہل کوفہ اہل بصرہ کے مقابلہ میں عربی شاعری کا زیادہ علم رکھتے ہیں۔ حماد الراویہ پر بعد کے ادوار میں محققین نے علمی خیانت کا الزام لگایا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان کی طرف منسوب بہت سی روایتیں قابل اعتماد نہیں ہیں۔ اسی لیے بہت سے متقدم اور متاخر محققین نے مذکورہ بالا واقعہ کو بھی بے بنیاد اور ناقابل اعتماد قرار دیا ہے۔

دور جاہلی میں شعر کی روایت کا طریقہ ہی زیادہ تر راجح تھا اور اس کے لیے شعرا کا ہی ایک ایسا طبقہ بھی موجود تھا جو اس اہم فریضہ کو انجام دے رہا تھا، چنانچہ کوئی شاعر اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں کسی مشہور شاعر کی صحبت اختیار کر لیتا اور اس کے قصائد کو حفظ کر کے انہیں روایت کرنے لگتا، یہاں تک کہ خود اس کے اندر شاعری کا ملکہ پروان چڑھنے لگتا۔ ابو الفرج الاصفہانی نے اپنی کتاب ”الاعانی“ میں دور جاہلی کے ان شعرا کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مثال کے طور پر اوس بن حجر التیمی کے اشعار کو زہیر بن ابی سلمی نے روایت کیا تو زہیر کے قصائد کو حطیبہ اور زہیر کے صاحب زادے کعب نے روایت کیا، پھر حطیبہ کے قصائد کو حطیبہ بن خشرم العذری نے روایت کیا، پھر

ہد بہ کے قصائد کو جمیل نے روایت کیا اور جمیل کے اشعار کو کثیر عزم نے روایت کیا۔ بلکہ شاعر کے اپنے اشعار کے علاوہ اس کے پاس سابق شعرا کے جو بھی اشعار ہوتے تھے، اور راوی ان سب کو حفظ کر لیا کرتا تھا اور پھر اگلے راوی تک پہنچا دیتا تھا۔

راویوں کی یہ جماعتیں اکثر قبیلوں کے دائروں میں سمٹی ہوتی تھیں یعنی ایک قبیلہ کے شعرا کے راوی اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی لیے ہر قبیلہ سے تعلق رکھنے والے شعرا کے اسلوب بیان اور موضوعات میں بھی کافی مماثلت پائی جاتی تھی۔ البتہ اس میں قبیلہ کے دیگر اہل ذوق حضرات بھی حصہ لیتے تھے، کیونکہ ان قصائد میں اکثر ان قبیلوں کے کارناموں، فخر و مباہات اور ان کی شان و شوکت کو نمایاں کیا جاتا تھا اور حریفوں پر کچھ اُچھالی جاتی تھی، اور اس میں کوئی حیرت و استعجاب کی بات نہیں ہے، کیونکہ شعر و شاعری میں عرب قوم کو جس قدر شغف اور دلچسپی تھی اتنی انہیں کسی بھی دوسرے علم یا فن میں نہیں تھی۔

جاہلی دور کے اشعار کی روایت کا جو سلسلہ خود جاہلی دور میں شروع ہوا تھا اور اسلامی دور میں جاری رہا عصر عباسی آتے آتے وہ سلسلہ اپنے عروج کو پہنچ گیا اور ابو عمرو بن العلاء اور المفضل الضبی جیسے عظیم راویوں نے بہت ہی اہم کردار ادا کیا اور جاہلی دور کے اشعار کی تدوین میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ نحاۃ اور مفسرین کو بھی جاہلی دور کے اشعار کی ضرورت استہدائے کے لیے پڑتی تھی، چنانچہ اس دور میں جاہلی اشعار کی روایت اور اس کے مقاصد میں مزید توسیع واقع ہوئی۔ عصر عباسی میں ان راویوں کے دو اہم مراکز سامنے آئے ایک کوفہ اور دوسرا بصرہ، ان میں کوفہ کے مقابلہ میں بصرہ کے راویوں کو زیادہ قابل اعتماد اور مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ عصر عباسی کے مشہور راویوں میں سے بعض تو ثقات میں شمار کیے جاتے ہیں جیسے ابو عمرو بن العلاء، المفضل الضبی اور الاصمعی وغیرہ، جب کہ بعض کے اوپر وضع و اختلاق کا الزام بھی لگا ہے جیسے حماد الراویہ اور خلف الاحمر۔ راویوں کی توثیق و تضعیف کا یہ سلسلہ بھی دراصل اسی دور میں شروع ہو چکا تھا، جب کہ دور جدید میں بھی بعض مستشرقین اور بعض عرب ناقدین نے اسے اپنا موضوع بحث بنایا، اور ان میں سے بعض نے تو عہد جاہلی کے زیادہ تر شعری سرمایہ کو شک کے دائرہ میں لاکھڑا کیا۔ جدید دور میں مصری ناقد طہ حسین کا نام اس حوالے سے خاص طور سے قابل ذکر ہے جنہوں نے عہد جاہلی کی شاعری کو بالعموم مشکوک قرار دیا۔ حالانکہ المفضل الضبی اور الاصمعی جیسے فاضل اور مستند راویوں کی روایت پر شک کرنا علمی و تحقیقی اعتبار سے قطعاً جائز نہیں ہے۔ محمد بن سلام الحنلی جیسے عظیم القدر اسکالر نے بھی جاہلی شاعری کے تئیں یہی معتدل موقف اختیار کیا ہے کہ ان جلیل القدر راویوں کی روایت پر شک کرنا مناسب نہیں ہے۔ جدید دور میں بھی شوقی ضیف اور عرب ناقدین و محققین کی ایک بڑی تعداد نے یہی معتدل موقف اختیار کیا ہے۔

جاہلی دور کے بعد اور خاص طور سے دوسری ہجری شروع میں جو عربی اشعار وضع کیے گئے اور جاہلی شعرا کی طرف منسوب کر دیے گئے اسے ”قضیۃ الاحتمال“ کہا جاتا ہے۔ بہت سے واضعین نے تو خود ہی اس امر کا اعتراف بھی کیا، جب کہ بہت سے واضعین کی قلعی ان کے اپنے دور میں یا بعد کے ادوار میں کھل گئی۔ جن راویوں پر وضع و احتمال کا الزام لگا ہے بلکہ ثابت بھی ہوا ہے ان میں حماد الراویہ اور خلف الاحمر جیسے رواۃ کے نام سرفہرست ہیں۔ لیکن شروع دور سے ہی اسکالر کی ایک ایسی جماعت موجود رہی جس نے پوری تدقیق و توثیق کے بعد اس قسم کے اشعار کی نشاندہی کی ان میں محمد بن سلام الحنلی، الاصمعی، اور المفضل الضبی وغیرہ کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

اس ضمن میں محمد بن سلام الحجی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے جنھوں نے اپنی مایہ ناز و مشہور کتاب ”طبقات فحول الشعراء“ میں اس امر کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ اور اپنی کتاب میں وضع و احتمال کے دو بنیادی اسباب بتائے ہیں، ایک قبائلی فخر و مباہات اور دوسرا شعرا وضع کرنے والے راویوں کی ایک جماعت جس نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ بعض قبائل کو جب اپنے شعری سرمایہ میں کمی محسوس ہوئی تو اس کے بعض شعرا نے یہ کوشش کی کہ کچھ اشعار وضع کر کے جاہلی شعرا کی طرف منسوب کر دیے جائیں تاکہ اس کمی کو دور کر لیا جائے۔ کچھ اصحاب سیر جیسے محمد ابن اسحاق وغیرہ کے بارے میں بھی آتا ہے کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں بنا تحقیق کیے اس قسم کے من گھڑت اشعار شامل کیے ہیں۔

اس حوالے سے جدید دور میں مستشرقین نے کافی دلچسپی دکھائی اور اسے اپنا موضوع بحث بنایا۔ نولدک نامی مستشرق نے ۱۸۶۴ء میں یہ موضوع اٹھایا، جب کہ آلورد نامی مستشرق نے ۶ جاہلی شعرا کے دو ادوین کو نشر کیا، اور جاہلی دور کے اشعار پر بالعموم تنقید ظاہر کیا، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جاہلی اشعار کی بہت ہی قلیل تعداد قابل اطمینان ہے۔ بعد میں بروکلمان اور مرگلیوٹ وغیرہ نے بھی اس فکر کی علمبرداری کی۔ ان سب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جاہلی دور کی شاعری کا زیادہ تر حصہ بعد کے ادوار میں وضع کیا گیا ہے، اور جاہلی شعرا کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ ان مستشرقین اور ان سے متاثر ہو کر بعض عرب مؤرخین و ناقدین نے اپنی رائے کی تائید میں بہت سی دلیلیں پیش کی ہیں، لیکن بہت سے عرب اسکالرز نے اور خود بعض مستشرقین نے ان دلیلوں کو غلط ثابت کیا ہے۔

جن عرب مؤرخین اور اسکالرز نے اس موضوع میں خاص دلچسپی دکھائی ان میں مصطفیٰ صادق الرافعی بھی ہیں جنھوں نے اپنی کتاب ”تاریخ آداب العرب“ میں شعر جاہلی میں احتمال کے موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اسی طرح طلحہ حسین نے اپنی کتاب ”فی الادب الجاہلی“ میں یہ موضوع اٹھایا ہے اور انہیں اپنے مذہب تشکیک کی وجہ سے بہت تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔

3.5 شعر جاہلی کی اقسام

دنیا کی دوسری قدیم تہذیبوں میں ہمیں شاعری کی مختلف اقسام نظر آتی ہیں، جن میں چار قسموں کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا ہے: رزمیہ شاعری، تمثیلیہ شاعری، طریبیہ شاعری اور تعلیمی شاعری۔ ان تینوں قسموں میں رزمیہ شاعری یا اشعار القصصی، سب سے قدیم ہے۔ رزمیہ شاعری میں مختلف واقعات و حوادث کو شعر کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا رواج قدیم یونانی اور ہندوستانی ادب میں بہت تھا، اور اس عہد کے کئی بہترین نمونے ہم تک پہنچے ہیں۔ اس قسم کے قصیدے بہت طویل ہوا کرتے تھے اور ہزاروں اشعار پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان میں شاعر اپنی قوم کی تاریخ اور اپنے جاننازوں کے قصے بیان کرتے تھا۔ رزمیہ شاعری میں مذہب بھی ایک اہم موضوع ہوا کرتا تھا۔ دیوی دیوتاؤں کو ان میں اہم کرداروں کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا۔ چنانچہ قدیم یونانی ادب میں ہومیروس کی الیاذہ اور قدیم ہندوستانی ادب میں مہا بھارت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ قدیم عبرانی تہذیب کی بھی ہمیں اس کے کچھ نمونے مل جاتے ہیں۔ لیکن قدیم عربی شاعری میں ہمیں اس قسم کی شاعری نہیں ملتی۔ البتہ یہ امکان ضرور ہے کہ عربوں نے بھی عہد جاہلی میں لات و عزلی اور اپنے دوسرے معبودوں کی شان میں اس قسم کے اشعار کہے ہوں، اور وہ بعد میں ضائع ہو گئے ہوں، بہر حال جس انداز کے شعری قصے ہمیں یونان اور ہندوستان کے قدیم ادبی سرمایہ میں نظر آتے ہیں وہ عربوں کی قدیم شاعری میں ہمیں نظر نہیں آتے۔ دوسری قسم یعنی شعر تعلیمی میں شاعر کسی علم یا کسی فن کے مبادی یا اصول کو شعر کی شکل میں بیان کرتا ہے

تا کہ طلبہ اور اہل علم اس سے کچھ علمی استفادہ کر سکیں۔ جب کہ تیسری قسم یعنی شعر تمثیلی بھی ہمیں یونان و رومان کی قدیم تہذیبوں میں ملتی ہے۔ شعر تمثیلی جس میں خیر و شر کی کشمکش کو زندہ کرداروں کے ذریعہ دکھایا جاتا ہے وہ بھی قدیم عربی شاعری میں ہمیں نظر نہیں آتا۔ عشق و محبت کے مختلف قصے جو قدیم عربی شاعری میں نظر آتے ہیں وہ بھی شعر غنائی یا طربیہ شاعری کی نوعیت کے ہیں نہ کہ شعر تمثیلی کی نوعیت کے۔

شاعری کی یہ تینوں قسمیں عہد جاہلی کی عربی شاعری میں نہیں ملتی ہیں۔ رزمیہ شاعری کی کچھ جھلکیاں ہمیں جاہلی قصائد میں بہت محدود انداز میں نظر آتی ہیں، البتہ یونانی طرز کے شعری قصے اپنے فنی عناصر کے ساتھ ہمیں یہاں دیکھنے کو نہیں ملتے۔ تعلیمی شاعری اور تمثیلی شاعری سے جاہلی دور کی شاعری بالکل محروم تھی، البتہ شاعری کی قدیم قسموں میں سے وہ قسم جس میں دور جاہلی میں عربی شاعری خوب کہی گئی اور بہت اعلیٰ معیار کی کہی گئی وہ طربیہ شاعری تھی، جس میں شاعر اپنے حالات و واقعات اور احساسات و جذبات کا اظہار کرتا ہے اور اپنے دکھ دور یا دوسروں کے تئیں اپنے تصورات و خیالات کو بیان کرتا ہے۔ شاعری کی یہ قسم قدیم یونانی ادب میں بھی نظر آتی ہے جہاں شاعر مدح، ہجاء، غزل اور وصف جیسے اغراض و مقاصد کے لیے شعر کہا کرتا تھا۔ جاہلی دور کی عربی شاعری میں ہمیں شاعری کی یہ قسم پوری طرح سے حاوی نظر آتی ہے، اور اپنے مختلف موضوعات کے ذریعہ شاعری کے بہترین شاہکار پیش کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جاہلی دور کی شاعری کا اصل محور شاعر کی اپنی ذات اور اپنی حیات ہوتی ہے۔ ذاتی واقعات اور اپنے قبیلے یا قوم کے کارنامے جاہلی شاعر کے اہم موضوعات میں شامل ہوتے تھے۔ جاہلی دور کا شاعر اپنے ماحول اور اپنے زمانے کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ اسے اپنے ارد گرد جو چیزیں نظر آتی ہیں انہیں اپنی شاعری کا حصہ بناتا ہے، اسے جو چرند و پرند اپنے آس پاس دکھائی دیتے ہیں ان کی وصف بیان کرتا ہے اور ان سے تشبیہات اخذ کرتا ہے۔ جاہلی دور کی شاعری قدیم یونانی شاعری کی طرح غنائیت سے پر تھی اور عرب شعرا اسے مختلف مواقع پر آلات موسیقی کے ساتھ گایا بھی کرتے تھے۔

عصر جدید کے ایک مصنف مارون عبود نے شعر جاہلی کو دو قسموں میں بانٹا ہے: ایک قسم وہ جسے شعرا برجستہ کہا کرتے تھے، اور دوسری قسم وہ جس کے لیے وہ کافی محنت اور مراجعہ کیا کرتے تھے جیسے زہیر بن ابی سلمیٰ کے 'قصائد الحولیات' جن کے بارے میں مشہور ہے کہ زہیر پہلے چار مہینے اسے کہتا تھا اور پھر ان پر غور کرتا تھا، اور پھر چار مہینے تک انہیں لوگوں کے سامنے پیش کیا کرتا تھا، تب کہیں جا کر اس کے یہ قصائد آخری شکل اختیار کرتے تھے۔

جاہلی دور کی عربی شاعری پر طربیہ شاعری یا 'الشعر الغنائی' کا رنگ غالب تھا جس میں شاعر خود اپنے احوال و کوائف کا اظہار کرتا ہے، دوسرے موضوعات پر گفتگو برائے نام ہوتی ہے، اس کا زیادہ تر حصہ اس کی اپنی ذات اور اس کے جذبات تک محدود رہتا ہے۔ جن قصوں کا جاہلی قصائد میں ذکر ہوتا ہے وہ بھی شاعر کی اپنی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جاہلی شاعر اپنے قبیلے کا ذکر بھی کرتا ہے تو وہ بھی خود اپنے آپ پر فخر کرنے کی غرض سے ہی کرتا ہے، گویا کہ اس میں بھی اس کا مقصد خود اس کی اپنی ذات ہی ہوتی ہے۔

3.6 شعر جاہلی کے موضوعات

مختلف ادوار میں مورخین نے عہد جاہلی کے اہم موضوعات پر گفتگو کی ہے، چنانچہ ابوتام نے جاہلی شاعری کے دس موضوعات ذکر کیے ہیں جن میں حماسہ، مرثیہ، مدح، وصف اور ہجاء وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ قدامہ بن جعفر نے اپنی کتاب 'نقد الشعر' میں جاہلی

شاعری کے چھ موضوعات بیان کیے ہیں، اور یہ بتایا ہے کہ ان کا تعلق بنیادی طور پر مدح اور ہجاسے ہے، جب کہ ابن رشیق القیروانی نے اپنی کتاب ”العمدہ“ میں جاہلی شاعری کے نو موضوعات ذکر کیے ہیں۔ ان میں سے بہت سے موضوعات دراصل مستقل موضوعات نہ ہو کر اہم موضوعات کے ہی کسی نہ کسی پہلو پر مشتمل ہیں۔ اس ضمن میں ابو ہلال العسکری نے جو رائے پیش کی ہے وہ کافی حد تک جامع ہے۔ انھوں نے جاہلی شاعری کے پانچ اہم موضوعات گنوائے ہیں: مدح، ہجاء، وصف، تشبیہ، اور مرثیہ۔ اور پھر لکھا ہے کہ نابغہ الذبیانی نے اس میں ایک اور موضوع کا اضافہ کر دیا، اور وہ ہے اعتذار ہے۔ اس طرح العسکری کے مطابق جاہلی دور کی شاعری کے چھ اہم موضوعات قرار پائے، ان میں حماسہ کا اور اضافہ کر لیا جائے تو ان موضوعات میں جاہلی دور کی شاعری کے تقریباً سبھی موضوعات شامل ہو جائیں گے۔

3.6.1 ہجائیہ شاعری

ہجوگوئی کو جاہلی شاعری میں بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس میں شاعر اپنے مخالف کے عیوب و نقائص کو گنواتا ہے، اور اس کے خاندان یا قبیلہ کی کمیوں کو بتاتا ہے، چنانچہ اس دور کی ہجوگوئی شخصی سطح پر بھی ہوتی تھی اور قبائلی سطح پر بھی ہوتی تھی۔ جاہلی دور میں میدان جنگ ہمیشہ تیار رہتا تھا اور مختلف قبائل میں جنگوں کا سلسلہ مستقل طور پر جاری رہتا تھا۔ لیکن ایک اور جنگ تھی ہجائیہ شاعری کی جو ان کے درمیان ہمیشہ چلتی رہتی تھی۔ اگر کوئی کسی شاعر یا اس کے قبیلہ کے خلاف کوئی ظلم کرتا یا اس پر کچھ اچھالتا تو وہ شاعر بھی اپنی ہجائیہ شاعری کے ذریعہ اس کا جواب دیتا۔ ہجائیہ شاعری میں شاعر اپنے حریفوں کو ہر طرح کے محاسن سے عاری اور ہر طرح کے عیوب میں مبتلا ثابت کرنے کی کوشش کرتا، بلکہ اپنے حریفوں کو ماضی میں ملی شکستوں کا ذکر کرتا، اور اپنے قبیلے کی کامیابی کی داستان سنا کر اس پر فخر کرتا۔

عصر اموی میں ہجوگوئی کی صنف ’شعر النقاہ‘ کی شکل میں سامنے آئی اور جریر و فرزدق کے بیچ سخت مقابلے ہوئے۔ ہجائیہ شاعری کی بہترین مثالیں ہمیں جاہلی دور کی شاعری میں نظر آتی ہیں، مثال کے طور پر قبیلہ عبدالقیس کے شاعر یزید بن الحذاق نے مملکتِ منذرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر کے خلاف ہجائیہ شاعری کرتے ہوئے کہا:

نُعْمَانُ اِنْكَ خَائِنٌ خَدَعٌ يُخْفِي ضَمِيرَكَ غَيْرَ مَا تُبْدِي

یعنی اے نعمان تم خائن اور دھوکے باز ہو، اور تمہارا ظاہر تمہارے باطن کے خلاف ہے۔ ایسے ہی متلمس اور طرفہ نے عمرو بن ہند کے خلاف ہجائیہ اشعار کہے جو بہت مشہور ہوئے۔ ان کی یہ ہجو اکثر ان کے طویل قصیدوں کی درمیان وارد ہوتی تھی، اور شاذ و نادر ہی مکمل ہجائیہ قصیدہ ہمیں اس دور میں نظر آتے ہیں۔ زہیر بن ابی سلمیٰ نے آلِ حصن کی ہجو کرتے ہوئے کہا:

وَمَا أُدْرِي، وَلَسْتُ أَحَالَ أُدْرِي أَقْوَمُ آلِ حِصْنِ أُمِّ نِسَاءِ

یعنی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قبیلہ حصن کے لوگ مرد ہیں یا عورتیں ہیں۔ قریط بن انیف العنبری نے اپنی قوم کی ہجو کرتے ہوئے اور انہیں عار دلاتے ہوئے کہا:

لَوْ كُنْتُ مِنْ مَازِنٍ لَمْ تَسْتَبِحْ اِبْلِي بَنُو اللَّقِيْطَةِ مِنْ ذَهْلِ بْنِ شَيْبَا

یعنی اگر میں خاندانِ مازن کا فرد ہوتا تو ذہل بن شیبان کی اولاد میرے اونٹوں کو اتنی آسانی سے نہیں لے جاسکتے تھے۔

لَكِنْ قَوْمِي وَإِنْ كَانُوا ذَوِي عَدَدٍ لَيْسُوا مِنَ الشَّرِّ فِي شَيْءٍ وَإِنْ هَانَا

یعنی میری قوم تعداد میں چاہے جتنی بھی زیادہ ہو، برائی میں نہیں پڑتی، چاہے وہ برائی بہت معمولی ہی کیوں نہ ہو۔

3.6.2 شعر الحماسہ

حماسہ یعنی پرجوش اور حوصلہ افزا قسم کی شاعری جس میں شاعر اپنی قوم کو بہادری و دلیری کا مظاہرہ کرنے پر ابھارتا ہے اور اپنے دشمن کو کانٹے کی ٹکر دینے کے لیے ان کے حوصلوں کو بلند کرتا ہے۔ اس قسم کی شاعری کو جاہلی دور کی شاعری کا ایک اہم موضوع مانا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عرب قبائل اکثر ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہتے تھے اور جنگوں کا طویل سلسلہ اکثر جاری رہتا تھا۔ اسی لیے شعرا کی بڑی اہمیت ہو کر تھی اور وہ اپنی قوم کے جاننازوں کو ہمیز لگانے میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔

جاہلی شاعری میں حماسہ کے اشعار کی کثرت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب ابو تمام نے قدیم عربی اشعار کا انتخاب مرتب کیا تو اس نے اس کا نام ”دیوان الحماسہ“ رکھا۔ اس صنف یعنی اشعار حماسہ میں نہ صرف پرجوش شاعری اور قوم کے جاننازوں کی حوصلہ افزائی کی بات کی جاتی ہے، بلکہ اس میں شاعر اپنی محبوبہ کا بھی ذکر کرتا ہے اور اپنے قبیلے کی خوبیوں کو بھی گنوا تا ہے۔ اس صنف میں شاعر اپنے دشمنوں کو دشمنیاں بھی دیتا ہے اور انتقام لینے کا اعلان بھی کرتا ہے۔ اسی انداز کا درید بن الصمہ کا وہ قصیدہ ہے جس میں اس نے اپنے بھائی عبد اللہ کے قاتلوں سے انتقام لینے کی بات کہی ہے۔ ایسے ہی عمرو بن کلثوم کا وہ بہترین قصیدہ ہے جس میں وہ اپنی قوم کے کارناموں کا ذکر کرتا ہے اور جنگوں میں اپنے فتح و کامرانی پر فخر کرتا ہے۔ اس قصیدے میں وہ اپنے قبیلہ تغلب کو سب سے اعلیٰ اور سب سے بلند و بالا قبیلہ قرار دیتا ہے، اور یہ اعلان کرتا ہے کہ جو بھی اس کے قبیلہ سے ٹکرانے کی کوشش کرے گا وہ پاش پاش ہو جائے گا۔

مفضلیات اور اصمعیات میں اس قسم کے بے شمار قصیدے موجود ہیں۔ وہ ان قصیدوں میں اپنے اسلحہ اور اپنے گھوڑوں کی تعریف کرتے ہوئے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ اسلحہ کی تعریف اور ان پر فخر کرنے میں اوس بن حجر کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے جس نے اپنے طویل قصیدہ لامیہ میں اپنے قبیلے کی خوب تعریف کی ہے۔ گھوڑوں پر فخر اور ان کی تعریف کے سلسلے میں ابوداؤد الا یادی، زید الخلیل اور عمرو بن معدیکرب کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ یہ سب اس عہد کے مشہور گھڑسوار تھے اور ان کی شاعری میں اس موضوع کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

3.6.3 فخریہ شاعری

عرب قوم مختلف قبائل میں تقسیم تھی اور ہر قبیلہ کے افراد اپنے قبیلہ کے اوپر فخر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ اس فخر و مباہات میں شعرا پیش پیش تھے، بلکہ کچھ شاعرات کا نام بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جاہلی دور میں جہاں ایک طرف بہت سی سماجی برائیاں رائج تھیں تو وہیں دوسری طرف عرب قوم میں بہت سی خوبیاں اور بہت سی اچھی عادتیں بھی موجود تھیں، جیسے سخاوت، وفاداری، مہمان نوازی اور امانت داری وغیرہ۔ چنانچہ اس دور کے شاعروں نے بھی اپنے قبیلوں کی خوبیوں اور خصلتوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں جو دو سخاوت اور مہمان نوازی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ چونکہ شراب کا بہت رواج تھا اس لیے مہمانوں کے سامنے شراب حاضر کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا، اس لیے اس دور کی شاعری میں شراب کا بھی کثرت سے تذکرہ ملتا ہے۔

عمرو بن کلثوم اپنے ایک قصیدہ میں اپنے قبیلے پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے:

و قد علم القبائل من معدّ إذا قبب بأبطحها بنينا

یعنی معد کے قبیلوں کو یہ بات اس وقت معلوم ہوئی جب ہم اپنے گھران کی زمین پر بنائے۔

بأنا المطعون إذا قدرنا وأنا المهلكون إذا ابتلينا

یعنی جب ہمیں قدرت حاصل ہو جاتی ہے تو ہم خوب نوازتے ہیں اور جب ہمیں آزما یا جاتا ہے تو ہم ہلاک کر دیتے ہیں۔

وأنا المانعون لما أردنا وأنا النازلون بحيث شننا

یعنی ہم جس چیز کو چاہتے ہیں روک دیتے ہیں، اور جہاں ہمارا جی چاہتا ہے ہم وہیں پڑاؤ ڈالتے ہیں۔

وأنا التاركون إذا سخطنا وأنا الآخذون إذا رضينا

یعنی جب ہم غصہ کرتے ہیں تو ترک کر دیتے ہیں، اور جب خوش ہوتے ہیں تو دست گیری کرتے ہیں۔

وإننا العاصمون إذا أطعنا وإننا العازمون إذا عصينا

یعنی جب ہماری اطاعت کی جاتی ہے تو ہم حفاظت کرتے ہیں، اور جب ہماری نافرمانی کی جاتی ہے تو ہم بدلہ کے کر رہتے ہیں۔

3.6.4 مرثیہ گوئی

عرب قبائل میں آپس میں جنگیں کثرت سے ہوا کرتی تھیں جن میں ہر قبیلہ کے لوگ بڑی تعداد میں ہلاک ہو جاتے تھے اور اہل قبیلہ کی نظر میں بلند مقام حاصل کر لیتے تھے۔ شعرا بھی ان کی شان میں خوب مرثیے پڑھتے تھے اور ان کی دلیری و جانبازی کے گن گاتے تھے اور اپنے اشعار میں ان کا تذکرہ کر کے اپنے جانباز جنگجوؤں کے حوصلے اور بڑھاتے تھے۔ اس دور میں مرثیہ گوئی میں شاعروں کے ساتھ ساتھ شاعرات نے بھی بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مشہور جاہلی شاعرہ خنساء عکاظ کے بازار میں اپنے دونوں بھائیوں صحرا اور معاویہ کی شان میں مرثیہ پڑھتی تھی۔ لویس شیخو نے اپنی کتاب ”مراثی شاعر العرب“ میں ان مرثیہ گو شاعروں اور شاعرات کا تذکرہ بخوبی کیا ہے۔

مرثیہ گوئی کا مطلب ہوتا ہے کہ شاعر کسی گزرے ہوئے شخص کو یاد کرے اور اس کی خوبیوں کو بیان کرے۔ جاہلی شعرا اپنے اہل واقارب کی وفات کے بعد ان کا ذکر اپنے اشعار میں کیا کرتے تھے۔ جاہلی دور میں شاعرات بھی اپنے اقربا کی وفات پر ان کو یاد کرتی تھی اور ان کی صفات کو بیان کرتی تھیں۔

قس بن ساعدہ الایادی نے اپنے دو بھائیوں کی قبر پر کھڑے ہو کر مرثیہ کے یہ اشعار پڑھے:

خَلِيلِي هَبْنَاهُ طَالَمَا قَدَرْتَمَا أَجْدُ كَمَا لَا تَقْضِيَانِ كَرَا كَمَا

یعنی میرے دونوں دوستو! اب اٹھ کھڑے ہو، بہت دیر سولیے، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم اپنی نیند پوری نہیں کر پاؤ گے۔

أَلَمْ تَعْلَمَا أَنِّي بِسَمْعَانَ مَفْرُذٌ وَمَالِي فِيهِ مِنْ حَبِيبٍ سِوَا كَمَا

یعنی کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں دیار سمعان میں میں اکیلا رہ گیا ہوں، اور یہاں تم دونوں کے سوا میرا کوئی دوست نہیں ہے

أَقِيمْ عَلَيَّ قَبْرِي كَمَا لَسْتُ بَارِحًا طَوَالَ اللَّيَالِي أَوْ يَجِيبُ صَدَا كَمَا

یعنی میں تم دونوں کی قبروں پر پوری پوری راتوں پڑا رہوں گا، اور وہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا، یہاں تک کہ تمہاری طرف سے مجھے

کوئی جواب نہ مل جائے۔

3.6.5 مدحیہ شاعری

ویسے تو عہد جاہلی کے ہر مرحلے میں ہمیں مدحیہ شاعری نظر آ جاتی ہے۔ لیکن خاص طور سے اس عہد کے آخری مرحلے میں ہمیں اس کا چلن زیادہ نظر آتا ہے۔ جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرق کی طرف مناذرہ کی عرب مملکت قائم تھی تو دوسری طرف شمال مغرب میں غسانہ کی عرب مملکت قائم تھی۔ ان دونوں ہی مملکتوں سے کئی بڑے عرب شعرا منسلک تھے اور ان کے بادشاہوں کی شان میں مدحیہ قصیدے پڑھا کرتے تھے، اور خوب انعام و اکرام سے نوازے جاتے تھے۔ اس حوالے سے زہیر بن ابی سلمیٰ، نابغہ الذبیانی اور حسان بن ثابت کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

زہیر بن ابی سلمیٰ نے اپنی قوم کے سرداروں کی شان میں زیادہ مدحیہ قصیدے کہے ہیں۔ حسان بن ثابت غسانہ کے دربار سے وابستہ تھے، جب کہ نابغہ شروع میں نعمان بن منذر کی مدح سرائی کیا کرتے تھے لیکن پھر ان کے قبیلے کے کچھ افراد غسانہ کے ہاتھوں قید کر لیے گئے تو انھوں نے ان کی رہائی کی غرض سے غسانہ کی مدح سرائی شروع کر دی، جس کی وجہ سے نعمان بن منذر اور ان کے درمیان رنجش قائم ہو گئی۔ اس رنجش کو ختم کرنے کے لیے اور نعمان بن منذر کو راضی کرنے کے لیے نابغہ نے اعتذاریات یعنی معذرت پر مبنی قصائد کہے جو اس قسم کی شاعری کے اس دور کے بہترین نمونے مانے جاتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ اس قسم کے معذرت طلب اشعار نے بھی مدحیہ شاعری کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہے، حالانکہ اس قسم کے اشعار کی مقدار بہت محدود ہے۔

اس دور کے شعرا کی قدردانی میں مناذرہ پیش پیش تھے، اس لیے مدحیہ شاعری بھی انہیں کے حق میں زیادہ وجود میں آئی، اور اس دور کے کئی بڑے شعرا ان کے دربار سے وابستہ رہے جیسے نابغہ، المحقّب العبدی، الممزق العبدی، متلمس، طرفہ، المسیب بن علس اور حجر بن خالد وغیرہ۔ اس دور کی مدحیہ شاعری کے حوالے سے اعشیٰ کا نام بھی قابل ذکر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے اس نے اس دور کے بیش تر بادشاہوں کے درباروں میں حاضری دی اور ان کی شان میں مدحیہ قصیدے کہہ کر خوب واہ واہی لوٹی۔

جاہلی شاعری میں ہمیں دو طرح کی مدحیہ شاعری نظر آتی ہے؛ ایک تو وہ جس میں شاعر ممدوح کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے یا اس کی کسی بات سے خوش ہو کر اس کی مدح سرائی کرتا ہے۔ اس طرح کی شاعری بادیہ نشین شعرا کے یہاں زیادہ نظر آتی ہے، جیسے امرؤ القیس اور زہیر وغیرہ۔ جب کہ دوسری قسم وہ ہے جس میں شاعر انعام و اکرام حاصل کرنے کی خاطر مدح سرائی کرتا ہے، اس قسم کی مدحیہ شاعری ہمیں درباری شعرا کے یہاں زیادہ نظر آتا ہے جیسے نابغہ اور اعشیٰ وغیرہ۔

زہیر بن ابی سلمیٰ ہرم بن سنان کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَأَبْيَضَ فَيَاضُ يَدَاهُ غَمَامَةٌ عَلِيٌّ مَعْتَفِيهِ مَا تَعْبُ فَوَاضِلُهُ

یعنی میرا ممدوح (ہرم بن سنان) پاک باز و سرخرو اور بڑا سخی ہے، اس کے ہاتھ ابر رحمت کی طرح ہیں، اور جو لوگ اس کی طرف دست سوال دراز کرتے ہیں ان کی داد و دہش ختم نہیں ہوتی۔

أخى ثقة لا تُهلِكَ الخمرُ مالهَ و لكنهُ قد يهلك المَالَ نائلهُ
یعنی وہ بھروسے کے لائق ہے اور شراب کی محفلیں اس کے مال کو ختم نہیں کر پاتیں، لیکن اس کی سخاوت البتہ اس کے مال کو ختم کر
سکتی ہے۔

تراہ إذا ما جئتہ متہللاً كأنک تعطیہ الذی أنت سائلہ
یعنی جب تم اس سے کچھ مانگنے کی غرض سے اس کے پاس آتے ہو تو اسے دیکھو گے کہ وہ اتنا خوش ہوتا ہے کہ جیسے تم ہی وہ چیز اسے
دے رہے ہو جو تم اس سے مانگ رہے ہو۔

3.6.6 غزلیہ شاعری

غزل گوئی بھی اس دور کی شاعری کی ایک اہم صنف تھی۔ جاہلی شاعر اپنی جوانی کے ان خوبصورت لمحوں کو یاد کرتا ہے جو اسے اپنی
محبوبہ سے ملاقات کے وقت نصیب ہوتے تھے، وہ دیار حبیب سے گزرتا ہے تو ماضی کی ان یادوں میں کھو جاتا ہے اور وہاں بتائے ہوئے ایک
ایک پل کو یاد کرتا ہے، آنسو بہاتا ہے اور اپنے عشق کی داستان بیان کرتا ہے۔ ویسے تو اس عہد کی قدیم ترین غزلیہ شاعری میں امرؤ القیس کا نام سر
فہرست آتا ہے لیکن خود امرؤ القیس نے ایک قدیم شاعر ابن خذام کا نام لے کر یہ کہا ہے کہ ہم بھی اپنے محبوب کی یاد میں ایسے ہی آنسو بہاتے
ہیں جیسے ہم سے پہلے ابن خذام نے آنسو بہائے تھے۔

جاہلی شاعر اپنی محبوبہ کی صفات اور خوبیوں کو تفصیل سے بیان کرتا ہے، اس کا حسن و جمال اور اس کے پرکشش جسم کی خوب تعریف
کرتا ہے، اس کے جسم کے ہر حصے کو تشبیہات و استعارات کے ذریعہ نہارتا ہے اور تعریف کرتا ہے، چنانچہ وہ اپنی محبوبہ کی پیشانی، اس کے
رخسار، اس کی گردن، اس کا سینہ، اس کی آنکھوں، اس کے لب، اس کا آبِ دہن، اس کی کلائی، اس کی پنڈلی، اس کے بال یہاں تک کہ اس
کے پستان تک کی تعریف میں اشعار کہتا ہے۔ ایسے ہی اس کے لباس، اس کے زیورات، اس کی خوشبو وغیرہ کو بھی اپنے اشعار میں ذکر کرتا ہے۔
کئی عشقیہ قصے اس عہد کے ذکر کیے گئے ہیں، مثال کے طور پر المرثس الاکبر اور اسما کی محبت کا قصہ، المرثس الاصغر اور فاطمہ بنت منذر کے پیار کی
کہانی اور المنخل البشکری اور نعمان بن منذر کی بیوی مخرہ کے پیار کے عشق کے داستان وغیرہ۔ چونکہ ان کی زندگی میں نقل مکانی کثرت سے ہوا
کرتی تھی اس لیے محبوبہ اور اس کے قافلے کے کوچ کرنے کا ذکر ہمیں اکثر ان کے قصیدوں میں ملتا ہے۔

امرؤ القیس جسے الملک الضلیل کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، اپنی صحرا نوردی کے بعد جب ایک دفعہ اپنی محبوبہ عنیزہ کے پاس رات کی
تاریکی میں آیا تو اس نے کہا:

فقالَت سبَاک اللہ انک فاضحی الست تری الشُمَاز والناس احوالی

یعنی اللہ تجھے غارت کرے تو نے تو مجھے رسوا کر ڈالا، کیا تجھے دکھائی نہیں دیا کہ یہ لوگ میرے پاس ابھی تک جاگ رہے ہیں، اور گب
شپ میں لگے ہوئے ہیں، تو اس کے جواب میں اس نے عنیزہ سے کہا:

فقلت یمین اللہ ابرح قاعدا ولو قطعوا راسی لدیک وأوصالی

یعنی اللہ کی قسم میں یہاں سے نہیں اٹھونگا چاہے وہ لوگ میرا سر اور ہاتھ پاؤں کاٹ کر تیرے پاس رکھ دیں۔ ایشی نے پیرا نہ سالی کے

باوجود عورت کو مسیحا بتاتے ہوئے کہا:

لو أسندت مینا الی نحرھا عاش ولم ینقل الی قابر

یعنی اگر اس کی گردن سے کسی مردہ کو بھی چھوا دو تو وہ زندہ ہو جائے گا اور پھر اسے قبرستان لے جانے کی ضرورت نہیں رہ جائے گی۔ نابغہ الذبیانی نے اپنی محبوبہ کے محاسن کی وصف تشبیہات و استعارت کے ذریعہ واضح کرتے ہوئے کہا کہ:

بیضاء کالشمس و افت یوم أسعدھا لم تئذ أھلا ولم تُفحش علی جار

یعنی وہ سورج کی شعاؤں کی طرح گوری ہے، اپنی مرادوں کے دنوں کو پہنچ چکی ہے، یعنی جوان ہو چوکی ہے، نہ تو اس نے اپنے گھر والوں میں سے کسی کو تکلیف پہنچائی ہے، اور نہ ہی کسی پڑوسی کے ساتھ بدکلامی کی۔

والطیب یزداد طیباً ان یكون بہا فی جید و اضحۃ الخدین معطار

یعنی عطر کی خوشبو اس کی گردن سے لگ کر دو بالا ہو جاتی ہے، ایسی جس میں عطر بیز رخسار لگے ہوئے ہیں۔ جاہلی شاعری میں ہمیں عورتوں سے عشق و محبت کا اظہار بکثرت نظر آتا ہے۔ اس دور کی غزلیہ شاعری دو قسم کی تھی؛ ایک وہ جس میں شاعر اپنی محبت کا اظہار ذرا پاک و صاف انداز میں کرتا ہے، اور دوسری وہ جس میں شاعر بہت صراحت کے ساتھ اور کھل کر اپنی معشوقہ کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے۔

3.6.7 وصفیہ شاعری

یہ بھی جاہلی دور کی شاعری کا ایک اہم موضوع تھا، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عرب قوم کو اس صنف میں خاص مہارت حاصل تھی۔ اپنی صحرائی زندگی میں جس چیز پر بھی اس دور کے شعرا کی نظر پڑتی تھی وہ اس کی وصف اپنی شاعری کے ذریعہ ضرور بیان کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ریگستان، اونٹ، گھوڑے، اور دیگر صحرائی جانور یہ سب ان کی وصفیہ شاعری کے موضوعات بنے۔ طرفہ نے اپنے معلقہ میں اپنی اونٹنی کی وصف بیان کرنا شروع کی تو اس کا کوئی عضو ایسا نہیں چھوڑا جس کی وصف بیان نہ کی ہو۔ مفضیلات اور اصمعیات میں موجود اس دور کے قصیدے وصفیہ شاعری سے لبریز ہیں۔ شعرا وصفیہ شاعری میں تشبیہات کا بھر پور سہارا لیا کرتے تھے، اور اس میں وہ واقعی بڑے ماہر ہوا کرتے تھے۔ اونٹ کی تشبیہ کبھی مضبوط محلوں سے دیتے تو کبھی عالیشان پہاڑوں سے دیتے تو کبھی سمندری جہازوں سے دیتے۔ ایسے ہی گھوڑوں کی بھی بہترین تشبیہات کے ذریعہ خوب وصف بیان کی گئی ہے۔ اس حوالے سے امرؤ القیس کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

ایسے ہی شکاری کتوں اور شیروں کی بھی خوب وصف بیان کی گئی ہے، ابو زبید الطائی نے کتے اور شیر کے درمیان ہوئے مقابلہ کو بھی ایک قصیدہ میں ذکر کیا ہے، جب کہ طفیل الغنوی نے بھیڑ کی وصف اپنے ایک قصیدہ میں بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ بھی دوسرے بہت سے جانوروں کا ذکر ان کی شاعری میں ہمیں ملتا ہے۔ پرندوں میں عقاب اور غراب کا ذکر خاص طور سے ملتا ہے۔ جانوروں سے متعلق عہد جاہلی کی شاعری میں جو قصے کہانیاں بیان کی گئی ہیں ان میں سے بہت سی من گھڑت ہیں اور اس عہد کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔ جانوروں کی وصف کے علاوہ سیلاب، سمندر کی ہولناکی، چراگا ہیں، اسلحہ، شراب اور اس کے جام جیسے موضوعات بھی ان کی وصفیہ شاعری کا حصہ بنے۔

امرؤ القیس اپنی محبوبہ کا سراپا کھینچتے ہوئے کہتا ہے:

مُهْفَهْفَهَةٌ بِيضَاءٍ غَيْرِ مُفَاصَّةٍ ترائبها مصقولة كالسَّجْنَجِلِ

یعنی میری محبوبہ گوری اور تپتی کمروالی ہے، اس کا پیٹ ڈھیلا ڈھالا بدنما نہیں ہے، اور اس کا سینہ آئینہ کی طرح چکنا اور صاف و شفاف ہے۔ و

جید کجید الزیم لیس بفاحش إذاهی نَصَّتْهُ وَلَا بِمَعْطَلِ

یعنی اس کی گردن سفید ہرنی کی گردن جیسی ہے، جب وہ اپنی گردن کو اٹھاتی ہے تو اس کی لمبائی بدنما نہیں معلوم ہوتی اور نہ ہی وہ زیورات سے خالی نظر آتی ہے۔

و فرع یزین المتنَ أسود فاحم أثیث کقنو النخلة المتعشکل

یعنی میری محبوبہ کی چوٹی کے بال اتنے کالے اور گھنے ہیں کہ پشت کے حسن کو دو بالا کر دیتے ہیں، اور اتنے گھنے ہیں جیسے خوشوں سے لدی ہوئی کھجور کے درخت کی کوئی ٹہنی ہو۔ گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے امرؤ القیس کہتا ہے:

مِکر مِفر مِقْبَلِ مُدْبِرِ مِعَاً کجلمو د صخر حطه السیل من عل

یعنی وہ ایک ہی وقت میں جب موقع ملے آگے بڑھ جاتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹ جاتا ہے، اور اتنا تیز رفتار ہے جیسے کوئی پہاڑ کی چٹان ہو جسے تیز سیلاب کی دھار نے اوپر سے نیچے پھینک دیا ہو۔

مندرجہ بالا اقسام کے علاوہ دور جاہلی کی شاعری میں ہمیں چند و نصح اور حکمتوں پر مبنی اشعار بھی ملتے ہیں۔ اس حوالے سے زہیر بن ابی سلمیٰ، الافوہ الأودی، اور علقمہ بن عبیدہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس عہد کے قصیدوں میں ہمیں مختلف موضوعات اکثر یکجا نظر آتے ہیں، یعنی ایک ہی قصیدے میں تشبیب یا دیار حبیب کی یاد میں کہے گئے اشعار بھی ہوتے ہیں، محبت کا قصہ بھی ہوتا ہے، صحراؤں کا ذکر بھی ہوتا ہے، اونٹ اور گھوڑوں کا وصف بھی ہوتا ہے، اور حماسہ، ہجو، مرثیہ، اور مدح جیسے موضوعات بھی شامل ہوتے ہیں۔ البتہ کچھ قصیدے کسی خاص موضوع یا صنف پر زیادہ مرکوز ہوتے ہیں، ورنہ زیادہ تر قصیدوں میں مختلف موضوعات اور اصناف موجود ہوتی ہیں۔

اس دور کی شاعری میں ہمیں وصفیہ شاعری کی مندرجہ ذیل انواع بطور خاص نظر آتی ہیں:

وصف الاطلاق: اس میں شاعر اپنے محبوب سے ملنے کے لیے آتا تو دیکھتا کہ اس کا قافلہ وہاں سے ہجرت کر چکا ہوتا ہے، تو اس کے باقی بچے آثار پر ایشک بہاتا ہے، اور

اپنے محبوب و یاد کرتا ہے اور محبوب سے ملاقات کو شوق ظاہر کرتا ہے۔

وصف الراحلة: اس میں شاعر اپنی سواری خواہ وہ اونٹ ہو یا گھوڑا ہو اس کی وصف میں اشعار کہتا ہے۔

وصف الصيد: اس میں شاعر اپنے شکار کا قصہ بیان کرتا ہے اور شکاری جانوروں کی وصف میں اشعار کہتا ہے، یہ شکار شوقیہ بھی ہوتا تھا اور کسب معاش کے لیے بھی ہوتا تھا۔

وصف الطبیعة: اس میں شاعر صحراؤں اور پہاڑوں کی وصف بیان کرتا ہے، ایسے ہی وادیوں، ہواؤں اور بارش کا بھی ذکر کرتا ہے۔

جاہلی دور کے عرب جس قسم کی سادہ زندگی گزارتے تھے وہی سادگی ہمیں ان کی شاعری میں بھی صاف نظر آتی ہے۔ ان کا طرز حیات قیصر و کسری کی زرق و برق اور پرشکوہ تہذیبوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ فطرت کی گود میں جیتے تھے اور نہایت فطری انداز کی سوچ رکھتے تھے، جس میں نہ تو بہت زیادہ نمود و نمائش ہوتی تھی اور نہ ہی بہت زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی۔ جن صحراؤں میں وہ رہتے تھے، جن وادیوں سے وہ گزرتے تھے، جن پہاڑوں کے ذریعہ وہ اپنی حفاظت کرتے تھے، جن جانوروں پر ان کی زندگی کا دار و مدار تھا، ان سب میں ایک طرح کی سادگی پائی جاتی تھی، اور اس سادگی کا پورا عکس ہمیں ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

جاہلی دور کے عرب نہایت سادہ مزاج اور فطرت سے بہت قریب تھے۔ ان کے یہاں کسی بھی طرح کا تصنع یا تکلف نہیں پایا جاتا تھا، وہ لوگ بہت ہی آزاد خیال تھے اور کسی کے بھی ظلم یا دباؤ میں رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لہذا جو بھی احساسات و جذبات ہوتے تھے، انہیں وہ نہایت سادہ طریقے سے بلا واسطہ بیان کر دیتے تھے۔ خود ایک جاہلی شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ کے اس شعر سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

وان أشعر بیت انت قائلہ بیت، یقال إذا انشدتہ، صدقا

جاہلی دور کا شاعر جب اپنے عشق کا قصہ بیان کرتا ہے تو پوری حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے جو بھی واقعات ہوتے ہیں یا احساسات ہوتے ہیں انہیں پورے صدق و صفا کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ جاہلی شاعر کی یہ سادہ مزاجی اور فطرت سے ہم آہنگی اس کی شاعری کے ہر موضوع میں ہمیں نظر آتی ہے خواہ وہ عشقیہ شاعری ہو یا مرثیہ گوئی ہو یا ہجائیہ شاعری ہو یا وصفیہ شاعری ہو، مبالغہ آرائی ہمیں برائے نام ہی اس عہد کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں ہمیں تشبیہ، مجاز اور کنایہ جیسی بلاغت کی خوبیاں تو ضرور نظر آئیں گی لیکن انہیں بھی اس انداز کی مبالغہ آرائی نظر نہیں آئے گی جس انداز کی بعد کے ادوار میں اور بطور خاص عصر عباسی میں نظر آتی ہے۔

جاہلی شاعری پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں معانی کی گہرائی اور تنوع اس قدر نظر نہیں آتا جس قدر الفاظ کی خوبصورتی اور انوکھا پن نظر آتا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی سوچ نہایت ماڈی اور سادہ تھی جب کہ زبان پر قدرت بے پناہ تھی جس کی وجہ سے سادہ و سطنی معانی و مفہیم کو وہ بہترین سے بہترین الفاظ کا جامہ پہنانا بخوبی جانتے تھے۔ نادر الفاظ کا استعمال بھی رائج تھا لیکن بہت عام نہیں تھا بلکہ تعلقات وغیرہ میں ہمیں اس کی کثرت نظر آتی ہے، جب کہ اس عہد کے بہت سے قصائد نہایت سہل اور شستہ لب و لہجہ میں کہے گئے تھے۔

جاہلی اشعار پر معنوی سطحیت اور حسیت اس قدر غالب تھی کہ کسی بھی موضوع پر اس دور کے شعرا شاعری کرتے تو اس میں بہت مماثلت نظر آتی، گویا سب کے سامنے وہی مناظر اور شجر و حجر اور چرند و پرند ہوں اور سب یکساں طور پر ان سے اپنے معانی و مفہیم اخذ کر رہے ہوں۔ شاعری کی کوئی بھی صنف ہو جاہلی شعرا کے یہاں اس کے معانی و موضوعات میں کافی مشابہت نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر طرفہ کا اوٹنی کے وصف میں جو انداز ہے وہی انداز دوسرے شعرا کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ ایسے ہی امرؤ القیس نے دیار حبیب پر آنسو بہانے کا جو انداز اختیار کیا ہے وہی انداز دیگر شعرا کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ عمرو بن کلثوم جس لب و لہجہ میں اپنی قوم کے حوصلے بلند کرتا ہے، وہی لب و لہجہ دیگر شعرا کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ الغرض معانی کے اعتبار سے بہت یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ہر شاعر کا لب و لہجہ اور اسلوب بیان جدا گانہ ہوتا

ہے لیکن معانی و موضوعات بالعموم وہی ہوتے ہیں۔ جاہلی شاعر اپنی شاعری میں اپنی بات کو تفصیل سے پیش کرتا ہے بلکہ بسا اوقات سیاق سے بھٹک بھی جاتا ہے اور دوسرے موضوعات میں داخل ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے بات مختصر ہونے کے بجائے اکثر طویل ہو جاتی ہے۔

اس ضمن میں ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ جس طرح اس دور کے عربوں کی زندگی میں ثبات و استقرار کی کمی تھی اور وہ ہمیشہ پابہ رکاب رہتے تھے، پانی کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے، اس کا صاف اثر ان کی شاعری میں بھی نظر آتا۔ ایک صنف یا موضوع پر گفتگو کرتے کرتے اچانک دوسری صنف یا موضوع میں داخل ہو جاتے تھے، اور بار بار موضوع بدلنے کی وجہ سے ان کے قصیدوں میں معنی و موضوع کا تسلسل یا ربط اکثر ٹوٹ جاتا تھا۔ کم ہی ایسا دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایک قصیدہ ایک ہی موضوع کے ارد گرد گھومتا ہو جسے 'وحدۃ الموضوع' کہتے ہیں۔ بلکہ اس دور کے قصیدوں میں اکثر مختلف موضوعات یکجا نظر آتے ہیں۔

جاہلی دور کی شاعری میں ہمیں اسلوب نہایت پختہ اور تعبیرات نہایت عمدہ نظر آتی ہیں۔ الفاظ اور ان کے مدلولات میں حسیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ ہر لفظ اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے بالکل سٹیک اور دقیق نظر آتا ہے۔ موضوعات تقریباً ایک جیسے ہوتے تھے، لیکن انہی موضوعات کو ہر شاعر اپنے منفرد اسلوب اور لب و لہجہ میں بیان کرتا تھا جس سے زبان پر ان کی قدرت اور ملکہ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شعر اپنے قصائد لکھنے کے بعد ان کا بار بار مراجعہ کرتے تھے۔ کچھ شعر تو ایک ایک سال تک ان پر نظر ثانی کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے قصائد کو حولیات کہا جاتا تھا، جیسے زہیر بن ابی سلمیٰ کے قصائد۔ اس کے پیچھے ان کا ایک ہی مقصد ہوتا تھا کہ ہر معنی و مفہوم کے لیے بالکل موزوں اور مناسب الفاظ و تعبیرات استعمال کی جائیں۔ بسا اوقات شاعر اپنا قصیدہ کسی دوسرے شاعر کے سامنے اصلاح کی غرض سے پیش کرتا تھا اور پھر حسب ضرورت الفاظ و تعبیرات میں رد و بدل کر لیتا تھا۔ یا کبھی کبھی اپنے راویوں کے ذریعہ مراجعہ کروایا کرتا تھا، اور اس میں حسب ضرورت تبدیلی کر لیتا تھا۔ اس قدر اہتمام صرف اس لیے کیا جاتا تھا کہ اسلوب زیادہ سے زیادہ پختہ اور موثر ہو سکے۔

جاہلی دور کے عربوں میں سے اکثریت کی زبان دوسری زبانوں کے اثرات سے محفوظ تھی اسی لیے ان کے یہاں عربی زبان کی فصاحت و بلاغت ہمیں پورے آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ شمالی اور جنوب جزیرہ نمائے عرب کے کچھ علاقوں میں ضرور دوسری معاصر تہذیبوں کے اثرات مرتب ہوئے تھے لیکن باقی علاقے ان بیرونی اثرات سے محفوظ تھے، جس کی وجہ سے ان کی زبان بھی بہت صاف و شفاف تھی۔

مجاز اور کنایہ جیسی بلاغت کی انواع و اقسام جو عباسی دور میں ہمیں اپنے عروج پر نظر آتی ہیں، جاہلی دور میں بہت کم استعمال ہوتی تھیں۔ ہاں نادر عربی الفاظ کے استعمال کی وجہ سے لب و لہجہ ذرا ثقیل اور پیچیدہ ضرور محسوس ہوتا ہے۔ لیکن شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہی الفاظ و تعبیرات اس دور میں رائج تھے، اب ہمارے لیے ان کو سمجھنے میں ذرا دقت پیش آتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ جاہلی دور کی تمام شاعری ایسے نادر اور ثقیل الفاظ سے پر ہے، بلکہ اس میں بھی ہمیں سہل اور شستہ قسم کے اشعار مل جاتے ہیں، چنانچہ عدی بن زید کے اشعار نہایت سہل اور شستہ ہوتے ہیں، کیونکہ کہ اس کا اس دور کی مختلف تہذیبوں سے رابطہ قائم تھا۔ اس دور کے عربوں کی اپنی زبان پر مضبوط پکڑ ہوتی تھی، چنانچہ نحوی و صرفی اعتبار سے کسی طرح کا جھول نہیں ہوتا تھا، ہر لفظ اپنی جگہ پر بالکل باریکی کے ساتھ استعمال کیا جاتا تھا۔

ان کے اسلوب کی ایک اور خاص بات یہ تھی کہ اس میں ایک طرح کی نغمگی اور موسیقیت پائی جاتی تھی، اس میں ایک طرح کی

سلاست اور روانی پائی جاتی تھی، بے مثال حلاوت اور جاذبیت پائی جاتی تھی۔ اپنے کلام کو مزید اثر انداز بنانے کے لیے وہ مختلف قسم کے محسنات لفظیہ کا بھی استعمال کرتے تھے، بطور خاص تشبیہات و استعارات کا خوب سہارا لیتے تھے۔ طباق اور جناس کا استعمال بھی ہمیں اس دور کی شاعری میں نظر آتا ہے، اگرچہ عباسی دور کے مقابلے میں اس دور میں اس کا استعمال بہت محدود تھا۔

اس دور کی شاعری یقیناً اس دور کی بہترین آئینہ دار ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ 'الشعر دیوان العرب'۔ قدیم دور سے ہی عرب مصنفین نے عہد جاہلی کے ماحول اور سماج کے بارے میں گفتگو کرتے وقت اس دور کے اشعار سے پورا استفادہ کیا اور خوب استنباط کیا۔ جاحظ نے "کتاب الحيوان" میں اس دور کے حیوانات کی تفصیل بیان کرنے میں بھی اس دور کے اشعار سے پورا استفادہ کیا ہے۔

3.8 جاہلی ادب : نثر

3.8.1 نثر

ہم اپنے گھروں، بازاروں، دفاتروں اور ملنے جلنے کی دوسری جگہوں پر اپنی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے اور اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے زبان سے جو کچھ بولتے ہیں اسے عام طور سے نثر میں بولتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقعوں پر انسان سوچ سمجھ کر، خاص ترتیب سے اور اپنی بات میں موزونیت یا موسیقیت پیدا کر کے دوسروں سے مخاطب نہیں ہوتا اور نہ ہی اپنے خیالات و افکار پیش کرنے میں فنی تسلسل کا خیال رکھتا ہے اور نہ ہی عقلی اور منطقی اصولوں کو پیش نظر رکھتا ہے اور نہ ہی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے مطلب کو بیان کرنے کے لیے منتخب اور پیچیدہ الفاظ کو استعمال کرے۔ بلکہ ایسے موقعوں پر جس ترتیب اور موقع محل کے اعتبار سے جس انداز سے خیالات اس کے ذہن میں آتے جاتے ہیں انہیں بیان کرتا جاتا ہے۔ اس طرز تخاطب یا اس انداز سے اپنے دل کی بات کہنے کو اصطلاح میں "عام بول چال" کہتے ہیں۔ کیونکہ عام بول چال میں وہ فنی باریکیاں نہیں ہوتیں جو کسی کلام کو عام سطح سے اٹھا کر اس خاص سطح پر پہنچادیں جہاں کلام ہماری روزمرہ کی بول چال سے ممتاز ہو کر اس بلند اور اعلیٰ سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں سامع کے گوش و ہوش جھنجھنا اٹھتے ہیں، یا کسی ابدی حقیقت کا اس پر انکشاف ہوتا ہے، یا ایسی پتے کی بات معلوم ہوتی ہے جو عام طور سے روزمرہ کی گفتگو میں نہیں معلوم ہوتی، اسی لیے نثر کی اس قسم کو ادب کا درجہ حاصل نہیں۔ کیونکہ جب کسی کلام میں فنی شرائط مفقود ہوں تو وہ کسی زبان و لغت کا وہ حصہ یا بجزء نہیں بن سکتا ہے جسے "ادب" کا نام دیا جاتا ہے۔

اس سے پہلے اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ عصر جاہلی میں فنون ادب کے حوالے سے جو اہمیت شعر کو حاصل رہی ہے وہ نثر کو حاصل نہیں رہی، اور اس دور میں شعرا کی اس قدر کثرت تھی کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہر شخص فطری طور پر ایک شاعر ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ اس دور میں نثری ادب مفقود تھا یا اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی، اپنی روزمرہ کی زندگی میں وہ لوگ جو اسلوب ایک دوسرے سے گفتگو کے وقت اختیار کرتے تھے وہ یقیناً نثری اسلوب ہی ہوا کرتا تھا، لیکن ظاہری بات ہے کہ وہ سب نثری ادب کا حصہ نہیں تھا، بلکہ جو بات قصداً ادبی لب و لہجہ اور اسلوب میں کہی جاتی تھی اسی کو اس عہد کے نثری ادب کی حیثیت حاصل ہے، یعنی ایسا کلام جس کے ذریعہ سامع کے دل و دماغ میں اس کے متوقع اثرات مرتب ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے جب صاحب کلام اپنے کلام کو کسی خاص مقصد سے ادبی پیرائے میں ڈال کر سامع کے سامنے پیش کرے۔ جاہلی دور میں ہمیں اس طرح کے ادبی نثر کی مختلف اقسام نظر آتی ہیں، جن میں قصے، محاورے، خطبے، اور کائنات کی مسجع و مقفی

عبارتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انہیں اقسام پر مختصر گفتگو یہاں کی جائے گی تاکہ جاہلی دور میں نثری فنون کے ارتقا کا ایک اندازہ ہو سکے۔ یقیناً شعر کے مقابلے میں نثر زیادہ قدیم ہے، لیکن جاہلی دور میں نثر کو بحیثیت فن اس قدر استعمال نہیں کیا گیا جس قدر شعر کو استعمال کیا گیا۔ ابن رشیق القیروانی کے مطابق قدیم عربی نثر یعنی دور جاہلی کی نثر کا صرف دس فیصد سرمایہ ہی باقی بچا اور ہم تک پہنچ سکا جب کہ شعر کا زیادہ تر سرمایہ باقی رہا اور ہمیں حاصل ہو گیا، حالانکہ بعض دوسرے مؤرخین کے مطابق قدیم عربی شعر کا بھی زیادہ تر حصہ ضائع ہو چکا ہے۔

جاہلی دور میں جس طرح شعر کے حوالے سے ذکر کیا جاتا ہے کہ چند عمدہ قصیدوں کو لکھ کر خانہ کعبہ کی دیوار پر چسپاں کر دیا جاتا تھا جنہیں معلمات کہا جاتا تھا، نثر کے حوالے سے اس قسم کی تحریروں کا کوئی پختہ ثبوت نہیں ملتا۔ حالانکہ خود معلمات کو خانہ کعبہ پر چسپاں کیے جانے کے سلسلے میں محققین و مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔ جاہلی دور میں عربی نثر کے تحریری شکل میں استعمال ہونے کے حوالے سے ایک روایت یہ بھی نقل کی جاتی ہے کہ ایک بار سوید بن صامت حج یا عمرہ کی غرض سے مکہ آیا تو اللہ کے رسولؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی۔ جواب میں اس نے کہا کہ اس طرح کا کلام تو میرے پاس بھی ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے پوچھا کیا ہے تمہارے پاس؟ تو اس نے کہا کہ میرے پاس مجلہ لقمان ہے۔ تو اللہ کے رسولؐ نے کہا کہ ذرا اسے پیش کرو۔ جب اللہ کے رسولؐ نے اسے سنا تو کہا کہ یہ ایک اچھا کلام ہے لیکن جو میرے پاس ہے وہ اس سے بھی بہتر کلام ہے، میرے پاس قرآن ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر نازل فرمایا ہے، جس میں ہدایت ہے اور نور ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے اسے قرآن کی کچھ آیات پڑھ کر سنائیں اور اسے اسلام کی دعوت دی، لیکن اس کا جواب بھی یہی تھا کہ یہ کلام بھی اچھا ہے۔ الغرض یہ کہ سوید بن صامت کے پاس تحریری شکل میں کچھ عربی کلام تھا جس کا نام اس نے مجلہ لقمان بتایا، اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس عہد میں بھی عربی نثر محدود پیمانے پر ہی صحیح تحریری شکل میں وجود میں آچکی تھی۔

جاہلی دور کی نثر کی توثیق کے بارے میں وہی موقف اختیار کرنا بہتر ہوگا، جو اس دور کی طرف منسوب اشعار کے تئیں اختیار کیا جاتا ہے، یعنی اس دور کا جو بھی نثری سرمایہ ہم تک پہنچا ہے اس کی چھان پھٹک کرنے کے بعد ہی اس کی تصدیق و توثیق کی جانی چاہیے، کیونکہ شعر نثر کے مقابلے میں اپنے وزن و قافیہ کی وجہ سے تادیر حافظہ میں محفوظ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

3.8.2 جاہلی دور میں فن قصہ

جاہلی دور کے جن چار نثری فنون کا ذکر اوپر آیا ان میں سے ایک فن قصہ ہے۔ دور جاہلی کے ان چاروں فنون کے حوالے سے کچھ آثار ہمیں ملے ہیں جن سے اس دور میں ان نثری فنون کے رواج اور ان کے ارتقا کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اپنے خالی اوقات میں وقت گزاری کے لیے عرب لوگ قصہ گوئی کا سہارا لیا کرتے تھے۔ وہ اکثر رات کے سناٹے میں جمع ہو کر ایک دوسرے کو قصے سنایا کرتے اور ہمہ تن گوش ان قصوں کو سنتے۔ وہ قصہ گو یقیناً اپنے اسلاف سے ان قصوں کو سن کر انہیں اپنے سامعین کے سامنے پیش کرتے ہوئے، اور ان میں اپنی فصاحت و بلاغت کے جوہر بھی ضرور دکھاتے ہوئے۔

دور جاہلی کے یہ قصے اس دور میں تحریر و تدوین سے ہمکنار نہ ہو سکے، بلکہ یونہی نسل در نسل راویوں کے ذریعہ اپنا سفر طے کرتے رہے، یہاں تک کہ دوسری صدی ہجری میں کہیں جا کر جب عباسی دور میں تدوین علوم کا رواج عام ہوا تب یہ قصے قرطاس و قلم کے سپرد کیے گئے۔

چنانچہ عصر عباسی میں جاہلی دور کے جو قصے مدون کیے گئے ان میں مرورِ ایام کے ساتھ یقیناً بہت سی تبدیلیاں بھی واقع ہوئی ہوں گی، البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان کا بنیادی خاکہ وہی تھا جو عصرِ جاہلی میں موجود تھا۔

جاہلی دور کے ان قصوں میں سے زیادہ تر کا تعلق ان کی جنگوں اور ان کے کارناموں سے ہوتا تھا۔ کچھ قصے قدیم عرب مملکتوں جیسے شمالی جزیرہ نمائے عرب میں واقع غساسنہ اور منازہ کی مملکتوں یا جنوبی جزیرہ نمائے عرب میں واقع حمیری مملکت سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بادشاہوں اور ان کے عروج و زوال کے قصے بیان کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسری قوموں کے قصے بھی سنائے جاتے تھے، جیسا کہ نصر بن حارث کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ملک فارس کے قصے عربوں کو سنایا کرتا تھا۔ بہت سے قصوں میں ان کے کاہنوں، شاعروں اور مختلف قبائل کے سرداروں کا ذکر ہوا کرتا تھا، جیسے مرثش اور امرؤ القیس وغیرہ کے قصے جو عربی ادب کے قدیم مصادر میں ہمیں جگہ جگہ نظر آ جاتے ہیں۔ ان میں بہت سے قصوں کے حقیقت پر مبنی ہونے پر شک بھی ظاہر کیا گیا ہے البتہ اتنا طے ہے کہ زیادہ تر قصے بعد میں تحریف اور حذف و اضافہ کا شکار ہوئے ہیں، خواہ ایسا ان کی جزئیات کے اعتبار سے ہوا ہو یا ان کے زبان و اسلوب اور لب و لہجہ کے اعتبار سے ہوا ہو۔ محققین کے مطابق دورِ جاہلی کی طرف منسوب بعض قصوں کے تحلیل و تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں بہت سے قصے دوسری قدیم اقوام کے قصوں سے ماخوذ یا متاثر تھے۔ جنوں اور شیاطین پر مبنی قصے بھی اس دور میں بیان کیے جاتے تھے۔

3.8.3 امثال یا محاورے

امثال یا محاورے دراصل ایسے مختصر جملے ہوتے ہیں جن میں کوئی صحیح رائے یا کوئی عام اصول یا کسی واقعہ کا حوالہ محض چند الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ ان کا تعلق اکثر کسی خاص واقعہ یا پس منظر سے ہوتا ہے، پھر جب بھی اس کے مماثل کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو اس اصل واقعہ کی طرف حوالہ دیتے ہوئے وہ مثل بیان کر دی جاتی ہے۔ جس طرح جاہلی دور کے بعض قصے ہم تک پہنچے ہیں اسی طرح اس دور کے کچھ عربی محاورے بھی ہمیں قدیم مصادر میں ملتے ہیں۔ اس دور کے ان امثال کی جمع و ترتیب کا کام تو پہلی صدی ہجری میں شروع ہو گیا تھا جیسا کہ ابن ندیم نے اپنی شہرہ آفاق کتاب الفہرست میں حضرت معاویہ کے دور کے ایک قصہ گو عبید بن شریہ کی امثال پر پچاس صفحات پر مشتمل ایک کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے از خود اس کتاب کو دیکھا ہے، حالانکہ یہ کتاب ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ البتہ قدیم عربی امثال پر لکھی گئی ان اولین کتابوں میں سے ایک اہم کتاب دوسری ہجری کے اسکالر المفضل الضبی کی کتاب امثال العرب ہے، اس کے بعد ہمیں تیسری صدی ہجری کے معروف مصنف ابو عبید القاسم بن سلام کی کتاب ملتی ہے جس کی شرح بعد میں ابو عبید البکری نے ”فصل المقال فی شرح کتاب الامثال لابن عبید القاسم بن سلام“ کے نام سے لکھی۔ قدیم عربی امثال پر لکھی گئی دیگر کتابوں میں ابو ہلال العسکری کی جمہرۃ الامثال، المیدانی کی مجمع الامثال اور الزمخشری کی المستقصى خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ المیدانی کی مجمع الامثال ایک نہایت جامع کتاب ہے۔ ان سب کتابوں میں جاہلی امثال کے علاوہ بعد کے عصور کی امثال بھی شامل ہیں۔

ان کتابوں کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں صرف امثال کو ذکر کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر مثل کے پس منظر میں جو قصہ یا کہانی بیان کی جاتی تھی اس کو بھی ضمناً ان کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ ان میں سے زیادہ تر قصوں کے مستند ہونے یا نہ ہونے کے بارے

میں یقین کے ساتھ کچھ بھی کہنا مشکل ہے لیکن اتنا یقین کے ساتھ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان امثال میں سے بیش تر کا تعلق جاہلی دور سے ہی رہا ہوگا، اور وہ اپنی اصل شکل و صورت میں راویوں کے ذریعہ سے ان مصنفین تک پہنچی ہوگی۔

اس حوالے سے ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ ان مذکورہ بالا کتابوں میں جاہلی دور کی سبھی امثال کی تحدید باقاعدہ طور پر نہیں کی گئی ہے بلکہ بعض امثال کے ساتھ ذکر کیے گئے قصوں کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق جاہلی دور سے ہے، کیوں کہ ان کتابوں میں عہد اسلامی کی امثال بھی موجود ہیں۔ جن امثال کے بارے میں مصنف نے یقین کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ ان کا تعلق دور جاہلی سے ہے ان کی نسبت تو عہد جاہلی کی طرف طے ہو جاتی ہے لیکن جن کی تحدید مصنف نے خود نہیں کی ہے ان کی بابت ان سے منسلک قصوں کے ذریعہ ان کے زمانے کی تحدید کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جاہلی دور کی طرف جو امثال و محاورات منسوب ہیں ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کو قوم عاد کے ایک شخص لقمان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ محققین کے مطابق یہ وہ لقمان الحکیم نہیں ہیں جن کا قصہ قرآن کریم میں سورہ لقمان میں وارد ہوا ہے بلکہ ایک دوسرے شخص ہیں جن کی طرف قدیم عربی نثر میں کچھ امثال و محاورات منسوب کیے جاتے ہیں۔ ایسے ہی جاہلی دور کے مشہور خطیب اکثم بن صیفی التمیمی کی طرف بھی بہت سی امثال منسوب کی جاتی ہیں، اس کی امثال ادب کے بعض مصادر میں موجود ہیں۔ ایسے ہی عامر بن الظرب العدوانی کا نام بھی اس حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔

اس دور کی طرف منسوب زیادہ تر امثال کے قائلین کا ہمیں پتہ نہیں چلتا اور ان میں سے بہت سی امثال ایسی بھی ہیں جن میں نحوی قواعد کی مخالفت پائی جاتی ہے لیکن انہیں ویسے ہی استعمال کیا جاتا ہے جیسا عربوں سے انہیں سنا گیا ہے۔ کچھ بھی ہو ان امثال میں سے زیادہ تر امثال کا اسلوب نہایت فصیح و بلیغ ہے اور یہ بات اس دور کے اعلیٰ ادبی معیار اور فصاحت و بلاغت کی بلندی کا واضح ثبوت ہے۔

جاہلی دور کی کچھ امثال:

- | | |
|---------------------------------------------------|-------------------------------------------------------------------------------------------------|
| ۱۔ ان البغاث بأرضنا تستنسر | (یعنی: بلی بھی اپنے دروازے پر شیر ہوتی ہے، یا کتا بھی اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے) |
| ۲۔ رَبَّ رَمِيَةٍ مِنْ غَيْرِ رَامٍ | (یعنی: اندھے کے ہاتھ بٹیر) |
| ۳۔ الْحَدِيثُ ذُو شُجُونٍ | (یعنی: بات سے بات نکلتی ہے) |
| ۴۔ اِنَّ الْعَوَانَ لَا تُعَلَّمُ الْجِمْرَةَ | (تجربہ کار شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں یعنی جو انسان تجربہ کار ہو اس کو ہر چیز بتانا نہیں پڑتی) |
| ۵۔ سَبَقَ السَّيْفُ الْعَدْلَ | (یعنی اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں جگ گئیں کھیت) |
| ۶۔ اِنْ كُنْتَ رِيحًا فَقَدْ لَاقَيْتَ اِعْصَارًا | (یعنی سیر کو سوا سیر، یا اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے) |
| ۷۔ اِنْكَ لَا تَجْنِي مِنَ الشُّوْكَ الْعَنْبَ | (یعنی جیسا بوؤ گے ویسا پاؤ گے) |

3.8.4 خطابت

”خطابت“ ”نثر فنی“ کی بہترین قسموں میں شمار جاتی ہے۔ یہ نثر کی وہ قسم ہے جس میں کوئی ممتاز شخص کسی ملکی یا سماجی مسئلہ پر یا زندگی کے کسی اہم پہلو پر کسی مجمع میں اپنی نقطہ نظر کی وضاحت اس غرض سے کرے کہ وہ مجمع کو متاثر کر کے اپنا ہم خیال بنالے۔ جب فن خطابت کی یہ غرض وغایت ہے تو خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ سننے والوں کی عقلی و ذہنی کیفیت سے پوری طرح واقف ہو، اور وہ جس موضوع پر بول رہا ہے اس میں اسے مہارت تامہ حاصل ہو اور زبان پر ایسی قدرت ہو کہ جب بولنا شروع کرے تو اپنی قوت بیان کی جاذبیت، الفاظ کے زیر و بم و خوبصورتی، قوت استدلال کے اچھوتے پن اور ندرت سے سامعین کے دل و دماغ پر اس طرح چھا جائے کہ وہ پوری طرح مطمئن ہو کر وہ سب کچھ کہنے لگے جسے مقرر ان سے کہلوانا چاہتا ہے یا وہ سب کچھ کرنے لگیں جسے مقرر ان سے کروانا چاہتا ہے۔“

فن خطابت قدیم یونانی اور رومانی تہذیبوں میں کافی حد تک رائج اور مقبول تھا، عرب قوم ایک نہایت جری اور خوددار قوم تھی، اسی لیے زبان و بیان کو ان کی زندگی میں بہت اہمیت حاصل تھی، ہر ایک اپنی بات کو قاعدے سے رکھنا اور منوانا جانتا تھا، اسی لیے ان کے یہاں بھی خطابت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ عربوں کو خطابت میں خدا داد صلاحیت حاصل تھی ایسے ہی جیسے فن شاعری میں انہیں فطری صلاحیت حاصل تھی۔ وہ اپنے بچوں کو خطابت کی مشق بھی کرایا کرتے تھے۔ قبیلے کا سردار بننے کے لیے ضروری تھا کہ وہ شخص ایک بہترین خطیب بھی ہوتا کہ اہل قبیلہ کی بہترین نمائندگی اپنی خطابت کے ذریعہ کر سکے۔ اس دور میں وفود کی آمد و رفت کا سلسلہ لگا رہتا تھا۔ بلاد روم و فارس، ہندوستان اور چین وغیرہ سے وفد بلاد عربیہ پہنچا کرتے تھے اور خود عربوں کے وفود دور دراز کے علاقوں میں جایا کرتے تھے، کبھی تجارت کی غرض سے اور کبھی سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت۔

فن خطابت میں دلچسپی اور اس میں مہارت حاصل کرنے کا رجحان ہمیں زیادہ تر قدیم تہذیبوں میں نظر آتا ہے، اہل فارس کے بارے میں جاہظ نے لکھا ہے کہ وہ لوگ اس فن میں بے انتہا ماہر ہوا کرتے تھے، جب کہ اہل یونان بھی اس فن میں کسی سے کم نہ تھے۔ خطابت دراصل کوئی آسان فن نہیں ہے اور فی البدیہہ مؤثر انداز میں اپنی بات کو رکھنا اور منوانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ عرب قوم میں بدوؤں کو اس فن میں خاص مہارت حاصل تھی، کیونکہ بدو لوگ فطرت سے قریب ہونے کی وجہ سے فطری انداز میں تقریر کیا کرتے تھے، ساتھ ہی وہ نہایت جری اور بے باک بھی ہوا کرتے تھے جس کو خطابت کی اہم شرائط میں گردانا جاتا ہے۔

دور جاہلی میں خطابت کا بہت رواج تھا اور جن حالات میں وہ لوگ اپنی زندگی گزارتے تھے اس کا یہی تقاضا بھی تھا، چنانچہ وہ جس انداز کی آزادانہ زندگی گزارتے تھے، جس طرح ان میں آپس میں ہمیشہ جنگیں جاری رہتی تھی جن کی وجہ سے ان کے سردار کبھی ان کو جنگ کے لیے بھڑکاتے تو کبھی مصالحت کی طرف بلاتے، اس کے علاوہ ان کی فصاحت و بلاغت ان کی حاضر جوابی، ان کے میلے اور راتوں کی محفلیں یہ سب چیزیں خطابت کے لیے اس دور میں ایک سازگار ماحول پیدا کرتی تھیں، بلکہ اس بات کی ضامن تھیں کہ یہ فن اس قوم میں خوب پروان چڑھے اور عظیم خطبا ان میں پیدا ہوں۔

جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں واقع منازہ نامی ریاست کے بادشاہوں کے ایران کے بادشاہ کسری سے بہت اچھے تعلقات ہوا کرتے تھے۔ منازہ کے ہی ایک بادشاہ نعمان بن منذر نے کبھی کسری کے سامنے اپنے خطیبوں کی فصاحت و بلاغت کا تذکرہ کیا ہوگا۔ کسری

نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اسے بھی عرب خطیبوں کے یہ جوہر دیکھنے کا موقع ملے۔ چنانچہ نعمان نے اپنے خطیبوں کی ایک جماعت تیار کی جن میں اکثم بن صیفی، حاجب بن زرارہ، حارث بن ظالم، قیس بن مسعود، خالد بن جعفر، علقمہ بن علاشہ اور عامر بن طفیل جیسے ماہر خطیب شامل تھے۔ ان سب خطیبوں نے کسری کے دربار میں اپنی خطابت کے ایسے جوہر دکھائے کہ کسری بھی عربوں کی خطیبانہ صلاحیت کا قائل ہو گیا۔

ادب کے مصادر اس دور کے خطیبوں سے لبریز ہیں۔ چنانچہ ہمیں اس دور کے بہترین خطبے ابن عبد ربہ کی ”العقد الفرید“، جاحظ کی ”البيان والتبيين“، ابوالفرج الاصفہانی کی ”الآغانی“ اور دوسرے مراجع میں کثیر تعداد میں نظر آجاتے ہیں۔

خطابت کا استعمال مختلف مواقع پر کیا جاتا تھا۔ کبھی اس کا استعمال اپنی قوم کو دشمن کے خلاف اکسانے کے لیے کیا جاتا تھا، تو کبھی اپنے قبیلے پر فخر و مباہات کے لیے کیا جاتا تھا، تو کبھی مصالحت کے لیے اس کا استعمال کیا جاتا تھا، تو کبھی اپنے سرداروں اور حاکموں کے دربار میں حاضر ی کے وقت کیا جاتا تھا، چنانچہ کبھی تو غسانہ اور منذرہ کے درباروں میں جب عرب قافلے پہنچتے تو ان کے نمائندے ان بادشاہوں کے سامنے تقریر کر کے اپنی بات رکھتے، تو کبھی بازاروں اور میلوں میں تقریریں کر کے اپنی فصاحت و بلاغت کے جلوے دکھاتے، تو کبھی خطیب اہل قبیلہ کو کسی موقع پر نصیحت آمیز تقریر کرتے ہوئے نظر آتا۔ ایسے ہی شادی وغیرہ کے موقع پر بھی خطبے دیے جاتے تھے، جیسا کہ ابوطالب نے اللہ کے رسول کی حضرت خدیجہ سے شادی کے وقت خطبہ دیا تھا۔

ان سبھی موضوعات پر جاہلی دور کے خطبے ادب کے مصادر میں موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس دور میں خطابت کو بے انتہا اہمیت حاصل تھی، اور اس کا سہارا کثرت سے لیا جاتا تھا۔ جاحظ نے اپنی معروف کتاب ”البيان والتبيين“ میں اس دور کے خطیبوں کی بڑی تعداد ذکر کی ہے جس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہر قبیلے کے پاس اس دور میں بہترین خطیب ہوا کرتے تھے۔ یوں تو عربوں میں بہت سے ممتاز اور نامور مقرر گزرے ہیں لیکن ان میں سے اکثر کے حالات اور کمالات کا ہمیں علم نہیں۔ پھر بھی قدیم ترین خطبا میں کعب بن لوی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤ اجداد میں سے تھے، اور حُرثان بن مُحْرَث جو ذوالاصح العَدِ وانی کے لقب سے مشہور ہیں، بہت نامور گزرے ہیں۔

جاہلی دور کے مشہور خطبا کی ایک لمبی فہرست ہے جو ہمیں ادب کے مختلف مصادر اور بطور خاص الجاحظ کی البیان والتبيين میں نظر آتی ہے، چنانچہ عتبہ بن ربیعہ، سہیل بن عمرو، علم، عامر بن الظرب، ربیعہ بن حذار، عمرو بن کلثوم، ہانی بن قبیصہ، زہیر بن خباب، لبید بن ربیعہ العامری، اکثم بن صیفی، عمرو الہاتم، قس بن ساعدہ الایادی اس عہد کے مشہور خطبا میں شمار کیے جاتے ہیں۔

دور جاہلی میں خطبا کی یہ مقبولیت اور ادب کے مختلف مصادر میں موجود ان کے خطبوں کی کثرت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس دور میں خطابت کو یقیناً بہت اہمیت حاصل تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس دور میں خطیب کا درجہ شاعر کے درجہ سے کہیں بھی کم نہ تھا، بلکہ زیادہ ہی تھا جیسا کہ ابو عمرو بن العلاء نے یہ لکھا ہے کہ شروع میں ان کے نزدیک شاعر کی اہمیت خطیب سے زیادہ تھی لیکن بعد میں جب شعرا کی کثرت ہو گئی اور شاعری کا معیار گرنے لگا تب خطیب کو شاعر سے بھی زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ اس کی وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ نابغہ اوور اعیسیٰ جیسے شاعروں نے شاعری کو کسب معاش کا ذریعہ بنا لیا تھا، جس کی وجہ سے شاعری کا معیار گرنے لگا تھا۔ یہی بات جاحظ نے البیان والتبيين میں بھی کہی ہے۔ خطیب کو شاعر کے مقابلے میں جاہلی دور میں جو اہمیت حاصل ہوئی اس کے بارے میں یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ شعرا اکثر جنگ کا ماحول تیار کرنے میں اہم رول ادا کرتے تھے، جب کہ خطیب اکثر صلح اور محبت کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے تھے، چنانچہ لوگوں کو

بالآخر یہ احساس ہوا کہ خطیب کا درجہ اس لحاظ سے شاعر کے مقابلے میں زیادہ بلند و برتر ہے۔ مؤرخین کا ماننا ہے کہ دور جاہلی کے آخری ایام میں شاعری کے مقابلے میں خطابت کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی تھی۔

اس دور کے خطیبوں کا تقریر کرنے کا اپنا ایک منفرد انداز ہوتا تھا، اور اس کی کچھ خوبیاں تھیں، چنانچہ وہ لوگ بازاروں اور میلوں وغیرہ میں اپنی سواری پر بیٹھ کر تقریر کیا کرتے تھے، اور دوران تقریر اپنے ہاتھوں میں عصا رکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر بھی تقریر کرتے تھے۔ عربی خطیبوں کے اپنے ہاتھوں میں عصا لیکر تقریر کرنے کو جاحظ نے عرب قوم کی امتیازی خوبیوں میں شمار کیا ہے۔ اس کے علاوہ خطابت میں خود اعتمادی، حاضر جوابی، اور بلند آواز کو خاص طور پر سراہا جاتا تھا، جب کہ کپکپانے ہکلانے اور بار بار گلا صاف کرنے کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔

جہاں تک اس دور کی خطابت کے لب و لہجہ کی بات ہے تو اس دور میں مسجع اور مرسل یعنی غیر مسجع دونوں ہی طرح کا اسلوب رائج تھا، جاحظ کے مطابق منافرت یا مفاخرت کی غرض سے جو تقریریں کی جاتی تھیں انہیں اسلوب اکثر مسجع ہوا کرتا تھا، جب کہ جو تقریریں مصالحت کی غرض سے کی جاتی تھیں ان کا اسلوب اکثر مرسل یا غیر مسجع ہوا کرتا تھا۔ اس دور میں وصیت کا بھی رواج تھا۔ اس کو بھی خطابت کے ہی باب میں شمار کیا جاتا ہے۔ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ خطبہ ایک جم غفیر کے سامنے یا کسی خاص محفل میں دیا جاتا تھا جب کہ وصیت ذاتی طور پر کسی شخص کو کی جاتی تھی۔ اس دور کی کچھ وصیتیں بھی ادب کے مختلف مصادر میں موجود ہیں۔ اب ہم جاہلی دور کے کچھ مشہور خطبا کا تعارف آپ کے سامنے پیش کریں گے۔

3.8.4.1 قس بن ساعدہ الایادی

قس بن ساعدہ الایادی قبیلہ ایاد کا نامور خطیب اور نجران کا پادری تھا۔ اسے صرف دور جاہلی کا ایک مایہ ناز اور شہرہ آفاق خطیب ہی نہیں سمجھا جاتا ہے بلکہ بہت سے اسکالرز کا یہ ماننا ہے کہ وہ پوری عرب قوم میں سب سے ممتاز، قادر الکلام، شعلہ بیان اور سحر طراز مقرر گزار ہے۔ اس کی فصاحت و بلاغت اور زبان پر بے پناہ قدرت کی وجہ سے خطابت میں اس کی مثال دی جاتی ہے۔ عربی تقریروں میں حمد و ثنا کے بعد اُما بعد کہنے کا جو رواج ہے اس کی شروعات بھی دراصل سب سے پہلے قس نے ہی کی تھی۔ جاحظ نے لکھا ہے کہ قبیلہ ایاد اور قبیلہ تمیم کے لوگوں کو خطابت میں ایسی امتیازی شان حاصل تھی کہ جو کسی اور قبیلہ کو حاصل نہیں تھی، اور خاص طور سے قس کو اس فن میں بے انتہا مہارت اور دسترس حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ قس وہ پہلا شخص تھا جس نے تقریر کے دوران چھڑی یا تلوار لیکر تقریر کرنے کا طریقہ شروع کیا۔ قس کے بارے میں اللہ کے رسول کا یہ قول نقل کیا جاتا ہے کہ آپ نے اسے سوق عکاظ میں تقریر کرتے ہوئے دیکھا تھا، اور اس کا وہ خطبہ بے انتہا مشہور بھی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

قس کا انداز بیان نہایت شستہ اور شگفتہ تھا۔ اس کے الفاظ بڑے شیریں اور منتخب ہوتے تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے مگر نہایت نپے تلے جملے کہا کرتا تھا۔ اور بیچ بیچ میں امثال اور کہاوتوں کا استعمال بھی خوب کیا کرتا تھا۔ اس کی ایک تقریر بہت مشہور ہے جو ادب کے مختلف مصادر میں موجود ہے، اسی کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

”أيها الناس! اسمعوا وَاغُوا! من عاش مات، ومن مات فات، وكل ما هو آتٍ آتٍ، ليل داغ، ونهار ساج، وسماء ذات ابراج، ونجوم تزهر، وبحار تزخر، وجبال مرساة، وارض مدحاة، وأنهار فمجرة، ان في السماء لخبرا، وان في الارض لخبرا، وما بال الناس، يذهبون ولا يرجعون، أَرْضُوا فَأَقَامُوا، أَمْ نُرِ كُوا فَنَامُوا، بالله قسما لا اثم فيه، ان لله ديننا هو أَرْضَىٰ له وفضل من دينكم الذي انتم عليه“

یعنی اے لوگو! گوش و ہوش سے سنو! اور یاد رکھو کہ جو زندہ ہے اسے ایک دن مرنا ہے، اور جو مر گیا وہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا، اور جو چیز آنے والی ہے وہ آ کر رہے گی۔ ایک گھنٹا ٹوپ اندھیری رات ہے، اور ایک پرسکون امنٹ دن ہے، ایک مختلف برجوں والا آسمان ہے اور اس میں چمکتے دکتے ستارے ہیں، ایک طرف ٹھاٹھے مارتے ہوئے سمندر ہیں تو دوسری طرف ٹھوس اور مضبوط پہاڑ ہیں اور پھیلی ہوئی یہ زمین ہے اور بہتے ہوئے یہ دریا ہیں۔ آسمان میں بھی کچھ چیزیں مخفی ہیں، اور زمین میں کچھ عبرتیں پوشیدہ ہیں۔ یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جاتے ہیں تو واپس نہیں آتے، کیا ان کو وہ جگہ ایسی بھاگی ہے کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے، یا ان کو وہاں چھوڑ دیا گیا تو ہمیشہ کے لیے وہیں سو گئے۔ قس خدا کی ایسی قسم کھا کر کہتا ہے جس میں ذرہ برابر بھی گناہ کا شائبہ نہیں کہ اللہ کا ایک خاص دین ہے جس کو تمہارے لیے سب سے زیادہ پسند کرتا ہے، اور وہ اس دین سے بہت بہتر ہے جسے تم مانتے ہو۔

3.8.4.2 اکثم بن صیفی

اکثم بن صیفی نہ صرف یہ کہ دور جاہلی کا ایک عظیم خطیب تھا بلکہ نسب دانی، ضرب الامثال اور قوت استدلال میں بھی نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کے جیسا قادر الکلام مقرر اور صحیح فیصلہ لینے والا حکم اور اپنی قوم میں معزز و محترم شخص مشکل سے ہی عربوں کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔ اس کے حکیمانہ مقولے اور پند و نصیحت کے جملے سارے عربوں کی زبان پر جاری تھے۔ اس کی انہی صفات کی وجہ سے نعمان بن منذر نے کسریٰ انوشیرواں کے دربار میں عربوں کی فضیلت اور برتری ثابت کرنے کے لیے جو وفد بھیجا تھا اس کا سردار اسی کو مقرر کیا تھا۔ چنانچہ اسی نے سب سے پہلے کسریٰ کے دربار میں تقریر کی۔ تقریر کے بعد کسریٰ نے اکثم سے چند سوالات کیے۔ کسریٰ اس کے جوابات سے اس قدر خوش اور متاثر ہوا کہ اس نے کہا کہ اگر عربوں کے پاس تمہارے علاوہ کوئی اور نہ بھی ہوتا تو تم ہی کافی تھے۔ اکثم کو جاہلی دور کے صف اول کے خطیبوں میں شمار کیا جاتا ہے، اس نے کسریٰ کے دربار میں جو تقریر کی تھی اس کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

”ان أفضل الأشياء اعاليها، وأعلى الرجال ملوكها، وأفضل الملوك أعمها نفعاً، وخير الأئمة أخصبها، وأفضل الخطباء أصدقها، الصدق منجاة، الكذب مهوأة، والشر لجاجة، والحزم مركب صعب، والعجز مركب وطني، آفة الرأي الهوى، والعجز مفتاح الفقر، وخير الأمور الصبر، وحسن الظن ورطة، وسوء الظن عصمة“۔

یعنی دنیا کی چیزوں میں سب سے بہتر اور افضل وہ ہیں جو سب سے اعلیٰ ہوں، اور لوگوں میں سب سے اونچے اور ارفع ان کے بادشاہ ہیں، اور بادشاہوں میں سب سے بہتر وہ ہیں جن کے ذریعہ نفع عام ہو، اور زمانوں میں سب سے بہتر خوشحالی اور ہریالی کا زمانہ ہے، اور مقررین میں سب سے بہتر حق گو ہیں۔ سچائی نجات کا ذریعہ ہے، اور جھوٹ تباہی کا گدھا ہے، برائی کی جڑ اس میں پھنسے رہنا ہے، عقلمندی اور دانشمندی کی راہ

بہت مشکل ہے، اور عاجزی و انکساری کی راہ بڑی آسان ہے، غلط فیصلوں کا سبب اتباع نفس ہے، اور بے عملی غریبی کی کنجی ہے، سب سے اچھی بات صبر کرنا ہے، اور بہت زیادہ حسن ظن میں ہلاکت ہے، جب کہ سوء ظن میں ہی اصل حفاظت ہے۔

3.8.4.3 عمرو بن معدیکرب

عمرو بن معدیکرب ایک اچھا خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین گھڑسوار بھی تھے۔ ۹ھ میں جب آپؐ غزوہ تبوک سے واپس آ رہے تھے تو عمرو اپنی قوم کے ساتھ آپ سے ملے اور اسلام لے آئے، لیکن پھر مرتد ہو گئے، اور ایک بار پھر سے حق نے ان کے دل میں روشنی پیدا کر دی اور وہ دوبارہ مسلمان ہو گئے، اور اسلام کی راہ میں کئی جنگوں میں شریک بھی ہوئے۔

عمرو کا شمار دور جاہلی کے خطبا اور شعرا کی صفِ اول میں ہوتا ہے۔ تقریر کرتے وقت وہ عام طور سے مختصر جملے استعمال کرتے تھے، بلا تکلف اگر سبچ آجاتا تو اس سے اپنی تقریر کو پُر اثر بنا دیتے تھے۔ زندگی کے تجربات اور ضرب الامثال سے اپنی تقریر کو مؤثر، دلکش اور دل نشیں بناتے تھے۔ اشعار میں عام طور سے اپنی بہادری، شجاعت اور زبان پر اپنی قدرت کا ذکر کر کے فخر کرتے تھے۔ نعمان بن منذر نے کسریٰ کے دربار میں جو وفد بھیجا تھا اس میں عمرو بھی شامل تھے۔ ان کی اس تقریر کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

”انما المرء بأصغریہ قلبہ ولسانہ، فبلاغ المنطق الصواب، وملاک النجعة الارتیاد، وعفو الرأی خیر من اسکراہ الفکر، وتوقیف الخبیرة خیر من اعتساف الحیرة“

یعنی انسان اپنی دو چھوٹی چیزوں سے پہچانا جاتا ہے: ایک اس کا دل اور دوسری اس کی زبان۔ قوت گو یائی کی معراج حق گوئی ہے، منزل پانے کی کنجی تلاش و جستجو ہے، جو بات دل میں غور و فکر سے پہلے آجائے وہ دل و دماغ کو مجبور کر کے قائم کی ہوئی رائے سے بہتر ہے، اور تجربات کی روشنی حیرت و پریشانی کے اندھیرے سے بہتر ہے۔

3.8.4.4 سجع الکہان

دور جاہلی میں جہاں قصہ گوئی اور خطابت جیسے نثری فنون رائج تھے وہیں ایک اور نثری فن کا چلن عام تھا جس کا تعلق کاہنوں کی جماعت سے تھا۔ اس دور کے عرب کہانت میں یقین رکھتے تھے اور اپنے بہت سے معاملات میں اس کا سہارا لیتے تھے۔ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ ان کاہنوں کے پاس غیب کا علم ہوتا ہے، جو انہیں جنوں کی مدد سے حاصل ہو جاتا ہے، چنانچہ وہ لوگ اپنے اہم فیصلوں میں ان کاہنوں سے رائے مشورہ کیا کرتے تھے۔ لوگ ان کے پاس اپنے ذاتی مسائل بھی لیکر جایا کرتے تھے اور اپنے قبائلی مسائل کے سلسلے میں بھی ان سے مشورہ کرتے تھے۔ انہیں کاہنوں کی طرف بہت سی عربی عبارتیں منسوب ہیں جن کا اسلوب اکثر مسجع اور معیار ادبی ہوا کرتا تھا۔ سجع الکہان میں ایک طرح کا غموض و ابہام پایا جاتا تھا۔ الفاظ اکثر ذومعانی ہوا کرتے تھے۔ سجع الکہان کا اسلوب جیسا کہ اوپر بی ذکر کیا گیا تھا نہایت مسجع ہوا کرتا تھا۔ سجع الکہان کو خطابت کی ہی ایک قسم مانا جاتا ہے۔ سجع الکہان میں جملے نہایت مختصر اور بے انتہا مسجع ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے اس کا نام بھی سجع الکہان رکھا گیا ہے۔ کاہنوں کی کوشش یہ ہوتی تھی اپنے کلام کو اس قدر ذومعانی اور مبہم بنا کر پیش کریں کہ بعد میں اس سے جو معنی و مفہوم بھی مراد لینا مقصود ہو وہ مراد لیا جاسکے۔

چونکہ اس دور میں کاہنوں کے تئیں عربوں کا یہ اعتقاد تھا کہ ان پر وحی والہام کے ذریعہ غیب کا علم نازل ہوتا ہے، اس لیے ہر قبیلے میں کاہنوں کو بہت اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ دور دراز کے علاقوں سے لوگ ان کاہنوں کے پاس آیا کرتے تھے۔ ان کاہنوں کی اس دور میں بڑی کثرت بھی تھی۔ ان کے مشہور کاہنوں میں سلمہ بن ابی کانام ذکر کیا جاتا ہے، جو عزی سلمہ کے نام سے مشہور ہوا جیسا کہ جاحظ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس دور کی کچھ کاہنات یعنی اس پیشہ سے بڑی کچھ خواتین کے نام بھی ذکر کیے جاتے ہیں جن میں شغناء، سعدیہ، زرقاء، غمیطلہ، اور براء وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

لیکن اس حوالے سے ایک بات نہایت اہم ہے کہ ان کاہنوں اور کاہنات کے حوالے سے جو کچھ بھی ادب کے مختلف مصادر میں نقل کی گیا ہے، اس کے ایک بڑے حصے کی اس عہد کی طرف نسبت کے بارے میں ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جس طرح بہت سے قصے اس دور کی طرف منسوب کر دیے گئے کچھ ایسا ہی صحیح الکہان کے ساتھ بھی ہوا ہے۔

اس دور میں صحیح الکہان کی کثرت اور مقبولیت اور اس کے ادبی معیار کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم میں بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ جو وحی حضرت محمدؐ پر نازل کی جا رہی ہے تم لوگ اسے صحیح الکہان مت سمجھو اور مت کہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”ولا بقول کاہن، قليلاً ماتذکرون“ اور فرمایا: ”فذکر، فماتت بنعمة ربک بکاہن ولا مجنون“۔

3.9 اکتسابی نتائج

ہر دور کی شاعری اس دور کی بہترین عکاس ہو کرتی ہے۔ وہ اپنے دور کی بہترین تصویر کشی کرتی ہے۔ سماج میں موجود اچھائیاں اور برائیاں سب ہمیں شاعری میں نظر آتی ہیں۔ جاہلی دور کی جو بھی عربی شاعری ہم تک پہنچی ہے وہ بھی اس دور کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ جاہلی دور میں عربوں کی شاعری پر اگر ہم نظر ڈالیں تو اس میں ہمیں ایسے اشعار زیادہ ملتے ہیں جن میں شاعر کے سچے احساسات و جذبات کا اظہار نظر آتا ہے، جب کہ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں الفاظ کی خوبصورتی و پختگی تو نظر آتی ہے لیکن معانی و مفہیم کی گہرائی نظر نہیں آتی۔ دور جاہلی میں شعر کی روایت کا طریقہ ہی زیادہ تر راجح تھا اور اس کے لیے شعر کا ہی ایک ایسا طبقہ بھی موجود تھا جو اس اہم فریضہ کو انجام دے رہا تھا۔

دنیا کی دوسری قدیم تہذیبوں میں ہمیں شاعری کی مختلف اقسام نظر آتی ہیں، جن میں چار قسموں کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا ہے: رزمیہ شاعری، تمثیلیہ شاعری، طریبیہ شاعری اور تعلیمی شاعری۔ ان میں سے رزمیہ شاعری، تمثیلیہ شاعری، اور تعلیمی شاعری ہمیں قدیم عربی شاعری میں برائے نام ہی نظر آتی ہے۔ کیوں کہ طریبیہ شاعری کا ہی رواج ان کے یہاں عام تھا۔ شعر جاہلی کے اہم موضوعات میں ہجائیہ شاعری، شعر الحماسہ، فخریہ شاعری، مرثیہ گوئی، مدحیہ شاعری، غزلیہ شاعری اور وصفیہ شاعری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جاہلی دور کا جو نثری سرمایہ ہم تک پہنچا ہے اس میں ہمیں نثر کی مختلف اصناف نظر آتی ہیں، جن میں قصے، محاورے، خطبے، اور کاہنوں کی مسجع و مقفی عباراتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جاہلی دور میں نثر کو بحیثیت فن اس قدر استعمال نہیں کیا گیا جس قدر شعر کو استعمال کیا گیا۔ جاہلی دور میں جس طرح شعر کے حوالے سے ذکر کیا جاتا ہے کہ چند عمدہ قصیدوں کو لکھ کر خانہ کعبہ کی دیوار پر چسپاں کر دیا جاتا تھا جنہیں معلقات کہا جاتا تھا، نثر کے حوالے سے اس قسم کی تحریروں کا کوئی پختہ ثبوت نہیں ملتا۔

جاہلی دور کی نثر کی توثیق کے بارے میں وہی موقف اختیار کرنا بہتر ہوگا، جو اس دور کی طرف منسوب اشعار کے تئیں اختیار کیا جاتا

ہے، یعنی اس دور کا جو بھی نثری سرمایہ ہم تک پہنچا ہے اس کی چھان پھٹک کرنے کے بعد ہی اس کی تصدیق و توثیق کی جانی چاہیے، کیونکہ شعر نثر کے مقابلے میں اپنے وزن و قافیہ کی وجہ سے تادیر حافظہ میں محفوظ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

3.10 فرہنگ

خَدِ ع	دھوکہ باز، فریبی
ہَا نَ یَہُونَ	کم تر اور معمولی ہونا
کَرِی	نیند
صَدِی	گونج
مُتہَلِّل	خوش و خرم
لِیلِ دَاج	تاریک رات
جِبَالِ مَرْسَاةٍ	مضبوط اور ٹھوس پہاڑ

3.11 نمونے کے امتحانی سوالات

- ۱۔ جاہلی شاعری کے موضوعات کیا کیا ہیں؟
- ۲۔ بجائیہ شاعری سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
- ۳۔ سجع الکہان سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
- ۴۔ جاہلی شاعری کی روایت اور تدوین پر ایک نوٹ لکھیے۔
- ۵۔ قس بن ساعدہ الایادی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں مختصراً تحریر کیجیے۔

3.12 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

- ۱۔ تاریخ الأدب العربی (العصر الجاہلی) شوقی ضیف
- ۲۔ تاریخ الأدب العربی عمر فروخ
- ۳۔ تاریخ آداب العرب مصطفی صادق الراغی
- ۴۔ تاریخ الأدب العربی احمد حسن الزیات
- ۵۔ ادب العرب زبید احمد
- ۶۔ عربی ادب کی تاریخ (جلد اول) ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

(<https://archive.org/details/TareekhEArabiAdab/page/n3>)

اکائی 4 اصحابِ معلقات، اصحابِ مجہرات اور صعا لیک شعرا

اکائی کے اجزا

- 4.1 مقصد
- 4.2 تمہید
- 4.3 امرؤ القیس بن حجر الکندی 500-540ء: حیات اور شاعری:
- 4.4 زہیر بن ابی سلمیٰ المزنی۔ حیات اور شاعری
- 4.5 عمرو بن کلثوم التغلبي
- 4.6 طرفہ بن العبد البکری: حیات اور شاعری
- 4.7 عشرہ بن شداد العبسی۔ حیات و شاعری
- 4.8 لبید بن ربیعہ العامری: حیات اور شاعری
- 4.9 حارث بن حلزہ الیشکری: حیات اور شاعری
- 4.10 نابغہ ذبیانی: تعارف
 - 4.10.1 حالات زندگی
 - 4.10.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات
- 4.11 عبید بن الأبرص: تعارف
 - 4.11.1 حالات زندگی
 - 4.11.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات
- 4.12 امیہ بن ابی الصلت: تعارف
 - 4.12.1 حالات زندگی
 - 4.12.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات
- 4.13 تائب شرأ: تعارف

- 4.13.1 حالات زندگی
- 4.13.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات
- 4.14 شنفری: تعارف
- 4.14.1 حالات زندگی
- 4.14.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات
- 4.15 اکتسابی نتائج
- 4.16 نمونے کے امتحانی سوالات
- 4.17 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

4.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ اصحابِ معلقات سے واقف ہوں گے۔
معلقات کی خصوصیات سمجھ سکیں گے۔
اصحابِ معلقات کی شاعری کے امتیازی پہلوؤں سے واقف ہو سکیں گے۔
اصحابِ مجہرات کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کی اہمیت سے واقف ہو سکیں گے۔
صعائیک شعرا کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کی اہمیت جان پائیں گے۔
عربی شاعری میں ان شعرا کے مقام اور مرتبے سے واقف ہو سکیں گے۔

4.2 تمہید

عرب معاشرے میں شاعری کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اچھے قصیدے کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ وہ اچھے قصائد کو کعبہ کی دیوار سے یا اس کے پردے سے آویزاں کر دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ان قصائد کو معلقات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
مکہ چوں کہ تجارتی اور ثقافتی مرکز تھا۔ لہذا جب کوئی قصیدہ کعبہ میں آویزاں کیا جاتا تھا تو لوگ ان قصائد کو پڑھتے تھے اور دوسروں تک انہیں نقل کرتے تھے۔ اس طرح وہ قصائد نہایت تیزی سے دور دراز علاقے تک پھیل جاتے تھے۔ اس کی وجہ شاعری اور شاعر کے قبیلہ کی شہرت بھی پھیلتی تھی۔ انہیں عرب معاشرہ میں اس طرح عزت و مقام حاصل ہوتا تھا۔
معلقات کی تعداد میں اختلاف ہے۔ بعض تذکروں اور تاریخوں میں ان کی تعداد دس اور بعض میں نو اور بعض میں سات مذکور ہے۔ بعض معلقات کے اشعار کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔ کیوں کہ عربی ادب کی تاریخوں میں کچھ بعد میں ملائے ہوئے اشعار کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

سبع معلقات کے سات شعرا ہیں اور وہ یہ ہیں:

- ۱۔ امرؤ القیس بن حجر الکندی۔
- ۲۔ زہیر بن ابی سلمیٰ المزنی۔
- ۳۔ عمرو بن کلثوم التغلبي۔
- ۴۔ طرفہ بن العبد البکری۔
- ۵۔ عثرہ بن شداد العبسی۔
- ۶۔ لبید بن ربیعہ العامری۔
- ۷۔ حارث بن حلزہ الیشکری۔

ادب کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ امرؤ القیس کا قصیدہ خانہ کعبہ پر آویزاں کیے جانے کے اعتبار سے فوقیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد طرفہ، زہیر، لبید، عثرہ، حارث اور عمرو بن کلثوم کے قصیدوں کو معلقات میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ نیز اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ یہ ساتوں قصیدے عکاظ کے میلے میں پڑھے گئے اور لبید کے ماسوا سب ہی شاعروں کی وفات بعثتِ نبوی سے پہلے ہو چکی تھی۔

ض صعلوک کے لغوی معنی ہیں غریب اور نادار شخص، جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اس کی جمع صعائیک ہے، صعائیک شعرا جاہلی زمانے کے وہ شعرا ہیں جو اپنے قبیلے کے اصول اور اقدار کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے قبیلے سے نکال دیے گئے۔ چنانچہ ان کو خانہ بدوشی کی زندگی

گزارنی پڑی، ان کی شاعری پر کیف اور اثر آفریں تھی، عربی ادب کی تاریخ ان کا ذکر کیے بغیر نامکمل رہے گی، ڈاکٹر شوقی ضیف نے اپنی کتاب ”العصر الجاہلی“ میں لکھا ہے کہ صلح و صلح وہ شخص ہے جس کے پاس زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ ہو، بعد میں اس لفظ کی دلائل مختلف ہو گئیں، اور اس سے مراد وہ لوگ لیے جانے لگے جو لوٹ مار کا کام کرتے تھے، یہ لوگ امیر قبائل کو لوٹ کر غریبوں کو مدد کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں شجاعت اور فخر کا پہلو غالب ہے۔

مجھرات جاہلی شاعری کے وہ سات قصائد ہیں جن کا شمار معلمات کے بعد دوسرے طبقے میں ہوتا ہے، مجھرات کا واحد مجھر ہے، مجھر کے لغوی معنی جمع ہونا جمع کرنا، محکم اور ثابت کرنا ہے۔

لغوی معنی کے اعتبار سے یہ وہ شعرا میں ہیں جن کا شمار گویا اولیٰ کے شعرا یا صاحب معلمات میں نہیں ہوتا، مگر اپنی مقبولیت اور فنکاری میں وہ کسی بھی درجے میں طبقہ اولیٰ کے شعرا سے کم نہیں تھے، اپنے کمال فن کی وجہ سے وہ مقبول عام و خاص تھے، اس اکائی میں ہم انہیں دونوں قسم کے شعرا کے بارے میں پڑھیں گے۔

4.3 امرؤ القیس بن حجر الکندی 500-540۔ حیات اور شاعری:

عہد جاہلی میں امرؤ القیس جاہلی شاعروں کا سرخیل ہے۔ اس کو ”الملک الضلیل“ یعنی در بدر پھرنے والا یا گمراہ بادشاہ اور ”ذوالقروح یعنی زخموں والا“ کے لقب سے جانا جاتا تھا۔ اس کا نام ابو الحارث جندح، لقب امرؤ القیس اور کنیت ابو وہب تھی۔ اس کے آبا و اجداد جنوبی عرب کے قبیلے بنو کندہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا باپ حجر نجد میں مضر کے قبائل بنو اسد اور غطفان کا حاکم تھا۔ امرؤ القیس نے ایک شہزادے کی طرح پرورش پائی۔ جب جوان ہوا تو شہزادوں کی عادت کے مطابق سیر و شکار، لہو و لعب، مے نوشی اور آوارگی میں وقت گزارنے لگا اور حسین لڑکیوں کے درمیان وقت بتانے لگا، ان سے برملا اظہارِ عشق کرنے لگا، اپنے شوق کی تسکین کے لیے شاعری میں ان کا ذکر اور ان کے بارے میں فحش باتوں کا اظہار کرنے لگا۔ باپ اس کی باتوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے امرؤ القیس کو کئی بار سرزنش کی، لیکن یہ بگڑا ہوا اوباش شہزادہ اپنی اصلاح نہ کر سکا۔ مجبور ہو کر امیر حجر نے اس کو گھر سے نکال دیا۔ گھر سے نکل کر امرؤ القیس نے خاندان اور اس کے وقار کے بندھنوں سے آزادی حاصل کر لی اور اس کے گرد قبیلہ طے، کلب اور بکر کے اوباشوں کا جگھٹا رہنے لگا۔ ان آوارہ لڑکوں کے ساتھ در در کی خاک چھاننے لگا۔ یہ لوگ جہاں پانی کا تالاب، نخلستان، یا شکار گاہ دیکھتے، وہیں ڈیرہ ڈال دیتے، دن کو شکار کے پیچھے گھوڑے دوڑاتے، شام کو بھنے ہوئے گوشت اور شراب سے پیٹ کی آگ بجھاتے اور شعر و شاعری کی محفلیں منعقد کرتے اور رات دن دادِ عیش دیتے۔ ایک دن ان آوارہ گردوں کا قافلہ ”حضر موت“ کے قریب ایک گاؤں ”دموں“ کے اطراف میں پڑا و ڈالے ہوئے تھے اور پینے پلانے کا دور چل رہا تھا کہ کسی نے امرؤ القیس کو بتایا کہ اس کے باپ حجر کے خلاف بنو اسد نے علم بغاوت بلند کر دیا اور ہنگامہ آرائی میں اسے قتل کر دیا گیا۔ یہ اندوہناک خبر سنتے ہی اس کے نشے کا خمار اتر گیا اور اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اس موقع پر اس نے اپنا یہ مشہور جملہ کہا ”ضیعنی ابي صغيراً، وحملنی دمه كبيراً، لا صحو اليوم، ولا سكر غدا، اليوم خمير، وغدا امر.“ ”میں چھوٹا تھا تو میرے باپ نے مجھ کو گنوا دیا اور اب میں بڑا ہوا ہوں، تو اپنا خون میرے سر منڈھ دیا، آج میں ہوش میں نہیں آؤں گا اور کل نشہ نہیں کروں گا، آج کا دن جام کے لیے ہے اور کل کا دن

بڑے کام کے لیے ہے۔

والد کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے اگلے دن قبیلے قبیلے پھر اور ان سے مدد مانگی، بعض نے ساتھ دیا بعض نے معذرت کا اظہار کیا۔ اپنے مددگاروں کو لے کر اس نے بنواسد پر چڑھائی کی اور ان کے بہت سے آدمیوں کو تیرتیر کر دیا اور بہتوں کو زخمی کر دیا۔ لیکن اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی اور اس نے بنواسد میں مزید قتل و غارتگری کا ارادہ کیا، تو جہاں دیدہ لوگوں نے اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے بعد دوبارہ وہ دوسرے قبیلوں کے پاس مدد کا طالب ہوا، لیکن کہیں سے اسے حسبِ منشا مدد نہ ملی۔ اسی طرح وہ دردر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا اپنے آبائی وطن یمن کی طرف جانکا اور اپنے خاندان والوں سے امداد کا خواست گار ہوا۔ انھوں نے امرؤ القیس کی حالتِ زار کو دیکھ کر پانچ سو جوانوں سے معاونت کی اور وہ ان کی معیت میں بنواسد کی سرکوبی کے لیے نکلا۔ اسی دوران حیرہ کے بادشاہ منذر بن ماء السماء نے اپنی پرانی دشمنی کی وجہ سے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ امرؤ القیس پر حملہ کر دیا۔ امرؤ القیس کے حمایتی حملے کی تاب نہ لاسکے اور منتشر ہو گئے اور اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔

ایسے سنگین حالات میں کسی نے اس کو قسطنطنیہ جا کر قیصر روم سے مدد طلب کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ جب امرؤ القیس قیصر کی خدمت میں پہنچا، تو قیصر نے اس کی خوب آدبگت کی اور اس کی مدد کے لیے ایک فوجی دستہ تیار کرایا، لیکن اس دوران ایک شخص طماح اسدی نے قیصر سے امرؤ القیس کے خلاف کچھ باتیں کہ دیں۔ قیصر نے بظاہر امرؤ القیس سے کچھ نہ کہا، بلکہ ایک قبا برکت کے لیے امرؤ القیس کو عطا کی اور کہا کہ اس کو زیب تن کرنا اور اپنے معاملات سے آگاہ کرتے رہنا، یہ بہت تیز قسم کے زہر میں بھیجی ہوا تھا، جب امرؤ القیس نے اس کو پہنا، تو اس کے جسم پر چھالے پڑ گئے اور کھال پر بڑے بڑے آبلے پڑ گئے اور ان میں پیپ بھر گیا۔ ان آبلوں کی وجہ سے اس کو ’ذوالقروح‘ کہا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ زہر اس کے خون میں سما گیا اور وہ اسی تکلیف میں آخر میں مقامِ انقرہ میں دفن ہوا۔

امرو القیس بچپن ہی سے شعر و شاعری کا دلدادہ تھا، بلا کا ذہین تھا، جاہلی دور کے طبقہ اولیٰ کے شاعروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ مؤرخین اس کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا حصہ والد کے انتقال سے پہلے اور دوسرا حصہ والد کے انتقال کے بعد۔ پہلے حصے میں وہ ایک عیاش، بے فکر اور کھلنڈرے نوجوان کی حیثیت سے نظر آتا ہے اور دوسرے دور میں باپ کے قصاص کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیے ہوئے ناقابلِ حصول امتگوں کی راہوں کا مسافر نظر آتا ہے۔ زندگی کی دونوں قسموں کی چھاپ اس کی شاعری میں جھلکتی ہے۔ اس کی شاعری میں بھاری بھرم الفاظ کی کثرت، شعروں میں بندش کی عمدگی، منظر کشی میں دلکشی، خیال میں نزاکت، مضامین میں تنوع، استعارات و تشبیہات کا مناسب استعمال، پیہم سفر، پریشانیوں کو جھیلنے اور مختلف معاشرے کے لوگوں سے ملنے جلنے کی وجہ سے خیالات میں توسع پیدا ہو گیا تھا۔ یہ پہلا عربی شاعر ہے جس نے محبوب کے کھنڈر پر کھڑے ہونے اور اس کی یاد میں آنسو بہانے کی رسم کو ایجاد کیا اور ذکرِ محبوب سے قصیدے کے آغاز کی طرح ڈالی، عورتوں سے عشق کا برملا اظہار کیا، انہیں نیل گایوں، ہرنیوں اور گورے رنگ کو شتر مرغ کے انڈوں سے تشبیہ دی۔ اس کا کلام جاہلی دور کی بدوی تہذیب، معاشرت، رسم و رواج اور دوسری اہم معلومات کی دستاویز ہے۔ زمانے کا گلہ اور دوستوں کے ساتھ چھوڑ دینے کا بیان اچھوتے انداز میں موجود ہے اور بہت سے مضامین میں بعد کے شعرا نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

معلقے کی ابتدا محبوب کی جدائی پر آہ و بکا سے کرتا ہے۔ جب اس کے آثار سے گزرتا ہے، تو اس کی یاد میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ گذشتہ معاشقوں کی یاد اس کو تڑپا دیتی ہے۔ اپنی مردانگی کا عیاں تذکرہ کرتا ہے۔ پھر عینہہ کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس ذیل

میں ”دارجلیل“، ”لب و رخسار“، ”زلف و کمر“ وغیرہ کا تذکرہ دلکش پیرایے میں کرتا ہے۔ اس کے بعد جدائی کی کسک، تلاش یار میں سفر کی صعوبتیں، سفر کے رفیق گھوڑے کی خوبیاں، اس کی برق رفتاری اور چھیرے پن کی رعنائی، دوران سفر کے مناظر، شکار پر گھوڑے کا چھلانگ لگانا، کڑکتی بجلیاں، جل تھل میدانوں اور پہاڑوں کی دلکش تصویر کشی کرتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی کائنات میں گھری نظر تھی۔

معلومات کی جانچ:

- ۱۔ عربوں کی شاعری کیسی تھی؟
- ۲۔ عرب کیسی زندگی گزارتے تھے؟
- ۳۔ اچھے قصائد کعبے میں کیوں آویزاں کیے جاتے تھے؟
- ۴۔ اصحابِ معلمات کون کون سے ہیں؟
- ۵۔ ”الملك الضلیل“ اور ”ذوالقروح“ ایک شاعر کے القاب ہیں یا دو مختلف شعرا کے؟ دونوں کے معانی تحریر کیجیے۔
- ۶۔ امرؤ القیس کے والد کا نام کیا تھا؟
- ۷۔ امرؤ القیس کی وفات کس مقام پر ہوئی؟
- ۸۔ امرؤ القیس کی شاعری کو کتنی قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے؟

4.4 زہیر بن ابی سلمیٰ المزنی حیات اور شاعری

زہیر بن ابی سلمیٰ کا تعلق قبیلہ مضر کی شاخ قبیلہ مزینہ سے تھا۔ یہ اور اس کا خاندان بنو غطفان کے علاقے میں سکونت پذیر تھے۔ ان کا علاقہ نجد میں آتا ہے۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کا شمار جاہلی دور کے تین بڑے شعرا میں ہوتا ہے، جن کو طبقہ اولیٰ میں شامل ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کا درجہ اپنے دونوں حریفوں کے مقابلے میں نمایاں ہے۔ کیوں کہ زہیر بن ابی سلمیٰ کے مزاج میں سنجیدگی اور شرافت کا عنصر زیادہ تھا اور اس کی شاعری ایک معلم اخلاق کی شاعری ہے۔ وہ کسی کی مدح و ذم اس میں موجود اوصاف کی وجہ سے کرتا ہے اور مبالغہ آمیزی سے حتی الامکان اجتناب کرتا ہے۔ اس کا کلام جنگ، نفرت اور امن و آشتی کے پیام سے پُر ہے۔ اس کے کلام کی بلندی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس میں بہت غور و فکر کرتا تھا اور ترمیم و تنسیخ کرتا رہتا تھا اور انہیں اشعار کو باقی رہنے دیتا تھا جو ہر طرح سے اعلیٰ معیار کے ہوں۔

زہیر بن ابی سلمیٰ کے خاندان میں شعر کی بہتات تھی۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کا حقیقی باپ ابوسلمیٰ ربیعہ بن ربیعہ، سوتیلے باپ اوس بن حجر، ماموں بشامہ بن غدیر، دونوں بہنیں سلمیٰ اور الخنساء، دونوں بیٹے کعب اور بخییر، پوتا عقبہ بن کعب اور پڑپوتا العوام بن عقبہ سبھی نے شاعری میں نام پیدا کیا۔

جاہلی دور میں عبس و ذبیان دو قبیلوں کے درمیان جنگ کا سلسلہ تھا، یہ لڑائی سرزمین عرب پر داحس وغیرہ کے تاریخی نام سے موسوم ہے۔ جس میں ہزاروں جانیں گئیں، بے شمار بچوں کے سر سے باپ کا سایہ اٹھا اور انگنت عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ تو دوسری طرف شعر و شاعری کے لیے نئے میدان کھلے، جن میں فخر، ہجو اور انتقامی جذبات کو ہوا دینے والے اشعار کی کثرت ہوئی اور اس سے جاہلی ادب مالا مال ہو گیا۔

قبیلہ عبس و ذبیان میں داحس وغیراء کی لڑائی چالیس سال تک چلتی رہی اور اس کی بھینٹ ہزاروں لوگ چڑھے، اس وقت قبیلہ ذبیان کے دو رحم دل سرداروں ہرم بن سنان اور حارث بن عوف کو اپنی قوم کی تباہی پر رحم آیا اور انھوں نے اپنی کوششوں سے دونوں فریقوں کے درمیان صلح کرادی اور مقتولین کے خوں بہا کے طور پر تین ہزار اونٹ اپنی طرف سے ادا کیے۔ اس طرح یہ لڑائی ختم ہوئی۔

زہیر بن ابی سلمیٰ ان سرداروں کی امن پسندی سے بہت متاثر ہوا اور اس نے اپنے معلقے میں ان کی مدح سرائی کی اور ان کی فیاضی کو اثر انگیز انداز میں پیش کیا۔ خاص طور سے ”ہرم بن سنان“ کی توصیف میں بہت سے اشعار کہے، ہرم بن سنان زہیر بن ابی سلمیٰ کی مدح سے بے انتہا خوش ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ زہیر بن ابی سلمیٰ جب بھی اس کی شان خوانی کرے گا یا اس سے کسی چیز کا طلب گار ہوگا یا صرف اس کو سلام ہی پر اکتفا کرے گا تو وہ اسے غلام یا لونڈی یا گھوڑا انعام میں عطا کرے گا۔ ہرم بن سنان کے اس طرز عمل سے زہیر بن ابی سلمیٰ اس کی داد و دہش اور عطیات لیتے لیتے اُسے شرمندگی کا احساس ہونے لگا، وہ جب بھی کسی مجمع میں ہرم بن سنان کو دیکھتا تو بے ساختہ پکار اٹھتا، آپ سب کو میرا سلام ہو، سوائے ہرم بن سنان کے اور آپ میں جو سب میں بہترین تھا میں نے اسی کو مستثنیٰ کر دیا ہے۔

زہیر بن ابی سلمیٰ صاحب عقل و شعور، اصابت رائے رکھنے والا، زہد و ورع کا مجسم، امن و آشتی کا دلدادہ اور اللہ اور یومِ آخرت پر یقین رکھنے والا تھا، وہ ہجرت سے پہلے فوت ہو گیا۔ تاہم اس کے دونوں بیٹوں بجیر اور کعب نے صحابی ہونے کا شرف حاصل کیا۔ اس کی شاعری پیچیدہ، غریب اور مشکل الفاظ سے پاک ہے۔ وہ تھوڑے الفاظ میں کثیر معانی بیان کرنے پر قادر تھا۔ وہ اپنی شاعری کو بنا سنوار کر پیش کرتا تھا، اسی لیے اس کو ”عبید الشعر“ کہتے ہیں۔ اس کے بعض قصائد ”حولیات“ کہلاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ ایک قصیدہ چار ماہ میں کہتا تھا، پھر چار ماہ اس کی نوک پلک سنوارنے میں لگا رہتا تھا، اس کے بعد چار مہینے خاص شعرا کے سامنے پیش کرتا تھا اور اس طرح ایک سال میں ایک قصیدہ مکمل کر کے لوگوں کو سناتا تھا۔

زہیر بن ابی سلمیٰ کا معلقہ میمہ ہے۔ یہ بحر طویل میں ہے۔ اس کا مرکزی مضمون حارث بن عوف اور ہرم بن سنان کی مدح ہے۔ جنھوں نے عبس و ذبیان کی تباہ کاریوں کا خاتمہ کرا کر ان کے مابین صلح کرائی تھی۔ شاعر ان کے فعل سے متاثر ہوتا ہے اور معلقے کی صورت میں ان کو خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ جاہلی روایت کے مطابق معلقے کی شروعات اپنی مطلقہ بیوی ام اونی کی تشبیہ سے کرتا ہے۔ اس کے بعد گریز کر کے ان سرداروں کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتا ہے جنھوں نے عبس و ذبیان کے خوں چکاں طویل معرکے کو اپنی سعی سے ختم کرایا اور اس ذیل میں جنگ کی ہولناکی سے نفرت پیدا کرنے کے لیے اس کی تصویر کشی خوفناک انداز میں کرتا ہے۔ معلقے کے آخر میں اپنے تجربات اور طویل زندگی کے مشاہدات کا تذکرہ کرتا ہے اور ان میں آفاقی نقطہ نظر کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

زہیر بن ابی سلمیٰ ایک سلیقہ مند اور ہنرمند شاعر تھا۔ اس کی زمزمہ سازی کا گہرا اثر عربوں کی معاشرتی زندگی پر پڑا اور عرب کے نامور مغنیوں نے اس کو خوب گایا۔

زہیر بن ابی سلمیٰ کا کلام سلیس اور صاف شیریں پانی کی طرح ہے، جو پڑھنے والے کو سیراب کرتا ہے۔ اس کے مضامین میں پاکیزہ اور صاف ستھری باتیں پائی جاتی ہیں، جس سے اس کے کلام میں عفت مآبی کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ بعض دوسرے جاہلی شعرا کے کلام میں بھی حکمت و دانائی کی باتیں پائی جاتی ہیں، لیکن زہیر بن ابی سلمیٰ ان سے ممتاز نظر آتا ہے۔ کیوں کہ اس کے کلام میں جنگ کی ہولناکی، اخلاق

فاضلہ، اقدار عالیہ، کارگرہ ہستی کو چلانے والی ذات جس کے سامنے ہر چیز عیاں ہے اور موت و حیات کی حقیقت کا اظہار ایسے پیرایہ بیان میں ہے جو دوسروں کے یہاں مفقود ہے اور اس کی وجہ سے اس کی شاعری دوسروں کے مقابلے میں فائق تر نظر آتی ہے۔
معلومات کی جانچ:

۱۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کو جاہلی دور کے طبقہ اولیٰ کے شاعروں میں کن خصائص کی وجہ سے شمار کیا جاتا ہے؟

۲۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کا تعلق کس قبیلے سے تھا؟

۳۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کے والد کا کیا نام تھا؟

۴۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کے خاندانے میں کون کون سے شعرا تھے؟

۵۔ قبیلہ مخطفان کے علاقے میں کون سی جنگ ہوئی؟

۶۔ قبیلہ عیس و ذبیان میں ”داحس وغیراء“ کی لڑائی کتنے سال تک چلتی رہی؟

۷۔ کن دوسروں کی وجہ سے لڑائی ختم ہوئی؟

۸۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کا معلقہ کونسا قصیدہ کہلاتا ہے؟

4.5 عمرو بن کلثوم الغلبی

عمرو بن کلثوم کا تعلق قبیلہ تغلب سے تھا۔ اس کا باپ کلثوم اپنی قوم کا سردار تھا۔ اس کی ماں عرب کے نامور سردار اور معروف شاعر مہلبہل کی دختر تھی۔ عمرو بن کلثوم اپنی غیر معمولی ہمت و شجاعت کی وجہ سے شیر عرب کے لقب سے مشہور تھا، اس کی کنیت ابوالاسود تھی، پندرہ سال کی عمر میں اپنے قبیلے کا سردار منتخب ہوا۔ اس کی طبیعت شعر گوئی کے لیے موزوں تھی اور ذہن رسا تھا، یہ اپنے ایک قصیدے کی وجہ سے لازوال شہرت کا حامل ہو گیا۔

عمرو بن کلثوم کا خاندان جزیرہ فرات میں رہائش پذیر تھا، تغلب اور بکر بن وائل کے قبیلوں میں ایک لمبے عرصے تک جنگ رہی، اس کا نام جنگ بسوس ہے۔ اس جنگ کی وجہ سے ان قبائل میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کے درمیان حیرہ کے بادشاہ نے صلح کرادی، ایک موقع پر غلاموں کے معاملے میں نزاع پیدا ہوا تو دونوں قبیلے تصفیے کے لیے بادشاہ عمر بن ہند کے پاس گئے۔ اس موقع پر قبیلہ بکر کا شاعر حارث بن حلزہ الیشکری اٹھا اور اپنا معروف قصیدہ اپنے قبیلے کی تعریف میں پڑھا، اس سے بادشاہ کا جھکاؤ قبیلہ بکر بن وائل کی طرف ہو گیا۔ اس پر عمرو بن کلثوم وہاں سے ناراض ہو کر نکل گیا۔ بادشاہ حیرہ کو عمرو بن کلثوم کی یہ روش پسند نہیں آئی اور اس نے عمرو بن کلثوم کو سرزنش کرنے اور اس کو رسوا کرنے کا پلان بنایا اور اپنے حاشیہ نشینوں سے دریافت کیا کہ کیا تم کسی ایسے عرب کو جانتے ہو، جس کی ماں میری ماں کی خدمت کرنے میں ہتک محسوس کرے۔ انھوں نے عمرو بن کلثوم کی ماں لیلیٰ کا نام بتایا، بادشاہ نے وجہ پوچھی، تو انھوں نے جواب دیا کہ اس کا باپ مشہور شاعر مہلبہل بن ربیعہ ہے۔ اس کا ماموں کلیب بن وائل ہے جو عربوں کے بہادروں میں سے ہے۔ اس کا شوہر کلثوم بن مالک سردار قوم تھا اور اس کا بیٹا عمرو اپنے قبیلے کا بہادر سردار ہے۔ اس پر حیرہ کے بادشاہ نے عمرو بن کلثوم کو ملنے کی دعوت دی کہ وہ اپنی والدہ کی معیت میں آئے۔ عمرو بن

کلثوم اپنی والدہ اور اپنے قبیلے کے ہمراہ بادشاہ سے ملنے آیا۔ بادشاہ نے حیرہ اور فرات کے درمیان مہمانوں کے اعزاز کے لیے انتظام کیا اور اپنی سلطنت کے بعض دوسرے سرداروں کو بھی مدعو کیا۔ بادشاہ نے اپنی والدہ سے کہا کہ وہ عمرو بن کلثوم کی والدہ لیلیٰ سے موقعہ دیکھ کر کسی کام کو کرنے کے لیے کہے۔ مہمانوں کے آنے پر ان کا شایان شان استقبال کیا، مردوں کو شاہی خیمے میں آرام کرایا اور عمرو بن کلثوم کی والدہ کو زنانہ خیمے میں لے جایا گیا۔ جب دسترخوان چنا گیا تو بادشاہ کی والدہ نے اپنے خدام کو چلے جانے کا اشارہ کیا اور عمرو بن کلثوم کی والدہ سے کہا کہ بہن! ذرا مجھے یہ طبق بڑھا دو۔ اس پر لیلیٰ نے کہا کہ جس کو ضرورت ہو وہ خود ہی اپنا کام کرے لیکن بادشاہ کی والدہ نے دوبارہ درخواست کی تو اس پر لیلیٰ چیخ پڑی: ہائے یہ ذلت! ہائے کہاں ہواے تغلب والو! جیسے ہی عمرو بن کلثوم نے اپنی والدہ کا یہ واویلا سنا، تو چراغ پا ہو گیا، خیمے میں بادشاہ کی تلوار آویزاں تھی، اس کو جھپٹ کر اٹھایا اور اسی سے بادشاہ عمرو بن ہند کی گردن اڑادی اور اپنے قبیلے والوں کو حکم دیا کہ وہ سب کچھ لوٹ لیں اور واپس روانہ ہو جائیں۔ تغلبیوں نے سارا ساز و سامان لوٹ لیا اور عمرو بن کلثوم ان کے ہمراہ اپنے علاقے میں واپس چلا گیا۔ اس اہم واقعے کے بعد اس نے اپنا معلقہ کہا جو شہرت کی بلندی کو پہنچا۔

عمرو بن کلثوم اس معلقے کی شروعات ساغر و ساقی کے ذکر سے کرتا ہے۔ اس کے بعد محبوبہ کے حسن اور اس کے فراق کا تذکرہ کرتا ہے۔ پھر حیرہ کو مخاطب کر کے اپنی قوم کی معرکہ آرائیوں اور ان کے جان لیوا حملوں کا ذکر دراز کرتے ہوئے آخر تک چلا جاتا ہے۔ عمرو بن کلثوم نے اپنا یہ قصیدہ عکاظ کے میلے میں سنایا تو اسے اس سال کے بہترین قصیدے کا لقب ملا۔ اس قصیدے کو بہت شہرت حاصل ہوئی اور قبیلہ تغلب کے لوگوں نے اس کو حرز جاں بنا لیا۔

عمرو بن کلثوم کے اس قصیدے میں حسن الفاظ، موزوں عبارت، جاذب اسلوب، فخر، بلند مقصد اور معنی و خیال کی پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ عمرو بن کلثوم کی شاعری کم ہونے کے باوجود عربوں کی معاشرتی حالت کے سلسلہ میں معلومات سے بھرپور ہے۔ چنانچہ اس سے عربوں کے مذہبی عقائد، معاشرتی حالات، روزمرہ کے مشاغل، ان کی صنعت و حرفت اور کھیل کود کے مشاغل کا پتہ چلتا ہے۔ نیز بعض عرب عورتوں کا بتوں کا طواف کرنا، اس کے ساتھ مذہبی رقص میں حصہ لینا، معاشرتی زندگی میں جنگ کے وقت مردوں کے ساتھ رہنا، جانوروں کو چارہ کھلانا، ان کو لڑنے مرنے پر برا بھلا کہنا، کپڑوں کی رنگائی کے لیے ارغوانی رنگ کا استعمال کرنا، تیروں کو سیدھا کرنے کے لیے ثقاف یعنی لوہے کے خاص اوزار کا استعمال کرنا، کپڑوں کی رنگائی کے لیے دکانوں کا ہونا، دھونکنی کے لیے آگ تیز کر کے کانٹے اور بندے بنانا، بچوں کا لکڑی کی تلواروں سے کھیلنا اور نوجوانوں کا نرم زمین میں فٹ بال کی طرح کھیل میں مصروف ہونا وغیرہ ہے۔ ان تاریخی دستاویزات کے علاوہ اپنے بزرگوں کے کارناموں کو فخر و مہابت کے ساتھ پیش کرنا، اپنے قبیلہ کی معرکہ آرائیوں میں سبقت اور دشمنوں پر ان کی فتوحات اور اپنے کو ایسے شجاع کے طور پر پیش کرنا جس کے سامنے بڑے سے بڑا سورما ٹھرنہ سکتا ہو۔ کثرت تعداد کے بیان میں یہ کہنا کہ جب ہم زمین پر چلتے ہیں تو اسے انسانوں سے بھر دیتے ہیں اور جب سمندر میں اترتے ہیں تو اس پر اپنی کشتیوں سے چھا جاتے ہیں اور دوسروں پر ہمارا رعب اس قدر ہوتا ہے کہ جب ہمارا کوئی بچہ دودھ چھوڑنے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اسی وقت سے اس کے سامنے بڑے بڑے جابر اور سرکش لوگ سجدہ کرنے لگتے ہیں۔

عمرو بن کلثوم کا معلقہ دوسرے معلقات کے مقابلے میں زبان و بیان کے اعتبار سے سہل ہے اور اس میں ایسی سلاست ہے کہ جب کوئی اسے شروع کرتا ہے تو پڑھتا ہی چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ قصیدے کو ختم کیے بغیر اسے نہیں چھوڑتا ہے۔

معلومات کی جانچ:

- ۱۔ عمرو بن کلثوم کا تعلق کس قبیلے سے تھا؟
- ۲۔ عمرو بن کلثوم کے والد کا نام کیا تھا؟
- ۳۔ عمرو بن کلثوم کا قبیلہ کس علاقے میں تھا؟
- ۴۔ عمرو بن کلثوم کا بادشاہ حیرہ کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا تھا؟
- ۵۔ عمرو بن کلثوم کی والدہ کو بادشاہ حیرہ کی والدہ نے کیا کہا؟
- ۶۔ عمرو بن کلثوم کو بادشاہ حیرہ نے کیوں بلایا؟
- ۷۔ عمرو بن کلثوم کا معلقہ دوسرے تعلقات کے مقابلے میں کیسا ہے؟

4.6 طرفہ بن العبد البکری: حیات اور شاعری

طرفہ بن العبد کا نام عمرو، کنیت ابو عمرو اور شہرت طرفہ سے ہوئی۔ اس کے القاب میں قنیل بنی بکر یعنی بنو بکر کا مقتول، ابن العشرین یعنی جوان بست سالہ اور الغلام القنیل یعنی مقتول لڑکا ہے۔ اس کا تعلق قبیلہ ربیعہ کی شاخ بکر بن وائل سے تھا۔ طرفہ کا نسب عالی اور خاندان ثروت مند تھا، جو بحرین اور یمامہ کے علاقوں میں رہائش پذیر تھا۔ یہ خلیج عرب کا ساحلی علاقہ تھا، یہیں طرفہ کی پیدائش ہوئی، بچپن ہی میں اس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا، اس کے چچاؤں نے اس کی تربیت پر توجہ نہ دی۔ وہ لاابالی اور منہ پھٹ ہو گیا۔ اس کو شاعری ورثے میں ملی۔ شاعرانہ صلاحیتیں بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگیں۔ اس کا ماموں ”متلمس“ بنو قیس بن ثعلبہ کی محفل میں ایک دن شعر گوئی کر رہا تھا۔ اس کے ایک شعر میں ایک نامانوس لفظ ”الصیعریہ“ آیا۔ جو اونٹنی کے ساتھ مخصوص ہے، مگر متلمس نے اس لفظ کو اونٹ کے لیے غلطی سے استعمال کر دیا۔ طرفہ قریب میں لڑکوں کے ساتھ کھیل میں مصروف تھا۔ اس نے اس لفظ کو سنا تو اپنے ماموں پر برجستہ جملہ کس دیا کہ ”استنوق الجمل“ لیجئے اونٹ اونٹنی ہو گیا۔ جملہ اس قدر بر محل تھا کہ آج تک ضرب المثل ہے۔ اس کا ترجمہ اونٹ اونٹنی کی طرح مسکین ہو گیا، لیکن مجاورے میں عزت کے بعد ذلیل ہونے والے کے لیے مستعمل ہے۔ متلمس نے طرفہ کو بلایا اور کہا ”ذبان نکالو“ دیکھا تو زبان سیاہ تھی، اس پر متلمس نے اس کی زبان اور اس کے سر کی طرف اشارہ کر کے کہا ”اس سے اس پر ہلاکت آئے گی“ اور یہی ہوا۔

طرفہ بن العبد کے باپ کے انتقال کے بعد اس کے چچاؤں نے اس پر توجہ نہ دی۔ اس کی ماں ”وردہ“ اپنے بچوں کے ساتھ کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہی تھی، اس سے طرفہ کے معصوم دل پر چوٹ لگی، اس نے اپنے چچاؤں کی ہجو میں کچھ اشعار کہہ دیے۔ طرفہ بن العبد نے لہو و لعب میں زندگی گزاری، اس کا ہاتھ کھلا ہوا تھا، اس کو جو کچھ میسر آتا تھا، اس کو دوستوں کی محفلوں میں خرچ کر دیتا تھا، طرفہ کی ہمشیرہ عبد عمرو بن بشر سے منسوب تھی، جو بڑا نامی سردار تھا، حیرہ کے بادشاہ عمرو بن ہند کے درباریوں میں بڑا معزز تھا۔ بیوی کے ساتھ اس کا سلوک اچھا نہ تھا۔ بہن نے شوہر کی بدسلوکی کا تذکرہ اپنے بھائی طرفہ سے کیا، طرفہ نے اپنے بہنوئی کی ہجو میں کچھ اشعار کہے، جو زبان زد ہو گئے۔ ان اشعار میں اس کے کھانے کی کثرت اور زنانہ پن پر بھپتیاں کسی گئی تھیں۔

شعراے حیرہ کے بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوتے، اس کی شان میں مدحیہ قصیدے پڑھتے اور انعام سے نوازے جاتے۔ جب طرفہ نے عیش و طرب میں اپنا تمام مال اڑا دیا، تو یہ اپنے ماموں متملس کے ساتھ عمرو بن ہند کے دربار میں پہنچا، بادشاہ نے دونوں ماموں، بھانجے کی خوب آدبگت کی اور اپنے بھائی قابوس بن ہند کا مصاحب بنا دیا، قابوس عمرو کے بعد بادشاہت کے لیے نامزد تھا۔

طرفہ یتیم ہونے کے بعد اعزہ واقارب کی قساوت قلبی کا شکار ہو گیا، اور گھر کی رہائش کو خیر باد کہہ دیا اور آزاد ماحول میں زندگی کی رنگینیوں کا مزہ لینے لگا، اس زمانے میں اس کے بھائی معبد کے بہت سے اونٹ لاپتہ ہو گئے جو تلاش بسیار کے بعد بھی نہ ملے تو طرفہ اپنے چچا زاد بھائی مالک کے پاس گیا کہ وہ معبد کے اونٹوں کو ڈھونڈھنے میں اس کا ساتھ دے، لیکن مالک نے اس کو جھڑک دیا اور کہا پہلے تو تم کو اونٹوں کی فکر نہ ہوئی تو اب ان کے کھوجانے کے بعد تمہارا غم کرنا کیسا ہے؟ طرفہ کے دل کو مالک کے جواب سے ٹھیس پہنچی، اس کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوا اور اسی جذباتی اشتعال میں اس نے یہ معلقہ کہا۔ اس کا معلقہ دالیہ ہے اور یہ تعلقات میں سب سے طویل ہے۔ اس میں ایک سو پانچ اشعار ہیں۔

معلقہ کی شروعات عربی شاعری کے رواج کے مطابق محبوبہ خولہ کے پڑاؤ کی جگہ بچے نشانات کے تذکرے سے کرتا ہے وہاں شاعر خود کو ماضی کی یادوں میں سوچ دیتا ہے اور جذبات کی رو میں بہ کر محبوبہ کے کوچ کے منظر کو تفصیل سے بیان کرتا ہے اور اس ذیل میں محبوبہ کے سراپا کی تعریف انوکھی تشبیہات سے بیان کرتا ہے جو دلوں کے تاروں کو جھنجھنا دیتے ہیں اس کے بعد محبوبہ کی اونٹنی کی توصیف بیان کرتا ہے اور اونٹنی کی تشریح اعضا کے ضمن میں ایسی اچھوتی تشبیہیں تراشتا ہے جو کہیں نہیں ملتی ہیں، اس کے بعد اپنی صفات فخر کے انداز میں بیان کرتا ہے کہ وہ مرد میدان بھی ہے اور رند میکدہ بھی، کڑے وقت میں قبیلہ کا دفاع کرنے والا بھی، مظلوم کا دادرس اور بے دریغ اونٹ ذبح کر کے ضرورت مندوں کو کھلانے والا بھی، یہ اشعار اس کو لافانی بناتے ہیں اور آخر میں حکمت و دانائی اور فلسفہ اخلاق کی طرف رجوع کرتا ہے اور نہایت سادہ لفظوں میں زمانے کے انقلاب کا ذکر کرتا ہے۔

طرفہ موت و حیات کے فلسفے کو انوکھے انداز میں پیش کرتا ہے، جو لوگ دنیا اور اس کی فنایت اور سرمستی کی زندگی جینے پر اس کو نشانہ بناتے تھے، ان کو جواب دیتا ہے کہ زندگی ختم ہونے والی ہے، دنیا میں ہمیشگی ممکن نہیں، ایک دن موت اپنا شکار کس لے گی، لہذا موت سے پہلے اپنے مال و دولت سے فائدہ اٹھا لو اور عیش کوشی میں اس کو خرچ کر ڈالو کیونکہ موت آ کر تمام چیزوں سے ہمیں دور کر دے گی، پھر زندگانی کا فلسفہ بیان کرتا ہے کہ موت بخیل اور سخی دونوں کو آتی ہے، دونوں قبر میں ابدی نیند سو جاتے ہیں اور مٹی کے ڈھیروں میں دبے رہتے ہیں اور موت بخیل و سخی دونوں کے مال کو چن لیتی ہے اور زندگی ایک ایسا بیش قیمت خزانہ ہے جو ہر شب گھٹتا ہے، اور گردش زمانہ جس کو روزانہ گھٹاتے رہیں وہ گھٹتے گھٹتے ختم ہو جاتا ہے اور موت کا معاملہ ڈھیلی رسی کی طرح ہے، جس کے دونوں کنارے کھینچنے والے کے ہاتھ میں ہیں، جب کسی کنارے کی رسی کو کھینچ لیا جائے گا وہ موت سے ہمکنار ہو جائے گا۔

اس طرح کی بیشمار خصوصیات اس کے معلقے کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ موت نے اس کو موقع نہ دیا اور جوانی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے اس کی طرف منسوب کیے جانے والے اشعار کی تعداد قلیل ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا دیوان ہے۔ جس میں اس کے کہے ہوئے متفرق اشعار موجود ہیں۔ جمع کرنے والے نے ان کو جمع کرنے میں سخت محنت سے کام لیا ہے۔

معلومات کی جانچ:

- ۱۔ طرفہ بن العبد کا پورا نام کیا تھا؟
- ۲۔ طرفہ بن العبد کو ابن العشرین کیوں کہتے ہیں؟
- ۳۔ طرفہ بن العبد کا قبیلہ کہاں رہائش پذیر تھا؟
- ۴۔ طرفہ بن العبد نے ”استنوق الجمل“ کب کہا؟
- ۵۔ طرفہ بن العبد کی ماں کا نام کیا تھا؟
- ۶۔ طرفہ بن العبد کی موت کیسے ہوئی؟
- ۷۔ طرفہ بن العبد کا معلقہ کونسا قصبہ کہلاتا ہے؟
- ۸۔ طرفہ بن العبد کے معلقہ میں کتنے اشعار ہیں؟

4.7 عشرہ بن شداد العبسی - حیات و شاعری

عشرہ بن شداد کا تعلق بنو عبس سے تھا۔ اس کی ماں "ذبیہہ" ایک حبشی کنیز تھی۔ عشرہ کی پیدائش اسی لونڈی کے بطن سے ہوئی، عشرہ کو سیاہ رنگت اپنی ماں سے ورثے میں ملی، عربوں کا دستور تھا کہ جو اولاد باندی کے پیٹ سے پیدا ہوتی تھی، اس کو بھی غلام کا درجہ ملتا تھا اور اس سے غلاموں والے کام لیے جاتے تھے، یہی معاملہ عشرہ کے ساتھ ہوا۔ چنانچہ عشرہ کے ذمہ غلاموں کے بہت سے کام تھے۔ اس پر مستزاد گھوڑوں اور اونٹوں کی گلہ بانی کی خدمت بھی اسی کے ذمے تھی، اس کو اپنی سیاہ رنگت اور کنیز زادہ ہونے کا طعنہ بھی دیا جاتا تھا، ان تمام کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے باپ کے خاندان میں ایک اچھوت کی زندگی گزارتا تھا، چونکہ وہ بہت حساس تھا، اس لیے اس نے اپنی زندگی کی راہ الگ نکالی اور فنون حرب اور شہ سواری میں مہارت حاصل کی اور نام و رشحاع سمجھا جانے لگا، ایک مرتبہ کسی قبیلے نے عبسیوں پر دھاوا بول دیا اور ان کے اونٹ اور گھوڑے بھگا لے گئے، اس موقع پر عشرہ کے باپ شداد نے مقابلہ میں اپنی ہزیمت کے آثار دیکھے تو عشرہ سے کہا "کَرَّ يَا عَنَّتْرَةَ" اے عشرہ حملہ کر! چونکہ عشرہ کو غلام کا درجہ دیا جاتا تھا، اس لیے اس نے برجستہ جواب دیا۔ "العبد لا يحسن الكَرَّ، إنما يحسن الحلاب و الصر" یعنی غلام حملہ کرنا کیا جانے، وہ تو دودھ دوہنا اور تھنوں کو باندھنا جانتا ہے، اس پر باپ نے کہا، "كَرَّ وَأَنْتَ حُرٌّ تَمَّ آزاد ہو، دشمن پر حملہ کرو، یہ سن کر عشرہ پر خوشی کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑا، کشتوں کے پستے لگا دیئے، دشمنوں کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ اونٹ اور گھوڑے چھوڑ کر اپنی جان بچا کر بھاگے اور عشرہ اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو لے کر واپس آیا، اس قابل فخر کا نامہ کا یہ اثر ہوا کہ شداد نے اس کو اپنے نسب میں شمولیت دی اور عرب کے دیگر قبائل کے لوگ اسے عبس کے سردار اور ایک نامور شہسوار کی حیثیت دینے لگے۔ چنانچہ اس نے داحس وغیراء کی معرکہ آرائیوں میں بنو عبس کی قیادت کی اور بڑی جانبازی کا مظاہرہ کیا، اس کی بسالت اور فنون حرب و ضرب کی لیاقت کی وجہ سے لوگ اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور بہادری کی شہرت میں اس کو ضرب المثل کا درجہ دیا گیا۔ کچھ مبالغہ آمیز حکایتیں بھی اس کی طرف منسوب ہوئیں اور ان کو عوامی داستانوں اور قصوں کے ہیرو کی حیثیت حاصل ہوئی ان کی شہرت اب تک عرب ممالک میں پائی جاتی ہے۔

عشرہ بن شداد کو سپہ گری میں مہارت اور قبیلہ عبس کے نوجوانوں میں نمایاں مقام حاصل کرنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ عشرہ کو اپنی چچا زاد بہن "عبلہ" سے محبت ہوگئی، اس نے چاہا کہ اس کا چچا اس کو اپنی دامادی میں لے لے، اس کے لیے اس نے جاہ و حشم کے حصول اور بہادری میں نام پیدا کیا، لیکن چچا کو اس کے غلام ہونے کی وجہ سے تامل ہا۔ لیکن جب اس کے باپ نے اس کو آزاد کر دیا، تو اس کے چچا نے اپنی بیٹی "عبلہ" سے بخوشی اس کی شادی کر دی۔ چنانچہ جب ہم عشرہ کے غلامی کے دور کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں، تو ہمیں اس دور کی شاعری روکھی پھیکھی انداز کی ملتی ہے۔ لیکن جب اس کو آزادی مل گئی اور غلامی کا طوق اس کی گردن سے اتر گیا تو اس میں ہمت و جواں مردی بھر گئی اور اس کے ساتھ عبلہ کی محبت کے طوفان نے اس کے دل میں ہیجانی کیفیت پیدا کر دی۔ اس وقت اس کے اشعار کا پایہ بہت بلند ہو گیا۔

عشرہ بن شداد کے معلقہ کہنے کی وجہ یہ مذکور ہے کہ قبیلہ عبس کے ایک شخص نے اس کو کالے پن اور حشی ماں کا طعنہ دیا، تو عشرہ نے کہا کہ تمہارا اور میرا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ کیوں کہ میں جنگوں میں بے دھڑک کود پڑتا ہوں، کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا ہوں، مالِ غنیمت میں سے بے دریغ لوگوں کے درمیان تقسیم کرتا ہوں۔ اس پر عبسی نے کہا کہ میں تم سے اچھے شعر کہتا ہوں۔ عشرہ نے جواباً کہا کہ تم کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ کون اچھے اشعار کہتا ہے۔ چنانچہ دوسرے ہی دن اس نے اپنا یہ لاثانی معلقہ نظم کیا اور لوگوں کو سنایا تو اس کے مخالف کا منہ بند ہو گیا۔ جس کو بعد میں سونے کے پانی سے لکھ کر کعبہ شریف کے اندر لٹکا یا گیا۔

عشرہ بن شداد کا معلقہ بحرِ کامل میں ایک مہمہ قصیدہ ہے۔ اس کے اشعار کی تعداد میں اختلاف ہے، جو پچھتر سے پچاسی تک بتائی جاتی ہے۔ قصیدے کی شروعات عرب کے شعرا کے دستور کے مطابق تشبیب سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد محبوبہ کے حسن اور بعض اعضا کی توصیف کی گئی ہے۔ پھر محبوبہ کے قیام گاہ سے کوچ کرنے کی حالت اور اس کو لے جانے والی اونٹنی کے اوصاف کا ذکر کرتا ہے۔ اپنی خوبی بیان کرتا ہے کہ وہ کبھی ظلم نہیں کرتا ہے اور نہ کوئی اس پر ستم کرنے کی ہمت کر سکتا ہے۔ وہ شراب پیتا ہے۔ لیکن تہذیب و شرافت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا ہے۔ پھر اپنی شجاعت کے کارناموں کا ذکر کرتا ہے اور اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر اپنی جوانمردی، بلا نوشی اور جود و سخا کا تذکرہ کرتا ہے اور یہ سلسلہ دراز ہوتا ہے پھر اپنے اعلیٰ اخلاق و کردار کا ذکر کرتا ہے اور اس کو اپنی طرف مائل ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ عشرہ کے معلقے کے الفاظ سہل اور شگفتہ ہیں بیان کا انداز دلکشی لیے ہوئے ہے اور فصاحت و بلاغت کا عمدہ نمونہ ہے۔

عشرہ بن شداد کو بہت طویل عمر عطا ہوئی، بڑھاپے نے اس کی طاقت سلب کر لی، وہ قبیلہ بنو طے کے ساتھ ایک معرکہ میں قید کر لیا گیا اور دشمنوں نے اسے قتل کر دیا، یہ واقعہ 615 کا ہے اور بعض نے 600 تحریر کیا ہے۔

4.8 لبید بن ربیعہ العامری حیات اور شاعری

لبید بن ربیعہ نام، ابو عقیل کنیت، مضر بنی قبیلہ بنو عامر کا ہر دل عزیز اور مشہور شاعر تھا۔ یہ زمانہ کے اعتبار سے "مختصر" یعنی زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں سے فائدہ اٹھائے ہوئے ہے۔ لیکن ان کی شاعری کا اکثر حصہ جاہلی دور کی یادگار ہے۔ اس لیے ان کا شمار جاہلی شعرا میں کیا جاتا ہے۔ ان کے والد ربیعہ اپنی داد و دہش اور غربا نوازی کی وجہ سے "ربیع المقتبرین" تنگ دستوں کی بہار کے نام سے جانا جاتا تھا اور چچا ابو براء عامر بن مالک قبیلہ مضر کا بھادر شہسوار "ملاعب الأسمیة" کہلاتا تھا اور ماں بنو عبس سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ سن شعور ہی

سے شعر گوئی کا ذوق رکھتے تھے۔ یہ فطری ذوق آہستہ آہستہ پروان چڑھتا رہا اور یہ بلند مرتبہ شعرا میں شمار ہونے لگے۔ ایک روایتی صحرائی شہنشاہ کی زندگی گزاری۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ حکمت و دانش اور پند و نصیحت سے لبریز ہے۔ یہ وسیم، باعزت، لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے والے، دریا دل اور متحمل مزاج تھے۔ زمانہ جاہلیت میں ان کی شاعری اور شہسواری کی شہرت تھی، کلام ربانی کی اثر انگیزی سے متاثر ہوئے اور صحابیت کا شرف حاصل ہوا۔ اس شرف کی وجہ سے عربوں میں ان کی عزت بہت بڑھ گئی، لبید کو عرب کے "معمربین" میں شمار کیا گیا ہے۔ اسلام کے بعد شاعری کے بجائے قرآن سے شغف بڑھ گیا، اس کو حفظ کیا اور اس کی تلاوت اور اس پر عمل کرنے میں اپنے کو لگا دیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں کوفہ کے شعرا سے اسلام کے متعلق کچھ اشعار لکھنے کی فرمائش کی، تو انھوں نے تحریر کر دیئے پھر یہی مطالبہ حضرت لبید سے بھی کیا گیا، تو آپ نے معذرت کر دی اور سورہ بقرہ کی آیات تحریر کر کے بھجوا دیا اور کہا کہ اس کلام کی موجودگی میں میں اشعار نہیں کہہ سکتا "قد أبدلنى الله بالشعر سورة البقرة وآل عمران" یعنی اللہ نے سورہ البقرہ اور سورہ آل عمران شعر کے بدلہ میں عطا کر دیئے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بہت مسرت کا اظہار کیا اور ڈھائی ہزار دینار وظیفہ مقرر کر دیا اور ایک طویل عمر گزارنے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اپنے رب سے جا ملے، رضی اللہ عنہ ورضوانہ۔

لبید بن ربیعہ کی شاعری کی ابتدا کی بابت یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے قبیلے اور ان کے ماموں کے قبیلے بنو عیس میں دشمنی تھی۔ دونوں قبیلوں کے وفود حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر کے یہاں جمع ہوئے۔ عیس قبیلہ کا سردار ربیع بن زیاد تھا، جو نعمان کے مقررین میں سے تھا اور عامریوں کا سردار ملاعب الاسنہ تھا، ربیع نے نعمان کو عامریوں کے خلاف برا بھونچتا کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے انہیں وہاں عزت نہیں دی گئی۔ یہ لوگ وہاں سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے واپس آئے۔ لبید ان کے جانوروں کو چرایا کرتا تھا۔ کیوں کہ اس کا بچپن تھا۔ اس لیے اس کو کچھ نہ بتایا۔ لبید نے ان کے چہروں کو دیکھ کر تاڑ لیا کہ کوئی بات ضرور ہے۔ اس نے اصرار کیا تو انھوں نے اس کو صورت حال سے آگاہی دی۔ تو لبید نے کہا کہ ہم بادشاہ کے پاس دوبارہ حاضری دیں گے اور عیسویوں سے اپنی اہانت کا بدلہ ضرور لیں گے۔ لبید نے اس معاملہ میں کلیدی رول ادا کیا اور یہ کہا کہ میں بذات خود اس کی ایسی خبر لوں گا کہ اس کے تعلقات بادشاہ سے بگڑ جائیں گے۔ عامریوں نے اس کا امتحان لیا اور اس کے سامنے تڑبہ نامی ایک بوٹی تھی، اس کے عیوب بیان کرنے کو کہا، تو لبید نے برجستہ کہا "هذه التربة لا تذكي ناراً، ولا توهل داراً، ولا تسر جاراً، عودها ضئيل وخيرها قليل وفرعها كليل، وأشدّها قلعاً۔۔۔" یہ بوٹی نہ آگ جلاتی ہے، نہ گھر میں پیدا ہوتی ہے، اس کے پڑوسی اس سے خوش نہیں ہوتے ہیں، اس کی لکڑی کمزور ہوتی ہے، اس کا فائدہ بہت کم ہے، اس کی شاخ کمزور ہے، چراگاہ کی بوٹیوں میں یہ بری ہیئت کی ہوتی ہے، اس کی شاخ اور اکھاڑنے میں سخت ہوتی ہے۔ اس کو سن کر لوگوں کو سکون ہوا کہ یہ اپنے قبیلے کی دفاع میں مقابل کی بہترین ہجو کر سکتا ہے۔ چنانچہ بنو عامر لبید کو اپنے ساتھ دربار میں لے گئے اور اس نے ربیع بن زیاد کی ہجو سخت الفاظ میں کی، جس میں اس نے یہ بیان کیا کہ ربیع کے در پر برص کے چمکتے ہوئے داغ ہیں اور یہ اپنی دبر میں انگلی داخل کرتا ہے اور انگلی کو جڑ تک پہنچا دیتا ہے۔ گویا وہ کسی ودیعت رکھی ہوئی چیز کا طلب گار ہے۔ ربیع بادشاہ کے ساتھ کھانے میں مشغول تھا، بادشاہ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور ربیع سر سے پاؤں تک ہل گیا اور اس کی چیخ نکل گئی، اس نے دھاڑتے ہوئے کہا کہ یہ جھوٹا ہے اور کمینے کی اولاد ہے، لیکن بادشاہ نعمان نے محاسمت کے بعد کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا

اور کہا: اف لهذا الغلام لقد خبت على الطعام۔

بادشاہ نے دونوں کو خاموش رہنے کی تلقین کی۔ اس کا دل رنج سے پھر گیا اور اس نے عامریوں کی توقیر کی اور اپنی قربت عطا کی اور ان کو بخشش دے کر رخصت کیا۔

ادھر رنج بن زیاد بھی بادشاہ سے رخصت ہو کر گیا اور زندگی بھر دوبارہ ادھر کا رخ نہ کیا، تاہم نعمان نے اسے تسلی کا خط لکھ کر بلایا لیکن رنج نے جواب دیا کہ جو بات آپ کے دل میں آچکی ہے۔ اس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ اس کی صفائی کے لیے میں اپنا ستر کھول کر آپ کو دکھاؤں یہ میرے لیے ناممکن ہے۔ لہذا میری طرف سے معذرت قبول کیجیے۔ اس طرح قبیلہ بنو عامر اپنے مخالف سے ہمیشہ کے لیے چھکارہ پا گئے۔ اس واقعے کی شہرت پورے عرب میں ہو گئی اور لبید کو لوگ بطور شاعر جاننے لگے اور اس کے بعد لبید کے چھوٹی بڑی ہر قسم کے قصیدوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک بار نابغہ ذبیانی نے لبید کو بادشاہ کے یہاں دیکھا، تو اس کی آنکھوں میں نابغہ کو شاعری کی رمت محسوس ہوئی، اس پر نابغہ نے پوچھا کہ کیا تم کچھ کہتے ہو، جواب میں لبید نے اپنے کچھ اشعار اس کو سنایا، تو نابغہ نے خوش ہو کر کہا کہ جاؤ تم قبیلہ رقیس کے سب سے بڑے شاعر ہو۔

لبید بن ربیعہ عامری کی شاعری اس کی زندگی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ناقدین ادب کا بیان ہے کہ لبید کی شاعری کے سلسلے میں فیصلہ کرنے کے لیے اس کا معلقہ اور اس کی رثائی شاعری معاون ہے۔ لبید نے کم عمری ہی سے شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔ یہ بہت خوددار تھے۔ اس لیے شاعری کو غم روزگار نہیں بنایا۔ اس کی شاعری میں تفاخر کا احساس، بسالت، سخاوت، پڑوسیوں کی معاونت اور قبیلے کی توقیر کا پاس، جوش میں ہوش کا غلبہ، عقیدے کی نظافت، پند و نصائح، الفاظ میں تمکنت اور اس میں نگینے کی طرح جڑاؤ پائے جاتے ہیں۔ مرثیے میں ایک دکھ کے مارے ہوئے غم سے نڈھال انسان کے جذبات کی عکاسی اثر انداز اسلوب بیان اور دل کے تاروں کو جھنجھنا دینے والے الفاظ میں پایا جاتا ہے۔ اس کے معلقہ میں الفاظ پر شکوہ اور اسلوب میں البیلاپن ہے۔ اس میں بادیہ نشینوں کی زندگی کی جھلکیاں اور ان کے اخلاق و عادات کی سچی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں اور اس کے شانہ بہ شانہ رغبت والوں کی خواہشوں کا اظہار اور دل والوں کی تمنائوں کا بیان چلتا ہے۔

لبید بن ربیعہ عامری کے معلقے میں اٹھاسی اشعار پائے جاتے ہیں۔ یہ ایک مہمہ قصیدہ ہے اور بحر طویل میں ہے۔ اس کے مضامین روایتی ہیں۔ لیکن اسلوب میں نیا پن ہے۔ قصیدے کی شروعات تشبیب سے ہوتی ہے۔ محبوبہ کے اجڑے دیار کا ذکر غم ناک انداز میں کرتا ہے۔ اس کے بعد اپنی اونٹنی کی صبا رفتاری کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کی برق رفتاری کو گور خراور نیل گایوں سے تشبیہ دے کر حیوانی زندگی کی حقیقت جاگتی تصویریں پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد اپنی زندگی کے لذیذ مشغلوں کے ضمن میں اپنی سخاوت اور قوت و شوکت کا ذکر کرتا ہے۔ اس میں صداقت اور توازن پایا جاتا ہے۔

لبید بن ربیعہ عامری کو معلقات کے شعرا میں سب سے کم سن اور موت کے استقبال میں سب سے آخری شخص شمار کیا گیا ہے۔
معلومات کی جانچ:

۱۔ لبید بن ربیعہ کا تعلق کس قبیلے سے تھا؟

۲۔ لبید کے والد ربیعہ کو "ربیع المقتدرین" کیوں کہا جاتا تھا؟

- ۳۔ ملاعب الاسنہ کس کا لقب تھا؟
 ۴۔ لبید بن ربیعہ کا انتقال کب ہوا؟
 ۵۔ لبید بن ربیعہ کی والدہ کس قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی؟
 ۶۔ لبید بن ربیعہ کا معلقہ کس چیز کی منہ بولتی تصویر ہے؟
 ۷۔ لبید بن ربیعہ کو معلقات کے شعرا میں عمر کے حساب سے کیسا شخص شمار کیا گیا ہے؟
 ۸۔ لبید بن ربیعہ کا معلقہ کون سی بحر میں ہے؟
 ۹۔ لبید بن ربیعہ کے معلقے میں کتنے اشعار ہیں؟

4.9 حارث بن حلزہ الیشکری: حیات اور شاعری

ابو النظیم حارث بن حلزہ قبیلہ بکر کا شاعر تھا۔ اس کو بھی عمرو بن کلثوم اور طرفہ بن العبد کی طرح صرف ایک قصیدہ کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔ یہ قصیدہ اس نے عمرو بن ہند بادشاہ حیرہ کے سامنے موقعے کے مناسبت سے کہا اور بادشاہ کا فیصلہ اپنے قبیلے کے حق میں کر لیا۔ اس کو بھی طویل عمر عطا ہوئی اور "معمورین" میں شمار کیا گیا۔

بکر اور تغلب دو بھائی تھے۔ لیکن دونوں کے درمیان دشمنی تھی اور سخت تھی، ان میں نوبت لڑائی تک پہنچی اور اس کا سلسلہ طویل ہوا۔ اس لڑائی کو ایام العرب میں "حرب البسوس" کہتے ہیں۔ حیرہ کے بادشاہ منذر بن ماء السماء نے دونوں کے درمیان مصالحت کرادی اور دونوں قبیلے سے سو غلام ضمانت کے طور پر لیے، تاکہ اگر کسی قبیلہ سے دوبارہ زیادتی سرزد ہو جائے، تو مظلوم قبیلہ کو وہ سو غلام دے دیے جائیں گے۔ منذر کے بعد اس کے بیٹے عمرو بن ہند بادشاہ ہوا تو اس نے بھی اس صلح نامہ کا خیال رکھا، ضمانتی غلام بادشاہ کی حمایت میں رہے اور اس کی خدمت کرتے رہے۔ ایک بار انہیں کسی کام کے لیے بھیجا گیا اور یہ نوشیبان کے ایک کنویں کے پاس پہنچے، وہاں ان کے مائین تو تو میں میں ہو گئی، نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچ گئی، مقابلہ آرائی ہوئی اور اس موقع پر بنو بکر کے غلام دبنگ پڑ گئے، انھوں نے بنو تغلب کے غلاموں کو مار پیٹ کر وہاں سے بھاگ دیا، بھاگنے میں ان کا رخ ریگستان کی طرف ہو گیا اور وہ ان کی گرم ہواؤں کے لپیٹ میں آ گئے۔ انہیں وہاں پانی بھی نہ مل سکا اور دم لینے کا موقعہ بھی نصیب نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گرم ہواؤں کے جھکڑوں اور پیاس کی شدت نے انہیں ہلاکت سے دوچار کر دیا۔ جب تغلبیوں کو اس جاں کاہ حادثہ کی اطلاع ملی تو انھوں نے بنو بکر سے اپنے غلاموں کی ہلاکت کا تاوان طلب کیا۔ انھوں نے خون بہا دینے سے منع کر دیا۔ یہ معاملہ عمرو بن ہند کے سامنے پیش ہوا، اس مقدمے میں تغلبیوں کا وکیل ان کا سردار اور شاعر عمرو بن کلثوم تھا اور بکریوں کا وکیل نعمان بن ہرم۔ مقدمہ کی پیشی میں وکالت کے دوران نعمان نے کچھ ناشائستہ جملے کہہ دیے۔ جس سے بادشاہ کے پندار کو ٹھیس پہنچی، وہ بکریوں سے ناراض ہو گیا۔ مجلس میں حارث بن حلزہ موجود تھا۔ اس نے تاڑ لیا کہ بادشاہ کا فیصلہ تغلبیوں کے حق میں ہونے والا ہے۔ وہ جہانگیر، بردبار اور حکیم و دانا تھا۔ وہ اٹھا اور اس نے اپنا مشہور معلقہ برجستہ بادشاہ کے سامنے کہا۔ اس قصیدے میں وہ سوچ سمجھ کر تیکھے وار عمرو بن کلثوم پر کرتا رہا، عمرو بن کلثوم نے اپنے معلقے کے کچھ اشعار فی البدیہہ کہے۔ جس میں جوش و طغیانی تھا۔ بادشاہ پر اس کا اثر ہوا تھا، لیکن اس تاثیر کو حارث بن حلزہ اپنی دانائی سے کافر کرتا رہا اور ایسا میٹھا وار کرتا رہا، جس سے عمرو بن کلثوم کے کلام کی تاثیر زائل ہوتی قوم کے کارناموں کا

تذکرہ دلکش پیرایہ بیان میں کرتا اور تغلیبوں کے جوش و خروش کی وجہ سے ان کو معرکہ آرائی کا مورد قرار دیتا۔ درمیان میں عمرو بن ہند اور اس کی قوم کی توصیف کرتا، تاکہ وہ بکریوں کی طرف مائل ہو جائے اور ان کے حق میں فیصلہ کر دے۔ اس دانش مندانہ کلام کی تاثیر یہ ہوئی کہ بادشاہ نے بکریوں کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ جس سے ناراض ہو کر عمرو بن کلثوم اپنے قبیلہ کے ساتھ اپنے علاقہ میں چلا گیا۔

اغانی میں یہ مذکور ہے کہ حارث بن حلزہ کے جسم پر کوڑھ کے نشانات تھے۔ جب وہ بادشاہ کے سامنے اپنا قصیدہ سنانے کے لیے کھڑا ہوا تو بادشاہ نے اپنے سامنے سات پردے ڈلوادیئے۔ کیوں کہ اس قسم کی بیماری کا دیکھنا عرب کسرشان سمجھتے تھے۔ جب حارث نے اپنا معلقہ پڑھنا شروع کیا، تو بادشاہ پر اس قدر اثر پڑا کہ وہ ایک کے بعد ایک پردے ہٹواتا گیا، یہاں تک کہ سارے پردے ہٹوادیئے اور جب حارث نے اپنا معلقہ پورا کیا، تو اس کی تعظیم کی اور اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلایا اور فیصلہ بکریوں کے حق میں دیدیا۔ اس قصیدے نے سارے عرب میں دھوم مچادی اور ایک مدت تک بنو تغلب خفت میں رہے۔ پھر موقعہ آیا اور عمرو بن کلثوم نے بادشاہ کو قتل کر دیا اور اپنا معرکہ الآراء معلقہ پیش کیا۔ تو دونوں کی وقعت عربوں کی نگاہ میں برابر ہوگئی۔ لیکن فخر میں مبالغہ کی شدت سے جو اثر عمرو بن کلثوم کے معلقہ کا ہوا، وہ حارث کے معلقہ کو نہ مل سکا۔

حارث کو زبان و بیان اور طرزِ ادا کی اثر انگیزی پر مہارت حاصل تھی۔ اس نے کچھ کچھ بھرے دربار میں فوراً اتنا بلند پایہ قصیدہ پیش کر دیا، جو عربی ادب میں ایک بڑا کارنامہ اور بہترین نمونہ مانا گیا ہے۔ ایسی عظیم مثال دوسرا کوئی عربی شاعر نہ پیش کر سکا۔

حارث بن حلزہ کا معلقہ ایک ہمزئیہ قصیدہ ہے۔ جب حارث نے اپنے قصیدے کو سنانے کی شروعات کی تو وہ ایک کمان پر ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ وہ مضامین کی تخلیق میں پوری طرح منہمک تھا کہ کمان کی نوک اس کی ہتھیلی میں گڑ گیا اور ہتھیلی زخمی ہوگئی، لیکن نہ اسے کوئی خبر ہوئی اور نہ اس کے انہماک میں کوئی فرق آیا۔

حارث معلقے کی شروعات عشقیہ شعر سے کرتا ہے اور وہ اس میں بیان کرتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ اسماء کے ساتھ کہاں کہاں گیا اور کن کن مقامات کی سیر کی۔ اس کے بعد اوٹنی کی تعریف کرتا ہے۔ پھر قبیلہ تغلب سے اپنے اختلافات اور جھگڑوں کا حال بیان کرتا ہے اور اس میں بنو تغلب کی خامیاں شمار کرتا ہے اور اس سلسلہ میں بہت سے "ایامِ عرب" اور عرب قبائل کی جنگوں کا حال بیان کرتا ہے۔ اس حیثیت سے یہ قصیدہ گذشتہ واقعات اور رونما ہونے والے مقامات کے لیے ایک تاریخی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ عمرو بن ہند کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ اس کے بعد بنو بکر کی وکالت کرتا ہے اور اس کے موقف کو بہت سوجھ بوجھ سے پیش کرتا ہے۔ قصیدے کا یہ حصہ جاہلیت میں سیاسی شاعری کی عمدہ مثال ہے۔

معلومات کی جانچ:

۱۔ حارث بن حلزہ کا تعلق کس قبیلے سے تھا؟

۲۔ ابوالظلم کس کو کہا جاتا تھا؟

۳۔ حارث بن حلزہ کو "معمرین" میں کیوں شمار کیا گیا؟

۴۔ حارث بن حلزہ نے کس کے کلام کی تاثیر زائل کر دی؟

5- حارث بن حلزہ کے جسم پر کس چیز کے نشانات تھے؟

6- حارث بن حلزہ کا ہاتھ کیوں زخمی ہوا؟

7- حارث بن حلزہ کا معلقہ کون سی بحر میں ہے؟

8- حارث بن حلزہ کا معلقہ کس چیز کی مثال ہے؟

4.10 نابغہ ذبیانی: تعارف

4.10.1 حالات زندگی:

نابغہ ذبیانی کا اصل نام زیاد بن معاویہ بن سعد بن ذبیان ہے اور اسی وجہ سے اس کی نسبت ذبیانی ہے۔ اس سے نابغہ جعدی اور نابغہ بنی شیبان وغیرہ سے امتیاز بھی ہو جاتا ہے۔ پہلے طبقتے کے جاہلی شعرا میں نابغہ کا نام بڑی اہمیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کی شاعری کا چرچا پورے عرب میں مدتوں تک رہا اور آج بھی نابغہ کلاسیکی عربی شاعری کے سرخیلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے ساری عمر شعر گوئی کی جدوجہد میں گزاری۔ بڑھاپے میں جا کر شاعری میں طبیعت موزوں ہوئی۔ اس کے بعد اس کی زبان سے اس طرح شعر نکلنا شروع ہوئے، جیسے کوئی چشمہ پھوٹ پڑا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا نام نابغہ بھی اسی لیے پڑا تھا کہ کافی عمر کے بعد اس نے شعر کہنا شروع کیا۔

نابغہ نے 530ء میں حیرہ کے دربار شاہی سے وابستگی اختیار کی، اسی سال مہلہل کا انتقال ہوا تھا اور حیرہ کا بادشاہ منذر بن ماء السماء تھا۔ اس کے بعد جب عمرو بن ہند نے تخت شاہی سنبھالا تو نابغہ کے ساتھ اس کی جم نہیں سکی؛ چنانچہ نابغہ نے حیرہ کو چھوڑ کر حوران کا سفر کیا تاکہ عسائسہ کے دربار میں پہنچ کر بادشاہ کی مدح سرائی کرے، مگر جب عمرو بن ہند کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد نعمان بن ابوقابوس حیرہ کا بادشاہ بنا، تو نابغہ پھر حیرہ لوٹ آیا اور ابوقابوس نعمان بن المنذر کے دربار سے وابستگی اختیار کر لی۔ نابغہ نے نعمان بن المنذر کی اپنے قصائد میں ایسی تعریفیں کیں کہ اس نے نابغہ پر انعامات و اکرامات کی بارش کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نابغہ امیر و رئیس بن گیا اور شاہانہ زندگی گزارنے لگا۔ دولت کی فراوانی کے سبب وہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھایا کرتا تھا۔ بادشاہ سے اس درجہ قربت نے نابغہ کے بہت سے حاسدین پیدا کر دیے تھے، جو اس تاک میں لگ رہتے تھے کہ نابغہ کے خلاف بادشاہ کے کان بھریں۔ بالآخر انھیں کامیابی حاصل ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ نے کسی موقع سے نابغہ سے اپنی بیوی کی تعریف میں اشعار کہنے کی درخواست کی، تو نابغہ نے نعمان کی بیوی متجرہ کے حسن و جمال کی تعریف میں اس قسم کے اشعار کہے:

فَأَمَّتْ تَرَاءَى بَيْنِ سَجْفِي كَلَّةٍ

كَالشَّمْسِ يَوْمَ طُلُوعِهَا بِالْأَسْعَدِ

أَوْ ذَرَّةٍ صَدْفِيَّةٍ غَوَاضِهَا

بِهَجِّ مَتَى يَرَهَا يَهْلُ، وَيَسْجُدُ

سَقَطَ النِّصْفُ، وَلَمْ تُرِدْ إِسْقَاطَهُ

فَتَنَاوَلْتَهُ، وَ اتَّقْتَنَا بِالْيَدِ
بِمُخَضَّبٍ رَخِصٍ، كَأَنَّ بِنَانَهُ
عَنَّمْ عَلَىٰ أَعْصَانِهِ لَمْ يَعْقِدْ

ترجمہ: جب وہ ریشمی دوپٹہ اوڑھ کر کھڑی ہوئی، تو اس کا چہرہ آفتاب کے مثل چمکتا دکھتا نظر آ رہا تھا جب کہ وہ منزلِ اسعد میں طلوع ہو رہا ہو یا وہ سہمی کا ایسا قیمتی موتی ہو کہ اگر غوطہ خور اسے دیکھ لے، تو مارے خوشی کے اس کی چیخ نکل جائے اور وہ سجدے میں گر پڑے۔ ایک دن اچانک اس کے سر سے دوپٹہ سرک گیا، تو شرم و حیا کے سبب جلدی سے اس نے ایک ہاتھ سے دوپٹے کو سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے مکھڑے کو چھپا لیا، وہ ہاتھ نازک و نرم اور مہندی سے رچا ہوا تھا، اس کی انگلیاں عنم کے درخت کے مثل خوبصورت اور سرخی مائل تھیں، جس کی شاخیں گتھی ہوئی نہیں ہوتی ہیں۔

ان اشعار میں نابغہ نے نعمان کی بیوی کا ایسا سراپا کھینچا تھا کہ گویا اس کے اعضا و جوارح خود اس نے دیکھے ہوں۔ نعمان تو یہ اشعار سن کر خوش ہوا کہ شاعر نے اس کی بیوی کی خوب صورتی کی اتنی تعریف کی تھی، مگر اس کے ایک دوسرے درباری مٹھل بيشکری کا داغ گھوم گیا، اس کا جذبہ رقابت جوش مارنے لگا کیوں کہ وہ اندر اندر نعمان کی بیوی سے محبت کرتا تھا؛ چنانچہ اس نے نعمان کو نابغہ کے خلاف بھڑکانے کی سازش کی، اس کے پاس گیا اور کہا کہ کسی کے سراپا کا ایسا نقشہ وہی کھینچ سکتا ہے، جو خود اس تجربے سے گزرا ہو اور ممدوح کے تمام اعضا کو دیکھا ہو۔ یہ سن کر نعمان کو شدید غصہ آیا اور وہ نابغہ سے ناراض ہو گیا، نہ صرف اس کی تمام مراعات بند کر دیں بلکہ اس کی جان کے درپے ہو گیا اور اس کے قتل کی عام اجازت دے دی، جس کے سبب نابغہ کو شاہِ غسان کے پاس جا کر پناہ لینا پڑی۔ اس نے اسے عزت و احترام سے نوازا اور باضابطہ اپنے دربار سے منسلک کر لیا، نابغہ نے اس کی مدح میں کئی قصائد بھی لکھے، لیکن اس کے باوجود اُسے عمرو بن حارث الغسانی سے قلبی لگاؤ پیدا نہ ہو سکا۔ اُسے نعمان بن منذر کی خفگی کا قلق رہا، بلکہ نعمان کو جب معلوم ہوا کہ نابغہ غسانی بادشاہ کے یہاں مقیم ہے، تو نابغہ پر اسے مزید غصہ آیا اور اس نے نابغہ کو خط لکھ کر سخت ڈانٹ پلائی کہ جس شخص نے میرے آباؤ اجداد کو قتل کیا ہے، تم اس کے یہاں مقیم ہو اور اس کی تعریف میں قصیدے لکھ رہے ہو! اس کے بعد نابغہ کو اپنے کیے پر مزید ندامت ہوئی، چنانچہ اس کی ناراضگی کو دور کرنے کے لیے اس نے اظہارِ معذرت کرتے ہوئے کئی شاندار قصیدے کہے لیکن نعمان کا دل اس کی طرف سے پھر بھی صاف نہ ہوا۔ یہاں تک کہ عمرو بن حارث غسانی کا انتقال ہو گیا اور نابغہ کی مسلسل معذرت خواہی کے باعث پھر ایک دن ایسا آیا کہ نعمان نے اسے معاف کر دیا اور حیرہ بلا لیا۔

4.10.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات:

نابغہ ذبیانی کے مدحیہ قصائد کو ماہرین فن نے خوب سراہا ہے اور تعریفیں کی ہیں۔ اس کی مدحیہ قادر الکلامی کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے کیا جا سکتا ہے، جو اس نے نعمان کو مخاطب کر کے کہے تھے۔ وہ کہتا ہے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَعْطَاكَ سُورَةً
تَرَى كُلَّ مَلَكٍ دُونَهَا يَتَذَبَذَبُ
بِأَنَّكَ شَمْسٌ وَالْمَلُوكُ كَوَاكِبُ

إِذَا طَلَعْتُ لَمْ يَبْدُ مِنْهُنَّ كَوْكَبٌ

ترجمہ: کیا آپ نہیں دیکھتے کہ خدا نے آپ کو ایسی طاقت اور جاہ و جلال عطا کیا ہے کہ دیگر بادشاہ آپ کے سامنے آتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کہ آپ آفتاب ہیں اور وہ ستارے۔ ظاہر ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو ستارے غروب ہو جاتے ہیں۔ نابغہ نے عمرو بن الحارث الغسانی کی شان میں یہ شعر کہا:

عَلَى لِعَمْرٍو نِعْمَةٌ بَعْدَ نِعْمَةٍ

لِوَالِدِهِ لَيْسَتْ بِذَاتِ عَقَّارٍ

ترجمہ: میرے اوپر عمرو نے مہربانی کی ہے، اس کرم اور مہربانی کے بعد جو ان کے والد احسان جتائے بغیر پہلے میرے اوپر کر چکے ہیں۔ نابغہ کا کلام اتنا دل آویز، معیاری اور حسین ہوتا تھا کہ لوگ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ جریر نے نابغہ کو تمام جاہلی شعرا میں سب سے بڑا اور ممتاز شاعر کہا ہے۔ اس کا کلام تصنع، تکلف اور آورد سے بوجھل نہیں ہوتا اس لیے سامعین کے دلوں میں اتر جاتا ہے۔ اخطل نے بھی نابغہ کی تعریف کی ہے حالانکہ اخطل عہد بنو امیہ کا وہ شاعر تھا، جو کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ نابغہ نے چوں کہ زیادہ تر عرصہ غسان و حیرہ کے شاہی درباروں میں گزارا؛ اس لیے اس کی شاعری میں ایک قسم کی تہذیب، شستگی اور شائستگی پائی جاتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ فصاحت الفاظ اور تعبیرات و تراکیب کی عمدگی بھی اس کے یہاں امرؤ القیس اور طرفیہ بن العبد جیسے شعرائے بادیہ کے بالمقابل زیادہ ہے۔ اس کی شاعری کے الفاظ سہل اور معانی و مراد واضح ہوتے ہیں۔ ابن رشیق کے مطابق نابغہ ذبیانی کے اشعار میں حسن و جمال اور فنی کمالات پائے جاتے ہیں، اس کے قصائد طویل اور عمدہ ہوتے ہیں، اس کی مدحیہ، ہجویہ شاعری ہو یا مرثیہ اور وصف بیانی کے اشعار ہوں سب لاجواب ہوتے ہیں۔ مدحیہ شاعری کی طرح معذرت خواہانہ شاعری میں بھی نابغہ کا جواب نہیں ہے۔ نابغہ ذبیانی چوں کہ پورے دل کے ساتھ معذرت خواہی کے اشعار کہتا تھا، اس لیے اس نوع کے اشعار اس کی شاعری کی جان بن گئے اور معذرت خواہی کے میدان میں وہ سب سے سبقت لے گیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے:

أَنَانِي أَيْبَتِ اللَّعْنُ أَنْكَ لُمْتَنِي

وَتَلَكِ الَّتِي تَسْتَكُّ مِنْهَا الْمَسَامِعُ

فَبِتُّ كَأَنِّي سَاوَرْتَنِي ضَّيْلَةٌ

مِنَ الرَّقَشِ فِي أَنْيَابِهَا السَّمُّ نَاقِعٌ

ترجمہ: مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مجھے لعنت و ملامت کی ہے۔ خدا آپ کو لعنت سے بچائے رکھے۔ یہ ایسی بات ہے کہ اس سے میرے کان پھٹے جاتے ہیں۔ میں نے پوری رات اس قدر بے چینی میں گزاری کہ گویا مجھے چت کبری پتلی زہریلی ناگن نے ڈس لیا ہو۔ معذرت خواہی پر مبنی اشعار کی نابغہ کے یہاں بہتات پائی جاتی ہے۔ عمرو بن الحارث کی شان میں بھی اس نے معذرت خواہی کے اشعار کہے جب وہ اس سے ناراض ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ نابغہ کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا، خاص طور سے اپنے مدد و حین کی ناراضگی اسے برداشت نہ تھی۔ بادشاہوں کی ناراضگی سے وہ خوف زدہ بھی رہتا تھا کہ مبادا وہ اسے تکلیف و پریشانی میں مبتلا کر دیں۔ اسی لیے اس کے بارے

میں مشہور ہوا کہ ”۔۔ والنابغة اذارهب“۔ اس کی اس عادت کی وجہ سے بعض لوگوں نے اس پر تنقید بھی کی ہے اور اسے کم ہمت و لالچی قرار دیا ہے کہ جو صرف بادشاہ کو خوش رکھنے اور مال و دولت حاصل کرنے کے لیے اشعار کہتا تھا۔

البتہ نابغہ صرف بادشاہوں کی مدح میں کمال نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ عورتوں کی تعریف و مدح میں بھی اپنے فن کا شاندار مظاہرہ کرتا تھا جیسا کہ ماقبل میں نعمان کی بیوی کی تعریف میں اس کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ اس کے عام قصائد میں بھی تعزول کا بھرپور رنگ پایا جاتا ہے۔ نعمان کی بیوی کے لیے کہے گئے مدحیہ قصیدے میں ہی اس کے حسن و جمال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتا ہے:

نَظَرْتُ بِمُقَلَّةٍ شَادِنٍ مُتَرَبِّبٍ
أَحْوَى أَحَمَّ الْمُقَلَّتَيْنِ مُقَلَّدٍ
صَفْرَاءَ كَالسَّيْرَاءِ أَكْمَلَ خَلْقَهَا
كَالْفَصْنِ فِي غَلَوَائِهِ الْمُتَاوِدِ

ترجمہ: اس نے ایسے ہرن کی آنکھوں سے دیکھا، جس کے ہونٹ سیاہی مائل سرخ ہیں، جس کی آنکھیں کالی کجری ہیں اور جو گردن میں ہار ڈالے ہوئے ہے۔ اس کا رنگ پیلی دھاریوں والے ریشمی کپڑے کی طرح زرد ہے، بناوٹ میں مکمل ہے اور اس کا قد لچکدار اور تروتازہ نازک شاخ کی طرح ہے۔

لَوْ أَنَّهَا عُرِضَتْ لِأَشْمَطِ رَاهِبٍ
عَبْدِ الْإِلَهِ، صَرُورَةٍ مُتَعَبِدٍ
لَرْنَا لِبَهْجَتِهَا وَحُسْنِ حَدِيثِهَا
وَلِخَالِهِ زُشْدًا وَإِنْ لَمْ يَرُشِدِ

ترجمہ: اگر وہ ایسے ادھیڑ عمر غیر شادی شدہ راہب کے سامنے آجائے، جس کی ساری عمر پروردگار کی عبادت میں بسر ہوئی ہو، تو وہ اس کی خوبصورتی کو ایک ٹک دیکھتا رہے اور اس کی خوب صورتی پر فریفتہ ہو جائے اور اسے وہ اپنی دانشمندی سمجھے، خواہ وہ دانشمندی نہ ہو۔

نابغہ ذبیانی نے مذکورہ اشعار میں متجددہ کے حسن کو اس طرح بیان کیا ہے کہ کوئی بھی اس سے متاثر ہوئے یا اس پر فریفتہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہتا ہے کہ وہ اتنی خوب صورت اور ناز و ادا میں ڈھلی ہوئی ہے کہ ایک راہب، جو دنیا کی تمام لذتوں سے بے نیاز ہو کر روز و شب اپنے رب کی عبادت و ذکر میں مشغول ہو، اتنا ہی نہیں بلکہ وہ تجرد کی زندگی گزار رہا ہو، اس نے کسی عورت کا قرب نہ پایا ہو اور لذت و صل سے نا آشنا ہو، پھر وہ بھی ادھیڑ عمر کا کہ جب خواہشاتِ نفسانی دم توڑنے لگتی ہیں اور جوانی کی منگیں باقی نہیں رہتیں، وہ بھی اسے دیکھے تو بس دیکھتا رہ جائے اور اپنے ہوش گنوا بیٹھے، تو عام انسان کا کیا کہنا۔ حسن و جمال کی تعریف میں نابغہ کے مذکورہ اشعار کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جاہلی شعرا میں نابغہ ذبیانی کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ وہ شعرا کے طبقہ اولیٰ کی فہرست میں شامل ہے۔ ویسے نابغہ کے کلام میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں، وہیں ناقدین نے بعض کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ جن میں سے ایک کمزوری اتوا کی ہے یعنی اس کے قصائد میں قافیوں کی حرکت بعض اوقات مختلف ہو جاتی ہے، لیکن بعد میں اس نے اپنے اس نقص کو دور کر لیا تھا۔ اس کی وفات 604ء میں ہوئی، اس

وقت وہ بہت زیادہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کی وفات کے تین سال بعد نعمان بن منذر کا انتقال ہوا۔

4.11 عبید بن الابرص

4.11.1 حالاتِ زندگی:

عبید ابن الابرص قدیم جاہلی شاعر ہے۔ اس کی پیدائش تقریباً 455ء میں ہوئی اور نشوونما نجد میں قبیلہ بنو اسد میں ہوئی۔ اس کا تعلق اسی قبیلے سے تھا اور اپنے قبیلے کے آثار و خصوصیات پر شاعری کیا کرتا تھا۔ عبید کا سلسلہ نسب اس طرح ہے: عبید بن الابرص بن جشم بن مالک بن الحرث بن سعد بن ثعلبہ بن دودان بن اسد بن خزیمہ بن مدرکہ۔ جب حجر بن حارث کنڈی نے 500ء میں بنو اسد پر غلبہ حاصل کیا تو عبید اس سے مل گیا اور پہلے کی دشمنی پر اظہارِ ندامت کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہو گیا۔ مگر جب کچھ دنوں کے بعد بنو اسد کی طاقت و قوت مجتمع ہو گئی، تو انھوں نے حجر کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اور ٹیکس دینے سے منع کر دیا۔ جب حجر کو معلوم ہوا، تو وہ بنو اسد کی طرف نکلا، انھیں بری طرح مارا، بہت سے سردارانِ قبیلہ کو قتل کر دیا اور بنو اسد کے بے شمار لوگوں کو نجد سے تہامہ کی طرف جلا وطن کر دیا۔ بعد میں عبید کی سفارش پر انھیں نجد واپس ہونے کی اجازت دے دی۔ ان لوگوں نے پھر اپنی قوت اکٹھا کی اور علباء بن حارث کاہلی کی قیادت میں حجر کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور کنڈیوں کا بے تحاشا قتل کیا، اس طرح بنو اسد پر ان کی حکومت و تسلط کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

عبید نے ابتدائی عمر سے ہی اشعار کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بہن ماویہ کے ساتھ بکریاں چرار رہا تھا کہ اسی دوران اسے پیاس لگی اور ایک چشمے پر پانی پینے کے لیے گیا، تو چشمے کے مالک نے اسے پانی بھی نہیں پینے دیا اور اسے اور اس کی بہن کو گالی بھی دی۔ عبید کو اس سے بہت تکلیف ہوئی اور اس نے خدا سے دعا کی کہ اسے اس شخص سے انتقام لینے کی صلاحیت عطا کر دے۔ اتنے میں اس کی زبان پر اس شخص کی ہجو میں اشعار جاری ہو گئے اور اس کے بعد وہ مستقل شاعری کرنے لگا۔

تذکرہ نگاروں کے مطابق عبید نے بہت لمبی عمر پائی۔ بعض لوگوں نے اس کی عمر تین سو سال تک بتائی ہے۔ اس کی موت کے بارے میں دلچسپ واقعہ منقول ہے۔ کہتے ہیں کہ حیرہ کا بادشاہ منذر بن ماء السماء ایک دن قبیلہ بنو اسد کے اپنے دو حاشیہ نشینوں سے خفا ہو گیا اور غصے میں انھیں قتل کروا دیا۔ بعد میں جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اسے اپنے کیے پر افسوس ہوا چنانچہ اس نے ان دونوں کی قبریں بنوائیں اور ان کا نام ”غریان“ رکھا۔ وہ سال میں دودن ان کی قبروں کے پاس بیٹھتا تھا اور اس نے دونوں میں سے ایک دن کا نام ”یومِ نعیم“ (بخشش کا دن) اور دوسرے کا نام ”یومِ ہوس“ (خجست اور سزا کا دن) رکھا تھا۔ جو شخص بخشش والے دن سب سے پہلے اس سے ملنے آتا اسے سواونٹ انعام یا اپنے گناہ کے کفارے کے طور پر دیتا اور جو شخص خجست والے دن سب سے پہلے اس سے ملتا، اسے قتل کروا دیتا اور اس کے خون سے ان دونوں کی قبروں کو نہلاتا۔ اتفاقاً سزا والے دن ہی عبید اس کے دربار میں پہنچ گیا، اسے دیکھ کر منذر نے کہا: تو کہاں مرنے چلا آیا؟ تو عبید نے اپنی چالاکي و ہوشیاری اور شاعرانہ مہارتوں سے کسی طرح جان بچانے کی کوشش کی، خود منذر نے بھی کہا کہ وہ اس کی شاعری کو پسند کرتا ہے اور اس نے اس سے اشعار سننے کی فرمائشیں بھی کیں، مگر ساتھ ہی اس نے واضح طور پر کہا کہ آج کے دن اگر سب سے پہلے تیری جگہ میرا بیٹا نعمان بھی میرے پاس آیا ہوتا، تو میں اسے بھی قتل کر دیتا؛ لہذا تیرا مرنا تو یقینی ہے، بس یہ بتاؤ کہ تم کس طرح مرنا چاہتے ہو، تو اس نے کہا کہ مارنے سے پہلے مجھے

اچھی طرح شراب پلوادیں؛ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور جب وہ بالکل بے ہوش ہو گیا تو اسے قتل کر دیا گیا اور اس کے خون سے مذکورہ دونوں قبروں کو نہلایا گیا۔ سوانح نگاروں نے اس کے قتل کے مختلف سال بیان کیے ہیں، کسی نے 545ء، کسی نے 555ء اور کسی نے 598ء لکھا ہے۔

4.11.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات:

امرو القیس عبید کا ہم عصر تھا، مگر چون کہ عبید کا تعلق بنو اسد سے تھا اور امرؤ القیس کنذی تھا اس لیے دونوں میں سخت دشمنی تھی۔ جب بنو اسد نے کنذیوں کے ساتھ قتل و غارت گری کی اور اپنے اوپر سے ان کے تسلط کو ختم کر دیا تو اس واقعے سے امرؤ القیس سخت رنجیدہ ہوا۔ وہ خود بھی میدان جنگ سے کسی طرح جان بچا کر بھاگ سکا تھا۔ اب وہ اس تدبیر میں لگا رہا کہ کس طرح بنو اسد سے اپنے قبیلے کی ہزیمت کا بدلہ لیا جائے۔ چنانچہ اس نے عملی تدبیر سے پہلے اپنے اشعار کے ذریعے بنو اسد کو دھمکی دینا شروع کی کہ وہ حجر کے قتل کا بدلہ لے گا۔ اس نے اپنے اشعار میں یہ بھی کہا کہ بنو اسد و بنو کنذہ کی جنگ میں اپنے ہاتھوں سے اس نے بنو اسد کے بہت سے سرداروں کو قتل کیا تھا۔ عبید کو جب اس کا علم ہوا، تو اس نے اسے جواب دیا اور امرؤ القیس کو عار دلانی کہ جس دن بنو اسد بنو کنذہ پر حملہ آور تھے اور دونوں میدان جنگ میں آمنے سامنے تھے، اس دن تو تمہارے قبیلے نے ہمت ہار دی تھی، اب بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو۔ عبید نے اپنے اشعار کے ذریعے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس دن تو نہ صرف بنو کنذہ بلکہ ان کے حلیف بنو عسنان کے بھی بہت سے سرداروں کو ہم نے مارا تھا اور اگر تم میدان جنگ سے بھاگ نہ گئے ہوتے، تو تمہارا بچنا بھی مشکل تھا۔ امرؤ القیس کے لیے عبید کے جوابی اشعار کچھ یوں تھے:

يَا ذَا الْمُخَوِّفِنَا بِقَتْلِ
أَبِيهِ إِذْ لَأَلَا وَ حِينَا
أَزْعَمْتَ أَنْكَ قَدْ قَتَلْتَ
سِرَاتِنَا ؟ كَذِبًا وَمِينَا
هَلَّا عَلَى جُحْرِبِنِ أُمَّ قَطَامٍ تَبْكِي، لَا عَلَيْنَا
هَلَّا سَأَلْتَ جَمُوعَ كِنْدَةَ
يَوْمَ وَلَوِ الْيَنِّ أَيْنَا

ترجمہ: اے وہ شخص جو ہمارے آبا کو مارنے اور ذلیل کرنے کی دھمکی دے رہا ہے! تیرا گمان ہے کہ تو نے ہمارے سرداروں کو قتل کیا ہے، یہ سراسر جھوٹ ہے۔ تو ہمارے بجائے حجر بن ام قطام کی موت پر کیوں نہیں روتا؟ تم اس دن بنو کنذہ سے کیوں نہیں پوچھ رہے تھے، جب وہ میدان چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے کہ کہاں بھاگے جا رہے ہو؟

جب عبید بوڑھا ہو گیا اور ساتھ ہی معاشی تنگدستیوں کا بھی شکار ہو گیا، تو اس کی بیوی، جو خود بھی بوڑھی تھی، اسے ناپسند کرنے لگی۔ تو عبید

نے اس پر یہ اشعار کہے:

تَلِكْ عُرْسِي غَضْبِي تُرِيدُ زَبَالِي
أَلْبِينِ تُرِيدُ أُمَّ لِدَلَالِ

إِنَّ يَكُنْ طَبُّكَ الْفِرَاقُ فَلَا أَحْفَلُ
 أَنْ تَعْطَفِي ضِدُورِ الْجَمَالِ
 أَوْ يَكُنْ طَبُّكَ الدَّلَالُ، فَلَوْ فِي
 سَالِفِ الدَّهْرِ وَاللَّيَالِي الْخَوَالِي
 كُنْتُ بَيْضَاءَ كَالْمَهَابَةِ، وَإِذِ
 آتِيكَ نَشْوَانِ مُرْخِيَاءِ أَذْيَالِي
 فَاتْرَكِي مَطَّ حَاجِيكِ وَعَيْشِي
 مَعَنَا بِالزَّجَاءِ وَالتَّأْمَالِ

ترجمہ: میری بیوی مجھ سے ناراض ہے اور مجھ سے الگ ہونا چاہتی ہے، کیا وہ واقعی ناراض ہے یا ناز و ادا کا مظاہرہ کر رہی ہے؟ اگر تو واقعی الگ ہونا چاہتی ہے، تو مجھے کوئی پروا نہیں، تو جاسکتی ہے اور اگر تو جھوٹی ناراضگی جتا رہی اور نخرے کر رہی ہے، تو یہ تجھے بہت پہلے زمانہ گزشتہ میں کرنا چاہیے تھا، جب تو موتی جیسی خوب صورت تھی اور جب میں تیرے پاس مستی میں جھومتا ہوا اپنا دامن گرائے ہوئے آتا تھا۔ پس اب تو اپنے ابروؤں کو پھیلانا چھوڑ اور میرے ساتھ پر امید زندگی گزار۔

ان اشعار میں عبید اپنی بیوی کی ناراضگی اور اسے چھوڑ کر جانے کی اس کی خواہش کو بیان کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ اگر واقعی تو مجھے چھوڑ کر جانا چاہتی ہے تو جاسکتی ہے، لیکن اگر محض ناز و ادا کے اظہار کے طور پر ایسا کہہ رہی ہے تو اب ہماری وہ عمر کہاں رہی، جب میں مستی اور خوشی کے عالم میں تیرے پاس آتا تھا۔ ان دنوں تو بھی موتیوں جیسی خوب صورت ہوا کرتی تھی اور میں بھی بھرپور جوان ہوا کرتا تھا۔ اب تو ہم دونوں میں ہی دم خم نہیں رہا، لہذا اب ناک بھوس چڑھانا بند کرو اور اچھے دنوں کی آس میں میرے ساتھ زندگی بسر کرو۔

حکمت و دانشمندی کے قیمتی نکات پر مشتمل اشعار:

تَصْبُو وَأَنْتِ لَكِ التَّصَابِي
 أَنْتِ، وَقَدْ رَاعَكَ الْمَشِيْبِ
 فَكُلُّ ذِي نِعْمَةٍ مَخْلُوسِ
 وَكُلُّ ذِي أَمَلٍ مَكْدُوبِ
 وَكُلُّ ذِي غَيْبَةٍ يُوْوِبِ
 وَغَائِبِ الْمَوْتِ لَا يُوْوِبِ
 مَنْ يَسْأَلُ النَّاسَ يَحْزُنُوهُ
 وَسَائِلُ اللَّهِ لَا يَخِيْبِ

ترجمہ: تم عشق و محبت میں پڑے ہوئے ہو، اس وقت کیسا لگے گا تم بڑھاپا تمہیں ڈرائے گا؟ ہر صاحبِ نعمت سے ایک دن وہ وہ نعمت

چھن جاتی ہے اور ہر امید پوری نہیں ہو پاتی۔ ہر جانے والا لوٹ آتا ہے، مگر جسے موت غائب کر دے، وہ کبھی نہیں آسکتا۔ جو انسانوں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے، وہ محروم رہ جاتا ہے، جب کہ اللہ کے حضور ہاتھ پھیلانے والا کبھی مایوس نہیں ہوتا۔

دنیا کی بے ثباتی، زندگی کی بے اعتباری، انقلابات زمانہ اور حادثات و تغیرات کو بیان کرنے والے عبید کے یہ اشعار نہایت قیمتی اور خوب صورت ہیں۔ ان اشعار میں جہاں اس نے حالات کی تبدیلی کی طرف اشارے کیے ہیں، وہیں اچھے حالات میں موت کو یاد کرنے اور برے حالات میں انسانوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے بجائے خالق کائنات کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی تلقین کی ہے؛ کیوں کہ اگر ہم ایک انسان کے آگے ہاتھ پھیلائیں تو محرومی ہی ہاتھ لگے گی، جب کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے انسان کبھی مایوس نہیں ہوتا۔

عبید بن الابریص پر گوشاعر تھا، البتہ اس کے زیادہ اشعار دستیاب نہیں ہیں جس کی وجہ سے ابن سلام نے اسے اصحاب الجہمات کے ضمن میں چوتھے طبقے میں شمار کیا ہے۔ حالاں کہ دوسرے بہت سے علمائے ادب نے اسے جاہلی شعرا کے طبقہ اولیٰ میں بھی شمار کیا ہے۔ اس نے کئی قصیدے کہے ہیں، جن میں اس کا قصیدہ ”عیناک دفعھا السروب“ سب سے طویل اور ۲۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس قصیدے کو ابو زید قرشی نے مجہمات میں شمار کیا ہے، جب کہ تبریزی نے اسے معلقات میں شمار کیا ہے۔

اس قصیدے میں جاہلی شاعری کا پورا رنگ موجود ہے۔ یعنی اپنے اس قصیدے کو دیار محبوب کے ویران ہو جانے سے شروع کرتا ہے، وادیوں، پہاڑوں اور مرغزاروں کا ذکر کرتا ہے، جہاں اس کی محبوبہ مست خرام تھی، پھر وہاں کی ویرانی، موت اور تباہی کو بیان کرتا ہے کہ کس طرح اس جگہ کی ویرانی کی وجہ سے وہاں جانوروں نے اسے اپنی آماجگاہ بنالیا۔

عبید کو فخریہ شاعری، وصف بیانی اور مرثیہ گوئی میں درک حاصل تھا۔ اس کے اشعار میں حکمت و دانش کی باتیں بھی وافر مقدار میں ملتی ہیں۔ اس کی غزلیہ شاعری بھی خوبصورت ہے، جاہلی نے بھی اس کی غزلیہ شاعری کی تحسین کی ہے۔ اس کی شاعری کی ایک اور خوبی الفاظ کی سلاست اور بیان و اسلوب کی وضاحت و شفافیت بھی ہے۔ عام طور پر جاہلی شعرا کے یہاں الفاظ و اسلوب کی جو پیچیدگی و اغلاق پایا جاتا ہے، وہ عبید بن الابریص کی شاعری میں بہت کم ہے۔

4.12 امیہ بن ابی الصلت

4.12.1 حالات زندگی:

اس کا پورا نام و نسب اس طرح ہے: امیہ بن ابی الصلت بن ابوربیعہ بن عوف بن ثقیف بن بکر بن ہوازن۔ اس کی ماں کا نام رقیہ بنت عبد شمس بن عبد مناف تھا۔ اس کا باپ طائف کے سرداروں میں سے ایک تھا۔ اس کی پیدائش و پرورش طائف میں ہی ہوئی۔ اس نے عملی زندگی کا آغاز بہ طور ایک تاجر کیا اور شام و یمن کے اسفار کیے۔ اسی دوران اس کا ذہن زہد اور دنیاوی مشاغل سے کنارہ کش ہونے کی طرف مائل ہوا۔ پھر اس نے بتوں کی پرستش چھوڑ دی، شراب بھی ترک کر دی، ایک خدا کے وجود کا عقیدہ اختیار کیا اور اپنے طور پر اس کی عبادت بھی کرنے لگا۔ اسلام کے ظہور کے بعد قریب تھا کہ وہ اسلام قبول کر لے، مگر اس کی قوم ثقیف کی اسلام دشمنی آڑے آگئی؛ چنانچہ وہ بھی مسلمانوں اور اسلام کا دشمن بن گیا اور لوگوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے لگا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اپنے مذہبی مطالعے کے دوران وہ اس نتیجے

پر پہنچا تھا کہ عنقریب کوئی نبی پیدا ہونے والا ہے، اس لیے اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہونے لگی کہ وہی نبی ہو لیکن جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا کی گئی، تو وہ دیکھتا ہی رہ گیا اور حسد کی وجہ سے ایمان نہیں لایا اور کہنے لگا کہ مجھے تو یہ امید تھی کہ نبوت مجھے ملے گی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ”وَإِنَّمَا عَلَيْهِمُ الذِّكْرُ الَّذِي أَنزَلْنَاهُ عَلَىٰ نَبِيِّكَ إِذْ قَرَأْتَ أُخْرَجُوا مِنْ دَارِهِمْ وَهُمْ فِي أَهْلِهِمْ يَضَعُونَ أَلْسِنَتَهُمْ عَلَىٰ حُدُودِهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَىٰ الْفَاسِقِينَ“۔ مگر وہ اس کے بعد بھی اسلام دشمنی سے باز نہ آیا اور لوگوں کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف کے خلاف اکساتا رہا۔ جب غزوہ بدر میں مسلمانوں نے فتح حاصل کی، تو اس نے اس غزوے میں مارے گئے مشرکین کا مرثیہ لکھا۔ اس کی وفات ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتویں یا آٹھویں سال میں 629ء میں ہوئی۔

4.12.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات:

امیہ بن ابی الصلت کا شمار اصحاب الجملہ میں ہوتا ہے۔ اس نے جاہلی دور کی شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ دینے کی کوشش کی۔ امیہ کا تمام شعری ذخیرہ دستیاب نہیں ہے، جو دستیاب ہے، اس میں مدحیہ و ہجویہ اشعار کے علاوہ مرثیہ و حکمت پر مشتمل اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔ البتہ چونکہ وہ طبعی طور پر دینی رجحان کا حامل تھا، اسی لیے اس کے قصائد میں دینی مضامین، زہد و تقویٰ اور یاد خدا و آخرت کے مضامین نمایاں نظر آتے ہیں۔ احمد حسن زیات نے لکھا ہے:

”اس کا طبعی رجحان دینی مضامین کی طرف تھا اور اسی سلسلے میں اس نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ یہی رنگ اس کی شاعری پر چڑھا ہوا ہے۔ وہ اللہ اور اس کے جلال کا وصف بیان کرتا ہے، حشر اور اس کے بھیانک واقعات کا ذکر کرتا ہے۔ جنت، جہنم اور فرشتوں کے حالات بتاتا ہے۔ تورات کے واقعات مثلاً سدوم کا خرابہ اور حضرات اسحق و ابراہیم علیہما السلام کے قصے نظم کرتا ہے، شاعری میں وہ ایسے جدید موضوعات و اسالیب پیدا کرتا ہے جن سے دیگر شعرا مانوس تھے۔ زبان میں ایسے الفاظ و تراکیب استعمال کرتا ہے جن سے اہل عرب ناواقف تھے۔“

اس اقتباس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی شاعری پر مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے اور اس نے مذہبی اشعار اس کثرت سے کہے ہیں کہ دوسرا کوئی بھی جاہلی شاعر اس میدان میں اس کے برابر نہیں پہنچتا۔ دوسری بات مذکورہ اقتباس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے بعض ایسے اسالیب اختیار کیے جو اس سے پہلے کسی نے اختیار نہ کیے تھے۔ گویا کہ اس نے جاہلی شاعری کو اسالیب و موضوعات کے اعتبار سے تنوع بخشا، یہاں تک کہ اس کے کلام میں الفاظ و تراکیب کی جدت بھی پائی جاتی ہے۔ جس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ امیہ نرا تقلیدی شاعر نہ تھا۔ اس نے جہاں جاہلی شاعری کی تقلید کی، وہیں اس سے بھی آگے کا سفر طے کیا۔ قصائد میں عبرانی اور سریانی زبان کے الفاظ سے اس کی شاعری میں وسعت پیدا ہوئی جس کو بعض ناقدین نے سراہا ہے لیکن بعض علمائے لغت نے اس کے اس تجربے کی وجہ سے اس کی زبان کو سندا ماننے سے انکار کیا ہے اور اس کی وجہ سے اس کے اشعار میں بعض دفعہ سخت پیچیدگی و ابہام بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

امیہ نے عام روش سے ہٹ کر جو شاعری کی، وہی اس کا امتیاز قرار پایا اور اسی سے اس کی منفرد شناخت قائم ہوئی۔ مثلاً اس نے کہا:

أَلْحَمْدُ لِلَّهِ مَمَسْنَا وَمَصْبَحُنَا

بِالْخَيْرِ صَبَحْنَا رَبِّي وَمَسَانَا

ترجمہ: تعریف اس خدا کے لیے ہے جو ہماری شاموں اور صبحوں کو وجود بخشا ہے۔ اے میرے رب ہماری صبح و شام میں خیر اور بھلائی لا۔

تَخَافُ الرَّدَى نَفْسِي عَلَيْكَ وَإِنَّهَا

لَتَعْلَمَنَّ أَنَّ الْمَوْتَ حَتْمٌ مُؤَجَّلٌ

ترجمہ: میرے دل کو ہر وقت تیری موت کا خدشہ رہتا ہے، حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے۔

كُلُّ عَيْشٍ وَإِنْ تَطَاوَلَ دَهْرًا

مُنْتَهِي أَمْرُهُ إِلَى أَنْ يَزُولَا

ترجمہ: ہر راحت و زندگی چاہے وہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، انجام کار ایک دن زوال پذیر ہو کر ہی رہے گی۔

لَيْتَنِي كُنْتُ قَبْلَ مَا قَدَّ بَدَالِي

فِي زُرُوسِ الْجِبَالِ أَرعى الْوَعُولَا

ترجمہ: کاش اس سچائی کو جاننے سے پہلے میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر جنگلی بکروں کو چرایا کرتا۔

إِجْعَلِ الْمَوْتَ نُصَبَ عَيْنِكَ وَاحْذِرْ

عَوْلَةَ الدَّهْرِ إِنَّ لِلدَّهْرِ عَوْلَا

ترجمہ: موت کو ہمیشہ یاد رکھو اور زمانے کے دھوکے سے بچو، بے شک زمانہ دھوکوں کا مجموعہ ہے۔

امیہ بن ابی الصلت پر جب مرض الموت طاری ہوا تو اس نے کہا:

قَدَدْنَا أَجَلِي

وَهَذِهِ الْمَرَضَةُ مِنِّي

وَأَنَا أَعْلَمُ أَنَّ الْحَنِيفِيَّةَ حَقٌّ

وَلَكِنِ الشُّكَّ يَدْخُلُنِي فِي مُحَمَّدٍ

ترجمہ: میری موت اور مرض الموت میرے قریب آگئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ مذہب حنیف حق ہے، مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں مجھے شک ہے۔

یہ کہتے ہی اس پر بے ہوشی طاری ہوگئی، پھر جب کچھ دیر بعد ہوش آیا، تو کہا:

لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ

هَآنَذَا الدَّبِيكَ

لَا مَالَ يُفِدُنِي

وَلَا عَشِيرَةَ تُنَجِّنِي

ترجمہ: لبلبک لبلبک! (خدا یا!) میں تیرے سامنے حاضر ہوں، نہ مجھے میرا مال بچا سکتا ہے اور نہ میرا خاندان نجات دلوا سکتا ہے۔
 کہا جاتا ہے کہ جب آنحضرتؐ اس کے ایمان و یقین اور توحید و رسالت کے بیان پر مشتمل اشعار سنتے تھے، تو فرماتے تھے کہ ”اس
 کی زبان تو ایمان لے آئی، مگر اس کا دل منکر رہا“۔ جاحظ نے امیہ کے بارے میں کہا ہے کہ وہ قبیلہ ثقیف کا ہوشیار ترین انسان تھا اور
 ثقیف عربوں میں سب سے ہوشیار قبیلہ تھا۔ غالباً یہی ہوشیاری یا روشنی طبع تھی کہ اسے اپنے نبی بنائے جانے کا وہم ہونے لگا تھا۔

4.13 تابط شرا

4.13.1 حالات زندگی:

تابط شرا کا اصل نام ثابت بن جابرؓ نہیں ہے، قبیلہ قیس سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا رنگ روپ سیاہ تھا، دیکھنے میں عام انسانوں سے الگ
 ڈراؤنا لگتا تھا۔ اس کی ماں حبشیہ النسل تھی۔ اس کا سن وفات 530ء ہے۔ امرؤ القیس سے پہلے یا کم از کم اس کے زمانے کا شاعر تھا۔ تابط شرا
 کے قصائد میں جاہلیت کا رنگ و آہنگ پایا جاتا ہے اور اس کی زندگی اس کے قصائد میں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ’تابط شرا‘ اس کا لقب تھا جس
 سے اسے شہرت ملی، اس کے معنی ”برائی کو بغل میں دبانے“ کے ہیں۔ اس لقب کی کئی وجوہ بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عام
 طور پر گھر سے باہر نکلتا تو بغل میں تلوار دبا کر نکلتا تھا۔ ایک دن کسی نے اس کی ماں سے اس کے بارے میں پوچھا، تو اس کی ماں نے کہا کہ
 ”پتا نہیں کہاں گیا، مگر وہ بغل میں برائی دبائے ہوئے تھا“۔ اسی دن سے اس کا یہ لقب پڑ گیا۔ ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ وہ کوئی کام نہیں
 کرتا تھا، جس پر ایک دن اس کی ماں نے کہا کہ تیرے دوسرے بھائی گھر کے باہر کچھ کام کرتے اور کما کر لاتے ہیں، تو کوئی کام نہیں کرتا بس
 یونہی بیکار پھرتا رہتا ہے، تو اس نے اپنی ماں سے کہا آج میں تیرے لیے کچھ لے کر آتا ہوں، چنانچہ وہ جنگل میں گیا اور بہت سے سانپ
 پکڑ کر اپنی جراب میں ڈالے اور اسے بغل میں دبائے ہوئے گھر آ گیا، گھر پہنچ کر جب اس نے جراب کا منہ کھولا، تو پورے گھر میں سانپ بھر
 گیا، اس کی ماں مارے ڈر کے باہر بھاگی، تو پڑوس کی خواتین نے اس سے پوچھا کہ تیرا بیٹا بغل میں کیا دبا کر لایا ہے؟ تو اس نے کہا کہ جراب
 میں سانپ بھر کر لایا ہے، یہ سن کر انھوں نے کہا کہ ”لقد تابط شرا“ (وہ تو اپنی بغل میں برائی اور مصیبت دبا لایا ہے) اور بھی دوسری وجوہات
 بیان کی جاتی ہیں۔

سماج کی پابندیوں اور خاندانی ذمہ داریوں سے گھبرا کر وہ بھی صلح کو بن گیا یعنی جنگل کی راہ اختیار کی۔ تابط شرا میں کئی ایسی خوبیاں
 تھیں جن کی وجہ سے وہ اپنے ساتھیوں میں ممتاز ہو گیا تھا۔ مثلاً وہ بہت تیز دوڑتا، عاقبت اندیشی اور دور بینی سے کام لیتا، اس لیے معرکوں میں
 اسی کو سردار بنایا جاتا تھا۔ اس کے دوڑنے کی رفتار بہت ہی تیز تھی۔ ابوالفرج اصفہانی نے الاغانی میں عمرو بن عمرو شیبانی سے ایک واقعہ نقل کیا ہے
 کہ اس کے علاقے میں قبیلہ قیس کی ایک جماعت آ کر ٹھہری تو وہ اس کے پاس گیا اور لوگوں سے تابط شرا کے واقعات جاننے کی خواہش ظاہر
 کی۔ تو ان میں سے کسی نے پوچھا کہ کیا تم بھی اسی کی طرح دشت نور داور چور ڈاکو بننا چاہتے ہو؟ تو اس نے کہا کہ نہیں! میں صرف اس کے احوال
 جاننا چاہتا ہوں، تاکہ بعد میں میں بھی لوگوں سے بیان کروں۔ تو ان لوگوں نے کہا کہ ٹھیک ہے ہم تمہیں سناتے ہیں۔ پھر انھوں نے بیان کیا کہ
 تابط شرا دو پیروں، گھٹنوں اور دو آنکھوں کے ساتھ نہایت تیز دوڑنے والا تھا، جب اسے بھوک لگتی تو وہ بجو تلاش کرتا تھا، جو سب سے موٹا اور

صحت مند بجو ہوتا، اس پر نشانہ سادھتا، پھر اس کے پیچھے بھاگتا، بھاگتا رہتا یہاں تک کہ اسے پکڑ لیتا، پھر اسے اپنی تلوار سے ذبح کرتا اور بھون کر کھاتا تھا۔ اس کے دوڑنے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ پلک جھپکتے ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔

اپنی بے مثال بہادری، پریشانیوں میں صبر و تحمل اور سوجھ بوجھ سے کام لینے کی وجہ سے وہ بڑا مشہور ہو گیا تھا اور قبائل اس کے نام سے تھراتے تھے، تاریخ و سوانح کی کتابوں میں اس کی بہادری کے بہت سے افسانوی واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک بار اونٹ پر ٹیک لگایا تو وہ اونٹ اس کے بوجھ کو برداشت نہ کر سکا اور گر گیا، ایک گھوڑے کی پشت پر بیٹھا، تو وہ گھوڑا لڑکھڑانے لگا، وہ تیز طرار گھوڑے سے بھی زیادہ تیز دوڑتا تھا، اس کی کمان سے ہوا کی رفتار سے تیر نکلتا تھا۔ اس کے حوالے سے جن و عنقریب کے بھی بہت سے واقعات بیان کیے جاتے ہیں، مگر تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ایک عنقریب ہی تھا اور اس کی صورت شکل نہایت خوفناک اور ڈراؤنی تھی۔

اس کی محبت اور شادی کی داستان بھی نہایت دلچسپ ہے۔ تابط شرا نے اشعار کے ذریعے اپنی محبوبہ کی بہت زیادہ تعریف بھی کی ہے۔ وہ اسے اسے گلاب کے پھول سے تشبیہ دیتا ہے۔ پھر اس سے ملاقات کا قصہ بیان کرتا ہے کہ ایک رات وہ اپنے ماموں اور لوٹ مار کے کاموں میں اپنے رفیق شمنفری کے ساتھ نکلا، تو اسے دور کہیں روشنی نظر آئی، قریب جا کر دیکھا تو ایک قافلہ رکا ہوا تھا اور لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ شمنفری نے تابط شرا سے کہا: ہمیں اس قافلے کو لوٹنا ہے۔ تو تابط شرا نے پوچھا کہ: اس کا طریقہ کیا ہوگا، کیوں کہ یہ تو بہت سارے لوگ ہیں اور ہم محض دو ہیں۔ تو شمنفری نے ایک پلان بنایا کہ تم ان لوگوں کے پاس جانا، جب وہ تمہیں دیکھیں گے تو پکڑنا چاہیں گے اور تمہیں دوڑائیں گے، تو تم بھاگنا، پھر ان کے آگے سرینڈر کر جانا، پھر اگر وہ تمہیں وہیں لے کر آجائیں جہاں قافلہ ٹھہرا ہے اور باندھ دیں، تو میں دور سے انہیں نظر آنے کی کوشش کروں گا، دوڑ کر ان کے سامنے آنے کی کوشش کروں گا، یہاں تک کہ وہ پھر مجھے پکڑنے کو دوڑیں گے اور میں انہیں قافلے کی جگہ سے دور بھگا لے جاؤں گا، اس دوران تم اپنی رسی کھول لینا اور جتنا مال و اسباب وہاں موجود ہو سب لوٹ کر اپنے کمین گاہ میں لے آنا۔ تابط شرا نے اسی منصوبے کے مطابق عمل کیا اور پکڑا گیا۔ پھر جب شمنفری قافلے والوں کو نظر آیا، تو انہوں نے تابط شرا سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ کیا تمہارا ساتھی ہے؟ تو اس نے انہیں جواب دیا کہ تم لوگ اس سے بچ کر رہنا، کیوں کہ وہ پوری دنیاے عرب میں سب سے تیز دوڑتا ہے، مجھے نہیں لگتا کہ تم لوگ اس کا پیچھا کر پاؤ گے۔ تو ان میں سے ایک شخص نے جواب دیا: ہم اسے ضرور پکڑ کر یہاں لائیں گے۔ پھر وہ سب شمنفری کا پیچھا کرنے لگے، وہ سارے کے سارے گھوڑوں پر سوار تھے، جب کہ شمنفری دونوں پیروں کے بل دوڑ رہا تھا، وہ ان سب کو اپنے پیچھے دوڑاتے دوڑاتے بہت دور لے گیا۔ اس دوران تابط شرا نے اپنی رسی کھولی، قافلے کا تمام سامان و اسباب اٹھا کر اس غار میں لے گیا، جہاں تابط شرا اور شمنفری نے ٹھکانہ بنا رکھا تھا، اس میں اونٹ داخل ہو رہے تھے کہ اندر سے ایک نسوانی آواز آئی، تابط شرا نے دریافت کیا کہ کون ہے؟ تو اس کے سامنے ایک نہایت خوب صورت، سڈول جسم والی دوشیزہ کھڑی تھی۔ اس نے تابط شرا سے کہا کہ تمہیں مال و اسباب تو کافی سارا مل ہی چکا ہے، تو مجھے میری راہ چھوڑ دو۔ یہ سن کر اس نے کہا: کیا تم جیسی چیز کو کوئی چھوڑ سکتا ہے؟ میں تو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ سن کر وہ لڑکی ہنس پڑی اور کہا: مجھے تم دنیا کی سب سے کمزور مخلوق لگتے ہو۔ تابط شرا کو یہ سن کر غصہ آ گیا، اس نے کہا: میرے جیسے انسان کو تم یہ کہہ رہی ہو؟ اتنے میں اس لڑکی نے اپنا ہاتھ تابط شرا کی طرف بڑھایا اور اسے پٹخ کر اس کے سینے پر بیٹھ گئی، تابط شرا مارے حیرت اور غصے کے پھنکارتا رہا کہ میں تمہیں

زندہ نہیں چھوڑوں گا بھلے ہی تم حسین و جمیل ہو۔ اس لڑکی نے اسے اٹھایا اور پھر ایک پٹختی لگائی اور اس کے سینے پر اپنا پیر رکھ کر بولی: خبیث کہیں کے، اب بولو جو بولنا ہے۔ اب تابط شرا ڈھیر ہو چکا تھا۔ اس نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ تیرے اندر اتنی طاقت کہاں سے آئی؟ تو اس کا سوال سن کر خوشی سے اس لڑکی کی ہانچیں کھل گئیں، اس نے کہا کہ میں تو تمہیں سب سے زیادہ طاقتور سمجھتی ہوں، اس لیے تمہیں معاف کرتی ہوں۔ پھر تابط شرا نے پوچھا کہ میں نے تیرے قبیلے کا سب سامان لوٹ لیا، مگر تو نے کچھ نہیں کہا، کیوں؟ تو اس نے کہا کہ: میں نے تیری بہادری کا چرچا سن رکھا تھا اور تجھے پسند کرتی تھی، اس لیے سوچا کہ توجو کرنا چاہتا ہے کر لے اور میں تجھے حاصل کر لوں۔ یہ سن کر پھر تابط شرا کی غیرت جاگ اٹھی اور اس نے کہا: میں تو سوچ رہا تھا کہ میں نے تجھ پر غلبہ حاصل کیا ہے۔ تم مجھے قتل کر دو، اس ذلت کے بعد میں اب اور کوئی ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ تو اس لڑکی نے کہا کہ میرے پاس قتل سے اچھی تجویز یہ ہے کہ تم مجھ سے شادی کر لو، جب سے میں نے تیری شہرت سنی ہے، تبھی سے تجھ سے محبت کرتی ہوں۔ تم مجھ سے شادی کر لو، پھر سرزمین عرب میں ہمارے بچوں سے زیادہ بہادر کسی کے بچے نہیں ہوں گے۔ اس طرح دونوں نے شادی کر لی۔ تابط شرا کے نہایت بد صورت ہونے کے باوجود اس کے بچے اتنے خوب صورت ہوئے کہ لوگ خوب صورتی میں ان کی مثالیں دیا کرتے تھے۔

تابط شرا کی موت کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ روایت ہے کہ اس کی ماں نے ابو کبیر ہذیل سے شادی کر لی تھی۔ ماں تو پہلے ہی اس کی عادتوں سے پریشان تھی، اس کا نیا باپ بھی تابط شرا کو اس حد تک ناپسند کرتا تھا کہ اس نے کئی بار اسے جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ تابط شرا کو اس کی بھنک لگ گئی؛ چنانچہ اس کے دل میں بھی اپنے نئے باپ اور قبیلہ ہذیل اور بنو بجیلہ کے تینوں حد درجہ نفرت بیٹھ گئی۔ کہا جاتا ہے کہ جبل نما کے علاقے میں بنو بجیلہ سے لڑتے ہوئے ہی وہ مارا گیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ اسی جنگ کے دوران ایک سانپ کے ڈسنے سے اس کی موت ہوئی، جب کہ قبیلہ ہذیل والے یہ دعویٰ کرتے تھے کہ تابط شرا کو انھوں نے مارا۔

4.13.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات:

”تابط شرا“ کو دنیائے ادب میں اس کی بے مثال شاعری کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ اس نے کئی ایسے قصیدے کہے جن کی وجہ سے دنیائے عرب میں اس کو پہچان ملی۔ اس کے قصائد میں وہ تمام فنی و شعری خصوصیات موجود ہیں، جو بعد کے بڑے بڑے عرب شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے یہاں زور تشبیب دیکھیے:

يَاعِيْدُ مَالِكٍ مِنْ شَوْقٍ وَ اِيْرَاقٍ
وَمَزٍ طَيْفٍ عَلَيِ الْاَهْوَالِ طَرَاقٍ
يَسْرِي عَلَيِ الْاَيْنِ وَالْحَيَاتِ مُحْتَفِيَا
نَفْسِي فِدَاؤُكَ مِنْ سَاَرَ عَلِي سَنَاقٍ

ترجمہ: اے بار بار آنے والی غم و خوشی کی کیفیت اور مصیبت کے وقت آنے والا خیال تو کس قدر عظیم ہے! رات کے وقت سانپ بچھووں سے بھرے راستے پر شوق و ذوق سے چلتا ہے، میری جان ایسے چلنے والے پر قربان ہے۔

یہ اس کے مشہور قصیدے کے ابتدائی اشعار ہیں۔ اس قصیدے کو مفضل الضبی نے اپنی شعری تالیف ”المفضليات“ میں شامل کیا ہے۔

قصیدہ اس وقت کا منظر پیش کرتا ہے جب تابط شرا کو قبیلہ 'بجیلہ' نے گرفتار کر لیا تھا، مگر عین اسی وقت الشنفری اور ابن براق نے اس کی مدد کی اور وہ بھاگ نکلے، یہاں تک کہ شام ہو گئی اور رات کی تاریکی چھانے لگی، عمر بن براق اور الشنفری کسی اور طرف نکل گئے تھے اور وہ رات کی تاریکی میں صحرا کے دامن میں تنہا تھا کہ یکا یک خیالِ محبوب آجاتا ہے اور پورا منظر مذکورہ اشعار میں سمٹ جاتا ہے۔

تشبیب کے مذکورہ اشعار میں محبوبہ کے ذکر کے لیے جو راہ نکالی گئی ہے وہ بالکل اچھوتی ہے کیوں کہ اس میں تخیل کی بلندی تو ہے ہی مگر سچائی بھی ہے۔ یعنی سچائی اور تخیل کی چاشنی سے ذکرِ حبیب کا خمیر تیار کر کے شاعر نے مذکورہ قصیدے کی تشبیب کو تیار کیا ہے۔ اس کے بعد یہیں سے اپنی خود اعتمادی، بہادری اور خود کفیلی کی تعریف کی راہ بھی ہموار ہو جاتی ہے کہ جب دوست احباب ساتھ چھوڑ دیں اور مصائب و آفات میں کوئی مددگار نہ ہو، تو میں اپنے اور اپنی دوڑ پر اعتماد کرتا ہوں اور مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہوں۔ اگلے چند اشعار میں اس نے اپنی دوڑ کی تعریف کی ہے۔ بعد کے شعر اوثنیوں اور ہاتھیوں کی برق رفتاری یا خوش رفتاری کی تعریف کرتے ہیں، لیکن تابط شرا خود اپنی دوڑ کی عمدہ انداز میں تعریف کرتا ہے جو حقیقت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ اسی قصیدے میں تابط شرا نے حکمت و فلسفے کی باتیں بھی کی ہیں۔ کہتا ہے:

عَاذِلْتِي إِنَّ بَعْضَ اللَّوْمِ مُعَنْفَةٌ
وَهَلْ مَتَاعٌ وَإِنْ أَبْقَيْتَهُ بَاقٍ

ترجمہ: اے ملامت گرتیری ملامت بہت سخت ہے۔ یہ مال و دولت تو آنی جانی چیز ہے، اگر میں بجیلی کے ذریعے اسے روکنا بھی چاہوں، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہمیشہ میرے ہی پاس رہے۔

چھبیس اشعار پر مشتمل تابط شرا کا یہ مشہور قصیدہ نہ صرف اس کی بلکہ اس جیسے تمام صعالیک عرب کی زندگی اور اس سے متعلق ان کے نقطہ نظر کا عکاس اور ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ اس میں حکایتِ غم دوراں بھی ہے اور شکایتِ غم جاناں بھی۔ ایک سخت کوش تند خو آزاد منش نوجوان کے جذبات کی تصویر کشی بھی ہے اور ان خانماں برباد شاعروں کی فلاکت زدہ انتہائی عسرت و غربت کی ماری زندگی کا نقشہ بھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس زندگی سے حاصل شدہ تجربات کی روشنی میں اخذ کی ہوئی حکمت و فلسفہ کی باتیں بھی، جن میں اگرچہ آج کل کے اعتبار سے بظاہر کوئی ندرت یا رفعتِ تخیل نہیں ہے، لیکن اس وقت معاشرے اور ان حالات میں بہت وقیع اور اہم سمجھی جاتی تھیں۔

تابط شرا کے قصائد کے مطالعے اور ان پر ناقدین کی رایوں و تبصروں کو سامنے رکھ کر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تابط شرا ایک بڑا شاعر تھا۔ اس کے معصروں میں سلیم بن السلک، عمرو بن براق اور اُسید بن جابر نے بھی میدانِ قصائد میں نام پیدا کیا۔ اسی دور میں اصحابِ المجرمات کا ایک قد آور قصیدہ گو شاعر بشر بن ابی خام بھی تھا۔

4.14 الشنفری

4.14.1 حالاتِ زندگی:

الشنفری بھی زمانہ جاہلیت کا ایک بڑا شاعر تھا۔ اس کا شمار شعرا کے دوسرے طبقے میں ہوتا ہے۔ یہ تابط شرا کا ماموں تھا۔ اس کا اصل نام ثابت بن اوس الازدی ہے۔ اس کا سن وفات 525ء ہے۔ زمانہ جاہلیت کے بڑے غارت گروں اور لوٹ مار کرنے والوں میں تھا، دوڑنے

میں نہایت تیز تھا۔ اس کی عادات و اطوار سے عاجز آ کر اس کے قبیلے نے اس سے براہت اختیار کر لی تھی۔

بچپن میں اس کے والد کو قتل کر دیا گیا تھا اور اس کی ماں اور خود اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا گیا تھا کہ وہ داد بیہال اور نانیہال سے بدظن ہو کر فرار ہو گیا تھا اور بعد میں انھیں پر حملہ بھی کرنے میں مشغول رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ گھوڑے سے بھی زیادہ تیز دوڑتا تھا۔ اس کی ایک چھلانگ تقریباً ساڑھے آٹھ میٹر لمبی ہوتی تھی۔ بہادر اتنا تھا کہ تن تنہا کسی بھی قبیلے پر حملہ کر دیتا تھا یا اس کے ساتھ تابلاً شرا، عامر بن اُخس اور عمرو بن براق جیسے لوگ ہوتے تھے، جو دوڑنے بھاگنے اور لوٹ مار و قتل و غارت مچانے میں اسی جیسے تھے۔

روایت ہے کہ ابھی وہ چھوٹا ہی تھا کہ بنو سلامان بن مفرج نے اس کے باپ کو مار دیا اور اسے قید کر لیا تھا۔ انہی کے درمیان اس کی پرورش ہوئی۔ پھر بڑے دنوں بعد اسے اس حقیقت کا علم ہوا کہ بنو سلامان تو اس کے قبیلے کے ہیں ہی نہیں اور اسے ان لوگوں نے قید کر رکھا ہے، یہ جاننے کے بعد اس نے قسم کھالی کہ وہ بنو سلامان کے سولوگوں کو قتل کرے گا؛ کیوں کہ انھوں نے اسے قید کیا، غلام بنا دیا اور اسے اس کے نسب اور خاندان سے بے خبر رکھا، چنانچہ اپنی قسم پوری کرتے ہوئے اس نے بنو سلامان کے 99 لوگوں کو قتل کیا، اس کے بعد وہ خود بھی مارا گیا۔ اس کی لاش ایسے ہی پڑی ہوئی تھی کہ بنو سلامان کے ایک شخص کا گزر ہوا، تو اس نے حقارتاً اسے اپنے پاؤں سے ٹھوکر مارنا چاہی، اس کا پاؤں شنفری کی ہڈی سے ٹکرایا اور زخمی ہو گیا، اسی زخم کی وجہ سے اس شخص کی موت واقع ہو گئی اور اس طرح شنفری کی بنو سلامان کے سولوگوں کو مارنے کی قسم بھی پوری ہو گئی۔ اس کے قتل کا ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بنو سلامان تو اس کے پیچھے لگے ہی ہوئے تھے اور اس بات کا علم سارے اہل عرب کو تھا؛ چنانچہ ایک بار وہ سفر کے دوران پانی پینے کے لیے کسی چشمے پر جھکا تو دو اجنبی لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور اسے بنو سلامان کے حوالے کر دیا۔ ان لوگوں نے اسے ایک پیڑ سے باندھ دیا اور پوچھا کہ مارنے کے بعد ہم تمہیں کہاں دفن کریں، تو اس نے جواب میں یہ اشعار پڑھے:

فَلَا تَدْفِنُونِي اِنَّ دَفْنِي مُحَرَّمٌ
عَلَيْكُمْ وَلٰكِنْ اُبَشِّرِي اُمَّ عَامِرٍ
اِذَا حَمَلُوْا رَاسِيْ وَفِي الرَّاسِ اَكْثَرِي
وَعُوْدِرَ عِنْدَ الْمُلتَقِيْ ثُمَّ سَائِرِي
هِنَالِكَ لَا اَرْجُو حَيَاةً تَسْرُنِي
سَمِيْرَ اللِّيَالِيْ مُبَسَّلًا بِالْجَرَائِرِ

ترجمہ: تم میری تدفین نہ کرنا، میری تدفین تم لوگوں پر حرام ہے۔ البتہ بچو کے لیے خوشخبری ہے کہ جب لوگ میرا سرتن سے جدا کر کے لے جائیں گے اور بقیہ جسم کو چھوڑ جائیں گے تو اسے کھانے کا موقع مل جائے گا۔ واضح ہو کہ مجھے کسی پُرمسرت زندگی کی آرزو نہیں ہے، اس حال میں کہ میں دراز راتوں میں بے یار و مددگار جرائم کا بوجھ اٹھائے پڑا رہوں۔

4.14.2 شاعری کے نمونے اور خصوصیات:

اس کا شمار بھی صعلیک شعرا میں ہوتا ہے۔ شنفری کے اشعار میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو کسی اچھے شاعر میں ہونی چاہئیں۔ اس کے

یہاں حسن و عشق، مناظرِ فطرت، اخلاق و حکمت اور مشاہدات و تجربات کا بیان ہے۔ دراصل زمانے کے حالات نے اسے ایک سنجیدہ شاعر بنا دیا تھا۔ شنفری کے اشعار اظہارِ شجاعت و فخر و مہابات پر مشتمل بھی ہیں، کچھ غزلیہ شاعری بھی کی ہے۔ اس کے بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں، جن کی نسبت تابلط شرا کی طرف کی جاتی ہے۔ اس نے متعدد ایسے قصائد کہے جو عرب میں خاصے مشہور ہوئے۔ 186 اشعار پر مشتمل اس کا قصیدہ ’لامیۃ العرب‘ عمدہ اور دورِ جاہلی کے شاعرانہ کلام کا بہترین نمونہ ہے۔ فصاحت و بلاغت اور بے خانماں زندگی کی عکاسی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس قصیدے کی مختلف شروحات لکھی گئی ہیں، جن میں محمود بن عمر الزمخشری کی ’شرح لامیۃ العرب‘، محمد بن قاسم کی ’تفریح الکرب عن قلوب اہل الارب فی معرفۃ لامیۃ العرب‘ اور عطاء اللہ بن احمد کی ’شہامۃ الارب فی شرح لامیۃ العرب‘ بہت مشہور ہیں۔ اس کا یہ قصیدہ نہ صرف عربی ادب بلکہ عالمی ادب میں بھی ایک خاص مقام و مرتبے کا حامل ہے اور مختلف عالمی زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے ہیں۔ شارحین نے اس قصیدے کی لغوی و ادبی قدر و قیمت کا جائزہ لینے کے ساتھ بے گھری یا صحرا نوردی کی زندگی گزارنے والی جماعت کے تعلق سے پیش کردہ اس کے افکار و خیالات کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ اس قصیدے کی شہرت ’لامیۃ العرب‘ کے نام سے اس لیے ہوئی کہ اس میں شنفری نے جاہلی دور کے عرب صحرا نوردوں اور ان کی مہم جوئیوں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس قصیدے کی نسبت خلف الاحمر کی جانب کی ہے، جو حقائق کے اعتبار سے بالکل غلط ہے؛ کیوں کہ اس قصیدے کے جو مضامین ہیں، وہ شنفری کے دوسرے قصیدوں اور دوسری شاعری سے ملتے جلتے ہیں۔ اس کا اسلوب بیان اور ذخیرہ الفاظ بھی اسی قسم کے ہیں جو اس کی دوسری شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ اس قصیدے میں شنفری نے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے بنو سلامان پر اپنے حملوں کا ذکر کیا ہے۔ اس قصیدے کی ایک وجہ تسمیہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ شنفری کے اس قصیدے میں اور مؤید الدین ابواسماعیل حسین بن علی الطغرائی کے لامیۃ العجم میں موضوع کے اعتبار سے ایک قسم کی مشابہت و مناسبت پائی جاتی تھی؛ اس لیے علماء ادب و تنقید نے اس کا نام لامیۃ العرب رکھ دیا۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ طغرائی نے اپنے قصیدے میں شنفری کی ہی نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ دونوں قصیدوں میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ شنفری کا قصیدہ زبان و بیان کے اعتبار سے قدرے پیچیدہ اور مشکل الفاظ و تعبیرات پر مشتمل ہے، جبکہ طغرائی کا قصیدہ سادہ الفاظ اور بڑی حد تک آج کل رائج شعری اسلوب پر مشتمل ہے۔ اور دونوں میں نقطہ اشتراک یہ ہے کہ جس طرح شنفری قتل کیا گیا تھا، اسی طرح طغرائی کی بھی موت ہوئی تھی اور دونوں قصیدوں کا مرکزی موضوع بھی ایک ہی ہے یعنی اظہارِ فخر و مہابات۔

اس قصیدے میں شنفری نے نہ صرف اپنی؛ بلکہ اپنے جیسے تمام صالح ایک شعرا کی زندگی کا حقیقی نقشہ بڑے اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک بے گھر، بے در، بے یار و نمگسار، مگر غیور و خوددار اور بہادر انسان کس طرح اپنی زندگی صحراؤں، بیابانوں میں درندوں اور جنگلی جانوروں کے درمیان گزارتا ہے۔ بھوک، پیاس اور گرمی کی شدت، راتوں کی ہوشربا وحشت اور تاریکی، صحرا کی ہولناکی میں کس طرح صرف اپنی اونٹنی کے سہارے ایک منزل موہوم کی طرف چلتا رہتا ہے، یہ سب اس قصیدے میں بیان کیا گیا ہے۔

قصیدہ ’لامیۃ العرب‘ کے شروع میں میں دکھ بھرے انداز میں شنفری کہتا ہے:

أَقِيمُوا بَنِي عَمِّي صُدُورَ مَطِيكِمِ
فَأِنِّي إِلَى قَوْمِ سِوَاكُمْ لَأَمِيلُ

فَقَدْحَمَتِ الْحَاجَاتُ وَاللَّيْلُ مَقْمَرٌ
وَشَدَّتْ لَطَيَاتٍ مَطَايَا وَأَرْحُلُ

ترجمہ: اے میرے پچازاد بھائیو! تم اپنی سواریوں کی پیٹھ سیدھی کر لو (چلے جاؤ) کیوں کہ میں اپنے آپ کو تمہارے مقابلے میں دوسری قوم سے زیادہ قریب محسوس کر رہا ہوں۔ ضرورت پورا ہونے کا وقت آچکا ہے، رات روشن ہے اور سواریاں چلنے کو تیار ہیں۔ اسی قصیدے کے دوسرے اشعار میں اس نے عوام الناس کو یہ درس دیا ہے کہ جس جگہ عزت سے زندگی بسر کرنے کا موقع نہ ہو، وہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے اور اپنی دنیا کہیں الگ بسانی چاہیے۔

شمنفری کے قصیدہ لامیہ کے بارے میں خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کا ایک قول مشہور ہے، جسے بعض دفعہ بطور حدیث بھی روایت کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ایک موقع پر فرمایا کہ ”اپنی اولاد کو قصیدہ لامیہ پڑھاؤ؛ کیوں کہ اس میں حسن اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے“۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ شاعر نے اپنے قصیدے میں جو کچھ کہا ہے، اس کا کچھ نہ کچھ اثر اس کی عملی زندگی میں ضرور رہا ہوگا اور حضرت عمر بن خطابؓ اس کی زندگی کے بارے میں ضرور جانتے ہوں گے۔ حضرت عمرؓ کی بات شمنفری کی زندگی اور اس کے حالات بیان کرنے والے دیگر مؤرخین اور روات سے بہت پہلے کے ہیں، اس لیے بھی ہمیں یہ یقین کرنا چاہیے کہ بعد میں اس کے بارے میں جو روایات نقل کی گئیں اور تاریخ میں اس کے بارے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان میں حقیقت بیانی کے ساتھ بعض دفعہ ملمع سازیوں سے بھی کام لیا گیا ہے اور شمنفری کو ایک نہایت بے رحم، ڈاکو اور لٹیرے کے طور پر پیش کر کے اس کی زندگی کی محض یک رخ تصویر پیش کی گئی ہے۔

شمنفری کا ”تائیہ قصیدہ“ بھی کافی مشہور ہوا۔ یہ قصیدہ بھی اس کے فن کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس میں غزلیہ لب و لہجہ پورے شباب کے ساتھ جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ اس میں شمنفری نے اپنے ذاتی خیالات اور اپنے اوپر گزرنے والے حالات کی عکاسی کی ہے۔ خاص طور پر اپنے باپ کے قتل اور بیوی ام عمرو کے اسے چھوڑ کر چلے جانے کا جو اسے غم تھا، اسے اشعار کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ قصیدے کا آغاز اپنی بیوی کے چھوڑ کر چلے جانے پر اظہارِ افسوس سے کیا ہے۔

ایک جگہ اپنی بیوی (اور محبوبہ) کا سراپا کھینچتے ہوئے کہتا ہے:

فَدَقَّتْ وَجَلَّتْ وَاسْبَكَّتْ وَأَكْمَلَتْ
فَلَوْجُنَ إِنْسَانٍ مِنَ الْحَسَنِ جَنَّتْ
فَبِتْنَاكَانَ الْبَيْتِ حُبَيْرَ فَوْقَنَا
بِرِيحَانَةٍ رِيحَتِ عِشَاءٍ أَوْطَلَّتْ

ترجمہ: اس کے اعضا متناسب، اس کی شکل و صورت عمدہ، انداز و اطوار بڑے مست اور قد قدر عনা ہے، بس یہ سمجھ لیجئے کہ خالق نے اسے ہر اعتبار سے ایسا مکمل پیدا کیا ہے کہ اگر کوئی آدمی اس کی خوبصورتی دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا ہے، تو وہ بھی دیوانی ہو جاتی ہے۔ ہم نے ایک ایسے

گھر میں ساتھ رات گزاری، جو خوشبودار ہواؤں سے گھرا ہوا تھا اور ہلکی بارش میں ان کی خوشبو اور بھی تیز ہو جاتی تھی۔

محبوبہ کی تعریف و توصیف کا یہ ایک اچھوتا انداز ہے کہ شاعر فقط ایک شعر میں اس کی ظاہری و باطنی خوبیوں کو بڑے اچھے پیرائے میں احاطہ کرتے ہوئے بیان کرتا ہے۔ حسن کی وجہ سے کوئی اس کا دیوانہ ہوتا ہے تو وہ بھی دیوانی ہو جاتی ہے۔ محبوب کے اخلاق کو بیان کرنے کا یہ واقعی نرالا انداز ہے۔ یعنی کوئی اس پر مرے اور وہ مرے، یہ تو بڑی بداخلاقی کی بات ہے، لہذا خوش اخلاقی کی وجہ سے اپنے مرنے والے پر وہ بھی مرنے لگتی ہے۔ پھر اس نے محبوب کے ساتھ اپنے وصال کے لمحات کی نہایت خوب صورت انداز میں منظر کشی کی ہے۔

قصیدے کے اختتام پر اس نے اپنی بہادری، خودداری اور عزت نفس وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ فنی اعتبار سے یہ قصیدہ بھی نہایت اعلیٰ درجے کا ہے اور شاعری کے شاعرانہ کمال و مہارت پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں اس نے انسانی اخلاق و تعلقات چاہے وہ مرد کے ہوں یا عورت کے دونوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اپنی بیوی، جو اس کی محبوبہ بھی تھی، اس کے تئیں اس کے غائبانے میں بھی دلی محبت و تعلق کا اظہار کیا ہے۔ اور ساتھ ہی صحرا نوردی والی زندگی نے اس کے اندر جس قسم کی خصوصیات پیدا کر دی تھیں، ان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس قصیدے میں قصہ گوئی، واقعیت پسندی، سچی منظر کشی، دقتِ تعبیر اور خوب صورت طرز بیان سبھی اوصاف پائے جاتے ہیں۔ زبان کے اعتبار سے بھی یہ قصیدہ بہت اعلیٰ ہے، سنجیدہ الفاظ اور تصنع و تکلف سے پاک تعبیرات استعمال کی گئی ہیں۔

4.15 اکتسابی نتائج

عرب معاشرے میں شاعری کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ کسی قبیلے میں اگر کوئی شاعر پیدا ہو جاتا تو سارا قبیلہ خوشیاں مناتا، کیونکہ یہی شاعر ان کی نیک نامی اور دشمنوں پر غلبہ پانے کا ضامن ہوتا تھا۔ شاعری وہ معاشرے اتنی عام تھی کہ کہا گیا: ”الشعر دیوان العرب“، شعر عربوں کا تاریخی دستاویز ہے، کیونکہ اشعار میں عرب اپنی زندگی کے سبھی پہلوؤں کا احاطہ کیا کرتے تھے۔ وہ لوگ اچھے قصیدے کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سالانہ عکاظ کے میلے میں باضابطہ قضاہ کی تنقیح اور تنقید کی جاتی اور جو قصیدہ سب سے اچھا ہوتا اس کا چرچہ سارے عرب میں پھیل جاتا۔ ”سبع معلقات“ دور جاہلیت کے عربی اشعار کا وہ مایہ ناز مجموعہ ہے، جس کی ثقافت، معیار اور لسانی خوبیاں اہل عرب کے ہاں مسلم تھیں۔ یہ سارے قصیدے اپنے معیار اور فصاحت و بلاغت کی وجہ سے خانہ کعبہ پر لٹکائے گئے۔ اس کلام کی خوبیوں اور محاسن کی وجہ سے ہر دور میں اسے عربی زبان کی اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں شامل کیا جاتا رہا ہے۔ سبع معلقات کے سات شعرا ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ امرؤ القیس بن حجر الکندی - ۲۔ زہیر بن ابی سلمیٰ المزنی - ۳۔ عمرو بن کلثوم التغلبی - ۴۔ طرفہ بن العبد البکری -

۵۔ عشرہ بن شداد العبسی - ۶۔ لبید بن ربیعہ العامری - ۷۔ حارث بن حلزہ الیشکری -

زمانہ جاہلی میں شعر و شاعری کو بڑی قبولیت حاصل تھی، اس دور میں بے شمار شعر پیدا ہوئے، ان میں زیادہ تر شعر اسماج اور معاشرے کے درمیان زندگی گزارتے تھے، لیکن بعض شعرا وہ تھے جو معاشرے سے بالکل الگ تھلگ زندگی گزارتے تھے، غربت اور ناداری نے انہیں اس حد تک مجبور کر دیا کہ وہ چوری، ڈکیتی اور راہ زنی پر اتر آئے۔ جب بھی وہ کوئی چوری وغیرہ کرتے تو اس کو اپنے اشعار میں بیان کرتے، ان کی شاعری پر کیف اور اثر آفریں تھی، یہ لوگ امیر قبائل کو لوٹ کر غریبوں کو مدد کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں شجاعت اور فخر کا

پہلو غالب ہے۔ ان شعرائے صعلوک میں سب سے زیادہ مشہور تائب شرا، شنفری، عروہ بن ورد العیسیٰ، حاجز ازدی وغیرہ ہیں۔
 اصحاب مجھرات وہ شعرا ہیں جو اگرچہ کہ ان کا شمار طبقہ اولیٰ میں نہیں ہے، لیکن ان کی شاعری طبقہ اولیٰ کی شاعری سے کم بھی نہیں
 ہے، اپنے کمال فن کی وجہ سے وہ مقبول عام و خاص تھے۔ اس طبقہ کے شعرا میں سب سے زیادہ مشہور نابغہ ذبیانی، عبید بن الأبرص، امیہ بن
 ابی الصلت وغیرہ ہیں۔

4.16 نمونے کے امتحانی سوالات

- ۱۔ امرؤ القیس ایک بے باک شاعر تھا؟ ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
- ۲۔ امرؤ القیس نے گھر بار چھوڑ کر کس طرح کی زندگی گزاری؟
- ۳۔ امرؤ القیس کی شعری خصوصیات کیا ہیں؟ تفصیل سے تحریر کریں۔
- ۴۔ امرؤ القیس کے معلقے کی خوبیاں تفصیل سے تحریر کریں۔
- ۵۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کے بعض قصائد کو حولیات کہا جاتا ہے۔ اس پر ایک نوٹ لکھیے۔
- ۶۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کی شاعری کی خصوصیات مفصل سے تحریر کریں۔
- ۷۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کی شاعری میں زندگی کے طویل تجربات ہیں۔ ایک نوٹ لکھیے۔
- ۸۔ عمرو بن کلثوم کی شاعری کی خصوصیات قلم بند کیجیے۔
- ۹۔ عمرو بن کلثوم نے اپنی شاعری میں کس چیز کا پیغام دیا؟
- ۱۰۔ نابغہ ذبیانی کی زندگی کے حالات کا مختصراً جائزہ لیجیے۔
- ۱۱۔ عبید بن الأبرص کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔
- ۱۲۔ تائب شرا کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔
- ۱۳۔ امیہ بن ابی الصلت کی شاعری پر ایک نوٹ لکھیے۔
- ۱۴۔ شنفری کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

4.17 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

- ۱۔ کتاب الشعر والشعراء۔ ابن قتیبہ
- ۲۔ طبقات فحول الشعراء۔ ابن سلام الجمحی
- ۳۔ جمہرۃ أشعار العرب۔ ابن زید القرشی
- ۴۔ فی الأدب الجاہلی۔ طہ حسین

- ٥- تاريخ آداب اللغة العربية- جرجي زيدان
٦- تاريخ الأدب العربي- دكتور شوقي ضيف
٧- تاريخ الأدب العربي- أحمد حسن زيات
٨- الجديد في الأدب العربي- حنا الفاخوري
٩- كتاب الأغاني- ابو الفرج الأصبهاني
١٠- العمدة في صناعة الشعر ونقده- ابن رشيق القيرواني

اکائی 5 عصر اسلامی کا تعارف اور اس کی خصوصیات

اکائی کے اجزا	
5.1	مقصد
5.2	تمہید
5.3	اسلام کا ظہور اور عرب معاشرے پر اس کے اثرات
5.4	عصر اسلامی کی ادبی و علمی سرگرمیاں: ایک تعارف
5.5	ادب کے حوالے سے عہد نبوی و عہد صحابہ کی امتیازی خصوصیات
5.6	اکتسابی نتائج
5.7	نمونے کے امتحانی سوالات
5.8	مطالعے کے لیے معاون کتابیں

5.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ عصرِ اسلامی کے ادبی ماحول اور اس کی خصوصیات سے واقف ہو سکیں گے۔ انھیں یہ معلوم ہو سکے گا کہ اسلام نے عرب معاشرہ اور عربی فکر پر وہ کون سے اثرات مرتب کیے تھے جن کی وجہ سے علم و ادب کو ایک نئی جہت میں فروغ حاصل ہوا۔ اس عہد کی وہ کیا خصوصیات تھیں جنہوں نے آنے والے ادوار کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے راہ ہموار کی؟

5.2 تمہید

عصرِ اسلامی عربی ادب کی تاریخ کے باب میں ایک اہم مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ حقیقی معنوں میں اسی عہد میں ان علوم و آداب کی بنیاد رکھی گئی تھی جنہیں اموی اور عباسی عہد میں عروج و ارتقا حاصل ہوا۔ انہیں علوم و فنون کی وجہ سے بلند اور عالمی معیار کی ادبی تخلیقات منظر عام پر آئیں جو عربی علم و ادب کا گراں مایہ سرمایہ ہیں۔

5.3 اسلام کا ظہور اور عرب معاشرے پر اس کے اثرات

610ء میں نبی عربی محمد بن عبد اللہ ﷺ کے اعلانِ نبوت سے اسلام کی تاریخ کا آغاز ہوا۔ اس اعلان نے عرب معاشرہ میں ایک بھونچال کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ رسول اللہ ﷺ کو اس حیثیت سے لوگ قبول کرنے کو تیار تھے کہ آپ ﷺ صادق اور امین ہیں لیکن اس حیثیت سے قبول کرنے کو تیار نہیں تھے کہ آپ ﷺ عرب کے فکری اور سماجی سانچے کو بدلنے کی کوشش کریں، وہ بھی اس عنوان سے کہ خدا نے آپ ﷺ کو اس مشن پر مامور کیا ہے۔ آپ ﷺ کی اس دعوت کی توقع کے عین مطابق مخالفت کی گئی جس کا نتیجہ متعدد جنگوں کی شکل میں سامنے آیا، جن میں رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کو کامیابی اور فتح حاصل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ موقع ملا کہ وہ مدینہ میں ایک نئے سماج کی تشکیل کریں۔

یہ نیا معاشرہ اپنی منفرد اور ممتاز خصوصیات رکھتا تھا۔ اس معاشرہ نے اپنے ماقبل جاہلی معاشرہ کی ان خصوصیات اور صالح عناصر کو اپنایا جو فطرتِ انسانی کے مطابق تھیں اور جو کسی بھی انسانی معاشرہ میں خیر و عدل کے قیام کے لیے ضروری تھیں اور ان فاسد عناصر کو ترک کر دیا جو کسی بھی انسانی معاشرہ کی فلاح و ترقی میں رکاوٹ ہیں۔ اسلام نے افراد کی ان خواہیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا جن کو مظاہر پرستی اور اوہام و خرافات پر مبنی تصورات اور رسوم و رواجات کی پابندیوں کی وجہ سے اب تک ظہور میں آنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اسلام نے عربی ذہن کو آزادی عطا کی تاکہ وہ فکر کی شاہراہ پر آگے بڑھ سکے اور اس کے فطری ذوق کو جلا اور قوت حاصل ہو۔

اسلام نے عرب معاشرہ میں جو تغیرات پیدا کیے ان کی مختلف نوعیتیں تھیں۔ ایک بڑا تغیر اسلام نے یہ پیدا کیا کہ عرب کے قبائلی سماج کو جو انتشار و پراگندگی کا شکار تھا، وحدت و اجتماعیت کی لڑی میں پرو دیا۔ یمن اور حجاز اور مُضریٰ اور حمیری کے مابین قبائلی عصبیت کی بنیاد پر جو چپقلش تھی وہ دب گئی۔ جس کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے کہ ”اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں کو باہم ایک دوسرے سے جوڑ دیا اور اس طرح تم اللہ کی اس نعمت و احسان سے ایک دوسرے کے بھائی ہو گئے۔“ (آل عمران: 103)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ایہا الناس إن ربکم واحد وان أباکم واحد۔ کلکم بنی آدم و آدم من تراب و اکر مکم عند اللہ اتقا کم۔ لیس
لعربی علی عجمی فضل الا بالتقوی۔

”اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تم سب کے باپ بھی ایک ہیں۔ تم میں سے ہر کوئی آدم کی اولاد ہے اور آدم مٹی سے
بنے تھے۔ تم میں سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ تقوی والا ہو۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کسی بنا پر کوئی فوقیت حاصل نہیں
ہے سوائے تقوی کے۔ (مسند احمد)

☆ دوسرا فرق اس اتحاد و اجتماعیت کے نتیجے میں یہ آیا کہ عرصہ دراز سے جو خون ریزی اور جنگ و فساد کی فضا بنی ہوئی تھی، معمولی
باتوں پر شروع ہونے والی جنگیں جو کئی کئی دہائیوں سے جاری تھیں، جیسے ”داحس“ اور ”غبر“ کی جنگیں؛ وہ ختم ہو گئیں اور مکمل امن قائم ہو گیا۔
رسول اللہ ﷺ نے امن کو خصوصی اہمیت دی۔

☆ جاہلی معاشرہ میں خواتین اور غلاموں کی حیثیت بہت کمزور تھی، اسلام نے انہیں مستضعفین میں شمار کرتے ہوئے، ان کی حیثیت کو
معاشرہ میں بلند کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں اس طبقہ نے علم و ادب کے ہر میدان میں نمائندگی
کی اور اہم کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

☆ عربی اور عجمی کے فرق کو مٹا دینے کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ بڑی تعداد میں خطہ عرب کے اندر غیر عربوں کو اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں
کے اظہار کا موقع ملا۔ چنانچہ عباسی دور میں اس طبقہ کو علم و ادب میں عربوں پر فوقیت اور برتری حاصل ہو گئی، یہاں تک کہ خالص اسلام علوم—
تفسیر، حدیث اور فقہ— میں بھی عرب کے مقابلہ میں اہل عجم آفاق علم پر زیادہ نمایاں نظر آنے لگے۔

☆ مجموعی طور پر ایک بڑا فرق انسان کے تصور میں آیا۔ اسلام سے قبل انسان اور انسانیت کا تصور بہت دھندلا اور انسان کی اپنی
فطری حیثیت کے اعتبار سے نہایت منفی تھا۔ اسلام نے مکرم انسانیت کے حوالے سے انسانیت کے معیار کو بلند کیا۔ اس طرح عرب معاشرہ پہلی
مرتبہ اپنے حقیقی معنوں میں انسانی اقدار سے آشنا ہوا۔

بہر حال یہ مختلف عوامل اور اسلام کی طرف سے کیے جانے والے اقدامات تھے جنہوں نے عرب معاشرے کی نئی صورت گری کی اور
ایک ایسا معاشرہ تیار کیا جس نے تاریخ کے اگلے مرحلوں میں عالمی نوعیت کی معیاری تخلیقات سے عالمی ادب کے دامن کو زینت بخشنے میں اہم
کردار ادا کیا۔

اس میں شک نہیں کہ عہد جاہلی میں تخلیق کیا جانے والا شعری سرمایہ اپنی منفرد اعلیٰ خصوصیات کی وجہ سے آج بھی توجہ کا مرکز ہے۔
لیکن دیکھا جائے تو عرب کی فکری اور ادبی صلاحیت اسلام سے قبل حقیقی معنوں میں صرف شعر تک محدود تھی۔ اسلام کے انقلاب نے عربی فکر کو وہ
زرخیزی اور قوت عطا کی کہ وہ علوم و آداب کے سینکڑوں میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کے قابل ہو گئی۔ نیز وہ شعری ادب جس پر فخر،
جہو، قبائلی عصبیت، شراب اور ان جیسی دیگر اخلاقی رذائل کی چھاپ تھی، اسلام کی آمد کے بعد اس کا رنگ بدل گیا۔

اخلاقی رذائل سے فضائل کی طرف عربوں کے رخ کو موڑنے کے ساتھ، اسلام کا ایک دوسرا بڑا کارنامہ یہ رہا کہ اس نے عرب معاشرہ
میں امن کا ماحول پیدا کر دیا جس کا تصور عرب کی قبائلی معاشرت میں نہایت مشکل تھا۔ امن و عافیت کے ماحول میں بدوی ذہن کو حیات

و کائنات کے مختلف موضوعات پر غور و فکر کرنے کا موقع ملا۔ بہر حال اسلام نے جو نظریہ حیات و کائنات (world view) پیش کیا، اس نے عرب معاشرت میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کر دی، ایک ایسی تبدیلی جس سے عرب معاشرہ اب تک دوچار نہیں ہوا تھا۔

5.4 عصر اسلامی کی ادبی و علمی سرگرمیاں: ایک تعارف

اسلام نے دینی و سیاسی اور معاشی سطح پر عرب معاشرہ میں جو تبدیلیاں پیدا کیں اُن کے نتیجے میں عربی فکر کو جلا حاصل ہوئی اور بڑے پیمانے پر علمی و ادبی سرگرمیاں ظہور میں آ گئیں۔ عربوں کے پاس نثری سرمایہ بہت محدود تھا بلکہ صرف محدودے چند۔ البتہ شعری سرمایہ بہت باثروت اور وسیع تھا۔ چنانچہ عصر اسلامی میں ایک اہم تاریخی و ادبی سرمایہ کی حیثیت سے لوگوں کی توجہ اس پر مرکوز رہی۔ قرآن کی تفہیم میں یہ جاہلی شاعری لسانی سطح پر معاون تھی اس لیے اس کو پڑھنے پڑھانے کی خلفائے راشدین نے ترغیب دی۔ چنانچہ ایسے لوگ سامنے آئے جنہیں ہزاروں کی تعداد میں جاہلی دور کے اشعار یاد تھے۔ قرآن میں بہت سے ایسے الفاظ تھے عرب جن سے نامانوس تھے یا قرآن نے جن معنوں میں انہیں استعمال کیا ہے، وہ اُن سے کما حقہ آشنا نہیں تھے۔ بنا بریں متلاشی ذہنوں کو تک و دو کا موقع ملا اور اس طرح ادبی و لسانی سرگرمیوں کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔

قرآن نے ایک ادبی نمونہ کی حیثیت سے بھی لوگوں کی توجہات اپنی طرف مبذول کیں۔ قرآن کا یہ نمونہ نہ تو شعر تھا اور نہ معروف معنوں میں نثر بلکہ حقیقت میں وہ دونوں کے مابین کی صنف تھی۔ اسی کے ساتھ فصاحت و بلاغت کا عمدہ نمونہ۔ اس حیثیت سے ادبی و علمی ذوق کو پروان چڑھانے میں سب سے اہم رول قرآن نے ہی ادا کیا ہے۔

دوسری سطح پر یہ رول حدیث نے نبھایا۔ رسول اللہ ﷺ اُضحیٰ العرب و العجم تھے۔ حالانکہ آپ ﷺ اُمی تھے۔ آپ ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے بہت سے جملے اور ترکیبیں اعلیٰ نثر کا عمدہ نمونہ ہیں۔ وہ جو امع الکلم کی خوبصورت مثال ہیں۔ صحابہ کرام کے ادبی ذوق کو ان سے بھی جلا حاصل ہوئی اور ان کی نقل کی جانے لگی۔ رسول اللہ ﷺ کا حجۃ الوداع کا خطبہ آپ ﷺ کے بلاغت آمیز کلام کی عمدہ مثال ہے۔ عصر اسلامی کے ابتدائی حصے میں خطبہ کو ایک اہم صنف کے طور پر ابھرنے اور ترقی پانے کا موقع ملا۔ ان خطبات کی اصل خوبی بلاغت ہے جو جذبات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ البتہ اس کو خالص منطقی اور عقلی پیمانے پر قائل کرنے والا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد عرب اور عرب سے باہر مختلف شہروں میں بکھری گئی جس کا مقصد اسلام کے پیغام کو عام کرنا اور دنیا کی قوموں کو اس کی دعوت دینا تھا۔ ان صحابہ میں سے ایک بڑی تعداد افاضل صحابہ کی تھی۔ وہ اور ان کے شاگردوں نے علم و ادب کی اشاعت میں اہم رول ادا کیا۔ انہیں نئے ماحول سے واسطہ پڑا جس کے لیے انہوں نے نئے انداز و اسالیب اختیار کیے جس کی وجہ سے بھی علم و ادب کو فروغ حاصل ہوا۔

عصر اسلامی کو اس لحاظ سے خصوصی اہمیت حاصل رہی کہ اس عہد میں علم و ادب کی جو سرگرمیاں پروان چڑھیں اُن میں مقصد حیات پر زور تھا۔ اس طرح وجود میں آنے والا علم و ادب کا یہ سرمایہ خالص مقصدیت کی اساس پر مبنی تھا۔ اس کا کوئی عنصر ایسا نہیں تھا جو مقصدیت سے خالی ہو۔ ادب کا یہ پہلو دنیا کی تاریخ میں سب سے زیادہ اسی دور اور اس کے ادب میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یونانیوں کی

طرح کے ادبی نمونے اس دور میں سامنے نہیں آسکے جن میں مجرد تخیل کو بنیاد بنا کر علم و ادب کی تخلیق کی کوشش کی گئی ہو۔ البتہ بعد کے ادوار میں متعدد ایسے نمونے نظر آتے ہیں۔

یونان کی طرح ہندوستان میں بھی اس دور میں اور اس سے پہلے ادب اور فلسفہ کے میدان میں اس طرح کی کوششیں نظر آتی ہیں، جن کی اپنی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، تاہم ان کا تعلق قوتِ خیال اور حکمت سے ہونے کے باوجود وہ مقصدیت سے بہت دور نظر آتی ہیں۔ عصرِ اسلامی کے ادب میں یہ مقصدیت توحید و آخرت کا عقیدہ تھا جس نے زندگی کو ایک نئے معنی دے دیے جو ادب برائے دنیاوی و اُخروی زندگی سے عبارت تھا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عصرِ اسلامی میں ادب کی تخلیق اپنی کمیت اور مقدار کے لحاظ سے کم تھی تاہم اپنی کیفیت کے اعتبار سے اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ یہ اسی کیفیت اور اثر کا کمال تھا کہ اس دور میں لکھے جانے والے علوم و افکار نے آنے والے دنوں میں ایسی تہذیب کی بنیاد رکھی جس نے انسانی تاریخ کو ایک نئے مرحلہ میں داخل کر دیا۔

5.5 ادب کے حوالے سے عہدِ نبوی و عہدِ صحابہ کی امتیازی خصوصیات

گزشتہ صفحات میں اس پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ ظہورِ اسلام نے عرب کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی صورتِ حال پر کس طرح گہرے اثرات مرتب کیے اور اس کے نتیجے میں متنوع قسم کی علمی و ادبی سرگرمیاں پیدا ہوئیں۔ حسب ذیل سطور میں عہدِ نبوی و عہدِ صحابہ بطورِ خاص خلفائے راشدین کے عہد کی خصوصیات کا جائزہ علمی و ادبی نقطہ نگاہ سے لیا جائے گا۔

عہدِ نبوی اس لحاظ سے خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ اس دور میں علم و ادب کے لحاظ سے ساری اہمیت قرآن کو حاصل تھی۔ اسی کو مرکزیت حاصل تھی۔ وہ علم و ادب کا سرچشمہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیث بھی اس دور میں ظہور پذیر ہونے والے علم و ادب کا دوسرا بڑا سرچشمہ تھیں، لیکن خود رسول اللہ ﷺ کی تاکید تھی کہ حدیث کو تحریر میں نہ لایا جائے۔ اس ممانعت کی وجہ بھی دراصل لوگوں کو قرآن کو مرکز توجہ بنانے کی ترغیب دینا تھا۔ قرآن کے اسلوب کی بلاغت اور ایجاز نے لوگوں کو اس کی پیروی پر مائل کیا۔ چنانچہ صحابہ کرام کے جملوں اور نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کے کلام میں اس کی نقل و اتباع کی جھلک ہمیں نظر آتی ہیں۔

قرآن کی تدوین کے بعد جب خصوصیت کے ساتھ حدیث کو تحریر میں لانے اور جمع کرنے کی تحریک آگے بڑھی تو حدیث کی بلاغت آفرینیوں اور جوامع الکلم (گہرے معانی رکھنے والے معنی خیز جملے) نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ حدیث اور خصوصیت کے ساتھ قرآن کے اثرات ہم اس عہد کے نثری و شعری ادب پر نمایاں طور پر دیکھتے ہیں۔

عربی ادب و ثقافت پر حدیث کے اثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے احمد امین ”فجر الإسلام“ میں لکھتے ہیں:

”عالمِ اسلام میں ادب و ثقافت کے پھیلاؤ میں حدیثِ نبوی نے — خواہ وہ صحیح ہو یا گھڑی ہوئی — غیر معمولی کردار ادا کیا۔ لوگ اس کے درس و تدریس پر ٹوٹ پڑے۔ علمی و ادبی سرگرمیاں اس کے گرد گھومتی تھیں۔ علمائے صحابہ و تابعین کی علمی شہرت قرآن کی تفسیر اور حدیث (کے تعلیم و تعلم) پر مبنی تھی۔“ (فجر الإسلام، دار الکتب العربی،

بیروت، 1969 ص، 223)

صحابہ کرام میں ایسے بھی لوگ تھے جنہیں اشعار پڑھوا کر سننے سے دلچسپی تھی۔ ان میں عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن جعفر، عبداللہ بن زبیر، معاویہ بن ابی سفیان اور عمرو بن العاص شامل ہیں۔ اس کا ذکر ابوالفرج اصفہانی نے اپنی مشہور کتاب ”الأغانی“ میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اس سے اشعار خوانی کی وہ روایت جو پہلے سے عربی معاشرے میں موجود تھی وہ ختم نہیں ہوئی کیوں کہ وہ اسلام کے اصولوں کے خلاف نہیں تھی بلکہ اسے مزید پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ البتہ شعر کو سننے اور سنانے کی یہ روایت اپنے حدود و قیود میں رہی۔ اس لیے اس پر اس ”غنا“ کا اطلاق نہیں ہوتا جس کی ممانعت حدیث میں آئی ہے۔

5.5.1 عہد اسلامی کے ادب کی خصوصیات:

☆ اس عہد کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ جو ادب اس عہد میں پروان چڑھا، اس میں تکلف اور تصنع کی آمیزش نہیں تھی، اسلوب میں سادگی و صفائی اور برجستگی تھی۔ ایک اہم عربی ادیب شکر فیصل لکھتے ہیں:

”اس عہد میں عربی ادب خالص فطری نوعیت کا تھا۔ جس میں نہ کوئی تکلف تھا اور نہ تصنع۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ مطلق طور پر برجستگی اور بے ساختگی کا نمونہ تھا تاہم یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ اس میں تکلف کی آمیزش تھی۔ یہ وہ ادب تھا جس کی تخلیق، اپنی قدرت و استعداد کے حدود میں، فطری صلاحیتوں کے زور پر عمل میں آئی تھی۔ ان صلاحیتوں کو یہ فکر نہیں تھی کہ اُن کو جلا حاصل ہو اور اس میں خاطر خواہ اضافہ ہو..... اس لیے جب ہم اس ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے جیسے ایک بہاؤ ہے، ہم اس بہاؤ کے ساتھ بہتے چلے جا رہے ہیں۔“

(حنافا خوری: الجامع فی تاریخ الادب العربی، دار الجلیل، بیروت: 1986 ص، 322)

اس عہد کے ادب کی ایک دوسری خصوصیت اس کا ایجاز و اختصار ہے۔ اس ایجاز و اختصار کی دو اہم وجہیں سمجھ میں آتی ہیں: ایک تو یہ کہ جاہلی ادب کی بھی اہم خصوصیات میں اختصار شامل ہے۔ دوسرے اب فتوحات کی وسعت اور دوسری قوموں کے ساتھ اختلاط کے نتیجے میں، نیز قرآن نے ذہنوں میں جو بالیدگی پیدا کی تھی، اس کی بنا پر عربی ذہن، خواہ عوام کا ہو یا خواص کا؛ لمبی اور طول طویل عبارتوں کے بجائے حکمت سے پُر مختصر جملوں سے زیادہ متاثر ہوتا تھا۔ خود حدیث میں بھی اس سے منع کیا گیا تھا کہ کلام میں تکلف اور بال کی کھال اتارنے والا اسلوب اختیار کیا جائے۔ اس اسلوب میں فرق خلفائے راشدین کے عہد کے بعد عہد اموی میں اس وقت پیدا ہوا جب وسیع پیمانے پر شعر و ادب کی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔

☆ اس عہد میں پرورش پانے والے ادب کی ایک تیسری خوبی اور وصف یہ ہے کہ اس میں اسے ایک خاص نظریہ حیات یعنی اسلام کی تبلیغ و دعوت اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنایا گیا۔ ادب کی تخلیق کرنے والوں کے سامنے دنیوی کے ساتھ اخروی سعادت کا حصول تھا۔ عہد نبوی میں شعر کو دشمنوں کے ساتھ قلمی و لسانی جہاد اور عقائد و ملت اسلام کے دفاع کے لیے استعمال کیا گیا، جس میں خصوصیت کے ساتھ مشہور صحابی رسول حسان بن ثابت کو اہمیت حاصل ہے۔

☆ اسی تیسرے وصف سے وابستہ چوتھا وصف وہ ہے جس پر اوپر کے مضمون میں روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ جو ادب عہد نبوی و عہد صحابہ

میں وجود میں آیا، اس میں مقصدیت پر زور تھا۔ یعنی وہ ادب برائے سعادت دنیوی و اُخروی کا نمونہ تھا نہ کہ ادب برائے ادب کا۔

5.5.2 عہد اسلامی کے ادب کے اصناف:

اس عہد میں ادب کے جن نمونوں کو پروان چڑھنے کا موقع ملا یا دوسرے لفظوں میں جن اصناف پر اس عہد کی سرگرمیاں حاوی تھیں، وہ ہیں: شعر، خطابت، خطوط و مراسلات، عہد نامے اور میثاقات۔ ان میں شعر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اگرچہ شعر کی اسلام میں بہت زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ چنانچہ قرآن میں ان الفاظ میں اس کی مذمت کی گئی کہ ”گمراہ لوگ شعرا کی پیروی کرتے ہیں اور یہ کہ شعرا باطل خیالات کی وادیوں میں اڑان بھرتے رہتے ہیں اور خود اپنے قول کو عملی سانچے میں نہیں ڈھالتے“ (الشعراء: 226-223) تاہم کسی کو شعر گوئی سے روکا نہیں گیا اور اس پر بندش نہیں لگائی گئی۔ شعرا کی مذمت اس پس منظر میں کی گئی تھی کہ دورِ جہالت کی شاعری میں کوئی مقصدیت موجود نہیں تھی، بلکہ اس کے بجائے وہ اخلاقی رذائل کا آلہ کار تھی جیسے جاہلی عصبیت کا اظہار، حسب و نسب پر فخر، شراب کی تعریف اور بے حیائی کی منظر کشی وغیرہ۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کا رخ اخلاق و آداب کے فروغ اور مقصدِ حیات کی اشاعت کی طرف موڑ دیا۔ بعض صحابہ جیسے حضرت عمرؓ کے تعلق سے روایات میں آتا ہے کہ انھوں نے بعض شعرا کو سزا دیں یا انھیں شعر گوئی سے روکا، اس کا تعلق ہجو گوئی سے ہے۔ حضرت عمرؓ نے مشہور شاعر حُطیبہ کے ساتھ سختی برتی کہ وہ اس سے باز آجائے۔ ورنہ صورت حال یہ تھی کہ خود حضرت عمرؓ اشعار پسند کرتے اور سنتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کی طرف بعض قصائد منسوب ہیں، جب کہ حضرت علیؓ کے اشعار مشہور زمانہ ہیں اور اب وہ دیوان کی شکل میں شائع بھی ہو چکے ہیں البتہ ناقدین کی رائے میں بہت سے اشعار ان کی طرف منسوب کر دیے گئے ہیں۔

اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد نبوی و خلفائے راشدین میں شعر کی گرم بازاری تو نہیں تھی لیکن اس کا قافلہ رواں دواں تھا۔ اس کی سرگرمی میں کمی کی دو وجہیں تھیں: ایک وجہ تو یہ تھی کہ مسلمان فتوحات میں مصروف ہو گئے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اب شعر و شاعری اپنے جاہلی دور کی موروثی خصوصیات کے ساتھ اسلامی معاشرے میں پر نکالنے کے قابل نہیں رہ گئی تھی۔ اس لیے صحابہ میں سے بعض افراد نے اسلام قبول کرنے کے بعد یہ کہہ کر شاعری ترک کر دی کہ اب قرآن کے نزول کے بعد شعر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

شعر گوئی کے علاوہ جس دوسری صنف کو عہد نبوی خصوصاً عہد صحابہ میں فروغ حاصل ہوا، وہ خطابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو خدا کی طرف سے خطابت کا خصوصی ملکہ عطا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے مختلف مواقع پر دیے گئے آپ ﷺ کے خطبات آپ ﷺ کی معجز بیانی کا شاہکار ہیں۔ جیتے الوداع اور فتح مکہ کے موقع پر دیے گئے خطبات اسی ضمن میں آتے ہیں، ان کا اسلوب عربی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

خلفائے راشدین میں ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ چاروں کو خطابت کا ملکہ حاصل تھا۔ تاہم حضرت علیؓ کو ان میں امتیازی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے خطبات کی جو جھلک ان کے خطبات کے مجموعہ ”نہج البلاغہ“ میں نظر آتی ہے، وہ عربی ادب کی پوری تاریخ کے اہم ادبی نمونے اور شہ پارے کی حیثیت رکھتا ہے۔

خطوط و مراسلات اور عہد ناموں کے ضمن میں عہد نبوی کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کے مکاتیب آتے ہیں جو آپ ﷺ نے عرب و عجم کے حکمرانوں کے نام لکھے۔ ان حکمرانوں میں: ہرقل شاہ روم، خسرو پرویز شاہ ایران، نجاشی شاہ حبشہ، منذر بن ساوی شاہ بحرین وغیرہ شامل ہیں۔ ان خطوط و فرامین کو ڈاکٹر حمید اللہ (م 2002ء) نے اپنی مرتب کردہ کتاب: ”مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ للعہد النبوی

والخلافة الراشدة“ میں جمع کر دیا ہے۔ اسی طرح وہ خطوط و مراسلات اور فرامین ہیں جو خلفائے راشدین نے اپنے گورنروں کو لکھے اور بھیجے اور وہ وثائق ہیں جو معاہدے نامے کی شکل میں پائے جاتے ہیں جو غیر مسلم ریاستوں پر فتح پانے کے بعد ان کے حکمراں اور عوام کے ساتھ کیے گئے تھے۔

عہد نبوی و عہد خلفائے راشدین کی ایک اور خوبی جس کا ذکر ضروری ہے، تحریر و کتابت کا فروغ اور پھیلاؤ ہے۔ ظہور اسلام کے وقت عربوں میں لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ تحریر کے بجائے علمی وراثت کو زبانی سطح پر دوسری نسلوں تک منتقل کرنے کی روایت موجود تھی۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مشہور عربی مورخ بلاذری کے مطابق اس وقت مکہ میں صرف 17 افراد پڑھنا جانتے تھے۔ جن میں کبار صحابہ شامل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ہدایت کی کہ ”تحریر کے ذریعے علم کو محفوظ کر لو“ (قیدوا العلم بالکتابۃ) (طبرانی) ہدایت نبوی اور خلفائے راشدین کی خصوصی توجہ سے تحریر و کتابت کو سیکھنے کا ذوق لوگوں میں پیدا ہوا۔ اس طرح عربوں میں زبانی سے تحریری روایت کی طرف منتقلی نے علم و ادب کی نشرو اشاعت میں نیز اصحاب علم کے درمیان باہم تبادلہ فکر کی روایت کو آگے بڑھانے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔

خلفائے راشدین کے عہد میں قرآن کو فی خط میں لکھا گیا، اس کے بعد عہد بنو امیہ میں اس سے تحریر و کتابت کے چار مزید نمونے ظہور میں آئے اور اس کے بعد اس نے باضابطہ ایک نفیس و پائیدار فن کی شکل اختیار کر لی جس نے اسلام کی ادبی و علمی روایت پر گہرے نقوش مرتب کیے۔

معلومات کی جانچ

۱۔ قرآن نے عربی فکر کو کس طرح متاثر کیا؟

۲۔ کن صحابہ کو خصوصیت کے ساتھ اشعار سے دل چسپی تھی؟

۳۔ عہد نبوی و عہد صحابہ میں کن اصناف کو مقبولیت حاصل تھی؟

۴۔ عصر اسلامی کے ادب میں کس پہلو پر زیادہ زور تھا؟

5.6 اکتسابی نتائج

اسلام کا ظہور عربی سماج کے لیے ایک زلزلہ اور انقلاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے عرب کو فکری، ادبی، سیاسی، سماجی ہر سطح پر متاثر کیا۔ اس نے عرب معاشرہ میں جو تغیرات پیدا کیے ان کی مختلف نوعیتیں تھیں۔ عرب کے قبائلی سماج کو جو انتشار و پراگندگی کا شکار تھا، اسے اسلام نے وحدت و اجتماعیت کی لڑی میں پرو دیا۔ عرصہ دراز سے جو خون ریزی اور جنگ و فساد کی فضا بنی ہوئی تھی وہ ختم ہو گئی اور مکمل امن قائم ہو گیا۔ جاہلی معاشرہ میں خواتین اور غلاموں کی حیثیت بہت کمزور تھی، اسلام نے انھیں مستضعفین میں شمار کرتے ہوئے، ان طبقے کی حیثیت کو معاشرے میں بلند کرنے کی کوشش کی۔ دینی و سیاسی اور معاشی سطح پر اسلام نے عرب معاشرے میں جو تبدیلیاں پیدا کیں ان کے نتیجے میں عربی فکر کو جلا اور قوت حاصل ہوئی۔

قرآن نے ایک ادبی نمونہ کی حیثیت سے لوگوں کی توجہات اپنی طرف مبذول کیں۔ قرآن کا یہ نمونہ نہ تو شعر تھا اور نہ معروف معنوں

میں نثر بلکہ حقیقت میں وہ دونوں کے مابین کی صنف تھی۔ عربوں کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں سب سے اہم رول قرآن نے ادا کیا۔ دوسری سطح پر یہ رول حدیث نے نبھایا۔ آپ ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے بہت سے جملے اور ترکیبیں اعلیٰ نثر کا عمدہ نمونہ ہیں۔ صحابہ کرام میں ایسے بھی لوگ تھے جنہیں اشعار پڑھوا کر سننے سے دلچسپی تھی۔ ان میں عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن جعفر، عبداللہ بن زبیر، معاویہ بن ابی سفیان اور عمرو بن العاص وغیرہ شامل ہیں۔

عصر اسلامی کو اس لحاظ سے خصوصی اہمیت حاصل رہی کہ اس میں علم و ادب کی جو سرگرمیاں پروان چڑھیں ان میں مقصد حیات پر زور دیا گیا تھا۔ اس طرح علم و ادب کا وجود میں آنے والا یہ سرمایہ خالص مقصدیت کی اساس پر مبنی تھا۔ اس عہد کی مختلف خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ جو ادب اس عہد میں پروان چڑھا، اس میں تکلف اور تصنع کی آمیزش نہیں تھی۔ اس میں ایجاز و اختصار پر زور دیا گیا تھا۔ اس عہد میں ادب کی جن اصناف کو پروان چڑھنے کا موقع ملا ان میں شعر، خطابت، خطوط و مراسلات، عہد نامے اور میثاقات وغیرہ شامل ہیں۔ تاہم ان میں شعر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

5.7 نمونے کے امتحانی سوالات

- ۱۔ عرب معاشرے پر اسلام نے کیا اثرات مرتب کیے۔ تفصیل کے ساتھ لکھیے۔
- ۲۔ سماجی سطح پر کون سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ وضاحت کیجیے۔
- ۳۔ عصر اسلامی میں جو ادب تشکیل پایا اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے
- ۴۔ ادب کے حوالے سے عہد نبوی عہد صحابہ کی خصوصیات قلم بند کیجیے۔

5.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

- (1) الجامع فی تاریخ الأدب العربی، حنا فاخوری
- (2) تاریخ الأدب العربی (جلد دوم)، ڈاکٹر شوقی ضیف
- (3) تاریخ الأدب العربی (جلد اول)، عمر فروخ
- (4) تاریخ الأدب العربی، احمد حسن زیات
- (5) عربی ادب کی تاریخ (جلد دوم) عبدالحلیم ندوی

اکائی 6 قرآن و حدیث کی تدوین اور ان کا ادبی مقام

اکائی کے اجزا

- 6.1 مقصد
- 6.2 تمہید
- 6.3 قرآن کا مختصر تعارف
- 6.4 وجہ تسمیہ
- 6.5 وحی کی حقیقت
- 6.6 وحی کے نازل ہونے کی مختلف صورتیں
- 6.7 قرآن کریم کا نزول
 - 6.7.1 قرآن کی حفاظت و تدوین
 - 6.7.2 قرآن کی کتابت و تدوین کے تین مراحل
- 6.8 قرآن کا اعجاز اور عربی ادب پر اس کے اثرات
 - 6.8.1 قرآنی اسلوب کے عربی ادب پر اثرات
- 6.9 حدیث کی تعریف
- 6.10 حدیث کی اہمیت
- 6.11 حدیث کی تدوین
- 6.12 حدیث کا طرز بیان
- 6.13 حدیث کی ادبی قدر و قیمت
- 6.14 اکتسابی نتائج
- 6.15 فرہنگ
- 6.16 نمونے کے امتحانی سوالات
- 6.17 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

☆ اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ وحی قرآنی کی حقیقت، قرآن کے نزول اور اس کی تدوین سے واقف ہو پائیں گے۔ اس کے علاوہ انہیں قرآن کے اعجاز کی حقیقت معلوم ہوگی اور اس ضمن میں وہ قرآن کی ان خصوصیات سے بھی آگاہ ہوں گے جو اس کو دوسری کتابوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

☆ اس اکائی کے ذریعہ طلبہ کو حدیث کی ادبی قدر و قیمت سے آگاہ کرنا مقصود ہے۔ حدیث کی تشریحی حیثیت جس طرح مسلم ہے، اسی طرح حدیث کی ادبی قدر و قیمت بھی کم نہیں، کیونکہ حدیث قرآن پاک سے مستفاد ہے۔ وہ سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فصیح العرب والجم تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی بلاغت سے کوئی دوسرا کلام کر ہی نہیں سکتا ہے۔ اس اکائی سے طلبہ حدیث کے ادبی مقام اور فصاحت و بلاغت اور عربی زبان و ادب پر اس کے اثرات و احسانات سے واقف ہو سکیں گے۔

قرآن کی تدوین پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد اسلامی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ یہ صحابہ کرام خصوصاً ابو بکرؓ و عمرؓ کی بے پناہ بصیرت اور دور اندیشی کی سب سے اہم مثال ہے۔ 610ء سے شروع ہونے والے اس سلسلہ وحی قرآنی کے ذریعہ انسانی تاریخ ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ قرآن متعدد ایسی منفرد خصوصیات کا حامل ہے، جو دوسری آسمانی کتابوں کو حاصل نہیں۔ تدوین کا معاملہ بھی انہیں خصوصیات سے تعلق رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دنیا میں جو بھی صالح انقلاب پیدا کیا، وہ دراصل قرآن کا ہی فیض ہے۔ عربی زبان و ادب پر قرآن کے زبردست اثرات مرتب ہوئے اور اس نے اسلام کی اجتماعی فکر کی تشکیل میں اہم رول ادا کیا۔ قرآن پاک نے جس طرح دلوں کی دنیا میں انقلاب برپا کیا اسی طرح اس نے عربی زبان کو بھی زندہ و جاوید بنا دیا۔

قرآن پاک کے بعد حدیث کا نمبر آتا ہے۔ حدیث نے عربی زبان کے ذخیرہ ادب کو اپنی زبردست فصاحت، لازوال بلاغت، حکمت کے موتیوں اور جوامع الکلم سے ثروت مند کیا، اس میں بہت ساری تراکیب کا اضافہ کیا، نئے محاورے دیے اور نئی لفظیات سے اس کو مالا مال کیا۔ انہیں سب پہلوؤں کو تفصیل سے ہم اس اکائی میں زیر بحث لائیں گے اور مختلف ذیلی سرخیوں اور عنوانات سے طلبہ کو موضوع کے مالہ و ماعلیہ سے واقف کرائیں گے اور حدیث کی ادبی اہمیت و مقام پر مختلف حوالوں سے روشنی ڈالیں گے، تاکہ موضوع ان کی گرفت میں اچھی طرح سے آسکے۔

قرآن آخری آسمانی کتاب ہے جو آخری پیغمبر محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی طرف سے نازل کی گئی۔ اس کے نزول کا سلسلہ غار حرا سے شروع ہوا۔

مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق، قرآن کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی انسانی تحریفات اور تبدیلیوں سے پاک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود خدا نے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے (الحجر: 9) جب کہ اس سے قبل نازل ہونے والی کتابوں کا معاملہ یہ ہے کہ یا تو اب وہ سرے سے دنیا سے ناپید ہو چکی ہیں یا پھر تحریف و تبدیلی کی وجہ سے ان کی حیثیت خدا کے مکمل سرچشمہ ہدایت کی نہیں رہی۔

قرآن کے نزول سے تاریخ انسانی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ قرآن کی پہلی وحی ”پڑھنے کی تلقین“ (اقراً) سے شروع ہوئی تھی، چنانچہ قرآن کے ذریعہ دنیا میں علم و تمدن کی روشنی پھیلتی چلی گئی۔

قرآن سے مختلف علوم کی سیکڑوں شاخیں نکلیں جن پر مختلف زبانوں میں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں لکھی گئیں جو دنیا کے کتب خانوں کی زینت ہیں۔ یہ قرآن کا عملی معجزہ ہے۔ علمی معجزہ یہ ہے کہ اس نے انسانی فکر میں ایک زبردست انقلاب برپا کر دیا۔ قرآنی تعلیمات کا سب سے اہم امتیاز اس کا نظریہ توحید ہے۔ قرآن کے نزول سے قبل توحید کی اصل روح اور بنیادی حقیقت دنیا کی اکثر قوموں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ قرآن نے اپنی مؤثر تعلیمات کے ذریعہ اس حقیقت کو بے غبار شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ قرآن کی ایک دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ بار بار اور شدت کے ساتھ انسان کے اپنے وجود اور کائنات میں غور و تدبر کی لوگوں کو دعوت دیتا ہے۔

6.4 وجہ تسمیہ

قرآن کو قرآن کہنے کی وجہ کیا ہے؟ قرآن کا لفظ دراصل قَدْ اَيَقْرَأُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ’پڑھنا‘ کے ہیں۔ یہ لفظ مصدر ہے لیکن اسے اسم مفعول کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے یعنی پڑھی ہوئی یا پڑھی جانے والی کتاب۔ قرآن کی اصطلاحی تعریف یہ ہے: ”قرآن اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، مصاحف میں لکھا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغیر کسی ادنیٰ شبہ کے تواتر کے ساتھ منقول ہے۔“ قرآن کے علاوہ اس کے مختلف نام ہیں: جیسے الفرقان، الكتاب، التنزيل اور الذکر وغیرہ لیکن ان میں سب سے مشہور نام ”القرآن“ ہی ہے۔ خود قرآن میں قرآن کے نام کے طور پر سب سے زیادہ اسی لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔

6.5 وحی کی حقیقت

عقل و حواس کے بعد وحی دوسرا ذریعہ علم ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسی کے ذریعہ غیب کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اگر وحی کو بیچ سے نکال دیا جائے تو پھر غیب سے تعلق رکھنے والے امور کا علم حاصل کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اسی طرح اس کائنات کی حقیقت، اس کائنات میں انسان کی حیثیت اور اس کی تخلیق کا مقصد بھی صرف وحی کے ذریعہ ہی معلوم ہو سکتا ہے۔

وحی نبوت کی خاصیت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک خدا کی طرف سے وحی کا سلسلہ جاری رہا اور اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء پر نازل ہونے والی وحی میں فی نفسہ سرے سے کوئی فرق نہیں۔ ظاہر ہے دونوں کا ماخذ اور مقصد ایک ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

”یقیناً ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسی طرح وحی کی ہے جیسے کہ نوح اور ان کے بعد والے نبیوں کی طرف کی، اور ہم نے وحی کی ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کیا۔ ہم نے بعض رسولوں کا ذکر کیا ہے اور بعض کا نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے صاف طور پر کلام کیا۔“ (النساء: 163-164) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکمل حد تک وحی خداوندی کے پابند تھے۔ وہ محض اپنی خواہش اور مرضی سے کوئی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس بات کی وضاحت قرآن میں کی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ- إِنَّ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ”وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی مرضی سے کوئی بات نہیں کہتے۔ وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے۔“ (النجم: 4-3) اسی طرح دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

قُلْ أَنَّمَا أُنبِئُكُمْ بِمَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنَ رَبِّي ”آپ کہہ دیجئے کہ میں اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے میری طرف کی جاتی ہے۔“ (الاعراف: 7)

”وحی“ یا اس سے مشتق لفظ ”ایحیاء“ کے معنی عربی میں اشارہ کرنے کے ہیں۔ قرآن میں اس معنی میں اس لفظ کا استعمال اس آیت میں کیا گیا ہے:

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَعَشِيًّا ”پس وہ اپنی قوم کے سامنے محراب سے نکلے اور انہیں اشارہ کیا کہ صبح و شام تسبیح کرتے رہا کرو“ (مریم: 11)۔ اس طرح وحی کا ایک توسیعی معنی ”کسی کے دل میں کوئی بات ڈال دینا“ بھی ہے۔ قرآن میں متعدد جگہوں پر وحی کا استعمال اس معنی میں کیا گیا ہے۔ جیسے شہد کی مکھی کے تعلق سے قرآن میں کہا گیا:

وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنْ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا ”اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تو پہاڑوں میں گھر بنالے۔“ (النحل: 68)

وَإِذْ نَادَىٰ إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ ”ہم نے موسیٰ کی والدہ کو یہ الہام کیا (ان کے دل میں یہ بات ڈال دی) کہ موسیٰ کو دودھ پلاؤ“ (القصص: 7)۔ شیطان انسان کے دلوں میں جو وسوسہ ڈالتا ہے، اس کے لیے بھی قرآن میں اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے: وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحَىٰ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ ”اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے ایک نہ ایک دشمن کو ضرور پیدا کیا ہے، جن و انس کے شیاطین میں سے؛ جو ایک دوسرے کے دل میں وسوسہ ڈالتے ہیں“ (الانعام: 112)۔

یہ معانی اور مثالیں وحی کے لغوی مفہوم سے تعلق رکھتی ہیں، جہاں تک اس کے اصطلاحی معنی کا معاملہ ہے۔ تو اس کے معنی ہیں: ”اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو اس کے کسی نبی پر اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا ہو“۔ مسلمانوں کے اجماعی عقیدہ کے مطابق وحی کا سلسلہ قیامت تک کے لیے بند ہو چکا ہے۔ اس لیے اس تعلق سے کسی شخص کی طرف سے کوئی بھی دعویٰ مسلمانوں کے بنیادی عقیدہ سے متصادم اور اس اعتبار سے باطل ہے۔ اس طرح یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ وحی اور کشف و الہام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کشف و الہام کوئی یقینی ذریعہ علم نہیں ہے، نہ ہی اس کا انکار و تسلیم عقیدہ کا جز ہے، جب کہ وحی کا انکار ایمان کے منافی ہے۔ اس کا منکر ایمان سے نکل جاتا ہے۔

6.6 وحی کے نازل ہونے کی مختلف صورتیں

پیغمبر خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف طریقوں سے وحی نازل کی جاتی تھی۔ اس کا ذکر خود حدیث میں آیا ہے۔ ایک صحابی کے اس سوال کے جواب میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”بعض اوقات نزول وحی کے وقت مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ میرے لیے بہت سخت ہوتی ہے۔ جب یہ کیفیت دور ہو جاتی ہے تو جو کچھ مجھے بتایا گیا ہوتا ہے وہ مجھے یاد ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات فرشتہ انسانی صورت میں آکر بات چیت کرتا ہے اور اس کو سن

کر میں یاد کر لیتا ہوں۔“ (صحیح بخاری، باب بدء الوحی، عن حارث بن ہشام)۔ اس حدیث سے نزول وحی کے دو طریقوں کا علم ہوتا ہے۔ تاہم دوسری روایات اور صحابہ کرام کے اقوال کے مطابق، آپ ﷺ پر مختلف طریقوں سے وحی کا نزول ہوتا تھا جن کا ذکر درج ذیل سطور میں کیا جا رہا ہے:

6.6.1 صلصلة الجرس

صلصلة گھنٹی بجنے اور جرس گھنٹی کو کہتے ہیں۔ آپ ﷺ پر گھنٹیوں کی آواز کی شکل میں وحی آتی تھی۔ وحی کی یہ شکل آپ ﷺ کے ارشاد کے مطابق آپ ﷺ کے لیے بہت مشکل ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ سخت سردی کے موسم میں بھی آپ ﷺ کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ اگر آپ ﷺ کسی اونٹنی پر بیٹھے ہوئے ہوتے تو وہ آپ ﷺ کے بوجھ سے دبنے لگتی۔ بعض اوقات اس وحی کی ہلکی آواز دوسروں کو بھی سنائی دیتی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے بقول یہ آواز شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے مشابہ ہوتی تھی۔

6.6.2 فرشتے کا انسانی شکل میں آنا

وحی کی دوسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ (جبریلؑ) انسان کی شکل میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر خدا کا پیغام آپ ﷺ کو پہنچا دیتا تھا۔ آپ ﷺ کے ارشاد کے مطابق وحی کی یہ صورت آپ ﷺ کے لیے نہایت آسان ہوتی تھی۔

6.2.3 فرشتے کا اپنی اصل شکل میں آنا

وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبریلؑ اپنی اصل شکل میں آپ ﷺ کو دکھائی دیتے تھے اور آپ ﷺ کے پاس خدا کا پیغام پہنچاتے تھے۔ لیکن ایسا صرف دو یا تین مرتبہ ہی پیش آیا۔

6.2.4 ہم کلامی

انبیائے کرام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا جو شرف حاصل ہوا اس کا تذکرہ قرآن میں بھی وارد ہوا ہے۔ ”اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے گفتگو کی“ (النساء: 164) لیکن یہ حضرت موسیٰ کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے۔ یہ شرف آپ ﷺ کو بھی معراج کے موقع پر بیداری میں اور ایک مرتبہ خواب میں حاصل ہوا ہے۔

6.6.5 سچے خواب

وحی کی ایک صورت سچے خوابوں کی ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ: ”ابتدا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند میں وحی کے طور پر سچے خواب آیا کرتے تھے۔ اس وقت آپ ﷺ کے تمام خواب صبح کی روشنی کی طرح سچے نکلتے تھے“ (متفق علیہ)۔

6.6.6 القائے قلب

ایک صورت وحی کی یہ تھی کہ فرشتہ آپ ﷺ کے سامنے آئے بغیر آپ ﷺ کے قلب میں خدا کے پیغام کو القا کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ کوئی شخص اس وقت تک دنیا سے جان نہیں سکتا جب تک کہ وہ اپنا رزق مکمل نہ کر لے“۔

بعض اہل علم نے بعض اور دوسری صورتوں کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن وہ عموماً انھی صورتوں کے ضمن میں آجاتی ہیں۔

6.6.7 وحی کی قسمیں

یہاں یہ سمجھ لینا بھی بہتر ہے کہ وحی کی علما نے دو قسمیں کی ہیں: ”وحی متلو“ اور ”وحی غیر متلو“۔

وحی متلو: یعنی تلاوت کی جانے والی وحی اور یہ قرآن ہے۔ جس کے الفاظ و معانی دونوں خدا کی طرف سے ہیں اور ان میں ذرہ برابر بھی کوئی کمی بیشی نہ ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے کہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔

وحی غیر متلو: یعنی وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی یا وہ قرآن کا جز نہیں۔ یہ صحیح و متواتر احادیث ہیں۔ اس وحی کا مفہوم تو خدا کی طرف سے ہے لیکن الفاظ خود آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یا حضرت جبریلؑ کے ہیں۔ البتہ حدیث قدسی سے متعلق علما کی ایک بڑی جماعت کا خیال ہے کہ اس کے الفاظ بھی اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بعینہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ ہوں اور وہ مکمل طور پر محفوظ بھی ہوں۔ نیز اپنی حیثیت اور معنی و مفہوم میں وہ کسی بھی طرح قرآن کے برابر نہیں ہیں۔

6.7 قرآن کریم کا نزول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کا نزول 23 رسالوں میں مکمل ہوا۔ اس پوری مدت میں قرآن تدریجی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔ یہ مدت مکہ میں ہجرت سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کے 13 سال اور ہجرت کے بعد مدینہ میں قیام کے 10 رسالوں پر مشتمل ہے۔ قرآن کی بہت سی آیات اور سورتیں اپنے نزول میں واقعاتی پس منظر رکھتی ہیں یعنی عموماً ایسے واقعات و حادثات پیش آتے رہے، جن میں خدا کی طرف سے رہنمائی کے لیے قرآن کی چھوٹی بڑی، مکمل یا غیر مکمل شکل میں آیتیں اور سورتیں نازل ہوتی رہیں۔

قرآن کے یکبارگی کے بجائے تدریجی طور پر نازل ہونے کی علما نے مختلف مصلحتیں اور حکمتیں بیان کی ہیں۔ ایک کا ذکر تو خود قرآن میں بھی آیا ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کی تقویت کا ذریعہ ہے (الفرقان: 23)۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے تبلیغی مشن میں مختلف سطحوں پر جو مصائب و مشکلات درپیش تھیں، حضرت جبریلؑ کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خدا کی طرف سے پیغام لے کر آنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کی تقویت اور اطمینان کا باعث بنتا تھا۔ دوسری حکمت یہ تھی کہ اگر پورا قرآن ایک مرتبہ نازل ہو جاتا تو شریعت کے سارے احکامات کی پابندی بیک وقت ضروری ہو جاتی اور یہ بات انسانی طبیعت کے لحاظ سے قرین مصلحت نہیں تھی۔ سب سے اہم یہ کہ قرآن کا ایک بہت بڑا حصہ، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، واقعات و حوادث سے مربوط تھا، اس لیے متعلقہ واقعات کے پیش آنے سے قبل ان کا نزول کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔

قرآن کے نزول کا آغاز شب قدر سے ہوا اور پہلے پہل غار حرا میں سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔ یہاں نزول کے ایک دوسرے پہلو کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ”میں نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے“۔ (القدر: 1) اس کا مطلب حدیث کی روشنی میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اولاً قرآن مکمل طور پر لوح محفوظ سے آسمان دنیا کے ایک مقام ”بیت العزت“ پر نازل کیا گیا پھر وہاں سے حسب موقع و واقعہ جستہ جستہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔

اس وقت قرآن مصحف میں جس ترتیب سے موجود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس ترتیب سے نازل نہیں ہوا تھا۔ البتہ یہ ترتیب آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ہی قائم کی گئی۔ جب بھی کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تب وحی کو یہ بتاتے کہ اسے کس سورت میں اور کس مقام پر لکھا جائے گا؟ بظاہر یہ اجتہاد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں تھا بلکہ غالباً متعلقہ آیات کی تعلیم کے ساتھ قرآن میں ان کی متعلقہ جگہ کی نشان دہی بھی حضرت جبریلؑ فرمایا کرتے تھے۔

معلومات کی جانچ

1- قرآن کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

2- وحی کے لغوی و اصطلاحی معنی کیا ہیں؟

3- پیغمبر اسلام پر وحی کے نزول کی عمومی صورتیں کیا تھیں؟

4- تدریج کے ساتھ قرآن کے نزول کی حکمتیں کیا ہیں؟

5- وحی متلو کسے کہتے ہیں؟

6.7.1 قرآن کی حفاظت و تدوین

قرآن کی جمع و تدوین کا کام عہد رسالت میں شروع ہو چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا خصوصی طور پر اہتمام فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دو طریقے اختیار فرمائے۔ جمع صدور یعنی قرآن کو یاد کر کے سینے میں محفوظ کرنے کا ذریعہ اور جمع مکتوب یعنی تحریر و کتابت کے ذریعہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو آیتیں نازل ہوتیں انہیں وہ پہلے خود یاد کر لیتے پھر کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر انہیں فوراً لکھوا دیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں آپ کا زیادہ زور حافظے پر تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تعلق سے اس قدر فکر و اضطراب ہوتا کہ جب حضرت جبریلؑ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر نازل ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اشتیاق و اضطراب میں اسے تیزی سے دہرانے لگتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ وحی قرآن کو جلد از جلد یاد کر لینے کی تڑپ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم زبان کو زیادہ تیزی کے ساتھ حرکت دینے کی کوشش نہ کریں۔ اس کو جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمے ہے۔ (القیامۃ: 17-61)

وحی قرآنی کی کتابت کروانے کے بعد وہ آیات صحابہ کرامؓ کے درمیان پھیل جاتیں۔ وہ انہیں یاد کرتے اور بہت سے صحابہ کرامؓ ان کی نقلیں بھی تیار کر کے اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ چونکہ قرآن کا حفظ نسبتاً تمام افراد صحابہ کے لیے زیادہ آسان بھی تھا اور ایک حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے اہتمام کا اشارہ بھی ملا تھا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو حفظ قرآن کی ترغیب دی۔ مزید برآں تعلیم قرآن کے تعلق سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس بات کا حکم دیا کہ وہ کسی مستند استاد سے ہی قرآن کو پڑھیں۔ ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مستند استاد کون ہو سکتا تھا، اس لیے لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پڑھنے اور سیکھنے کا التزام کیا۔ جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ بڑھ گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فہم و قرأت کے ماہر بعض صحابہ کرامؓ کو بھی اس پر مامور کیا کہ وہ لوگوں کو قرآن پڑھایا کریں۔ قرآن پڑھانے والے صحابہ کرامؓ میں حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، ابوالدرداءؓ، اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ خاص طور پر حضرت ابی بن کعبؓ سے صحابہ کی کثیر تعداد نے قرآن پڑھا۔ قرآن پڑھنا اور قرآن سمجھنا صحابہ کا سب

سے اہم معمول اور مشغلہ بن گیا۔ مسجد نبوی قرآن کی تلاوت سے گونجنے لگی۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کو لوگوں کو یہ حکم دینا پڑا کہ وہ آہستگی کے ساتھ قرآن پڑھا کریں تاکہ دوسروں کو ان کے پڑھنے سے خلل نہ ہو۔ قرآن کے ساتھ اس انتہائی شغف کے نتیجے میں صحابہؓ کے درمیان حفاظ کی بہت بڑی تعداد پیدا ہوئی۔ یہ تعداد بلاشبہ سینکڑوں میں تھی۔ کیونکہ جیسا کہ روایات سے اندازہ ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قبیلہ میں تعلیم قرآن کے لیے ستر (70) حفاظ بھیجے تھے۔ چنانچہ واقعہ بڑے معونہ میں شہید ہونے والے صحابہ کی تعداد ستر (70) تھی۔ تقریباً اتنی ہی تعداد جنگ یمامہ کے موقع پر شہید ہونے والے صحابہ کی ہے۔ حفاظ صحابہ کے علاوہ بہت بڑی تعداد ان اصحابؓ کی ہے جنہوں نے قرآن کے مختلف اجزا اور سورتوں کو یاد کر رکھا تھا۔

قرآن کے تعلق سے یہ اہتمام و انتظام قرآنی تعلیمات کی امت میں اشاعت کے علاوہ، قرآن کی حفاظت کی ہی ایک مضبوط شکل تھی۔

6.7.2 قرآن کی کتابت و تدوین کے تین مراحل

6.7.2.1 پہلا مرحلہ: عہد نبوی

سینوں کے ساتھ سفینوں کے ذریعے قرآن کی حفاظت اور اس کی تدوین کا کام بھی عہد نبوی میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم متعدد صحابہ کرامؓ سے قرآن کی کتابت کا کام لیا کرتے تھے۔ کاتبین وحی میں خاص طور پر چاروں خلفائے راشدین: ابوبکرؓ، عمر فاروقؓ، عثمانؓ اور علیؓ کے علاوہ زید بن ثابتؓ، معاویہ بن ابی سفیانؓ، ابی بن کعبؓ، خالد بن ولیدؓ اور ثابت بن قیسؓ شامل ہیں۔ کتابت وحی کے تعلق سے آپ کا طریقہ یہ تھا کہ کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر اسے پہلے لکھواتے، پھر اس کی صحت کے اطمینان کے لیے متعلقہ صحابی سے پڑھوا کر سنتے تھے اور ضرورت پڑنے پر اس کی اصلاح فرمادیتے تھے۔ اس کا اندازہ حضرت زید بن ثابتؓ کی اس روایت سے ہوتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ: ”(وحی نازل ہونے کے بعد) میں مونڈھے کی کوئی ہڈی یا کسی اور چیز کا کوئی ٹکڑا آپ ﷺ کے پاس لے آتا۔ آپ ﷺ لکھواتے اور میں لکھتا۔ پھر جب میں لکھ کر فارغ ہوتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ جیسے قرآن نقل کرنے کے بوجھ سے میری ٹانگ ٹوٹی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ میں کہتا کہ اب میں کبھی اپنی ان ٹانگوں سے نہیں چل سکوں گا پھر جب میں لکھ کر فارغ ہو جاتا تو آپ ﷺ اس لکھے ہوئے حصے کو پڑھنے کو کہتے۔ اگر اس میں کوئی چیز چھوٹ گئی ہوتی تو آپ اس کی تصحیح فرمادیتے۔ پھر اسے لوگوں کے درمیان لے آتے“ (طبرانی)۔ اس وقت قرآن زیادہ تر کھجور کی شانوں، جانوروں کی ہڈیوں، چمڑے کے ٹکڑوں، پتھر کی سلوں اور درخت کے پتوں پر لکھا جاتا تھا۔

یہ بات صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باضابطہ مصحف کی شکل میں اپنے عہد میں قرآن کو یکجا اور مرتب نہیں کرایا، تاہم یہ بات بھی صحیح ہے کہ متعدد صحابہ کرامؓ کے پاس قرآن کے اہم حصے نبوی ترتیب کے ساتھ محفوظ تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے بھی ہوتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں ایسا ہی کچھ حصہ حضرت عمر فاروق کی بہن اور بہنوئی کے پاس تھا جسے وہ اس وقت پڑھ رہے تھے، جب وہ ان کے اسلام لانے کی خبر سن کر ان کے پاس پہنچے تھے۔ بخاری میں رسول اللہ کی ایک حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ قرآن کو لے کر دشمن کی زمین میں سفر کیا جائے۔ ظاہر ہے جب تک قرآن کا معتدبہ اور قابل ذکر حصہ مرتب شکل میں موجود نہ ہو اس پر قرآن کا اطلاق کیوں کر کیا جاسکتا ہے؟

مختلف روایات واضح طور پر اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ متعدد صحابہ کرامؓ کے پاس مکمل یا نامکمل نسخے لکھے ہوئے موجود تھے۔

6.7.2.2 دوسرا مرحلہ: عہد ابوبکرؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت قرآن سینکڑوں صحابہ کرام کے سینوں میں نیز ان کے پاس تحریری شکل میں محفوظ ہو چکا تھا۔ وہ ان کی تلاوت کرتے اور دوسروں کو ان کی تعلیم دیتے تھے۔ بعض اصحاب کے پاس باضابطہ قرآنی سورتوں کے مجموعے بھی موجود تھے لیکن یہ مجموعے مکمل نہیں تھے۔ بعضوں کے پاس کچھ سورتیں تھیں اور دوسرے کے پاس دوسری سورتیں جب کہ بعض اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف چند آیات ہی لکھی ہوئی تھیں۔ اب تک قرآن کو یکجا اور مکمل شکل میں جمع کرنے کا اہتمام نہیں ہو سکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں قرآن کو مدون کرنے کی غالباً اس لیے بھی کوشش نہیں کی کہ وحی قرآنی کا نزول جاری تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کس آیت یا سورت کو قرآن میں کس مقام پر رکھنا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا حضرت جبریلؑ کی ہدایت پر کرتے تھے۔

قرآن کے منتشر اجزا کو یکجا اور ایک مرتب نسخے کی شکل میں محفوظ کر دینے کا کام حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں یہ المناک واقعہ پیش آیا کہ نبوت کے مدعی مسیلمہ کذاب اور اس کی جماعت کے ساتھ جنگ میں جسے اسلامی تاریخ میں جنگ یمامہ کے نام سے جانا جاتا ہے؛ قرآن کے حفاظ کی ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی۔ بعض لوگوں نے ان شہید ہونے والے اصحاب کی تعداد ستر (70) لکھی ہے۔ اس واقعے سے حضرت عمرؓ کے دل میں یہ تشویش پیدا ہوئی کہ اگر اسی طرح حفاظ قرآن کی شہادت یا موت ہوتی رہی تو اسباب کی سطح پر قرآن کے ضائع ہونے کا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے قرآن کے تحفظ کو یقینی بنانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس فکر و اندیشے سے حضرت ابوبکرؓ کو آگاہ کیا، حضرت ابوبکرؓ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ انھوں نے حضرت عمرؓ کو جواب دیا کہ جو کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا ہے، وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس کام میں خیر ہی خیر ہے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کو اس پر شرح صدر ہو گیا اور انھوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کو جو کاتبین وحی میں سے تھے اور قرآن سے ان کا شغف ظاہر و باہر تھا؛ بلا یا اور ان سے کہا کہ وہ اپنی نگرانی میں یہ کام شروع کریں۔ خود حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت کے مطابق، انھوں نے بھی اپنا وہی اشکال دہرایا جو حضرت عمرؓ کے مشورے پر حضرت ابوبکرؓ نے کیا تھا کہ جس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دینے کی کوشش نہیں کی اس میں ہم اپنا ہاتھ کیوں ڈالیں۔ فرماتے ہیں کہ: ”خدا کی قسم اگر ابوبکرؓ مجھے کسی پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹانے کا حکم دیتے تو وہ میرے لیے اس ذمہ داری کی انجام دہی قرآن کی تدوین کی بہ نسبت زیادہ آسان ہوتی تاہم حضرت ابوبکرؓ مجھ سے بتا کید یہ بات کہتے رہے۔ یہاں تک کہ ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح اس کام کے تئیں اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی شرح صدر عطا کر دیا۔ چنانچہ میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کیا اور کھجور کی شانوں، پتھر کی سلوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کو جمع کیا“۔ (صحیح بخاری۔ کتاب فضائل القرآن)

6.7.2.3 عہد صدیقی میں جمع قرآن کا طریقہ کار

حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ میں یہ منادی کرا دی کہ جس کے پاس قرآن کا جو بھی حصہ تحریری صورت میں موجود ہو، وہ زیدؓ کے پاس لا کر جمع کر دے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بعض دوسرے حضرات کے علاوہ حضرت عمرؓ کو حضرت زیدؓ کی اس کام میں معاونت پر مامور کیا تھا۔ چنانچہ

جب کوئی شخص ان کے پاس قرآن کا کوئی حصہ لے کر حاضر ہوتا تو مختلف طریقوں سے اس کی تصدیق کی جاتی تھی:

☆ حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں حافظ تھے۔ وہ اپنے حافظے سے اس کی تصدیق کرتے تھے۔

☆ اس کے بعد قرآن کے اس تحریر شدہ حصے پر دو مستند اور قابل اعتبار لوگوں کی یہ گواہی لی جاتی تھی کہ قرآن کا یہ حصہ تحریر کیے جانے کے بعد آپ ﷺ کی وفات کے سال آپ ﷺ کے سامنے آپ ﷺ کی تصدیق کے لیے پیش بھی کیا گیا تھا۔

☆ زیر ترتیب مجموعہ قرآنی میں کسی آیت یا سورت کو شامل کرنے کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ کسی دوسرے مکتوب نسخے سے اس کا موازنہ بھی کر لیا جائے۔ گویا متعلقہ آیت یا سورت کم از کم دو جگہ تحریر شدہ شکل میں موجود ہو۔

تقریباً ایک سال کی مدت میں قرآن کی جمع و تدوین کا کام مکمل ہوا اور قرآن کا ایک مرتب و مدون نسخہ وجود میں آ گیا۔ اس نسخے کو ”ام“ کہا جاتا ہے۔ یہ نسخہ حضرت ابوبکر کے پاس رہا۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت عمرؓ کی تحویل میں آ گیا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد یہ صحیفہ قرآنی ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس منتقل کر دیا گیا۔ حضرت عثمانؓ کی تحویل میں یہ اس لیے نہیں دیا گیا کہ حضرت عمرؓ کے انتقال کے وقت ابھی خلیفہ کے طور پر ان کا انتخاب نہیں ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان کی خلافت و جانشینی کا معاملہ شوریٰ کے سپرد کر دیا تھا۔

6.7.2.4 تیسرا مرحلہ: عہد عثمان غنیؓ

حضرت عثمانؓ کے وقت تک اسلام حدود عرب سے نکل کر روم و ایران کے ایک بڑے حصے میں پھیل چکا تھا۔ اہل عجم کی ایک بڑی تعداد مسلمان ہو چکی تھی جن کی زبان عربی نہیں تھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد یہ لوگ قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ خاص طور پر ان کے درمیان قرآن کی قرأت میں اختلافات سر ابھارنے لگے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ رسول اللہ کی حدیث کے مطابق، قرآن عرب کے سات حرفوں پر نازل ہوا تھا۔ چنانچہ لوگ مختلف طرح سے قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ جب تک لوگوں کو قرآن کے سات حروف پر نازل ہونے کی حقیقت معلوم رہی، اس وقت اس اختلاف نے سر نہیں اٹھایا لیکن پھر مختلف انداز کی قرأتوں کی بنیاد پر ان کے درمیان شدید ترین اختلافات پیدا ہو گئے۔ حضرت انس بن مالکؓ کی روایت کے مطابق، حدیفہ بن یمانؓ نے آرمینیا اور آذربائیجان کی جنگ میں شرکت کی تھی۔ اس موقع پر قرأت قرآن کے معاملے میں لوگوں کے باہمی لڑائی جھگڑوں کو دیکھ کر انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں قرآن کی متواتر قرأتیں ہی لوگوں کے اختلاف اور جھگڑوں کا شکار ہو کر لوگوں کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں یا انہیں ہی غلط نہ قرار دینے لگیں۔ اس وجہ سے حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابتؓ، عبد اللہ بن زبیرؓ، سعید بن العاصؓ اور عبد الرحمن بن حارث بن ہشامؓ کو اس بات پر مامور کیا کہ وہ قرآن کو صحیفوں سے باضابطہ ایک کتاب کی شکل میں مرتب کریں۔ اس اہتمام کے ساتھ کہ اس میں سورتیں بھی مرتب شکل میں ہوں۔ ان چاروں صحابہ میں سے حضرت زید کے علاوہ باقی تینوں قریشی تھے۔ حضرت عثمان نے ان حضرات سے فرمایا کہ اگر ان کے درمیان قرآن کی کسی آیت کو تحریر کرنے میں اختلاف ہو تو اسے قریش کی زبان میں لکھا جائے کیوں کہ قرآن بنیادی طور پر انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کا تیار کردہ اصل نسخہ دوبارہ حضرت کے حفصہ کے پاس بھجوا دیا گیا۔

ان چار (بعض روایت کے مطابق بارہ) افراد پر مشتمل کمیٹی نے قرآن کا جو نسخہ تحریری شکل میں مرتب کیا اس کی خصوصیات یہ تھیں:

حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو نسخہ تیار کیا گیا تھا اس میں سورتیں مرتب نہیں تھیں۔ ہر سورت الگ الگ صحیفوں کی شکل میں لکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ تمام صحیفوں کو ایک ہی مصحف میں مرتب شکل میں لکھا گیا۔ لکھنے میں ایسے رسم الخط کا استعمال کیا گیا کہ اس میں تمام متواتر قراءتیں جمع ہو جائیں۔ چنانچہ اس پر نقطے اور اعراب تک نہیں لگائے گئے۔ نیز یہ کہ اس کے پانچ یا سات نسخے تیار کرائے گئے۔ ان میں سے ایک کو مدینہ منورہ میں اور باقی نسخوں کو مکہ مکرمہ، شام، یمن اور کوفہ وغیرہ علاقوں میں بھیج دیا گیا اور مختلف لوگوں کے پاس قرآن کے جو مختلف نسخے اب تک موجود تھے، انہیں نذر آتش کر دیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے کسی مصحف قرآنی کی بنیاد پر اب دوبارہ کسی قسم کے اختلاف اور جھگڑے کو سربھارنے کا موقع نہ ملے اور پوری امت ایک نسخہ قرآنی کی قرأت و تلاوت پر متفق ہو جائے۔ تمام وہ صحابہ کرام جن کے پاس انفرادی نسخے تھے وہ بخوشی اس پر آمادہ ہو گئے۔ البتہ حضرت عبداللہ ابن مسعود کو اس میں کچھ تردد اور تکدر ہوا۔ تاہم بعد میں وہ بھی حضرت عثمانؓ کی رائے سے متفق ہو گئے، جو دراصل امت کی اجماعی رائے تھی۔

6.7.2.5 چوتھا مرحلہ: قرآن پر نقطے اور اعراب

حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عثمانؓ نے قرآن کا جو نسخہ تیار کروایا اس میں قرآن کے الفاظ و حروف پر نقطے اور حرکات (زیر، زبر، پیش وغیرہ) نہیں لگائے گئے تھے۔ عربوں میں اب تک نقطے اور حرکات کے بغیر ہی تحریر کا رواج تھا۔ اہل زبان ہونے کی بنیاد پر لوگ اس سے اس قدر مانوس تھے کہ عموماً اس میں انہیں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ لیکن اہل عجم کے لیے یہ صورت حال پریشاں کن تھی۔ اس لیے تلاوت کو آسان اور غلطیوں سے پاک کرنے کے لیے الفاظ قرآنی پر نقطے اور حرکات لگانے کی ضرورت پیش آئی اور وقت کے علما و اہل نظر نے اس سے اتفاق بھی کر لیا۔

اس تعلق سے کوئی ایک رائے نہیں ہے کہ یہ اہم خدمت کس اہل علم کے ذریعہ انجام پائی؟ زیادہ شہرت ابوالاسود دؤلی کو حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حضرت علیؓ کی ایما پر یہ کارنامہ انجام دیا۔ بعض اصحاب علم کے مطابق، یہ کام حجاج بن یوسف ثقفی کی فرمائش پر حسن بصریؓ، یحییٰ بن یعمر اور نصر بن عاصم لیشی نے انجام دیا۔ کہا جاتا ہے کہ نقطے کی باضابطہ ایجاد کا سہرا خلیل بن احمد فراہیدی (175ھ) کے سر ہے۔

اس کے بعد قرآن کی تلاوت، حفظ اور تعلیم و تفہیم کے عمل کو آسان تر کرنے کے لیے مزید اقدامات بھی کیے گئے۔ جیسے ہر سورت کے شروع میں اس کا عنوان تحریر کرنا، آیت کے اخیر میں اختتامی علامت، قرآن کو اجزائے یعنی پاروں میں تقسیم کرنا اور پارے کو نصف اور ربع میں تقسیم کرنا، رکوع لگانا، اسی طرح احزاب اور منزلوں کا تعین۔ بعض صحابہ و تابعین کو ان چیزوں میں تامل رہا لیکن اکثریت کے اتفاق رائے اور احساس ضرورت کے تحت یہ کام انجام دیا گیا۔ مثلاً قرآن کو سات منزلوں یا تیس پاروں میں تقسیم کرنا بعض علما کے قول کے مطابق، مدارس میں طلبہ کی تعلیم کی سہولت کے لیے تھا۔

آگے چل کر بعض علما نے رموز اوقاف کی تشکیل و تعیین کی جن سے تلاوت و تجوید کا عمل مزید آسان ہو گیا۔ پریس کی ایجاد کے بعد سب سے پہلے بعض عیسائیوں اور مستشرقین کی طرف سے قرآن کی اشاعت عمل میں آئی لیکن ان کے نسخوں کو عالم اسلام میں قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ پھر 1787ء میں مولائے عثمان نے روس کے شہر ”سینٹ پیٹرس برگ“ میں قرآن کا ایک نسخہ طبع کروایا پھر قازان اور تہران وغیرہ مقامات

پر قرآن کے نسخے طبع ہوئے اور اس طرح عالم اسلام میں قرآن کی طباعت و اشاعت کی تحریک عام ہوتی چلی گئی۔

6.8 قرآن کا اعجاز اور عربی ادب پر اس کے اثرات

قرآن اپنے اندر اعجاز کے متعدد پہلو رکھتا ہے۔ ان میں بعض کا تعلق زبان و بیان سے تو بعض دوسرے پہلوؤں کا تعلق اس کے معانی و افکار سے ہے۔ یہاں ان سطور میں اس کے اعجاز کی پہلی قسم مراد ہے۔ قرآن نے منکرین کو چیلنج کیا کہ وہ اس کے جیسی ایک سورت ہی پیش کر دیں (البقرہ: 23) اور اس کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ تمام جن و انس مل کر بھی وہ اس عمل پر قادر نہیں ہو سکتے (الاسراء: 88)۔ قرآن کے اس دعوے میں دونوں پہلو شامل ہیں کہ نہ تو الفاظ و اسلوب کے لحاظ سے اس جیسا بلیغ و مؤثر کلام کسی سے ممکن ہے اور نہ ہی افکار و معانی کے وہ جواہر جو قرآن اپنے اندر رکھتا ہے، اس کی نظیر پیش کی جاسکتی ہے۔

اس کا لغوی اعجاز دراصل اس کی بلاغت ہے۔ نزول قرآن سے قبل عرب نظم و نثر دونوں سے واقف تھے۔ البتہ نثر کا نمونہ بہت محدود تھا، کیوں کہ عربوں میں لکھنے کی روایت بہت کم تھی۔ تاہم ادبی روایت کا بڑا سرمایہ محفوظ تھا، جس پر اہل عرب کو فخر و ناز تھا۔ وہ اشعار، خطبات کے اقتباسات اور فقروں، امثال و محاورات کو بلاغت کا اعلیٰ نمونہ تصور کرتے تھے۔ قرآن نے جس اسلوب کو اختیار کیا وہ نہ تو شعر ہے اور نہ ہی خالص اور مجرد نثر، بلکہ وہ ان دونوں کے مابین ہے۔ اس میں بکثرت قافیہ کا حسن ہے، لیکن شعری اوزان اور پیمانوں سے خالی۔ اس میں نثری عبارتیں ہیں: طویل بھی، مختصر اور درمیانہ نوعیت کی بھی، لیکن یہ نثر سپاٹ نہیں ہے۔

قرآن کے لغوی و ادبی اعجاز کے دوسرے پہلو یہ ہیں:

ایجاز و اختصار

قرآن مختصر جملوں میں طویل عبارتوں کو سمودیتا ہے جیسے:

فَأَسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ (ہود: 112)

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَاۤوَلِي الْأَلْبٰبِ (البقرہ: 179)،

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ۔ (الاعراف: 199)

امثال و حکم

قرآن بلیغ محاوروں، ضرب الامثال اور حکمت آفریں جملوں اور فقروں سے معمور ہے۔ ان سے کلام میں حسن بھی پیدا ہوتا ہے اور وہ ذہن و فکر پر گہرا اثر بھی ڈالتے ہیں۔ جیسے یہ جملے اور فقرے:

كُلُّ اٰمْرِ بِئِیْ مَا كَسَبَ رَهِیْنٌ (الطور: 21)

لِكُلِّ نَبِیٍّ مِّنْ مَّسْتَقَرٍّ (الانعام: 67)

تَحْسَبُهُمْ جَمِیْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتٰی (الحشر: 14)

مَنْ یَعْمَلْ سُوْءًا یَّجْزِ بِهٖ۔ (النساء: 123)

قرآن میں کنایوں، استعاروں اور مجازات و تشبیہات وغیرہ کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔ جن سے کلام کا حسن و اثر دو بالا ہو گیا ہے۔

نظم

قرآن کے اسلوب کا ایک کمال اس کا نظم ہے۔ نظم کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مضامین میں باہم ایک خوب صورت ربط پایا جاتا ہے حالانکہ عموماً قرآن کی ایک سورت کی مجموعی آیات مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر نازل ہوئی ہیں۔ یہ قرآن کا لفظی اور معنوی دونوں اعجاز ہے۔

6.8.1 قرآنی اسلوب کے عربی ادب پر اثرات

عربی زبان و ادب پر قرآن کے غیر معمولی اثرات مرتب ہوئے۔ حقیقتاً یہ اصلاً قرآن کریم ہی ہے جس نے اس زبان کو وہ پائیداری، حسن اور استحکام عطا کیا اور اس کو دیگر ایسی خصوصیات سے نوازا کہ وہ دنیا کی چند قدیم ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک تصور کی جاتی ہے۔ وہ ایسی منفرد خصوصیات کی حامل ہے، جن کا تصور دوسری زبانوں کے تعلق سے نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے ڈیڑھ ہزار سالوں کے درمیان اس زبان کی ساخت، اس کی ترکیب، اس کی قواعدی خصوصیات اور اصول اپنی جگہ برقرار ہیں۔ دوسری زبانوں کا معاملہ یہ ہے کہ صرف چند صدیوں کے بعد ان کے الفاظ اور ان کی قواعدی ساخت اتنی بدل جاتی ہیں کہ ان میں لکھی تحریروں کو پڑھنا اور سمجھنا عام لوگوں کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ لیکن عربی زبان اس معاملے میں منفرد ہے کہ اس کی ڈیڑھ ہزار سال قبل کی زبان و اسلوب اور آج کے اسلوب میں کوئی بڑا اور بنیادی فرق نظر نہیں آتا۔

قرآن جس وقت نازل ہوا، عربی زبان عرب قبائل کے متعدد لہجات کے زیر اثر پراگندگی کا شکار تھی۔ قرآن کے ذریعے اس پراگندگی اور انتشار کی کیفیت ختم ہوئی۔ اس طرح پورا عالم عرب ایک لسانی سانچے میں ڈھل گیا۔ قرآن کا ہی فیض ہے کہ اس زبان کے جو ہزاروں الفاظ اور محاورے جنگوں، پہاڑوں اور بیابانوں میں بدو قبائل کے خیموں تک محدود تھے، قرآن کی آیات کی تفہیم کے لیے مسلم لغت نگاروں اور ماہر لسانیات کی انتھک کوششوں سے عربی زبان و ادب میں آئے اور ہمیشہ کے لیے عربی ادب کا حصہ بن گئے۔

قرآن نے نئی اصطلاحات وضع کیں۔ پرانے الفاظ کو نئے معانی دیے یا دارہ معنی کو وسعت دی جیسے: صلاة، زکاۃ، کافر، مسلم، مومن، رکوع، سجود وغیرہ۔ دوسری زبانوں کے بہت سے الفاظ ہیں جو قرآن میں جگہ پا کر عربی ادب عالیہ کا حصہ بن گئے۔

معلومات کی جانچ

۱۔ قرآن کی جمع و تدوین کی کمیٹی کا سربراہ حضرت ابو بکر نے کس صحابی کو بنایا تھا؟

۲۔ قرآن کا جو پہلا نسخہ مرتب کیا گیا، اس کا نام کیا تھا؟

۳۔ حضرت عثمان کے عہد میں تدوین قرآن کی دوبارہ ضرورت کیوں پیش آئی؟

6.9 حدیث کی تعریف

لفظی طور پر حدیث کے معنی بات، گفتگو اور نئی چیز ہوتا ہے۔ اصطلاح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات، آپ ﷺ کا قول و عمل

اور آپ ﷺ کی تقریر کو حدیث کہتے ہیں۔ تقریر کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی موجودگی میں کوئی بات کہی گئی یا کوئی کام کیا گیا اور آپ ﷺ نے اس پر کبھی نہیں کی۔ حدیث کے دائرے میں مزید وسعت پیدا کرتے ہوئے صحابہ کرام کے فیصلے اور اقوال و آرا کو بھی حدیث میں شامل کیا جاتا ہے اور اسی طرح صدر اول کے مسلمان معاشرہ کے مجموعی طرز عمل کو بھی بعض ائمہ مثلاً امام مالک حدیث میں شامل کرتے ہیں، مگر عمومی طور پر حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل و تقریر ہی کو کہتے ہیں۔

اگرچہ قرآن پاک کے بعد حدیث کا درجہ ہے اور اُس کی بہت سی فنی اقسام صحیح، حسن، ضعیف وغیرہ ہوتی ہیں، لیکن ادبی مطالعہ میں حدیث کے صحت و سقم کو یا جرح و تعدیل کو زیر بحث نہیں لایا جاتا۔ حدیث صحیح ہو یا غیر صحیح، ادیب ان کو اس نظر سے دیکھے گا کہ وہ کلام کے طریقوں میں سے ایک طریقہ اور معانی و مطالب کے سرچشموں میں ایک سرچشمہ ہیں اور قرآن سے ماخوذ و مستفاد ہونے کی وجہ اعلیٰ درجہ کے اسلوب بیان کی حامل ہیں، یہاں تک کہ یہ اسلوب بیان ضعیف و کمزور احادیث میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس لیے ان کی ادبی و لسانی قدر و قیمت مسلم ہے۔

6.10 حدیث کی اہمیت

حدیث کی شرعی حیثیت یہ ہے کہ وہ قرآن کے بعد شریعت کا دوسرا مصدر اور ماخذ ہے اور اس کی ادبی و لسانی حیثیت اور اہمیت یہ ہے کہ جس طرح قرآن پاک نے عربی ادب کو ایک لازوال زبان بنا دیا۔ اسی طرح حدیث نے بھی اس کو مختلف طرح سے مالا مال کیا ہے۔ حدیث کے ادب، لفظیات، محاورات و اصطلاحات کے زبردست اثرات عربی نثر پر پڑے ہیں۔ قرآن کے بعد مذہبی، تہذیبی و ثقافتی امور میں اسی کا کردار سب سے بڑا ہے۔ عبادات و حقوق کے متعلق قوانین اور قواعد و ضوابط بنانے کا سب سے بڑا ماخذ اور مرجع یہی ہے۔ قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے سب سے زیادہ مضبوط و معتبر ذریعہ حدیث ہے، کیونکہ وہ قرآن کی تفسیر کرتی ہے، اُس کے اجمال کو کھولتی ہے، اس کے مطلق حکم کو مقید کرتی اور اس کے عام حکم کو خاص بنا دیتی ہے۔ اگرچہ وہ احادیث صحیح و ثابت سند سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، ان کی تعداد کم ہے، تاہم فصاحت و بلاغت اور فیضان سماوی کی چھاپ ان پر بالکل ظاہر و باہر ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش میں پیدا ہوئے جو قریش کا فصیح ترین قبیلہ تھا۔ بنو سعد جو عرب کا فصیح ترین قبیلہ تھا اس میں آپ ﷺ نے دودھ پیا۔ قرآن کریم کا نزول آپ ﷺ پر ہوا، اس کی زبان پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ اسی طرح عربوں کی زبان پر وسیع اطلاع اور نئے نئے اسالیب اختراع کرنے کی کامل مہارت اور بلند معانی کی تعبیر کے لیے جامع تعبیرات اختیار کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔ دینی و مذہبی، اخلاقی و تعلیمی و تربیتی مطالب ادا کرنے کے لیے نئی ترکیبیں اور نئے الفاظ وضع فرما لیتے تھے۔ غرض حدیث کے ادبی مطالعہ کی بڑی اہمیت ہے اور عربی زبان و ادب خصوصاً نثر کے ارتقا کا کوئی بھی مطالعہ حدیث کے جائزہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، اس لیے ہر مورخ ادب حدیث کی ادبی حیثیت اور اس کے مقام و مرتبہ کا جائزہ لیتا ہے کہ عربی زبان کا کوئی طالب علم اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

6.11 حدیث کی تدوین

جس طرح قرآن کی کتابت و تدوین اس کے نزول کے ساتھ ساتھ ہی ہوتی رہی اس طرح حدیث کی تدوین نہیں ہوئی۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ کتابت و تدوین کے آلات و وسائل کم تھے۔ پڑھنے لکھنے کا رواج عرب معاشرہ میں ابھی شروع ہوا تھا۔ دوسرے یہ خوف تھا کہ

کہیں قرآن و حدیث دونوں باہم مختلط نہ ہو جائیں، اس لیے شروع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے علاوہ کچھ بھی لکھنے سے منع فرمادیا تھا، بعد میں اجازت دے دی، تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کے احکام اور بعض دوسرے احکام بعض صحابیوں کے لیے لکھوائے۔ مختلف ملوک و سلاطین عالم کے نام خطوط لکھوائے، جنہیں تاریخ نے محفوظ رکھا۔ مختلف قبائل کے ساتھ تحریری معاہدے کیے۔ مدینہ کی مردم شماری کروائی وغیرہ۔ یہ ساری لکھی ہوئی چیزیں بعد میں مجموعہ احادیث کے لیے اساس اور بنیاد بن گئیں۔ اس کے علاوہ متعدد صحابیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اپنے ذاتی مجموعوں میں جمع کیے اور یہ مجموعے ان کے اخلاف و اولاد اور شاگردوں کو منتقل ہوئے۔ ایسے صحابیوں کی تعداد بہت ہے۔ ان ذاتی چھوٹے بڑے مجموعوں نے بھی بعد میں احادیث کی کتابوں کے لیے بنیادی سوس کا کام دیا۔ تیسرا طریقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی زبانی نقل و روایت اور حفظ و نسلاً بعد نسل آگے منتقل کرنے کا تھا، جس میں حضرت ابو ہریرہ و حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کی مرویات ہزاروں سے تجاوز کر گئیں۔ صحابہ سے تابعین اور ان سے اتباع تابعین نے علم و تحقیق اور درس و تعلیم حدیث کے متعدد حلقے مختلف شہروں میں بنا لیے اور اس طرح علم حدیث ایک مفصل و متنوع شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ پھر اموی دور حکومت میں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے باضابطہ طور پر اپنے گورنروں کو حدیث کی تدوین کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے بعد مختلف شہروں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ وغیرہ میں باضابطہ حدیث کے اولین مجموعے ترتیب دینے کی کوششیں شروع ہو گئیں، چنانچہ امام مالک کی مؤطا، مصنف عبدالرزاق، جامع معمر بن راشد وغیرہ لکھی گئیں۔ اس کے بعد پورے عالم اسلام میں درس حدیث کی مجلسیں، محدثین کے حلقے اور طالبان علم حدیث کے اخذ حدیث کے لیے دور دراز کے اسفار کا دور شروع ہوا۔ نقل و نقل اور روایت در روایت کی ایسی گرم بازاری میں حدیث کا حجم بھی بہت زیادہ بڑھا۔ فتنہ وضع حدیث بھی شروع ہوا جس کے سدباب کے لیے علمائے حدیث نے متعدد علوم مثلاً اصول حدیث، علم جرح و تعدیل وغیرہ کے اصول و قواعد مرتب کیے۔

ایک بڑا مسئلہ یہ پیش آیا کہ علمائے سالہا سال تک زبانی روایت کی بنا پر حدیث کے الفاظ بعینہ رکھنے کو محال قرار دیتے ہوئے اپنے الفاظ میں حدیثوں کے مفہوم کو روایت کرنے کی اجازت دے دی، جس کو روایت بالمعنی کہتے ہیں۔ سیاسی نزاعات، مسلکی، جماعتی اور مشربی اختلافات نے ہزاروں حدیثیں اپنی دعوت کی تائید اور اپنے میلان کی ترجیح میں اختراع کروادیں۔ بعض عابد زہد لوگوں نے معاشرہ کی اصلاح کے مقصد سے بھی فضائل اعمال کی بہت سی حدیثیں گھڑ لیں۔ قرآن مجید کی سورتوں کے فضائل، بعض شہروں اور شخصوں کے فضائل پر مشتمل حدیثیں وضع کی گئیں۔ قریش کی تمام عرب پر فضیلت، عجم پر عرب کی فضیلت، بعض صحابہ کی بعض پر فضیلت کے باب میں بھی حدیثیں بنائی گئیں۔ وضع حدیث کی اس تحریک کے ذریعہ ان لوگوں نے عربی معقولات، محاورے، کہاوتیں، دانش مقولے اور عجیبی آراء و افکار کا ایک بڑا حصہ حدیث میں شامل کر دیا، جس نے تقریر و خطابت، بحث و مناظرہ، شعر و شاعری اور مذہبی وعظ و خطابت نیز زہد و رفاق کی کتابوں پر گہرا اثر ڈالا۔ اس میں شک نہیں کہ گروہ محدثین نے حدیث کے غٹ و ثمین کو چھانٹنے کی بڑی کوششیں کی ہیں۔ مسلمانوں کے علوم و فنون میں علم حدیث کو بہت بڑا درجہ حاصل ہے اور اس فن میں ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ تیسری صدی ہجری میں حدیث کے وہ مستند مجموعے بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ وغیرہ مدون کیے گئے جن کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔

6.12 حدیث کا طرز بیان

تاریخ ادب عربی کے معروف مصنف استاذ احمد حسن زیات حدیث کے طرز بیان کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر باوجود برجستگی کے فیضان سماوی کا اثر، غیر معمولی صلاحیت کا نشان اور بلاغت و دل نشینی کی مہر نظر آتی ہے اور آپ ﷺ کا طرز بیان، قرآن مجید کے اسلوب کی نسبت زمانہ نبوت کے طرز بیان سے قریب تر ہے۔ تاہم وہ اپنی ظاہری چمک دمک، عبارت کی ترتیب و روانی، واضح و معین غرض و غایت کو بیان کرنے کے لیے سلجھے ہوئے مناسب الفاظ لانے، بیان کے حسن حال ہونے اور جس سے گفتگو کی جائے اس کی بولی کے مطابق ہونے کی وجہ سے ممتاز ہے۔ دوسری زبانوں سے مطابقت ایسی شکل میں بہت زیادہ نمایاں ہو جاتی تھی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے آنے والے وفود سے مخاطب ہوتے تھے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غریب الفاظ استعمال کرتے، مقفی عبارت کا التزام کرتے اور وفود سے گفتگو کرنے کے لیے آپ ﷺ ایسے الفاظ بھی بول دیتے تھے جو قریش کے ہاں تو متروک تھے، مگر ان وفود کے قبائل کی زبانوں میں مستعمل تھے۔ ابن عبد ربہ نے اس سلسلے میں آپ کا وہ کلام نقل کیا ہے جو آپ نے عیینہ ابن ابی زہیر ہندی اور لقیط بن عامر بن متفق کے ساتھ گفتگوؤں میں استعمال کیا۔ (العقد الفرید ۲/۱۸۲)

حدیث اپنے طرز بیان میں نہایت ممتاز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جوامع الکلم دیے گئے تھے، چنانچہ حدیث میں طبعی روانی کا جمال، الفاظ کا جلال اور قدرتی و طبعی استدلال نمایاں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تشبیہ و تمثیل، کلیمانہ کلام اور حسن جواب اور فی البدیہہ گفتگو پر قدرت حاصل تھی۔ انبیائے کرام اصل میں انسانیت کے معلم ہوتے ہیں اور تعلیم و تربیت میں سب سے بہتر طریقہ اور مؤثر اسلوب تمثیل و تشبیہ کا طریقہ ہے۔

6.13 حدیث کی ادبی قدر و قیمت

جاہل عربی زبان و ادب کا بے نظیر ادیب، متکلم اور ناکد ہے۔ اس نے حدیث کی ادبی قدر و قیمت بیان کرتے ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی صفت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: لم ینتکلم الا بکلام قدحف بالعصمة و شید بالتائید و یسر بالتوفیق“ (البيان والتبيين ۲/۱۷) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام عصمت سے ڈھکا ہوا ہے، تائیدِ نبوی سے مضبوط ہے اور توفیق الہی اس کی ہم عنان ہے۔ جاہل نے حدیث کی فصاحت و بلاغت پر دال جوامع الکلم مثال میں پیش کیے ہیں جن کے حروف کی تعداد کم اور معانی کثیر ہیں۔ مثلاً آپ ﷺ نے انصار کی منقبت میں فرمایا: ”ما والله ما علمتکم الا لتقلون عند الطمع وتکثرون عند الفزع (خدا کی قسم میں نے تم کو نہیں جانا مگر یہ کہ تم فائدہ کی امید کے وقت کم ہوتے ہو اور جنگ کی ضرورت پڑے تو سب آجاتے ہو“ اور فرمایا: المسلمون تتکافؤ دمائهم ویسعی بذمہتم اذناہم وهم یدعلی من سواہم“ ”مسلمانوں کے خون برابر ہیں، ان میں کا ادنیٰ آدمی بھی ان کی طرف سے گارٹی لے سکتا ہے اور وہ دوسروں کے خلاف سب متحد ہیں“ اور آپ ﷺ کا قول: لا تنزال امتی صالحاً امرہا مال ترا الأمانة مغنماً والصدقة مغرماً“ میری امت میں بھلائی رہے گی جب تک امانت کو مال غنیمت اور صدقہ کو جرمانہ نہ سمجھائے۔ اور آپ ﷺ کا قول: المستشار مؤتمن یعنی جس سے مشورہ مانگا جائے وہ پوری امانت داری سے مشورہ دے۔ اور آپ ﷺ کا قول: إن أحبکم إلي وأقربکم منی مجالس یوم القیامة أحسنکم أخلاقاً المؤمنون أکنافاً الذین یألفون ویؤلفون وإن أبغضکم إلي وأبعدکم منی مجالس یوم القیامة الشرارون المتفہقون“ تم میں سے مجھے سب سے زیادہ محبوب اور قیامت میں مجھ سے قریب تر وہ ہوں گے جن کے اخلاق اچھے

ہیں جو نرم خو ہیں جو لوگوں کو جوڑتے ہیں اور تم میں سے مجھے سب سے زیادہ ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو بہت بولتے ہیں، بال کی کھال نکالتے ہیں اور چپا چپا کر بولتے ہیں۔ اور آپ ﷺ کا قول: ماملق تاجر صدوق: صادق و امین تجارت کرنے والا کبھی محتاج نہ ہوگا۔ اور آپ ﷺ کا فرمان: رحم الله عبد اقال خيرا فغنم أو سكت فسلم“ اللہ اس بندے پر رحم کرے کہ بولے تو اچھی بات بولے اور بھلائی پائے یا چپ رہے تو سلامتی پائے۔“

اور فرمایا: ان الله يرضى لكم ثلاثا ويكره لكم ثلاثا: يرضى لكم أن تعبدوه لا تشركوا به شيئا وأن تعصموا بعبه جميعاً ولا تنفروا وأن تناصحوا من ولاه الله امركم ويكره لكم قيل وقال وكثرة السؤال وإضاعة المال“ اللہ تم سے تین چیزیں چاہتا ہے اور تین چیزیں ناپسند کرتا ہے، پسند یہ کرتا ہے کہ تم اسی کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اس کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو، متفرق نہ ہو، آپس میں ہمدرد بنو، اپنے حکمراں کے خیر خواہ رہو، قیل و قال، کثرت سوال اور مال کی بربادی کو وہ ناپسند کرتا ہے۔ اور فرمایا: يقول ابن آدم: مالي مالي، وانما لك من مالك ما اكلت فافيت او لبست فابليت او وهبت فامضيت“۔ ابن آدم میرا مال میرا مال چلاتا ہے، حالانکہ تمہارا مال تو وہ ہے جو تم نے کھا کر ختم کر دیا یا پہن کر پرانا کر دیا یا ہدیہ میں دوسرے کو دے کر آگے بھیج دیا۔ اور آپ ﷺ کا ارشاد: ان قومًا ركبوا سفينة في البحر فاقسموا افسار لكل رجل موضع فنقرر رجل موضعه بفأس فقالوا ما تصنع؟ قال هو مكاني أصنع به ماشنت، فان أخذوا على يديه نجا ونجاوا وان تركوه هلك وهلكوا۔ کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے اور قرعہ ڈال کر کشتی میں جگہیں آپس میں بانٹ لیں، اب ہر آدمی کو ایک جگہ مل گئی تو ایک آدمی نے کپھاڑی لیکر اپنی جگہ کھودنی شروع کر دی، لوگوں نے کہا یہ کیا کر رہے ہو بھئی؟ کہنے لگا میری جگہ ہے میں اس کا جو چاہوں کروں، اب اگر سب لوگ اس کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں تو وہ بھی بچے گا اور دوسرے لوگ بھی ورنہ وہ بھی ہلاک ہوگا دوسرے بھی۔ اور آپ ﷺ کا قول: أوصاني ربي بتسع، أوصاني بإخلاص في السر والعلانية وبالعدل في الرضا والغضب وبالصدق في الغنى والفقروا أن أعفو عن ظلمي، وأعطي من حرمني وأصل من قطعني وأن يكون صمتي فكراً ونظمي ذكراً ونظري عبراً“ میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے مجھے حکم دیا ہے کہ کھلے اور چھپے اخلاص برتوں، رضامندی و ناراضگی ہر حال میں انصاف کروں، مال داری و فقر ہر حال میں اعتدال سے کام لوں، جو مجھ پر ظلم کرے اس کو معاف کر دوں جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں جو میری قطع رحمی کرے میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کروں، اور یہ کہ میری نموشی فکر، میرا بولنا خدا کا ذکر اور میرا دیکھنا عبرت پکڑنا ہو۔“ اس کے علاوہ کتب امثال میں رسول اللہ ﷺ کے بعض اقوال و کلمات بھی نقل کیے گئے ہیں جو مجاورے اور ضرب الامثال بن گئے ہیں مثال کے طور پر: ان المنبت لأرضاً قطع ولا ظهر أبقي: سواری کو تیز دوڑا کر قافلہ سے کٹ جانے والا نہ مسافت طے کرتا ہے اور نہ سواری ہی بچا پاتا ہے۔ المؤمن هين لين كالجمال الأنف، ان قيدا نقادان انيخ على صخرة استناخ: مؤمن نکیل پکڑے ہوئے اونٹ کی طرح نرم خواہ اور اطاعت شعار ہوتا ہے، اگر اسے ہانکا جائے تو چلنے لگتا ہے اور اگر اسے چٹان پر بٹھا دیا جائے تو وہ بیٹھ جاتا ہے۔ لوتو كلتم على الله لوزقكم كما يرزق الطير تغدو خماصاً وتعود بطناً: اگر تم خدا پر بھروسہ کر لو تو وہ پرندوں کی طرح تم کو روزی پہنچائے گا کہ صبح کو خالی پیٹ نکل جاتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ لوٹ کر آتے ہیں۔ مثل المؤمن كالنحلة لا ياكل الا طيباً ولا يطعم الا طيباً: مؤمن شہد کی مکھی کی طرح ہے خوش

ذائقہ چیز کھاتا ہے اور خوش ذائقہ چیز ہی کھلاتا ہے: انکم لن تسعوا الناس باموالکم فسعواہم باخلاقکم تم تمام انسانوں کو اپنے مال سے خوش نہیں کر سکتے تو ان کو اپنے اخلاق سے خوش کرو۔

آپ ﷺ نے فرمایا: المؤمن الف مألوف ولاخیر فی من لایألف ولا یؤلف: مؤمن ملنسار اور ہر دل عزیز ہوتا ہے اور جو شخص ملنسار اور خوش اخلاق نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں۔ ایاکم وخصراء الدمن، المرأة الحسنة فی المنبت السوء: دیکھو گھورے کی سبزی سے پچو یعنی اُس حسینہ سے جو خراب ماحول میں پلی ہو۔ المرأة کالضلع ان رمت قوامہا کسرتہا: عورت پبلی کی طرح ہے اگر تم اُسے سیدھا کرنے لگو گے تو اس کو توڑ ڈالو گے۔

الناس کلہم سواسیة کاسنان المشط: تمام انسان کنگھی کے دانتوں کی طرح برابر ہیں۔ جنة الرجل دارہ: انسان کی جنت اس کا گھر ہے۔

حدیث میں آئے یہ محاورے، ضرب الامثال اور کہاوتیں عربی زبان وادب پر بہت مؤثر ہوئے ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے تمام علوم اسلامیہ میں جو زبردست اعتنا اور توجہ حدیث کو دی اتنی کسی علم کو نصیب نہیں ہوئی۔ ہر زمانہ میں حدیث کی کتابیں، دواوین، ان کی شرحیں، معاجم، انڈیکس اور تشریحات پر مبنی کتابیں لکھی گئیں۔ حدیث کی کتابوں کے اختصار، ترجمے اور حاشیے لکھے گئے۔ حدیث کی کتب کے مختلف عالمی زبانوں میں ترجمے ہوئے، محدثین، رواۃ اور رجال حدیث پر عظیم الشان کتابیں لکھی گئیں۔ یوں حدیث کے حوالہ سے بالواسطہ عربی زبان وادب کی خدمت بھی ہوتی رہی ہے۔ حدیث نے عربی نثر کو ایک خاص آہنگ اور اسلوب دیا اور اس کی ثروت مندی میں زبردست اضافہ کیا۔ اس لیے علماء و مؤرخین ادب قرآن پاک کے بعد عربی زبان وادب پر حدیث کے گہرے اور وسیع الاطراف اثرات کا تذکرہ کرتے اور حدیث کی شان میں رطب اللسان رہتے ہیں۔

6.14 اکتسابی نتائج

☆ قرآن کی جمع و تدوین کا کام عہد رسالت میں شروع ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا خصوصی طور پر اہتمام فرمایا۔ آپ ﷺ نے اس کے لیے دو طریقے اختیار فرمائے۔ جمع صدور یعنی قرآن کو یاد کر کے سینے میں محفوظ کرنے کا ذریعہ اور جمع مکتوب یعنی تحریر و کتابت کے ذریعہ۔ قرآن کے منتشر اجزا کو یکجا اور ایک مرتب نسخے کی شکل میں محفوظ کر دینے کا کام حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ہوا۔ اس کے بعد اپنے تیسرے مرحلے میں قرآن کی تدوین حضرت عثمان کے عہد میں ہوئی۔ عہد عثمانی میں جو نسخہ قرآنی مرتب ہوا وہ نسخہ مصحف عثمانی کہلاتا ہے اور یہ وہی نسخہ ہے جو پوری امت مسلمہ میں کے درمیان آج متداول ہے۔ اس کے بعد چوتھے مرحلے میں ابواسود دولی یا حجاج بن یوسف کی کوششوں سے قرآن پر اعراب اور نقطے لگائے گئے۔ اس طرح قرآن کی تدوین پوری طرح مکمل ہو گئی۔

☆ قرآن اپنے اندر اعجاز کے متعدد پہلو رکھتا ہے۔ ان میں بعض کا تعلق زبان و بیان سے تو بعض دوسرے پہلوؤں کا تعلق اس کے معانی و افکار سے ہے۔ قرآن نے منکرین کو چیلنج کیا کہ وہ اس کے جیسی ایک سورت ہی پیش کر دیں (البقرہ: 23)۔ اور اس کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ تمام جن و انس مل کر بھی وہ اس عمل پر قادر نہیں ہو سکتے (الاسراء: 88)۔ قرآن کے اس دعوے میں دونوں پہلو شامل ہیں کہ نہ تو

الفاظ و اسلوب کے لحاظ سے اس جیسا بلینج و مؤثر کلام کسی سے ممکن ہے اور نہ ہی افکار و معانی کے وہ جواہر جو قرآن اپنے اندر رکھتا ہے، اس کی نظیر پیش کی جاسکتی ہے۔

☆ قرآن کی نثر ایک اہم ادبی نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ نہ وہ مجرد نثر ہے اور نہ ہی شعر۔ وہ ان دونوں کے مابین کی صنف ہے۔ اس میں بکثرت قافیہ کا حسن ہے، لیکن شعری اوزان اور پیمانوں سے خالی۔ اس میں نثری عبارتیں ہیں: طویل بھی، مختصر اور درمیانہ نوعیت کی بھی، لیکن یہ نثر سپاٹ نہیں ہے۔ یہی قرآنی اسلوب کا کمال ہے جو اسے اعجاز کی صفت عطا کرتا ہے۔

☆ حدیث نبی اکرم ﷺ کے کلام کو کہتے ہیں۔ حدیث نے عربی زبان کے ذخیرہ ادب کو اپنی زبردست فصاحت، لازوال بلاغت، اپنی حکمتوں اور جوامع الکلم سے ثروت مند کیا۔ اس میں بہت ساری تراکیب کا اضافہ کیا، نئے محاورے دیے، نئی لفظیات سے اُس کو مالا مال کیا۔ ☆ حدیث کی ادبی و لسانی حیثیت اور اہمیت یہ ہے کہ جس طرح قرآن پاک نے عربی ادب کو ایک لازوال زبان بنا دیا۔ اسی طرح حدیث نے بھی اس کو مختلف طرح سے مالا مال کیا ہے۔ حدیث کے ادب، لفظیات، محاورات و اصطلاحات کے زبردست اثرات عربی نثر پر پڑے ہیں۔ قرآن کے بعد مذہبی، تہذیبی و ثقافتی امور میں اسی کا کردار سب سے بڑا ہے۔ عبادات و حقوق کے متعلق قوانین اور قواعد و ضوابط بنانے کا سب سے بڑا ماخذ اور مرجع یہی ہے۔ قرآن پاک کو سمجھنے کے یہی سب سے زیادہ مضبوط و معتبر ذریعہ ہے، کیونکہ وہ قرآن کی تفسیر کرتی ہے، اُس کے اجمال کو کھولتی ہے، اس کے مطلق حکم کو مقید کرتی اور اس کے عام حکم کو خاص بنا دیتی ہے۔ اگرچہ وہ احادیث جو صحیح و ثابت سند سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، ان کی تعداد کم ہے، تاہم فصاحت و بلاغت اور فیضانِ سماوی کی چھاپ ان پر بالکل ظاہر و باہر ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش میں پیدا ہوئے جو قریش کا فصیح ترین قبیلہ تھا۔ بنو سعد جو عرب کا فصیح ترین قبیلہ تھا اس میں آپ ﷺ نے دودھ پیا اور قرآن کریم کا نزول آپ ﷺ پر ہوا۔ آپ ﷺ کو عربی زبان پر مکمل عبور تھا نئے نئے اسالیب اختراع کرنے کی کامل مہارت، بلند معانی کی تعبیر کے لیے جامع تعبیرات اختیار کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔ دینی و مذہبی، اخلاقی و تعلیمی و تربیتی مطالب ادا کرنے کے لیے نئی ترکیبیں اور نئے الفاظ وضع فرما لیتے تھے۔ غرض حدیث کے ادبی مطالعہ کی بڑی اہمیت ہے اور عربی زبان و ادب خصوصاً نثر کے ارتقا کا کوئی بھی مطالعہ حدیث کے جائزہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

☆ شروع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے علاوہ کچھ بھی لکھنے سے منع فرما دیا تھا لیکن بعد میں اجازت دے دی۔ تاہم آپ ﷺ نے زکوٰۃ کے احکام اور بعض دوسرے احکام بعض صحابیوں کے لیے لکھوائے۔ مختلف ملوک و سلاطین عالم کے نام خطوط لکھوائے، جنہیں تاریخ نے محفوظ رکھا۔ مختلف قبائل کے ساتھ تحریری معاہدے کیے۔ مدینہ کی مردم شماری کروائی وغیرہ۔ یہ ساری لکھی ہوئی چیزیں بعد میں مجموعہ احادیث کے لیے اساس اور بنیاد بن گئیں۔ اس کے علاوہ متعدد صحابیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اپنے ذاتی مجموعوں میں جمع کیے اور یہ مجموعے ان کے اخلاف و اولاد اور شاگردوں کو منتقل ہوئے۔ ایسے صحابیوں کی تعداد بہت ہے۔ ان ذاتی چھوٹے بڑے مجموعوں نے بھی بعد میں احادیث کی کتابوں کے لیے بنیادی سوس کا کام دیا۔ تیسرا طریقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی زبانی نقل و روایت اور حفظ و نسلاً بعد نسل آگے منتقل کرنے کا تھا، جس میں حضرت ابوہریرہ و حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کی مرویات ہزاروں سے تجاوز کر گئیں۔ صحابہ سے تابعین اور ان سے اتباع تابعین نے علم و تحقیق اور درس و تعلیم حدیث کے متعدد حلقے مختلف شہروں میں بنا لیے اور اس طرح

علم حدیث ایک مفصل شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ پھر اموی دور حکومت میں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے باضابطہ طور پر اپنے گورنروں کو حدیث کی تدوین کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے بعد مختلف شہروں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ وغیرہ میں باضابطہ حدیث کے اولین مجموعے ترتیب دینے کی کوششیں شروع ہو گئیں، چنانچہ امام مالک کی مؤطا، مصنف عبدالرزاق، جامع معمر بن راشد وغیرہ لکھی گئیں۔ اس کے بعد پورے عالم اسلام میں درس حدیث کی مجلسیں، محدثین کے حلقے اور طالبان علم حدیث کے اخذ حدیث کے لیے دور دراز کے اسفار کا دور شروع ہوا۔ یہ علم حدیث کا زرین دور تھا اور حدیث کی وہ کتابیں جو صحاح ستہ کہی جاتی ہیں اسی دور میں وجود پذیر ہوئیں۔

☆ حدیث کے ذخیرہ میں جوامع الکلم بہت بڑی تعداد میں ہیں جن کی ادبی حیثیت بھی مسلم ہے۔ مؤرخین ادب ان کو اپنی کتابوں میں ادب کے شہ کارکڑوں کی مثال میں پیش کیا کرتے ہیں مثال کے طور پر آپ ﷺ نے فرمایا: ان اللہ یرضی لکم ثلاثاً ویکرہ لکم ثلاثاً: یرضی لکم ان تعبدوه لاتشركوا به شیئاً وان تعصموا بحبلہ جمیعاً ولاتتفرقوا وان تناصحوامن ولاہ اللہ امرکم ویکرہ لکم قیل وقال وکثرة السوال واضاعة المال، اللہ تم سے تین چیزیں چاہتا ہے اور تین چیزیں ناپسند کرتا ہے، پسند یہ کرتا ہے کہ تم اسی کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اس کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو، متفرق نہ ہو، آپس میں ہمدرد بنو، اپنے حکمران کے خیر خواہ رہو، قیل وقال، کثرت سوال اور مال کی بربادی کو وہ ناپسند کرتا ہے۔ اور فرمایا: یقول ابن آدم: مالی مالی، وانمالک من مالک ما اکلت فافنییت اولبست فابلیت اوہبت فامضیت۔ ابن آدم میرا مال چلاتا ہے، حالانکہ تمہارا مال تو وہ ہے جو تم نے کھا کر ختم کر دیا یا پہن کر پرانا کر دیا یا ہدیہ میں دوسرے کو دے کر آگے بھیج دیا۔

☆ اس کے علاوہ کتب امثال میں رسول اللہ ﷺ کے بعض اقوال وکلمات بھی نقل کیے گئے ہیں جو محاورے اور ضرب الامثال بن گئے ہیں مثال کے طور پر: ان المنبت لارضا قطع ولاظہر اأبقی: سواری کو تیز دوڑا کر قافلہ سے کٹ جانے والا نہ مسافت طے کرتا ہے اور نہ سواری ہی بچا پاتا ہے۔ المؤمن ہین لین کالجمل الآنف، ان قیدانقادان انیخ علی صخرة استناخ: مؤمن نکیل پکڑے ہوئے اونٹ کی طرح نرم خو اور اطاعت شعار ہوتا ہے، اگر اسے ہانکا جائے تو چلنے لگتا ہے اور اگر اسے چٹان پر بٹھا دیا جائے تو وہ بیٹھ جاتا ہے۔ غرض یہ کہ حدیث کی ادبی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے اور اس کی تشریحی حیثیت کے ساتھ ہی عربی ادب کے طالب علم کو حدیث کی بلاغت اور اس کے ادبی اثرات پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔

ہے اور اگر اسے چٹان پر بٹھا دیا جائے تو وہ بیٹھ جاتا ہے۔ غرض یہ کہ حدیث کی ادبی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے اور اس کی تشریحی حیثیت کے ساتھ ہی عربی ادب کے طالب علم کو حدیث کی بلاغت اور اس کے ادبی اثرات پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔

6.15 فرہنگ

مسلم	:	تسلیم شدہ
جوامع الکلم	:	وہ الفاظ جن میں الفاظ کم اور معانی زیادہ ادا کر دیے جائیں
مالہ وما علیہ	:	کسی موضوع کے مثبت اور منفی تمام پہلو
اجمال	:	ایسا اختصار جس میں بات پوری نہ کھل سکے

مطلق	:	بغیر کسی شرط کے، پورا
مختلط	:	ملا جلا
حجم	:	سائز
وضع حدیث:		حدیث گھڑنا
مشرب	:	مکتب فکر سے متعلق
رقاق	:	زہد و تقویٰ سے متعلق باتیں جو دل کو نرم کریں
غث و ثمین	:	کوڑا کرکٹ، بودی چیزیں، تلچھٹ
متکلم	:	بولنے والا، علم کلام کا جاننے والا
فقر	:	غربت
گھورا	:	گندگی و میل کچیل
دو ادین	:	دیوان کی جمع، مجموعہ کلام یا کسی بھی موضوع پر متعلقہ مواد کا مجموعہ
اعتنا	:	توجہ
معاجم	:	ڈکشنریاں
رواۃ	:	راوی کی جمع، روایت کرنے والا
مستعار	:	ماخوذ، ادھار لیا ہوا
رطب اللسان:		یعنی زبان پر ہمیشہ اس کا چر چار ہوتا ہے، تعریف
منقح	:	کانٹ چھانٹ کر الگ و ممتاز کیا ہوا، اصلاح یافتہ

6.16 نمونے کے امتحانی سوالات

- ۱- عہد نبوی میں قرآن کی تدوین کی صورت کیا تھی؟ اظہار خیال کیجیے۔
- ۲- عہد عثمانی میں تدوین قرآن سے متعلق کیا کام ہوا؟ وضاحت کیجیے۔
- ۳- حضرت ابو بکر نے قرآن کے جمع و تدوین کا کیا طریقہ کار اختیار کیا؟ تفصیل کے ساتھ لکھیے۔
- ۴- تدوین کے حوالے سے قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں کیا فرق ہے؟ بحث کیجیے۔
- ۵- حدیث کی تدوین پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
- ۶- قرآن و حدیث کے متن میں ادبیت کے لحاظ سے کیا فرق ہے؟
- ۷- حدیث نے عربی زبان و ادب کو کس طرح متاثر کیا؟

۸۔ جوامع الکلم پر روشنی ڈالنے اور بعض مثالیں دیجیے۔

۹۔ حدیث کی روایت باللفظ اور روایت بالمعنی سے ادبی لحاظ سے کیا فرق پڑتا ہے وضاحت کریں؟

6.17 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

- (1) علوم القرآن، مکتبہ دارالعلوم کراچی
- (2) علوم القرآن (ترجمہ: غلام احمد حریری)
- (3) محاضرات قرآنی، اریب پبلی کیشنز، نئی دہلی
- (4) مطالعہ قرآن، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور
- (5) نقوش، لاہور، قرآن نمبر۔
- (6) تاریخ الأدب العربی، المجلد الثاني، العصر الإسلامي، د۔ شوقی ضیف
- (7) تاریخ الأدب العربی، اردو ترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی، د۔ أحمد حسن الزیات
- (8) تاریخ الأدب العربی، د۔ عمر فروخ
- (9) فجر الإسلام، د۔ أحمد أمين
- (10) اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور مادہ حدیث

اکائی 7 مخضرمی شعرا اور ان کی شعری خصوصیات

اکائی کے اجزا

- 7.1 مقصد
- 7.2 تمہید
- 7.3 کعب بن مالک
- 7.3.2 حسان بن ثابت
- 7.3.3 حطیبہ
- 7.3.4 الخنساء
- 7.3.5 نایفۃ جعدی
- 7.4 اکتسابی نتائج
- 7.5 نمونے کے امتحانی سوالات
- 7.6 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

7.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ مخضرمی عہد کے نمائندہ شعرا اور ان کی شاعری خصوصیات سے واقف ہو سکیں گے۔ اس اکائی میں مخضرمی عہد کے پانچ اہم شعرا کعب بن مالک، حسان بن ثابت، حطیبہ، خنساء، نابغہ جعدی کے مخضرموانحی حالات بیان کیے جائیں گے اور ان کی شاعری کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار بھی بطور مثال پیش کیے جائیں گے۔

7.2 تمہید

عربی زبان و ادب کی تاریخ میں مخضرم شعرا کے ادبی کارنامے قابل ذکر قرار دیے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف جاہلی شاعری کی بعض صفات پائی جاتی ہیں وہیں وہ دوسری طرف اسلامی تعلیمات و اقدار سے بھی مزین نظر آتی ہے۔ عربی شاعری میں ان شعرا کو 'مخضرم شعرا' کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے جنہوں نے زمانہ جاہلیت کے ساتھ ساتھ عصر اسلامی میں شاعری کی تھی اور اپنے اسلام لانے کے باوجود بھی کوچہ شاعری میں اپنے وجود کو منواتے رہے۔ دراصل عربی زبان میں مخضرم کے کئی معنی ہیں۔ ان تمام معانی میں قدر مشترک یہ ہے کہ اس میں ملانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یعنی دو چیزوں کو ملانا، حالانکہ یہ ملانا کئی طرح کا ہو سکتا ہے لیکن شاعری اصطلاح میں اس سے مراد زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام کا ملانا ہے۔ یعنی ایسے شعرا جنہوں نے زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں میں شاعری کی ہو۔ ان شعرا کا کلام زمانہ جاہلیت کے شعرا سے ممتاز ہے۔ ان کے یہاں اخلاقی اقدار، زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور مشکلات کا مقابلہ حوصلہ مندی کے ساتھ کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں زمانہ جاہلیت کی طرح قنوطیت نہیں ہے بلکہ رجائیت اور امید کی فضا ہے۔ ساتھ ہی ان شعرا نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت گوئی کا بھی آغاز کیا جو آج تک ایک مستقل صنف سخن کی حیثیت سے مختلف زبانوں میں موجود ہے۔

7.3 اہم مخضرم شعرا

7.3.1 کعب بن مالک

حضرت کعب بن مالک ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ انصار کے قبیلہ بنی خزرج سے نسبی تعلق تھا۔ انصار میں سے جو لوگ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک ہوئے یہ بھی ان میں شامل تھے۔ ان کی پیدائش ہجرت سے کم و بیش ۲۵ سال قبل ۵۹۸ء میں ہوئی۔ شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہ پختہ کار شعرا میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے بعض اشعار پسند فرمائے تھے اور ان کو اپنے بہت قریب رکھتے تھے۔ شاعری کے ساتھ وہ میدان کارزار میں بھی داد شجاعت دیا کرتے تھے۔ غزوہ احد کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بڑی بے جگری سے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خوش ہو کر ان کی زرہ بکتر خود زیب تن فرمائی اور اپنی زرہ حضرت کعب کو دی۔

غزوہ تبوک کے موقع پر جب تمام مسلمانوں کو میدان جنگ میں جانے کا حکم تھا، اس موقع پر جو چند لوگ شریک نہ ہو سکے ان میں حضرت کعب بن مالک بھی تھے۔ حالانکہ کعب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت چہیتے تھے لیکن یہاں دین کا مسئلہ آگیا تھا لہذا آپ ﷺ کے حکم پر مدینہ کے تمام لوگوں نے ان سے بات چیت بند کر دی۔ بیوی بھی علیحدہ ہو گئی اور وہ اکیلے اس مصیبت کو جھیلتے رہے۔ بہت سخت امتحان

تھا۔ ان حالات میں ایک آزمائش یہ ہوئی کہ غسان کے عیسائی حکمران نے ان کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ لیکن ان حضرات کے دلوں میں ایمان راسخ ہو چکا تھا، دنیا کی ہر چیز ان کی نظر میں بے معنی تھی، وہ ہر مشکل کا مقابلہ کرتے رہے اور اپنی غلطی کے لیے استغفار کرتے رہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور پچاس دن کے بعد ان کے لیے قرآن پاک کی آیات نازل ہوئیں۔ حضرت کعب نے خود بھی ان واقعات کا بہت موثر انداز میں تذکرہ کیا ہے جو عربی ادب کا ایک شاہکار مانا جاتا ہے۔

حضرت کعب نے طویل عمر پائی۔ خلافت راشدہ کا پورا زمانہ دیکھا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد انھوں نے بھی حضرت علیؓ سے قصاص کا مطالبہ کیا تھا۔ امیر معاویہ کے عہد خلافت میں سنہ ۵۰ یا ۵۱ء میں ان کی وفات ہوئی۔ حضرت کعب بن مالک اچھے شاعر تھے۔ تاہم ان کو صف اول کا شاعر نہیں کہا جاسکتا۔ حضرت حسان کا مقام بہر حال ان سے بلند ہے۔ لیکن دوسری صف کے شعرا میں ان کا نمایاں مقام ہے۔ ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اس دیوان میں اس دور میں رائج تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی ملتی ہے۔ ان کے کلام میں نعت، نقائض، مرثیہ اور رزمیہ شاعری کے اچھے نمونے ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ حضرت کعب بن مالک کی شاعری پر قدما کے یہاں کم کلام ملتا ہے۔ غالباً حضرت حسان بن ثابت کی وجہ سے ان کو عربی ادب کی تاریخ میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کے مستحق تھے۔ البتہ جدید عہد کے تذکرہ نگار عام طور پر ان کا ذکر کرتے ہیں۔ انھوں نے ان کی شاعرانہ خوبیوں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کے دیوان پر سامی العانی نے تحقیق کی ہے اور ان کی شاعرانہ خوبیوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

نعت گوئی میں ان کا رجحان حقائق نگاری کی طرف تھا۔ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان، آپ کی شخصیت کے اوصاف، آپ کے فضائل و مناقب اور اطاعت رسول ﷺ کے مضامین باندھے ہیں۔ ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فینا الرسول شہاب یتبعہ
نور مضيئٍ له فضل علی الشہب
بد النا فاتبعناہ مصدقہ
و کذبوہ فکنا اسعد العرب

ترجمہ: رسول ﷺ ہمارے درمیان شہاب ثاقب کی طرح ہیں، جس کی اتباع کی جاتی ہے، بلکہ وہ شہاب ثاقب سے بھی زیادہ پر نور ہیں چمکدار ہیں، ہم نے تصدیق کرتے ہوئے ان کی اتباع کی، اور ان لوگوں نے ان کو جھٹلایا، پس ہم عربوں میں سب سے زیادہ خوش نصیب تھے۔ اسی طرح:

وفینا رسول اللہ نتبع امرہ
إذا قال فینا القول لا نتطلع
تدلی علیہ الروح من عند ربہ
ینزل من جو السماء ویرفع

ترجمہ: اور ہمارے درمیان اللہ کے رسول ﷺ ہیں جن کی ہم اتباع کرتے ہیں، جب وہ ہمیں کوئی حکم دیتے ہیں تو ہم بے توجہی نہیں کرتے، اپنے رب کے حکم سے روح (جبرئیل علیہ السلام) ان کے پاس آتے ہیں، آسمان کی فضا سے اترتے ہیں اور چڑھتے ہیں۔
اسی طرح:

الحق منطقہ و العدل سیرتہ
فمن یجبہ الیہ ینج من تب

ترجمہ: ان کی گفتگو برحق ہے، اور عدل و انصاف ان کی سیرت ہے، پس جو بھی ان کی اتباع کرے گا وہ ہلاکت سے بچ جائے گا۔
اس طرح ان کی نعت گوئی میں اتباع رسول ﷺ کی دعوت اور رسول اللہ ﷺ کے فضائل و مناقب کا ذکر بڑے دل نشیں انداز میں ملتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جو وہ دیکھ رہے ہیں اس کو بیان کر رہے ہیں۔

نقائض یعنی اللہ کے رسول ﷺ پر کفار و مشرکین کے اتہامات کا جواب بھی انھوں نے بڑے سلیقے اور اچھوتے انداز میں دیا ہے۔ مکہ کے ایک شاعر ضرار بن خطاب نے بدر کے میدان میں جو قصیدہ کہا حضرت کعب نے اس کا جواب اسی لب و لہجہ میں دیا جو ان کا بہترین قصیدہ مانا جاتا ہے۔ اس طرح ابوسفیان کو بھی ایک تہدید کی قصیدہ لکھا۔ احد کے موقع پر عمرو بن عاص کے جواب میں قصیدہ لکھا۔ غزوہ خندق کے موقع پر عبداللہ بن زہری اور غزوہ بنی نضیر کے موقع پر عبداللہ بن مرداس کی نقیض کی، ان کے یہ نقائض کافی مشہور ہیں۔ بعض کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت حسان کے ہم پلہ ہیں۔ ان کے نقائض میں مشرکین کے جوابات، ان کے الزامات کی تردید اور دین اسلام کی عظمت و خوبیوں کا اعتراف شامل ہے۔ ان کے اس طرح کے بعض اشعار کو رسول اللہ ﷺ نے بھی پسند فرمایا۔ روایت ہے کہ غزوہ حنین کے موقع پر انھوں نے ایک قصیدہ کہا جس کے دو شعر یہ ہیں:

قضینا من تہامۃ کل رب
و خبیر ثم اجمعنا السیوفا
نخبیرھا ولو نطقت لقات
قواطعہن دوسا اور ثقیفا

ترجمہ: تہامہ اور خبیر میں ہم نے تمام شک کو زائل کر دیا، پھر تلواریں نے ہمیں جمع کر دیا، ہم نے ان کو اختیار کر لیا، اگر تلواریں بول سکتیں تو وہ کہتیں کہ دوس اور ثقیف کا فیصلہ کرنے والی ہیں۔

مشہور ہے کہ اس قصیدہ کو سن کر قبیلہ دوس نے اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ان اشعار کو پسند فرمایا۔ امام بیہقی نے ان اشعار کے سلسلے میں آپ ﷺ کا جملہ نقل کیا ہے ”لہو اسرع فیہم من السہم فی غلس الظلام۔“ (بے شک وہ ان پر اندھیاری کے تیروں سے زیادہ اثر کرنے والا ہے۔)

مرثیہ نگاری میں بھی حضرت کعب کا اسلوب بڑا منفرد تھا۔ انھوں نے متعدد مرثیہ کہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی وفات پر انھوں نے مرثیہ کہا وہ بڑا موثر ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

ياعين فابكى بدمع ذرى
 لخير البرية والمصطفى
 على خير من حملت ناقة
 وأنقى البرية عندالتقى
 على سيد ماجد جحفل
 وخير الانام و خيراللها

ترجمہ: اے آنکھ تو آنسو چھلکا دے اس ذات کے لیے جو مخلوق میں سب سے بہتر اور اللہ کی طرف سے منتخب ہے، اس شخصیت پر جو اونٹ پر سوار ہونے کے اعتبار سے سب سے بہترین ہے، اور مخلوق میں سب سے زیادہ تقویٰ والی ہے، بزرگیت میں سب کی سب کی سردار ہے، اور مخلوق میں سب سے بہتر ہے،
 حضرت حمزہ کی شہادت پر انھوں نے جو مرثیہ کہا تھا وہ بھی ان کے بہترین مرثیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس قصیدہ میں حضرت حمزہ کی بہن حضرت صفیہ کو مخاطب کر کے یہ اشعار کہے:

صفیة قو مي! ولا تعجزى
 و بكي النساء على حمزة
 ولا تسأمی ان تطيل البكا
 على اسدالله في الهزة
 يرید بذاک رضا أحمد
 و رضوان ذی العرش و العزة

ترجمہ: اے صفیہ! اٹھو! کمزور مت پڑو، درآنحالیکہ عورتیں حضرت حمزہ پر آنسو بہا رہی ہیں، اللہ کے شیر پر جو جنگ میں شہید ہو گیا زیادہ رو کر تم اپنے آپ کو مت تھکاؤ، وہ اس شہادت کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ رب العزت کی رضا چاہتے ہیں۔
 مجموعی طور پر حضرت کعب بن مالک اپنے عہد کے بہترین شاعر تھے۔ شاعری میں انھوں نے اجتہادی بصیرت سے کام لیا۔ ان کی شاعری میں روایتی عرب شاعری سے انحرافات بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے اپنے قصائد میں تشبیب کی رعایت نہیں کی جب کہ عرب شعرا اپنے قصائد تشبیب سے شروع کرتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے نئی لفظیات کا استعمال کثرت سے کیا۔ خاص طور پر اسلامی اصطلاحات کو انھوں نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا، ان کی شاعری ایک مکمل اسلامی شاعری تھی۔ قرآن و حدیث کے مضامین بھی انھوں نے نظم کیے۔ دین کی دعوت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ نعت اور مدح و ثنا بھی ان کے کلام میں موجود ہے لیکن انھوں نے کبھی بھی بے مبالغہ یا غلو کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ خاص طور پر قصائد میں زور بیان کے لیے انھوں نے ثقیل اور بھاری بھر کم الفاظ

کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی شاعری بوجھل نہیں معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے حسن و عشق اور رنگین مضامین نہیں باندھے ہیں۔ شاید ایک وجہ یہ بھی ہے جس کی وجہ سے متقدمین نے ان کے کلام کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور نہ حقائق نگاری اور شعریت کا جہاں تک تعلق ہے وہ اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔

7.3.2 حسان بن ثابت:

حضرت حسان بن ثابت کا شمار دور جاہلیت اور عہد اسلام کے اہم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ان کو معلقات کے شاعروں کے ہم پلہ قرار دیا گیا اور زمانہ اسلام میں تو کوئی شاعر نہ مسلمانوں میں اور نہ مشرکین ان کے ہم سرا اور ہم پلہ ہوا۔ ساتھ ہی ان کی دوسری فضیلتیں مستزاد ہیں۔ وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے منبر سے اپنے اشعار سنائے۔ ان کو شاعر النبی کا معزز خطاب ملا، اور ان کو باضابطہ دربار رسالت کی طرف سے شعر گوئی کے لیے مقرر کیا گیا اور حضرت ابو بکر کے ذریعہ باضابطہ ان کی تعلیم و تربیت کی گئی تاکہ وہ مکہ والوں کی بھوکا اسی لب و لہجہ میں جواب دے سکیں۔

حضرت حسان بن ثابت کو قدرت کی طرف سے لمبی عمر ملی۔ ان کی ولادت ہجرت سے تقریباً ساٹھ سال قبل ۵۶۵ء میں ہوئی۔ ان کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا اور وہ بنی نجار سے تھے۔ اس طرح رسول اللہ سے نانیہالی رشتہ داری بھی تھی۔ ان کا گھرانہ بھی اپنے دور میں بہت معزز مانا جاتا تھا اور جب ان کی شاعری کے چرچے شروع ہوئے رفتہ رفتہ وہ خزرج کے قومی شاعر بن گئے۔ چون کہ بنی غسان اور بنی منذر سے ان کا خاندانی تعلق تھا اس لیے وہ ان کے بادشاہوں کے یہاں بھی جانے لگے اور ان کے دربار میں قصیدے کہے۔ حضرت حسان کے قصیدے اس قدر پسند کیے گئے کہ ان بادشاہوں نے نہ صرف ان کو انعام و اکرام دیا بلکہ ان کا مستقل وظیفہ بھی مقرر کر دیا جو ان کو تاحیات ملتا رہا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی یہ وظیفہ جاری رہا حالانکہ غسانی بدستور عیسائی ہی رہے۔

غسانی حکمراں حضرت حسان کی اتنی رعایت کرتے تھے کہ ایک مرتبہ وہ دربار میں گئے، اتفاق سے معلقات کا مشہور شاعر نابغہ ذبیانی بھی دربار میں تھا۔ غسانی بادشاہ کو ڈر ہوا کہ نابغہ کی موجودگی میں حضرت حسان نے شعر پڑھے تو ان کی سبکی ہو سکتی ہے اس لیے انھوں نے حضرت حسان سے کہا کہ آپ قصیدہ نہ سنائیں آپ کا انعام آپ کو مل جائے گا، لیکن حضرت حسان نے اپنا قصیدہ سنایا اور وہ ان لوگوں سے بھی زیادہ پسند کیا گیا۔ اپنی قوم کی مدح و ثنا اور غسانی بادشاہوں کی مدح میں قصیدہ کہتے ہوئے حضرت حسان نے اپنی زندگی کے تقریباً ساٹھ سال بسر کیے۔ انھوں نے مکہ کے میلوں میں بھی اپنے قصیدے پڑھے اور داد و تحسین وصول کی۔

جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو مکہ کے چند شعرا جیسے عبداللہ بن زبیری، ابوسفیان بن حارث اور عمرو بن عاص، ضرار بن خطاب اور امیہ بن ابی صلت وغیرہ شعرا نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی بھجوشروع کی۔ اس زمانے میں شاعری وہ کام کرتی تھی آج کا میڈیا کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا جواب دینے کے لیے انصار کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ لوگوں نے تلوار سے ہماری مدد کی ہے۔ زبان سے مدد کرنے میں کیا چیز مانع ہے؟ اس پر حضرت حسان آگے بڑھے اور انھوں نے اپنی زبان پکڑ کر کہا کہ اب اس زبان سے سوائے آپ ﷺ کی حمایت اور مدافعت کے اور کوئی بات نہیں نکلے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسان کو کچھ ہدایات دیں۔

حضرت ابو بکر کے پاس بھیجا کہ اہل مکہ کے عیوب و نقائص معلوم کریں۔ اس کے بعد انھوں نے مکہ کے مشرکین کی ہجو شروع کی اور اس طرح شروع کی کہ اس ہجو میں سے رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے خاندان کو پوری طرح بچا لیا۔ روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسان کو دعا بھی دی کہ حسان تم پڑھے جاؤ جبرئیل تمھاری مدد کریں گے۔

حضرت حسان نے ہجرت سے قبل ہی اسلام قبول کر لیا تھا اور مشرکین مکہ کے اعتراضات کا جواب دینے لگے تھے۔ لیکن اس میں سب سے اہم مسئلہ جنگ بدر کا ہے۔ اس موقع پر حضرت حسان کے اشعار نے وہ کام کیا جو مجاہدین کے تیروں نے کیا۔ مکہ کے تقریباً ۷۰ سردار اس میں مارے گئے تھے، ان کی لاشیں ایک گڑھے میں ڈال دی گئیں۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے ان کو مخاطب کر کے اللہ کے وعدہ کی تکمیل کا ذکر کیا تھا۔ حضرت حسان نے اس منظر کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ ان اشعار میں بیان فرمایا:

ینادیہم رسول اللہ لما
 قذفناہم کبا کب فی القلب
 الم تجدوا حدیثی کان حقاً
 و امر اللہ یأخذ بالقلوب
 فما نطقوا ولو نطقوا لقالوا
 صدقت و کنت ذا رأی مصیب

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے انھیں (کفار) کو مخاطب کیا، جب ہم نے ان کے لشکر کے بیچ و بیچ حملہ کیا، کیا تم نے میری بات کو برحق نہیں سمجھا، کہ اللہ کا حکم دلوں کو پکڑنے والا ہے، تو انھوں نے کچھ نہیں کہا، اگر وہ بولتے تو کہتے کہ آپ سچے اور درست رائے والے ہیں۔
 غزوہ بدر کے موقع پر بھی انھوں نے متعدد قصیدے کہے۔ حضرت حمزہ کی دردناک شہادت پر جو قصیدہ کہا وہ ان کے رثائی کلام میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر انھوں نے بہت شاندار قصیدہ لکھا۔ اس کا ایک شعر بہت مشہور ہے:

فان أبی و والدہ و عرضی
 لعرض محمد منکم و قاء

ترجمہ: میرے والد اور ان کے والد اور میری عزت حضور ﷺ کی عزت کے لیے ڈھال ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات اور اس کے بعد پورے خلافت راشدہ کے عہد میں وہ زندہ رہے۔ حضرت عثمان کی دردناک شہادت پر بھی انھوں نے نہایت موثر مرثیہ لکھا اور اس میں حضرت علیؓ پر تنقید کی تھی۔ غالباً ان کو یہ غلط فہمی تھی کہ حضرت عثمان کے قاتلوں کو سزا دینے میں حضرت علیؓ نے مطلوبہ سرگرمی نہیں دکھائی۔

حضرت حسان تقریباً ۱۲۰ سال کی عمر پا کر ۵۴ھ میں امیر معاویہ کے دور حکومت میں فوت ہوئے۔ ان کی وفات کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ لیکن سبھی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انھوں نے اسلام سے قبل ساٹھ سال گزارے اور اسلام لانے کے بعد بھی وہ ساٹھ سال زندہ

رہے۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ مذکورہ بالا سنہ وفات زیادہ معتبر ہے۔ انھوں نے ہجرت سے دو سال قبل اسلام قبول کیا تھا۔ اس طرح یہ ۵۶ سال ہوتے ہیں اور عربی زبان میں ۵۶ کو ساٹھ کہنے کا یعنی دو چار سال کے کسر کو پورا کہنے کا رواج ہے۔

حضرت حسان اعلیٰ درجے کے شاعر تھے اور چوں کہ لمبی عمر پائی اس لیے کلام بھی ان کا سب سے زیادہ ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات میں تنوع ہے۔ قصیدہ، ہجو، مرثیہ اور نعت ان کے خاص موضوعات ہیں۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں غزل دراصل قصیدہ کے تشبیب کا حصہ ہے جس نے اپنی علیحدہ پہچان قائم کر لی۔ حضرت حسان کے قصائد میں تشبیب بلکہ بعض مراثنیٰ میں بھی تشبیب کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ گویا جس کو آج غزلیہ شاعری کہا جاتا ہے حضرت حسان کے یہاں وہ بھی کافی ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے۔ حضرت حسان کا سب سے اعلیٰ کلام وہ ہے جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی مدح و ثنا میں کہا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ صلہ کی خواہش کی وجہ سے تملق اور چا پلوسی ہے اور نہ تخیلات کی جھوٹی پرواز ہے، بلکہ بیانیہ انداز میں اعلیٰ ترین حقائق کا بیان ہے۔

نعت نبی ﷺ صرف حضرت حسان نے نہیں کہی بلکہ اس کے دور کے اور بھی بہت سے شعرا نعت گوئی کرتے تھے بلکہ مکہ میں بھی نعت کے اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔ حضرت ابوطالب کو تو نعت گوئی کا موجد کہا جاسکتا ہے کہ نعت سب سے پہلے انھوں نے ہی شروع کی تھی لیکن اس میدان میں امامت کا درجہ حضرت حسان کو حاصل ہے۔ انھوں نے نعت میں ایسے اشعار کہے ہیں جو آج بھی ضرب المثل ہیں۔ مثلاً یہ دو شعر:

و أحسن منك لم ترقط عيني
وأجمل منك لم تلد النساء
خلقت مبراً من كل عيب
كأنك قد خلقت كما تشاء

ترجمہ: مری آنکھ نے آپ ساحسین دیکھا نہیں، کسی عورت نے آپ جیسا خوبصورت جنا نہیں، آپ ہر عیب سے پاک پیدا کئے گئے ہیں، گویا کہ آپ کو پیدا کیا گیا ہے جیسا آپ چاہتے تھے۔

نعت گوئی کی تاریخ میں ان سے بہتر اور ان سے زیادہ مبنی بر حقیقت اشعار اور کسی نے نہیں کہے۔ اس نعت کے علاوہ بھی ان کا نعتیہ کلام بہت ہے اور اس میں نہایت معیاری اشعار موجود ہیں۔ یہ چند شعر بھی نعت کے بہترین نمونے ہیں:

أغر عليه للنبوه خاتم
من الله مشهود يلوح و يشهد
و ضم الاله اسم النبي الى اسمه
إذا قال في الخمس المؤذن اشهد
و شق له من اسمه ليسجله
فذو العرش محمود و هذا محمد
فامسى سراجا مستنير او هاديا

یلوح کمالاح الصقیل المہند

ترجمہ: مجھے خاتم الانبیاء کے امتی ہونے پر فخر ہے، اس واضح گواہی پر اللہ شاہد ہے جو آج تک دی جاتی ہے، اللہ نے اپنے نام کے ساتھ نبی کے نام کو ملا دیا ہے، جب کہ مؤذن پانچ مرتبہ گواہی دیتا ہے، اللہ نے اپنے نام سے ان کے نام کو نکالا ہے، پس عرش والا محمود ہے اور یہ محمد ہیں، پس وہ روشنی دینے والے چراغ اور ہدایات دینے والے ہو گئے، وہ ایسے چمکتے ہیں جیسے ہندوستان کی تلوار چمکتی ہے۔

ان کے نعتیہ اشعار میں رسول اللہ ﷺ سے محبت و عقیدت، آپ ﷺ کے فضائل و کمالات، اہل مکہ میں اور اہل عرب میں آپ ﷺ کی افضلیت اور آپ ﷺ کے لیے قربان ہو جانے کا جذبہ پایا جاتا ہے ان نعتیہ اشعار میں خوشامداندہ انداز نہیں ہے جو قصائد کی جان ہوتا ہے بلکہ فدویانہ اور عقیدت مندانہ اسلوب ہے۔

فخر و مہابت، نسب اور قبیلہ پر فخر کرنا اسی طرح دشمنوں اور مخالفوں کی ہجو کرنا اس دور کی عربی شاعری کا پامال مضمون تھا۔ حضرت حسان نے بھی اس طرح کی شاعری کی ہے۔ حضرت حسان کے فخریہ اشعار نے اسلام کی سربلندی کا سامان فراہم کیا تو ہجو یہ اشعار نے مشرکین کو منھ توڑ جواب دیا۔ غزوہ بدر کے موقع پر انھوں نے جو فخریہ قصیدہ کہا تھا وہ بڑا معیاری ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

لقد علمت قریش یوم بدر
غداة الأسر والقتل الشدید
بأنا حین تشجر العوالی
حماة الروع یوم أبی الولید
قتلنا ابنی ربیعہ یوم سا روا
إلینا فی مضاعفة الحدید

ترجمہ: قریش نے بدر کے دن جب کہ لوگوں کو قیدی بنایا جا رہا تھا اور زبردست قتل عام برپا تھا جان لیا کہ ہم جب مصیبتیں آتی ہیں، تو ہم جنگ کے شہسوار ہیں ابو الولید کے مقتل کے دن، ہم نے ربیعہ کے دونوں بیٹوں کو اس وقت قتل کیا جب کہ وہ دوہرے اسلحہ سے لیس تھے۔ ایک اور قصیدہ میں اپنے قومی فضائل کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

و کنا ملوک الناس قبل محمد
فلما اتی الاسلام کان لنا الفضل

ترجمہ: ہم محمد ﷺ سے پہلے بادشاہ تھے، جب اسلام آیا تو ہم کو ہی فضیلت حاصل ہوئی۔ نقائض اس دور کی عربی شاعری کا خاص مضمون تھا۔ حضرت حسان کے نقائض بھی بڑی شہرت رکھتے تھے بلکہ مسلمان ہونے کے بعد ان کی شاعری کا زیادہ حصہ ان نقائض پر ہی مشتمل ہے۔ اگرچہ ہجو نگاری اور نقائض ملتی جلتی اصطلاحیں ہیں، لیکن ہجو عام ہے اور نقائض ان ہجو یہ قصائد کو کہا جاتا ہے جو کسی کے جواب میں کہے گئے ہوں۔ چونکہ مشرکین اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف اشعار کے ذریعہ بھی پروپیگنڈا کرتے رہتے تھے، اس لیے حضرت حسان نے کفار و مشرکین کے ان الزامات کا جواب دیا اور کم و بیش دس سال تک وہ یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ اس

طرح کے قصائد میں غزوہ احد کا وہ قصیدہ ہے جو انھوں نے ابوسفیان بن حرب کے جواب میں کہا تھا۔ اس طرح کا ایک مشہور قصیدہ وہ ہے جو بنو تیمم کے ایک شاعر کے جواب میں کہا تھا۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

إن الذوائب من فهور إخوتهم
قد بينوا سنة للناس تتبع

ترجمہ: پیشک سرداران قریش اور ان کے بھائیوں نے لوگوں کے لیے ایک طریقہ بنایا ہے جس کی پیروی کی جاتی ہے۔
معرکہ بدر کے موقع پر جو قصیدہ انھوں نے لکھا تھا اس کی مثال نقائص کی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ عبداللہ بن زبیری نے بدر کے مشرک مقتولین کا مرثیہ لکھا تھا۔ حضرت حسان نے اس کا جواب دیا۔ یہ جواب اپنی اثر آفرینی، پرشکوہ الفاظ، ندرت بیان اور حقیقت پسندی کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ یہ قصیدہ مکہ میں بھی بہت مقبول ہوا۔ خود زبیری اس پر تلملا اٹھا اور موقع کی تاک میں تھا کہ احد کا معرکہ پیش آ گیا اور اس میں مسلمانوں کو یک گونہ ہار ہوئی تھی تو اس نے خاص حضرت حسان کو مخاطب کر کے اس قصیدہ کا جواب لکھا تھا۔ جنگ بدر کے بارے میں ہمیر نے بھی ایک قصیدہ لکھا تھا۔ حضرت حسان نے اس کا جواب بھی دیا تھا۔ اس میں ان کی حقیقت بیانی اور فیصلہ کن انداز بہت نمایاں ہے۔ چند اشعار یہ ہیں:

سقتم كنانة حهلا من سفاهتكم
إلى الرسول فجد الله يحزبها
أورد تموها حياض الموت ضاحية
فالنار موعدها والقتل لاقبها
أنتم أحابيش جمعتم بلا نسب
ائمة الفكر غرتكم طواوبها
اعتبرتم بخيل الله إذ قنلت
أهل القلب و من أردينه فيها

ترجمہ: تم نے بے وقوفی کرتے ہوئے کنانہ قبیلے کو اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں لاکھڑا کر دیا، اور اللہ کا لشکر اس کو شکست دیا، تم نے اس کو موت کے گڑھے میں لایا ہے قربان ہونے کے لیے، تو آگ ان کے وعدے کی جگہ ہے اور قتل ان کا ہونے والا ہے، تم احباش ہو جو بغیر نسب کے جمع کر دیے گئے ہو، تم کفر کے سرخیل ہو تم کو تمہارے طاغوتوں نے دھوکے میں ڈال دیا ہے۔

مرثیہ نگاری میں انھوں نے کوئی منفرد اسلوب تو نہیں نکالا بلکہ وہ بڑے مرثیہ گو بھی نہیں تھے۔ ان کے ابتدائی ساٹھ سال کی شاعری میں ایک غسانی شہزادہ کا مرثیہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی مرثیہ دستیاب نہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جیسے مرثیہ نگاری کا بند کھل گیا ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر انھوں نے متعدد مرثیے کہے اور نہایت پر درد مرثیہ کہے، جن میں یہ مرثیہ بہت مشہور ہے:

مابال عینک لاتنام کانما
 کحلت ماقیہا بکحل الارمد
 جزعا علی المہدی أصبح ثاویا
 یاخیر من وطی الحصى لاتبعد
 بابی وأمی من شہدت وفا تہ
 فی یوم الاثنین النبی المہدی

ترجمہ: میرے آنکھوں کو کیا ہو گیا کہ وہ نہیں سوری، ایسا لگتا ہے جیسے کہ آنکھوں میں مٹی کا سرمہ لگ گیا ہے، مہدی پر غم کرتے ہوئے جو
 دن ہو گیا، اے وہ جس کو کنکریوں نے چھپا دیا ہے دور مت ہو، میرے ماں باپ کی قسم پیر کے دن جس کی وصال میں شریک ہوادہ نبی رحمت ہیں۔
 اللہ کے رسول ﷺ کی وفات سے قبل حضرت حمزہ کے بارے میں بھی انھوں نے رثائی اشعار کہے۔ بعض اور صحابہ کی وفات پر بھی
 مرثیے کہے، خلفائے راشدین کی وفات پر بھی مرثیے لکھے۔ ان میں سب سے اہم اور سب سے مشہور وہ مرثیہ ہے جو انھوں نے حضرت عثمان کی
 وفات پر کہا تھا یہ مرثیہ اس میں درد و غم کے سچے بیان کے ساتھ ساتھ اثر آفرینی کے اعتبار سے بے مثال ہیں۔

حضرت حسان بن ثابتؓ اپنے عہد کے مایہ ناز شاعر تھے۔ ان کے کلام میں سب سے زیادہ قصائد اور نقائض ہیں۔ اس کے علاوہ
 نعت، مرثیہ اور قبائلی فخر و مباہات کے مضامین بھی ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ حضرت حسان کے یہاں غزلیہ شاعری کے بھی
 اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ان کے قصائد کی تشبیب میں حسن و عشق کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔

7.3.3 حطیہ

عام طور پر لوگ مدح و ثنا کو پسند کرتے ہیں اور ہجو و مذمت کو ناپسند کرتے ہیں۔ اسی طرح کسی بھی انسان کی ذاتی شخصیت، اس کی
 وجاہت، اس کی شکل و صورت کا معاملہ ایسا ہوتا ہے جس میں اس کا دخل نہیں ہوتا لیکن اس کی وجہ سے لوگ اس کی عزت کرتے ہیں اور اس کو قدر
 و منزلت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تمام منفی صفات مجتمع ہو کر ایک شخص کی صورت میں مجسم ہو جاتی ہیں۔ نہ اس میں خاندانی
 وجاہت ہوتی ہے نہ حسن صورت اور نہ حسن سیرت، زبان دکھتا ہوا انگارہ اور الفاظ چھتے ہوئے تیر بن جاتے ہیں۔ بظاہر ایسا وجود ملنا مشکل ہے،
 لیکن عربی ادب کی تاریخ میں حطیہ ایک ایسی شخصیت ہے جس کے لیے یہ سب کچھ ثابت ہے اور اس کے باوجود اس کا نام تاریخ کے روشن
 اوراق میں ثبت ہے۔

حطیہ کا اصل نام جرول ہے۔ ماں اوس بن مالک کی حبشی باندی تھی۔ اس اعتبار سے ان کو قبیلہ اوس کا ایک فرد ہونا چاہیے لیکن اس کی
 ماں کے بارے میں لوگوں کی اچھی رائے نہیں تھی اور ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حطیہ نے اپنے باپ کے بارے میں پوچھا تو ان کی
 ماں جن کا نام ضریر تھا، اپنے مالک کی بیوی کے بھائی انقم کا نام بتا دیا جو قبیلہ بنی ذہل سے تھا۔ اس طرح اس کا وجود دو قبیلوں میں بٹ گیا۔ شکل و
 صورت کے اعتبار سے وہ انتہائی لاغر اور کمزور تھا، چہرہ سوکھا ہوا اور بے رونق تھا، نچلے جڑے کی ہڈی ابھری ہوئی تھی اور چھوٹا سا قد تھا۔ عربی
 زبان میں حطیہ کا مطلب نانا قد کا آدمی ہوتا ہے۔ اس کے قد کی وجہ سے اس کو حطیہ کہتے تھے۔ غرض حطیہ کے ساتھ نہ جسمانی خوبصورتی تھی،

نہ خاندانی وجاہت، نہ اس کا کوئی قبیلہ تھا، نہ خاندان۔ شکل و صورت ایسی تھی کہ اپنے بھی دیکھ کر منہ چھپا لیتے تھے۔ اوس بن مالک کے بیٹوں نے اس کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس لیے اس کو باپ کی وراثت میں سے حصہ نہیں ملا۔ پھر وہ بنی ذہل میں انقم کی اولاد کے پاس گیا۔ ان کی بڑی مدح و ثنا کی۔ انھوں نے اس کو کھجور کے تین درخت گزارے کے لیے دے دیے جو اس کے لیے ناکافی تھے۔ اس نے پوری میراث کا مطالبہ کیا۔ یہاں بھی وہ مطالبہ پورا نہیں ہوا۔ اسی دوران اس کی شادی بھی ہو گئی اور ایک بیٹی بھی جس کا نام ملیکہ تھا جو باپ کے برخلاف بڑی خوبصورت تھی۔

حطیہ کی شخصیت جس طرح بیان کی جاتی ہے اس کی شاعری اس کے مقابلے میں اعلیٰ درجہ کی تھی۔ قافیہ وضع کرنے میں اس کو کمال حاصل تھا اور دیگر شعرا کے کلام پر اس کی گہری نظر تھی۔ اس نے دوسرے شعرا کے بارے میں جو تبصرے کیے ہیں وہ اس کی دقت نگاہ اور تنقیدی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

جیسے جیسے حطیہ کی ہجو گوئی کا چرچا ہونے لگا اس کی عزت و تکریم بھی ہونے لگی۔ لوگ اس غیر اہم شخصیت کو اہمیت دینے لگے۔ اس دوران عرب میں اسلام کا آغاز ہوا۔ سارے عرب نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کر لی۔ بنی عیس اور بنی ذہل بھی مسلمان ہو گئے۔ ان کے ساتھ حطیہ نے بھی اسلام قبول کر لیا لیکن اس کی زبان کی تیزی اسلام لانے کے بعد تیز ہی رہی۔ حطیہ کو صحابیت کا شرف نہیں مل سکا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مسلمان ہوا تھا۔ حطیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مرتد ہو گیا تھا اور دلیل کے طور پر حطیہ کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے:

أطعنا رسول الله إذ كان صادقاً

فيا عجباً ما بال دين أبي بكر

ترجمہ: ہم نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی جب کہ وہ صادق (سچے) تھے، کہ ابو بکر کے دین پر تعجب ہے یہ کچھ ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس نے ردة کی جنگوں میں حصہ لیا لیکن مرتدین کی ہار کے بعد وہ پھر مسلمان ہو گیا۔ طلحہ بنی ذہل اور دوسرے ناقدین نے اس کے اسلام کو مجبوری بتایا ہے ورنہ ان کا خیال ہے کہ وہ دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ساری زندگی طرح طرح کی خرافات میں مبتلا رہا حتیٰ کہ اس نے وصیت بھی ایسی کی جس کی امید کسی مسلمان سے نہیں کی جاسکتی۔

حضرت عمر کے دور خلافت میں حطیہ اور زبرقان کا واقعہ پیش آیا۔ زبرقان حضرت عمر کی طرف سے صدقات کی وصولی پر مامور تھے اور اپنی قوم کے سردار تھے۔ ان کے اور ان کے چچا زاد بھائیوں میں چشمک تھی۔ ان کے چچا زاد بھائی 'بنی انف ناقہ' کے نام سے مشہور تھے جو توہین آمیز لقب تھا۔ اتفاق سے ایک سال ملک میں بڑا قحط تھا۔ حطیہ اپنی بیوی اور اولاد کو لے کر عراق کی طرف جا رہا تھا۔ راستہ میں زبرقان سے ملاقات ہو گئی۔ زبرقان ان کو پہچانتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ رہنے کی پیشکش کی۔ حطیہ نے قبول کر لیا لیکن حالات ایسے ہو گئے کہ وہ زبرقان کے مخالف بھائیوں کے پاس چلا گیا اور اس نے وہاں رہ کر ایک تو ان کے لقب بنی انف ناقہ کو اپنی شاعری کے ذریعہ معزز لقب بنا دیا، دوسرے زبرقان کی ہجو میں ایک شعر کہا کہ:

دع المكارم لا ترحل لبغيتها

و اقعء فانك انت الطاعم الكاسى

ترجمہ: عزتوں کو چھوڑ دے، اس کے حاصل کرنے میں کدو کاوش مت کر، بیٹھ جا بیٹنگ تو کھانے والا ہے اور پہننے والا ہے۔
زبرقان نے اس شعر پر حضرت عمر سے شکایت کی کہ حطیہ نے میری ہجو کی ہے۔ حضرت عمر نے شعر سن کر کہا کہ اس میں تو کوئی ہجو نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت حسان کو بلا کر پوچھا تو انھوں نے فیصلہ دیا کہ اس میں بڑی ہجو ہے اس لیے حطیہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں حطیہ نے معافی نامہ لکھا اور حضرت عمر کی مدح بھی کی۔ حضرت عمر نے اس کو رہا کر دیا اور تاکید کی کہ اب کسی کی مذمت مت کرنا۔ اس نے کہا کہ میرا تو ذریعہ معاش ہی یہ ہے، اگر یہ نہ کروں گا تو کھاؤں گا کیا۔ حضرت عمر نے اس کو تین ہزار دینار دیے اور وعدہ لیا کہ اب کسی کی مذمت نہیں کرے گا۔ حطیہ جنگ قادسیہ میں شریک ہوا اور اپنے اشعار کے ذریعہ لوگوں کا حوصلہ بلند کیا۔

حطیہ کی زندگی کے بہت سے واقعات تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں مرقوم ہیں اور اس کے دیوان میں قصائد کے ساتھ بھی بعض واقعات کا تذکرہ ہے۔ بہر حال حطیہ نے خلافت راشدہ کا زمانہ دیکھا اور حضرت امیر معاویہ کے عہد میں ۵۹ھ میں وفات پائی۔
بہر حال، حطیہ اپنے دور کا عظیم لیکن تیکھا شاعر تھا۔ اس کے یہاں اگرچہ کئی صنف سخن ملتی ہیں لیکن اس کا امتیاز ہجو گوئی ہے۔ ہجو کے علاوہ مدح بھی کسی قدر ہے اور غزلیہ شاعری میں بھی اس کا قلم بڑا رواں ہے۔ غزلیہ شاعری میں جاہلی عہد کے شعرا کی طرح اس کے یہاں فحش گوئی اور عریانیٹ پائی جاتی ہے۔ وہ مجموعی طور پر حسن و عشق اور محبوب کے سراپا کا نقشہ بڑی چابکدستی سے کھینچتے ہیں۔

مدح میں بھی حطیہ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اور اس کے مدحیہ قصائد، ہجو کے مقابلے میں زیادہ نپے تلے اور سچے ہوئے یعنی مرصع ہیں۔ ہجو نگاری میں ان کے یہاں والہانہ پن ہے جب کہ مدح نگاری میں ٹھہراؤ اور طمانیت ہے۔ مدح میں اس نے کم لکھا اور جو کچھ لکھا اس کا بھی اکثر حصہ ضائع ہو گیا۔ اس وقت ان کا جو مدحیہ کلام موجود ہے اس میں ایک تو حضرت عمرؓ کی مدح میں کہا گیا قصیدہ ہے جو اگرچہ مختصر ہے لیکن بڑا موثر ہے۔ یہ قصیدہ ایک معذرت نامہ ہے اور عربی ادب میں مثالی معذرت نامہ مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دو قصیدے بنی الف نائقہ کے نام کے ہیں یہ دونوں قصیدے زمانہ جاہلیت کے قصائد کی طرح ہیں۔ اسلوب و انداز بھی وہی ہے۔ خاص طور پر امرؤ القیس کے معلقہ کی بازگشت اس میں سنائی دیتی ہے۔ اجڑی ہوئی بستیوں کا ذکر، محبوب کی یاد اور اس کے بعد روئے سخن مدوح کی طرف کرتے ہیں۔

محبوب کے سراپا کا بیان بھی عربوں کا پسندیدہ موضوع تھا۔ قصیدہ کی تشبیب کا موضوع وہی ہوتا تھا۔ حطیہ نے بھی اپنے محبوب کا سراپا اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے اوقات کو نہایت رنگین انداز میں بیان کیا ہے۔ حطیہ نے اپنی ایک محبوبہ ام معبد کا نام لیا ہے۔ غالباً اس کی غزلیہ شاعری کی محرک ام معبد ہی ہے۔ اس کے انداز و نیاز کو بیان کرنے میں اس نے کبھی تو پاک بازی کی حد کر دی ہے اور کبھی عریانیٹ اور فحش نگاری میں زمانہ جاہلیت کے شعرا کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس کی پاک باز شاعری کے چند اشعار یہ ہیں:

ولمارأت من في الرحال تعرضت

حياءً و صدت تتقى القوم باليد

فتبتنا ولم نكذبك لو أن ليلنا

إلى الحول لم نملل وقلنا له ازدد

و في كل ممسى ليلة أو معرس

خیال یوافی الרכب من أم معبد

ترجمہ: جب اس نے کجاوے میں موجود لوگوں کو دیکھا تو وہ حیا کے مارے ہٹ گئی اور قوم سے اپنے ہاتھ کے ذریعے سے بچنے لگی، ہم نے رات گزاری اور ہم نے آپ کو جھوٹ نہیں کہا، اگر رات سالِ دجتنی طویل بھی ہوتی تو ہم نہیں اکتاتے اور ہم زیادہ کی آرزو رکھتے، ہر رات گزارنے والے اور رات کو اترنے والے کا یہ خیال ہے کہ امِ معبد کے قافلے والوں کے خیال سے میل کھاتا ہے۔

حطیہ کی شاعری میں حکمت و دانش، زندگی کے حقائق اور اخلاق و کردار کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ اس کے بعض اشعار بڑے حکیمانہ ہیں اور بعض اشعار میں مذہب کی بھی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

ولست أرى السعادة جمع مالٍ

ولكن التقي هو السعيد

و تقوى الله خير الزاد ذخرا

و عند الله للاتقى مزيد

وما لا بد أن ياتى قريب

ولكن الذي يمضى بعيد

ترجمہ: میں مال کو جمع کرنے میں سعادت نہیں سمجھتا، لیکن متقی ہی ہے جو خوش قسمت ہوتا ہے، اللہ کا تقویٰ ذخیرہ اندوزی کا بہترین تحفہ ہے، اور اللہ کے نزدیک متقیوں کے نزدیک مزید انعامات ہیں، جو آنے والا ہے وہ قریب ہے لیکن جو گزر گیا بہت دور ہے۔

ان اشعار میں حطیہ نے مذہب سے لگاؤ اور اللہ پر بھروسے کا تذکرہ مومنانہ شان سے کیا ہے۔ دراصل حطیہ ستم ظریف تھے۔ ان کی نظر زیادہ تر ان عوارض اور کمیوں پر رہی جو ان کو فطری طور پر ملی تھیں۔ بدل میں فطرت نے جو اس کو بے پناہ قیمتی دولت دی تھی اس کا احساس پس منظر میں چلا گیا۔ اسی لیے کمیوں کا زیادہ رونا رویا ہے اور مننی رحمان کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا۔ اس کے یہاں معاشرہ سے بغاوت اور حالات کا شکوہ زیادہ ملتا ہے۔

7.3.4 الخنساء

حضرت خنساء عرب کی عظیم ترین خاتون شاعر گزری ہیں۔ عربوں میں شاعری کا عام رواج تھا۔ بہت سی خواتین بھی شاعری کرتی تھیں اور ان کے اشعار متفرق طور پر کتابوں میں ملتے ہیں لیکن حضرت خنساء پہلی باضابطہ صاحب دیوان شاعرہ ہیں۔

حضرت خنساء کا نام تھامر تھا۔ قبیلہ مضر کے عمرو بن حارث خنساء سلمیٰ کی بیٹی تھیں۔ ان کے دو بھائی تھے معاویہ اور صخر۔ دونوں بڑے وجیہ اور ابھرتے ہوئے نوجوان تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے والد کو ان پر اتنا ناز تھا کہ میلہ میں ان کو لے جاتے اور ان کے ہاتھ پکڑ کر کہتے کہ میں مضر کے دوسب سے اچھے جوانوں کا باپ ہوں۔ اہل قبیلہ کو بھی ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ حضرت خنساء بھی اپنے علم و فضل اور شاعرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے قبیلہ میں بہت مقبول تھیں اور ان کی صلاحیتوں کے ساتھ ان کے حسن و جمال کا بھی چرچا تھا۔ ان کے بہت سے رشتے

آئے لیکن انھوں نے اپنے قبیلہ کے ایک نوجوان روادح بن عبدالعزیز سلمی سے شادی کر لی۔ اس سے ایک بیٹا پیدا ہوا لیکن اس کے بعد روادح کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے انھوں نے عبدالعزیز سے شادی کی۔ لیکن عبدالعزیز فضول خرچ بھی تھا اور شراب بھی پیتا تھا، اس نے اپنا بھی سارا مال برباد کر دیا۔ خنساء کے بھائی سخرنے کئی مرتبہ مدد کی لیکن عبدالعزیز کی عادتیں نہیں سدھریں اور پھر اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد مرداس بن عامر سے شادی کی لیکن یہ شادی بھی زیادہ دن نہیں چلی۔ ان سے تین بچے ہوئے اور شوہر کی وفات ہو گئی۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ انھوں نے چوتھی شادی بھی کی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ صحیح ہوتا ہے حضرت خنساء رفیق حیات کے معاملے میں بہت خوش نصیب نہ ثابت ہو سکیں انھوں نے تین شادیاں کیں اور تینوں شوہر فوت ہو گئے جنھوں نے حضرت خنساء کو بہت سکھ بھی نہیں دیے تھے۔ اس کے ساتھ دو حادثے اور ان پر ایسے گزرے جن کی کسک وہ ساری زندگی جھیلی رہیں۔ وہ حادثے ان کے چہیتے بھائیوں کی موت کے تھے۔ خنساء کے ایک بھائی معاویہ کو قبیلہ مرہ کے دو نوجوانوں نے قتل کر دیا تھا۔ حضرت خنساء کو اس کا شدید قلق ہوا۔ دوسرے بھائی نے اس کا بدلہ لے لیا لیکن وہ بھی عین جوانی میں بری طرح زخمی ہو گیا اور زندگی کی بازی ہار بیٹھا۔ حضرت خنساء کو اپنے بھائیوں سے شدید محبت تھی۔ وہ یہ غم برداشت نہ کر سکیں اور ان کی یاد میں مستقل روتی رہتی تھیں۔ اسی طرح روتے روتے ان کی پینائی بھی متاثر ہوئی۔

قبیلہ مضر کے لوگ اسلام لائے تو یہ بھی مسلمان ہو گئیں اور صحابیت کا شرف بھی ان کو حاصل ہوا۔ ان کے چار بیٹے تھے وہ جوان ہو چکے تھے۔ جنگ قادسیہ میں وہ چاروں شریک ہوئے اور چاروں اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے۔ بوڑھی ماں نے جب ان کی شہادت کی خبر سنی تو زبان سے ارشاد فرمایا ”الحمد لله الذي شرفني بقتلهم“۔

حضرت خنساء کی وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قول کے مطابق ان کی وفات حضرت عثمان کے عہد خلافت میں سنہ ۲۴ھ میں ہوئی۔

حضرت خنساء اپنے قبیلہ کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو کچھ اپنے اشعار اللہ کے رسول ﷺ کو سنائے۔ آپ ﷺ انہیں پسند فرمائے اور مزید سننے کی خواہش کی۔ حضرت خنساء کی شاعری کے لیے یہ سب سے بڑا اعزاز تھا۔ اس کے علاوہ بھی اجلہ صحابہ میں ان کی شاعری مقبول تھی۔ حضرت حسان کے بعض اشعار پر انھوں نے اصلاح بھی دی تھی۔

حضرت خنساء کے لیے شاعری ذریعہ اظہار تھی۔ یہ نہ ان کا ذریعہ معاش تھا اور نہ انھوں نے دیگر شعرا کی طرح شاعری کو اپنی پہچان بنانے کا ذریعہ بنایا تھا بلکہ ان کے لیے شاعری صرف واردات قلبی کا بیان تھا۔ ان کے سرمایہ شاعری میں زیادہ تر مرثیہ ہیں اسی وجہ سے ان کو فن مرثیہ میں عرب کی سب سے بڑی شاعرہ کہا جاتا ہے۔ اپنے بھائیوں خاص طور سخرنے کی موت سے وہ بہت دل برداشتہ ہوئیں اور ان کی یاد میں انھوں نے مرثیے کہے۔ اس کے شوہر مرداس بن عامر کی وفات بھی اس کے لیے بڑا حادثہ ثابت ہوئی اور ان کی وفات کے بعد بھی حضرت خنساء نے متعدد مرثیے کہے جو ان کے بہترین مرثیہ میں شمار ہوتے ہیں۔ مرداس کی وفات پر انھوں نے جو مرثیہ لکھا تھا اس کے چند اشعار یہ ہیں:

ألا اختار مزداسا على الناس قاتله
ولو عاده كُناتة و حلاته
فلما راه البدر أظلم كاسفا

أرن شواذ بطنه وسوائله
 و فضل مرداسا علی الناس حلمه
 و إن کل هم همه فهو فاعله
 متی تعادل ماجدا یعتدل به
 کما عدل المیزان بالكف ثاقله

ترجمہ: مرداس کے قاتل نے تمام لوگوں میں سے اسی کا انتخاب کیا،۔۔۔ میں نے جب چاند کو دیکھا تو وہ گرہن سے تاریک ہو چکا تھا، اور شواذ پہاڑ اس کی وادیاں اور اس کے جھرنے رورہے ہیں، بردو باری نے مرداس کو تمام لوگوں پر فضیلت دیدی، اور وہ اپنے ہر ارادے کو کر گزرتا ہے، بزرگی کو جب کبھی ناپا جائے گا تو اسی سے ناپا جائے گا جس طرح کہ ترازو کو اس کے رطل سے نوازا جاتا ہے۔

شوہر کے ساتھ فطری محبت انسانی معاشرہ کی بڑی حقیقت ہے۔ اس کے ساتھ زن و شوہر ایک دوسرے کے سہارے اور ایک دوسرے کے ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی کا بچھڑ جانا بڑا حادثہ ہوتا ہے اور خاص بیوی کے لیے شوہر کی جدائی کا غم اور بڑا ہوتا ہے۔ لیکن حضرت خنساء کو جو تعلق اپنے بھائیوں سے تھا ایسا لگاؤ شوہر سے بھی نہیں تھا۔ خاص طور پر اپنے سوتیلے بھائی صخر کی موت کا تو انھیں اتنا سخت صدمہ ہوا کہ ان کی یاد میں زندگی بھر روتی رہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت خنساء حضرت عائشہ سے ملنے آئیں۔ اس وقت وہ بوڑھی ہو چکی تھیں اور لکڑی کے سہارے سے چلتی تھیں۔ حضرت عائشہ نے پچان لیا اور پوچھا کہ تمہاری یہ حالت کیوں ہو گئی؟ حضرت خنساء نے جواب دیا صخر کی وجہ سے۔ اس کے بعد حضرت خنساء نے صخر کے احسانات گنوائے۔

صخر کے علاوہ اپنے حقیقی بھائی معاویہ کے لیے بھی انھوں نے بہت سے مرثیے کہے۔ ناقدین کا خیال ہے کہ اگرچہ معاویہ کے مرثیے بھی اعلیٰ درجہ کے ہیں لیکن صخر کی یاد میں انھوں نے جو مرثیے کہے ہیں وہ اپنی اثر آفرینی اور درد و غم کی حقیقی تصویر کھینچنے میں بے مثال ہیں۔ حضرت خنساء کی اصل شاعری تو مرثیہ نگاری ہے لیکن ان کے یہاں حکمت و دانش اور زندگی کے حقائق کا بیان بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ ملتا ہے۔ حضرت خنساء کی شاعری کا بڑا حصہ مرثیہ نگاری پر مشتمل ہے۔ لیکن ان کے مرثیے جہاں درد و غم کی ہو بہو تصویر کشی کرتے ہیں وہیں ان اشعار میں ان کیفیات اور ان وسائل کا بھی بڑا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے جن کے ذریعہ انسان اپنے غم کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے آپ کو بھلاتا ہے اور غموں کو بھلا دیتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بدوی زندگی اور اس کے انداز اور وسائل حیات کا بھی مرقع سامنے آ جاتا ہے۔

اسلام لانے کے بعد ان کے درد و غم کم تو نہیں ہوئے لیکن اللہ کی رحمت اور اس کی مغفرت کی امید نے ان کا حوصلہ بڑھا دیا اور انھوں نے غموں کو صبر و شکر کے گھونٹ کے ساتھ جھیلنا شروع کر دیا اور بڑی مجاہدہ خاتون بن گئیں۔ جنگ قادسیہ میں ان کی قربانیاں بے مثال ہیں۔

7.3.5 نابغہ جعدی

مخضرمی شعرا میں نابغہ جعدی کا نام اہمیت سے لیا جاتا ہے۔ وہ اچھے شاعر اور بڑے باہمت مجاہد تھے۔ طویل عمری میں بھی وہ بہت سے لوگوں پر سبقت لے گئے۔ ان کی عمر ایک سو بیس سال بتائی جاتی ہے۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے ابتدائی عہد اسلامی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کے عہد میں ان کی وفات ہوئی۔

نابغہ کا اصل نام عبداللہ بن عدس بن جعدہ ہے۔ اس لیے نام کے ساتھ جعدی لکھا جاتا ہے۔ اندازہ کے مطابق ظہور اسلام سے ۵۵ سال قبل پیدا ہوئے۔ مورخین نے ان کی طویل عمری کے لیے ان کے اشعار سے شواہد جمع کیے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی اس کی عمر ۱۲۰ سال رہی ہوگی۔

اسلام سے قبل اس دور کے دیگر شعرا کی طرح قصیدہ گوئی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور نحی بادشاہوں کے یہاں جا کر مدح و ستائش کرتے اور صلہ پاتے۔ اور انعام و اکرام کے سہارے اپنی زندگی گزارتے تھے۔

نابغہ کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ دین حنیف کے پیروکار تھے۔ انھوں نے اسلام سے پہلے کبھی بھی نہ بت پرستی کی اور نہ فال نکالا جو اسلام میں حرام ہے اور جس کو قرآن نے ازلام کہا ہے۔ وہ روزے بھی رکھتے تھے اور عرب کی دوسری برائیوں شراب، رندا اور فحش و عریانیت سے بھی ہمیشہ دور رہے۔ وہ اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا متبع بتاتے تھے۔ ایسے شخص کے لیے اسلام نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ لیکن بد قسمتی سے ۹ ہجری تک ان کا براہ راست اسلام سے واسطہ پیش نہیں آیا۔ نابغہ کے زمانہ جاہلیت کا ایک شعر ہے:

الحمد لله لا شريك له

من لم يقلها ففسه ظلما

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس کا کوئی شریک نہیں، جو ان تعریفات کا قائل نہیں پس اس کا دل تاریک ہے۔

نابغہ نے زمانہ جاہلیت میں طویل زمانہ پایا اور کافی شاعری کی۔ اسی دور میں ایک مرتبہ ان کی زبان شاعری کے لیے ایسی بند ہوئی ہے کہ باوجود کوشش کے وہ شعر نہیں کہہ پائے۔ ۹ ہجری میں جب ان کا قبیلہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا تو اللہ نے ان کی زبان شعر گوئی کے لیے دوبارہ کھول دی اور شان رسالت میں ایک قصیدہ کہا۔ اس قصیدہ کو سن کر روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو دعا دی کہ خدا ساری عمر تمھارے دانت سلامت رکھے۔ یعنی تم پو پلے نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے پڑھنے کا انداز ایسا ہو کہ اگر دانت گر جاتے تو اسلوب باقی نہیں رہتا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا دی ہو۔

نابغہ نے دربار رسالت میں جو قصیدہ پڑھا تھا وہ بہت طویل ہے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ اس قصیدہ میں دو سو شعر تھے اور وہ تمام شعر انھوں نے رسول اللہ کو سنائے اور آپ نے بڑی توجہ سے سنے۔ اس قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں:

أتيت رسول الله إذا جاء بالهدى

و يتلو كتابا كالمجرة نيرا

تذکرت والذکری تهیج للهوی

و من حاجة المحزون أن يتذکرا

ترجمہ: میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، جب کہ وہ ہدایت کا پیغام لے کر آئے، اور ایسی کتاب کی تلاوت کرتے ہوئے آئے جو روشن کہکشاں کی طرح ہے، میں نے ان کو یاد کیا، اور کسی کی یاد عشق کو برا بیچتے کرتا ہے، اور غم زدہ شخص کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ محبوب

کو یاد کرے۔

نابغہ اس قصیدہ میں جب اس شعر پر پہنچے:

بلغنا السماء مجداً وجوداً وسؤداً

وانا لنرجو فوق ذلك مظهرا

ترجمہ: ہم بزرگی، سخاوت اور قیادت کے اعتبار سے آسمانوں پر پہنچ گئے، اور اس سے بھی اوپر جو مظہر ہے وہاں تک پہنچنا چاہتے

ہیں۔

یہ شعر سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بھائی وہ مظہر کہاں ہے، تو نابغہ نے جواب دیا کہ جنت۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

انشاء اللہ کہو۔

اس قصیدہ کے درج ذیل شعر پر رسول اللہ ﷺ نے ان کو دعویٰ تھی:

ولا خیر فی حلم إذا لم تکن له

بوا در تحمی صفوہ ان یکدر

ترجمہ: اس بردباری میں کوئی خیر نہیں ہے جب کہ اس میں غیض و غضب نہ ہو، جو اسے مکدر ہونے سے بچالے۔

نابغہ کا یہ قصیدہ بہت مقبول ہے۔ متعدد لوگوں نے اس کو نقل کیا ہے اور ان کے دیوان میں بھی شامل ہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ یہ

قصیدہ دراصل انھوں نے زمانہ جاہلیت میں کہا تھا پھر اسلام لانے کے بعد اس قصیدہ کو مزید بڑھا کر دو سوا شعرا کا کر دیا۔ اس لیے اس قصیدہ میں دونوں انداز کی جھلک موجود ہے۔ دوسرے حصہ میں قرآنی تعلیمات اور اسلام کا واضح اثر دکھائی دیتا ہے۔

نابغہ نے مدینہ آ کر اسلام قبول کیا اور پھر مدینہ میں ہی مستقل بود و باش اختیار کر لی۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے بہادر تھے۔

انھوں نے متعدد جنگوں میں شرکت کی، خاص طور پر ایران کی جنگوں میں شریک رہے۔ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں انھوں نے اپنے وطن جانے کی اجازت چاہی لیکن حضرت عثمان نے اجازت نہیں دی اور ان کو سمجھایا کہ ہجرت کرنے کے بعد واپسی درست نہیں ہے۔ لیکن وہ نہیں مانے اور اپنے علاقے میں چلے گئے۔

نابغہ کا علاقہ جو باد یہ کہلاتا ہے، وہ عراق کے ماتحت تھا۔ وہاں کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری تھے ان سے کسی اختلاف کی بنا پر ان کی

ہجو کہہ دی اس پر حضرت ابوموسیٰ اشعری نے ان کو سزا دی۔ وہاں سے بڑی مشکل سے رہائی ملی۔

امیر معاویہ اور حضرت علی کے اختلاف میں وہ حضرت علی کے پرزور حامی تھے۔ حالانکہ کافی ضعیف ہو چکے تھے لیکن صفین کی جنگ میں

شریک ہوئے۔ حضرت علی کی مدح میں اور امیر معاویہ کی ہجو میں قصیدے بھی لکھے۔ حضرت علی کی شہادت کے بعد جب اقتدار امیر معاویہ کو

حاصل ہو گیا تو کہتے ہیں کہ انھوں نے مدینہ کے حاکم مروان کو حکم دیا کہ نابغہ کا مال و اسباب ضبط کر لیا جائے۔ جب نابغہ کو اس کی اطلاع ملی تو وہ

امیر معاویہ کے پاس آئے اور انھوں نے کچھ اشعار پڑھے جن میں سے دو شعر یہ تھے:

فإن تاخذ و أهلی و مالی بظنّة

فإني لجزاب الرجال معجرب
صبور على ما يكره المرء كله
سوى الظلم أنى إن ظلمت سا غضب

ترجمہ: اگر تم میرے مال اور خاندان والوں کو کسی خام خیالی میں لیتے ہو، تو میں لوگوں میں سب سے زیادہ تجربہ کار ہوں، میں ان تمام چیزوں پر صبر کرنے والا ہوں جس کو انسان ناپسند کرتا ہے، سوائے ظلم کے کیوں کہ کوئی مجھ پر ظلم کرتا ہے تو میں غصہ ہو جاتا ہوں۔
امیر معاویہ نے فوراً اپنا سابقہ حکم واپس لے لیا۔ کچھ لوگوں نے کہا بھی کہ آپ تو حاکم وقت ہونے کے باوجود ان کی دھمکیوں سے ڈر گئے؟ امیر معاویہ نے کہا کہ یہ نابغہ ہیں۔ مجھے سارے عرب میں رسوا کر دیں گے۔

نابغہ کی زندگی کا ایک واقعہ اور ملتا ہے۔ وہ حضرت عبداللہ بن زبیر کے عہد کا ہے۔ یزید کی وفات کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر نے خلافت قائم کی۔ اگرچہ مروان اور عبدالملک کے مقابلے میں ان کو شکست ہوگی لیکن پھر بھی کئی سال ان کی خلافت قائم رہی۔ ان کے زمانے میں نابغہ ان سے ملنے گئے اور ان کی مدح میں قصیدہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے قصیدہ کی وجہ سے نہیں بلکہ تمہارے مسلمانوں کے مال میں دوسرے حقوق ہیں ان کی وجہ سے ہم تمہاری مدد کریں گے اور ان کو کافی مال و دولت عطا کی۔

نابغہ کی وفات ان کے اپنے علاقہ میں سنہ ۶۵ ہجری کے آس پاس ہوئی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۱۲۰ سال کے قریب تھی۔
نابغہ مختصری شعرا میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ عہد جاہلیت میں انھوں نے راگ رنگ اور حسب و نسب پر فخر اور قومی بہادری کے گن گائے۔ اپنے قبیلہ کے بہادروں اور ان کی جنگ جوئی کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ یہ عام موضوعات ہیں لیکن نابغہ کا انداز بیان بڑا منفرد ہے۔ نابغہ نے نہ صرف اپنے قبیلہ کے بہادروں بلکہ ان کے گھوڑوں کی بھی بہادری کے گن گائے ہیں اور میدان جنگ میں ان کے قبیلہ کے بہادروں کی خون ریزی کا نقشہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ہمارے بہادر میدان جنگ میں اس بے جگری سے لڑتے ہیں کہ ان کے گھوڑے خون میں تر ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے ہم لال گھوڑوں کو کالا اور کالے گھوڑے کو لال سمجھنے لگتے ہیں۔

نابغہ کے کلام میں مبالغہ آرائی کا عنصر بہت بڑھا ہوا ہے۔ خاص طور پر میدان جنگ کے مناظر بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس میں بہادروں کے مقابلے، ان کی تلواروں کی جھنکار، نیزوں کی بوچھاڑ اور تیروں کی بارش میں مرد میدان کس طرح ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں اور ان کے قبیلے کے لوگ کس طرح میدان جنگ میں شیروں کی طرح بہادری سے جنگ کرتے ہیں وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ نابغہ کے یہاں مبالغہ میں منظر کشی کا عنصر بھی اوروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر جنگی مناظر کو تو وہ اپنی شاعری میں مجسم کر دیتے ہیں۔

اسلام کے بعد ان کی شاعری میں اخلاقیات اور قرآن و سنت کی تعلیمات کا عنصر غالب آ گیا۔ شعر کے مضامین میں تقویٰ، طہارت اور آخرت کی فکر کے مضامین باندھنے لگے، نعت نبی بھی انھوں نے کہی اور خلفائے راشدین کے زمانے میں مرثیے اور قصیدے بھی لکھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اسلامی تعلیمات پر غور و فکر کرنے سے ان کے کلام میں فلسفیانہ سوچ اور حیات و ممات کے مسائل پر غور کرنے کی بھی عادت پڑی۔
ان کے چند شعر یہ ہیں:

وجا هدث حتی ما أَحْسُ و من معی
سهیلاً إذا ما لاح ثُمَّتْ غَوْرًا
أَقِیْمُ عَلَی التَّقْوِی و أَرْضِی بفعْلِهَا
و کُنْتُ مِنَ النَارِ المَخْوَفَةِ أَوْجِرًا

ترجمہ: میں نے جہاد کیا یہاں تک کہ جو میرے ساتھ تھے، ہم نے ایک ستارے کو محسوس کیا جو چمکا اور پھر دشمنوں کو شکست دیے دیا، میں تقویٰ پر قائم رہوں گا اور اس کے مطابق کام کروں گا، کیوں کہ میں مہیب آگ سے ڈرتا تھا۔
دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی پائیداری کے بارے میں چند شعر یہ ہیں:

و لا تَجْرَعَا إِنْ الحِیَاةُ ذَمِیْمَةٌ
فَخَفَا لِرُوعَاتِ الحِوَادِثِ أَوْقِرَا
وَإِنْ جَاءَ أَمْرٌ لَا تُطِیقَانِ دَفْعَهُ
فلا تَجْزَعَا مِمَّا قَضَى اللهُ وَاصْبِرَا
تَهِیجِ البِکَاءِ وَالنَّدَامَةَ ثَمَّ لَا
تُغَیِّرُ شَیْئًا غَیْرَ مَا کَانَ قُدْرًا

ترجمہ: تم دونوں پریشان مت ہو، بلاشبہ زندگی حقیر ہے، حوادثِ زمانہ کے سامنے نرم ہو جا، اور اگر تجھ کو کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو جائے، جس کو حل کرنے کی تو طاقت نہیں رکھتا تو اللہ کے فیصلے پر پریشان مت ہو اور صبر کا دامن تھامے رکھ، تو رونے کو اور پشیمانی کو برا سمجھتے کرے گا، اور جو کچھ مقدر میں لکھا جا چکا ہے وہ تبدیل نہیں ہوگا۔

نابغہ کے بارے میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ وہ شاعر تو بہت بڑے تھے اور میدان کارزار میں بہادر بھی تھے لیکن میدانِ شعر میں کمزور تھے۔ اگر کوئی شخص شاعری میں ان کا مقابلہ کرتا تو میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ تذکرہ نگاروں نے متعدد نام لکھے ہیں جن کے ساتھ ان کے مباحثے ہوئے اور بہت جلد انھوں نے ہار مان لی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ انھوں نے کسی کی مذمت یا ہجو کی جب اس کی طرف سے کسی نے جواب دیا تو فوراً ہار مان لی اور میدان چھوڑ دیا۔ اس کمزوری کے باوجود وہ عظیم شاعر تھے۔ قصیدہ نگاری میں وہ اعلیٰ درجہ کے شاعروں میں تھے اور گھوڑے کے اوصاف بیان کرنے میں تو ان کو خصوصی مہارت حاصل تھی۔ اصمعی نے لکھا ہے کہ دورِ جاہلیت کے شعرا میں صرف دو شاعر ایسے ہیں جن کو گھوڑے کے اوصاف ہو بہو بلکہ مبالغہ آمیز انداز میں بیان کرنے کے اندر سب سے زیادہ مہارت ہے۔ ان میں ایک نابغہ جعدی ہیں۔
نابغہ کی اولیات میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے اپنے قصائد کی تشبیب اور اپنی عشقیہ شاعری میں اپنے محبوب کی پردہ داری بھی کی ہے۔ وہ اپنے محبوب کا نام نہیں لیتے بلکہ ایسا نام لیتے ہیں جس سے کنایہٴ محبوب کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے۔ دراصل عرب شعرا اس معاملے میں بڑے منہ پھٹ تھے وہ سرعام اپنے محبوب کا نام لیتے تھے اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی منظر کشی بھی کرتے تھے۔ نابغہ نے دوسرے حصے کو تو باقی رکھا لیکن محبوب کو پردہ میں چھپا دیا۔ اس طرح کی شاعری میں وہ منفرد شخصیت ہیں اور عہدِ جاہلیت کی شاعری میں اس کنایے کی

7.4 اکتسابی نتائج

عربی شاعری کو بالعموم تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک عہد جاہلیت کے شعرا، دوسرے وہ شعرا جنہوں نے جاہلیت کے عہد میں ہوش سنبھالا پھر اسلام قبول کر کے عہد اسلام میں بھی شاعری کی اس طرح کے شعرا کو مخضرمی شعرا کہا جاتا ہے۔ مخضرم کا مطلب ہوتا ہے ملانے والا۔ یعنی یہ شعرا ایسے تھے جنہوں نے دو عہدوں کو ملایا۔ تیسرا دور عہد اسلامی کے شعرا کا دور ہے۔

اس یونٹ میں ہم نے مخضرمی شعرا میں سے چند کا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں ایک نام کعب بن مالک انصاری کا ہے۔ حضرت کعب بن مالک بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کی شاعر کے خاص موضوعات میں نعت رسول، مرثیہ اور وصف نگاری ہے۔ ان کے یہاں غزل بالکل نہیں ہے ان کے قصائد تشبیب سے خالی ہوتے ہیں۔ دوسرے شاعر حضرت حسان ہیں جن کو شاعر الرسول اور شاعر المنی کا خطاب حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے خاص شاعر ہیں۔ ان کا بنیادی کام کفار و مشرکین کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہے گئے نازیبا الفاظ کا جواب ہے۔ اس کے علاوہ نعت گوئی میں وہ بے مثال تھے۔ بعض لوگ ان کو معلقات کے درجہ کا شاعر مانتے ہیں۔ تیسری شخصیت حطیہ کی ہے۔ یہ مخضرمی شعرا میں اپنی گونا گوں خصوصیات کی وجہ سے منفرد ہیں۔ اصلاً یہ ہجو گوئی کے شاعر تھے اور انہوں نے زیادہ ہجو و مذمت ہی لکھی ہیں۔ ان کے قصائد میں حضرت عمرؓ کی تعریف میں کہا ہوا قصیدہ زیادہ مقبول ہے۔ حطیہ کی عشقیہ شاعری بھی عربی زبان کی بہترین شاعری مانی جاتی ہے۔ چوتھی شخصیت حضرت خنساء کی ہے۔ یہ بڑی جلیل القدر صحابیہ ہیں اور مخضرمی عہد کی سب سے بڑی شاعرہ ہیں۔ ان کا کلام بنیادی طور پر مرثیہ پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنے دو بھائیوں کی یاد میں متعدد مرثیے کہے ہیں جو اپنی اثر آفرینی اور درد و غم کی مختلف کیفیات کی تصویر کشی میں بے مثال ہیں۔ حضرت خنساء نے نعت بھی لکھی ہیں۔ تذکروں میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت خنساء سے شعر سنا کرتے تھے۔ پانچویں شخصیت نابغہ جعدی کی ہے۔ یہ بھی مخضرمی عہد کے بڑے شاعر تھے۔ ان کے موضوعات بالعموم وہی ہیں جو اس دور کے دیگر عرب شعرا کے موضوعات تھے۔ بہترین شاعر تھے، اور ان کو گھوڑے کے اوصاف بیان کرنے میں خصوصی مہارت تھی۔ عربی شاعری میں ان کی بعض اولیات بھی ہیں۔

7.5 نمونے کے امتحانی سوالات

- ۱۔ مخضرمی لفظ سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔
- ۲۔ حضرت کعب بن مالک کی حیات اور شعری خصوصیات بیان کیجیے۔
- ۳۔ حضرت حسان بن ثابت کی حیات اور شعری خصوصیات بیان کیجیے۔
- ۴۔ حطیہ کی حیات اور شعری خصوصیات بیان کیجیے۔
- ۵۔ حضرت خنساء کی حیات اور شعری خصوصیات بیان کیجیے۔
- ۶۔ حضرت نابغہ جعدی کی حیات اور شعری خصوصیات بیان کیجیے۔

7.6 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

- | | |
|----------------|---------------------------------|
| حنا فاخوری | ۱۔ الجامع فی تاریخ الأدب العربی |
| ڈاکٹر شوقی ضیف | ۲۔ تاریخ الأدب العربی (جلد دوم) |
| عمر فروخ | ۳۔ تاریخ الأدب العربی (جلد اول) |
| احمد حسن زیات | ۴۔ تاریخ الأدب العربی |
| عبدالحلیم ندوی | ۵۔ عربی ادب کی تاریخ (جلد دوم) |

اکائی 8 الخطابة في العهد الإسلامي (عصر اسلامی میں خطابت)

اکائی کے اجزا:

- | | |
|------------------------------|-------|
| مقصد | 8.1 |
| تمہید | 8.2 |
| خطابت کا تعارف | 8.3 |
| عصر اسلامی کے بڑے خطبا | 8.4 |
| حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم | 8.4.1 |
| حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ | 8.4.2 |
| حضرت علی رضی اللہ عنہ | 8.4.3 |
| سحبان وائل | 8.4.4 |
| زیاد بن ابیہ | 8.4.5 |
| حجاج بن یوسف ثقفی | 8.4.6 |
| شیخ حسن بصری | 8.4.7 |
| اكتسابی نتائج | 8.5 |
| فرہنگ | 8.6 |
| نمونے کے امتحانی سوالات | 8.7 |
| مطالعے کے لیے معاون کتابیں | 8.8 |

8.1 مقصد

اس اکائی سے آپ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ عصر اسلامی کی خطابت میں مقصد، اسلوب، مضامین اور تاثیر کے لحاظ سے کیا فرق آیا اور اس زمانہ میں بڑے بڑے خطبا کون کون تھے اور ان کی خصوصیات کیا تھیں، عربی ادب میں انھوں نے کیا اثرات ڈالے اور اس کو کس طرح متاثر کیا۔

8.2 تمہید

خطابت کلام کا لازمی جزو ہے اور عربی زبان میں تو اس کی بہت زیادہ اہمیت رہی ہے۔ عصر اسلامی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی بلاغت اور اس کے سحر نے ایک زمانہ کو متاثر کیا۔ قرآن پاک کا اسلوب بھی خطابی ہے۔ قرآن وحدیث یہ دونوں عربی زبان کے ایسے لازوال نمونے ہیں جن پر کبھی اضمحلال طاری نہ ہوگا، نہ ان کی تاثیر میں کمی آئے گی۔ ان دونوں کے زبردست اثرات عربی زبان پر پڑے۔ قرآن و حدیث نے مضامین کے اعلیٰ اور لازوال خزانے عربی کی جھولی میں ڈال دیے۔ ان دونوں نے اس کو اتنی حکمتیں، وسعتیں، برکتیں، مضامین کی گہرائیاں، معانی کی پہنائیاں عطا کیں کہ جن سے عربی زبان ثروت مند اور بے نظیر بن گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ و تابعین نے اس فن کو آگے بڑھایا اور حسن بصری، سبحان وائل اور حجاج بن یوسف کی خطابت میں یہ اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ ان سب کی تفصیلات آنے والے صفحات میں آپ کے سامنے آئیں گی۔

8.3 خطابت کا تعارف

استاذ احمد حسن زیات فن خطابت کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں:

”شاعری کی طرح فن خطابت کا تانا بانا بھی خیالات وافکار اور فصاحت و بلاغت ہیں۔ یہ آزادی وشجاعت، ہمت واولوالعزمی کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا، دلائل سے (مخالف کو) خاموش کرنے اور اہم کاموں پر ابھارنے اور اکسانے کا یہ ایک کارگر حربہ ہے۔ اس فن کے لیے چرب زبانی، خوش بیانی اور برجستہ گوئی لازمی شرائط ہیں۔“ (تاریخ ادب عربی، اردو، ترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی، ص ۴۳، البلاغ پہلی کیشنز، 2015)

جاہلی زمانہ کے عربوں میں خطیب کی بڑی اہمیت تھی۔ اگر شاعر عرب کا دیوان تھے تو خطیب قبیلہ کا نخر۔ خطیب اپنی تقریر میں دل نشین اسلوب، سحر بیانی، سلیس ورواں الفاظ، صاف صاف باتیں، چھوٹے چھوٹے ہم وزن جملے، مسجع و مقفلی عباراتیں، ضرب الامثال اور کہاوتیں استعمال کرتے۔ وہ مخاطب کو اپنا مضمون ذہن نشین کرنے کے لیے تقریروں میں اختصار مد نظر رکھتے۔ دستور یہ تھا کہ خطیب اونچی جگہ کھڑا ہوتا یا سواری پر بیٹھ کر تقریر کرتا، اثنائے تقریر ہاتھ ہلاتا، مناسب اشاروں سے مفہوم کو واضح کرتا اور ہاتھ میں عصا، نیزہ یا تلوار لے لیتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہاتھ میں عصا لے کر جمعہ وغیر جمعہ میں تقریر کرنا منقول ہوا ہے۔ ہر قبیلہ اپنے بچوں میں بچپن سے ہی خطابت کا ملکہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ خطابت کی ضرورت اکثر باپ دادا کے حسب و نسب کے مفاخر بیان کرنے، دو قبیلوں کے باہمی تعلقات کی اصلاح، قبائل کے سرداروں اور اپنے شیوخ نیز حکمرانوں اور امرا کے مابین سفارت کاری جیسے مقاصد کے لیے پڑتی تھی۔ خطیب کے لیے بلند آواز، خوش بیان، دلیر اور بے باک ہونے کی صفات لازمی تھیں۔ جاہلی زمانہ کے عربوں میں بہت سارے خطیب ہوئے ہیں اور اسلام کے بعد اس فن کو اور ترقی

ہوئی۔ خطابت کے فنون اور مضامین میں بلندی اور وسعت خیالی آگئی۔ یہاں ہم عہد اسلامی کے اہم خطبا پر مختصر روشنی ڈالیں گے۔
 نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو تمام خطیبوں کے سردار اور ان کے لیے اسوہ اور نمونہ ہیں ہی، حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے خطبے بھی تاریخ میں منقول ہوئے ہیں۔ وہ فوجوں کو جہاد پر روانہ کرتے وقت خطبے دیتے اور انھیں نصیحتیں کرتے۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے حضرات کے خطبے بھی منقول ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر قادیسیہ کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہؓ کا، خالد بن ولیدؓ کا یرموک میں اور ایلد کی جنگ میں عتبہ بن غزو ان کا خطبہ طبری نے نقل کیا ہے، جس میں انھوں نے کہا:

”أما بعد، فإن الدنيا تولت حذاء مدبرة، وقد أذنت أهلها بصرم وإنما بقي منها حباية كصباية الإناء يحطبها صاحبها، ألا وإنكم منقولون منها إلى دار لا زوال لها، فانتقلوا منها بخير ما يحضركم۔“

ابا بعد، دنیا بہت جلد چلی جانے والی ہے، اُس نے دنیا والوں سے رخصتی کی اجازت مانگ لی ہے۔ اب اس کے چلے جانے میں اتنی سی دیر باقی ہے جیسے پانی کے برتن میں ذرا سا پانی بچ جائے۔ آگاہ رہو کہ تم سب اس دنیا سے اس دنیا کی طرف جاؤ گے جس کو زوال نہیں، اس لیے اچھا زاد راہ لے کر اس دنیا کی طرف چلو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہ صرف مختلف موقعوں پر خود خطبے دیتے بلکہ ان کے سامنے فوجوں کے آگے مشابہت عرب آ کر خطبے دیتے، جن میں بنو تمیم کے سردار احف بن قیس نے متعدد خطبے ان کے سامنے دیے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کئی صحابہ کو کوفہ، بصرہ اور دوسرے شہروں میں دینی علوم کی ترویج اور اسلامی تربیت کے لیے بھیجا جن میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک بار اہل کوفہ کو یوں خطاب کیا:

”إن أصدق الحديث كتاب الله، وأوثق العرى كلمة التقوى، وخير الممل ملة إبراهيم، وأحسن السنن سنة محمد صلى الله عليه وسلم وشر الأمور محدثاتها وخير الأمور عزائمها، ما قل وكفى خير مما كثر وألهى، خير الغنى غنى النفس، الخمر جماع الآثام، اعظم الخطايا اللسان الكذوب، سباب المؤمن فسق وقتاله كفر وأكل لحمه معصية۔۔ مکتوب فی دیوان المحسنین من عفا عفی عنه، السعيد من وعظ بغيره۔۔ أحسن الهدى هدى الأنبياء۔“

”سب سے بہتر بات اللہ کی کتاب ہے۔ تقویٰ سب سے مضبوط دستہ ہے، سب سے اچھا طریقہ ابراہیم کا طریقہ ہے۔ سب سے بہترین سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ سب سے برے امور بدعات ہیں۔ سب سے بہتر بات وہ ہے جو پختہ ہو۔ جو کلام کم ہو اور کافی ہو جائے وہ اس زیادہ سے بہتر ہے جو غفلت میں ڈالے۔ بہترین غنائفس کا غنا ہے۔ شراب بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہے۔ سب سے بڑی گناہ کی بات جھوٹی زبان ہے۔ مومن کو گالی دینا فسق اور اس سے قتال کفر ہے، اس کی غیبت معصیت ہے۔ احسان کرنے والوں کے رجسٹر میں لکھ دیا گیا ہے کہ جو معاف کرتا ہے اس کو معاف کر دیا جاتا ہے اور سب سے بہترین ہدایت انبیا کی ہدایت ہے۔“

خلافت راشدہ کے اخیر میں مشاجرات صحابہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ ایک گروپ عثمانی و امویوں کا بن جاتا ہے اور ایک گروپ شیعوں کا، ایک خوارج کا، یہ سب فرقے اپنے فکر و عقیدہ کے حق میں خطابت کے زور کو کام میں لاتے ہیں۔ خوارج کا مشہور خطیب قطری بن حوارة ہے۔ حضرت امام علی رضی اللہ عنہ عربی زبان کے ایک اہم اور عظیم الشان خطیب ہیں، ان کی خطابت میں قرآنی اسلوب، منہج نبوی سے تاثر اور اعلیٰ

درجہ کی فصاحت و بلاغت منتہائے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ ان کے خطبوں کا بڑا حصہ نہج البلاغہ میں جمع کیا گیا ہے، تاہم تاریخ ادب عربی کے محققین مثلاً ڈاکٹر شوقی ضیف اس کتاب کے بیشتر مشتملات کو غیر مستند اور گڑھا ہوا قرار دیتے ہیں کہ اس کا بڑا حصہ شریف رضی یا شریف مرتضیٰ نے اختراع کر کے حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ (تاریخ الادب العربی، شوقی ضیف)

جہادی مہمات اور سیاسی اختلافات، تفسیر قرآن کے حلقوں اور سیاسی فضا سے الگ وعظ و ارشاد کی مجلسیں بھی سرگرم ہوتی ہیں اور ان میں سماک بن حرب اور حسن بصری جیسے زہاد اپنی فصاحت و بلاغت اور مذہبی خطابت کے ذریعہ لوگوں میں دینی شوق اور جذبہ پیدا کر دیتے ہیں۔ یوں ان مختلف اسباب کے تحت عصر اسلامی میں خطابت کا فن عروج کو پہنچتا ہے۔

8.4 عصر اسلامی کے بڑے خطبا

ذیل میں عصر اسلامی کے بڑے خطبا کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے، جس میں ایک ترتیب سے ان کا مختصر تذکرہ اور ان کی خطابت کے اہم خصائص کا تذکرہ کیا جائے گا۔ اس فہرست میں اول نمبر پر بجاطور پر فصیح العرب والعمم اور سید الخطبا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آتا ہے:

8.4.1 نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فصیح العرب والعمم تھے۔ آپ ﷺ بنو ہاشم میں پیدا ہوئے۔ شیر خوارگی کا زمانہ بنو سعد میں گزارا، نوخیزی قریشی قبائل میں۔ خود آپ ﷺ نے اپنے متعلق فصیح العرب ہونے کا دعویٰ کیا اور کبھی کسی عرب نے اس کی تردید نہیں کی۔ نہ آپ ﷺ کی زبان و بیان پر کبھی کوئی اعتراض کر سکا، حالانکہ مکہ کے لوگوں نے آپ ﷺ کو ساحر مجنون اور سب کچھ کہا۔ آپ ﷺ کی فصاحت و بلاغت میں آمد ہی آمد تھی۔ آپ ﷺ کی زبان قرآن سے مستعار و Inspired تھی، لہذا آپ ﷺ کی زبان مبارک بھی الہامی تھی کہ جس کی شہادت میں وما یطلق عن الہوی ان ہو الا وحی یوحی کہا گیا۔ آپ ﷺ کے طرز بیان میں کوئی جھول نہ تھا، نہ کبھی کوئی بھدا، غیر معیاری اور غیر موزوں لفظ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا۔ بچپن بنو سعد میں گزارنے اور نوجوان میں تجارتی اسفار کی وجہ سے عرب کی بولیاں آپ ﷺ کے علم میں تھیں۔ آپ ﷺ کے کلام کی جاہل نے یوں تعریف کی ہے:

”وہ ایسا کلام تھا جس کے حروف کی تعداد کم، معانی کی مقدار زیادہ تھی، جو صنعت و آورد سے بالاتر اور تکلف سے منزہ ہوتا، اُس میں تفصیل کی جگہ تفصیل اور اجمال کی جگہ اجمال تھا۔ وہ بے قاعدہ، غریب و توحش کن الفاظ سے خالی نیز بازاری و عامیانہ الفاظ سے پاک و صاف تھا۔ سرمایہ حکمت سے لبریز نیز غلطیوں و خامیوں سے محفوظ و مامون تھا۔ اس کو تائید غیبی اور حمایت ربانی حاصل تھی۔ الغرض لوگوں نے آپ ﷺ کے کلام سے زیادہ مفید، سچا، مناسب و موزوں، خوش اسلوب و خوش معنی، پر اثر و دل نشیں، آسان و زود فہم اور اپنے مقصود و مطلوب کو کھول کر وضاحت سے بیان کرنے والا کوئی کلام نہیں سنا۔“ (البیان والتبین، جلد دوم، ص ۱۷)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنی بات کو تین مرتبہ دہراتے۔ خطابت میں بڑے پر شوکت الفاظ استعمال کرتے اور اسلوب خطابت میں زیر و بم ہوتا۔ اس اتار چڑھاؤ کی وجہ سے آپ ﷺ کے کلام میں بلا کی تاثیر پیدا ہو جاتی۔ آپ ﷺ جو ام الکلم استعمال کرتے، جس میں ایک جملہ ایک کتاب پر بھاری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں ایک لاکھ لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

أيها الناس إن ربكم واحد وإن أباكم واحد، كلكم لآدم وادم من تراب، إن أكرمكم عند الله اتقاكم، إن الله عليم خبير، وليس لعربي على عجمي فضل إلا بالتقوى۔ (البيان والتبيين للجاحظ، طبع مطبعة لجنة التأليف والترجمة والنشر، ۳۳/۲)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے قبل تیرہ سال مکہ میں رہے اور دین کی دعوت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطابت کو حکمت اور موعظت کے ساتھ استعمال کیا۔ اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا وسیلہ اور سرچشمہ قوت قرآن پاک تھا، جس کی فصاحت و بلاغت اور اعجاز خطابت نے تمام عرب کو مسحور کر رکھا دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری قوت سے لوگوں کے سوائے ہونے ضمیر کو بیدار کرتے اور طرح طرح کے اسلوبوں سے ان کو توحید کی طرف بلا تے۔ ہجرت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات کے مضامین میں اور وسعت آئی اور اب توحید رسالت و معاد کے اثبات کے علاوہ دینی احکام کی وضاحت بھی شامل ہو گئی۔ خاندانی مسائل، میراث، لین دین، زکوٰۃ و صدقات، پڑوسیوں سے تعلقات کے ساتھ مکارم اخلاق وغیرہ کی تعلیم، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ”بعثت لأتمم مکارم الأخلاق۔“

جمعہ کے خطبوں کے علاوہ عیدین میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبے دیتے تھے۔ اس کے علاوہ خاص خاص مواقع پر بھی حدیث و سیرت کی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے منقول ہیں، جن میں بہت مشہور خطبہ وہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد دیا تھا۔ ہوا یوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤلفۃ القلوب کی مد میں اہل مکہ کو کچھ مال دیا تھا اور انصار کو چھوڑ دیا تھا۔ اس پر بعض انصاریوں کو شکایت ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک خیمہ میں جمع کیا، پھر ایک مؤثر خطبہ دیا، جس سے انصار زار و قطار رونے لگے۔ اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے مشہور خطبہ وہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر دیا، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره وننتوب اليه، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادي له، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله۔

أوصيكم عباد الله بتقوى الله وأحثكم على طاعته وأستفتح بالذي هو خير۔ أما بعد أيها الناس اسمعوا مني أبين لكم فإني لا أدري لعلي لا ألقاكم بعد عامي هذا في موقفي هذا۔

أيها الناس إن دماءكم وأعراضكم حرام عليكم إلى أن تلقوا ربكم كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا في بلدكم هذا۔ ألا هل بلغت اللهم فاشهد، فمن كانت عنده أمانة فليؤدها إلى من ائتمنه عليها۔

وإن ربا الجاهلية موضوع ولكن لكم رؤوس أموالكم لا تظلمون ولا تظلمون وقضى الله أنه لا ربا۔ وإن أول ربا أبدا به ربا عمي العباس بن عبد المطلب۔ وإن دماء الجاهلية موضوعة، وإن أول نبدأ به دم عامر بن ربيعة بن الحارث بن عبد المطلب وإن مآثر الجاهلية موضوعة غير السدانة والسقاية، والعمد قود وشبه العمدم ما قتل بالعصا والحجر وفيه مائة بعير، فمن زاد فهو من أهل الجاهلية۔

أيها الناس! إن الشيطان قد يئس أن يعبد في أرضكم هذه، ولكنه قد رضي أن يطاع فيما سوى ذلك مما تحقرون من أعمالكم فاحذروه على دينكم، أيها الناس إنما النسيء زيادة في الفكر يضل به الذين كفروا يحلونه عاماً ويحرمونه عاماً ليوطئوا عدة ما حرم الله فيحلوا ما حرم الله ويحرموا ما أحل الله۔ وإن الزمان قد استدار كهيئته يوم خلق الله السماوات والأرض، وإن عدة

الشهور عند الله اثنا عشر شهرا في كتاب الله يوم خلق الله السماوات والأرض، منها أربعة حرم ثلاثة متواليات وواحد فرد: ذوالقعدة وذوالحجة والمحرم ورجب مضر الذي بين جمادى وشعبان -ألا هل بلغت اللهم فاشهد-

أيها الناس إن لنسائكم عليكم حقاً ولكم عليهن حق -لكم أن لا يواطئن فرشكم غيركم، ولا يدخلن أحداً تكرهونه بيوتكم إلا بإذنكم ولا يأتين بفاحشة، فإن فعلن فإن الله قد أذن لكم أن تعضلوهن وتهجروهن في المضاجع وتضربوهن ضرباً غير مبرح، فإن انتهين وأطعنكم فعليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف، واستوصوا بالنساء خيراً فإنهن عندكم عوان لا يملكن لأنفسهن شيئاً، وإنكم إنما أخذتموهن بأمانة الله واستحللتم فروجهن بكلمة الله فاتقوا الله في النساء واستوصوا بهن خيراً -ألا هل بلغت؟ اللهم فاشهد- فلا ترجعن بعدي كافراً يضرب بعضكم رقاب بعض، فإني قد تركت فيكم ما إن أخذتم به لن تضلوا بعده: كتاب الله وسنة نبيه، ألا هل بلغت -اللهم فاشهد-

أيها الناس إن ربكم واحد وإن أباكم واحد كلكم لآدم وادم من تراب أكرمكم عند الله اتقاكم، وليس لعربي على عجمي فضل إلا بالتقوى -ألا هل بلغت -اللهم فاشهد، قالوا نعم -قال فليبلغ الشاهد الغائب-

ترجمہ:

”تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، ہم اس کی حمد کرتے اور اسی سے مدد و استغفار چاہتے ہیں اور اسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ہم اپنے نفس کے شرور اور اپنے برے اعمال سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، جس کو اللہ ہدایت دے دے اُس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

اے اللہ کے بندو! میں تم سب کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، اس کی اطاعت پر ابھارتا ہوں اور جو اچھا ہے اس کو طلب کرتا ہوں۔ ابابعد، اے لوگو! میری بات سنو، میں تمہیں کھول کھول بیان کرتا ہوں، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ شاید اس سال کے بعد میں اس جگہ پر نزل سکوں۔ اے لوگو! تمہارا خون اور تمہارا مال تم پر حرام ہیں، یہاں تک کہ تم اپنے رب سے ملاقات کرو۔ ایسے ہی حرام ہیں جیسے تمہارا یہ آج کا دن محترم ہے، تمہارا یہ مہینہ محترم ہے، تمہارا یہ شہر محترم ہے۔ دیکھو کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ گواہ رہنا۔ جس کسی کے پاس بھی کوئی امانت ہو تو اسے اس کے مالک کو لوٹا دے۔ جاہلیت کے زمانہ کے سود سب کا لعدم ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کے سود کو کا لعدم کرتا ہوں اور جاہلیت کے خون معاف ہیں، میں سب سے پہلے عامر بن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب کے خون کو معاف قرار دیتا ہوں۔ اور یقیناً جاہلیت میں جو اچھے کام ہوتے تھے وہ بھی کا لعدم ہیں، سوائے خانہ کعبہ کی دیکھ بھال اور حاجیوں کو پانی پلانے کے۔ قتل عمد میں قصاص ہوگا، شبہ عمدہ جو کلکڑی پتھر مارنے سے مر جائے اور اس میں سواونٹ ہیں، جو اس پر زیادہ کر دے گا تو وہ اہل جاہلیت میں ہوگا۔“

”اے لوگو! شیطان اس سے تو مایوس ہو گیا ہے کہ تمہاری اس سرزمین میں اُس کی پوجا کی جائے، لیکن اس کے علاوہ تمہارے چھوٹے کاموں میں اپنی اطاعت کیے جانے پر وہ راضی ہو گیا ہے۔ سو اس سے اپنے دین کے معاملہ میں ہوشیار رہو۔ اے لوگو! بیشک نسیء کفر میں

بڑھائی گئی چیز ہے جس کے ذریعہ کافروں کو گمراہ کیا جاتا تھا کہ وہ ایک سال کو حلال کر لیتے اور ایک سال کو حرام کہ اس طرح اللہ کی حرام کی گئی گنتی کے مطابق ہو جائیں، یوں حرام کو حلال کر ڈالیں۔ بلاشبہ آج زمانہ اپنی اصل حیثیت پر لوٹ آیا ہے، جس دن کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، لہذا اللہ کے نزدیک مہینوں کی گنتی بارہ ہوگی، یہ اللہ کے قانون میں ہے جب اس نے آسمانوں و زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار مہینے محترم ہیں۔ تین مہینے یہ بہ پے اور ایک اکیلا۔ ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب جو جمادی (الثانی) اور شعبان کے درمیان پڑتا ہے۔ بتاؤ کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ تو گواہ رہنا۔

اے لوگو! یقیناً تمہاری عورتوں کا تمہارے اوپر حق ہے اور تمہارے لیے ان پر حق ہے۔ تمہارے لیے ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستروں کو غیروں سے نہ روندوائیں اور تمہارے گھر میں کسی ایسے شخص کو بلا اجازت داخل نہ کریں جسے تم پسند نہ کرتے ہو۔ اور کسی کھلی برائی کا ارتکاب نہ کریں۔ اگر وہ کرتی ہیں تو اللہ نے تم کو اجازت دی ہے کہ ان کو بستروں میں تنہا چھوڑ دو اور ان کی ہلکی پھلکی پٹائی کر دو۔ پس اگر وہ باز آجائیں اور تمہاری اطاعت کریں تو تمہارے اوپر ان کی روزی روٹی اور معروف کے مطابق کپڑے پہنانا ہے۔ عورتیں تمہارے پاس گویا قیدی ہیں، وہ اپنے لیے کسی چیز کا حق نہیں رکھتیں۔ ان کو تم نے اللہ کی امانت کے بطور لیا ہے اور ان کی شرم گاہیں تم نے حلال کر لیں ہیں، اللہ کے کلمہ کے ذریعہ لہذا عورتوں کے بارے میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ان کے بارے میں میری خیر کی وصیت کو قبول کرو۔ کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ گواہ رہنا۔ اے لوگو! تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کسی مسلمان کے لیے اس کے مسلمان بھائی کے مال میں سے وہی حلال ہے جس سے وہ رضامند ہو۔ تو تم میرے بعد کفر اختیار نہ کر لینا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو، میں تمہارے لیے کتاب اللہ اور رسول کی سنت چھوڑ کر جا رہا ہوں جس کو اگر تم پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ بتاؤ کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ تو گواہ رہنا۔

اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارے باپ بھی ایک ہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ بلاشبہ اللہ علیم وخبیر ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی برتری نہیں، سوائے تقویٰ کے ذریعہ، بتاؤ کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ! تو گواہ رہنا۔ لوگوں نے کہا: ہاں آپ ﷺ نے پہنچا دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تو جو یہاں موجود ہے وہ غیر موجود کو پہنچا دے۔“

8.4.2 حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

عہد اسلامی کے دوسرے بڑے خطیب خلیفہ ثانی حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ مکہ کے تاجروں میں تھے اور اپنے قبیلہ کے اشراف میں گنے جاتے تھے اور قریش کے ان لوگوں میں سے ایک تھے جن کو لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ عرب میں ان کی دلیری، بے باکی اور اولوالعزمی کی شہرت تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ ابو جہل اور عمر دونوں میں سے کسی ایک کے دل کو اسلام کے لیے کھول دے اور اسلام کی تقویت کا سامان کر دے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا، جس کا قصہ مشہور ہے۔ اسلام لا کر سب سے پہلے وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو لے کر کعبہ پہنچے، وہاں بانگ دہل اپنے اسلام کا اعلان کیا، تبھی بارگاہ نبوت سے انہیں فاروق کا خطاب ملا۔ اسلام میں حضرت ابو بکر کے بعد انہیں کا رتبہ ہے۔ وہ عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں اور ان کی ایک صاحب زادی حضرت سیدہ حفصہ امہات

المؤمنین میں سے ہیں۔ خلیفہ اول ابو بکر صدیق کے بعد انہیں کو دوسرا خلیفہ منتخب کیا گیا۔ ان کے زمانہ میں ایران، شام، مصر و عراق کی فتوحات کی تکمیل ہوئی جس کی ابتدا عہد ابو بکر میں ہوئی تھی۔ انھوں نے نہایت حکمت و تدبیر اور غایت درجہ کی فراست و فہمی بصیرت کے ساتھ بارہ سال تک لاکھوں کلومیٹر کے رقبہ پر حکومت کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شعر فہمی کا ذوق عطا ہوا تھا۔ ان کی خطابت میں ہیبت و جلال اور شفقت و عدل کے عناصر جمع ہیں۔ ایک موعظت پر یہاں اکتفا کی جاتی ہے:

إن الله سبحانه وبحمده قد استوجب عليكم الشكر، واتخذ عليكم الحجيج فيما آتاكم من كرامة الآخرة والدينا من غير مسألة منكم له، ولا رغبة منكم فيه إليه؛ فخلقكم تبارك وتعالى ولم تكونوا شيئاً لنفسه وعبادته، وكان قادراً أن يجعلكم أدنى خلقه عليه؛ فجعل لكم عامة خلقه، ولم يجعلكم لشيء غيره، وسخر لكم ما في السموات وما في الأرض، وأسبغ عليكم نعمه ظاهرة وباطنة، وحملكم في البر والبحر، ورزقكم من الطيبات لعلكم تشكرون، ثم جعل لكم سمعاً وبصراً، ومن نعم الله عليكم نعم عم بها بني آدم، ومنها نعم اختص بها أهل دينكم، ثم صارت تلك النعم خواصها وعوامها في دولتكم وزمانكم وطبقتكم، وليس من تلك النعم نعمة وصلت إلى امرء خاصة إلا لو قسم ما وصل إليه منها بين الناس كلهم أتعبهم شكرها، وفدحهم حقها إلا بعون الله مع الإيمان بالله ورسوله، فأنتم مستخلفون في الأرض، قاهرون لأهلها، قد نصر الله دينكم والله المحمود مع الفتح العظام في كل بلد۔۔۔ فسأل الله الذي لا إله هو الذي ابلائنا هذا أن يرزقنا العمل بطاعته والمسارعة إلى مرضاته۔

ترجمہ:

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر شکر واجب کیا ہے، تمہارے خلاف دنیا و آخرت کی اس عزت کو دلیل بنا دیا ہے جو اُس نے تم کو بلا مانگے عطا کر دی ہے، جس سے تم بے رغبت بھی نہیں ہو۔ تم کچھ نہ تھے تو اللہ نے تم کو اپنے لیے اور اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا اور آسمانوں و زمین میں جو کچھ ہے اس کو تمہارے لیے مسخر کر دیا۔ تمہارے اوپر اپنی ظاہری و باطنی ہر نعمت تمام کر دی۔ تمہیں بحر و بر میں اٹھایا۔ تمہیں طیبات سے رزق دیا تاکہ تم شکر گزار ہو۔ پھر تمہارے لیے آنکھ اور کان بنائے۔ اللہ کی تم پر کچھ نعمتیں وہ ہیں جن میں سارے ہی بنی آدم شریک ہیں اور کچھ نعمتیں تمہارے دین والوں کے ساتھ خاص کر دی ہیں۔ پھر یہ خاص و عام نعمتیں تمہاری مملکت، زمانہ اور طبقہ میں ہو گئی ہیں۔ ان میں سے کوئی نعمت بھی ایسی نہیں جو کسی ایک آدمی کے ساتھ خاص ہو اور وہ اُسے تمام انسانوں میں بانٹ دے کہ اُس کے شکر سے سب در ماندہ رہ جائیں اور اللہ کی مدد کے بغیر اس کا حق ادا نہ کر سکیں۔ ایمان باللہ و بالرسول سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ تم کو اللہ نے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، تم زمین والوں کو مطیع بنانے والے ہو۔ اللہ نے تمہارے دین کی مدد کی۔ ہر شہر بڑی بڑی فتوحات عطا کی ہیں۔ تو ہم اللہ تعالیٰ سے جس کے سوا کوئی معبود نہیں جس نے ہمیں یہ سب کچھ دیا دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم کو وہ اپنا اطاعت گزار اور اپنی مرضی کا پابند بنا دے۔“

8.4.3 حضرت علی رضی اللہ عنہ

فاتح خیبر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کاشانہ نبوت میں پرورش پائی۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی بھی تھے، جن کی پرورش کی ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت سے لے لی تھی جب وہ ایک کمسن بچہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سابقون اولون میں سے

ہیں کہ وہ بچوں میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔ حضرت علیؑ کو بوقت ہجرت آپ ﷺ کے بستر پر سونے کا شرف حاصل ہوا۔ بعد میں آپ ﷺ کے داماد بھی بنے۔ فیضانِ نبوت سے مستفید ہونے کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ حکمت و موعظت کا خزانہ تھے اور فصاحت و بلاغت کی کان۔ صحابہ کرام میں ان سے بڑھ کر کوئی فصیح و بلیغ، صائب الرائے اور حکیم نہ تھا۔ ان کے خطبے زیادہ تر البیان والتبیین، عیون الأخبار اور طبری میں نقل کیے گئے ہیں۔ جہاں تک نہج البلاغۃ کی بات ہے جو ان کے سیاسی خطبوں، مواعظ، تقریروں، بیانات اور اقوال کا مجموعہ ہے، جس کو ابن ابی الحدید نے ترتیب دیا تھا تو اس کے بارے میں ڈاکٹر شوقی ضیف کی رائے یہ ہے کہ اس کا بڑا حصہ غیر مستند اور گرگڑھا ہوا ہے، جس کو شریف رضی یا شریف مرتضیٰ نے لکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ نمونہ کے طور پر ایک خطبہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

”إن الجهاد باب من أبواب الجنة، فمن تركه رغبةً عنه البسه الله ثوب الذلّ وشمله البلاء، ولزمه الصغار، وسيم الخصف ومنع النصف۔ ألا وإني قد دعوتكم إلى قتال هؤلاء القوم ليلاً ونهاراً وسراً وإعلاناً وقلت لكم: اغزروهم قبل أن يغزوكم، فوالله ما غزى قوم قط في عقر دارهم إلا ذلوا، فتواكلتم وتخاذلتم، وثقل عليكم قولي، واتخذتموه ورائكم ظهرياً، حتى شنت عليكم الغارات۔۔۔ فيا عجباً من جد هؤلاء القوم في باطلهم وفشلكم عن حقكم۔۔۔ حتى صرتم هدفاً يرمى وفيئنا ينتهب، يغار عليكم ولا تغيرون وتغزون ولا تغزون، قد ملأتم صدري غيظاً، وجرعتموني الموت انفاً وفسدتم علي رائي بالعصيان والخذلان۔“

ترجمہ:

یقیناً جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے، جو شخص جہاد کو بے رغبتی سے چھوڑ دے اللہ اس کو ذلت کا لباس پہنائے گا، اس پر بلائیں آئیں گی اور اسے چھوٹا بن کر رہنا ہوگا، اسے ذلت کا مزہ چکھنا ہوگا اور اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ یاد رکھو میں نے تم کو ان لوگوں سے قتل کے لیے دن رات، چپکے سے اور پکار پکار کر بلایا۔ میں نے تم سے کہا کہ اس سے پہلے کہ وہ تم پر حملہ کریں تم ان پر حملہ آور ہو، خدا کی قسم کسی قوم پر اس کے اپنے گھر میں حملہ نہیں کیا جاتا مگر وہ ذلیل ہو جاتی ہے۔ تم نے ٹال مٹول کی، مجھے چھوڑ دیا، میری بات تم پر بھاری ہو گئی، تم نے میری باتوں کو پس پشت ڈال دیا، یہاں تک کہ تم پر حملے ہونے لگے۔ مجھے تعجب ہے کہ یہ لوگ باطل پر ہیں، پھر بھی کوشش کر رہے ہیں اور تم حق پر ہوتے ہوئے بھی ناکام ہو۔۔۔ نوبت بایں جا رسید کہ اب تم پر نشانہ لگایا جا رہا ہے، تم نے میرے سینے کو غصہ کی آگ سے بھر دیا ہے۔ تم نے مجھے موت کے کڑوے گھونٹ پلائے ہیں اور میری نافرمانی اور سرکشی کر کے میری رائے کو کنفیوٹ کر دیا ہے۔

8.4.4 سبحان وائل

سبحان بن زفر بن زیاد، بنو ربیعہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درباری تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی بڑی قدر افزائی کرتے تھے۔ سبحان غیر سیاسی اور غیر جماعتی مقرر تھے۔ وہ نہایت برجستہ گو تھے، مگر ان کی خطابت کے موضوع وعظ و نصیحت تک محدود تھے۔ دوسرے ان کے خطبے بڑے طویل اور یک موضوعی ہوتے تھے جس کی وجہ سے راویان ادب نے ان کے خطبات کو محفوظ نہیں رکھا۔ خلافت معاویہ ہی میں سنہ ۵۴ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ سبحان تقریر کرتے وقت اپنا عصا ضرور استعمال کرتے تھے۔ انھیں

اپنی خطابت پر ناز تھا اور حضرت معاویہ نے انھیں اخطب العرب قرار دیا تھا۔ وہ نہایت روانی سے ایک ہی موضوع پر تقریر کرتے چلے جاتے تھے۔ احمد حسن زیات نے اپنی کتاب تاریخ الأدب العربی میں ان کا ایک مختصر خطبہ نقل کیا ہے، جس کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

”لوگو! دنیا آخرت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور آخرت ہمیشہ رہنے کی جگہ۔ اے لوگو! اپنی گزرگاہ سے دائمی اقامت گاہ کے لیے سامان لے لو اور جس پر تمہارے بھید آشکارا ہیں اُس کے سامنے اپنے پردے چاک نہ کرو۔ اپنے جسموں کے نکلنے سے پہلے دنیا سے اپنے دلوں کو نکال لو، تم اس دنیا میں جیتے ہو لیکن دوسری جگہ رہنے کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔ جب آدمی مرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں ”کیا چھوڑا؟ اور فرشتے کہتے ہیں کیا لایا؟ لہذا کچھ اپنے لیے پیشگی روانہ کرو اور سب یہاں نہ چھوڑ جاؤ کہ وہ تمہارے لیے وبال نہ بن جائے۔“

8.4.5 زیاد بن ابیہ

زیاد بن ابیہ اپنی خطابت، انتظامی صلاحیتوں، بیوروکریسی کے جوہر اور طلاق لسانی میں ایک بے نظیر انسان تھے۔ بعض روایتوں کے مطابق ان کے والد عبد نامی غلام اور سیمہ نامی لونڈی تھی۔ جب کہ بعض روایات ان کا نسب حضرت ابوسفیان سے جوڑتی ہیں، اسی وجہ سے مؤرخوں میں وہ زیاد بن ابیہ کے نام سے معروف ہوئے۔ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے انہیں بڑے بڑے انتظامی و مالی عہدوں پر مامور بھی کیا، لیکن بہت زیادہ صلاحیتوں کی بنا پر عمرؓ نے اس خوف سے اسے معزول بھی کر دیا تھا کہ کہیں لوگ فتنہ ہی میں نہ پڑ جائیں۔ حضرت عمرو بن العاص نے ایک بار ان کی تقریر سن کر کہا: ”سبحان اللہ، کیا کہنے ہیں اس نوجوان کے، اگر اس کا باپ قریش سے ہوتا تو سارے عرب کا قائد بن جاتا۔“ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں انھوں نے زیاد کو کوفہ و بصرہ دونوں جگہوں کا گورنر مقرر کر دیا۔ انھوں نے دونوں جگہوں کا اچھا انتظام کیا، فضا کو سازگار بنایا، سیاسی استحکام پیدا کر دیا اور سرحدوں کو مضبوط کر دیا۔ جب تک حضرت علی رضی اللہ عنہ زندہ رہے زیاد ان کے وفادار رہے۔ ان کی شہادت کے بعد حضرت امیر معاویہ جو پہلے سے ہی اپنے کیمپ میں لانے اور اپنا ہم نوا بنانے کے لیے کوشاں تھے، اپنے ارادہ میں کامیاب ہوئے اور زیاد نے اپنی خدمات ان کو دے دیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں کوفہ و بصرہ کا گورنر بنائے رکھا۔

نمونہ: زیاد بن ابیہ جتنی زیادہ لمبی تقریر کرتے ان کی تقریر کی فصاحت و بلاغت اور زور بیان بڑھتا چلا جاتا تھا۔ امام شعبی نے بھی ان کی طول خطابت کی تعریف کی۔ ان کی تقریروں سے خطبہ پتراء یعنی بغیر حمد و ثنا کا خطبہ مشہور ہے۔

”اما بعد! جاہلیت خالص، اندھی گمراہی اور آگ میں لے جانے والی سرکش ہے جس میں تمہارے نادان اور دانش مند سب پڑے ہوئے ہیں، وہ چیزیں ہیں جن سے چھوٹے تباہ ہو جاتے ہیں اور بڑے بچ کر نہیں نکلتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کتاب اللہ کو نہیں پڑھا اور اللہ نے اطاعت شعار بندوں کے لیے جو اجر و ثواب اور نافرمانوں کے لیے جو سخت عذاب ہمیشہ ہمیش کی زندگی میں رکھا ہے، وہ نہیں سنا۔ تم میں سے ہر ایک کی آنکھ دنیا پر لگی ہوئی ہے۔ تمہارے کانوں میں خواہشات کی صدائیں گونج رہی ہیں اور تم فانی حیات کو ابدی زندگی پر ترجیح دے رہے ہو۔ تم یہ بھولے ہوئے ہو کہ تم نے کمزور پر ظلم روا رکھ کر دن دہاڑے کمزور لٹی ہوئی اور دکھیااری عورت کو بے یار و مددگار چھوڑ کر - حالانکہ دشمن کثیر اور متحد ہیں - اسلام میں ایک ایسی بری مثال قائم کی ہے جس کی نظیر تم سے پہلے کبھی نہیں مل سکتی۔ کیا تم میں روک تھام کرنے والے نہیں جو سرکشوں کو راتوں میں شب خون مارنے اور لوٹ مار کرنے سے روکیں؟ تم نے رشتے داری کا پاس رکھا اور دین کو چھوڑ دیا ہے۔ بغیر کسی معقول

وجہ کے تم معذرتیں پیش کرتے ہو، خلاف شرع اعمال اپنے سامنے ہوتے دیکھ کر چشم پوشی کرتے ہو۔ ہر شخص اپنے نادان و مجرم سے اس طرح بے توجہی برتا ہے گویا اُسے نہ عاقبت کا خوف ہے نہ قیامت کی امید۔ تم عقل والے نہیں، تم بے وقوفوں کی پیروی کرتے ہو۔ تم نے ان کو ڈھیل دے کر اس قدر دلیر کر دیا ہے کہ وہ اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کرنے لگے ہیں اور انھوں نے تمہاری آڑ لے کر بد معاشی کے اڈے بنا لیے ہیں۔ مجھ پر اس وقت تک کھانا پینا حرام ہے جب تک میں ان اڈوں کو منہدم نہ کر دوں یا جلانہ ڈالوں (الح)۔“

8.4.6 حجاج بن یوسف ثقفی

حجاج بن یوسف ثقفی ۴۱ھ میں پیدا ہوئے۔ طائف میں تعلیم حاصل کی۔ بچپن سے زیرک و ذہین تھے۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان نے حجاج کی صلاحیتیں دیکھ کر انہیں اپنی فوج میں افسر مقرر کر دیا۔ انھوں نے فوج میں نظم و ضبط پیدا کیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر سے لڑنے کے لیے بھی حجاج کو مکہ پر فوج کشی کے لیے بھیجا گیا۔ اس مہم میں انہیں کامیابی ملی اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ گئے اور حضرت ابن زبیر شہید ہو گئے۔ مکہ میں زبیریوں کی حکومت ختم کرنے کے بعد حجاج کو عراق کا گورنر مقرر کیا گیا۔ حجاج خلافت بنی امیہ کا بہت بڑا خدمت گار تھے اور اپنے آقاؤں کی وفاداری میں بہت سے علماء، فقہاء، تابعین (جو بنی امیہ کے مخالف تھے) کو قتل کروایا اور ہزاروں کو جیل میں ڈالا دیا۔ اُن کا ایک کارنامہ قرآن پاک پر نکتے لگوانا تھا اور دوسرا بڑا کارنامہ محمد بن قاسم کو سندھ فتح کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ۹۵ھ میں بمقام واسط حجاج نے انتقال کیا۔

خطبہ کا نمونہ: حجاج بن یوسف کا مشہور خطبہ وہ ہے جب عراق کی امارت ملنے کے بعد وہ کوفہ پہنچے تھے۔ اُنھوں نے سر پر عمامہ باندھ رکھا تھا اور چہرہ اس میں چھپالیا تھا۔ وہ گلے میں تلوار اور شانہ پر کمان لٹکا کر مسجد میں داخل ہوئے۔ منبر پر چڑھ کر تھوڑی دیر خاموش رہے۔ فتنہ باز کوفیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ ایک شخص عمیر بن ضابی نے انہیں پتھر مارنے کا ارادہ تک کر لیا۔ تمام لوگوں کی نگاہیں اپنی طرف اٹھتی دیکھ کر حجاج نے اپنے چہرے سے عمامہ ہٹایا اور یہ شعر پڑھا:

انا ابن الجلا طلاع الشنايا
متى اضع العمامة تعرفونني

”میں مشہور اور تجربہ کار شخص ہوں، جب اپنا عمامہ اتار دوں گا تو تم مجھے پہچان لو گے۔“ اس کے بعد گرم اور دہکتی ہوئی تقریر کی جس نے اہل کوفہ کو سرا سیمہ کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا:

”اے کوفیو! میں دیکھ رہا ہوں کہ سروں کی کھیتی پک کر تیار ہو گئی ہے اور اب اس کے کاٹنے کا وقت آ گیا ہے۔ میں اُسے کاٹنے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے عماموں اور داڑھیوں میں خون لگا ہوا نظر آ رہا ہے۔

اے عراقیو! مجھے کسی چیز سے خوف زدہ نہیں کیا جاسکتا، نہ مجھ پر زور یا دباؤ ڈالا جاسکتا ہے۔ میں بہت جانچ پڑتال کے بعد ہوشیار و لائق ثابت ہوا ہوں اور بڑے تجربہ کے بعد ڈھونڈ کر منتخب کیا گیا ہوں۔ امیر المؤمنین نے اپنے ترکش کے تمام تیر نکالے، پھر ان کی لکڑیوں کو جانچا اور مجھے سب سے زیادہ تلخ اور مضبوط لکڑی کا تیر پا کر تمہارے اوپر مسلط کر دیا، کیونکہ تم فتنوں میں پیش پیش ہو اور گمراہیوں میں پڑے رہتے ہو۔ بخدا میں تمہیں اس طرح گٹھری میں باندھ دوں گا جس طرح ببول کی لکڑی کا گٹھا باندھا جاتا ہے اور اس طرح بے دردی سے ماروں گا جس

طرح پر اے اونٹوں کو مارا جاتا ہے۔ تمہاری مثال ان بستی والوں کی ہے جن کو ہر جگہ سے امن و اطمینان کے ساتھ رزق ملتا تھا، لیکن انہوں نے خدا کے انعامات و احسانات کی قدر نہ کی تو اللہ نے ان کے اعمال کی سزا میں انہیں بھوک اور خوف میں مبتلا کر دیا۔

بخدا میں جو کچھ کہوں گا پورا کروں گا، جس کا ارادہ کر لوں گا اُسے پورا کر کے چھوڑوں گا اور جو کروں گا وہ ٹھیک اور مناسب کروں گا۔ امیر المؤمنین نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارے وظیفہ تم کو دے دوں اور تم کو تمہارے دشمنوں سے لڑائی کے لیے مہلب بن ابی صفرہ کی قیادت میں بھیج دوں۔ خدا کی قسم جس کو میں وظیفہ وصول کرنے کے تین دن بعد گھر میں بیٹھا پاؤں گا اُس کی گردن اڑا دوں گا۔“

8.4.7 خواجہ حسن بصری

اس زمانہ میں دینی وعظ و نصیحت اور زہد و ورع پر ابھارنے والی خطابت بھی سامنے آئی۔ لوگوں نے درسِ قرآن دینا اور قصص و مواظب کہنے شروع کیے۔ اس قسم کی خطابت میں سب سے اہم نام حسن بصری کا ہے۔ حسن بصری ۲۱ ہجری میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد یسار تھے جو انصار کے مولیٰ تھے اور ان کی ماں خیرہ حضرت ام سلمہ ام المؤمنین کی مولاہ تھیں۔ حسن اپنی والدہ کے ساتھ امہات المؤمنین کے پاس آیا جایا کرتے اور اس طرح نور نبوت سے کسب فیض کرتے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں وہ جہاد پر بھی نکلے، پھر دس سال تک کسی خراسانی والی کے پاس منشی کا کام کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ واپس آ کر بصرہ میں سکونت اختیار کرتے ہیں اور دینی درس و تدریس اور وعظ و نصیحت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں۔ ۱۱۰ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔

حسن بصری بڑے زاہد و واعظ اور اولین متکلمین میں شامل ہیں۔ ان کی واعظانہ خطابت کا مختصر نمونہ ذیل میں دیا جا رہا ہے:

”رحمہ اللہ امرأ کسب طیباً، وانفق کسباً، وقدم فضلاً، ووجه هذه الفضول حیث وجهها اللہ و وضعها حیث امر اللہ، فان من کانت قبلکم کانوا یاخذون من الدنیا بلاغهم ویؤثرون بالفضل۔ ألا إن هذا الموت قد أخرج بالدنیا ففضحها، فلا والله ما وجد ذولب فیها فرحاً، فایاکم وهذه السبل المتفرقة التي جماعها الضلالة وميعادها النار، أدرکت من صدر هذه الأمة قوماً کانوا إذا أجنهم اللیل فقیام علی أطر افهم یفترون وجوههم، تجری دموعهم علی خدودهم، یناجون مولاهم فی فکاک رقابهم۔۔ یا ابن آدم إن کان لا یغنیک ما یکفیک فلیس ها هنا منشیء یغنیک وإن کان یغنیک ما یکفیک فالقلیل من الدنیا یغنیک۔“

”اللہ ایسے شخص پر رحم کرے جس نے حلال کمایا اور اپنی کمائی سے خرچ کیا اور فاضل مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا اور وہاں رکھ دیا جہاں اللہ نے رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ تم سے پہلے جو لوگ تھے وہ دنیا سے قدرے حصہ لیتے اور فاضل مال کو دوسروں کو صدقہ میں دے دیتے۔ آگاہ رہو کہ اس موت نے دنیا کو نقصان پہنچایا اور اس کو ذلیل و رسوا کر دیا۔ پس خدا کی قسم کسی عقل مند کو اس سے کبھی خوشی نہیں ملی، اس لیے ان تمام متفرق راستوں سے بچو جن کا سرمایہ ضلالت اور جن کا انجام آگ ہے۔ اس امت کے پہلے حصہ میں میں نے ان لوگوں کو پایا تھا کہ جب رات آجاتی تو وہ اپنے قدموں پر (نماز) کے لیے کھڑے ہو جاتے، ان کے چہرے زمین میں بچھ جاتے، ان کے آنسو رخساروں پر بہتے۔ وہ اپنے مولیٰ سے سرگوشیاں کرتے کہ ان کی گردنوں کو دنیا کی غلامی سے آزاد کر دے۔۔۔ اے ابن آدم! اگر وہ چیز جو تمہیں کفایت کرتی ہے تمہیں بے نیاز نہ کرے تو دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو تمہیں بے نیاز کر دے اور اگر جو تمہیں کفایت کر جائے وہ تمہارے لیے کافی ہو جائے تو دنیا کا قلیل حصہ بھی تمہیں کافی ہو جائے گا۔“

شاعری کی طرح فن خطابت کا تانا بانا بھی خیالات و افکار اور فصاحت و بلاغت ہیں۔ یہ آزادی و شجاعت، ہمت و اولوالعزمی کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے، دلائل سے (مخالف کو) خاموش کرنے اور اہم کاموں پر ابھارنے اور اسکا نے کا یہ ایک کارگر حربہ ہے۔ عرب میں خطابت اور خطیب کی بہت اہمیت تھی جس طرح شاعر قبیلہ کی ناک ہوتا تھا اسی طرح وہ خطیب پر بھی فخر کرتے تھے۔ خطیب اپنی تقریر میں دل نشیں اسلوب، سحر بیانی، سلیس و رواں الفاظ، صاف صاف باتیں، چھوٹے چھوٹے ہم وزن جملے، مسجع و مقفی عباریں، ضرب الامثال اور کہاوتیں استعمال کرتے تھے اور مخاطب کو اپنا مضمون ذہن نشین کرنے کے لیے تقریروں میں اختصار مد نظر رکھتے تھے۔ دستور یہ تھا کہ خطیب اونچی جگہ کھڑا ہوتا یا سواری پر بیٹھ کر تقریر کرتا تھا، اثنائے تقریر ہاتھ ہلاتا تھا، مناسب اشاروں سے مفہوم کو واضح کرتا تھا اور ہاتھ میں عصا، نیزہ یا تلوار لے لیتا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہاتھ میں عصا لے کر جمعہ میں تقریر کرنا منقول ہوا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو تمام خطیبوں کے سردار اور ان کے لیے اسوہ اور نمونہ ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبوں میں فتح مکہ کے بعد دیا گیا خطبہ اور خطبہ حجۃ الوداع حدیث و سیرت کی کتابوں میں روایت کیے گئے اور بڑے مؤثر ہیں۔ خطبہ حجۃ الوداع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اے اللہ کے بندو! میں تم سب کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، اس کی اطاعت پر ابھارتا ہوں اور جو اچھا ہے اس کو طلب کرتا ہوں۔ اما بعد، اے لوگو! میری بات سنو، میں تمہیں کھول کھول بیان کرتا ہوں، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ شاید اس سال کے بعد میں اس جگہ پر نہ مل سکوں۔“

اے لوگو! تمہارے خون اور تمہارے مال تم پر حرام ہیں، یہاں تک کہ تم اپنے رب سے ملاقات کرو۔ ایسے ہی حرام ہے جیسے تمہارا یہ آج کا دن محترم ہے، تمہارا یہ مہینہ محترم ہے، تمہارا یہ شہر محترم ہے۔ دیکھو کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ گواہ رہنا۔ اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارے باپ بھی ایک ہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ بلاشبہ اللہ علیم وخبیر ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی برتری نہیں، سوائے تقویٰ کے ذریعہ، بتاؤ کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ! تو گواہ رہنا۔ لوگوں نے کہا: ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچا دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو جو یہاں موجود ہے وہ غیر موجود کو پہنچا دے۔“

اس کے علاوہ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے خطبے بھی تاریخ میں منقول ہوئے ہیں۔ وہ فوجوں کو جہاد پر روانہ کرتے وقت خطبے دیتے تھے اور انہیں نصیحتیں کرتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے حضرات کے خطبے بھی منقول ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر قادیسیہ کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہ[ؓ] کا، خالد بن ولید[ؓ] کا یرموک میں اور ایلہ کی جنگ میں عتبہ بن غزو ان[ؓ] کا خطبہ طبری نے نقل کیا ہے۔

خلافت راشدہ کے اخیر میں صحابہ کے مابین مشاجرات کا دور شروع ہو جاتا ہے جس میں اموی و عثمانی، علوی و خارجی خطبا اپنا زور خطابت دکھاتے ہیں۔ خوارج کا مشہور خطیب قطری بن فجاءہ ہے۔ حضرت امام علی رضی اللہ عنہ عربی زبان کے ایک اہم اور عظیم الشان خطیب ہیں، ان کی خطابت میں قرآنی اسلوب، منہج نبوی سے تاثر اور اعلیٰ درجہ کی فصاحت و بلاغت منتہائے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ ان کے خطبوں کا بڑا حصہ منہج البلاغہ میں جمع کیا گیا ہے، تاہم تاریخ ادب عربی کے محققین مثلاً ڈاکٹر شوقی ضیف اس کتاب کے بیشتر مشتملات کو غیر مستند اور گڑھا ہوا قرار دیتے ہیں۔

دواموی گورنر زیاد بن ابیہ اور جاج بن یوسف عربی زبان کے قدآور خطیب اسی دور میں ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ جہادی مہمات اور سیاسی اختلافات، تفسیر قرآن کے حلقوں اور سیاسی فضا سے الگ وعظ و ارشاد کی مجلسیں بھی سرگرم ہوئی ہیں اور ان میں سبحان وائل، سماک بن حرب اور حسن بصری جیسے زہاد اپنی فصاحت و بلاغت اور مذہبی خطابت کے ذریعہ لوگوں میں دینی شوق اور جذبہ پیدا کر دیتے تھے۔ یوں ان مختلف اسباب کے تحت عصر اسلامی میں خطابت کا فن عروج کو پہنچتا ہے۔

8.6 فرہنگ

پہنائیاں	:	گہرائیاں۔
مصحح	:	صحیح سے آراستہ جملہ جس میں ہم آواز الفاظ لانے کا التزام کیا جاتا ہے۔
مقفی	:	قافیہ والا کلام: قافیہ نثر و نظم میں استعمال کی جانے والی ایک صنعت جس میں سُر یکساں ہوں۔
مفاخر	:	مفخرہ کی جمع: فخر بیان کرنا۔
اسواق عرب	:	زمانہ جاہلیت میں عرب کے وہ مشہور بازار جن میں شعر و ادب کی مجلسیں بھی جیتی تھیں۔
مشاجرات	:	جھگڑا، نزاع، خاص طور پر صحابہؓ کے درمیان ہوئی لڑائیوں اور سیاسی اختلافات کو کہا جاتا ہے۔
منحول	:	گھڑا ہوا، جعلی۔
افح العرب	:	عرب کا سب سے فصیح آدمی۔
آورد	:	تکلف اور بناوٹ سے کوئی بات کہنا۔
توحش کن	:	ایسے الفاظ جن سے سننے والے کو وحشت ہو۔
زیروم	:	اتار چڑھاؤ۔
مؤلفۃ القلوب	:	جن کے دلوں کو کچھ دے دلا کر رام کیا جاتا ہے۔ زکوٰۃ کی ایک مد۔
کالعدم	:	ختم کر دینا، لغو کر دینا۔
قتل عمد	:	جان بوجھ کر قتل کر ڈالنا۔
قتل شبہ عمد	:	جان بوجھ کر قتل نہ کرنا مگر ایسے طریقہ سے مارنا جس سے آدمی کی جان جاسکتی ہو۔
نسبی	:	لوند، سال کے مہینوں کو آگے پیچھے کر دینا جیسا کہ جاہلی زمانہ کے عربوں میں رواج تھا۔
اشراف	:	اشرف کی جمع، قبیلہ و قوم کے بڑے لوگ، معززین۔
تقویت	:	قوت پہنچانا۔
اخطب العرب	:	عرب کا سب سے بڑا خطیب۔
طلاقت لسانی	:	زبان کی روانی۔

زہد و ورع	:	تقویٰ اور پرہیزگاری۔
مولاء	:	مولیٰ کی مؤنث جس کو آزاد کر دیا گیا ہو۔
اضحلال	:	کمزوری۔
مشاہیر	:	مشہور کی جمع، مشہور و معروف لوگ۔
بانگ دہل	:	اعلان کے ساتھ، کھلے عام۔
عشرہ مبشرہ	:	وہ دس صحابی جن کو جنت کی بشارت دینا میں مل گئی تھی۔
سابقون اولون	:	سب سے آگے رہنے والے، سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے۔
منزہ	:	پاک و صاف۔

8.7 نمونہ کے امتحانی سوالات

- ۱۔ عصر اسلامی کی خطابت عہد جاہلی کی خطابت سے کس معنی میں ممتاز ہے؟
- ۲۔ عہد اسلامی میں خطابت کے معانی و مضامین میں کیا اضافہ ہوا؟ مختصر نوٹ لکھیں
- ۳۔ عہد اسلامی کے ممتاز خطبا کون کون ہیں، نام لکھیں اور بتائیں کہ کسی کی خطابت پر کون سا عنصر غالب تھا؟
- ۴۔ الخطبة البتراء کس خطیب کا ہے اور اس کو بتراء کیوں کہتے ہیں؟
- ۵۔ أرى رؤسا قد أینعت و حان خطافها کس خطیب نے کہا تھا، کس سے کہا تھا اور کہاں کہا تھا؟ پس منظر پر روشنی ڈالیے۔
- ۶۔ حضرت علیؓ کے خطبات کے مجموعہ کا کیا نام ہے اور اس پر اہل علم میں کیا اختلاف ہے؟

8.8 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

- ۱۔ تاریخ الأدب العربي المجلد الثاني، العصر الاسلامی ڈاکٹر شوقی ضیف
- ۲۔ تاریخ الأدب العربي، اردو ترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی ڈاکٹر احمد حسن الزیات
- ۳۔ تاریخ الأدب العربي ڈاکٹر عمر فروخ
- ۴۔ فجر الإسلام ڈاکٹر احمد امین
- ۵۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور مادہ حدیث

اکائی 9 عصر اموی کے سیاسی و دینی حالات

- اکائی کے اجزا
- 9.1 مقصد
- 9.2 تمہید
- 9.3 عصر اموی کے سیاسی حالات ایک تعارف
- 9.3.1 اموی خلافت کا پہلا مرحلہ: سفیانی خلفا کا دور
- 9.3.1.1 حضرت معاویہ کا دور خلافت
- 9.3.1.2 یزید بن معاویہ کا عہد خلافت
- 9.3.2 اموی خلافت کا دوسرا مرحلہ
- 9.3.2.1 مروان بن حکم کا دور خلافت (۶۳ تا ۶۵ھ)
- 9.3.2.2 عبدالملک بن مروان کا عہد خلافت (۶۵ تا ۸۶ھ)
- 9.3.2.3 ولید بن عبدالملک کا عہد خلافت (۸۶ تا ۹۶ھ)
- 9.3.2.4 سلمان بن عبدالملک کا عہد خلافت (۹۶ تا ۹۹ھ)
- 9.3.2.5 صالح خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا عہد خلافت (۹۹ تا ۱۰۱ھ)
- 9.3.2.6 ہشام بن عبدالملک کا عہد خلافت (۱۰۵ تا ۱۲۵ھ)
- 9.3.3 سیاسی افراتفری اور اموی خلافت کا زوال
- 9.4 عصر اموی کے دینی حالات ایک تعارف
- 9.4.1 شیعوں کا ظہور
- 9.4.1.1 السبئہ
- 9.4.1.2 الغرابیہ
- 9.4.1.3 زہدیہ

9.4.1.4 الامامیہ الاثناعشریہ

9.4.1.5 الامامیہ الاسماعیلیہ

9.4.2 خوارج

9.4.3 معتزلہ

9.5 اکتسابی نتائج

9.6 فرہنگ

9.7 نمونے کے امتحانی سوالات

9.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

اس اکائی کے ذریعہ آپ کو بنو امیہ کے عہد خلافت کے سیاسی اور دینی حالات کا اندازہ ہوگا اور یہ واضح ہوگا کہ کس طرح یہ پورا عہد سیاسی اٹھل پٹھل اور رسہ کشی کا شکار رہا اور کس طرح مختلف مذہبی جماعتیں اس عہد میں رونما ہوئیں اس اکائی کے ذریعہ واضح ہو جائے گا کہ بنو امیہ کے کن خلفانے اموی خلافت کو سیاسی استحکام بخشا اور کن خلفانے اسے نقصان پہنچایا اور کس خلیفہ کے عہد میں فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھا اور اسلامی ریاست میں کب کتنی توسیع واقع ہوئی۔

حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں ان کی نرم سیاسی پالیسی کی وجہ سے فتنہ پرور عناصر کو شراکینگری اور فتنہ پروری کا پورا موقع ملا جس کی وجہ سے آپؓ کی خلافت کے آخری ایام میں حالات اس قدر بے قابو ہو گئے کہ خود حضرت عثمانؓ بھی اس کا شکار ہو گئے اور شہید کر دیے گئے، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد عالم اسلام کی سیاسی بساط دو خیموں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک طرف حضرت معاویہ تھے جن کا قبضہ شام پر تھا جو حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو بلا تاخیر کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کر رہے تھے اور دوسری طرف حضرت علیؓ اور ان کی جماعت تھی جو ابھی اس مطالبہ کو نافذ کرنے کے لیے مہلت مانگ رہے تھے۔ دونوں خیموں میں اختلافات بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ حضرت معاویہ نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی ضد پر قائم رہے اور دونوں خیموں میں جنگ کی صورتحال بن گئی۔ ان دونوں کے علاوہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی جماعت بھی تھی جن کا دبدبہ حجاز کے علاقے میں قائم تھا۔ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد حالات اور بھی زیادہ مضطرب ہو گئے کہ ایک طرف حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تو دوسری طرف خوارج کی فتنہ انگیزیاں اپنے شباب پر پہنچ گئیں۔ حضرت معاویہ کے ہاتھ پر جب ۴۰ھ میں بیعت لی گئی تب ان کے معاندین اور حریفوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ایک طرف شیعہ تھے تو دوسری طرف خوارج تھے۔ حجاز میں عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے حامی تھے تو وہیں جزیرہ عرب کے مختلف علاقوں میں باغی جماعتیں بار بار بنو امیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہی تھیں۔ ان حالات میں اموی خلافت کا دور شروع ہوا، حالانکہ حضرت معاویہ اور ان کے جانشین یزید اور اس کے بعد عبدالملک بن مروان اور اس کے بیٹے ولید نے اموی خلافت کو اپنی حکمت عملی اور مستحکم سیاسی پالیسی کے ذریعہ تقویت بخشی لیکن فتنوں اور مخالفتوں کا بازار مستقل گرم رہا۔

اگر اس عہد کے دینی حالات کی بات کریں تو مختلف جماعتیں، جو دراصل سیاسی جماعتیں تھیں مگر ان کے خاص مذہبی عقائد بھی تھے، سامنے آئیں اور سب نے اپنے عقائد و افکار کی نشر و اشاعت اور ترویج کے لیے ہر طرح کے وسائل استعمال کیے۔ ان جماعتوں میں شیعہ، خوارج اور معتزلہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ان میں سے ہر جماعت کے اپنے مخصوص افکار و عقائد تھے جن کا ذکر اس موضوع کے تحت آئے گا۔ اور ان میں سے ہر جماعت متعدد فرقوں میں منقسم تھی۔ ان جماعتوں اور ان کے فرقوں میں ہمیشہ رسہ کشی جاری رہتی تھی جن کے پیچھے اکثر سیاسی اسباب و محرکات کارفرما ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نام بھی قابل ذکر ہے جن کا دور خلافت اپنے مذہبی رجحان اور دینی ماحول کی وجہ سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ عصر اموی کے یہ سبھی سیاسی اور دینی پہلو اس موضوع کے تحت آگے آنے والے صفحات

9.3 عصر اموی کے سیاسی حالات ایک تعارف

اموی خلافت کا قیام ۷۱۷ء رمضان ۴۰ھ میں حضرت علیؓ کی شہادت اور خلافت راشدہ کے خاتمہ کے ساتھ ہوا لیکن مؤرخین اس کی باقاعدہ شروعات اس وقت سے مانتے ہیں جب حضرت حسن بن علی نے ۲۵ رجب الاول ۴۱ھ میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے حق میں اپنے حق خلافت سے دست برداری کا اعلان کیا۔ تقریباً اکیانوے سال تک یہ خلافت قائم رہی۔ اس کا اصل اختتام ”معرکة الزاب“ (Battle of the Zab) کی اس فیصلہ کن جنگ پر ہوا جو ۱۱ جمادی الاولیٰ ۳۲ھ میں واقع ہوئی۔ اکیانوے سال کے عرصے میں اموی خلافت پر جن چودہ خلفا نے حکومت کی ان کا تعلق بنو امیہ کے دو خاندانوں سے تھا یا یوں کہہ لیجیے کہ دو شاخوں سے تھا، ایک سفیانی شاخ اور دوسری مروانی شاخ۔

(۱) بنو امیہ کے سفیانی خلفا: اس شاخ سے تین خلیفہ تخت نشین ہوئے اور اس کی خلافت ۴۱ھ سے ۶۴ھ تک یعنی تقریباً ۲۳ سال تک

قائم رہی۔

- | | |
|-----------------------------------|-----------|
| ۱۔ معاویہ بن ابی سفیان | ۴۱ھ - ۶۰ھ |
| ۲۔ یزید بن معاویہ | ۶۰ھ - ۶۴ھ |
| ۳۔ معاویہ بن یزید (معاویہ الثانی) | ۶۴ھ |

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ معاویہ بن یزید بن معاویہ یا معاویہ الثانی کو خلیفۃ المسلمین بنایا گیا لیکن فرزندگان امت اسلامیہ کے درمیان یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد ان کی خلافت پر اتفاق نہیں تھا، لہذا حضرت عبداللہ بن زبیر کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کر لی تھی۔ دوسری بات یہ کہ معاویہ الثانی کی خلافت محض چند مہینوں پر مشتمل تھی جس کے بعد انھوں نے اپنی دست برداری کا اعلان کر دیا جس کے بعد ایک طرف حجاز وغیرہ میں حضرت زبیر کے ہاتھ پر بیعت کی گئی تو دوسری طرف شام میں مروان بن الحکم کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔

(۲) بنو امیہ کے مروانی خلفا: اس شاخ سے گیارہ خلفا نے زمام خلافت سنبھالی اور ۶۴ھ سے ۱۳۲ھ تک قائم رہی۔

- | | |
|------------------------------|-------------|
| ۱۔ مروان بن الحکم | ۶۴ھ - ۶۵ھ |
| ۲۔ عبدالملک بن مروان | ۶۵ھ - ۸۶ھ |
| ۳۔ الولید بن عبدالملک | ۸۶ھ - ۹۶ھ |
| ۴۔ سلیمان بن عبدالملک | ۹۶ھ - ۹۹ھ |
| ۵۔ عمر بن عبدالعزیز بن مروان | ۹۹ھ - ۱۰۱ھ |
| ۶۔ یزید بن عبدالملک | ۱۰۱ھ - ۱۰۵ھ |
| ۷۔ ہشام بن عبدالملک | ۱۰۵ھ - ۱۲۵ھ |

۱۲۵ - ۱۲۶ھ

۸- الولید بن یزید بن عبدالملک

۱۲۶ - ۱۲۷ھ

۹- یزید بن الولید بن عبدالملک

۱۲۷ - ۱۲۸ھ

۱۰- ابراہیم بن الولید بن عبدالملک

۱۲۸ - ۱۳۲ھ

۱۱- مروان بن محمد بن مروان

یہاں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ۶۴ سے ۶۳ تک کے عرصہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر کو حجاز، یمن، عراق اور خراسان کے لوگوں نے خلیفہ المسلمین تسلیم کیا تھا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی معاویہ الثانی اور مروان بن حکم کو اگرچہ بنو امیہ اپنا خلیفہ تسلیم کرتے تھے لیکن اس دور کے زیادہ تر فرزند ان اسلام ان دونوں کی خلافت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

یزید کی وفات کے بعد بنو امیہ کا وجود خطرے میں پڑ چکا تھا، خلافت کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں سے تقریباً نکل چکی تھی، اس وقت مروان بن حکم کی حکیمانہ مداخلت کے ذریعہ بنو امیہ کو دوبارہ سیاسی استحکام حاصل ہوا۔ امویوں اور زبیریوں کے علاوہ شیعہ اور خوارج جیسی سیاسی جماعتیں بھی موجود تھیں جن کا اس پورے عہد کی سیاسی رسہ کشی اور تھل پھل پر پورا اثر تھا بلکہ اس میں ان کا پورا ہاتھ تھا، مندرجہ ذیل فصول کے تحت ان کا ذکر بھی ضمنی طور پر آئے گا۔

9.3.1 اموی خلافت کا پہلا مرحلہ: سفیانی خلفا کا دور

9.3.1.1 حضرت معاویہ کا عہد خلافت

اموی خلافت کا باقاعدہ آغاز حضرت معاویہ کی تاج پوشی سے تب ہوا جب ۴۱ھ میں ان کے ہاتھوں پر خلافت کی بیعت کی گئی اور انھیں خلیفہ المسلمین قرار دے دیا گیا، حالانکہ بہت سی مخالف سیاسی جماعتیں ایسی تھیں جنہوں نے انہیں بحیثیت خلیفہ المسلمین ماننے سے انکار کر دیا تھا ان میں شیعہ، خوارج اور عبداللہ بن زبیر کے متبعین سرفہرست تھے۔

حضرت معاویہ کی پیدائش ہجرت سے اٹھارہ سال قبل ہوئی تھی، آپ اپنے والد ابوسفیان کے ساتھ غزوہ احد اور غزوہ خندق وغیرہ میں مسلمانوں کے خلاف میدان جنگ میں اترے تھے۔ حضرت معاویہ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر اسلام قبول کر لیا تھا لیکن انہوں نے اپنے اسلام کو اپنے والد اور دیگر مشرکین مکہ سے مخفی رکھا یہاں تک کہ فتح مکہ کے بعد جب اللہ کے رسول مکہ تشریف لے گئے تب قریش کے دوسرے کئی سرداروں کی طرح حضرت معاویہ نے بھی اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ قبول اسلام کے بعد وہ اللہ کے رسول کے ساتھ غزوہ طائف اور غزوہ حنین میں شرکت کی۔ بعد میں وہ مدینہ منتقل ہو گئے تھے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

حضرت معاویہ کی جنگی قیادت کا باقاعدہ آغاز خلافت راشدہ کے دور میں تب ہوا جب حضرت ابوبکر نے انھیں ایک فوج کا قائد بنا کر شام میں موجود فوج کی کمک کے طور پر بھیجا، جہاں آپ نے جنگ یرموک میں شرکت کی اور اپنے جوہر دکھائے۔ حضرت عمر کے دور میں قیساریہ کی جس جنگ میں رومیوں کے خلاف مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی وہ بھی حضرت معاویہ کی ہی قیادت میں لڑی گئی تھی۔ ۱۸ھ میں عمواس نامی طاعون کی وبا پھیلنے سے شام میں موجود کئی قائدین لقمہ اجل بن گئے جس کے بعد حضرت عمر نے رفتہ رفتہ بلاد شام کے سبھی علاقے حضرت

معاویہ کے ماتحت کر دیے۔ حضرت عثمان نے بھی خلافت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد حضرت معاویہ کو شام کے والی کے طور پر قائم رکھا۔ حضرت علی نے جب خلافت کی کمان سنبھالی تو انھوں نے بہت سے والیوں کو ان کے منصب سے برطرف کر دیا۔ حضرت معاویہ شام کو رومیوں کے قبضے سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے منصب پر جمے رہے اور بیعت کرنے میں ٹال مٹول کرتے رہے یہاں تک کہ خلیفہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جنگی صورت حال پیدا ہو گئی۔

حضرت علی کی شہادت کے بعد حضرت حسن بن علی کے ہاتھ پر بیعت کی گئی لیکن انھوں نے دست بردار ہونا پسند کیا جس کے بعد ۴۱ھ میں حضرت معاویہ کے ہاتھ پر خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے مسلمانوں نے بیعت کی۔

حضرت معاویہ کی خلافت مسلمانوں کے لیے کئی نالیوں سے ایک اچھی خلافت ثابت ہوئی، وہ اس طرح کہ ایک طرف کئی سالوں سے جاری آپسی خانہ جنگی کافی حد تک کم ہو گئی اور ریاست کا اندرونی سیاسی ماحول کافی حد تک پر امن اور پرسکون ہو گیا، جس کا سیدھا فائدہ یہ ہوا کہ فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھا اور دشمن طاقتوں کو قابو میں کرنے میں کافی مدد ملی چنانچہ رومیوں پر مسلم فوجوں نے ایسا شگجہ کسا کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

حضرت معاویہ نے امت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کرنے کی سنجیدہ کوشش کی اور مخالفین کے خیموں کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اپنے حریفوں کے ساتھ بھی محبت سے پیش آئے چنانچہ حضرت حسن بن علی کے مطالبات کو پورا کیا، حضرت عبداللہ بن عباس کو امان دی اور قیس بن سعد جنھوں نے حضرت علی کی شہادت کے بعد حضرت معاویہ کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا ان کو نہ صرف معاف فرمایا بلکہ انہیں امان بھی دی، بالآخر ان سب نے حضرت معاویہ کی اطاعت و فرماں برداری کو قبول کیا، اسی طرح زیاد بن ابیہ بھی حضرت علی کے مقررین میں سے تھے جو ان کی طرف سے خراسان کے والی تھے۔ جب حضرت علی کی شہادت واقع ہوئی تو زیاد نے خراسان میں خود کو نظر بند کرنا پسند کیا، لیکن حضرت معاویہ نے ان کو بھی محبت کا پیغام بھیجا اور بالآخر انھوں نے حضرت معاویہ کی درخواست کو قبول کیا اور حاضر ہوئے اور حضرت معاویہ نے انہیں پھر سے والی بنا کر انعام و اکرام سے نوازا۔ یہ تھی حضرت معاویہ کی سیاسی پالیسی جس کے تحت وہ سب کو اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے، دشمنان اسلام سے مقابلہ کرنا اور انہیں شکست دینا ان کا اصل مٹح نظر تھا، اس لیے انھوں نے آپسی مصلحت پسندی کو ترجیح دی اور اس کے لیے جو بھی کر سکتے تھے وہ کیا۔

اس دور میں موجود تقریباً سبھی جلیل القدر صحابہ کرام جیسے عبادہ بن صامت، ابو ایوب انصاری، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو، شداد بن اوس وغیرہ حضرت امیر معاویہ کے ساتھ تھے اور ان کے قدم سے قدم ملا کر راہ جہاد میں شریک ہوئے اور اپنی برکتوں سے دشمنوں کے بے شمار قلعے فتح کیے۔

بعض صحابہ ضرور ایسے تھے جو حضرت معاویہ کی ان سیاسی پالیسیوں سے اتفاق نہیں رکھتے تھے لیکن ان کی تعداد برائے نام تھی، البتہ خوارج کی ایک بڑی تعداد تھی جو اپنے موقف کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتے تھے اور موقع دیکھتے ہی بلوہ اور فساد پھیلانے کی کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے ضرور خلیفہ کے خلاف اپنی آواز بلند کی تھی لیکن مجموعی طور پر خلیفہ کے حامیوں کے مقابلہ میں ان خوارج کی تعداد کم تھی اور سیاسی طور پر غیر مؤثر بھی۔ ان کے اصل مراکز کوفہ اور بصرہ کے شہر تھے، یہی وجہ ہے کہ خلیفہ یعنی حضرت معاویہ کی طرف سے ان دونوں شہروں پر متعین کردہ

والی نہایت سخت گیر ہوا کرتے تھے یا یوں کہیے کہ وہ اس قسم کے متمرّد لوگوں کو قابو میں کرنے کے لیے سختی سے پیش آنے پر مجبور تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت معاویہ کے دور میں ان کے خلاف جو سیاسی مورچے قائم ہوئے تھے اس کا اصل مرکز عراق کا علاقہ تھا تو شاید یہ بات غلط نہیں ہوگی۔

حضرت معاویہ کی کچھ سیاسی پالیسیاں مورخین کی تنقید کا نشانہ ضرور بنیں اور خاص طور سے جب انھوں نے اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تو اس کے خلاف کئی صحابہ نے بھی آواز اٹھائی۔ بہر حال امیر معاویہ سے بحیثیت ایک انسان جو بھی سیاسی و غیر سیاسی چوک یا خطا ہوئی اس سے قطع نظر ان کا عہد خلافت ایک مثالی عہد خلافت تھا جس میں ایک طرف اتحاد امت کی سعی و کوشش کی بہترین مثال بھی ملتی ہے تو وہیں فتوحات کی پیش قدمی اور مسلمانوں کی مجموعی خوشحالی بھی قابل ستائش اور ناقابل فراموش ہے۔

حضرت معاویہ کی خلافت کے دوران عالم اسلام بنیادی طور پر چھ ولایتوں یا حصوں میں تقسیم تھا:

(۱) شام: جس کے والی وہ خود تھے۔ یہ علاقہ شروع سے ہی خلیفہ کی حمایت میں ہمیشہ پیش پیش رہا۔

(۲) کوفہ: یہ مخالفین کا مرکز تھا بطور خاص خوارج کا گڑھ تھا، یمامہ کا علاقہ اس کے ماتحت تھا۔

(۳) بصرہ: مشرق میں ہونے والی فتوحات پر یہیں سے نظر رکھی جاتی تھی، بلاد فارس، خراسان اور سجستان وغیرہ بصرہ کے ماتحت

تھے، بعد میں عمان اور بحرین کو بھی اس کے ماتحت کر دیا گیا تھا۔

(۴) خراسان: اکثر یہ بصرہ کے ماتحت رہا، اس کے امیر کا تعین بصرہ کے والی خود کیا کرتے تھے۔

(۵) مدینہ: یہاں پر صحابہ کرام کی بڑی تعداد مقیم تھی۔

(۶) مصر: حضرت عمر کے زمانے میں مصر حضرت عمرو بن العاص کے ماتحت تھا، حضرت معاویہ کے عہد میں دوبارہ سے مصر کی ولایت

ان کے سپرد کی گئی۔

حضرت معاویہ کے دور خلافت میں فتوحات کے سلسلے میں جو وسعت ہوئی وہ یقیناً اس عہد کی ایک اہم خوبی ہے۔ مغرب و مشرق

دونوں ہی طرف فتوحات کا سلسلہ جاری رہا، مسلم فوجوں نے سلطنت روم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور سمندری طاقت میں اپنی جگہ بنائی۔

حضرت معاویہ نے ایک مضبوط بحری بیڑہ تیار کرنے کی طرف خاص توجہ دی، شمال کی طرف اناضول میں طوروس کے پہاڑوں میں

رومیوں سے مقابلے کے لیے حضرت معاویہ نے گرمی اور جاڑے کی الگ الگ فوجیں تیار کیں جو باری باری وہاں جا کر لڑا کرتی تھیں، حضرت

معاویہ نے رومیوں کے مرکز قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کے لیے کئی بار فوج بھیجی اگرچہ مسلم فوج کو اس میں فتح نصیب نہ ہو سکی۔

9.3.1.2 یزید بن معاویہ کا عہد خلافت

حضرت معاویہ نے اپنی وفات سے قبل اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا جن کی وفات کے بعد امت کے سواد اعظم نے ان کے

ہاتھ پر بیعت کر لی، البتہ حجاز میں کچھ لوگوں نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا جن میں حسین بن علی، عبدالرحمن بن ابوبکر، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن

زبیر اور عبداللہ بن عباس وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

یزید کی پیدائش ۲۳ھ میں حضرت عثمان کے دور خلافت میں ہوئی تھی، بچپن کھیل کود اور ناز و نعم میں گزرا، ۲۴ سال کی عمر میں حضرت

معاویہ نے یزید کو فتح قسطنطنیہ کی مہم پر روانہ کیا۔ مذکورہ حضرات کو چھوڑ کر مفتوحہ اسلامی علاقوں کے تقریباً سبھی امرا و عوام نے یزید کی خلافت کو

تسلیم کر لیا تھا۔ یزید کی متواتر سعی و کوشش کے بعد عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس بھی بیعت لینے پر تیار ہو گئے لیکن عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین اس پر راضی نہ ہوئے اور ان دونوں نے مکہ میں پناہ لے لی۔

سیاسی اعتبار سے یزید کا عہد خلافت بہت افراتفری اور اٹھل پٹھل کا دور رہا، جب حضرت حسین نے مکہ میں سکونت اختیار کی تب اہل کوفہ نے ان سے مراسلت کی اور ان کے نام خطوط بھیج کر انھیں کوفہ آنے کی دعوت دی اور انھیں اپنی حمایت کا یقین دلایا، حضرت حسین نے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا تا کہ وہ وہاں جا کر معاملہ کی حقیقت کا پتہ لگا سکیں، جب مسلم بن عقیل وہاں پہنچے تو کوفہ کے بارہ ہزار لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور کوفہ کے عامل نعمان بن بشیر کو برطرف کر دیا اور کوفہ کو بصرہ کے عامل عبید اللہ بن زیاد کے تحت کر دیا گیا۔ مسلم بن عقیل نے حضرت حسین کو کوفہ کے لیے روانہ ہونے کا مشورہ دیا، لیکن کچھ دنوں بعد ہی اہل کوفہ نے مسلم بن عقیل کا ساتھ چھوڑ دیا اور بالآخر انھیں قتل کر دیا گیا۔ حضرت حسین کے کئی خیر خواہوں نے انھیں اپنا ارادہ بدلنے کا مشورہ دیا لیکن وہ اپنے عزم پر قائم رہے اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ ان کے کچھ تبعین بھی تھے جن کی تعداد تقریباً ۸۰ تھی۔ جب حضرت حسین اپنے اس مختصر سے قافلہ کے ساتھ کر بلا نامی مقام پر پہنچے تو کوفہ کے والی عبید اللہ بن زیاد نے ایک لشکر روانہ کیا اور حضرت حسین کا محاصرہ کر لیا، تب حضرت حسین نے کچھ شرطوں کے ساتھ ان سے امان مانگی، لیکن لشکر کے قائد نے ان کی سبھی شرطوں کو ٹھکرا دیا اور ان پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ جانبین میں سخت مقابلہ ہوا۔ بالآخر حضرت حسین نے جام شہادت نوش کیا اور ان کے اہل خانہ اور ان کے تبعین نے بھی ان کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی جانوں کو ان کے اوپر قربان کر دیا۔ یہ واقعہ کر بلا کے نام سے مشہور ہوا اور ۱۰ محرم ۶۱ھ میں پیش آیا۔ اس دل سوز واقعہ سے پوری امت اسلامیہ غم و الم سے کراہ اٹھی اور بطور خاص حجاز میں یزید کے خلاف غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس واقعہ کے بعد اہل مدینہ نے یزید کی بیعت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، ان پر شکنجہ کسے کے لیے یزید نے ایک لشکر بھیجا جس نے مدینہ میں خوب قتل و غارت گری مچائی، پھر ان لوگوں نے مکہ کا رخ کیا اور تقریباً دو مہینے تک اس کا محاصرہ کیے رہے اور خانہ کعبہ وغیرہ کو بھی کافی نقصان پہنچایا۔ اہل مکہ نے عبداللہ بن زبیر کی قیادت میں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس درمیان یزید کی وفات ہو گئی اور اس کی فوج نے واپسی کا راستہ اختیار کیا۔

9.3.2 اموی خلافت کا دوسرا مرحلہ: مروانی خلفا کا دور

9.3.2.1 مروان بن حکم کا دور خلافت (۶۴ھ تا ۶۵ھ)

۶۴ھ میں یزید کی وفات کے بعد خلافت کو لے کر ایک طرح کی رسہ کشی شروع ہو گئی۔ یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ خلیفہ بنا، مگر وہ ایک متقی اور دیندار انسان تھا اور بنو ہاشم کے تین ہمدردی رکھتا تھا، اس لیے اس کی خلافت چالیس دن سے زیادہ نہ چل سکی۔ اس نے اپنے بعد کسی کو خلیفہ بھی مقرر نہیں کیا، کچھ ہی دنوں بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اب خلافت کے مسئلہ پر پوری امت دو خیموں میں بٹ گئی، ایک طرف عبداللہ بن زبیر تھے جنہیں اہل حجاز کی حمایت حاصل تھی چنانچہ یزید کی وفات کے بعد سب سے پہلے اہل حجاز نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی پھر عراق، ایران، مصر اور یمن کے مسلمانوں نے بھی ان کو اپنا خلیفہ تسلیم کر لیا اور ان کے ہاتھ پر ۶۴ھ میں بیعت کر لی۔ دوسری طرف اہل شام تھے جنہوں نے مروان بن الحکم کو اپنا خلیفہ تسلیم کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ مروان کی خلافت صرف ایک سال ہی قائم رہی لیکن اسی دوران مروان نے شام کے ساتھ ساتھ مصر کو اموی خلافت کے زیر نگین کر لیا اور ڈگمگاتی ہوئی اموی خلافت کو بچا لیا۔ مروان نے اپنی وفات سے

پہلے اپنے بیٹے عبدالملک اور عبدالعزیز کو یکے بعد دیگرے خلیفہ بننے کی بیعت لوگوں سے لے لی۔ ۶۵ھ میں دمشق میں اس کی وفات ہوئی۔

9.3.2.2 عبدالملک بن مروان کا عہد خلافت (۶۵ھ تا ۸۶ھ)

عبدالملک بن مروان کی پیدائش ۲۶ھ میں مدینہ میں ہوئی تھی اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ عبدالملک نے سب سے پہلے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے فتنوں کو فرو کرنے کی طرف توجہ دی اور حالات کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ عبدالملک نے اس سخت کام کو اپنی حکمت عملی سے بخوبی انجام دیا۔ اسی وجہ سے ان کو اموی خلافت کے مؤسس ثانی کے لقب سے نوازا گیا تھا۔

بلاد شام اور مصر پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد عبدالملک کے سامنے ایک طرف وہ علاقے تھے جو عبداللہ بن زبیر کے ماتحت تھے تو دوسری طرف شمالی افریقہ کی بربر قوم اور عراق میں خوارج اور شیعوں کے گروہ تھے جنہیں قابو میں کرنا تھا، وہیں مختار ثقفی جیسے کچھ باغی بھی تھے جو جنگی اعتبار سے بہت مضبوط تھے۔ مختار اور عبداللہ بن زبیر کی فوجوں میں زبردست مقابلہ ہوا جس میں مختار قتل کیا گیا۔ عبدالملک نے ایک لشکر جبرار کو روانہ کیا جس نے عبداللہ بن زبیر کے بھائی مصعب بن زبیر اور باغیوں کی جماعت کو شکست دے کر کوفہ اور عراق کے دیگر علاقوں کو اموی خلافت کے زیر نگیں کر دیا، ساتھ ہی عبدالملک نے خوارج کو بھی زبردست ٹکڑے کر انہیں بھی زیر کر دیا۔

اب عبدالملک کے سامنے سب سے بڑے حریف کی شکل میں عبداللہ بن زبیر تھے جن کی خلافت حجاز میں اب بھی قائم تھی۔ ان کو زیر کرنے کے لیے عبدالملک نے اپنے کمانڈر حجاج بن یوسف کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا جس نے مکہ پر چڑھائی کر دی اور منجلیقوں سے حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا اور کعبہ شریف بھی اس میں محفوظ نہ رہ سکا۔ عبداللہ بن زبیر نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، بالآخر ۳۷ھ میں انھوں نے جام شہادت نوش کیا۔ عبداللہ بن زبیر کی شہادت کے ساتھ ہی عبدالملک بن مروان کو سبھی بلاد اسلامیہ کا واحد خلیفہ تسلیم کر لیا گیا۔

عبدالملک نے حجاج کو انعام کے طور پر پورے عراق کا والی مقرر کر دیا جس کے بعد حجاج نے عراق میں جو بھی فتنے اور بغاوتیں تھیں انہیں فرو کر کے اموی خلافت کی بنیادوں کو اور مضبوط کر دیا۔ ابھی کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ حجاج بن یوسف کے ہی ایک کمانڈر عبدالرحمن بن اشعث نے بغاوت کر دی اور کوفہ و بصرہ پر قبضہ کر لیا، لیکن عبدالملک کی بھیجی ہوئی فوجی کمک کے ذریعہ حجاج نے ابن اشعث کو شکست دے کر دوبارہ عراق پر اپنا قبضہ بحال کیا اور ابن اشعث قتل کر دیا گیا۔ بربر قوم کو بھی قابو میں کرنے میں کچھ وقت لگا اور سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑا لیکن پہلی صدی ہجری کی آٹھویں اور نویں دہائی میں ان کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا اور علاقے میں امن و امان قائم ہو گیا۔

عبدالملک بن مروان کا عہد اس اعتبار سے بھی اہم تھا کہ اسی عہد میں اموی خلافت کو سیاسی استحکام نصیب ہوا اور اس کی بنیادیں اور مضبوط و پختہ ہو گئیں۔ یہ عہد کئی انتظامی اصلاحات کی وجہ سے بھی ممتاز ہے بطور خاص سرکاری کام کاج کے لیے عربی کو لازمی قرار دینا اور نئے سکوں کو چلوانا اور بیت المقدس میں قبۃ الصخرہ کی تعمیر کرنا وغیرہ۔ عبدالملک نے ۸۶ھ میں اپنی وفات سے قبل بالترتیب اپنے بیٹے ولید اور سلیمان کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا۔

9.3.2.3 الولید بن عبدالملک کا عہد خلافت (۸۶ھ تا ۹۶ھ)

ولید نے اپنے والد کی وفات کے بعد ۸۶ھ میں خلافت کی باگ ڈور سنبھالی۔ ولید کا عہد خلافت اسلامی فتوحات اور امن و امان کا دور

کہلاتا ہے۔ عبدالملک نے اپنے عہد میں چھوٹے بڑے تقریباً سبھی فتوں کا قلع قمع کر دیا تھا۔ اس لیے ولید کو داخلی مسائل کا زیادہ سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس نے فتوحات پر پوری توجہ دی۔ ولید کے عہد خلافت میں بلاد اسلامیہ کی وسعتوں میں اس قدر اضافہ ہوا کہ اس کی سرحدیں سندھ اور چین کی سرحدوں سے لے کر مغربی افریقہ اور جنوبی یورپ تک پھیل گئیں۔

ولید کے عہد میں مشرق کی جانب سندھ اور ترکستان کے وسیع و عریض علاقے فتح کیے گئے، کہ ایک طرف عراق کے والی حجاج بن یوسف کے قائد اور خراسان کے والی قتیبہ بن مسلم کی قائدانہ صلاحیتوں کی بدولت ترکستان، خوارزم اور سمرقند جیسے علاقوں پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا، تو دوسری طرف حجاج کے ہی ایک دوسرے قائد محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کر کے ہندوستان کی طرف پیش قدمی کی اور ۸۹ھ میں دیبل (حالیہ کراچی) کو فتح کر لیا اور کچھ ہی دنوں بعد سندھ کے راجہ داہر کو شکست دے کر وہاں بھی اسلامی پرچم نصب کر دیا ان فتوحات کے بعد سندھ اور ترکستان کے ان سبھی مفتوحہ علاقوں میں زیادہ تر لوگ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

فتح اندلس:

ایک طرف جہاں قتیبہ بن مسلم اور محمد بن قاسم مشرق میں یکے بعد دیگرے مختلف علاقے فتح کرتے چلے جا رہے تھے، وہیں دوسری طرف مغرب کی جانب اموی لشکر کے قائد موسیٰ بن نصیر اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہے تھے۔ موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کو جو طنجہ کے امیر تھے، بربر مسلمانوں پر مشتمل ایک لشکر کا قائد بنا کر فتح اندلس کے لیے روانہ کر دیا۔ طارق بن زیاد نے ۹۲ھ میں سبتہ نامی مقام سے سمندر کو پار کر کے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اندلس کی سر زمین پر قدم رکھا۔ یہ واقعہ مشہور ہے کہ طارق نے ان کشتیوں کو جلواد یا تھا جن پر سوار ہو کر اس کی فوج نے سمندر پار کیا تھا تاکہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے کی سوچ بھی نہ سکیں۔ اندلس پہنچ کر جس پہاڑ پر اس کی فوج نے اپنا پڑاؤ ڈالا تھا وہ جبل طارق (Gibraltar) کے نام سے مشہور ہوا۔

اس موقع پر طارق بن زیاد نے اپنا وہ مشہور فصیح و بلیغ اور پر جوش خطبہ دیا تھا جو تاریخ اور ادب کی کتابوں میں مذکور ہے۔ طارق بن زیاد کے بہادر سپہ سالاروں اور فوجیوں نے اسپین کے عیسائی بادشاہ لذر ریک (رودریک) کو زبردست ٹکر دی، سات دن تک گھمسان جنگ جاری رہی، آخر کار آٹھویں دن مسلمانوں نے یہ جنگ جیت لی۔ رودریک میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا اور غرقاب ہو کر مر گیا، تاریخ میں یہ معرکہ ”معرکہ شریش“ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پھر طارق بن زیاد نے اسپین کے دارالسلطنت طلیطلہ کو فتح کیا اور پھر قرطبہ اور اشبیلیہ نامی شہروں کو فتح کر لیا۔ اس طرح پانچ مہینوں سے بھی کم عرصے میں اندلس کی سر زمین پر مسلمانوں نے اپنی فتح کا پرچم نصب کر دیا۔

9.3.2.4 سلیمان بن عبدالملک کا عہد خلافت (۹۶ھ تا ۹۹ھ)

ولید بن عبدالملک کی وفات کے بعد ان کے بھائی سلیمان مسند خلافت پر ۹۶ھ میں بیٹھے۔ سلیمان کے عہد خلافت کی شروعات ہی جس طرح کی سیاسی پالیسی کے ساتھ ہوئی وہ خلافت کے لیے نقصان دہ ثابت ہونے والی تھی، سلیمان نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی سب سے پہلے ان قائدین اور والیوں کو برطرف کر دیا جنہوں نے ولید کے عہد میں مشرق و مغرب میں وسیع و عریض علاقے فتح کیے تھے۔

سلیمان نے نہ صرف انہیں اپنے عہدوں سے برطرف کیا بلکہ انہیں سزائیں تک دیں۔ ان میں بطور خاص محمد بن قاسم، قتیبہ بن مسلم،

موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد قابل ذکر ہیں۔

سلیمان کے عہد کے اہم کارناموں میں فتح قسطنطنیہ کی وہ کوشش تھی جو کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہوتے صرف اس لیے رہ گئی کہ سلیمان جو خود مسلم لشکر کی مدد کے لیے زبردست کمک لے کر قسطنطنیہ کی طرف نکلا تھا، راستے میں سخت بیماری کا شکار ہو گیا اور مسلم لشکر کو جس نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر رکھا تھا اسے ختم کر کے واپس آنا پڑا۔ سلیمان نے اپنے چچا زاد بھائی عمر بن عبدالعزیز کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور ۹۹ھ میں وفات پائی۔

9.3.2.5 صالح خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا عہد خلافت (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ)

عمر بن عبدالعزیز ایک متقی اور صالح انسان تھے، شریعت کا وسیع علم رکھتے تھے اور اپنے اعلیٰ اخلاق کے لیے لوگوں میں جانے جاتے تھے۔ مدینہ کے علما و فقہاء سے انھوں نے شریعت کا علم حاصل کیا تھا، ادب اور دیگر علوم میں بھی اچھی دسترس حاصل تھی۔ سیرت اور اخلاق کے اعتبار سے انہیں کو بنو امیہ کا سب سے بہترین خلیفہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ نہایت سادہ مزاج اور بہت انصاف پسند انسان تھے، جو والی رعایا پر ظلم کرتے تھے اور بد عنوانی کا شکار تھے وہ انہیں برطرف کر دیا کرتے تھے۔ امت مسلمہ میں اتحاد کی فضا قائم کرنے کی غرض سے وہ شیعوں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آئے اور انصاف کا معاملہ کرنے کا حکم دیا۔ بنو امیہ کے پچھلے خلفا نے جو غیر ضروری ٹیکس لگا رکھے تھے ان کو ختم کیا، جن لوگوں کی زمینوں پر قبضے کر لیے گئے تھے انہیں ان کی زمینیں واپس لوٹائی گئیں، والیوں کو یہ حکم دیا گیا کہ کوئی سخت سزا خلیفہ سے مشورہ کیے بغیر نافذ نہ کی جائے۔ اس طرح سے اس عہد میں ظلم و ستم کا خاتمہ ہوا اور امن و امان کو دور دورہ ہوا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے خلافت کے داخلی امور کی طرف زیادہ توجہ دی اور ان کی اصلاح کی بھرپور کوشش کی جس کی وجہ سے فتوحات کا سلسلہ اس عہد میں کچھ خاص آگے نہ بڑھ سکا۔ ۱۰۱ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

9.3.2.5 ہشام بن عبدالملک کا عہد خلافت (۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ)

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد سلیمان بن عبدالملک کی وصیت کے مطابق یزید بن عبدالملک خلافت پر بیٹھے۔ وہ ایک کمزور اور عیاش قسم کے انسان تھے، سیاسی اعتبار سے نا تجربہ کار اور ناعاقبت اندیش تھے، چنانچہ عمر بن عبدالعزیز اور دیگر سابق خلفا نے جس طرح سے خلافت کو سیاسی سطح پر مضبوط کیا تھا یزید بن عبدالملک کے دور میں اسے اتنا ہی نقصان لاحق ہوا۔ ان کا دور خلافت تقریباً چار سال تک قائم رہا۔ ان کے بعد ان کا بھائی ہشام بن عبدالملک خلیفہ بنایا گیا، ہشام نے اپنے بھائی اور سابق خلیفہ یزید کی نااہلی کی وجہ سے ہونے والے نقصان کی بھرپائی کرنے کی کوشش کی جو کچھ حد تک کامیاب بھی ثابت ہوئی۔ فتوحات کا سلسلہ بھی پھر سے شروع ہوا اور کئی رومی شہر فتح کیے گئے۔ وہیں دوسری طرف ترکوں نے مفتوحہ علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو اسد بن عبداللہ قسری کی قیادت میں ترکوں کو زیر کیا گیا اور سمرقند و بخاری کو دوبارہ فتح کیا گیا، شمالی افریقہ میں بھی بربر قبائل نے علم بغاوت بلند کیا لیکن مسلم لشکر کی بہادری اور جانبازی کی وجہ سے اس بغاوت کو فرو کر دیا گیا اور قیروان اور طنجہ شہر پھر سے فتح کر لیے گئے۔ یہ فتوحات ہشام کی سیاسی حکمت عملی کا ہی نتیجہ تھیں۔

9.3.3 سیاسی افراتفری اور اموی خلافت کا زوال

ہشام بن عبدالملک کے بعد بہت تیزی کے ساتھ اموی خلافت روبہ زوال ہو گئی، سیاسی انتشار اور افراتفری ہر طرف عام ہو گئی۔ ہشام

بن عبد الملک کے بعد تقریباً سات سالوں میں چار خلیفہ مسند خلافت پر بیٹھے جو سب نا اہل اور غیر ذمہ دار ثابت ہوئے۔ ہشام کے بعد ان کا بھتیجا ولید بن یزید خلیفہ بنا جو ایک نہایت لاپرواہ اور نا اہل قسم کے خلیفہ ثابت ہوئے۔ ایک سال تین ماہ خلافت کے عہدے پر قائم رہنے کے بعد اپنے ہی چچا زاد بھائی یزید بن ولید کے ہاتھوں قتل کر دیے گئے۔ یزید بن ولید ایک نیک طینت انسان تھے لیکن صرف چھ ماہ بعد طاعون کے مرض میں مبتلا ہو کر لقمہ اجل بن گئے۔ ان کے بعد ان کا بھائی ابراہیم بن ولید خلیفہ بنے لیکن مروان بن محمد جو آذر بائیجان اور ارمینیا کا والی تھا اس نے ابراہیم کے خلاف بغاوت کر دی اور ابراہیم کو شکست دے کر مرکز خلافت پر قبضہ کر لیا۔ ابراہیم بھاگنے پر مجبور ہوئے اور بالآخر اپنی شکست تسلیم کر کے مروان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ مروان نے ۱۲ھ میں خلافت کی ذمہ داری سنبھالی۔ مروان کا پورا عہد مختلف بغاوتوں اور فتنوں کو فرو کرنے میں ہی نکل گیا۔ خود بنو امیہ کے کئی امرا ان کے خلاف اعلان بغاوت کر چکے تھے، ابھی مروان ان فتنوں سے نبٹنے کی کوشش میں ہی لگے ہوئے تھے اور پوری خلافت سیاسی انتشار اور افراتفری سے دوچار تھی کہ اسی دوران ابو مسلم خراسانی کی قیادت میں عباسی خلافت کے قیام کی کوششیں تیز ہو گئیں۔ اموی خلافت کے خاتمے اور عباسی خلافت کے قیام کا بگل اب بچ چکا تھا۔ مروان نے فوراً عباسیوں کے سردار ابراہیم کو گرفتار کر لیا، ابراہیم نے گرفتاری سے قبل اپنے بھائی ابو العباس السفاح کو قیادت کی ذمہ داری سونپی۔ ابو مسلم خراسانی اور اموی افواج کے درمیان مقابلہ جاری رہا جس میں خراسانی کو کامیابی ہاتھ لگی، آہستہ آہستہ کوفہ بھی اس کے قبضے میں آ گیا۔ خلیفہ مروان نے ایک زبردست لشکر کے ساتھ عباسیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے عراق کا رخ کیا اور موصل سے تقریباً ۱۲۵ کلومیٹر کی دوری پر نہر زاب کے کنارے دونوں لشکروں میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں اموی فوج کو شکست اور عباسیوں کو فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح اموی خلافت کا خاتمہ ہوا اور عباسی خلافت کے نام سے ایک نئی خلافت وجود میں آئی۔

9.4 عصر اموی کے دینی حالات ایک تعارف

اللہ کے رسول ﷺ کی وفات کے بعد جب حضرت ابو بکرؓ خلیفہ مقرر ہوئے تب امت کو جو بڑے مسائل درپیش تھے ان میں ایک بڑا مسئلہ ارتداد کا تھا، یعنی بہت سے مسلمانوں نے آپ ﷺ کی وفات کے بعد زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت ابو بکر کو ان کے خلاف سخت کاروائی بھی کرنی پڑی تب کہیں جا کر یہ مسئلہ قابو میں آیا۔ عہد صدیقی کا دوسرا بڑا مسئلہ منافقین کی جماعت تھی جن میں عبد اللہ بن سبا جیسے یہودی بھی شامل تھے۔ منافقین آپ ﷺ کی زندگی میں بھی ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں رچتے رہے اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد انھوں نے انتشار اور بدامنی پیدا کرنے اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کو راہ راست سے بھٹکانے کے لیے اور بھی نئے نئے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیے۔ ان لوگوں نے ہمیشہ دین کا سہارا لے کر ماحول کو خراب کرنے اور اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ حضرت عثمان کی شہادت ہو یا حضرت علیؓ کی شہادت ہو یا واقعہ کربلا ہو ان سب کے پیچھے انہیں منافقوں اور یہودیوں کا ہاتھ تھا۔

جب اموی خلافت قائم ہوئی اس وقت مسلمانوں کے درمیان دو مذہبی جماعتیں وجود میں آچکی تھیں ایک شیعہ اور دوسری خوارج۔ حالانکہ ان کے قیام کا اصل سبب سیاسی تھا اور سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت ہی یہ جماعتیں وجود میں آئی تھیں لیکن ان دونوں کے اپنے اپنے مذہبی عقائد و افکار تھے جن کی بنیاد پر وہ اپنی پالیسیاں اور اپنے منصوبے تیار کرتے تھے، یا یوں کہہ لیجئے کہ مذہب کی آڑ میں ہی یہ جماعتیں اپنے

سیاسی وغیر سیاسی مقاصد کو حاصل کرنا چاہتی تھیں (بعد میں ہر جماعت سے بہت سے فرقے پیدا ہو گئے جن میں سے ہر ایک کے اپنے مخصوص عقائد و افکار تھے، کچھ تو تادیر باقی رہے، جب کہ کچھ جلد ہی رو بہ زوال ہو گئے) ان دو جماعتوں کے علاوہ اموی دور میں ایک اور جماعت مذہبی رنگ میں سامنے آئی اور وہ تھی معتزلہ کی جماعت۔ ان سبھی جماعتوں اور اس عہد سے جڑے کچھ دیگر مذہبی پہلوؤں پر اس موضوع کے تحت گفتگو کی جائے گی۔

9.4.1 شیعوں کا ظہور

اللہ کے رسول ﷺ کی وفات کے بعد جو مذہبی مکاتب فکر نمودار ہوئے ان میں سب سے قدیم شیعہ مکتب فکر ہے۔ حضرت عثمان کی عہد خلافت میں ہی اس جماعت کا ظہور ہو گیا تھا، پھر حضرت علی کے عہد خلافت میں اس کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور ہزاروں لاکھوں فرزندگان اسلام اس جماعت سے منسلک ہو گئے۔ اس جماعت کے عقائد کی اصل بنیاد حضرت علی سے بے پناہ محبت اور لگاؤ تھا لیکن شروع سے ہی اس محبت و عقیدت پر غلو کا اس قدر غلبہ رہا کہ بہت سے شیعہ فرقے سبھی حدوں کو تجاوز کرتے ہوئے حضرت علی کو الوہیت تک کا درجہ دے بیٹھے۔ ان کے عقائد کی اصل بنیاد یہ تھی کہ امامت اور خلافت اسلام کا ایک اہم رکن ہے اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ نبی نے اپنا خلیفہ مقرر نہ کیا ہو چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علی کو ہی اپنا خلیفہ و جانشین مقرر کیا تھا، اس کے علاوہ شیعہ حضرت علی کو تمام دیگر صحابہ سے افضل مانتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ اس مکتب فکر کی شروعات حضرت علی کے تین حد سے زیادہ عقیدت و احترام سے ہوئی، حالانکہ حضرت علی نے خود اس طرح کے رجحانات کی کبھی تشبیح نہیں کی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے تابعین نے ان کی اعلائے شان میں غلو سے کام لینا شروع کر دیا اور کچھ فرقے حد سے تجاوز بھی کرنے لگے۔ اس جماعت کی مقبولیت کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ حضرت معاویہ نے اپنے عہد میں ایک نیا طریقہ یہ شروع کیا کہ ہر خطبہ کے بعد حضرت علیؓ کو لعن طعن کیا جائے اس سے شیعوں کے جذبات مجروح ہوئے، کئی صحابہ نے حضرت معاویہ کو ایسا کرنے سے منع بھی کیا لیکن وہ نہ مانے۔ یہ سلسلہ بعد کے خلفاء کے عہد میں بھی جاری رہا یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس پر روک لگائی۔ اس کے علاوہ بنو امیہ کے عہد میں حضرت حسین کی شہادت ہوئی اس سے بھی شیعوں کے تین لوگوں کی ہمدردی میں اضافہ ہوا۔ بنو امیہ کی ان زیادتیوں کی وجہ سے ان کے تین صحابہ اور دیگر بہت سے لوگوں میں ایک طرح کا غصہ پیدا ہو گیا اور شیعوں کے قدم آہستہ آہستہ مضبوط ہوتے چلے گئے۔ ان کا اصل مرکز دراصل عراق تھا، ایک تو اس لیے کہ حضرت علی نے آخری ایام میں وہیں سکونت اختیار کی اور اس کو اپنا دار الخلافہ قرار دیا چنانچہ اہل عراق نے حضرت علی کے فضل و کرم کو بہت قریب سے دیکھا، اس کے بعد اہل عراق نے کبھی بھی اخلاص کے ساتھ بنو امیہ کی تائید و حمایت نہیں کی جس کے پاداش میں انھیں بنو امیہ کے غیظ و غضب کا شکار بھی ہونا پڑا، کبھی عبید اللہ بن زیاد، کبھی زیاد بن ابیہ اور کبھی حجاج بن یوسف جیسے سخت گیر قسم کے قائدین ان پر مسلط کیے گئے، شاید اسی کا رد عمل تھا کہ عراق بنو امیہ کے آخری ایام میں شیعیت کے سب سے اہم مرکز کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ اموی دور میں جو سب سے اہم دینی تبدیلی واقع ہوئی وہ دراصل تشیع کا ظہور اور اس کا ارتقا تھا۔ اس عہد میں شیعیت میں کئی فرقے وجود میں آئے جن میں سے ہر فرقے کے اپنے عقائد تھے، ان میں کچھ اہم فرقوں کا یہاں اختصار کے ساتھ ذکر کیا جا رہا ہے:

9.4.1.1 السبئیہ

یہ عبداللہ بن سبا کے متبعین کی جماعت ہے جو ایک یہودی تھا اور قبول اسلام کا دعویٰ کرتا تھا۔ اس نے حضرت عثمان اور ان کی خلافت کے خلاف اس نے ایک مہم چھیڑ رکھی تھی، اس نے حضرت علی کو پہلے اللہ کے رسول کا وحی قرار دیا اور پھر انہیں کو خدا تک کا درجہ دے بیٹھا، حضرت علی کی وفات کو بھی وہ ان کی وفات تسلیم نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا ماننا تھا کہ انہیں آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا ہے جیسے حضرت عیسیٰ کو اٹھا لیا گیا تھا۔ ان میں سے بعض کا یہ بھی ماننا ہے کہ اللہ کی ذات حضرت علیؑ اور باقی ائمہ کی ذات میں حلول کر گئی تھی (نعوذ باللہ من ذلک)۔

9.4.1.2 الغرابیہ

یہ بھی شیعوں کا ایک غالی فرقہ ہے جو عصر اموی میں ظاہر ہوا۔ اس کے مطابق حضرت علیؑ ہی دراصل نبوت کے حقدار تھے اور جبرئیلؑ نے غلطی سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل کر دی، کہ حضرت علیؑ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت مشابہت رکھتے تھے ایسے ہی جیسے ایک کو دوسرے کوے سے مشابہت رکھتا ہے۔ کوے کو عربی میں غراب کہتے ہیں، اسی وجہ سے اس جماعت کا نام الغرابیہ پڑا۔ اس قسم کے شیعہ فرقے غالی فرقے کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ شیعہ فرقے ایسے ہیں جو معتدل فرقے کہلاتے ہیں اور ان کے عقائد میں بہت زیادہ انحراف یا شدت نہیں پائی جاتی ان میں سے کچھ کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

9.4.1.3 زیدیہ

یہ اپنے عقائد کے اعتبار سے ایک اعتدال پسند شیعہ فرقہ ہے۔ ان کے یہاں ائمہ کا درجہ نبی سے بڑھ کر یا نبی کے مساوی نہیں ہے بلکہ نبی کے بعد ہے۔ انھوں نے غالی فرقوں کی طرح صحابہ کرام پر کفر کے فتوے نہیں لگائے۔ اس فرقے کے امام زید بن علی زین العابدین تھے جو ایک متقی اور صالح انسان تھے، وہ ایک ذی علم انسان تھے۔ اپنے دور کے علما سے انھوں نے استفادہ بھی کیا تھا۔ امام زید بن علی نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافت کو بھی تسلیم کیا ہے۔

9.4.1.4 ال امامیہ الاثنا عشریہ

ان کے مطابق ائمہ کی تعیین شریعت میں باقاعدہ طور پر کر دی گئی ہے، حضرت علی سے لے کر محمد بن حسن عسکری تک کل بارہ امام ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہی اس جماعت کو الامامیہ الاثنا عشریہ کہا جاتا ہے۔ ان کے مطابق شرعی معاملات میں امام کی بات ہی حرف آخر ہوتی ہے۔

9.4.1.5 ال امامیہ الاسماعیلیہ

یہ فرقہ دراصل شیعوں کی امامیہ جماعت کی ہی دوسری شاخ ہے۔ شیعوں کی یہ جماعت ان کے ایک امام اسماعیل بن جعفر صادق کی طرف منسوب ہے۔ اثنا عشریہ کے مطابق امام جعفر صادق کے بعد امامت ان کے بیٹے موسیٰ کاظم کے حصے میں آئی جب کہ اسماعیلیہ کا ماننا ہے کہ امام جعفر صادق کے بعد امامت ان کے دوسرے صاحبزادے اسماعیل کے حصے میں آئی، ان کے مطابق امام جعفر نے از خود اپنی وفات سے قبل اس کی وصیت کر دی تھی، بعد کے ادوار میں شیعوں کے یہاں اور بھی دوسرے فرقے وجود میں آئے، جیسے الحاکمیہ اور النصیریہ وغیرہ۔

9.4.2 خوارج

خوارج کی جماعت نے چونکہ حضرت علیؓ کے حکم سے خروج کیا تھا یعنی اسے ماننے سے انکار کیا تھا اسی لیے انھیں خوارج کا نام دیا گیا۔ انھیں الحُرور یہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے جو حُروراء نامی مقام کی طرف منسوب ہے جس کی طرف انھوں نے رخ کیا تھا، ان کو شراۃ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے وہ اس لیے کہ یہ لوگ آیت کریمہ ”وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ“ کے مطابق اپنے بارے میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی نفوس کو اللہ کی راہ میں بیچ دیا ہے یا قربان کر دیا ہے، اس لیے وہ شراۃ ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو دین حق پر پوری ثبات قدمی سے قائم واحد دینی جماعت مانتے ہیں۔

یہ دراصل ایک سیاسی جماعت تھی لیکن اس کے بہت سے عقائد و افکار ایسے تھے جن پر اس جماعت کی بنیاد قائم تھی۔ فرقہ خوارج کا ظہور بھی دراصل فرقہ شیعہ کی طرح حضرت علی کے عہد خلافت میں ہوا۔ حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان صفین کی جنگ میں زبردست مقابلہ ہوا اور حضرت معاویہ کی فوج شکست کے قریب تھی تبھی ان کے سپاہیوں نے مصحف اپنے ہاتھوں میں اٹھالیے اور یہ مطالبہ کرنے لگے کہ فیصلہ اب اس قرآن کے ذریعہ سے ہونا چاہیے۔ حضرت علی چاہتے تھے کہ جنگ اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ فتح و شکست کا آخری فیصلہ نہ ہو جائے۔ اسی بیچ ان کے حامیوں میں سے ایک جماعت نے ان کی مخالفت کی اور ان پر یہ دباؤ ڈالا کہ وہ اس مطالبہ کو قبول کر لیں اور حضرت علی کو ناچاہتے ہوئے بھی اس فیصلہ کو منظور کرنا پڑا۔ پھر یہ طے ہوا کہ ایک ایک حکم دونوں طرف سے طے کیا جائے۔ خارجیوں کی اس جماعت نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو حکم بنانے کا مطالبہ کیا جب کہ حضرت علی عبداللہ بن عباس کو حکم بنانا چاہتے تھے، خوارج اپنی ضد پر قائم رہے اور بالآخر انھوں نے حضرت علی کی قیادت سے بغاوت کر دی اور الٹا ان کے خلاف کھڑے ہو گئے اور ان سے یہ مطالبہ کرنے لگے کہ وہ تحکیم والے مسئلہ پر توبہ کریں کیوں کہ وہ فیصلہ کفر کے موافق تھا۔

یہ فرقہ ایک نہایت تشدد اور جذباتی قسم کا فرقہ تھا، اپنے مذہب اور موقف کے دفاع میں بہت سخت رویہ رکھتا تھا، شرعی معاملات و مسائل کو قرآن و حدیث کے ظاہری معنی و مفہوم کے اعتبار سے طے کرتا تھا، ”لا حکم الا للہ“ ان کا شعار تھا۔ ایک طرف تو انھوں نے حضرت علیؓ اور ان کے حامیوں کو نشانہ بنایا تو دوسری طرف حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ اور ان اموی خلفا سے بھی برأت کا اظہار کیا جنہیں وہ ظالم و جابر قرار دیتے تھے۔ ان کی جرأت و بے باکی کا یہ عالم تھا کہ وہ حضرت علی کو دوران خطبہ ٹوک دیتے تھے، بلکہ دوران نماز بھی ان کو ٹوکنے سے باز نہیں آتے تھے، حضرت علی اور حضرت عثمان کے متبعین کو مشرک اور کافر تک کہہ دیتے تھے۔ حضرت علی نے اپنے دور خلافت میں ان کی لگام کسنے کی کوشش کی تھی لیکن ان میں سے جو بیچ گئے تھے انھوں نے اپنے عقائد و افکار کو لوگوں میں پھیلا کر اپنے مذہب کو مضبوطی دینے کی کوشش کی۔

خوارج کے حوالے سے ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ ان میں سے اکثر کا تعلق عرب کے بدوؤں سے تھا جو ظہور اسلام کے وقت نہایت خستہ حال تھے اور علوم و فنون سے بالکل نا آشنا تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے اندر موجود جاہلی عادات و صفات پوری طرح سے ختم نہ ہو سکی تھیں اور اس کا اثر ان کے افکار و عقائد میں بھی نظر آتا تھا مثلاً وہ اپنے ارادے کے بہت پکے ہوا کرتے تھے۔ اپنے عقائد و افکار کے تئیں بہت مخلص اور راسخ العقیدہ ہوتے تھے، اسی طرح بہت جری و بے باک اور نہایت بہادر ہوا کرتے تھے اور ان کے مزاج میں خشونت اور سختی تھی۔ ان کے عقائد و افکار میں سے کچھ کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) خلیفہ کا تعین ایک آزادانہ اور غیر جانب دارانہ انتخاب کے ذریعہ ہی ہونا چاہیے اور مسلمانوں کی اکثریت مل کر طے کرے کہ کس کو خلیفہ بننا چاہیے، نہ تو وہ اس بات کے قائل تھے کہ خلافت صرف قریش یا اہل بیت کا حق ہے اور نہ ہی اس بات کے کہ یہ صرف عربوں کا حق ہے عجمیوں کا نہیں۔

(۲) خوارج کے بنیادی عقائد میں سے ایک یہ ہے کہ گناہوں کا مرتکب بھی کافر ہوگا۔ اپنے اس عقیدہ کو قرآنی آیات کی غلط تفسیر کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے، مثلاً قرآنی آیت ہے کہ ”وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حُجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلاً وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ“

(ترجمہ: لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے)

کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تارک حج کو کافر قرار دیا ہے، اس لیے مرتکب گناہ کبیرہ بھی کافروں میں شمار کیے جائیں گے۔ اسی طرح ایک دوسری آیت قرآنی پیش کرتے ہیں ”وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ“

(ترجمہ: جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں) کہتے ہیں کہ گناہوں کا مرتکب اللہ کے حکم کے خلاف اپنی ذات کے لیے فیصلہ کرتا ہے لہذا وہ کافر قرار دیا گیا ہے۔

خوارج کے حوالے سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ نہایت فصیح و بلیغ ہوا کرتے تھے، خطابت میں بے انتہا ماہر ہوا کرتے تھے، تاریخ و ادب کی کتابوں میں ان کی فصاحت و بلاغت کے نمونے بکثرت موجود ہیں، فصاحت و بلاغت کے علاوہ علوم شرعیہ پر بھی انہیں بہت دسترس حاصل تھی، قرآن و حدیث کا گہرا علم رکھتے تھے، فقہی مسائل پر بھی ان کی مضبوط پکڑ تھی، بحث و مباحثہ میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا، بہت قوی الحجج ہوا کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ بحث و مباحثہ کے دوران اگر اپنا پہلو کمزور لگتا تھا تو حدیثیں گڑھ کر انہیں اللہ کے رسول کی طرف منسوب بھی کر دیتے تھے، قرآن و حدیث کے ظاہری حکم کو مانتے تھے، قرآنی آیات اور احادیث رسول کے اصل معنی و مفہوم، اس کے سیاق و سباق اور اس کے اغراض و مقاصد کو تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ ہر مسئلہ میں ظاہر پر ہی حکم لگاتے تھے۔

خوارج کے کئی فرقے اموی دور میں ظاہر ہوئے۔ کچھ کا مختصر تعارف یہاں پیش کیا جاتا ہے:

(۱) الأزارقہ: یہ نافع بن ازرق کے تبعین تھے۔ خوارج کی اکثریت کا تعلق اسی جماعت سے تھا۔ عبد اللہ بن زبیر اور بنو امیہ کا مقابلہ خوارج کی اسی جماعت سے سب سے پہلے ہوا تھا۔ نافع نے تقریباً نو سال تک اپنے ان حریفوں سے جنگ لڑی۔ ان کے بنیادی عقائد میں نمایاں یہ ہیں کہ یہ اپنے مخالفین کو غیر مسلم مانتے تھے بلکہ ان کے مطابق ان کا دائمی ٹھکانہ جہنم ہے اور ان سے قتال جائز ہے، یہ لوگ رجم کی سزا کو نہیں مانتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ زانی اور زانیہ کو صرف کوڑوں سے مارا جانا چاہیے، کیوں کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے اور ان کے نزدیک یہ حدیث سے بھی ثابت نہیں ہے، ان کے مطابق انبیائے کرام کبار و صغائر گناہوں کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔

(۲) الخجدات: یہ نجدہ بن عویمیر کے تبعین ہیں۔ ان کے عقائد بھی ازارقہ سے ملتے جلتے ہیں، البتہ انھوں نے تقیہ کا نیا عقیدہ پیش کیا وہ یہ کہ ایک خارجی مصلحتاً اپنے عقیدے کو پردہ خفا میں رکھے جب تک کہ اس کو ظاہر کرنے کا مناسب وقت نہ آجائے۔

(۳) صفریہ: یہ زیاد بن اصر کے تبعین تھے۔ ان کے اور ازرقہ کے عقائد میں معمولی سا فرق ہے۔

(۴) عجارہ: یہ عبدالکریم بن عجرد کے تبعین تھے۔ قضا و قدر کے مسائل میں ان کے کچھ خاص عقائد ہیں۔

(۵) الالباضیہ: یہ عبداللہ بن اباض کے تبعین تھے۔ یہ خوارج دوسرے فرقوں کے بمقابل اپنے عقائد میں زیادہ معتدل تھے،

ان کے یہاں غلو اور تشدد نسبتاً کم پایا جاتا تھا، اسی لیے جہاں دوسرے خارجی فرقے آہستہ آہستہ روبہ زوال ہو گئے، یہ فرقہ باقی رہا اور کئی بڑے علماء اس جماعت میں پیدا ہوئے۔ یہ اپنے مسلم مخالفین کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں مانتے تھے اور ان کے قتل کو جائز نہیں ٹھہراتے تھے اور ان کی شہادت اور ان کے ساتھ منا کحت کو درست مانتے تھے۔

9.4.3 معتزلہ

معتزلہ کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں مؤرخین نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ اس جماعت کا سردار واصل بن عطا (وفات ۱۳۱ھ) تھا جو اس دور کے مشہور اہل منطق میں شمار کیا جاتا تھا اور حضرت حسن بصری کی مجلس میں ان کا درس سننے کے لیے بیٹھا کرتا تھا۔ حضرت حسن بصری کی مجلس میں ایک بار گناہ کبیرہ کے مرتکب کے بارے میں اختلاف واقع ہو گیا، اس مجلس میں موجود خوارج کے علماء کی رائے تھی کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر قرار دیا جائے گا جب کہ علماء کی ایک دوسری جماعت نے کہا کہ نہیں وہ مومن ہی قرار دیا جائے البتہ وہ اس گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے فاسق ہو جائے گا۔ اس مجلس میں واصل بن عطا بھی موجود تھا اور اس نے ان دونوں جماعتوں سے مختلف اپنی یہ رائے پیش کی کہ مرتکب کبائر نہ تو کافر قرار دیا جائے گا اور نہ ہی مومن بلکہ وہ ان دونوں مرتبوں کے بیچ میں ایک تیسرے مرتبہ میں شمار کیا جائے گا۔ اس کی اس مختلف رائے کی وجہ سے حضرت حسن بصری نے اسے اپنی مجلس سے باہر نکال دیا، چنانچہ واصل بن عطا نے اپنی الگ علمی مجلس قائم کر لی اور لوگوں کو اپنے عقائد و افکار بتانے لگا چونکہ عربی میں اعتزل کے معنی علیحدگی اختیار کرنے کے آتے ہیں اور واصل نے بھی حضرت حسن بصری سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اس لیے وہ اور اس کے تبعین معتزلہ کہلائے۔ واصل بن عطا کی پیدائش مدینہ میں ہوئی تھی اور نشوونما بصرہ میں ہوئی تھی، اس کا شمار اس دور کے اہل علم میں ہوتا تھا، اس نے کئی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جن میں ”المنزلۃ بین المنزلتین“، ”معانی القرآن“ اور ”طبقات اہل العلم“ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

معتزلہ دراصل وہ مذہبی جماعت ہے جس نے عقل کو اصول وادلہ پر ترجیح دی، بطور خاص عصر عباسی میں اس جماعت کا کافی اثر دیکھنے کو ملتا ہے، بعض مؤرخین کے مطابق معتزلہ کی شروعات واصل بن عطا سے پہلے ہو چکی تھی، بلکہ بعض معتزلہ تو صحابہ و تابعین میں سے بھی بعض کو معتزلی العقیدہ قرار دیتے ہیں، معتزلہ کے بھی کئی فرقہ سامنے آئے۔

واصل بن عطا کے تبعین کو واصلیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ واصل کے علاوہ جو مشہور علماء وادبا اس جماعت سے منسلک رہے ان میں محمد بن ہذیل علاف، ابراہیم بن سیار نظام، عمرو بن بحر جاحظ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

معتزلہ کے مطابق عقل کا درجہ قرآن و حدیث کے بعد نہیں آتا بلکہ اس سے پہلے آتا ہے، ان کا ماننا ہے کہ عقل کے ذریعہ ہی قرآن و حدیث کے اسرار و رموز کو سمجھنا ممکن ہے۔

اپنے اس عقیدے کی بنیاد پر انھوں نے بہت سی متواتر احادیث کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا، عقائد کے باب میں ان کے کچھ خاص افکار و خیالات تھے جن میں سے بہت سے اہل سنت والجماعۃ کے عقائد سے متضاد تھے، مثال کے طور پر یہ کہ وہ اللہ کی ذات کے لیے صفات کا انکار کرتے ہیں، قرآن کو مخلوق مانتے ہیں، قیامت کے روز اللہ کے دیدار کا انکار کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

9.5 اکتسابی نتائج

اس پوری بحث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پورا دور سیاسی افراتفری کا دور تھا۔ پہلے اموی خلیفہ حضرت معاویہ کی سیاسی پالیسی اموی خلافت کو مستحکم کرنے میں بہت اہم اور کارگر ثابت ہوئی، ان کے یہاں ہمیں اعتدال بھی نظر آتا ہے اور اتحاد و اتفاق اور امن و امان قائم کرنے کی سعی و کوشش بھی صاف دکھائی دیتی ہے، وہیں فتوحات کا سلسلہ بھی ان کے عہد میں کافی آگے بڑھا لیکن ان کے جانشین یزید کے یہاں ہمیں شدت اور سختی نظر آتی ہے، حضرت حسین تک کو بخشا نہیں جاتا ہے، لوگوں میں خوف و دہشت کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور اسی وجہ سے خلافت بنو امیہ کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے، اگر مروان بن حکم نے اپنی حکمت عملی سے حالات کو قابو میں نہ کیا ہوتا تو شاید یہ خلافت تہی ختم ہو چکی ہوتی۔ عبدالملک بن مروان اور الولید بن عبدالملک کا عہد خلافت نسبتاً بہتر ثابت ہوا، فتنوں کو فرو کیا گیا اور رعایا کی فلاح و بہبود کی طرف توجہ دی گئی، خلافت کے آخری ایام میں جو خلیفہ آئے وہ نہایت نااہل اور غیر ذمہ دار ثابت ہوئے جس کی وجہ سے خلافت بہت کمزور ہو گئی اور بالآخر ۱۳۲ھ میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس دوران عبداللہ بن زبیر، شیعہ اور خوارج کے بھی اس عہد کے سیاسی منظر نامے پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے، لیکن بنو امیہ کی فوجی اور سیاسی طاقت کے سامنے یہ سیاسی جماعتیں ٹک نہ سکیں اور بالآخر یکے بعد دیگرے امویوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئیں۔

اگر اس عہد کے دینی حالات کی بات کریں تو جیسا کہ ہم نے اس اکائی کے تحت پڑھا کہ کئی مذہبی جماعتیں اس عہد میں رونما ہوئیں جنہوں نے اپنے اپنے انداز میں اپنے عقائد و افکار کی ترویج و اشاعت کی۔ ان جماعتوں میں اختلافات کا عکس ہمیں اس دور کی خطابت اور خطوط نویسی میں بھی صاف نظر آتا ہے، اس عہد کی شاعری میں بھی ان اختلافات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ عہد اموی میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور وہ بہترین دور تھا جو اپنے دینی رجحان کی وجہ سے ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔

9.6 فرہنگ

السبیۃ:	عبداللہ بن سہل کی طرف منسوب شیعوں کا ایک فرقہ۔
الغرابیۃ:	شیعوں کا ایک غالی فرقہ جو عصر اموی میں رونما ہوا۔
الزیدیۃ:	شیعوں کا ایک معتدل فرقہ جس کی نسبت امام زید بن علی زین العابدین کی طرف ہے
الأزارقۃ:	خوارج کا ایک فرقہ جو نافع بن ازرق کے تابعین پر مشتمل تھا۔
المعتزلۃ:	عصر اموی میں ظاہر ہونے والی ایک دینی جماعت جس کے اپنے مخصوص عقائد تھے، اس کی بنیاد واصل بن عطا

نے ڈالی تھی۔

المنزلة بين المنزلاتين: مرتکب کبار کے سلسلے میں معتزلہ کا ایک خاص عقیدہ

9.7 نمونے کے امتحانی سوالات

- (۱) اموی خلافت کا قیام کس طرح عمل میں آیا اس پر روشنی ڈالیے۔
- (۲) بنو امیہ کی اپنے مخالفین کے تئیں کیا سیاسی پالیسی رہی اس کا جائزہ لیجیے۔
- (۳) اموی دور کی مختلف سیاسی جماعتوں جیسے عبداللہ بن زبیر کی جماعت، شیعہ اور خوارج وغیرہ کی سیاسی سرگرمیوں پر ایک نوٹ لکھیے۔
- (۴) عصر اموی میں جن اہم دینی جماعتوں کا ظہور ہوا ان کا مختصر تعارف کراپیے۔
- (۵) عصر اموی کے دینی حالات پر ایک سرسری نظر ڈالیے۔

9.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

- ۱- تاریخ الأدب العربي۔ العصر الإسلامي شوقي ضيف
- ۲- التاريخ الإسلامي محمود شاكر
- ۳- الملل والنحل ابو الفتح محمد الشهرستاني
- ۴- تاريخ الدولة الأموية محمد سهيل طقوس
- ۵- في التاريخ الإسلامي شوقي ابو خليل
- ۶- تاريخ عربي ادب ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

(<https://archive.org/details/TareekhEArabiAdab/page/n3>)

اکائی 10 عصر اموی میں عربی خطابت کا ارتقا، اس کی اہم خصوصیات اور اہم شخصیات

اکائی کے اجزا	
10.1	مقصد
10.2	تمہید
10.3	اموی دور میں عربی خطابت کا ارتقا
10.3.1	سیاسی خطابت
10.3.1.1	خطبا خوارج
10.3.1.2	شیعہ خطبا
10.3.1.3	عبداللہ بن زبیر اور ان کی جماعت کے خطبا
10.3.1.4	خطبائے بنو امیہ
10.3.2	درباری تقریریں اور مختلف مناسبات کی خطابت
10.3.3	واعظانہ خطابت اور قصہ گو خطبا
10.4	اموی دور کے چند مشہور خطبا
10.4.1	زیاد بن ابیہ
10.4.2	طارق بن زیاد
10.4.3	حجاج بن یوسف
10.4.4	حسن بصری
10.5	اکتسابی نتائج
10.6	نمونے کے امتحانی سوالات
10.7	مطالعے کے لیے معاون کتابیں

عصر اموی چونکہ سیاسی اعتبار سے ایک نہایت پر آشوب اور پرفتن دور تھا اور عربوں میں سیاسی رسہ کشی اپنی شباب پر تھی اس لیے اس عہد میں خطابت کو پروان چڑھنے اور فروغ پانے کا بہت موقع ملا۔ اس اکائی کا اصل مقصد اموی دور میں خطابت کی اہمیت، اس کے ارتقا اور اس کی اہم شخصیات کو آپ کے سامنے پیش کرنا ہے۔

عرب قوم کو زبان و بیان پر قدرت کے اعتبار سے شروع سے ہی ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ ظہور اسلام کے ساتھ ہی عربی خطابت ایک نئے انداز میں سامنے آئی اور ایک نئی سمت میں اس نے اپنا سفر شروع کیا۔ اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے دین حق کی طرف لوگوں کو دعوت دینے کے لیے خطابت کا سہارا لیا بلکہ یہ اس دعوتی مشن کا سب سے اہم اور مؤثر وسیلہ ثابت ہوا۔ ہجرت سے قبل رسول اللہ ﷺ تیرہ سال تک خطابت کے ذریعہ قریش اور دیگر عرب قبائل کو اسلام کی طرف بلاتے رہے۔ اللہ کے رسول ﷺ عربوں کے مشہور بازاروں اور میلوں میں جا کر لوگوں کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش کرتے اور انہیں راہ حق کی طرف بلاتے، ان کی زندگی کا اصل مقصد اور خالق کائنات سے متعلق حقائق قرآنی آیات کی روشنی میں ان کے سامنے پیش کرتے۔ اس مہم میں خطابت ہی کا رول سب سے اہم ثابت ہوا۔ مدینہ ہجرت کے بعد خطابت کی اہمیت و ضرورت میں مزید اضافہ ہوا۔ مدینہ میں پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی، عملی طور پر ایک مسلم معاشرہ کا قیام عمل میں آیا، گونا گوں معاملات و واقعات سامنے آئے، ان سب کا حل رسول ﷺ اور ان کے اصحاب قرآنی تعلیمات کی روشنی میں نکالتے تھے اور خطابت کے ذریعہ لوگوں تک اپنی بات پہنچایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جمعہ، عیدین، حج وغیرہ کے موقع پر اس کی جواہریت و افادیت تھی وہ اپنی جگہ قائم تھی۔

عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ میں عربی خطابت کا ایک خاص انداز تھا، اس کی کچھ خوبیاں تھیں جن کے بارے میں آپ اسلامی دور کے تحت پڑھ چکے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے موقع پر اور آپ کی وفات کے بعد خطابت کا دائرہ اور وسیع ہوا اور قائدین و خلفائے اپنے لشکر کے حوصلوں کو بلند کرنے کے لیے پرجوش اور مؤثر خطبے دیے، خواہ وہ جنگ قادسیہ کے موقع پر مغیرہ بن شعبہ کا خطبہ ہو، یا جنگ یرموک کے موقع پر خالد بن ولید کا خطبہ ہو یا ابلہ کی فتح کے دن عتبہ بن غزو ان کا خطبہ ہو۔ اس عہد کی خطابت بنیادی طور پر دو محوروں پر قائم تھی ایک دعوت دین اور دوسری جہاد کی ترغیب۔ اس دور کے آخری ایام میں خاص طور سے جنگ جمل اور جنگ صفین وغیرہ کے موقع پر عربی خطابت میں ایک نیا رنگ یہ پیدا ہوا کہ مختلف سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے اوپر خطبوں کے ذریعہ حملہ کرنے لگیں، حضرت علی خود ایک ماہر خطیب تھے اور ان کی حامیوں میں خطیبوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی، جب خوارج کی جماعت منظر عام پر آئی تو اس کے اور حضرت علی کے حامیوں کے درمیان جو بحث و مباحثہ شروع ہوا اس کی بنیاد بھی خطابت پر ہی تھی۔ اس دور کی خطابت میں جاہلی دور کی خطابت میں موجود سجع ہمیں بہت کم نظر آتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے ناپسند کرتے تھے۔ عصر رسول اور خلافت راشدہ کے دور میں جن عوامل و محرکات کی بنیاد پر عربی خطابت کا فروغ شروع ہوا تھا عہد اموی کے آتے آتے ان عوامل و محرکات میں اور بھی زیادہ شدت پیدا ہو گئی، جس کے نتیجے میں

خطابت کو ترقی کرنے کے لیے زیادہ سازگار ماحول میسر ہوا۔

10.3 اموی دور میں عربی خطابت کا ارتقا

بنو امیہ کی خلافت جس ماحول میں قائم ہوئی وہ نہایت پر آشوب اور پر فتن ماحول تھا، کئی سیاسی جماعتیں آپس میں ایک دوسرے سے نبرد آزما تھیں، ایک طرف تو بنو امیہ کے خلاف کئی جماعتیں میدان کارزار میں اتری ہوئی تھیں تو دوسری طرف مختلف سیاسی جماعتوں کی آپس میں خوب ٹھنی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ماحول کافی گرم تھا اور ایسے ماحول میں خطابت جیسے فن کا فروغ پانا ایک فطری بات تھی۔

ایک طرف بنو امیہ کے حامیوں میں زیاد بن ابیہ اور حجاج بن یوسف جیسے خطیب تھے جو خلافت پر بنو امیہ کے حق کو ثابت کرنے میں جٹے ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عربوں بلکہ تمام مسلمانوں کی قیادت کے لیے خلیفہ منتخب کیا ہے، تو دوسری طرف ان کے مقابلہ میں خوارج کے خطبا تھے اور خلافت کو تمام مسلمانوں کا حق بتاتے تھے اور یہ مانتے تھے کہ خلیفہ کا انتخاب زہد و تقویٰ کی بنیاد پر ہونا چاہیے نہ کہ حسب و نسب کی بنیاد پر۔ وہیں تیسری طرف حضرت علی کے تبعین تھے جو بعد میں شیعہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ خلافت دراصل ان کا حق شرعی ہے، وہیں حضرت زبیر اور ان کے تبعین بھی تھے جو خلافت کو قریش اور حجاز میں واپس لانے کے قائل تھے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میدان جنگ میں اترے ہوئے تھے۔ اس پورے جنگ و جدال میں تیر و تفنگ کے بعد ہر فریق اور ہر جماعت کا سب سے بڑا ہتھیار خطابت ہی تھا، اس کے ذریعہ وہ اپنے مخالفین کے اوپر حملے کر کے ان کے پر نچے اڑایا کرتے تھے اور اپنے مؤیدین کو سر بہ کفن دشمن سے ٹکرانے کے لیے لگا کر کرتے تھے۔ یہ اموی دور میں خطابت کا سیاسی رنگ تھا جس نے اس دور میں سب سے زیادہ ترقی کی، اس کے علاوہ دوسرے موضوعات بھی تھے جن پر اس دور میں خوب خطابت ہوئی، جن میں سے کچھ کا ہم یہاں جائزہ لیں گے۔

مشرق و مغرب میں جو اسلامی لشکر یکے بعد دیگرے معرکے سر کر رہے تھے اس میں ان کے قائدین کا بہت ہی اہم رول تھا اور جب بھی کسی معرکے کی تیاری شروع ہوتی تھی تو قائدین اپنے جنگجوؤں کے سامنے آ کر تقریریں کرتے اور ان کے اندر دل و جان سے لڑنے کا جوش و ولولہ پیدا کرتے۔ ان کی یہ تقریریں ان جنگوں کی فتوحات میں بہت مؤثر ثابت ہوتی تھیں۔

مختلف عرب قبائل کے مابین دور جاہلی میں جو تعصب تھا اور جو منافرت پائی جاتی تھی وہ عصر رسول اور خلافت راشدہ کے دور میں کافی حد تک کم ہو گئی تھی، لیکن اموی دور آتے آتے وہ قبائلی رنجشیں پھر سے جاگ اٹھیں اور قبائلی تعصب کی آگ پھر سے دلوں میں بھڑک اٹھی۔ اس میں بھی مخالفین نے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے خطابت کا سہارا لیا، ایک طرف قیس اور تغلب و مختلف یہی قبائل آمنے سامنے آگئے تھے تو دوسری طرف بصرہ میں تیمم اور ازد کے درمیان ٹھن گئی، کچھ یہی حال خراسان وغیرہ میں موجود عرب قبائل کا تھا، ہر قبیلے کے خطیب دوسرے قبیلہ کے لوگوں پر اپنی تقریروں کے ذریعہ وار کرتے اور انہیں نیچا دکھانے کی کوشش کرتے۔

وفود کی آمد کا جو سلسلہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں شروع ہو چکا تھا، مختلف قبائل اور علاقوں کے وفد آپ ﷺ کی خدمت میں آیا کرتے تھے اور ان کے خطبا آپ ﷺ سے دین اسلام کی بابت پوچھتے تھے یا اپنا جو بھی مدعا ہوتا تھا اسے سامنے رکھتے تھے۔ خلافت راشدہ کے دور میں یہ سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ فتوحات کی کثرت کی وجہ سے اس میں مزید اضافہ ہوا۔ عصر اموی میں بھی ان وفود کی تعداد میں خاطر

خواہ اضافہ ہو۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اب اسلامی ریاست کی حدیں بے انتہا وسیع ہو چکی تھیں اور اسی حساب سے مسائل کی بھی کثرت ہو گئی تھی، وہیں دوسری طرف خود خلفا اور امرانے اس بات کو پسند کیا کہ لوگ ان سے ملیں اور بالمشافہہ اپنا مدعا ان کے سامنے پیش کریں۔ یہ وفد خلفا اور والیوں کے دربار میں حاضر ہوتے تھے اور ان کے سامنے اپنی قوم کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہ وفد نئے خلیفہ کی تاج پوشی کے وقت اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے بھی آتے تھے اور اس کے سامنے اپنی پریشانیوں اور اپنے مسائل کو رکھ کر ان کا حل تلاش کرنے بھی۔ بعض دفعہ وفد تعزیت یا مبارک باد پیش کرنے کے لیے بھی خلفا اور امرانے دربار پہنچتے تھے اور ہر وفد کے خطیبوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ پوری فصاحت و بلاغت اور پورے شد و مد کے ساتھ حاکم وقت کے سامنے اپنی بات کو پیش کرے اور اس کی تائید و حمایت سے ہمکنار ہو اس طرح کے سینکڑوں خطبے تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

خطابت کا جو دینی مقام و مرتبہ عصر رسول اور دور خلافت راشدہ میں تھا وہ یقیناً اپنی جگہ قائم رہا بلکہ اس میں بھی بے انتہا وسعت پیدا ہو گئی تھی، کیوں کہ جیسے جیسے فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا اور نئے نئے علاقے اسلامی ریاست میں شامل ہوتے رہے اسی حساب سے مساجد اور عیدگاہوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ جب اللہ کے رسول ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے مسجد قبا کے نام سے پہلی مسجد کی بنیاد رکھی اور چالیس پچاس سال کا عرصہ گزرنے کے بعد سندھ سے لے کر شمالی افریقہ کے آخری کنارے تک ہزاروں مسجدوں اور عیدگاہوں کا قیام عمل میں آچکا تھا جن میں باقاعدہ پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس طرح عالم اسلام کے ہر کونے میں خطبا حضرات جمعہ اور عیدین کے موقع پر خطبے دیتے اور عوام الناس تک اسلام کی صحیح تعلیمات پہنچاتے۔ ویسے تو یہ خطبے خالص مذہبی نوعیت کے ہوا کرتے تھے لیکن کبھی کبھی ان میں خلفا اور امرانے کے نام بھی داخل ہو جاتے تھے۔ جمعہ و عیدین کے خطبوں کے علاوہ مذہبی خطبوں کی ایک اور قسم تھی جو اس وقت کثرت سے رائج ہوئی اور وہ تھی وعظ و نصیحت اور دینی حلقوں میں دی جانے والی تقریروں کی قسم جس کے ذریعہ ائمہ اور واعظین لوگوں کے سامنے دینی تعلیمات کو پیش کرتے اور صحیح راستہ پر چلنے کی تلقین کرتے۔ اس نوعیت کے خطبوں میں حسن بصری وغیرہ کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ادب اور تاریخ کے مصادر و مراجع میں اس دور کی خطابت کے نمونے ہمیں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ تاریخ طبری وغیرہ اس قسم کے مراجع کی بہترین مثال ہے۔

10.3.1 سیاسی خطابت

10.3.1.1 خطبائے خوارج

اس دور کی سیاسی خطابت میں خوارج کو دوسری سیاسی جماعتوں پر سبقت حاصل تھی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے عقائد و افکار کو لے کر سب سے زیادہ پر جوش اور جذباتی تھے اور کھل کر برملا اپنے مخالفین پر ہر طرح سے حملہ کرتے تھے، خطابت میں بھی انھوں نے اپنے مخالفین پر شدید حملے کیے اور انھیں خوب آڑے ہاتھوں لیا، حالانکہ ان کے زیادہ تر خطبے ہم تک نہ پہنچ سکے کیوں کہ ایک تو انھوں نے خود انہیں سپرد قلم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی وہیں ان کے مخالفین نے بھی ان کے خطبوں کو اکثر نظر انداز کیا لیکن جو خطبے بھی تاریخ و ادب کے حوالے سے ہم تک پہنچے ہیں ان میں بہت جوش و ولولہ نظر آتا ہے۔ جاحظ کی البیان والتبیین میں ان کے بہت سے خطبے موجود ہیں۔ خوارج کے اس وقت

وجود میں آئے چاروں فرقوں، ازرقہ، حجدات، صفریہ اور اباضیہ میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے خطیب تھے جو ایک دوسرے کو ٹکر دیتے تھے۔ ازرقہ کے مشہور خطیبوں میں ان کا لیڈر نافع بن ازرق، زبیر بن علی اور قطری بن الفجاء خاص طور سے قابل ذکر ہیں یہ اپنی تقریروں میں اپنے متبعین کو راہ حق میں جان کی بازی لگانے کی ترغیب دیتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان کی تقریروں کا اسلوب مسجع و مقفی ہوا کرتا تھا۔

خوارج میں فرقہ ازرقہ اپنے عقائد و نظریات اور خیالات میں بڑا سخت اور کٹر تھا۔ یہ لوگ اللہ کے راستے میں جان دینے کے لیے اس طرح بے تاب رہتے تھے جس طرح پروانہ شمع پر نثار ہونے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اس دنیا کی زندگی ہیچ ہے، اصل زندگی جنت کی زندگی ہے اور اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ ان گمراہ لوگوں اور فرقوں سے جنگ کر کے راہ حق میں شہادت حاصل کی جائے، چنانچہ ان کے لیڈر زبیر بن علی نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ: ”إن البلاء للمؤمنين تمحيض وأجز، وهو على الكافرين عقوبة وخزي، وثقوا بأئكم المستخلفون في الأرض“

(ترجمہ: مومن جب آزمائش اور مصیبت میں پڑتا ہے تو اس کے گناہ گھٹتے ہیں اور ثواب بڑھتا ہے اور کافر جب آزمائش اور مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی ذلت و خواری اور سزا بڑھتی ہے، یقین رکھو کہ تم ہی زمین پر خدا کے خلیفہ ہو اور انجام کار کا میاں متقیوں ہی کو نصیب ہوگی) یہ لوگ دنیا اور متاع دنیا کو فریب، دھوکہ اور خواہشات نفسانی کا مرکز سمجھتے تھے، ان کے بقول دنیا سراسر ناکامی اور نقصان کا موجب ہے اور اس کے مقابلہ میں آخرت اور اس کی خاطر ہر قسم کی قربانی حاصل زندگی ہے۔ زبیر بن علی کے بعد ان کے مشہور مقرر اور لیڈر قطری بن الفجاء نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا: ”أما بعد، فإني أأخذكم الدنيا، فإنها حلوة خضرة، حفت بالشهوات، مع أن امرء ألم يكن منها في حيرة، إلا عقبته بعدها عبرة۔۔۔ لا خير في شيع من زادها إلا التقوى“

(ترجمہ: اے لوگو! تم کو دنیا سے خبردار کیے دیتا ہوں، اس لیے کہ یہ بڑی میٹھی اور ہری بھری ہے، مگر خواہشات نفسانی سے بھری ہوئی ہے، آدمی کو یہاں جب کوئی خوشی نصیب ہوتی ہے تو اس کے بعد فوراً ہی کوئی نہ کوئی تکلیف دہ بات ہو جاتی ہے۔۔۔ اس لیے یہاں کی کسی چیز میں سوائے تقویٰ کے کوئی بھلائی یا خیر نہیں)

خوارج کے دوسرے فرقے صفریہ کے یہاں ہمیں عمران بن حطان اور صالح بن مسرح جیسے خطیب ملتے ہیں۔ ان حضرات نے بنو امیہ اور اپنے دیگر مخالفین پر جم کر حملے کیے اور انہیں گمراہ قرار دے کر ان کے خلاف جہاد پر اپنے متبعین کو خوب بھڑکایا۔ ان کے دیگر مشہور خطیبوں میں طرماح بن حکیم، شمیل بن عزرہ ضبعی اور سخاک بن قیس وغیرہ اہم مانے جاتے ہیں۔ اباضیہ فرقے کے بھی کئی اہم خطیبوں کے نام تاریخ و ادب کے مراجع میں ہمیں ملتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت ان کے ایک لیڈر عبداللہ بن یحییٰ کندي کو حاصل ہوئی جس نے ۱۲۹ھ میں بنو امیہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا اور یمن و حضرموت وغیرہ کے علاقوں پر اپنا قبضہ جمایا۔ اپنے قائد ابو حمزہ کی قیادت میں اس فرقے نے حجاز تک اپنا تسلط قائم کر لیا تھا، یہاں تک کہ اموی خلیفہ مروان بن محمد نے اسے شکست دے کر اس کی تکمیل کسی۔

10.3.1.2 شیعہ خطبا

شیعہ فرقے کے خطیبوں کے نشانے پر بھی بنو امیہ اور ان کے خلفا تھے۔ ان کے مطابق بنو امیہ نے خلافت پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا اور

اس پر حضرت علیؓ اور ان کی جماعت کا ہی حق تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ از خود خلافت کے لیے حضرت علیؓ کو نامزد کیا تھا اور بنو امیہ نے ان کو ان کے اس حق سے محروم کر دیا۔ اس فرقے کے خطیبوں کا سارا زور اپنے ان دعوؤں کو ثابت کرنے پر تھا، بطور خاص حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد ان لوگوں نے بنو امیہ کے خلاف اپنا محاذ پوری طرح کھول دیا تھا اور خطابت کے ذریعہ ان پر شدید حملے کیے۔ امام حسینؓ کی شہادت کے بعد اس جماعت کے ایک رہنما سلیمان بن سرد نے منبر پر کھڑے ہو کر پر جوش خطبے دیے اور بنو امیہ کو منھ توڑ جواب دینے کے لیے لوگوں کو بھڑکایا۔ اس جماعت کا ایک اور خطیب عبید اللہ بن عبد اللہ مری تھا جس نے جو شیلے خطبوں کے ذریعہ شیعوں کو بنو امیہ کے خلاف برا بھانتا کیا۔ شیعوں کا ہی ایک بہت بڑا قائد مختار ثقفی بھی تھا، جس کی بنو امیہ اور مصعب بن زبیر کے خلاف معرکہ آرائیاں تاریخ کا حصہ ہیں۔ یہ بھی ایک زبردست خطیب تھا اور اس کے خطبے بھی تاریخ کے مراجع میں موجود ہیں۔ ان خطیبوں کے علاوہ شیعہ فرقہ کے اور بھی ماہر اور شعلہ بیان خطیب تھے جنہوں نے اپنی خطابت کے خوب جلوے دکھائے، لیکن ان کے بہت سے خطبے ہم تک نہ پہنچ سکے۔

شیعوں کے دوسرے خیالات کے علاوہ جن میں ان کا اختلاف عام مسلمانوں سے ہے، مذکورہ بالا خیالات صرف ان کے سیاسی مقررین کے نہ تھے بلکہ ان کے اماموں کا بھی یہی نقطہ نظر تھا چنانچہ حضرت حسینؓ جب شیعوں کی دعوت پر مدینہ سے روانہ ہو کر کوفہ کے قریب پہنچ گئے اور لوگ ان کے ارد گرد جمع ہونے لگے اور اسی درمیان عبید اللہ بن زیاد کی فوج کے ہراول دستے بھی پہنچنے لگے تو حضرت حسین نے اپنا رخ لوگوں کی طرف کر کے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے کہا کہ: ”ایہا الناس، فإنکم إن تتقوا وتعرفوا الحق لأهله بکن أرضی اللہ، ونحن اهل البيت۔ اولی بولایة هذا الأمر علیکم من هؤلاء المدعین مالیس لہم، والسائرین فیکم بالجور والعدوان“

(ترجمہ: اے لوگو! اگر تم خدا سے ڈرو اور حقداروں کے حق کو سمجھو تو اس سے خدا بہت خوش ہوگا، ہم اہل بیت ہی ان جھوٹے دعوے داروں کے مقابلہ میں تمہارے اوپر حکومت کرنے کے زیادہ حقدار ہیں کیوں کہ ان لوگوں کو تو یہ حق کسی طرح پہنچتا ہی نہیں، پھر یہ لوگ تم لوگوں سے ظلم و زیادتی کا معاملہ کرتے ہیں)

جلد ہی امویوں نے خلافت کے سب سے بڑے اور معزز و محترم دعوے دار یعنی حضرت حسینؓ کو قتل کروا کے اپنی حکومت اور سطوت کو اور مضبوط کرنا شروع کر دیا، لیکن تبھی خلیفہ یزید بن معاویہ جس کے زمانے میں کربلا کا واقعہ پیش آیا تھا مر گیا، اب شیعوں میں ذرا جان آئی اور ان میں ایک جانباز سلیمان بن سرد کے نام سے پیدا ہوا، اس نے شیعوں کو ان کی غلطی یاد دلائی، ان کو حضرت حسینؓ کی مدد نہ کرنے پر عار اور شرم دلائی، چنانچہ شیعان کوفہ میں سے اکثریت اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی اور اس طرح اس نے شیعوں میں فرقہ تو اپین کی بنیاد ڈالی۔ اس نے سبط رسول کی مدد نہ کرنے اور اپنے گھروں میں چپ چاپ بیٹھے رہنے کے گناہ سے سب سے توبہ کروائی اور ان کے خون کا بدلہ لینے کا ان سے عہد لیا۔ اس موقع پر کئی شیعہ قائدین کے علاوہ ان کے لیڈر سلیمان بن سرد نے بھی ایک جو شیلی تقریر کی جس میں اس نے کہا: ”قتل فینا ولدینا ولد نبینا و سلالتہ و عسارتہ و نضعۃ من لحمہ و دمہ، اتخذہ الفاسقون غرضاً للنبیل، ألا انھضوا فقد سخط ربکم، ولا ترجعوا إلی الحلائل والأبناء حتی یرضی اللہ، واللہ ما أظنہ راضیا دون أن تناجزوا من قتلہ أو تبیروا“

(ترجمہ: ہمارے درمیان ہمارے نبی کی اولاد اور ان کی ذریت کا نچوڑ اور ان کے خون و گوشت کا ٹکڑا قتل کر دیا گیا، انھیں ان فاسقوں نے اپنے تیروں کا نشانہ بنا لیا، اے لوگو! اٹھ کھڑے ہو کہ تمہارا رب تم سے خفا ہو گیا ہے اور اپنی بیویوں اور بچوں کے پاس اس وقت تک نہ جانا

جب تک کہ خدا تم سے خوش نہ ہو جائے اور خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ خدا اس وقت تک تم سے خوش نہیں ہو سکتا جب تک تم اس شخص سے ڈٹ کر مقابلہ اور لڑائی نہ کرو جس نے ان کو قتل کیا تھا یا تم خود ہی اس راہ میں ختم نہ ہو جاؤ)

شیعوں کا ہی ایک اور لیڈر مختار ثقفی بھی بڑا ہی فصیح و بلیغ اور شعلہ بیان مقرر تھا۔ اس کی جوشیلی تقریریں سن کر کوفہ والے اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے۔ مختار ایک بہت ہی سکی اور بہروپیا قسم کا انسان تھا، وہ یہ تصور دینے کے لیے کہ اس پر جی یا اللہ کا حکم نازل ہوتا ہے اپنی تقریروں میں جاہلی دور کے کاہنوں جیسا رنگ پیدا کرتا تھا اور اپنی تقریروں میں مسیح و مقفی عباراتیں بکثرت استعمال کرتا تھا اور قرآنی اسلوب کی طرح اپنے جملوں کو اکثر قسم سے شروع کرتا تھا، جن میں نامانوس اور شاذ و نادر الفاظ کی بھرمار ہوا کرتی تھی، چنانچہ اس نے ایک موقع پر اپنی ایک تقریر میں کہا:

”أما ورب البحار، والنخيل والأشجار، والمهامة والقفار، والملائكة الأبرار، والمصطفين الأخيار، لأقتلن كل جبار، بكل لدن خطار، ومهند بتار، في جموع من الأنصار، ليسو بميل أعمار، ولا بعزل أشرار، حتى إذا أقمت عمود الدين ورأبت شعب صدع المسلمين وشفيت غليل صدور المؤمنين، وأدركت بنثر النبيين، لم يكبر عليّ زوال الدنيا، ولم أحفل بالموت إذا أتى“

(یعنی: قسم ہے سمندروں کے مالک کی، کھجوروں اور درختوں کے مالک کی، صحراؤں اور بیابانوں کے مالک کی اور پاکیزہ فرشتوں کے مالک کی کہ میں ہر جابر و ظالم شخص کو پیوست ہو جانے والے نیزوں سے اور تیز دھار والی ہندوستانی تلواروں سے اس کے ایسے مددگاروں کے بچ قتل کروں گا جو نہ تو بزدل ہیں اور نہ ہی ناتجربہ کار ہیں اور نہ ہی لنگے ہیں اور نہ ہی نپتے ہیں، یہاں تک کہ جب میں دین کے ستون کو کھڑا کر لوں گا اور مسلمانوں کے اختلاف کو دور کر لوں گا اور مومنوں کے دل کی پیاس بجھا دوں گا اور نبیوں کے خون کا بدلہ لے لوں گا، تب میرے لیے اس دنیا کو چھوڑنا کوئی بڑی بات نہ ہوگی اور اس کے بعد جب موت آئے گی تب میں اس کی کوئی پرواہ نہ کروں گا)

مذکورہ بالا مقررین اور شیعوں کے دیگر مقررین اپنی نجی مجالس کی گفتگو سے لے کر بڑے بڑے جلسوں کی تقریروں میں بنو امیہ کی برائی اور آل بیت کی مظلومیت کی داستانیں سنا کر لوگوں کو امویوں کے خلاف اکساتے تھے اور خون کا بدلہ لینے کی ترغیب دیتے تھے۔ ان لوگوں کے خیال کے مطابق آل رسول ہی نبوت کے حقیقی وارث، مقدس پیغام کے حامل اور مہدی منتظر تھے۔

10.3.1.3 عبداللہ بن زبیر اور ان کی جماعت

خوارج اور شیعوں کے علاوہ بھی کچھ سیاسی جماعتیں اس وقت میدان میں تھیں جن میں حضرت عبداللہ بن زبیر کی جماعت خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ عبداللہ بن زبیر بذات خود ایک شعلہ بیان خطیب تھے اور ان کی خطابت کا انداز بے انتہا مؤثر اور سحر انگیز تھا۔ انھوں نے بھی اپنے خطبوں میں بنو امیہ، خوارج اور شیعوں پر شدید حملے کیے۔

یہ اپنی تقریروں میں بنو امیہ کی برائی کرتے اور حضرت حسین کے قتل کے واقعہ کو ان کی دھوکہ دھڑی اور خون ناحق بہانے اور ظلم و ستم ڈھانے کے مماثل بتا کر سامعین کی ہمدردی بٹورنے اور ان کو امویوں کے خلاف بغاوت کرنے پر ابھارنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

ایسے ہی جب ان کے بھائی مصعب بن زبیر کی شہادت کی خبر ان تک پہنچی تب بھی انھوں نے ایک بہترین خطبہ دیا اور بھائی کی شہادت پر رنج و غم کا اظہار بھی کیا اور اپنے اور اپنے ساتھیوں کے حوصلوں کو بلند رکھنے کا عزم بھی ظاہر کیا۔

ان کی یہ تقریر ایک معرکہ الآرا اور نہایت مؤثر تقریر تھی۔ اس میں انھوں نے اپنے بھائی مصعب بن زبیر کی شہادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”اگر وہ قتل ہو گیا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس گھرانے کا تو دستور یہی رہا ہے، چنانچہ اس سے قبل اس کے باپ، اس کے چچا اور اس کے چچا زاد بھائی کو بھی ایسے ہی قتل کیا گیا تھا۔ مصعب کے والد زبیر جنگ جمل کے بعد شہید ہوئے تھے، ان کے چچا عبدالرحمن جنگ یرموک میں شہید ہوئے تھے اور ان کے بیٹے عبداللہ یوم الدار میں کام آئے تھے۔

مصعب بن زبیر خود ایک اچھے خطیب تھے اور ان کے بھی کچھ خطبے ادب کے مراجع میں محفوظ ہیں۔

اس کے علاوہ اس دور میں خلافت بنو امیہ کے خلاف اور بھی بہت سی بغاوتوں نے سراٹھایا تھا جنہیں بنو امیہ کے لشکر جرار نے ایک ایک کر کے کچل دیا تھا۔ ان باغی جماعتوں میں بھی بہت سے اچھے خطیب موجود تھے۔ جیسے مدینہ پر جب یزید بن معاویہ نے چڑھائی کی تب عبداللہ بن حنظلہ نے اپنی جماعت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور ہار کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے ہی عمرو بن سعید بن العاص نے عبدالملک بن مروان کے عہد میں شام پر حملہ کیا اور بالآخر شکست سے دوچار ہوئے۔ عمرو بن العاص کو خطابت میں بے انتہا مہارت حاصل تھی اسی لیے انہیں ان کی فصاحت و بلاغت پر قدرت کی وجہ سے اشراق کا لقب دیا گیا تھا۔ عراق میں حجاج بن یوسف کے خلاف عبدالرحمن بن محمد بن اشعث نے محاذ بنایا اور مقابلہ کیا۔ یہ بھی اپنے دور کے ایک بہترین خطیب تھے۔ اسی طرح دوسری صدی ہجری کے شروع میں یزید بن مہلب نے یزید بن عبدالملک کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ انہیں بھی اس دور کے ماہر خطیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

10.3.1.4 خطبائے بنو امیہ

ان سب سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں بنو امیہ کی جماعت نظر آتی ہے جو صاحب اقتدار تھی اور یقیناً اس دور کی سب سے بڑی اور مضبوط سیاسی جماعت بھی تھی۔ اس لیے اس جماعت میں ماہر خطیبوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی بلکہ ایک سے بڑھ کر ایک شعلہ بیان خطیب ان کے درمیان موجود تھے، خود ان کے خلفا اور قائدین بھی خطابت میں بلند مقام رکھتے تھے۔ خلافت کے بانی حضرت معاویہ بذات خود ایک بہترین خطیب تھے اور ان کے علاوہ عبدالملک بن مروان اور عمر بن عبدالعزیز بھی بہترین خطیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ امیر معاویہ اور عبدالملک مروان کے خطبے تو زیادہ تر سیاسی نوعیت کے ہیں لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز کے خطبوں میں وعظ و نصیحت کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔

جہاں تک بنو امیہ کے قائدین اور والیوں کی بات ہے تو خطابت کے میدان میں ان کو دوسری جماعت کے قائدین پر خاصی سبقت حاصل رہی۔ ایک سے بڑھ کر ایک ماہر خطیب بنو امیہ کی صفوں میں موجود تھے جن کی تقریروں کو آج بھی فصاحت و بلاغت اور فن خطابت پر قدرت کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مصر میں بنو امیہ کے والی عتبہ بن ابوسفیان اور عراق میں زیاد بن ابیہ، حجاج بن یوسف اور خالد قسری جیسے خطیبوں نے خطابت کے بہترین نمونے پیش کر کے تاریخ ادب کے صفحات پر اپنے نام ہمیشہ کے لیے ثبت کر والیے ہیں۔ بنو امیہ کے قائدین میں سرفہرست حجاج بن یوسف کا نام لیا جاتا ہے۔ اگر حجاج کو اس دور کا سب سے بہترین خطیب کہا جائے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ حجاج کو جب خلیفہ عبدالملک کی طرف سے عراق کا والی متعین کیا گیا تو اس وقت عراق فتنوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، ہر طرف خون ریزی اور بغاوت نظر آرہی تھی۔ آشوب زدہ ماحول سے نپٹنے کے لیے خلیفہ نے حجاج بن یوسف جیسے مضبوط کمانڈر کا انتخاب کیا جو نہ صرف یہ کہ اپنی قائدانہ صلاحیتوں

کے لیے جانے جاتے تھے بلکہ اپنی خطیبانہ مہارت کے لیے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ لہذا جب انہیں عراق کا والی مقرر کر کے بھیجا گیا تو انہوں نے اہل عراق کو مخاطب کر کے جو خطبہ دیا وہ عربی ادب کی تاریخ کے بہترین اور عمدہ خطبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس تقریر میں ایسی گھن گرج تھی کہ سننے والوں کے دل دہل کر رہ گئے تھے گویا وہ حجاج بن یوسف کے الفاظ نہ ہوں بلکہ تیغ و تفلنگ کے وار ہوں۔ یہ تقریر فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ ہے۔

بنو امیہ کے دور کا دوسرا سب سے بڑا خطیب زیاد بن ابیہ تھا جن کو امیر معاویہ نے عراق اور خراسان کا والی مقرر کیا تھا۔ خطابت میں زیاد کو حجاج کا ہم پلہ مانا جاتا ہے۔ زیاد ایک ماہر سیاستداں تھے۔ انہوں نے اس وقت عراق میں موجود خراب حالات کو قابو میں کرنے کے لیے سختی سے کام لیا۔ ان کے کئی معاصرین نے ان کی خطابت کی تعریف لکھی ہے۔ حجاج کی ہی طرح زیاد کی بھی زیادہ تر تقریریں سیاسی نوعیت کی تھیں۔ ان کا سب سے مشہور خطبہ وہ خطبہ ہے جو انہوں نے بصرہ میں دیا تھا اور اس کو اللہ کی حمد و ثنا کے بغیر ہی شروع کر دیا تھا۔ اسی لیے اس خطبے کو البتراء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ زیاد کا یہ خطبہ اس عہد کی خطابت کے بہترین نمونوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ خطبہ اس قدر مؤثر تھا کہ اس کے بعد بصرہ میں امن و امان کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ اس میں ان کا انداز بہت دھمکی آمیز تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو سن کر بصرہ کے لوگوں پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ اس خطبہ کو پڑھ کر اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ زیاد کے وعظ و نصیحت پر مبنی کچھ خطبے بھی ادب کے مختلف مراجع میں موجود ہیں۔

10.3.2 درباری تقریریں اور مختلف مناسبات کی خطابت

قدیم زمانے سے ہی عربوں میں اس کا خوب رواج تھا کہ وہ اپنے سرداروں اور بادشاہوں کے درباروں میں حاضر ہو کر بہترین انداز میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ اس میں مخاطب کی تعریف بھی شامل ہوتی تھی اور اپنے قبائل کی بڑائی بھی۔ اسی طرح وہ لوگ مختلف قسم کے اختلافات اور منازعات کی صورت میں صلح کرانے کے لیے بھی تقریروں کا سہارا لیتے تھے۔ اسی طرح بازاروں میں، میلوں میں اور شادی بیاہ کے موقع پر بھی تقریریں کیا کرتے تھے۔ حبشہ میں نجاشی کے دربار میں اور شام میں قیصر کے دربار میں کی ہوئی ان کی تقریریں تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ وفود کی آمد کا سلسلہ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں ہی شروع ہو گیا تھا خاص طور سے فتح مکہ کے بعد اس میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ خلافت راشدہ کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ عہد اموی کے آتے ہی اس میں بے انتہا وسعت پیدا ہو گئی۔ یہ وہ درباری تقریریں ہوا کرتی تھیں جنہیں مختلف قبائل کی نمائندگی کے لیے آنے والے وفود کے سربراہ خلیفہ کے سامنے اپنے مسائل بیان کرنے یا اپنی مشکلات کو بتانے یا کسی حاکم یا گورنر یا والی کی شکایت کرنے یا خلیفہ سے مدد مانگنے یا اپنی قوم یا قبیلہ کی تعریف و توصیف کرنے یا دوسروں کے مقابلے میں فخر و مباہات کرنے یا خلیفہ کو کسی خوشی کے موقع پر مبارکباد دینے یا کسی غم کے موقع پر اظہار ہمدردی یا تعزیت کرنے کے لیے کیا کرتے تھے۔ یہ تقریریں زبان و بیان کے اعتبار سے فن خطابت کا بہترین نمونہ ہوا کرتی تھیں اور اس زمانے میں ان کی بڑی گرم بازاری تھی جس کی وجہ سے خطابت کے ایسے ماہرین اس دور میں سامنے آئے جنہوں نے عربی ادب کی تاریخ میں اپنے نام زریں حروف سے لکھوائے۔

اموی خلفائے اپنے دروازوں کو ان وفود کے لیے پوری طرح کھول دیا تھا اور ان کو خوب انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا۔ خود حضرت

معاویہ نے اس میں بہت دلچسپی دکھائی اور ان کے دور سے ہی اس کے نتائج سامنے آنے لگے تھے۔ زیادہ تر وفود خلیفہ کے تئیں اپنی اور اپنے اہل قبیلہ کی اطاعت گزاری و فرماں برداری کا پیغام دینے کے لیے آتے تھے۔ خلیفہ بھی ان کی خوب خاطر مدارات کرتے اور انہیں خوب نوازتے تھے۔ عرب قوم اور خاص طور سے شیوخ قبائل اور بادیہ میں رہنے والے بھوکے اور تنگ حال بدوؤں کو اپنی طرف مائل کا یہ بہترین طریقہ تھا، چنانچہ حضرت معاویہ کے بعد آنے والے تمام اموی حکمرانوں نے اس طریقے کو اختیار کیا۔ وفود کی خطابت کے حوالے سے خاص طور سے سبحان وائل کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ وائل قبیلہ کی نمائندگی کرتے ہوئے خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوئے تھے۔ اپنے وقت کے بہت ماہر خطیب تھے۔ اور شوہاء نامی اپنے خطبہ کے لیے جانے جاتے ہیں۔

اس ضمن میں احنف بن قیس کا نام جو قبیلہ تمیم کے نمائندہ کے طور پر حاضر ہوئے تھے اور صحار بن عیاش عبدی کا نام جو بنو عبد القیس کے نمائندہ تھے قابل ذکر ہے۔

صحار بن عیاش عبدی کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک بار حضرت معاویہ نے اس سے کہا کہ ”ماہی البلاغہ الی فیکم“ یعنی یہ کون سی بلاغت ہے جو تم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ (اپنے اس جملہ سے حضرت معاویہ اس کی قوم بنو عبد القیس کی خطابت میں شہرت اور مہارت کی طرف اشارہ کر رہے تھے)۔ تو اس نے جواب میں کہا ”شئ تجیش بہ صدورنا، فتنفذه علی الأستنا“۔ یعنی یہ ایسی چیز ہے جس کا ابال ہمارے سینوں میں اٹھتا ہے تو ہمارے سینے اسے ہماری زبانوں کی طرف پھینک دیتے ہیں“۔

بنو عبد القیس کے دیگر مشہور مقررین میں بنو صوحان، مصقلہ بن رقیہ، رقیہ بن مصقلہ اور کرب بن مصقلہ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا ذکر جاہظ نے اپنی کتاب البیان والتبیین میں کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ ان لوگوں کے پاس ایک خطبہ ہوا کرتا تھا جسے المعجوز (یعنی بوڑھا یا بزرگ) کہا جاتا تھا اور جب بھی وہ لوگ خطبہ دیتے تو اس المعجوز خطبے کو پورا یا اس کا کچھ حصہ پڑھنا ضروری سمجھتے تھے۔

جاہظ نے ایک اور شخص عبد العزیز بن زرارہ الکلابی کا ذکر بھی کیا ہے کہ وہ بھی فن خطابت میں اس زمانے میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا، چنانچہ جاہظ نے لکھا ہے کہ عبد العزیز نے ایک بار حضرت معاویہ سے مخاطب ہو کر چار پانچ جملوں میں اپنی ضرورت اس بلیغانہ انداز میں بیان کی کہ حضرت معاویہ اس کی زبان دانی پر عیش عیش کراٹھے۔

ہر خطیب کی یہی سعی و کوشش ہوتی تھی کہ کس طرح اپنی فصاحت و بلاغت اور حسن اسلوب کے ذریعہ خلیفہ یا والی کا دل جیت لیا جائے اور اسے اپنی بات سے مطمئن کر دیا جائے۔ ان کا انداز بیان اس قدر خوبصورت اور دلپذیر ہوتا تھا کہ دمشق کے درباروں میں جب یہ خطیب تقریر کیا کرتے تھے تو ان کو سننے کے لیے شہر کے نوجوان جوق در جوق وہاں پہنچ جاتے تھے تاکہ ان کی خوش اسلوبی اور فصاحت و بلاغت سے محظوظ ہو سکیں۔

حجاج جیسا جابر اور سخت دل والی بھی ان مقرروں کی زبان دانی اور حاضر جوابی کے سامنے جھک جاتا تھا حالانکہ وہ خود اپنے زمانے کا سب سے مؤثر اور شعلہ بیان خطیب تھا۔ ان مقررین میں آپس میں تقریری مقابلے ہوا کرتے تھے۔ اس قسم کا ایک مقابلہ حضرت معاویہ کے دربار میں پیش آیا جب یزید کی خلافت کے لیے بیعت کی گئی، اس قسم کا دوسرا مقابلہ اس وقت ہوا جب عبد الملک بن مروان نے اپنے بیٹے الولید

کے لیے بیعت لینے کا اعلان کیا۔

ان خطیبوں کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ خلیفہ کو اپنی خوش اسلوبی اور فصاحت و بلاغت کے ذریعہ متاثر کیا جائے اور اس کے سامنے اپنی اطاعت و فرماں برداری کا اظہار کیا جائے۔ اسی ضمن میں تعزیت اور مبارکبادی کے خطبوں کو بھی شامل کر لیا جاسکتا ہے جو اس طرح کے مواقع پر دیے جاتے تھے اور تاریخ ادب کی کتابوں میں ان کے نمونے محفوظ ہیں۔

اس صنف کی خطابت کی شروعات عبداللہ بن ہمام سلولی کوفی کے ذریعہ ہوئی جو یزید کی بیعت کے وقت یزید کے دربار میں حاضر ہوا اور لوگوں کے جم غفیر کے سامنے ایک خطبہ دیا۔ ایک طرف حضرت معاویہ کے انتقال کی وجہ سے رنج و غم کا ماحول تھا تو دوسری طرف یزید کی بیعت کی خوشی۔ ہر خطیب اس موقع پر زبان کھولنے سے گھبراتا تھا کہ اگر وہ خوشی کا اظہار کرے تو اتنے بڑے غمناک حادثے کو کیسے نظر انداز کرے اور اگر مبارکباد پیش کرے تو تہنیت کے لیے کیا اسلوب اختیار کرے۔ چنانچہ اس موقع پر عبداللہ بن ہمام نے ہمت دکھائی اور آگے بڑھ کر اپنی تقریر پیش کی، اس کی وہ تقریر ایک طرف اس کی فصاحت و بلاغت پر دلالت کرتی ہے تو دوسری طرف اس کی ذہانت و فطانت کا ثبوت دیتی ہے۔ اس نے ان دونوں جذبات کا اظہار کچھ اس طرح کیا: ”یا امیر المؤمنین! آج کرک اللہ علی الرزیزہ، وبارک لک فی العطیة، وأعانک علی الرعیة، فلقد زرت عظیماً، وأعطیت جسیماً، فاشکر اللہ علی ما أعطیت، واصبر لہ علی ما زرت، فقد فقدت خلیفۃ اللہ، ومُنحت خلافة اللہ، ففارقت جلیلاً، ووهبت جزیلاً“۔

(یعنی اے امیر المؤمنین! خدا آپ کو اس مصیبت پر اجر دے اور جو عطیہ (یعنی خلافت) دیا گیا ہے اس میں برکت عطا کرے اور رعیت کے سلسلے میں آپ کی مدد کرے ایک طرف آپ پر ایک بڑی مصیبت آن پڑی ہے تو دوسری طرف آپ کو ایک عظیم الشان چیز بھی عطا کی گئی ہے۔ اس لیے جو چیز آپ کو عطا کی گئی ہے اس پر خدا کا شکر ادا کیجیے اور جو مصیبت آپ پر پڑی ہے اس پر صبر کیجیے کیوں کہ آپ نے اگر ایک طرف اللہ کے خلیفہ کو کھویا تو دوسری طرف اللہ کی خلافت کو پایا اور یوں آپ نے ایک طرف ایک عظیم الشان ہستی کا ساتھ چھوڑا تو دوسری طرف ایک بہت بڑی چیز آپ کو مرحمت کر دی گئی)

اموی خلافت میں وفود کی کثرت اور خطیبوں کے جلوے ہمیں سب سے زیادہ عبدالملک بن مروان کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں، اسی طرح واعظوں کی کثرت ہمیں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے دور میں زیادہ نظر آتی ہے۔

دراصل ان وفود اور درباری خطبوں میں کچھ خطیب ایسے بھی تھے جو خلیفہ کے سامنے واعظانہ خطبے دیا کرتے تھے۔ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے دربار میں کئی واعظ خطبہ حاضر ہوئے اور واعظانہ تقریریں کیں، اس سلسلے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نام سب سے اہم ہے کیوں کہ اس قسم کے خطیبوں کا ذکر سب سے زیادہ انھیں کے عہد میں ملتا ہے، خالد بن صفوان، عبداللہ بن اہتم، محمد بن کعب قرظی جیسے خطیبوں کا نام اس حوالے سے ہمیں ملتا ہے۔

اس کے علاوہ خلیفہ کے والیوں اور قائدین کے درباروں میں بھی وفود کی آمد اور خطیبوں کی جلوہ گری کا سلسلہ اموی دور میں جاری رہا چاہے وہ زیاد بن ابیہ ہوں یا حجاج بن یوسف ہوں جو خود بھی عظیم خطیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے درباروں سے بھی بہت سے ماہر

خطیب وابستہ تھے۔

زیاد بن ابیہ کے دربار میں عمران بن حطان حاضر ہوئے اور انھوں نے والی کے سامنے ایک بہترین خطبہ پیش کیا۔ اسی طرح حجاج کے دربار میں حاضر ہونے والے خطیبوں کی ایک بڑی تعداد کا ذکر ملتا ہے جن میں جامع محاربی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

10.3.3 واعظانہ خطابت اور قصہ گو خطبیا

جس طرح سیاسی خطابت کا اس عہد میں بہت زور رہا اسی طرح قصہ گوئی اور وعظ و نصیحت پر مبنی خطابت کا بھی اس عہد میں بہت فروغ ہوا۔ جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبیین میں ان خطبوں کا کثرت سے ذکر کیا ہے۔ واعظین اپنے خطبوں میں قصوں کو شامل کر لیتے تھے تو وہیں قصہ گو حضرات پر وعظ و نصیحت کا رنگ غالب آجاتا تھا۔ بصرہ میں اس نوعیت کی خطابت کی شروعات اسود بن سرلیج کے ذریعہ ہوئی جب کہ کوفہ کے اولین قصہ گو خطبیا میں زید بن صوحان کا شمار ہوتا ہے۔ مدینہ میں اس کی شروعات عبید بن عمیر اور مسلم بن جندب جب کہ مصر میں عبداللہ بن عمرو بن العاص کے ذریعہ ہوئی۔ وہب بن منبہ اور سعید بن جبیر وغیرہ بھی اس دور کے اہم قصہ گو خطبیا میں شمار کیے جاتے ہیں۔

بصرہ کے دیگر قصہ گو خطبیا میں جن کا ذکر جاحظ نے کیا ہے قاضی بصرہ ایاس بن معاویہ اور خالد بن صفوان وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ اس دور کے واعظین میں سب سے زیادہ شہرت حسن بصری کو ملی۔ اس میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کے بعد واصل بن عطاء، عبداللہ بن شداد اور فضل بن عیسیٰ رقاشی وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔

واصل بن عطاء اپنے دور کے عظیم خطیبوں میں سے ایک مانے جاتے ہیں۔ اس دور میں علم کلام کو بھی کافی مقبولیت حاصل ہوئی تھی اس لیے واصل اور علم کلام کے دوسرے ماہرین نے اس دور کی خطابت میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

اس دور کے خلفا میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بہت سے دینی خطبے کتابوں میں محفوظ ہیں جن کا مرکزی خیال اللہ کی اطاعت، اس کی نافرمانی سے اجتناب، قیامت کے دن کا حساب و کتاب اور جزا و سزا جیسے موضوعات ہوا کرتے تھے۔ خطبوں میں اس واعظانہ رنگ کا اس دور میں اس قدر غلبہ ہو گیا تھا کہ جو بھی خطبہ دینے کھڑا ہوتا اس کے خطبہ میں کچھ نہ کچھ واعظانہ باتیں ضرور ہوا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ مشہور اموی کمانڈر اور والی حجاج بن یوسف کے بارے میں بھی آتا ہے کہ جب وہ مسجد میں منبر پر چڑھتا تھا تو کہتا تھا کہ: ”اے لوگو! خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرنا، یہ اس کے عذاب کو برداشت کرنے کے مقابلے میں بہت آسان ہے“۔ حجاج کے علاوہ کچھ دوسرے سخت دل اور سخت گیر حکام اور والی تھے جو اس طرح کی واعظانہ باتیں خطبوں کے دوران کیا کرتے تھے۔

واعظانہ مقررین کا یہ طبقہ اس عہد میں ہر اسلامی شہر میں پایا جاتا تھا۔ اموی خلفا و حکام نے کئی جید واعظین اپنے یہاں ملازم کے طور پر بھی رکھے ہوئے تھا اور قصے دن میں دو مرتبہ سنائے جاتے تھے، ایک مرتبہ فجر کی نماز کے بعد اور دوسری مرتبہ مغرب کے نماز کے بعد۔ اس طبقہ واعظین کا کام مسلمانوں کو وعظ و نصیحت کرنا اور انھیں اچھے کاموں کی ترغیب و تلقین کرنا تھا۔ جاحظ کی البیان والتبیین میں اس قسم کی واعظانہ تقریریں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

ان واعظین میں ابراہیم تیمی کوفی اور سعید بن جبیر کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر کا یہ معمول تھا کہ وہ روز فجر اور عصر کی

نماز کے بعد وعظ کیا کرتے تھے۔ جاہظ نے دیگر واعظین میں یزید بن ابان رقاشی کا ذکر بھی بطور خاص کیا ہے اور ان کے ایک خطبے کا یہ جز بھی نقل کیا ہے کہ:

”لِيتِنَا لِمَ نُخَلِّقْ، وَلِيتِنَا اِذْ خَلَقْنَا لِمَ نَعُصِّ، وَلِيتِنَا اِذْ عَصَيْنَا لِمَ نَمُتْ، وَلِيتِنَا اِذْ مَتْنَا لِمَ نُبْعَثْ، وَلِيتِنَا اِذْ بَعَثْنَا لِمَ نُحَاسِبُ، وَلِيتِنَا اِذْ حَاسَبْنَا لِمَ نُعَذِّبُ، وَلِيتِنَا اِذْ عَذَّبْنَا لِمَ نُخَلِّدُ“۔

(یعنی اے کاش ہم پیدا ہی نہ ہوتے اور اگر پیدا ہو گئے تو کاش ہم خدا کی نافرمانی نہ کرتے اور اگر نافرمانی کرتے تو کاش ہم نہ مرتے اور اگر مرتے تو کاش دوبارہ زندہ نہ کیے جاتے اور اگر زندہ کر دیے جاتے تو اے کاش ہم سے حساب کتاب نہ ہوتا اور اگر حساب کتاب ہوتا تو کاش ہمیں عذاب نہ دیا جاتا اور اگر عذاب دیا جاتا تو اے کاش اسی عذاب میں ہمیشہ نہ رہنا پڑتا)

اس دور کے مشہور ترین واعظین خطبا میں جماعت معتزلہ کا سردار واصل بن عطا بھی تھا۔ وہ بے انتہا فصیح و بلیغ اور بہت ذی علم انسان تھا۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک بار وہ عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس وقت عبداللہ بن عمر عراق کے امیر (۱۲۶ھ) تھے۔ واصل کے ہمراہ اس وقت خالد بن صفوان، شیبیب بن شیبیب اور فضل بن عیسیٰ رقاشی بھی تھے۔ عبداللہ بن عمر کے دربار میں چاروں خطیبوں میں زور دار مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں واصل اپنے تینوں ساتھیوں پر غالب آ گیا۔ اس کا وہ خطبہ اس عہد کے بہترین خطبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں اس کا کچھ حصہ ذکر کیا جاتا ہے:

”الحمد لله القديم بلا غاية، والباقي بلا نهاية، الذي علا في ذنوه، ودنا في غلوه، فلا يحويه زمان ولا يحيط به مكان، ولا يؤوده حفظ ما خلق، ولم يخلقه على مثال سبق، بل انشأه ابتداء، وعدله اصطناعاً، فأحسن كل شيء خلقه، وتمم مشيئته، وأوضح حكمته، فدل على ألوهيته، فسبحانه لا مُعَقَّبَ لحكمه ولا دافع لقضائه، تواضع كل شيء لعظمته، وذل كل شيء لسלטانه، ووسع كل شيء فضله، لا يعزب عنه مثقال حبة وهو السميع العليم، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده الها تقدست أسماؤه وعظمت آلاؤه، وعلا عن صفات كل مخلوق، وتنزه عن شبيه كل مصنوع، فلا تبلغه الأوهام، ولا تحيط به العقول والافهام، يعصى فيحلم، ويدعى فيسمع، ويقبل التوبة من عباده، ويعفو عن السيئات، ويعلم ما تفعلون“۔

(یعنی اس خدا کے لیے ہر قسم کی حمد و ثنا ہے جو غیر معلوم مدت سے قدیم ہے اور جو نہ ختم ہونے والی مدت تک باقی رہے گا، جو باوجود قریب ہونے کے دور اور جو دور ہونے کے قریب ہے۔ نہ کوئی زمانہ اسے اپنے اندر سمو سکتا ہے اور نہ کوئی مکان اس کا احاطہ کر سکتا ہے، جو چیز اس نے پیدا کر دی ہے اس کی حفاظت میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے اور نہ اس نے کسی سابق چیز کی مثال پر اسے پیدا کیا ہے۔) یعنی ہر مخلوق بالکل نئی اور اچھوتی ہے کوئی کسی سے پوری طرح مشابہ نہیں ہے) بلکہ ہر چیز کو اس نے خود ہی ایجاد کر کے بنایا ہے اور پھر اسے پوری مہارت اور چابکدستی سے ہر طرح مکمل بنایا اور پھر اپنی مخلوق کو پوری طرح سنوارا اور نکھارا اور اس طرح اپنی مرضی پوری کی اور اس کے ذریعہ اپنی حکمت کو پوری طرح بیان کیا اور یوں اپنی خدائی کی دلیل دی۔ بڑی پاک و صاف ہے اس کی ذات اور اس کے حکم کو نہ کوئی ٹال سکتا ہے اور اس کے فیصلے کو نہ کوئی روک سکتا ہے۔ ہر چیز اس کی عظمت و بڑائی کے آگے سرنگوں اور اس کی فرماں روائی و سلطانی کے آگے ذلیل و حقیر ہے۔ اس کا فضل و کرام ہر چیز کو حاوی ہے اور روائی کے برابر بھی اس سے کوئی چیز تجاوز نہیں کر سکتی۔ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ

نہیں ہے کوئی چیز پوجنے کے لائق سوائے یکتا اللہ کے جس کے تمام بڑے نام بڑے مقدس اور پاک ہیں اور جس کی نعمتیں اور مہربانیاں بہت بڑی ہیں جو ہر مخلوق میں موجود صفات سے بلند اور ہر بنائی ہوئی چیز کی مشابہت اور مماثلت سے مبرا ہے۔ اس کی ہیبت کو سوچنے، سمجھنے پر کوئی طاقت قادر نہیں ہو سکتی اور نہ عقل و فہم اس کا احاطہ کر سکتی ہے، اس کی نافرمانی کی جاتی ہے تو وہ عفو و درگزر سے کام لیتا ہے اور اس کو پکارا جاتا ہے تو وہ بندوں کی پکار کو سنتا ہے اور ان کی توبہ کو قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کرتا ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اسے وہ جانتا ہے۔)

واصل کی یہ تقریر جہاں ایک طرح قرآن و حدیث کی بہت سی تعلیمات کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ان کی بنیاد پر وعظ و نصیحت کی باتیں پیش کرتی ہے تو وہیں یہ متکلمین اور معتزلہ کے عقائد و انداز بیان کا بھی ایک نمونہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

اپنے اسی خطبے میں واصل آگے چل کر تقویٰ اور عمل صالح کی ترغیب دیتا ہے۔ اور دنیا اور اس کی لذتوں میں غرق ہونے سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ وہ آگے کہتا ہے:

”اوصیکم عباد اللہ مع نفسی بتقوی اللہ و العمل بطاعته و المجانبۃ لمعصیتہ، و احضکم علی ما یدنیکم منہ، و یزلفکم لدیہ، فإن تقوی اللہ أفضل زاد و أحسن عاقبۃ فی معاد، و لا تلهینکم الحیاة الدنیا بزینتھا و خدعھا و فواتن لذاتھا، و شہوات آمالھا، فإنھا متاع قلیل و مددۃ الی حین، و کل شیء فیہا یزول، فکم عانیتم من أعاجیبھا و کم نصبت لکم من حبانلھا، و أهلكم من جنح إلیھا و اعتمد علیھا، أذاقتهم حلواً و مزجت لهم سماً“

(یعنی اے اللہ کے بندوں! میں تمہیں اور خود اپنے آپ کو تقویٰ اور اللہ کی اطاعت گزاری اور اس کی معصیت سے اجتناب کرنے کی نصیحت کرتا ہوں اور میں تمہیں ان کاموں کو کرنے کی ترغیب دیتا ہوں جو تمہیں اللہ سے قریب کر دیں اور تمہیں اس کا مقرب بنا دیں، کیوں کہ تقویٰ اور اللہ کی اطاعت ہی آخرت کے لیے بہترین توشہ ہے۔ اور اسی کا انجام آخرت میں سب سے اچھا ہوگا جو اس کو حاصل کرے گا، یہ دنیا تمہیں اپنی زینت و چمک دک، پر فریب اور فتنہ پرور لذتوں اور شہوتوں کے ذریعہ ہرگز دھوکہ نہ دینے پائے کیوں کہ یہ ایک بہت ہی معمولی چیز ہے اس کی مدت بہت ہی مختصر ہے اور اس کی ہرشی بہت جلد فنا ہونے والی ہے، تم کس قدر اس کے دام فریب میں آچکے ہو اور جس نے اس کے اوپر بھروسہ کیا اس نے اسے تباہ و برباد کر دیا، اس نے اسے سبز باغ دکھائے اور پھر اسے بادِ سموم کے ذریعہ ہلاک کر دیا کیوں کہ اس کی ہر میٹھی اور لذیذ چیز در حقیقت زہر آلود ہوتی ہے)

جاہظ نے واصل کی فصاحت و بلاغت اور فنِ خطابت میں اس کی مہارت کو خوب سراہا ہے اور کہا ہے کہ وہ زبان و بیان اور فصاحت و بلاغت کا ایک معجزہ تھا۔

اس دور میں بڑے بڑے خطیبوں کے درمیان خطابت کے مقابلے بھی ہوا کرتے تھے جیسا کہ عبد اللہ بن عمر بن عبد العزیز کے دربار میں مقابلہ ہوا جس میں واصل بن عطا، خالد بن صفوان، شیبیب بن شیبیب اور فضل بن عیسیٰ رقاشی کے درمیان خطابت کا مقابلہ ہوا جس میں واصل بن عطانے بازی ماری۔

وعظ و نصیحت اور قصہ گوئی کی خطابت کے حوالے سے ایک بات اور قابل ذکر ہے وہ یہ کہ سیاسی خطبا اور وفود کے خطبا کے برعکس اس صنف کے خطبا بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے اور ان کے اردگرد ان کے سامعین کا حلقہ سجا ہوتا تھا۔

اس سلسلہ میں حسن بصری کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ حسن بصری نے اپنی زندگی وعظ و نصیحت کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس زمانے کے عظیم واعظین میں ان کو گردانا جاتا ہے۔ نمونے کے طور پر انہیں پیش کیا جاتا تھا۔ تمام مؤرخین اور اہل قلم نے ان کی فصاحت و بلاغت کی تعریف کی ہے۔ جاحظ کی البیان و التبيين، ابن قتیبہ کی عیون الأخبار اور ابن عبد ربہ کی العقد الفرید وغیرہ میں ان کی واعظانہ تقریریں مذکور ہیں جو اس فن میں ان کے عظیم مقام و مرتبہ کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ امام غزالی نے احیاء علوم الدین میں ان کی تعریف کی ہے۔ ان کی تقریروں کا دار و مدار اکثر قرآنی آیات اور احادیث رسول پر ہوا کرتا تھا۔ وہ دنیا سے خود کو محفوظ رکھنے اور آخرت کی تیاری کرنے کی تلقین کرتے تھے اور تقویٰ و عمل صالح کی ترغیب دیتے تھے۔

اس دور کی خطابت کی خاص بات یہ بھی تھی کہ اس عہد میں اور اس کے بعد انشا پر دازی کا جو مسجع و مقفی اسلوب رائج ہوا اس پر اس عہد کی خطابت کے اسلوب کا کافی اثر تھا۔ گویا اس اسلوب کی شروعات انہیں تقریروں اور خطبوں سے ہوئی تھی۔

اس دور کی خطابت کو عصر رسول اور خلافت راشدہ کی خطابت کا ارتقا کہا جاسکتا ہے۔ البتہ اس دور میں خطابت کے اسلوب میں کچھ تبدیلیاں بھی واقع ہوئیں۔ مثال کے طور پر اس دور سے قبل خطبے اکثر مختصر ہوا کرتے تھے، لیکن اس دور کے زیادہ تر خطبے ہمیں نسبتاً طویل اور مفصل نظر آتے ہیں۔ اس تبدیلی کے پیچھے کئی اسباب کار فرما تھے۔ مثلاً یہ کہ خطبوں کا اصل مقصد خلیفہ کے حکم یا پیغام کو رعایا تک پہنچانا تھا اور اس دور میں چونکہ فتوحات کثرت سے ہوئیں اور اسلامی ریاست میں توسیع ہوتی رہی اور رعایا کی تعداد اور ان کے مسائل و معاملات میں بھی کثرت واقع ہوئی اس لیے تقاضا یہی تھا کہ اسی کے مطابق تفصیل سے اپنی بات کو عوام کے سامنے رکھا جائے۔ اسی طرح اس عہد میں جس طرح بغاوتوں اور جنگوں کا سلسلہ جاری رہا، قائدین اور والیوں کو اپنے متبعین کو جنگ پر ابھارنے اور اپنا حکم منوانے کے لیے وعدہ و وعید کے مختلف طریقے استعمال کرنا پڑتے تھے جس کی وجہ سے بات مختصر ہونے کے بجائے اکثر طویل ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ سبب بھی کار فرما تھا کہ پچھلے ادوار کے خطیبوں کے مخاطب اکثر خالص عرب ہوا کرتے تھے جو مختصر اور جامع لب و لہجے کو بھی باسانی سمجھ لیا کرتے تھے جب کہ اس دور میں غیر عربوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد خطیبوں کے سامنے ہوا کرتی تھی جن کو نہایت مختصر اور جامع انداز میں ہر بات سمجھانا آسان نہیں تھا، اس لیے بسط و شرح کا سہارا لیا گیا۔

اس دور کی خطابت میں وعید اور ترہیب کا عنصر بھی بالکل نمایاں نظر آتا ہے، بطور خاص اس دور کے سیاسی خطبات میں ہمیں یہ عناصر غالب نظر آتے ہیں جیسا کہ ہم ججاج بن یوسف اور زیاد بن ابیہ وغیرہ کے خطبوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

اس دور کی خطابت میں ہمیں اس دور کے حالات کی بہترین تصویر نظر آتی ہے خواہ وہ سیاسی اٹھل پھٹل ہو، یا مذہبی بحث و مباحثہ ہوں یا علم کلام کے مناظرے ہوں یا وعظ و نصیحت کے حلقے ہوں، لوگوں کے آپسی اختلافات ہوں، یا قبائلی منافرتیں ہوں، یا معاشرتی محفلیں اور ملاقاتیں ہوں یا لوگوں کے آپسی تعلقات ہوں۔ غرض یہ کہ اس وقت کی خطابت اس دور کے سماج اور معاشرے کی بہترین تصویر پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

10.4 اموی دور کے چند مشہور خطبا

10.4.1 زیاد بن ابیہ

زیاد کی پیدائش عام الحجرت یعنی ہجرت کے سال یا اس سے کچھ پہلے ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں مشرق کی جانب ہونے والی فتوحات میں زیاد بھی شریک تھا۔ بچپن سے ہی بے انتہا ذہین اور فصیح و بلیغ تھا۔ حضرت علیؓ نے اسے اپنے دور خلافت میں بلاد فارس کا والی بنا کر بھیجا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے جب خلافت کا عہدہ سنبھالا تو زیاد کو اپنی جماعت میں شامل کر لیا۔ حضرت معاویہؓ نے زیاد کی کارکردگی دیکھی تھی اس لیے وہ اس کے بڑے قدر دان تھے۔ حضرت معاویہؓ نے اسے ۴۵ھ میں بصرہ، خراسان اور سجستان کا والی مقرر کر دیا۔ بعد میں کوفہ بھی اس کے ماتحت کر دیا۔ اس طرح پورا عراق اس کے ماتحت ہو گیا۔

زیاد ایک بہترین خطیب تھا، اپنی بات کو مؤثر انداز میں ادا کرنے کے لیے بہترین الفاظ اور انداز کا انتخاب کیسے کرنا ہے یہ اس کو بہت اچھی طرح آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فن خطابت میں اس کی بے پناہ مہارت کے اس معاصرین بھی قائل تھے۔ اس کے بارے میں شعبی کا کہنا ہے کہ میں جب بھی منبر پر کسی ایسے آدمی کو بولتے ہوئے سنتا جو بہت اچھا بولتا ہو تو میری خواہش یہی ہوتی تھی کہ وہ خاموش ہو جائے تاکہ اس کے منہ سے کوئی غلط بات نہ نکل جائے سوائے زیاد کے، کیوں کہ وہ جب بھی بولتا ہے بہت اچھا بولتا ہے۔ زیاد کی تقریریں بھی حجاج بن یوسف کی طرح دو اہم موضوعات کے ارد گرد گھومتی تھیں۔ ایک سیاست اور دوسرا وعظ و نصیحت۔ اس کے خطبوں کے کچھ اجزا ہم تک پہنچے ہیں۔ اس کا ایک طویل سیاسی خطبہ بھی تاریخ و ادب کی کتابوں میں موجود ہے جو اس دور کے بہترین خطبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ زیاد کا یہ خطبہ البتراء کہلاتا ہے اسے البتراء اس لیے کہا جاتا ہے کہ زیاد نے اپنے اس خطبہ کو بغیر حمد و ثنا کے شروع کیا تھا اور بتراء کے معنی عربی میں ناقص یا ادھورے کے آتے ہیں۔ اس خطبے کی ایک جھلک آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے:

”أما بعد فإن الجهالة الجاهلاء والضلالة العمياء، والغى الموفى بأهله على النار ما فيه سفهاؤ كم ويشتمل عليه علماؤ كم من الأمور العظام، ينبت فيها الصغير ولا يتحاشى عنها الكبير كأنكم لم تقرؤا كتاب الله ولم تسمعوا ما أعد الله من الثواب الكريم لأهل طاعته والعذاب الأليم لأهل معصيته في الزمن السرمدي الذي لا يزول، أتكونون كمن صرفت عينيه الدنيا، وسدث مسامعه الشهوات واختار الفانية على الباقية“۔

(یعنی بدترین جہالت اور تاریک گم رہی اور دوزخ کے عذاب کو واجب کر دینے والی کج روی جس میں تمہارے احق اور بے وقوف لوگ بتلا ہیں اور جس میں تمہارے عقلمند لوگ بھی برابر کے شریک ہیں وہ یقیناً ایک بہت ہی اہم اور سنجیدہ مسئلہ ہے۔ اسی صورت حال میں تمہارے بچے پلتے ہیں اور اسی میں تم بڑے ہو کر جیتے ہو تو ایسا لگتا ہے گویا تم نے اللہ کی کتاب پڑھی ہی نہیں۔ اللہ نے اپنے فرمانبردار بندوں کے لیے ثواب تیار کیا ہے اور اپنے نافرمان بندوں کے لیے وہ سخت عذاب تیار کیا ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے، ایسا لگتا ہے اس کے بارے میں تم نے کچھ سنا ہی نہیں۔ کیا تم ان لوگوں کی طرح ہو گئے ہو جن کی آنکھوں میں دنیا بس گئی ہو اور شہوتوں نے جن کے کان بند کر دیے ہوں، جنہوں نے باقی رہنے والی آخرت کو بھلا کر اس فنا ہونے والی دنیا کو گلے لگا لیا ہو)

10.4.2 طارق بن زیاد

طارق بن زیادہ اموی دور میں مصر کے والی موسیٰ بن نصیر کا ایک غلام تھا۔ خود موسیٰ بن نصیر بھی عبدالعزیز بن مروان کا آزاد کردہ غلام تھا۔ طارق بن زیادہ کے خاندان اور ذاتی حالات کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتی اور جو معلومات ملتی بھی ہے

اس میں بھی بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً ان کے نام تک کے بارے میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان کا نام طارق بن زیاد تھا یا طارق بن عمرو تھا۔ اسی طرح اس بات کو لے کر بھی اختلاف ہے کہ وہ بربر نسل سے تھے یا بلاد فارس کے موالی قوم سے ان کا تعلق تھا یا کسی اور قبیلے سے البتہ اس بات پر زیادہ تر مؤرخین کا اتفاق ہے کہ وہ موسیٰ بن نصیر کے آزاد کردہ غلام تھے اور موسیٰ نے انھیں طنخہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اندلس کی فتح میں طارق بن زیاد کا بہت ہی اہم رول تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے سب سے پہلے جو فوج فتح اندلس کے لیے روانہ کی تھی اس کا سربراہ طارق بن زیاد ہی کو بنایا تھا۔ اس بابت ایک قصہ بہت مشہور ہے کہ جب طارق نے اپنے سات سو سپاہیوں کے ساتھ چار کشتیوں پر سوار ہو کر سمندر کو پار کر لیا اور الجزیرۃ الخضراء کے سامنے صخرۃ الاسد نامی پہاڑی پر اپنی کشتیوں کو لنگر انداز کر دیا، تب اسپین کے حاکم لذریق کی فوجی طاقت کو دیکھ کر طارق کو یہ اندازہ ہو گیا کہ مقابلہ بے انتہا مشکل ہے اور اس کو جیننے کے لیے ان کے سپاہیوں کو جان کی بازی لگانی ہوگی، ورنہ سب کے سب لقمۂ اجل بن کر رہیں گے۔ اسی لیے طارق نے ان سبھی کشتیوں کو جلانے کا حکم دے دیا جن پر سوار ہو کر ان لوگوں نے سمندر پار کیا تھا تاکہ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ اب ان کے پاس میدان چھوڑ کر بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں بچا ہے اور اب انھیں سر بہ کفن میدان جنگ میں کودنا پڑے گا۔ اس موقع پر اپنے سپاہیوں کے حوصلوں کو بڑھانے کے لیے طارق بن زیاد نے ایک جوشیلہ خطبہ دیا تھا جو نہ صرف بحیثیت ایک کمانڈر کے خطبہ کے آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے بلکہ فصاحت و بلاغت کا وہ بہترین نمونہ ہے جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ یہاں اس خطبے کا کچھ حصہ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

”یا ایہا الناس این المفر، البحر من ورائکم والعدو أمامکم و لیس لکم واللہ إلا الصدق والصبر، واعلموا أنکم فی ہذہ الجزیرۃ أضعیع من الأیتام فی مادبۃ اللام، وقد استقبلکم عدو کم بجیشہ وأسلحتہ، وأقوائہ موفورۃ، وأنتم لا وزر لکم إلا سیوفکم ولا أقوات إلا ما تستخلصونہ من أیدی عدو کم، وإن امتدت بکم الأيام علی افتقار کم ولم تجزوا لکم امرأ ذہبت ریحکم، وتعوذت القلوب من رعبہا منکم الجراءۃ علیکم، فادفعوا عن أنفسکم خزلان ہذہ العاقبۃ من أمر کم بمناجزۃ ہذا الطاغیۃ“۔

(یعنی اے لوگو! اب بھاگنے کا راستہ کہاں ہے؟ سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن تمہارے سامنے ہے اور خدا کی قسم اب تمہارے لیے سوائے سچائی و صبر کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہے اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ تم اس جزیرہ میں ان یتیم بچوں سے زیادہ لاچار اور کم مایہ ہو جو کمینوں کے چنگل میں پھنس گئے ہوں۔ تمہارے دشمن نے تمہارا استقبال اپنی فوج سے کیا ہے۔ اس کے پاس طاقت، سامان خورد و نوش اور اسلحہ کی فراوانی ہے جب کہ تمہارا تمہاری تلواروں کے سوانہ کوئی سہارا ہے نہ ہی کوئی مددگار اور نہ ہی کوئی خورد و نوش کا سامان سوائے اس کے جو تم خود سے اپنے دشمنوں کے ہاتھوں سے چھین کر حاصل کر لو اور اگر بہت دنوں تک تمہاری محتاجگی اور کسمپرسی قائم رہی اور تم کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکتے تو یاد رکھو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور یہاں کے لوگوں کے دلوں میں تم سے خوف کے بجائے تم پر دست درازی کرنے کے خیالات پیدا ہونے لگیں گے۔ اس لیے اس سرکش حاکم سے ڈٹ کر مقابلہ کر کے اس ذلت آمیز نتیجہ سے اپنے آپ کو محفوظ کر لو۔)

10.4.3 حجاج بن یوسف

ابو محمد حجاج بن یوسف کی پیدائش طائف میں ۲۱ھ ہوئی تھی۔ حجاج ایک پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو معاشی اعتبار سے

قدرے تنگ دست تھا۔ شروع میں وہ ایک رنگ ریز کے یہاں کام کرتا تھا لیکن بے انتہاد لیر اور چرب زبان تھا۔ حضرت حسینؑ کی شہادت کے بعد اموی خلیفہ یزید نے ایک لشکر مدینہ میں اپنے مخالفین کو زیر کرنے کے لیے روانہ کیا اور اس میں حجاج کو بھی شامل کر لیا گیا۔ جب عبد الملک بن مروان خلیفہ ہوا تو اس نے حجاج کو مصعب بن زبیر سے جنگ کرنے اور عراق کو ان کے اثر سے آزاد کرانے کے لیے ایک فوج کا کمانڈر بنا کر بھیجا۔ حجاج نے مصعب بن زبیر کو قتل کر کے عراق کو ان کے حامیوں سے آزاد کر لیا اور اسے عبد الملک بن مروان کے زیر نگین کر دیا۔ اس کامیابی اور اس کے بعد کئی دوسری جنگی کامیابیوں کے بعد خلیفہ نے حجاج کا مقام بلند کر دیا اور اس کی خوب قدر کی۔ ۲۷ھ میں عبد الملک نے ایک لشکر جرجان کی سربراہی میں عبد اللہ بن زبیرؑ سے مقابلے کے لیے مکہ کی طرف روانہ کیا۔ حجاج نے مکہ پر حملہ کیا اور عبد اللہ بن زبیر کو قتل کروا کر مکہ میں سولی پر لٹکوا دیا۔ اس موقع پر حجاج نے اہل مکہ کے سامنے ایک خطبہ دیا تھا جو اس طرح تھا:

”یا أهل الحجاز، كيف رأيتموني، ألم أكشف ظلمة الجور وطخية الباطل بنور الحق، والله لقد واطئكم الحجاج وطأة مشفق وعطفة رحم ووصل قرابة، فاباكم أن تزلوا عن سنن أقمناكم عليه، فأقطع عنكم ما واصله لكم بالصارم البتار وأقيم من أودكم ما يقيم المثقف من أود القناة بالنار، ثم نزل وهو يقول

أخوال العرب إن عَضَّتْ به الحرب عَضَّهَا

وإن شَمَرَتْ عن ساقها الحرب شمرا

یعنی اے حجاز کے لوگو! تم نے مجھے کیسا پایا؟ کیا میں نے ظلم کی تاریکی اور باطل کے اندھیرے سے پردہ ہٹا کر نور حق سے دنیا کو منور نہیں کر دیا؟ خدا کی قسم تمہاری سر زمین پر حجاج نے ایک مشفق، قریبی، ایک عزیز اور رشتہ دار کی طرح قدم رکھا ہے اس لیے خبردار اس راستے سے ہرگز نہ ہٹنا جس کو ہم نے تمہارے لیے مقرر کیا ہے، ورنہ جو کچھ میں نے تم کو دیا ہے اسے دھاردار تلوار سے کاٹ کے رکھ دوں گا اور تمہاری کج روی کو آگ کے ذریعہ ایسے ہی سیدھا کر دوں گا جیسے نیزے کی کچی کو نیزہ درست کرنے والا آگ سے دور کرتا ہے۔ پھر وہ منبر سے اتر اور یہ شعر پڑھا: میں ایک ایسا جنگجو سپاہی ہوں کہ اگر جنگ اسے کاٹے گی تو وہ بھی اسے کاٹے بغیر نہ چھوڑے گا اور جنگ شروع ہو جائے تو وہ بھی اس کے لیے تیار رہے گا۔

حجاج کو جب عراق کا والی بنا کر بھیجا گیا تب اس نے اہل عراق کے سامنے بھی ایسی ہی جوشیلی اور زبردست تقریریں کیں کہ اہل عراق کے دل دہل گئے اور روح کانپ اٹھی۔ حجاج کے یہ خطبے تاریخ و ادب کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور ادب کے شہ پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عراق پہنچ کر حجاج نے جو تقریر اہل عراق کے سامنے کی تھی اس کی ایک جھلکی یہاں پیش کی جاتی ہے۔

”والله يا أهل العراق إن امير المؤمنين عبد الملك نفل كنانته بين يديه، فعجم عيدانها عوداً عوداً، فوجدني أمرها عوداً و أشدها مسكاً، فوجهني إليكم ورماكم به، يا أهل العراق، يا أهل النفاق والشقاق ومساوي الأخلق، إنكم طالما أوضعتم في الفتنة، واضطجعتم في مناخ الضلال، وسننتم سنن الغي، وأيم الله لألحنوكم لحو العود، ولأقر عنكم قرع المروءة، ولأعصبنكم عصب السلمة، ولأضربنكم ضرب غرائب الإبل“۔

(یعنی اے عراق کے لوگو! اللہ کی قسم امیر المؤمنین عبدالملک نے اپنے ترکش کے سارے تیر نکال کر ہر ایک کو دانت سے چبا کر دیکھا اور ان میں سے مجھ کو ہی سب سے زیادہ کڑوا، سخت اور مشکل سے ٹوٹنے والا پایا، اس لیے تم کو مجھ سے ہی مارا، اے عراق کے لوگو! تم نفاق اور اختلاف کی جڑ ہو اور تم بدترین اخلاق کے حامل ہو، تم فتنہ و فساد کی طرف تیزی سے بڑھتے ہو اور ضلالت و گمراہی کے بستروں پر سوتے ہو، خدا کی قسم میں تم لوگوں کی ایسے ہی کھال کھینچوں گا جیسے کسی لکڑی کی چھال اتاری جاتی ہے اور میں تمہاری ڈنڈوں سے ایسے ہی پٹائی کروں گا جس طرح مسلمہ نامی درخت کو اس کے پتے جھاڑنے کے لیے پیٹا جاتا ہے اور میں تمہیں ایسے ہی ماروں گا جیسے لوگ انجانے اونٹوں کو اپنے کنوؤں سے بھگانے کے لیے مارتے ہیں)

10.4.4 حسن بصری

حسن بصری کی پیدائش مدینہ میں ۲۱ھ میں ہوئی۔ ان کی والدہ خیرہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی آزاد کردہ باندی تھیں۔ ان کا رجحان بچپن سے ہی دینداری اور تحصیل علم کی طرف تھا۔ اس دور میں جاری سیاسی سرگرمیوں میں انھوں نے کبھی بھی دلچسپی نہیں لی۔ گویا انھوں نے خود کو دین پر عمل کرنے اور اس کی خدمت کرنے کے لیے وقف کر دیا تھا، وہ اپنا زیادہ تر وقت قرآن و حدیث کے مطالعہ میں ہی گزارا کرتے تھے۔ ان سے بہت سی احادیث بھی مروی ہیں۔ جب مشرق کی جانب فوجی مہم زوروں پر تھی تب وہ بھی اس میں شریک ہوئے اور خراسان کے بعض والیوں کے یہاں کچھ دفتری کام پر مامور ہوئے اور تقریباً دس سال تک اس کام سے منسلک رہے۔ اس کے بعد ۱۱۰ھ میں اپنی وفات تک بصرہ میں ہی گوشہ نشین رہے اور دین کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کا شمار ان کے عہد کے اہم واعظین میں ہوتا ہے۔ فصاحت و بلاغت میں بھی ان کی اپنی ایک الگ پہچان تھی۔

ویسے تو بنو امیہ کے دیگر خلفا کے یہاں بھی ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا لیکن بطور خاص حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں انہیں بہت ہی خاص مقام حاصل ہوا کیوں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز خود ایک متقی و صالح خلیفہ تھے اور وہ ایسے لوگوں کو بہت پسند کیا کرتے تھے۔ البیان و التبیین، العقد الفرید اور عیون الأخبار جیسے ادب کے اہم اور مستند مراجع میں حسن بصری کے خطبوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو آپ کی واعظانہ اور خطیبانہ صلاحیت کا پختہ ثبوت پیش کرتی ہے۔ وہ اپنے خطبوں میں اکثر تقویٰ اور عمل صالح اور آخرت کی تیاری کرنے پر ابھارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اپنے ایک خطبہ میں آپ فرماتے ہیں:

”یا ابن آدم بع دنیاک با آخرتک تر بحمما جمیعاً، ولا تبع آخرتک بدنیاک فتخسرهما جمیعاً، یا ابن آدم إذا رأیت

الناس فی النخیر فنافسہم فیہ، وإذا رأیتہم فی الشر فلا تغبطہم بہ، الثواء ہا ہنا قلیل والبقاء ہناک طویل۔“

(یعنی اے ابن آدم اپنی دنیا کو آخرت کے بدلے بیچ دے تو تجھے دونوں چیزیں مل جائیں گی۔ اور اپنی آخرت کو دنیا کے بدلے مت بیچ ورنہ دونوں ہاتھ سے جائیں گی۔ جب لوگوں کو خیر کے کام کرتے دیکھو تو اس میں ان کا مقابلہ کرو اور جب انہیں کوئی برائی کرتے دیکھو تو ان پر رشک نہ کرو، اس دنیا میں بہت کم رہنا ہے مگر آخرت میں بہت رہنا ہے)

بسا اوقات آپ اپنے خطبے میں قرآن کی کسی آیت کی دل نشین انداز میں تشریح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے قرآن کی آیت ”إِنَّا

عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا“ کو کچھ اس طرح اپنے وعظ میں سمجھایا کہ:

”إن قوما غدّوا في المطارف العتاق والعمائم الرقاق يطلبون الإمارات ويضيعون الأمانات، يتعرضون للبلاء وهم منه في عافية، حتى إذا أخافوا من فوقهم من أهل العفة وظلموا من تحتهم من أهل الذمة، اهزلوا دينهم وأسمنوا برأذينهم، ووسعوا دورهم وضيقوا قبورهم“۔

(یعنی بے شک وہ لوگ جو ریشم کے بہترین لباس زیب تن کیے ہوئے اور سروں پر بہت ہی باریک کپڑوں کے عمامے باندھے ہوئے حکومت و بادشاہت کو طلب کرتے ہیں اور امانتوں کو ضائع کر دیتے ہیں، وہ اپنے آپ کو ان مصیبتوں اور پریشانیوں کے حوالے کر دیتے ہیں جن سے وہ محفوظ تھے۔ یہاں تک کہ جب انھوں نے اپنے سے بلند تر پاک دامن اور نیک لوگوں کو ڈرانا شروع کر دیا اور اپنے ماتحت ذمیوں پر ظلم ڈھانا شروع کر دیا تو انھوں نے اپنے دین کو کمزور اور اپنی ساریوں کو موٹا کرنا شروع کر دیا (یعنی دین کو بھلا کر مال و دولت لوٹنے میں لگ گئے) اور اپنے گھروں کو کشادہ کر لیا اور اپنی قبروں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔)

10.5 اکتسابی نتائج

عربوں کو شروع سے ہی خطابت میں بے پایاں مہارت حاصل تھی، عہد جاہلیت اور عصر رسول و خلافت راشدہ میں عربوں نے خطابت میں جو جو ہر دکھائے اس کے نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں، لیکن عصر اموی کو عربی خطابت کا سنہری دور کہا جائے تو شاید غلط نہیں ہوگا، کیوں کہ جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا کہ جس انداز سے خلافت راشدہ کے آخری ایام میں اور اس کے بعد جو سیاسی اتھل پتھل اور افراتفری برپا ہوئی اور مختلف سیاسی و غیر سیاسی جماعتیں جس طرح سے آپس میں نبرد آزما ہوئیں اس طرح کے ماحول میں خطابت جیسے فن کو فروغ حاصل ہونا ایک فطری بات تھی اور ایسا ہی ہوا کہ ہر جماعت کے اپنے خطیب ہوا کرتے تھے جو اپنی جماعت کے موقف اور عقائد کو پیش کرتے تھے اور ان کا دفاع کرتے تھے اور اپنے حریفوں کے الزامات اور حملوں کا جواب دیتے تھے، امویوں کے اپنے خطیب تھے جن میں زیاد بن ابیہ اور حجاج بن یوسف کے نام نمایاں ہیں، جب کہ شیعوں اور خوارج کے اپنے خطیب تھے جن میں سلیمان بن صرف، مختار ثقفی، نافع بن ازرق، واصل بن عطاء، قطری بن فجاءہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، عبداللہ بن زبیر خود ایک اچھے خطیب تھے، ان کے علاوہ سحبان وأئل، احنف بن قیس اور حسن بصری جیسے خطیب بھی فن خطابت میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ غرض یہ کہ یہ دور فن خطابت کے ارتقا کے لیے بہت ہی سازگار دور ثابت ہوا ہے لہذا اگر اسے عربی خطابت کا سنہرا دور کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔

10.6 نمونے کے امتحانی سوالات

- (۱) عصر اموی میں فن خطابت کے ارتقا کے اہم اسباب کیا تھے، ان پر مختصراً روشنی ڈالیے۔
- (۲) عصری اموی میں سیاسی خطابت کی اہمیت اور ارتقا پر ایک نوٹ لکھیے۔
- (۳) درباری خطابت سے کیا مراد ہے؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔

(۴) اموی دور میں واعظانہ خطابت اور اس کے ارتقا کا جائزہ لیجیے۔

(۵) اموی دور کے ان اہم خطبا میں سے کسی دو کے اوپر ایک مختصر نوٹ لکھیے

(۱) حجاج بن یوسف (۲) زیاد بن ابیہ (۳) طارق بن زیاد (۴) حسن بصری

10.7 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

- ۱۔ تاریخ الأدب العربی، العصر الإسلامي شوقی ضیف
- ۲۔ تاریخ الأدب العربی عمر فروخ
- ۳۔ أدب العرب زبید احمد
- ۴۔ الجامع فی تاریخ الأدب العربی حنا الفاخوری
- ۵۔ تاریخ الأدب العربی أحمد حسن الزیات
- ۶۔ تاریخ عربی ادب ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

(<https://archive.org/details/TareekhEArabiAdab/page/n3>)

اکائی 11 خطوط نویسی اور وصیتیں

اکائی کے اجزا	
11.1 مقصد	
11.2 تمہید	
11.3 عصر اموی میں خطوط نویسی	
11.3.1 سیاسی خطوط نویسی	
11.3.1.1 خوارج کی خطوط نگاری	
11.3.1.2 شیعوں کی خطوط نگاری	
11.3.1.3 بنو امیہ کی خطوط نگاری	
11.3.2 واعظانہ خطوط نویسی	
11.3.3 ذاتی خطوط	
11.3.4 دیوان الرسائل	
11.4 عصر اموی میں توصیات یا ادب الوصایا	
11.4.1 عصر جاہلی میں ادب الوصایا	
11.4.2 عصر رسول اور خلافت راشدہ میں ادب الوصایا	
11.4.3 عصر اموی میں ادب الوصایا	
11.5 اکتسابی نتائج	
11.6 نمونے کے امتحانی سوالات	
11.7 مطالعے کے لیے معاون کتابیں	

11.1 مقصد

اس اکائی کا اصل مقصد اموی دور میں خط و کتابت اور ادب الوصایا تو صیات کا جو سلسلہ قائم ہوا اس کا ایک مختصر تعارف پیش کرنا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ اس دور کے خطوط اور وصیتیں ادبی اہمیت کی حامل ہیں اور ان سے اس دور کے حالات کا بھی پتہ چلتا ہے۔

11.2 تمہید

خطوط نویسی اور ادب الوصایا کو قدیم ادب کا ایک اہم حصہ مانا جاتا ہے اور یہ بات جگہ بالکل صحیح ہے۔ ان دونوں نثری فنون کے ذریعہ ہمیں متعلقہ عہد کے احوال و کوائف اور حالات زندگی کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ عصر اموی کے جو خطوط اور وصیتیں ہم تک پہنچی ہیں وہ ایک طرف جہاں اپنی ادبی اور فنی حیثیت سے ایک منفرد مقام رکھتی ہیں اور اہم سرمایہ مانی جاتی ہیں تو وہ خطوط اور وصیتیں اس عہد کے سیاسی، سماجی، دینی حالات اور لوگوں کے ذاتی حالات کے بہت سے پہلوؤں کو ہمارے سامنے اجاگر کرتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس عہد کے بہت سے خطوط اور بہت سی وصیتیں ہم تک نہ پہنچ سکیں لیکن جو کچھ بھی ہم تک پہنچ سکی ہیں وہ یقیناً اہم ادبی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو خطوط اس عہد کے ہم تک پہنچے ہیں ان میں سیاسی خطوط بھی ہیں مثلاً بنو امیہ کے خلفا اور والیوں کے لکھے ہوئے خطوط یا خوارج، شیعہ اور عبد اللہ بن زبیر کے جماعت کے ذریعہ لکھے ہوئے خطوط، وہیں ان میں واعظانہ اور ناصحانہ خطوط بھی شامل ہیں۔ اسی طرح اس دور کے بہت سے ذاتی خطوط بھی ہم تک پہنچے ہیں، اگرچہ ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اموی خلفانے ایک شعبہ بھی سرکاری خط و کتابت کے لیے خاص کر رکھا تھا جس میں سرکاری خطوط کو لکھنے اور انہیں ارسال کرنے کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہ شعبہ دیوان الرسائل کہلاتا تھا۔ اس عہد کی خطوط نویسی سے متعلق ان سبھی پہلوؤں کا اس اکائی کے تحت تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا۔

جہاں تک بات اس دور کے ادب الوصایا یا وصیتوں کی ہے تو ان پر بھی عموماً ادبی رنگ غالب ہوتا تھا اور وہ سیاسی و غیر سیاسی نوعیت کی ہوا کرتی تھیں۔ اس موضوع کے تحت اس اکائی میں سب سے پہلے ادب الوصایا کا مختصر پس منظر پیش کیا گیا ہے اور عہد جاہلی و عہد اسلامی میں اس کی اہمیت پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ عصر اموی میں وصیتوں کی جو مختلف شکلیں موجود تھیں ان کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور کچھ مثالیں پیش کی گئی ہیں جن سے اس دور کے نثری ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

11.3 عصر اموی میں خطوط نویسی

خط و کتابت اور مراسلت کو اس دور کے نثری سرمایہ کا ایک اہم حصہ مانا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اگرچہ عصر رسول اور خلافت راشدہ کے دور میں بھی جاری تھا اور اس دور کے خطوط کے نمونے تاریخ و ادب کے مصادر میں موجود ہیں۔ اموی دور میں چونکہ اسلامی ریاست بہت وسیع و عریض ہو چکی تھی اس لیے خلیفہ اور والیوں کو اپنے ماتحت علاقوں میں موجود اپنے قائدین اور نمائندوں سے رابطے کے لیے خط و کتابت کا ہی سہارا لینا پڑتا تھا، اس کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

ویسے تو اس دور کے جو خطوط مختلف مراجع کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے کچھ مراجع قابل اعتماد یا مستند نہیں ہیں جس کی وجہ سے ان میں مذکور متعدد خطوط کو ہم پورے یقین کے ساتھ نہیں لے سکتے، البتہ کچھ مستند مراجع جیسے جاحظ کی

البیان و التبیین، امام طبری کی تاریخ الطبری اور مبرد کی الکامل وغیرہ ایسے مراجع ہیں جن میں کثیر تعداد میں اس دور کے خطوط موجود ہیں جن کی روشنی میں اس دور میں فن خطوط نویسی کے ارتقا کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان مراجع میں امام طبری کی تاریخ کو خاص طور سے اہم مرجع مانا جاتا ہے۔

اس دور کے جو خطوط ہم تک پہنچے ہیں ان میں اگرچہ خوارج، شیعہ، عبداللہ بن زبیر، بنو امیہ اور واعظین جیسی جماعتوں کے خطوط موجود ہیں، لیکن سب سے زیادہ خطوط جو ان مراجع میں موجود ہیں وہ خوارج کی طرف منسوب ہیں۔

فرقہ خوارج کے اندر جو آپسی اختلافات تھے ان سے ہم سب بخوبی واقف ہیں، یہ فرقہ بنیادی طور پر چار فرقوں یعنی ازرقہ، نجدیہ، صفریہ اور اباضیہ میں منقسم تھا اور آپس میں فکری اور سیاسی اختلافات اپنے عروج پر تھے، ان فرقوں کے رہنماؤں اور قائدین کے درمیان مختلف مسائل کو لے کر خوب خط و کتابت ہوتی تھی، مثال کے طور پر ازرقہ کے قائدین نافع بن ازرق اور قطری بن الفجاءہ کی جو خط و کتابت حجاج بن یوسف سے ہوئی اس کو اس عہد کی خط و کتابت کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، ان خطوط میں ایک دوسرے پر طرح طرح کے الزام لگائے جاتے تھے۔

اگر ہم اس دور میں شیعوں کے خطوط کی بات کریں تو جیسا کہ اوپر ذکر آیا کہ ان کی تعداد بے شمار ہے، البتہ زیادہ تر غیر مستند کتابوں کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں، جماعت شیعہ کے جو خطوط ہم تک اس دور کے پہنچے ہیں ان میں وہ خطوط خاص طور سے قابل ذکر ہیں جن کو ان کے قائدین نے اپنے متبعین کے نام روانہ کیا، جیسے سلیمان بن صدر اور مختار الثقفی وغیرہ، اس کے علاوہ ان کے وہ خطوط بھی موجود ہیں جو انھوں نے دوسری جماعتوں اور فرقوں کے قائدین اور رہنماؤں کے نام لکھے تھے۔ ایسے ہی تاریخ کی کتابوں میں عبداللہ بن الزبیر اور ان کے والیوں کے کئی خطوط موجود ہیں، ان میں عبداللہ بن زبیر کا وہ خط بھی ہے جو انھوں نے شیعہ رہنما مختار الثقفی کے نام لکھا تھا، رہی بات بنو امیہ کی تو چونکہ وہ صاحب اقتدار تھے اس لیے انتظامی امور کی ادائیگی کے لیے خط و کتابت ان کی ایک بنیادی ضرورت تھی، چنانچہ خلفا اپنے والیوں کو خطوط بھیجا کرتے تھے اور والی ان کے خطوط کا جواب لکھتے تھے، اسی طرح قائدین جب بھی کوئی نیا علاقہ فتح کرتے تو فوراً خط لکھ کر اپنے والی اور خلیفہ کی جانب روانہ کرتے تھے، بہت سے معاہدے بھی خطوط کے ذریعہ روانہ کیے جاتے تھے۔

اس ضمن میں خاص طور سے اولین دور میں جن خطوط کا ذکر کیا جاتا ہے ان میں زیادہ بن ابیہ اور امیر معاویہ کے درمیان ہونے والی خط و کتابت، یزید بن معاویہ اور حجاز میں موجود ان کے والیوں کے درمیان ہونے والی مراسلت اور یزید اور عراق میں ان کے والی عبید اللہ بن زیاد کے درمیان ہونے والی خط و کتابت قابل ذکر ہے۔ عبدالملک بن مروان کا عہد اس حوالہ سے خاص اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اسی کے عہد میں سب سے زیادہ خط و کتابت ہوئی اور اس میں بھی خاص طور سے خلیفہ اور اس کے والی حجاج بن یوسف کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی وہ اس دور کی خط و کتابت کا اہم سرمایہ مانا جاتا ہے۔ خود حجاج بھی اپنے قائدین اور ماتحتوں سے کثرت سے خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ اسی طرح حجاج اور اس کے مخالفین اور باغیوں کے درمیان بھی خوب خط و کتابت ہوتی تھی جس کے نمونے تاریخ و ادب کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ حجاج کا جس طرح خطابت میں اپنا ایک منفرد انداز تھا اسی طرح خط و کتابت میں بھی اس کا ایک خاص انداز تھا۔

اس کے علاوہ وعظ و نصیحت پر مبنی کچھ خطوط بھی اس عہد کے ہم تک پہنچے ہیں۔ اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں ذکر کیا جاتا

ہے کہ وہ واعظین کو خط لکھ کر ان سے یہ گزارش کرتے تھے کہ وہ انہیں اپنی طرف سے نصیحت لکھ کر بھیجیں چنانچہ انہوں نے اپنے عہد کے امام حسن بصری کو لکھا کہ وہ ان کو مفید شوروں اور نصیحتوں سے نوازیں چنانچہ حسن بصری نے ان کو ایک خط اس بابت لکھا جو اس دور کی خط و کتابت کے اہم نمونوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس خط میں امام صاحب نے اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق، بعث بعد الموت اور تقویٰ جیسے موضوعات پر گفتگو کی ہے۔

جاہظ نے حسن بصری کی فصاحت و بلاغت کی خاص طور سے بہت تعریف کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے بعد کے دور میں بھی ان کے اسلوب کو لوگ اپناتے رہے۔

سیاسی اور دینی خط و کتابت کے علاوہ شخصی خط و کتابت کو بھی اس دور میں رواج حاصل ہوا، چونکہ اب اسلامی ریاست بہت وسیع و عریض ہو چکی تھی اس لیے خط و کتابت کے ذریعہ ہی ایک دوسرے تک اپنا پیغام پہنچانا اور خیر خبر لینا ممکن تھا، لہذا شخصی خط و کتابت کا دائرہ بھی بہت وسیع ہوا لیکن اس نوعیت کے زیادہ تر خطوط ہم تک اس طرح نہیں پہنچ سکے جس طرح دوسری اقسام کے خطوط ہم تک پہنچے ہیں۔ اس قسم کے جو خطوط بھی ہم تک پہنچے ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شخصی خطوط میں بھی زبان و بیان کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا ان میں بھی عبارتیں مسجع اور مقفی ہوا کرتی تھیں۔

11.3.1 سیاسی خطوط نویسی

11.3.1.1 خوارج کی خطوط نگاری

ازرقہ کی جماعت نے اپنے رہنما نافع بن ازرق کی سربراہی میں یہ طے کر لیا تھا کہ ہر وہ بات جو انہیں غلط معلوم ہوگی اس کے خلاف انہیں تلوار نکال لینا ہے، چاہے اس کے لیے مسلمانوں کا خون ہی کیوں نہ بہانا پڑے اور معصوم بچوں تک کو قتل کرنا پڑے جب کہ خوارج کی ہی دیگر جماعتوں نے ان کے اس موقف کی سختی سے مخالفت کی۔ اس طرح کے موضوعات کو لے کر ان فرقوں میں آپس میں خط و کتابت کی ایک جنگ سی چھڑ گئی تھی۔ اس نوعیت کے دو خطوط مبرد نے اپنی کتاب الکامل میں ذکر کیے ہیں جن کا تبادلہ عبادت فریقہ کے سربراہ عجبہ بن عامر حنفی اور ازرقہ فریقہ کے سربراہ نافع بن ازرق کے درمیان ہوا تھا۔ اس خط میں عجبہ نافع پر حملہ کرتا ہے اور پھر نافع اس کا جواب دیتا ہے۔ دونوں ہی خط فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار کے حامل اور نہایت دلچسپ ہیں۔

ایسے ہی جب ازرقہ کی جماعت نے اپنے ایک دوسرے رہنما قطری بن الفجاءة کی سربراہی میں جب اس وقت کے گورنر عراق حجاج بن یوسف کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا تو اس موقع پر بھی دونوں رہنماؤں اور سپہ سالاروں میں خط و کتابت کا سلسلہ پورے شد و مد کے ساتھ جاری رہا، چنانچہ حجاج نے قطری کو دھمکی آمیز خط لکھ کر اس کو ڈرانے اور دبانے کی کوشش کی تو وہیں قطری نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے حجاج کے خط کا سخت لب و لہجے میں جواب دیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان دونوں خطوط کی کچھ عبارتیں نقل کی جائیں تاکہ اس دور کی سیاسی خط و کتابت کی ایک جھلک ہمارے سامنے آجائے اور ہمیں اس کے اسلوب اور انداز و بیان کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ حجاج بن یوسف نے قطری کے نام جو خط لکھا وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

”سلام علیک۔ أما بعد! فإنک مَرَفْتُ من الدین مَرُوقَ السہم من الرَّمیة، وقد علمتَ حیث تَجَزَّ فَمَت، ذلک انک

عاص لله ولولا أمره، غير انك اعرابي جلف أُمي تستطعم الكسرة وتستشفى بالتمر، والأمر عليك حسرة، خرجت لتنال شعبة، فلحق بك طعام صلوا بهم صليت به من العيش فهم يهزون الرماح ويستنشون الرياح على خوف و جهد من امورهم، وما أصبحوا ينتظرون اعظم مما جهلوا معرفته، ثم أهلكهم الله بنزحتين۔ والسلام“

(ترجمہ: تم پر سلامتی ہو، تم دین سے ایسے ہی نکل گئے ہو جیسے کوئی تیرا اپنے شکار کو چیرتے ہوئے نکل جاتا ہے اور تم نے کیا غلطی کی ہے یہ تم بخوبی جانتے ہو، تم نے اللہ اور اس کے اولیا کی نافرمانی کی ہے، اس کے علاوہ تم سخت مزاج بدو ہو اور ان پڑھ ہو اور دوسروں کے نوالوں پر جیتے ہو اور صرف کھجور کھا کر اپنا علاج کرتے ہو اور تمہارا ہر معاملہ تمہارے لیے افسوس اور حسرت و ندامت کا سبب بنتا ہے، تم اپنی بھوک مٹانے نکلے تھے اور غنڈے موالی تمہارے ساتھ ہو لیے اور وہ بھی تمہاری ہی طرح جینے لگے، ہو امیں نیزے لہراتے ہیں جب کہ پیٹ بالکل خالی ہوتا ہے، دل میں خوف ہوتا ہے اور تھکن سے چور ہوتے ہیں اور انھیں یہ بھی نہیں پتہ کہ جو چیز آنے والی ہے وہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے جس کی وہ توقع کر رہے ہیں، آخر کار اللہ نے انھیں دو شکستوں سے دوچار کیا)

حجاج کے اس خط کے جواب میں قطری نے جو خط لکھ کر روانہ کیا اس کے چند ابتدائی جملے آپ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں:

”سلام على الهداة من الولاة الذين يرعون حريم الله ويرهبون نغمه، فالحمد لله على ما أظهر من دينه، وأطلع به أهل السفال وهدى به من الضلال ونصر به عند استخفافك بحقه، كتبت إلي تذكرا أني اعرابي جلف أُمي أستطعم الكسرة وأستشفى بالتمر، ولعمري يا ابن ام الحجاج إنك لمُنِيَّة في جبلتك مُطْلِحِم في طريقتك، واه في وثيقتك، لا تعرف الله ولا تجزع من خطيبتك، ينست واستيأست من ربك فالشيطان قرينك“

(ترجمہ: سلامتی ہو ان والیوں پر جو دوسروں کو راہ دکھاتے ہیں اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور اس کے عقاب سے لوگوں کو ڈراتے ہیں۔ تمام تعریف اللہ کے لیے ہے، اس دین حق کے لیے جسے اللہ نے ظاہر کر دیا اور گھٹیا اور ذلیل قسم کے لوگوں کو خوار کر دیا جس کے ذریعہ اس نے گمراہی سے نجات دی اور اس کے ذریعہ سے اس وقت لوگوں کی مدد کی جب تم نے اس کے حقوق کو پامال کیا۔ تم نے مجھے خط لکھ کر یہ کہا کہ میں سخت مزاج بدو ہوں اور ان پڑھ ہوں، دوسروں کے ٹکڑوں اور نوالوں پر جیتتا ہوں اور صرف کھجور سے علاج کرتا ہوں، تو سن لے اے اپنی ماں کی اولاد میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تو تو فطری طور پر ایک گمراہ انسان ہے، تیرے ہر کام میں ٹیڑھ اور کچی پائی جاتی ہے، تو بالکل بھی بھروسے کے لائق نہیں ہے، نہ ہی تو اللہ کو ٹھیک سے جانتا ہے اور نہ ہی تو اپنی غلطی پر کبھی شرمندہ ہوتا ہے، تو خود سے بھی مایوس ہو چکا ہے اور اپنے رب سے بھی مایوس ہو چکا ہے اور شیطان ہی تیرا اصل دوست ہے)

ان دونوں خطوط میں ایک طرف تو ہمیں فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ معیار نظر آتا ہے، سجع و قافیہ اور طباق و جناس کی تزئین کاری کا غلبہ نظر آتا ہے، بھاری بھرم اور موثر الفاظ کی کثرت نظر آتی ہے تو وہیں دوسری طرف ان میں ہمیں بے انتہا بے باک اور جری لب و لہجہ نظر آتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ کوئی خط یا کوئی مجموعہ الفاظ نہیں بلکہ تیروں اور تلواروں کی بوچھار ہو جو دشمن کے دل و دماغ کو تار تار کر کے رکھ دے اور اس کے نفس کو چھانی کر دے۔ یہ انداز تھا اس دور کی سیاسی خطوط نگاری کا۔ ان خطوط میں ایک بات جو مشترک نظر آتی ہے وہ ہے السلام علیکم سے ان کی شروعات۔ یہ اس دور کے اسلوب کی ایک خوبی تھی کہ خطوط کو اکثر سلام یا بسم اللہ سے شروع کیا جاتا تھا۔

11.3.1.2 شیعوں کی خطوط نگاری

شیعہ فرقہ کے خطوط کی ایک کثیر تعداد تاریخ و ادب کے مختلف مراجع میں محفوظ ہے جس سے اس دور کی خطوط نگاری کے انداز اور بطور خاص اس پر چڑھے مذہبی رنگ کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ شیعوں کے درمیان خط و کتابت نے اس وقت زور پکڑ لیا جب اہل کوفہ نے حضرت حسین کو کوفہ کی طرف کوچ کرنے پر آمادہ کیا تا کہ وہ بنو امیہ کے خلاف جنگ میں باقاعدہ شریک ہو سکیں اور ان کو خلافت سے برطرف کر کے خلافت اس کے اصل حقداروں کو دی جاسکے۔ اس کے بعد حالات بہت تیزی سے بدلے یہاں تک کہ حضرت حسین کی شہادت کا افسوس ناک واقعہ پیش آیا، اس کے بعد تو ابنین کی تحریک چلی جس میں اس کے رہنما سلیمان بن سرد نے حسرت و ندامت کا لبادہ اوڑھ کر قاتلین حسین سے انتقام کا اعلان کیا، سلیمان اور اس کے ساتھیوں کے درمیان بھی خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوا جس کے نمونے تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ اس کے بعد عبد اللہ بن زبیر کے عہد میں مختار ثقفی نے علم بغاوت بلند کیا اور کوفہ پر قبضہ کر لیا، مختار اور اس کی جماعت کے دوسرے سپہ سالاروں اور قائدین کے درمیان جن خطوط کا تبادلہ ہوا وہ بھی تاریخ و ادب کے مراجع میں محفوظ ہیں، انھیں میں سے ایک خط وہ ہے جو مختار نے بنو تمیم کے قائد احنف بن قیس کے نام لکھا تھا:

”بسم الله الرحمن الرحيم، من المختار بن ابی عبیدالی الأحنف بن قیس، ومن قبله، فسلم أنتم، أما بعد فویل امر بیعة من مضر، فإن الأحنف مؤرد قومہ سقر، حیث لا یستطیع لهم الصدر، وإنی لا أملك ما حُطَّ فی القدر، وقد بلغنی انکم تسموننی کذابا، وإن کُذِّبْتُ فقد کذبت رسل من قبلی، ولست بخیر من کثیر منهم“

(ترجمہ: بسم اللہ الرحمن الرحیم، مختار بن ابی عبید کی طرف سے احنف بن قیس اور اس کی جماعت کے نام، تم پر سلامتی ہو، اما بعد! مضر سے تعلق رکھنے والے مضر قبیلہ پر مجھے حیرت ہوئی ہے، احنف اپنی قوم کو جہنم رسید کرنا چاہتا ہے، جہاں پہنچ کر وہ ان کا دفاع بھی نہیں کر سکتا، تقدیر میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ میری ملکیت میں نہیں ہے، مجھے پتہ چلا ہے کہ تم لوگ مجھے جھوٹا کہتے ہو، اگر میں نے جھوٹ بولا ہے تو مجھ سے پہلے بہت سے نبیوں نے بھی جھوٹ بولا ہے اور میں بہر حال ان سے بہتر نہیں ہوں)

اسی طرح سے امام طبری نے حضرت زبیر بن عوام اور عراق میں موجود ان کے والیوں کے درمیان ہونے والی خط و کتابت کے کئی نمونے پیش کیے ہیں۔

11.3.1.3 بنو امیہ کی خطوط نگاری

جہاں تک خود بنو امیہ کے خلفاء، امرا اور حکام اور والیوں کی بات ہے تو ان کے مابین خط و کتابت دیگر سیاسی جماعتوں کے بمقابلہ کہیں زیادہ تھی، اسی طرح بنو امیہ اور دیگر سیاسی جماعتوں کے درمیان بھی خط و کتابت بہت زور و شور کے ساتھ جاری رہی۔ خطوط کے ذریعہ خلیفہ عہد نامے لکھ کر مختلف علاقوں میں موجود اپنے والیوں کے نام روانہ کیا کرتے تھے بلکہ خلفاء اور ان کے والیوں کے درمیان ہر چھوٹے بڑے معاملہ پر خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ قائم رہتا تھا، جیسے قائدین جب بھی کوئی نیامشن سر کرتے یا کوئی نیا علاقہ فتح کرتے تو فوراً خط لکھ کر خلیفہ کو یہ خوش خبری سناتے یا جب بھی خلافت اسلامیہ کے کسی گوشے میں کوئی بغاوت سر اٹھاتی تو اس علاقے میں موجود خلیفہ کے والی فوراً خلیفہ کو اس سے باخبر کرتے

اور مدد مانگتے مثال کے طور پر جب حجر بن عدی اور اس کے شیعہ ساتھیوں نے علم بغاوت بلند کیا تو زیاد بن ابیہ نے فوراً حضرت معاویہ کو اس کی اطلاع دی اور خلیفہ نے اس کا جواب دیا، ایسے ہی یزید بن معاویہ اور حجاز میں متعین اس کے والیوں کے درمیان عبداللہ بن زبیر اور حسین بن علی کے خلاف جنگی مہم کے سلسلے میں خط و کتابت ہوئی۔ اسی طرح جب حضرت حسین کو فہ پہنچے اور بعد میں جو واقعات پیش آئے اس سلسلے میں خلیفہ یزید بن معاویہ اور عبداللہ بن زیاد کے درمیان خوب خط و کتابت ہوئی۔ یہ سارے خطوط تاریخ طبری اور دیگر مراجع میں موجود ہیں۔

اس دور میں سیاسی خط و کتابت کا جو سلسلہ پہلے اموی خلیفہ معاویہ کے ذریعہ شروع ہوا وہ خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دور میں اپنے شباب پر پہنچ گیا، بطور خاص عبدالملک اور اس کے گورنر حجاج بن یوسف کے درمیان بکثرت خط و کتابت ہوئی۔ حجاج بن یوسف جہاں ایک طرف ایک بہترین شعلہ بیان خطیب تھا تو وہیں خطوط نویسی میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھا۔ عراق اور خراسان میں جو بغاوتیں ظاہر ہوئیں انہیں کچلنے کی ذمہ داری حجاج کو ہی سونپی گئی تھی چنانچہ میدان جنگ کی ہر خبر حجاج خلیفہ کو خط کے ذریعہ بھیجا کرتا تھا، ساتھ ہی ساتھ خود اپنے قائدین اور سپہ سالاروں کے ساتھ اس کی خط و کتابت بہت کثرت سے ہوا کرتی تھی۔ حجاج کا مزاج اور لب و لہجہ اس قدر سخت تھا کہ وہ بنو امیہ کی سربرآوردہ شخصیات تک کو بھی نہیں بخشتا تھا چنانچہ ایک بار اس نے ولی عہد سلیمان بن عبدالملک کو جس سے اس کی کچھ ان بن ہو گئی تھی، یہ خط لکھ کر بھیجا: ”إنما أنت نقطة من مداد، فإن رأيت في ما رأى أبوك وأخوك كنت لك كما كنت لهما وإلا فأنا الحجاج وأنت النقطة، فإن شئت محوتك وإن شئت اثبتك“

(ترجمہ: تمہاری حیثیت روشنائی کے ایک نقطہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں، اگر میرے بارے میں تمہاری رائے وہی رہی جو تمہارے باپ اور بھائی کی تھی تو میں میری رائے بھی تمہارے تین ایسے ہی رہے گی جیسی ان کے لیے تھی، ورنہ یاد رکھنا کہ میں حجاج ہوں اور تم روشنائی کا ایک نقطہ، اگر میں چاہوں تو تمہیں مٹا دوں اور اگر چاہوں تو تمہیں باقی رکھوں)

یقیناً حجاج کا یہ انداز اور یہ سخت لب و لہجہ اس کی تقریروں کی یاد دلاتا ہے جن میں وہ کسی شیر کی طرح دھاڑتا اور گرجتا ہوا نظر آتا ہے۔ حجاج کے یہ خطوط اس دور کی خطوط نویسی کے بہترین نمونے شمار کیے جاتے ہیں، فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے حجاج کے خطوط کو بہت ہی بلند مقام حاصل ہے۔

11.3.2 واعظانہ خطوط نویسی

پہلی صدی ہجری کے آخر میں سیاسی خطوط کے ساتھ ساتھ واعظانہ اور ناصحانہ خطوط کا بھی چلن ہونے لگا، اس سلسلے میں متقی و پرہیزگار خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ خلفائے بنو امیہ میں انہیں کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ خود بھی اپنے ماتحتوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے اور اس بات کو بہت پسند بھی کرتے تھے کہ اہل علم اور اہل تقویٰ ان کو وعظ و نصیحت کرتے رہیں۔ ان کے برعکس دیگر اموی خلفا اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی ان کی طرف انگلی اٹھائے یا انہیں وعظ و نصیحت کرے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور کے ایک متقی و پرہیزگار واعظ اور ناصح امام حسن بصری کا نام تاریخ کی کتابوں میں بڑے ہی ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیز بھی ان کے ورع و تقویٰ سے اس قدر متاثر تھے کہ ان سے وعظ و نصیحت کرنے کی درخواست کرتے تھے، چنانچہ حسن بصری نے ان کے خط کا جواب لکھا جو بہت سی قیمتی نصیحتوں پر مشتمل ہے، اس خط میں امام حسن بصری نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ایک حاکم کے اوپر رعایا کے

کیا حقوق ہوتے ہیں اور اس کے اوپر اس کے دین کے کیا حقوق ہوتے ہیں، یہاں اس طویل خط کی ایک جھلک پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

”اعلم یا امیر المؤمنین ان الله جعل الإمام العادل قوام كل مائلة وقصد كل جائر، وصلاح كل فاسد وقوة كل ضعيف ونصفة كل مظلوم ومفزع كل ملهوف، والإمام العادل يا امير المؤمنين كالراعي الشفيق على ابله الرفيق بها الذي يرتاد لها أطيب المراعى ويزودها عن مراتع الهلكة، ويحميها من السباع، ويكفيها من أذى الحر والقُر، والإمام العادل يا امير المؤمنين كالأب الحانى على ولده، يسعى لهم صغاراً ويعلمهم كباراً، يكتسب لهم في حياته ويذخر لهم بعد مماته، والإمام العادل يا امير المؤمنين كالأم الشفيقة البرّة بولدها، حملته كرها ووضعته كرها، وربّته طفلاً، وتسهر بسهره وتسكن بسكونه ترضعه تارة وتفظمه أخرى وتفرح بعافيته وتغتم بشكايته“

(ترجمہ: اے امیر المؤمنین! آپ جان لیجیے کہ اللہ نے عادل امام اور خلیفہ کو کج روی کو سیدھا کرنے کے لیے، ظالم کو صحیح راہ دکھانے کے لیے، بدکار کی اصلاح کے لیے، مجبور کو تقویت بخشنے کے لیے، مظلوم کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے اور لاچار کو پناہ دینے کے لیے مقرر کیا ہے۔ اے امیر المؤمنین! عادل امام ایک ایسے چرواہے کی طرح ہوتا ہے جو اپنے اونٹوں کے ساتھ شفقت اور نرمی سے پیش آتا ہے اور ان کے لیے بہترین چراگاہ تلاش کرتا ہے اور انھیں ہر طرح کی ہلاکت سے محفوظ رکھتا ہے، خونخوار جانوروں سے ان کی حفاظت کرتا ہے، ہر قسم کی تکلیف اور پریشانی سے انھیں بچا کر رکھتا ہے۔ اے امیر المؤمنین! عادل امام ایک ایسے باپ کی طرح ہوتا ہے جو اپنے بچوں سے محبت سے پیش آتا ہے، بچپن میں ان کے لیے ہر مشقت اٹھاتا ہے اور جب بڑے ہو جاتے ہیں تو انھیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتا ہے، اپنی زندگی میں ان کے لیے کماتا ہے اور اتنا مال ان کے لیے جمع کرتا ہے کہ اس کے بعد ان کے کام آسکے۔ اے امیر المؤمنین! عادل امام ایک ایسی ماں کی طرح ہوتا ہے جو اپنے بچوں سے ہمیشہ شفقت و محبت سے پیش آتی ہے، اس کی خاطر حمل کی صعوبتوں کو برداشت کرتی ہے اور ایسے ہی اسے جنم دینے کی تکلیف اٹھاتی ہے اور بچپن میں اس کا پورا خیال رکھتی ہے، جب بچہ جاگتا ہے تو وہ بھی جاگتی ہے اور جب بچہ سکون سے رہتا ہے تو وہ بھی سکون سے رہتی ہے، کبھی اسے دودھ پلاتی ہے تو کبھی اس کا دودھ چھڑاتی ہے، اس کی صحت و عافیت پر خوش ہوتی ہے اور جب اسے کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے تو وہ بھی غمزدہ اور پریشان ہو جاتی ہے)

اس طرح حسن بصری اپنے اس خط میں خوف خدا اور تقویٰ و پرہیزگاری کی تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس خط میں ان کا اسلوب، ان کی خطابت کے اسلوب سے کافی مشابہ نظر آتا ہے۔ ان کے خطبوں کی طرح ان کے اس خط میں بھی سجع و قافیہ کا پورا اہتمام نظر آتا ہے اور جناس و طباق جیسی بلاغت کی خوبیاں بکثرت استعمال ہوئی ہیں۔ ان کے اس خط کے اسلوب میں اور حجاج اور زیاد وغیرہ کے خطوط میں اسلوب کا بنیادی فرق یہ نظر آتا ہے کہ ان دونوں کے اسلوب میں الفاظ بے انتہا ثقیل، وزنی اور نادر قسم کے استعمال ہوئے ہیں جب کہ حسن بصری کے اسلوب میں سہل اور آسان قسم کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ حسن بصری کا مقصد اصلاح قوم تھا جب کہ حجاج اور زیاد کے خطوط کا اصل مقصد اپنا رعب اور اپنی ہیبت اپنے مخالفین کے دلوں میں پیدا کرنا تھا۔

11.3.3 ذاتی خطوط

اس دور میں خطوط نویسی کی مذکورہ بالا دونوں قسموں کے علاوہ ایک قسم اور تھی جس کے بہت سے نمونے ہم تک پہنچے ہیں اور وہ تھی ذاتی

خطوط کی قسم، چونکہ اب خلافت اسلامیہ کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا اور مسلمان دور دراز کے علاقوں تک پھیل گئے تھے، اس لیے سماجی و معاشی ضروریات کے تحت ذاتی خط و کتابت کا بھی اسی دور میں کافی چلن ہوا، بہت سے ایسے حالات و واقعات لوگوں کی زندگی میں پیش آتے تھے کہ وہ اپنے اہل و عیال یا احباب وغیرہ کو خطوط کے ذریعہ اپنا پیغام بھیجا کرتے تھے مثلاً کسی قریبی شخص کی موت پر تعزیت کرنا ہو یا کسی کی عہدہ نشینی پر مبارک باد پیش کرنا ہو، یا کسی رشتہ دار یا دوست کے لیے کوئی سفارش کرنا ہو، یا کسی سے کوئی گلہ شکوہ ہو اور اس کا اظہار کرنا ہو، اس طرح کے مواقع پر لوگ ایک دوسرے کو خط لکھا کرتے تھے اور اپنے احساسات و جذبات یا اپنی ضرورت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ چونکہ یہ خطوط شخصی نوعیت کے ہوتے تھے اس لیے ان کی حفاظت بھی شخصی سطح پر ہوتی تھی نہ کہ سرکاری سطح پر اس لیے اس نوعیت کے پیش تر خطوط ضائع ہو گئے اور بہت ہی قلیل تعداد میں باقی بچ سکے ہیں۔ اس نوعیت کے جو خطوط محفوظ رہے ان میں سے ایک خط وہ ہے جو عقیال بن شبہ نے خالد قسری کے نام بھیجا تھا جس میں کسی قریبی شخص کو کسی منصب پر فائز کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس کی کچھ سطریں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

”وقد وجهت إليك فلانا وهو من دنية قرايتي، وذوي الهيئة من أسرتي، عرف معروفك وأحببت أن تلبسه نعمتك“
 (ترجمہ: میں نے تمہارے پاس فلاں شخص کو بھیجا ہے، جو میرے بہت ہی خاص قریبی لوگوں میں سے ہے اور میرے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، وہ تمہاری نیک نامی سے خوب واقف ہے، میری خواہش ہے تم اسے کسی نعمت سے نواز دو)
 اس خط میں عبارتیں مسجع و مقفی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شخصی خطوط میں بھی اس بات کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔

11.3.4 دیوان الرسائل

اسلامی تاریخ میں مختلف قسم کے دواوین یعنی سرکاری شعبوں کی بنیاد خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے رکھی تھی۔ یہ نظام ایران کے قدیم بادشاہوں کے یہاں پہلے سے موجود تھا، مال فنی اور مال غنیمت اور زکوٰۃ و خیرات کا حساب کتاب رکھنے کی غرض سے حضرت عمرؓ نے دو دیوان قائم کیے تھے ایک دیوان الخراج کے نام سے اور دوسرا دیوان الجند کے نام سے۔ اس کے بعد امیر معاویہ نے اس میں توسیع کی اور دیوان الرسائل اور دیوان الخاتم کے نام سے دو نئے دیوان قائم کیے۔ دیوان الرسائل میں سرکاری خطوط تیار کیے جاتے تھے جب کہ دیوان الخاتم میں ان کو سیل کیا جاتا تھا۔ کچھ دواوین میں کاغذی کاروائی علاقائی زبانوں میں ہوا کرتی تھی جیسے دیوان الخراج کا کام شام اور مصر میں رومی اور قبطی زبان میں اور عراق وغیرہ میں فارسی میں ہوا کرتا تھا حتیٰ کہ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے سبھی سرکاری کام کاج کے لیے عربی زبان کو لازمی قرار دے دیا۔ ان علاقوں میں عجمیوں نے بھی عربی زبان میں مہارت حاصل کی اور ان دواوین میں عربوں کے شانہ بہ شانہ کام کرتے رہے۔ مذکورہ بالا سبھی دواوین میں معاملات کو عربی زبان میں تحریر کر کے کاغذی کاروائی ہوا کرتی تھی لیکن ادبی نقطہ نظر سے دیوان الرسائل کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ اسی دیوان یا شعبہ میں خلفا اور امرا کے پیغام اور فرمان تحریر کیے جاتے تھے اور ان میں کام کرنے کے لیے فصاحت و بلاغت کو ہی اصل معیار سمجھا جاتا تھا۔ اس سے منسلک انشا پرداز اچھے قلم کار اور ادبا ہوا کرتے تھے۔ دیوان الرسائل کی وجہ سے انشا پردازوں کی ایک خاص جماعت وجود میں آئی جو اس فن میں اپنے جوہر دکھاتی رہی، خلیفہ کے علاوہ مختلف علاقوں کے امرا اور حکام بھی اپنے یہاں ایسے انشا پردازوں کو متعین کیا کرتے تھے۔

امیر معاویہ کے عہد کے انشا پردازوں میں عمرو بن سعید بن عاص کا نام لیا جاتا ہے جو اپنی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے الأشدق کے

نام سے جانے جاتے ہیں۔ وہ ایک اچھے خطیب بھی تھے۔ اسی دور کے ایک اور انشا پرداز عبید اللہ بن اوس غسانی تھے جو امیر معاویہ اور یزید کے دور میں دیوان الرسائل کے سرپرست تھے۔ شروع میں دواوین کے خطوط اور تحریروں میں ایجاز و اختصار کا غلبہ ہوتا تھا، بعد میں اس میں شرح و بسط پیدا ہونے لگا، عبدالملک بن مروان کے عہد کے مشہور انشا پردازوں میں سلیمان بن سعد حسنی کا نام لیا جاتا ہے۔ شام و عراق کے دواوین کو رومی سے عربی زبان میں منتقل کرنے کا سہرا بھی انہیں کو جاتا ہے، عراق کے دواوین میں بھی اچھے انشا پرداز موجود تھے جن میں عبدالرحمن بن اشعث کے دیوان سے منسلک ابن القریہ کا نام مختلف مصادر میں موجود ہے۔ ابن اشعث نے ان سے ایک خط لکھوایا تھا اور اسے مسجع و مقفی عبارت میں لکھنے کی درخواست کی تھی۔ ابن القریہ نے ان کا یہ حکم بخوبی پورا کیا تھا۔

حجاج بن یوسف کے دواوین میں بھی کئی اچھے قلم کار موجود تھے۔ انہیں میں سے ایک صالح بن عبدالرحمن بھی تھے، جن کے ذمہ عراق کے دواوین کو فارسی سے عربی منتقل کرنا تھا۔ عراق کے زیادہ تر انشا پرداز صالح کے ہی شاگرد تھے۔

یہ قلم کار اور انشا پرداز اکثر بڑے حجم کے کاغذ کو اپنی تحریروں کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ ہشام بن عبدالملک کا دور (۱۰۵-۱۲۴ھ) آتے آتے دواوین کی انشا پردازی نے ایک خاص فنی انداز اختیار کر لیا تھا اور باقاعدہ ایک جماعت انشا پردازوں اور قلم کاروں کی تیار ہو چکی تھی۔ اسی دور کے اہم قلم کاروں میں سالم مولیٰ ہشام کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

سالم کے دو شاگرد اس فن کے حوالے سے خاص طور سے قابل ذکر اور بہت مشہور ہوئے ہیں۔ ایک ان کے صاحبزادے عبداللہ اور دوسرے ان کے ایک رشتہ دار عبدالحمید الکاتب۔ ان میں عبدالحمید الکاتب کو فن انشا پردازی میں خاص شہرت حاصل ہوئی۔ سالم خود ایک اچھے قلم کار تھے، وہ یونانی زبان میں بھی ماہر تھے اور بعض یونانی کتابوں کو انھوں نے عربی میں منتقل بھی کیا تھا۔ جہاں تک عبدالحمید الکاتب کی بات ہے تو وہ فارسی الاصل تھے جب کہ بعض مؤرخین کے مطابق ان کا تعلق عراق کے علاوہ انبار سے تھا۔ اموی خلیفہ مروان بن حکم کے عہد میں عبدالحمید کو دیوان الرسائل کا رئیس یا سرپرست بنا دیا گیا تھا جس کے نتیجے میں بہترین تحریری نمونے ان کے نوک قلم سے وجود میں آئے۔

عبدالحمید اس عہد کے سب سے بڑے انشا پرداز کے طور پر جانے جاتے ہیں، بلکہ انہیں فن انشا پردازی کا امام مانا جاتا ہے۔ جاحظ نے ان کی بہت تعریف کی ہے اور قلم کاروں کو نصیحت بھی کی ہے کہ وہ ان کے طرز نگارش کو اپنائیں۔ ان کے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ (خطوط نویسی کا فن عبدالحمید سے شروع ہوا اور ابن الحمید پر ختم ہوا) بعد کے ادوار میں بھی عبدالحمید الکاتب کو ایک مثالی انشا پرداز کے طور پر دیکھا گیا اور لوگوں نے ان کے اسلوب کو اختیار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی تحریروں کو تمجید و تجید سے شروع کرنے کا طریقہ بھی عبدالحمید نے ہی ایجاد کیا تھا۔ عبدالحمید کے خطوط اور دیگر تحریروں کو خاص ادبی مقام حاصل ہے، ان کے بہترین خطوط میں سے وہ عام خط بھی ہے جو انھوں نے اپنے زمانے کے قلم کاروں کے نام لکھا تھا جس میں انھوں نے فن انشا پردازی کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور جن آداب سے انہیں مزین ہونا چاہیے ان کو ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اس خط میں مختلف علوم و فنون سے آگہی اور واقفیت کو انشا پردازی کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بہت سے خطوط ہیں جو ادبی اہمیت کے حامل ہیں اور انہیں بہت شہرت نصیب ہوئی۔ ان کے کچھ خطوط سیاسی نوعیت کے بھی ہیں مثال کے طور پر ان کا وہ طویل خط جو انھوں نے مروان کی طرف سے اس کے بیٹے عبداللہ کے نام لکھا تھا۔ یہ ایک نہایت طویل خط تھا، اس خط کا اصل محور

بھی جنگ اور قیادت سے متعلق آداب و اخلاق ہیں۔ یہ خط ایک پورے سیاسی دستور کی مانند ہے جس میں عبد الحمید قدیم فارسی ادب کی تحریروں سے متاثر نظر آتے ہیں، البتہ اس میں اسلامی تعلیمات کا اثر بھی صاف نظر آتا ہے اور یہ سب عبد الحمید نے اپنے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ عبد الحمید کے مشہور خطوط میں سے ایک خط وہ ہے جس میں انھوں نے شکار کا قصہ نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

اس دور سے قبل جو سرکاری رسائل دیوان الرسائل سے صادر ہوتے تھے ان میں خلیفہ یا امیر یا والی انشا پردازوں کو اپنا خط یا پیغام املا کروادیتے تھے، لیکن اس دور میں ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ یہ کاتبین از خود خلیفہ کی طرف سے اس کا خط یا پیغام لکھ لیا کرتے تھے، پھر خلیفہ کے پاس لے جاتے اور اسے پڑھ کر سناتے اور جو بھی تبدیلی وغیرہ کرنا ہوتی وہ کی جاتی تھی۔

11.4 عصر اموی میں توصیات یا ادب الوصایا

ادب الوصایا کا شمار قدیم عربی نثر کے اہم ادبی فنون میں کیا جاتا ہے۔ اس فن کے ذریعہ اس دور کے عربی معاشرہ کی عقلی، فکری و ادبی معیار کی جھلکیاں ہم تک پہنچی ہیں، اسی طرح اس فن کے جو نمونے ہم تک پہنچے ہیں ان کے ذریعہ اس دور کے سیاسی، سماجی اور دینی حالات کو سمجھنے میں ہمیں مدد ملتی ہے۔

جاہلی دور میں بھی ادب الوصایا کا وجود تھا اور مختلف مواقع پر وصیتوں کے ذریعہ اپنی بات رکھنے کا پتہ ملتا ہے، تاہم اس دور کی وصیتوں کی بہت ہی قلیل تعداد ہم تک پہنچ سکی ہے اور اس دور کے دیگر نثری فنون کی مانند اس دور کی زیادہ تر وصیتیں بھی غیر مدون ہونے کی وجہ سے تاریخ کی دھند میں کہیں غائب ہو گئی ہیں۔ جاہلی دور کے ادبی فنون میں شاعری کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ وہ چونکہ اپنے اوزان کی وجہ سے سہل الحفظ ہوتی ہے، لہذا اس کی ایک بڑی مقدار شروع دور سے ہی محفوظ رہی اور رفتہ رفتہ صفحہ رقرطاس پر اپنی جگہ بنا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ و جاوید ہو گئی، جب کہ ادب الوصایا اور اس دور کے دوسرے نثری فنون اس امتیازی خوبی سے محروم رہے اور دھیرے دھیرے ناپید ہو گئے۔

عصر رسول اور خلافت راشدہ کے دور میں بھی وصیت کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دور کے چند ایک نمونے ہم تک پہنچے ہیں۔ اس دور میں اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کی وجہ سے وصیتوں کا اپنا ایک الگ رنگ تھا۔ اس کے بعد اموی دور آتا ہے جس میں ادب الوصایا کی اپنی خوبیاں اور خصوصیات تھیں، ادب الوصایا سے متعلق ان سب پہلوؤں کا ذکر اس موضوع کے تحت کیا جائے گا۔ سب سے پہلے جاہلی دور اور ابتدائی اسلامی دور جسے صدر الاسلام کہا جاتا ہے یعنی عصر رسول اور خلافت راشدہ کے دور میں ادب الوصایا کی نشوونما پر مختصر روشنی ڈالی جائے گی، اس کے بعد عصر اموی میں ادب الوصایا کا ارتقا کیسے ہوا اس پر تفصیل سے گفتگو ہوگی اور اس عہد کی وصیتوں کے کچھ نمونے آپ کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔

تاریخ ادب کا شاید ہی کوئی ایسا دور رہا ہو جس میں ادب الوصایا کی جھلکیاں ہمیں نہ ملتی ہوں، کہیں باپ اپنے بچوں کو وصیت کرتے ہوئے نظر آتا ہے، تو کہیں سردار اپنے ماتحتوں کو اور کہیں حاکم اپنے محکوم کو اور کہیں بڑے اپنے چھوٹوں کو وصیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہیں تو یہ وصیتیں سیاسی نوعیت کی ہوتی ہیں اور کہیں سماجی اور دینی نوعیت کی ہوتی ہیں اور ہر وصیت میں ہمیں سچے احساسات و جذبات نظر آتے ہیں۔ ان وصیتوں کی بنیاد صدق و اخلاص پر ہوتی ہے اور اس کا منبع و مصدر خیر خواہی اور ہمدردی ہوتا ہے۔ ادب الوصایا کی یہ ایک اہم خوبی ہے اور یہ خوبی

ہمیں ہر دور کی وصیتوں میں صاف نظر آتی ہے اور بطور خاص جاہلی دور کی وصیتوں میں ہمیں یہ خوبی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

11.4.1 عصر جاہلی میں ادب الوصایا

جاہلی دور میں عمومی طور پر پڑھنے لکھنے کا رواج بہت کم تھا، اگرچہ وہ اپنے عمدہ قصائد کو لکھ لیا کرتے تھے اور اس ضمن میں بعض نثری عبارتوں کی تدوین کے بھی ثبوت ملتے ہیں لیکن ان کے علمی و ادبی سرمائے کا دار و مدار ان کے قوت حافظہ پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کچھ ایسا حیرت انگیز قوت حافظہ عطا کیا تھا کہ انھوں نے لکھنے پڑھنے کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور چونکہ نثر کے مقابلہ میں اشعار کو حفظ کرنا نسبتاً سہل اور آسان ہوتا ہے اس لیے اس دور کے زیادہ تر قصائد اور شعری کلام انہیں از بر یاد تھے اور نسل در نسل وہ اسے اپنی قوت حافظہ کے ذریعہ محفوظ کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ مزید برآں نثر کے برخلاف شاعر کے پاس اپنا راوی بھی ہوا کرتا تھا جو اس شاعر کے اشعار کو یاد کرنے اور انہیں روایت کرنے پر مامور ہوتا تھا۔ انہیں اسباب کی بنا پر جب تدوین و تالیف کا دور آیا یعنی دوسری صدی ہجری کا دور تو فوراً اشعار کی تدوین عمل میں آگئی اور اس دور کا زیادہ تر شعری سرمایہ قلم و قراطس کے سپرد کر دیا گیا جب کہ نثر کا زیادہ تر حصہ اس وقت تک آفت نسیان کی نذر ہو چکا تھا۔

جاہلی دور کے نثری و شعری فنون کا جو مستند سرمایہ ہم تک پہنچا ہے وہ ظہور اسلام سے تقریباً دو سو سال قبل تک کا ہے، حالانکہ اس سے پہلے کے بھی بہت سے کتبات اور نقوش وغیرہ مختلف مقامات پر برآمد ہوئے ہیں لیکن ان سے اس دور کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق کوئی خاص معلومات فراہم نہیں ہو پاتی۔ ادب الوصایا کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ مختلف کتابوں میں ظہور اسلام سے ہزاروں سال قبل کے عرب بادشاہوں وغیرہ کی وصیتیں نقل کی گئی ہیں، مثال کے طور پر یحییٰ بن الوشاکی کتاب ”وصایا ملوک العرب فی الجاہلیۃ“ میں ان قدیم عرب بادشاہوں اور شخصیتوں کی وصیتیں بھی نقل کی گئی ہیں جن کی طرف نسبت کا کوئی پختہ ثبوت دستیاب نہیں ہے۔ اس کتاب میں جہاں حضرت ہود علیہ السلام کی وصیت بیان کی گئی ہے تو وہیں عربوں کے قدیم اجداد میں قحطان، یعرب، عبد شمس، سہل، حمیر، کہلان، ایمن، زہیر، القوت وغیرہ کی وصیتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے حالانکہ ان کی نسبت کے بارے میں کوئی پختہ ثبوت موجود نہیں ہے۔ ان میں سے زیادہ تر وصیتیں من گھڑت ہیں۔ انہیں میں سے ایک وصیت سیف بن ذی یزن کی ہے جس میں اس نے رسول اکرم کے جد امجد عبدالمطلب کو اللہ کے رسول کے بارے میں بشارت دی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ آپ ﷺ کے ماں اور باپ کا انتقال ہو جائے گا اور آپ ﷺ کی کفالت آپ ﷺ کے دادا اور چچا کریں گے۔

ایک اور کتاب اس ضمن میں قابل ذکر ہے جو الوصایا النخالۃ کے نام سے موسوم ہے جسے عبدالبرلیج صقر نے تصنیف کیا ہے۔ اس میں بھی جاہلی و اسلامی دور کی وصیتوں کو جمع کیا گیا ہے۔

ابو حاتم سجستانی نے بھی اپنی کتاب ”کتاب المعمرین و کتاب الوصایا“ میں اس عہد کی وصیتوں کو ذکر کیا ہے، یہ کتاب ”المعمرون والوصایا“ کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

عصر جاہلی کی طرف منسوب ادبی اہمیت کی وصیتوں میں سے ایک وصیت وہ ہے جسے شہاب الدین محمد بن احمد البشیری نے اپنی کتاب المستطرف میں ذکر کیا ہے جس میں امامہ بنت حارث نے اپنی بیٹی کو سہاگ رات سے پہلے کی جانے والی وصیت کو نقل کیا ہے۔ اس وصیت کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کی وصیتوں کا اسلوب مبالغہ و مقفی ہوا کرتا تھا اور طباق و جناس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس وصیت میں امامہ نے اپنی بیٹی کو اپنے شوہر کے تئیں جو رو یہ اختیار کرنا چاہیے اس کی تلقین کی ہے اور گیارہ باتیں اس کو بتائی ہیں۔ یہ وصیت ایک نہایت جامع

وصیت ہے جس سے فکری اور عقلی پختگی کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور خوش اسلوبی و خوش کلامی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یقیناً یہ اس دور کی ایک بہترین وصیت شمار کیے جانے کی مستحق ہے۔

اس دور کی طرف منسوب مشہور وصیتوں میں ایک وصیت حیرة کے حاکم نعمان بن منذر کی وصیت ہے جو انھوں نے عرب رہنماؤں کی ایک جماعت کو کسریٰ کے دربار کی طرف روانہ کرنے سے قبل کی تھی۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہے اور ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ اشم بن صیفی، حاجب بن زرارہ اور عمرو بن معدیکرب جیسے قادر الکلام اور شعلہ بیان عرب خطبا اس جماعت کے حصہ تھے۔ نعمان نے رواگئی سے قبل ان کو وصیت کی تھی جو العقد الفرید جیسے تاریخ اور ادب کے اہم مراجع میں محفوظ ہے۔

نعمان کی یہ وصیت دراصل سیاسی نوعیت کی تھی۔ اپنی اس وصیت میں نعمان نے اپنے نمائندوں کو یہ بتایا تھا کہ انھیں کسریٰ کے سامنے کس طرح حاضر ہونا ہے اور کس طرح اپنی بات پیش کرنا ہے۔ نعمان کی یہ وصیت بھی اس سے قبل مذکور امامہ کی وصیت کی طرح مختصر اور فصیح و بلیغ ہے، البتہ اس میں وہ سجع و قوافی نظر نہیں آتے جو امامہ کی وصیت میں ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں، شاید اس لیے کہ نعمان کی وصیت سیاسی نوعیت کی وصیت تھی جب کہ امامہ کی وصیت ایک شخصی وصیت تھی جس کو امامہ نے اپنے علمی و ادبی ذوق کے ذریعہ نہایت ادبی و فنی پیرائے میں ڈھال کر پیش کیا تھا۔ بہر حال اس عہد کے ادب الوصایا کی جو مثالیں بھی ہم تک پہنچتی ہیں وہ نہایت عمدہ اور اعلیٰ ادبی معیار کی ہیں، جن کے مطالعہ سے اس دور کے سماجی، سیاسی اور ادبی رجحانات و میلانات اور معیار کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

11.4.2 عصر رسول اور خلافت راشدہ میں ادب الوصایا

تاریخ و ادب کی کتابوں میں عصر رسول اور خلافت راشدہ کو صدر الاسلام کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس دور میں عربی ادب میں سب سے بنیادی تبدیلی جو واقع ہوئی وہ قرآن کریم کے نزول اور احادیث رسول کے اضافہ کی شکل میں تھی۔ قرآن کریم کلام اللہ ہے اور احادیث رسول جو امع الکلم۔ ان دونوں کے عربی زبان و ادب پر بہت ہی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ دیگر نثری فنون کی طرح ادب الوصایا بھی ان دونوں سے کافی متاثر ہوا چنانچہ ان دونوں مراجع میں موجود ادب الوصایا کے وجود پر مختصراً گفتگو کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں شروع سے آخر تک جگہ جگہ وصیتوں کی شکل میں پسند و نصائح پیش کیے گئے ہیں، بار بار ”أمر بالمعروف اور نہی عن المنکر“ کی تلقین کی گئی ہے، اعمال حسنہ کو اپنانے کی بات کہی گئی ہے اور اعمال سیئہ سے روکا گیا ہے، والدین کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق وغیرہ کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے گویا قرآن کریم میں اس طرح کی وصیتیں جا بجا وارد ہوئی ہیں۔ کچھ قرآنی وصیتیں تو ایسی ہیں جنہیں خود رب کائنات نے بلا واسطہ انسان کے سامنے پیش کیا ہے یعنی رب کائنات خود اپنی زبانی انسان کو وصیت کرتا ہوا نظر آتا ہے جیسے سورۃ النساء کی یہ آیت کریمہ ”وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئاً وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَالاً فَخُوراً“۔

(ترجمہ: اور تم سب اللہ کی بندگی کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں احسان کا معاملہ رکھو۔ یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے)

اس آیت میں ایک بہترین سماج اور معاشرہ کی تعمیر کے لیے جس طرح حقوق کی پاسداری ضروری ہے اس کو اس وصیت کی شکل میں رب کائنات نے بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

قرآن کریم میں وارد وصیتوں کی دوسری شکل وہ ہے جن میں کوئی نبی یا کوئی متقی انسان اپنے کسی ماتحت کو وصیت کرتا ہے اور اس کی بہترین مثال وہ وصیت ہے جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کی تھی اور جس کو سورۃ لقمان کی ان آیتوں میں ذکر کیا گیا ہے ”وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ۔ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنْ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَى الْمَصِيرِ۔ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبَهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (سورۃ لقمان ۱۳-۱۵)

(ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، بیشک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے اور ہم نے انسان کو جسے اس کی ماں تکلیف پر تکلیف سہہ کر پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے، پھر اس کو دودھ پلاتی ہے) اور آخر کار دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے، تو ہم نے اس کو اس کے والدین کے بارے میں یہ تاکید کی کہ میرا بھی شکر کرتے رہنا اور اپنے والدین کا بھی کہ تم کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کرے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں تو ان کا کہنا نہ ماننا، ہاں دنیا کے کاموں میں ان کا اچھی طرح ساتھ دینا اور جو شخص میری طرف رجوع کرے اس کے راستے پر چلنا، پھر تم کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، تو جو کام بھی تم کرتے رہے میں سب سے تم کو آگاہ کروں گا)

جہاں تک احادیث رسول کا تعلق ہے تو ان میں بھی اس طرح کی وصیتیں اور نصیحتیں رسول اکرم اور صحابہ کرام کی زبانی کثرت سے وارد ہوئی ہیں۔ مختلف احادیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے ایک ہادی و رہنما اور ایک سردار کی حیثیت سے اپنے ماتحتوں یعنی صحابہ کرام کو مختلف مواقع پر وصیتیں کیں جن کے ذریعہ آپ ﷺ نے انھیں جینے کا طریقہ بھی سکھایا اور بلند اخلاق سے آشنا بھی کرایا۔ مثال کے طور پر بخاری شریک کی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو یہ وصیت کی: ”ایاکم والظن فان الظن أكذب الحدیث، ولا تحسسوا ولا تجسسوا ولا تناجسوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وكونوا عباد الله اخوانا“

(ترجمہ: بدگمانی سے بچو، کیوں کہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹ پر مبنی بات ہوتی ہے، ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہو، ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کرو، مال کی قیمت بڑھا کر ایک دوسرے کو دھوکہ مت دو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے بغض نہ کرو، ایک دوسرے کے خلاف چالیں نہ چلو، آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو)

اس وصیت میں آپ ﷺ نے ایک نیک اور صالح معاشرہ کی بنیادی شرائط بیان کی ہیں کہ جن کے بغیر ایک مثالی معاشرے کی تعمیر ناممکن ہے۔ ایسے ہی ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس کو اس طرح سے وصیت کی ”یا غلام انی اعلمک کلمات، احفظ الله يحفظک، احفظ الله تجده تجاهک، إذا سألت فاسأل الله، وإذا استعنت فاستعن بالله، واعلم أن الأمة لو اجتمعت علی أن ینفوک لم ینفوک إلا بشیء قد کتبه الله لک، ولو اجتمعوا علی أن یضروک بشیء، لم یضروک إلا بشیء قد کتبه الله علیک، رفعت الأقالیم وجمعت الصحف“ (صحیح الترمذی)

(ترجمہ: اے لڑکے میں تمہیں کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں، اللہ کے حقوق و احکام کی حفاظت کرو، وہ تمہاری حفاظت کرے گا اور تم اسے اپنی مدد کے لیے حاضر پاؤ گے، جب بھی کچھ مانگنا ہو تو صرف اللہ سے مانگنا، جب بھی مدد طلب کرنا ہو تو صرف اللہ سے کرنا اور جان لو کہ اگر پوری امت تمہیں فائدہ پہنچانے پر متفق ہو جائے تو تمہیں صرف اتنا ہی فائدہ پہنچا سکتی ہے جتنا اللہ نے تمہارے نصیب میں لکھ دیا ہے، ایسے ہی اگر پوری امت تمہیں نقصان پہنچانے پر متفق ہو جائے تو صرف اتنا ہی نقصان پہنچا سکتی ہے جتنا اللہ نے تمہاری تقدیر میں لکھ دیا ہے، قلم اٹھالیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں (یعنی ہر شخص کی تقدیر لکھی جا چکی ہے)۔

اسی طرح خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام سے بھی وصیتیں نقل کی گئی ہیں، کہیں تو ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کو اپنی موت سے پہلے وصیت کرتا ہوا نظر آتا ہے اور اسے خوف خدا اور اعمال صالحہ پر عمل کرنے کی تاکید کرتا ہے جیسے کہ حضرت ابو بکرؓ کی وصیت جو انھوں نے اپنی وفات سے قبل حضرت عمرؓ کو خلیفہ متعین کرنے کے بعد کی تھی۔ اس میں انھوں نے انھیں دنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی کے کچھ بنیادی اصول بتائے اور کہا کہ اس کی بنیاد تقویٰ ہے، تو کہیں کوئی خلیفہ اپنے سپہ سالاروں اور کمانڈروں کو میدان جنگ کی طرف روانہ کرنے سے پہلے وصیت کرتا ہوا نظر آتا ہے جیسے حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر اپنے ایک لشکر کو صبر و تحمل اور حسن اخلاق کی تلقین کی تھی۔ حضرت عثمانؓ کے حوالے سے بھی بہت سی روایات تاریخ طبری وغیرہ میں وارد ہوئی ہیں جن میں وہ اپنے والیوں، گورنروں اور سپہ سالاروں کو وصیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، جب کہ حضرت علیؓ کی طرف کثیر تعداد میں وصیتیں منسوب ہیں جن میں وہ لوگوں کو تقویٰ و پرہیزگاری اور اللہ و رسول کی فرمانبرداری پر ابھارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس عہد کی طرف منسوب بعض وصیتوں کے آغاز میں ہمیں بسم اللہ ملتی ہے جب کہ بعض میں نہیں۔ ظن غالب یہی ہے کہ ہر وصیت بسم اللہ ہی سے شروع کی جاتی ہوگی، ممکن ہے کہ راویوں نے روایت کرتے وقت ہر جگہ اس کو ذکر نہ کیا ہو۔ جہاں تک اس دور کی وصیتوں کے اسلوب و بیان کی بات ہے تو وہ زیادہ تر سبوح و توانی کی قید و بند سے آزاد ہوا کرتا تھا، البتہ خلفائے راشدین اور صحابہ کی کچھ وصیتوں میں ہمیں بسا اوقات سبوح و قافیہ اور طباق و جناس جیسی اسلوبی خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔

اس دور کی وصیتوں کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر وصیتیں بالمشافہہ کی جاتی تھیں اور انھیں رواۃ نے محفوظ کر کے بعد میں تحریر کیا جب کہ بعض وصیتیں ایسی بھی تھیں جو خط و کتابت کے ذریعہ کی جاتی تھیں جیسے حضرت علیؓ کی وصیت عبداللہ بن عباسؓ کے لیے جو ایک خط کے ذریعہ بھیجی گئی تھی۔

11.4.3 عصر اموی میں ادب الوصایا

عصر اموی آتے ہی ادب الوصایا میں خاطر خواہ ترقی واقع ہوئی اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ دراصل یہ دور سیاسی اٹھل پٹھل اور افراتفری کا دور تھا اور بنو امیہ کا سیاسی نظام ایک موروثی نظام تھا جس کی وجہ سے ان کے حریفوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی اس لیے اس دور میں ہمیں مختلف انواع و اقسام کی وصیتوں کا ذکر ملتا ہے، چنانچہ خلفا اپنے وارثین کو وصیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو قائدین اور والی اپنے ماتحتوں کو اطاعت و فرمان برداری کی وصیت کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو علما اور اہل تقویٰ حضرات، حکام اور خلفا کو عدل و انصاف وغیرہ کی وصیت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ باپ اپنی اولاد کو یا ولی اللہ اپنے ماتحتوں کو وصیت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، غرض یہ کہ

اس دور میں وصیت اپنی مختلف اشکال میں کثرت سے نظر آتی ہے۔

اگر ہم سیاسی نوعیت کی وصیتوں کی بات کریں تو اس دور کی اولین وصیتوں میں سے وہ وصیت ہے جو بنو امیہ کے پہلے خلیفہ اور بانی خلافت حضرت معاویہ بن ابوسفیان نے اپنے بیٹے زیاد کو اس وقت کی جب انھوں نے اسے عراق کا حاکم بنا کر بھیجا، چنانچہ انھوں نے فرمایا: ”یا زیاد، لیکن حبک وبغضک قصدا، فإن العثرة فیہما کامنة، واجعل للنزوع والرجوع بقیة من قلبک، واحذر صولة الانهماک فإنہا تؤدی الی الہلاک“

(یعنی اے زیاد تمہاری محبت اور تمہاری نفرت قصداً و ارادۃً ہونا چاہیے، کیوں کہ ان دونوں میں ہی انسان کے لڑکھڑانے اور ٹھوکر کھانے کا خطرہ چھپا ہوتا ہے، جب کسی سے قطع تعلق کرنا ہو یا کسی کی طرف مائل ہونا ہو تو اپنے دل میں تھوڑی سی گنجائش رکھنا اور کسی بھی امر میں حد سے زیادہ انہماک سے بچنا، کیوں کہ یہ ہلاکت کا سبب بن سکتا ہے۔)

ایسے ہی یزید بن معاویہ نے اپنے فوجی کمانڈر عبداللہ بن زیاد کو وصیت کی تھی۔ خلفا اکثر اپنے وارثین کو وصیت کیا کرتے تھے جو زیادہ تر سیاسی نوعیت کی ہوا کرتی تھی۔ وہ انھیں سمجھانے کی کوشش کرتے تھے کہ اپنی رعایا کے ساتھ کیسے پیش آنا ہے اور ان کا دل کیسے جیتنا ہے۔ اس عہد کی اہم ترین سیاسی وصیتوں میں سے وہ وصیت ہے جو اموی خلیفہ مروان بن حکم نے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اس وقت کی تھی جب اسے مصر کا حاکم متعین کیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک بہترین وصیت تھی۔ مروان نے اپنی اس وصیت میں کہا تھا کہ ”أرسل حکیمًا ولا تُؤصِّہ، أمی بنی، أنظر الی عمالک فإن کان لہم عندک حق غدوة فلاتؤخرہ الی عشیة، وإن کان لہم عشیة فلاتؤخرہ الی غدوة، وإیاک أن یظہر لرعیتک منک کذب، فانہم إن ظہر لہم منک کذب لم یصدقوا فی الحق، واستشر جلساءک و اہل العلم، وإن کان بک غضب علی أحد من رعیتک فلاتؤاخذہ بہ عند سورة الغضب، واحبس عنہ عقوبتک حتی یسکن غضبک، ثم انظر الی اہل الحسب والذین والمروءة فلیکونوا أصحابک و جلساءک“

(ترجمہ: اے میرے بیٹے! اپنے عمال کا خیال رکھنا، اگر تمہارے اوپر ان کا کوئی حق صبح کے وقت ہو تو اسے شام تک مت ٹالنا اور اگر ان کا کوئی حق تمہارے پاس شام کے وقت ہو تو اسے صبح تک مت ٹالنا اور تمہاری طرف سے کوئی کذب بیانی تمہاری رعایا کے سامنے نہ آنے پائے، کیوں کہ اگر ایسا ہوا تو وہ حق بات پر بھی تمہاری تصدیق نہیں کریں گے اور ساتھیوں سے اور اہل علم سے مشورہ ضرور کر لیا کرنا اور اگر کبھی کسی شخص پر غصہ آجائے تو غصہ کی حالت میں اس کا مؤاخذہ نہ کرنا اور جب تک غصہ ٹھنڈا نہ ہو جائے تب تک اس کو کوئی سزا بھی مت دینا، پھر یہ کوشش کرنا کہ صاحب حسب، دیندار اور بامروت لوگوں کو ہی اپنا ساتھی اور ہم مشرب بنانا)

اس طرح خلیفہ اس وصیت میں اپنے بیٹے کو ان اہم باتوں سے آگاہ کرتا ہے اور قیمتی نصیحتوں سے نوازتا ہے تاکہ وہ ایک کامیاب خلیفہ بن سکے اور لوگ اس سے محبت کرتے رہیں۔

اسلوب کے اعتبار سے یہ وصیت نہایت سہل اور سادہ انداز میں کہی گئی ہے، نہ تو اس میں کوئی سجع و قافیہ ہے اور نہ ہی کوئی پیچیدگی ہے، یہ وصیت فصاحت و بلاغت کے بلند معیار پر بالکل کھری ثابت ہوتی ہے اور ساتھ ہی بے انتہا ذومعنی اور قابل عمل بھی ہے۔ اس طرح کی وصیتوں کو دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ اموی خلفا اپنے وارثین کے لیے خلافت کو محفوظ اور مضبوط کرنے کے لیے کس قدر کوشاں اور فکر مند رہا کرتے

تھے۔ مذکورہ بالا وصیتیں ان کی اس فکر مندی کو صاف ظاہر کرتی ہیں۔

پہلی صدی ہجری کے آخر میں جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت قائم ہوئی تب ادب الموصایا کا بطور خاص بہت ارتقا ہوا، حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے ورع و تقویٰ کے لیے جانے جاتے ہیں وہ ایک متقی اور پرہیزگار خلیفہ تھے اور اپنی طرح اپنی رعایا کو بھی ایسے ہی صراط مستقیم پر اور جادہ حق پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے، اسی لیے وہ خود بھی اپنے والیوں وغیرہ کو وصیتیں کرتے رہتے تھے، ساتھ ہی ساتھ دوسروں کی وصیتوں اور خاص طور سے واعظین کی وصیتوں کے لیے انھوں نے اپنے دروازے وا کر رکھے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز جو خطوط اپنے والیوں اور سپہ سالاروں کی طرف روانہ کیا کرتے تھے، ان میں بکثرت وصیتیں شامل ہوا کرتی تھیں جن میں وہ انھیں کتاب اللہ اور سنت رسول کو مضبوطی سے تھامنے کی تلقین کرتے تھے اور یہ سمجھاتے تھے کہ معاملہ عدل و انصاف پر مبنی ہو اور ظلم کا قطعاً کوئی سہارا نہ لے، خواہ معاملات مسلم رعایا کے ساتھ ہوں یا غیر مسلم رعایا کے ساتھ۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سوانح پر جو اہم کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ان کی وصیتیں اور وصیت کے خطوط شامل اور موجود ہیں، مثال کے طور پر ابو محمد عبداللہ بن حکم نے اپنی تصنیف ”سیرۃ عمر بن عبدالعزیز“ میں سات صفحات پر مشتمل حضرت عمر بن عبدالعزیز کا وہ خط بھی ذکر کیا ہے جو انھوں نے مختلف علاقوں کے حاکموں اور والیوں کے نام روانہ کیا تھا جس میں بہت سی قیمتی وصیتیں موجود تھیں۔ ان وصایا میں انھوں نے انھیں خوف خدا اور امر بالمعروف والنہی عن المنکر کی خاص تلقین کی تھی۔ اس خط میں ان کی یہ وصیت بھی موجود ہے، ”اجتنبوا الاشغال عند حضور الصلوات، فمن أضعافها فهو لما سواها من شرائع الإسلام أشد تضييعاً“ (ترجمہ: نماز کے وقت اپنی تمام دوسری مصروفیات کو چھوڑ دو، کیوں کہ جس نے نماز کو ضائع کیا وہ شریعت کے دوسرے احکام کو ضائع کرنے میں اور بھی آگے نظر آئے گا)

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ جس طرح خلفا اپنے وارثین اور والیوں کو وصیت کیا کرتے تھے اسی طرح ان کے والی، عوام الناس اور علما ان خلفا کو وصیت کیا کرتے تھے، یہ چیز ہمیں خاص طور سے عمر بن عبدالعزیز کے دور میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے، اس کا ایک سبب خود حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ذاتی مزاج اور رجحان تھا جس کے تحت وہ دوسروں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ خود اپنی اصلاح کو بھی پسند فرماتے تھے، بعض اموی خلفا اس امر کو ناپسند کیا کرتے تھے کہ کوئی ان کے معاملات میں دخل دے اور انھیں وصیت یا نصیحت کرے، لیکن عمر بن عبدالعزیز کا معاملہ اس کے برعکس تھا، وہ اس طرح کی وصیتوں کو پسند کرتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے زمانے کے مشہور متقی عالم اور واعظ حسن بصری سے یہ درخواست کی کہ وہ انھیں اچھی باتوں کی وصیت کریں چنانچہ حسن بصری نے ایک طویل خط کے ذریعہ انہیں اپنی وصیت لکھ کر بھیجی۔ اس وصیت میں بہت سی مفید اور قابل عمل نصیحتیں شامل ہیں۔ چنانچہ حسن بصری اس میں فرماتے ہیں ”ولا یغزَنک الذین یتنعمون بما فیہ بؤسک ویاکلون الطیبات فی دنیاہم یا ذہاب طیباتک فی آخرتک، ولا تنظر الی قدرتک الیوم ولکن انظر الی قدرتک غدا وأنت مأسور فی حبال الموت وموقوف بین یدی اللہ فی مجمع من الملائکة والنبيين والمرسلین وقد عننت الوجہ للحمی القیوم“

(ترجمہ: آپ ان لوگوں سے ہرگز دھوکا مت کھانا جو آپ کی آزمائش اور پریشانی پر خوش ہوتے ہیں اور آپ کو آخرت کی نیکیوں سے محروم کر کے خود دنیا کی نعمتوں کے مزے اڑاتے ہیں، آج جو طاقت و قوت آپ کے پاس ہے اس کو مت دیکھیے، بلکہ اس طاقت کے بارے میں غور کیجیے جو کل آپ کے پاس اس وقت ہوگی جب موت کے شکنجے میں کسے ہوئے ہوں گے اور جب آپ اللہ کے سامنے کھڑے ہوئے ہوں

گے، جب آپ کے اردگرد فرشتے اور انبیاء کھڑے ہوں گے اور ہر ہستی بارگاہ الہی میں سجدہ ریز ہوگی، اس وقت آپ کی طاقت کیا ہوگی اس کے بارے میں سوچئے!

اسی نوعیت کی وصایا میں وہ وصیت بھی شامل ہے جو ایک شخص نے خلیفہ ہشام بن عبدالملک کو کی تھی۔ اس وصیت میں اس نے خلیفہ کو اپنی رعایا کے ساتھ صدق و صفا سے پیش آنے کی نصیحت کی اور یہ بتایا کہ بلندی پر چڑھنا اگر آسان لگے تو یہ دیکھ لینا کہ اس سے اترنے کا راستہ بہت مشکل تو نہیں ساتھ ہی ساتھ اس کے ذریعے یہ بھی سمجھایا کہ بسا اوقات اچانک مصائب نازل ہو جاتے ہیں اس لیے ہمیشہ چوکنا اور محتاط ہو کر ہر کام کریں۔

ان وصایا کے علاوہ اس دور میں بہت سی ایسی وصیتیں بھی ملتی ہیں جن میں باپ اپنی اولاد کو وصیت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں اموی دور کی ایک سرکردہ شخصیت عمر بن ہبیرہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے جن کی دو وصیتیں تاریخ و ادب کے مراجع میں وارد ہوئی ہیں۔ ایک تو وہ وصیت ہے جو انھوں نے ایک قائد کو کی تھی اور دوسری وہ جو انھوں نے اپنے بیٹے کو کی تھی۔

ابن ہبیرہ کی یہ خواہش تھی کہ جو شہرت اور مقام و مرتبہ خلافت بنی امیہ میں انھیں حاصل تھا وہی ان کے بیٹے کو بھی حاصل ہو جائے۔ وہ اس بات کو لے کر بہت فکر مند اور سنجیدہ تھے اور انھوں نے اپنے بیٹے کو وصیت کی تاکہ وہ اس پر عمل کر کے بلند مقام حاصل کر سکے، چنانچہ انھوں نے اپنے بیٹے کو یہ وصیت کی کہ ”لا تکن اول مشیر، وایاک والرأی الفطیر، ولا تسترن علی مستبد ولا علی و غد ولا علی متلون ولا علی لجوج، و خف اللہ فی موافقة ہوی المستشیر، فإن التماس موافقته لؤم، و سوء الاستماع منه خیانة“

(ترجمہ: سب سے پہلے مشورہ دینے والوں میں نہ ہونا اور جلد بازی میں لیے ہوئے فیصلے سے بچنا، کسی بھی ظالم، غنڈے موالی، متلون مزاج اور جھگڑا لوتقم کے انسان کو مشورہ مت دینا اور طالب مشورہ کی خواہش اور رائے کی موافقت میں اللہ سے ضرور ڈرنا، کیوں کہ ایسے طالب مشورہ کی تائید کرنے میں ملامت ہے اور اس کی غلط بات سنا خیانت ہے)

اموی دور کے آخری ایام میں عربی نثر کے اسلوب میں نمایاں تبدیلی واقع ہونے لگی تھی، نثری تحریروں میں سجع و قافیہ کا چلن شروع ہو گیا تھا، چنانچہ یہ تبدیلی ہمیں اس دور کے ادب الوصایا میں بھی صاف نظر آتی ہے چنانچہ عصر اموی کے آخری دور کے ایک ادیب علقمہ بن لبید عطاردی کی اپنے بیٹے کو کی گئی وصیت پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہاں سجع و مقفی عبارات بھی صاف نظر آتی ہیں جو اس عہد کے شروعاتی دور میں ہمیں خال خال ہی دکھائی دیتی ہیں۔ سجع و قافیہ کے علاوہ طباق اور جناس جیسی بلاغت کی بعض خوبیاں بھی صاف دکھائی دیتی ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مروجہ نثری رجحانات کا اثر ادب الوصایا پر بھی خوب پڑا، جس کے نتیجے میں اسلوب کی یہ بنیادی تبدیلی واقع ہوئی۔

عصر اموی کے آخری زمانے میں دوسرے نثری فنون کے ساتھ ساتھ فن رسائل کے ارتقا کو بطور خاص ذکر کیا جاتا ہے۔ اس فن کے ارتقا میں اس دور کے اہم قلم کار عبدالحمید الکاتب کا نام سب سے نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ عبدالحمید الکاتب کے لکھے ہوئے خطوط میں بھی ہمیں جا بجا وصیتیں نظر آتی ہیں، مثال کے طور پر انھوں نے ۱۲۹ھ میں جو خط اموی خلیفہ مروان بن محمد کی طرف سے عبداللہ بن مروان کو لکھا تھا اور جو تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل تھا اس میں بہت سی سیاسی، سماجی اور دینی نوعیت کی وصیتیں موجود ہیں جو بے پایاں ادبی اہمیت کی حامل ہیں، ان میں سجع و قافیہ کا بھی غلبہ نظر آتا ہے۔

اموی دور کے ابتدائی دور اور آخری دور کی وصیتوں کے درمیان ایک اہم فرق اسلوب کا فرق ہے۔ ابتدائی دور کی وصیتوں کا اسلوب سہل اور آسان ہے اور اس میں سجع و قافیہ کا غلبہ اس قدر نہیں ہے جتنا ہمیں اموی دور کے آخری زمانہ میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس دور کی وصیتوں میں اسلامی تعلیمات کا بھی خاصہ اثر دیکھنے کو ملتا ہے، البتہ قرآن و حدیث کے نصوص کا استعمال شاذ و نادر ہی ہوا کرتا تھا۔ عبدالحمید الکاتب کے دور میں چونکہ فن رسائل کو فروغ حاصل ہوا اور یہ رسائل اکثر طویل ہوا کرتے تھے اس لیے ان کے ضمن میں وارد ہونے والی وصیتوں میں طوالت اور تفصیلی انداز صاف نظر آتا ہے۔

11.5 اکتسابی نتائج

اس دور کے خطوط کا جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چاہے وہ خطوط سیاسی نوعیت کے ہوں، یا دینی نوعیت کے ہوں یا ذاتی نوعیت کے ہوں ان سب میں ہمیں ادبی اسلوب اور فنی حسن و جمال نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے جو بھی خط لکھتا تھا وہ اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ وہ بہترین سے بہترین الفاظ میں اور نہایت جامع انداز میں اپنی بات اپنے مخاطب تک پہنچائے تاکہ اس کی بات اتنی ہی مؤثر ثابت ہو۔ خطوط نویسی کی مذکورہ ہر صنف کا اپنا ایک منفرد اسلوب تھا جس کو حسب ضرورت اختیار کیا جاتا تھا، مثلاً جو خطوط فوجی سربراہوں یا والیوں کو بھیجے جاتے تھے ان کا انداز اور لب و لہجہ مجاہدانہ اور سخت ہوتا تھا جب کہ جو خطوط پند و نصائح پر مبنی ہوتے تھے ان کا انداز اور لب و لہجہ واعظانہ اور ناصحانہ ہوتا تھا۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ ذاتی خط و کتابت میں بھی لغوی حسن و جمال کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ تاہم ذاتی خطوط کی اکثریت ہم تک نہ پہنچ سکی۔ اسی طرح وصیتوں میں بھی موقع اور مناسبت کے اعتبار سے الگ الگ اسلوب اور انداز بیان ملتا ہے۔ وصیتوں کا سلسلہ جاہلی دور سے شروع ہوا، پھر قرآن و حدیث میں بھی اس کو خاص جگہ ملی بعد ازیں عصر اموی میں اس کو خاص مقام و مرتبہ حاصل ہوا اور سیاسی، واعظانہ اور ذاتی وصیتوں کی کئی مثالیں بھی ہمارے سامنے آئیں۔

11.6 نمونے کے امتحانی سوالات

- (۱) خطوط نویسی کی اہمیت و افادیت تحریر کیجیے۔
- (۲) خطوط نویسی کے عروج و ارتقا پر روشنی ڈالیے۔
- (۳) ادب الوصایا کی خصوصیات بیان کیجیے۔
- (۴) اموی دور میں سیاسی خطوط پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
- (۵) واعظانہ خطوط اور دیوان الرسائل کے درمیان فرق واضح کیجیے۔
- (۶) عصر اموی ادب الوصایا پر فن نثر کی تاثیر کو بیان کیجیے۔

11.7 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

- ۱- تاریخ الأدب العربي العصر الإسلامي شوقی ضیف
- ۲- أدب الوصایا أحمد أمين مصطفی

- ٣- تاريخ الأدب العربي عمر فروخ
- ٤- تاريخ الأدب العربي أحمد حسن الزيات
- ٥- أدب العرب زييد أحمد
- ٦- تاريخ عربي ادب ڈاکٹر عبد الحلیم ندوی
- (<https://archive.org/details/TareekhEArabiAdab/page/n3>)

اکائی 12 عصر اموی کی شاعری اور اس عہد کے مشہور شعرا

اکائی کے اجزا	
12.1 مقصد	
12.2 تمہید	
12.3 عصر اموی کی عربی شاعری	
12.4 عصر اموی کے شعری مراکز	
12.4.1 عراق	
12.4.2 شام	
12.4.3 حجاز	
12.5 شعر اموی کے اغراض	
12.5.1 مدح سرائی	
12.5.2 ہجو گوئی	
14.5.3 فخر	
12.5.4 سیاسی شاعری	
12.5.5 غزل	
12.5.6 غزل صریح/عمری/اباحی	
12.5.7 غزل عذری/عذری	
12.6 نقائض	
12.6.1 نقائض کی ابتدا	
12.6.2 نقائض کی قدر و قیمت	
12.6.2.1 سیاسی حیثیت	

سماجی حیثیت	12.6.2.2	
لغوی اور ادبی حیثیت	12.6.2.3	
شعر اموی کی خصوصیات	12.7	
اموی دور کے مشہور شعرا	12.8	
عمر بن ابی ربیعہ :	12.8.1	
پیدائش و حالات زندگی	12.8.1.1	
شاعری کی ابتدا	12.8.1.2	
عورتوں کا شاعر	12.8.1.3	
عمر بن ابی ربیعہ کے اشعار کی فنی تقسیم	12.8.1.4	
شاعری کی خصوصیات	12.8.1.5	
اخطل	12.8.2	
پیدائش اور حالات زندگی	12.8.2.1	
شاعری کی ابتدا	12.8.2.2	
اخطل کی شاعری	12.8.2.3	
اخطل کی امتیازی خصوصیات	12.8.2.4	
فرزدق	12.8.3	
پیدائش اور حالات زندگی	12.8.3.1	
شاعری کی ابتدا	12.8.3.2	
فرزدق کا شعری اسلوب	12.8.3.3	
شاعری کے ادوار	12.8.3.4	
شاعری کی خصوصیات	12.8.3.5	
نقائض	12.8.3.6	
شہرہ آفاق قصیدہ میمہ	12.8.3.7	
جریر	12.8.4	
پیدائش اور حالات زندگی	12.8.4.1	
نقائض کی ابتدا	12.8.4.2	

شاعری کے موضوعات 12.8.4.3

امرا کی مدح سرائی 12.8.4.4

جریر کے اشعار کی امتیازی خصوصیات 12.8.4.5

اكتسابی نتائج 12.9

نمونے کے امتحانی سوالات 12.10

مطالعے کے لیے معاون کتابیں 12.11

12.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ عصر اموی کی عربی شاعری اور اس کے اغراض و مقاصد اور خصوصیات سے اچھی طرح باخبر ہو جائیں گے۔ نیز اموی دور کے اہم شعرا عمر بن ابی ربیعہ، اخطل، فرزدق اور جریر کی زندگیوں سے واقف ہو جائیں گے۔ نیز ان شعرا کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ان کے شعری اسالیب اور مخصوص طرز ادا سے بھی بخوبی واقفیت حاصل ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں یہ اکائی طلبہ کو اس دور کے شعری موضوعات، شعری مراکز اور شعری ترجیحات کے ساتھ ساتھ اغراض و مقاصد کے محرکات اور اسباب سے بھی باخبر کرے گی۔

12.2 تمہید

عربی زبان و ادب میں عصر اموی کی شاعری نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ عربی شاعری جس کے آثار اسلام کے ڈیڑھ سو سال قبل سے ملتے ہیں، اپنے ابتدائی دور سے ہی اپنے مخصوص اسلوب اور منفرد طرز بیان سے ممتاز رہی ہے۔ عربی شاعری کے تاریخی سفر میں جب اس کا پڑاؤ بنو امیہ کے دور میں ہوا تو اس میں کافی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ نئے نئے شعری مراکز وجود میں آنے لگے۔ ان مراکز کی خاص بات یہ تھی کہ مرکز کا انداز اور اسلوب دوسرے مرکز سے بالکل جداگانہ اور منفرد رہا ہے۔ نیز شاعری کے اغراض اور مقاصد میں کافی تبدیلیاں آنے لگیں۔ عربی زبان کے شعرا جو شعر کو اپنے جذبات اور محسوسات کے اظہار کا اہم وسیلہ سمجھتے تھے اب وہ بعض شعرا کے نزدیک ذریعہ معاش میں تبدیل ہو گیا۔ علاوہ ازیں امرا کی سرپرستی میں عربی شاعری نے قبائلی اختلافات کے ساتھ ساتھ دینی اور سیاسی اختلافات کو بھی پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے جس کی وجہ سے نئے موضوعات اور مقاصد وجود میں آنے لگے۔ اسی لیے عصر اموی کو عربی شاعری کی نشوونما کے حوالہ سے بہت اہم دور سمجھا جاتا ہے۔

اموی دور عربی زبان و ادب اور شعر و شاعری کی نشوونما کا اہم دور مانا جاتا ہے۔ اس دور میں عربی شاعری کی کچھ نئی اصناف معرض وجود میں آئیں اور دیگر شعری اصناف نے بھی ترقی کرتے ہوئے اپنے گہرے اثرات عربی زبان اور عربی شاعری پر چھوڑے ہیں۔ عصر اموی میں قادر الکلام بلند پایہ شعرا کی کثیر تعداد موجود تھی جنہوں نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کر کے عربی شاعری پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان تمام شعرا میں چند ایسے شعرا بھی ہیں جو خوشنما الفاظ، آسان معانی، پختہ اسلوب، بلند خیال اور وسعت فکر و دیگر خصوصیات شعری کی بنا اس دور کے تمام شعرا میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں جن میں عمر بن ابی ربیعہ، اخطل، جریر اور فرزدق سرفہرست ہیں۔

12.3 عصر اموی کی عربی شاعری

عصر اموی کی شاعری ابتدائی زمانہ میں خالص اسلامی اور عربی زندگی کی آئینہ دار تھی۔ بعد ازاں زمانہ کے تغیرات اور انقلابات کے نتیجے میں ہونے والے حوادث کی وجہ سے اس پر سیاسی، معاشرتی اور مذہبی اغراض اور مفادات کا غلبہ ہونے لگا جس کی وجہ سے اس عصر کی عربی شاعری پر جاہلانہ میلانات، بدویانہ ماحول، شاہی انعام و اکرام اور اموی سرفرازیوں کے آثار نمایاں پائے جاتے ہیں۔ نیز اس کے مقاصد اور موضوعات پر سیاسی جھگڑوں اور مذہبی وابستگیوں کو بھی واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود اس عصر کی شاعری کی بنیاد مثلاً اوزان اور قافیہ میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

اسلام نے اول یوم سے شعر گوئی میں لہو و لعب، لغویات و منکرات اور زلل و ضلال کے ساتھ ساتھ قبائلی تعصب اور آپسی شکر رنجی و ریشہ دوانیوں سے منع کیا ہے اسی لیے اس عصر کے شعرا پر قرآنی الفاظ و معانی، اسلوب و احکام کا اثر جابجا نظر آتا ہے۔ مخضرمین شعرا جن کی تربیت اور نشوونما عصر جاہلی کے پر آشوب عصر میں ہوئی ان کے افکار اور جذبات بھی اسلامی تعلیمات کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور ان کے قصیدے عصر جاہلی کی لغویات اور عصبیات سے محفوظ ہو گئے اور اسلامی افکار و نظریات ہی ان کے شعر و ادب کا مرکز اور محور ہو گیا۔ اس کے بعد عصر اموی میں نئے شعرا پیدا ہوئے جن کی نشوونما اسلامی ماحول اور اسلامی ادب کے دائرہ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے عصر جاہلی کے مآخذ اور مراجع سے بھی خوب خوب استفادہ کیا جس کا اثر ان کے مزاج اور شاعری میں بھی واضح طور پر نظر آنے لگا جس کی وجہ سے اس عصر کے بیشتر شعرا عصر جاہلیت کے افکار اور موضوعات کو اختیار کرنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے جن امور، لہو و لعب، لغویات اور موضوعات سے منع کیا تھا اب وہی چیزیں دوبارہ اس عصر کے بعض شعرا میں سرایت کرنے لگی۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ غزل جو کہ عصر جاہلی میں صرف قصیدہ کے ابتدائی حصہ اور تمہید کے طور پر شامل ہوا کرتی تھی، نے عصر اموی میں جامع شکل اختیار کر لی اور مکمل غزلیہ قصائد میں کہے جانے لگے۔ نیز لہو و لعب کو بھی خاطر خواہ انداز میں پیش کیا جاتا رہا۔ بات یہی ختم نہیں ہوئی بلکہ عصر اموی نے عصر جاہلیت کے قبائلی تعصبات کو بھی ہوا دینا شروع کر دیا اور شعرا بھی قصیدوں میں اپنے اپنے قبیلوں کا فخر یہ ذکر اور دوسرے قبیلوں کی ہجو کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتے تھے۔

عصر جاہلی میں شاعری کو قبیلہ کے دفاع اور اس کی عظمت و منزلت کے اظہار کا اہم ذریعہ شمار کیا جاتا تھا۔ اسلام کے بعد شعر کا استعمال دینی مقاصد کے لیے ہونے لگا لیکن عصر اموی میں شعر کا استعمال محامد اور مآثر کو عام کرنے، سیاسی جماعتوں کی تائید کرنے اور قبائلی عادات و اطوار کی حفاظت کے لیے ہونے لگا۔ علاوہ ازیں لہو و لعب اور غنا کو پروان چڑھانے میں بھی اس عصر کی شاعری نے اہم رول ادا کیا ہے۔ نیز امرا اور حکمرانوں کی مدح سرائی میں بھی شعرا ایک دوسرے سے سبقت لے جانے لگے۔

12.4 عصر اموی کے شعری مراکز

عصر اموی کے وہ مراکز جہاں عربی شاعری کا گلستا آباد ہوا حسب ذیل ہیں:

12.4.1 عراق

عراقی شاعری باہمی منافرت، آپسی مقابلہ اور مضطرب انقلابی زندگی کی تصویر ہے۔ عراق میں فخر و ہجو کی کثرت، قبائلی تعصب، قومی جماعت بندی اور سیاسی وابستگی نئی نئی شکل و صورت میں وقتاً فوقتاً میں نمودار ہوئیں۔ عراقی شاعری پر اخلاقیات اور اسلامی تعلیمات سے زیادہ جاہلانہ میلانات، بدویانہ ماحول، قبائلی تعصب، دینی کشمکش، سیاسی بے چینی، آپسی ہجو گوئی، باہمی مقابلہ اور مباحثہ، مختلف رجحانات اور پراگندہ خیالات کا غلبہ رہا ہے۔

عصر اموی میں عراق ایک اہم اور مرکزی حیثیت رکھتا تھا جہاں عربی شاعری کو پروان چڑھنے کا موقع میسر ہوا۔ عراقی شاعری کے موضوعات اور اسلوب عصر جاہلیت کے موضوعات اور اسلوب سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔ شعرا کے بیشتر قصیدے فخریہ کلام اور ہجو گوئی پر مشتمل ہوتے تھے۔ فرزدق اپنے قبیلہ پر فخر کرتا اور دوسرے قبائل کی ہجو کرتا تھا، اسی طرح جریر نے بھی دوسرے قبائل کی ہجو اور تنقیص میں کوئی

کسر باقی نہیں رکھی۔

عراق کی سرزمین عہد اموی میں سیاسی اور گروہی چپقلش کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی خاص طور سے شیعہ تحریک، جس نے اموی حکومت کے دانت کھٹے کر دیے تھے اسی سرزمین پر فروغ حاصل ہوا تھا، خوارج کی جماعت نے بھی عراق ہی کو سرگرمی کا ٹھکانہ بنایا تھا اور دوسری تحریکیں بھی اسی سرزمین میں پروان چڑھیں تھیں۔ عراق میں عربی شاعری کو پروان چڑھانے میں بصرہ کے بازار ”مرید“ کا نہایت ہی اہم کردار رہا ہے اور اس بازار کی قدر و منزلت عصر اموی میں بالکل اسی طرح تھی جس طرح عصر جاہلیت میں عکاظ بازار کی تھی۔ مرید دراصل ایک بازار تھا جہاں اونٹوں کی خرید و فروخت اور تجارت ہوتی تھی۔ عرب اس بازار میں جمع ہو کر خرید و فروخت بھی کرتے تھے اور اپنے اشعار کے ذریعہ اپنے حسب و نسب پر فخر بھی کرتے تھے۔ علاوہ ازیں بہادری اور شجاعت کے واقعات اور داد و دہش کے قصہ سنانا بھی ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ مرید کے بازار میں ہر شاعر کا ایک حلقہ ہوا کرتا تھا جہاں اس کے قبیلہ اور مذہبی ہم آہنگ لوگ جمع ہو کر اس کی تائید اور مدد کیا کرتے تھے۔ مرید کے وہ اہم شعرا جن کا مخصوص حلقہ ہوا کرتا تھا ان میں جریر، فرزدق، اخطل، عجاج اور کعب بن جمیل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نفاض اور اراجیز کا شمار عراقی شاعری اور مرید کے اہم شعری آثار میں ہوتا ہے۔

عراقی شاعری کی دوسری قسم خوارج کی شاعری تھی جو بالکل طور پر جاہلی شعر، جاہلی عصیت اور جاہلی عادات و اطوار سے پاک تھی اور اس کا مرکز و محور صرف اسلامی تعلیمات اور احکامات تھے۔ خوارج کے شعرا دوسرے شعرا کی طرح مدح سرائی اور ہجو گوئی کے بجائے اسلامی موضوعات اور تعلیمات کو اختیار کرتے تھے۔ خوارج کے شعرا میں قطری بن فناء، اور عمران بن حطان زیادہ مشہور ہیں۔ غزلیہ شاعری کی نشوونما جس بہترین انداز میں حجاز کی سرزمین میں ہوئی، اس انداز میں سرزمین عراق میں نہ ہو سکی۔

12.4.2 شام

عصر اموی میں شام کا شمار ادبی اور شعری سرگرمیوں کے اہم مراکز میں ہوتا تھا۔ چونکہ شام کا علاقہ بنو امیہ کے زیر نگیں رہا اسی لیے وہ وفاداروں اور حاشیہ برداروں کا مرکز رہا جس کی وجہ سے وہ آپسی چپقلشوں اور سیاسی ہنگاموں سے محفوظ رہا۔ یہاں کی شاعری میں نہ حجاز کی طرح لہو و لعب اور نہ ہی عراق کی طرح مختلف سیاسی اور مذہبی اختلافات کے موضوعات پائے جاتے ہیں بلکہ شامی شعری سب سے اہم خصوصیت مدح سرائی تھی، اور یہ بات فطری بھی تھی کیونکہ دمشق بنو امیہ کا پایہ تخت تھا اور شعرا مدحیہ کلام پیش کرنے کے لیے دور دراز کے سفر کی مشقتوں کو برداشت کر کے آتے تھے جس کے صلہ میں امرا بھی داد و دہش و انعامات سے انھیں مالا مال کرتے تھے۔ امرا اور حکمرانوں کے درباروں میں جو شعری نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں وہ شعر و ادب کے لحاظ سے بہت اہم ہوا کرتی تھیں کہ امرا خود شعر و ادب کے ادانشاس اور بیان و بلاغت کے رمز شناس ہوتے تھے۔ ان کی تعلیم اور تربیت میں خاص طور سے اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ عربی زبان و شعر پر جو ان کا قومی اثاثہ تھا، انھیں قدرت حاصل ہو اسی لیے عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کی تعلیم کے لیے امرا اپنی اولادوں کو قبائل میں بھیجتے تھے۔ عبدالملک بن مروان نے اپنی اولاد کے اتالیق سے کہا کہ ان کو شعر کی تعلیم دیجیے تاکہ وہ اہل کمال بن سکیں۔

بنو امیہ کے امرا چونکہ اہل زبان تھے اسی لیے مدحیہ قصائد پر ان کے حسن اور خوبی کے پیش نظر شعرا کو داد و دہش سے نوازتے تھے اور سیاسی

اغراض اور مقاصد کے لیے ان کا استعمال کرتے تھے تاکہ یہ شعر ان کی جو دو سخا اور حسن معاملت کو عوام الناس میں عام کر کے حکومت کے تئیں عوام کے افکار اور جذبات کو مائل کریں۔ اسی لیے شام کے امرا کے محلات جہاں سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھے وہیں ادبی اور شعری سرگرمیوں کے بھی اہم مرکز کے طور پر جانے جاتے تھے۔ عدی بن رفاع، یزید بن عبد الملک اور ولید بن یزید کا شمار شام کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔

12.4.3 حجاز

اہل حجاز جو طبعی طور پر خوش مزاج، نزاکت احساس، عیش و آرام، کھیل کود اور دیگر تفریحی مشاغل سے مانوس تھے۔ اموی حکمرانوں نے سیاسی مصلحتوں کے تحت انھیں عیش و آرام کے وسائل مہیا کر کے عیش کوشی کا خوگر بنا دیا تھا، لہو و لعب کے صحرا میں اہل حجاز اس قدر سرگرداں تھے کہ حجاز اس زمانہ کے مشہور گانے والوں کا مرکز بنا ہوا تھا جن میں ابن سرتج، غریض، معبد، حنین، ابن محرز، جمیلہ، نشیط، ہ وغیرہ شامل ہیں۔

حجاز عصر اموی کے شعری مراکز میں ایک منفرد اور ممتاز مقام کا حامل تھا۔ حجاز بیک وقت دو متناقض و متضاد مظاہر کا اہم مرکز تھا۔ ایک طرف وہ مذہبی اور دینی اعتبار سے بلند مرتبہ پر فائز ہونے کی وجہ سے لوگ دور دراز کے علاقوں سے رخت سفر باندھ کر قرآن کریم، حدیث شریف اور فقہ اسلامی کی دولت سے مالا مال ہونے کے لیے وہاں آتے تھے تو دوسری طرف وہ لہو و لعب اور لغویات کا بھی ایک اہم مرکز بن چکا تھا۔ حجاز کے ادب اور شاعری میں عورتوں کے ساتھ کھیل کود اور ان کے محاسن کا ذکر ہی ان کی خصوصیت تھی اور ان کی شاعری کا بیشتر حصہ غزل پر مشتمل ہوتا تھا جس کا اہم سبب یہ تھا کہ شام بنو امیہ کا پایہ تخت تھا اور عراق مخالفین کا اہم مرکز، اس طرح یہ دونوں مقامات سکون اور فراغ کے بجائے سیاست کے اہم مراکز تھے جب کہ حجاز ایک پرسکون اور سیاسی چپقلشوں سے دور ایک سازگار جگہ تھی جہاں عربی شاعری اور بطور خاص غزل نے ترقی کے بے شمار منازل طے کیے تھے۔ حجاز کی سرزمین میں شعر و شاعری کو اس وقت زیادہ عروج اور فروغ حاصل ہوا جب اس معاشرہ میں مال و دولت کی فراوانی نے وہاں کے لوگوں کی زندگی بدل دی خاص طور سے عہد اموی میں جب حکومت کا دار السلطنت حجاز سے باہر شام میں قائم ہوا تو لوگ تبرکاً مقدس سرزمین سمجھ کر مال و دولت حجاز بھیجنے لگے۔ دوسری سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اموی حکمرانوں نے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے اہل حجاز کو خلافت اور حکومت سے غافل رکھنے اور حکومت کے معاملات سے دور رکھنے کی غرض سے ان میں مال و دولت اور ہر طرح کی عیش کوشی کے سامان مہیا کر دیئے اور زندگی کے ہر ایک شعبہ میں عیش و تنعم داخل ہو گیا۔ اونچے محلات اور خوبصورت باغات میں لہو و لعب کی مجلسیں قائم ہونے لگیں اور نغمہ و سرور کی محفلیں جمنے لگیں، غیر ممالک سے جو خواتین کنیز کی صورت میں آئیں تھیں وہ بھی بے پردہ ان میں شریک ہونے لگیں، الفت و محبت نے اظہار جذبات پر مجبور کر دیا اور حسن و عشق کے اس ماحول نے شاعری کو پاکیزہ اور خوبصورت غزل سے ایسا مالا مال کر دیا کہ عربی شاعری کا وہ حصہ طرہ امتیاز بن گیا۔

حجاز کے اہم شعرا میں عمر بن ابی ربیعہ، جمیل بن معمر، کثیر بن عبد الرحمن، احوص اور نصیب کے علاوہ دوسرے شعرا بھی شامل ہیں۔

12.5 شعرا اموی کے اغراض

عصر اموی میں شعرا نے کثیر اغراض و مقاصد کے لیے طبع آزمائی کی اور عمدہ کلام پیش کیا ہے جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

12.5.1 مدح سرائی

اگرچہ اموی دور سے قبل اسلامی شاعری میں خالص مدح سرائی کو پسند نہیں کیا جاتا تھا لیکن عصر اموی میں حضرت امیر معاویہ نے مشروط اجازت دی تھی لیکن رفتہ رفتہ شعراء دنیاوی مفاد اور اغراض کے حصول کے لیے امرا کی مدح سرائی مبالغہ آرائی کے ساتھ کرنے لگے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مدح میں کثیر عزة کے اشعار:

ولیت فلم تشتم علیا ولم تخف ولیا ولم تقبل اشارة مجرم
 وصدقت بالفعل المقال مع الذي أتیت فأمسی راضیا کل مسلم
 فما بین شرق الارض والغرب کلها مناد ینادی من فصیح وأعجم
 یقول امیر المؤمنین ظلمتنی بأخذ لدینار ولا أخذ درهم
 ولو یستطیع المسلمون لقسما لک الشطر من اعمارهم غیر ندم

12.5.2 ہجو گوئی

عصر اموی میں شاعری کی اس صنف نے بھی بہت ترقی کی اور اسے سیاسی، ذاتی، قبائلی اور دینی اغراض کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ انخل کے ہجو یہ اشعار جریر کے قبیلہ کلیب کے بارے میں:

ما زال فینا رباط الخیل معلمة وفي کلیب رباط الذل والعار
 النازلین بدار الذل ان نزلوا وتستیح کلیب حرمة الجار
 والطاعین علی اہواء نسوتهم وما لهم من قدیم غیر اعیار
 بمعرض او معید او بنی الخطفی ترجو جریر مساماتی واططاری
 قوم إذا استنبح الاضیاف کلیهم قالوا لامهم بولی علی النار

12.5.3 فخر

اس عصر کے شعرا زمانہ جاہلیت کے کارناموں کو فخریہ اشعار میں ذکر کرنے لگے۔ نیز عصر جاہلیت کی عصبيت کو دوبارہ زندہ کر کے اس کے ذریعہ داد و دہش اور کرم نوازیوں کے واقعات بھی سنانے لگے۔ اس عصر میں اگرچہ فخر و مباہات میں مبالغہ آرائی اور ناپسندیدہ امور پر عمل کیا جانے لگا لیکن اس کا ایک مثبت پہلو یہ بھی رہا کہ اس کے ذریعہ اس عصر کی تاریخ اشعار کی شکل میں محفوظ ہوگئی۔

جریر کے فخریہ اشعار

ان الذي حرم المکارم تغلبا جعل الخلافة والنبوة فینا
 مضر ابی وابوالملوک فهل لکم یا خرز تغلب من اب کابینا
 هذا ابن عمی فی دمشق خلیفة لو شئت ساقکم الی قطنینا

12.5.3 سیاسی شاعری

سیاسی شاعری عربی شاعری کی ایک ایسی اہم صنف ہے جسے عصر اموی میں امرا بنو امیہ کی سرپرستی میں پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ بنو امیہ نے اپنے خلاف چلنے والی تیز و تند آندھیوں کا مقابلہ جہاں مال و زر، جاہ منصب سے کیا وہیں دوسری طرف شعرا کو داد و بخش اور انعام و اکرام کے ذریعہ استعمال کیا جس کے نتیجے میں عربی زبان میں شعر سیاسی کا وجود ہوا۔ اس عصر میں بنو امیہ کے علاوہ دوسری جماعتوں کے موافق شعرا بھی کثرت سے پائے جانے لگے مثلاً بنو ہاشم، زبیر، خوارج وغیرہ۔ جریر، فرزدق اور اخطل بنو امیہ کے لیے شعر گوئی کرتے تھے۔ کیت بن زید بنو ہاشم کی مدح سرائی کرتا تھا۔ عبداللہ بن قیس ابتدا میں زبیر کے لیے بعد ازاں بنو امیہ کی تائید میں شعر کہتا تھا۔ جب کہ قطری بن فجاءة، عمران بن حطان اور طرماح بن حکیم کا شمار خوارج کے شعرا میں ہوتا تھا۔

بنو ہاشم کی مدح میں کیت بن زید کے اشعار

طربت وما الى البيض اطرب	ولا لعبا مني ،وذو الشيب يلعب
ولم تلهني دارولا رسم منزل	ولم يتطربني بنان مخضب
ولكن الى اهل الفضائل والتقى	وخير بنى حواء، والخير يطلب
الى النفر البيض الذين بحبهم	الى الله فيما نالني أتقرب
بني هاشم رهط النبي فاني	بهم ولهم ارضى مرارا وأغضب
خففت لهم مني جناحي مودة	الى كنف عطفاه أهل ومرحب
بأي كتاب ام بأي سنة	ترى حبهم على عارا وتحسب
فمالي الا آل أحمد شيعة	ومالي الا مذهب الحق مذهب
يعيبونني من غيهم وضلالهم	على حبكم بل يسخرون وأعجب
فطائفة قد كفرني بحبكم	وطائفة قالوا: مسيء ومذنب

عبداللہ بن قیس کے اشعار کا نمونہ جو مصعب بن زبیر کے مدح میں کہے گئے ہیں:

حبذا العيش حين قومي جميع	لم تفرق امورها الأهواء
قبل ان تطمع القبائل في ملك	قریش وتشتت الاعداء
ايها المشتهى فناء قریش	بيدالله عمرها والبقاء
ان تودع من البلاد قریش	لايكن بعدهاحي بقاء
انما مصعب شهاب من الله	تجلت عن وجهه الظلماء

ملکہ ملک قوۃ لیس فیہ
کیف نومی علی الفراش ولما
جبروت ولا بہ کبریاء
تشمّل الشام غارۃ شعواء
تذہل الشیخ عن بنیہ وتبدی
عن براہا العقیلۃ العذراء

12.5.4 غزل

اموی دور سے قبل عربی قصائد میں غزلیہ اشعار کو بطور تمہید ذکر کیا جاتا تھا لیکن عصر اموی میں غزل ایک مستقل صنف کی شکل اختیار کر گئی اور غزل میں مکمل قصیدے پیش کیے جانے لگے اور اس کی دو اہم قسمیں وجود میں آئیں۔

12.5.5 غزل صریح/عمری/اباجی

غزل صریح، غزل کی وہ صنف ہے جس میں شاعر دل لگی، دل بستگی کے مناظر اور محبت و نسوانی حسن کے مشاعر کو بغیر شرم و حیا کے پیش کرتا تھا اور یہ صنف حجاز کے اہل ثروت انصار اور مہاجرین کے درمیان پروان چڑھی تھی۔ اس صنف کے مشہور شاعر عمر بن ابی ربیعہ قریشی تھے جو اعلیٰ طور پر چھوٹے قصوں میں تشبیہ کیا کرتے تھے۔ عمر بن ابی ربیعہ نے غزل میں زبان و بیان، وصف و منظر کشی، مکالمہ و معاملہ بندی اور حدیث دیدہ و دل کا ایسا اچھوتا، دلنشین اور سحر آگیز انداز ایجاد کیا تھا جو معاشرہ کے تمام افراد کے زبان پر یکساں طور پر جاری تھا اور جسے سن کر ہر کوئی مدہوش اور سرشار ہو جاتا تھا۔ اور جب اس سحر آمیز کلام کو فرزدق جیسے قادر الکلام اور جادو بیاں شاعر نے سنا تو بے ساختہ بول پڑا ”خدا کی قسم یہی وہ باتیں تھیں جنہیں درحقیقت شعرا کہنا چاہتے تھے، لیکن بھٹک کر دیار حبیب پر رونے لگے، اور تقریباً یہی بات اس کے معاصر اور حریف شاعر جریر نے بھی کہی تھی۔ نیز راگ و رنگ اور نغمہ و آہنگ نے غزل صریح کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے جس کی وجہ سے اس کی بازگشت دوسرے شہروں میں بھی سنائی دینے لگی۔

حجاز چونکہ مذہبی اور سیاسی اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا اسی لیے وہاں مال و دولت کی فراوانی تھی، مزید برآں وہاں ملک شام، مصر، روم اور فارس کے غلاموں اور باندیوں کی خاصی تعداد بھی پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے حجاز میں نئی تہذیب اور لہو و لعب کا عنصر زیادہ پایا جاتا تھا جس نے غزل اباجی کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ غزل کی اس قسم کا نمائندہ شاعر عمر بن ابی ربیعہ تھا۔ غزل کی اس قسم کو اس کی نسبت سے غزل عمری سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

12.5.6 غزل عقیف/عذری

غزل کی یہ صنف حجاز کے مشہور قبیلہ بنو عذرہ میں پروان چڑھی تھی جو ایک قحطانی قبیلہ ہے۔ یہ قبیلہ صفائی محبت، پاک دامنی اور اخلاق فاضلہ میں پورے عجب و حجاز میں مشہور تھا جہاں کے باشندے بدوی خصوصیات پر نازاں اور اپنے رسم و رواج کو سینے سے لگائے ہوتے تھے۔ بعد ازاں قبیلہ بنو عامر نے بھی اس صنف کی شاعری میں حصہ لیا ہے۔ اس صنف کے شعرا نقش نگاری اور کذب سے احتراز کرتے تھے اور غیر حقیقی محبت کو پیش کرنے سے احتراز کرتے تھے اور عاشق شعرا اپنی محبتوں کا اظہار قصائد اور اشعار کے ذریعہ عورتوں کے محاسن کو ذکر کیے بغیر پاک و صاف انداز میں کیا کرتے تھے۔

ان کے الفاظ ثقل و گرانی کے باوجود بڑے سبک اور حسین اور معانی و مطالب سیدھے سادھے اور ابندال و فشیات سے پاک و صاف ہوتے تھے، نیز کلام میں ایسا مؤثر اسلوب اختیار کیا جاتا کہ پڑھنے والا بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔ علاوہ ازیں نغمگی اور موسیقی نے بھی ان کے کلام کو چار چاند لگا دیے۔ غزل عذری میں جمیل بن معمر اور بشینہ، کثیر بن عبدالرحمن اور عرہ، قیس بن ملوح اور لیلیٰ، تویبہ بن حمیر اور لیلیٰ انجیلیہ، قیس بن ذریح اور لبنی کی حقیقی محبت کے واقعات بہت مشہور ہیں۔

بنو عذرہ کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اسے عذری غزل سے موسوم کیا جاتا ہے۔ غزل عذری کے ارتقا میں معاشرتی عوامل کا بھی نہایت اہم رول رہا ہے کیونکہ عرب کا وہ ایسا معاشرہ تھا جو اپنی غیرت کے لیے شہرت رکھتا تھا۔ اگر کوئی شاعر کسی دوشیزہ کو شعر میں ذکر کرتا تو اس کے اہل خاندان اس سے شادی ہرگز نہیں کرتے تھے اور اس زمانہ میں حاسدین، ملامت کرنے والوں اور چغل خوروں کی کثرت سے اکثر شعرا کے حصہ میں محرومی آتی تھی جس کی وجہ سے ان کی محبت میں اور شدت پیدا ہو جاتی تھی۔ قبیلہ بنو عذرہ چونکہ شہری زندگی سے دور اور اس کے اثرات سے محفوظ رہا اس لیے وہاں کے شعرا میں عفت اور پاک دامنی کا عنصر زیادہ غالب رہا۔ علاوہ ازیں قبیلہ بنو عذرہ عصر اموی میں تمام سیاسی اور عسکری سرگرمیوں سے بھی کافی دور رہا جس کی وجہ سے اس قبیلہ میں غزل گوئی کا رجحان بڑھتا چلا گیا اور اس فراغت نے غزل کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔ نیز عشاق کی آپسی قربت داری کو بھی غزل عذری کی ترقی کا اہم عنصر قرار دیا جاتا ہے۔

غزل عذری میں شاعر فحش اور یا وہ گوئی کے بجائے عفت اور پاک دامنی کا پہلو زیادہ اجاگر کرتا تھا جو کہ محرومی، شدت جذبات اور دینی جذبات کا صلہ تھا۔ شعر کی اس صنف میں محبوبہ کی نسوانی خوبصورتی کے بجائے عاشق کی ذات اور اس کے جذبات زیادہ غالب رہتے تھے۔ اس صنف کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ شعرا حقیقی واقعات اور تجربوں کو ہی ذکر کرتے تھے اور جھوٹ اور غیر حقیقی واقعات سے اجتناب کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اس صنف کے شعرا محبت میں کثرت کے بجائے وحدت میں یقین رکھتے تھے اسی لیے ان کی زندگیوں اور قصیدوں میں عام طور پر صرف ایک ہی محبوبہ کا ذکر ملتا ہے اسی لیے ان کی محبتوں میں دوام اور استقرار بھی پایا جاتا ہے۔ اس صنف کے شعرا کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے جذبات اور محبتوں کے اظہار کے لیے فطری آسان اور سہل زبان استعمال کرتے تھے۔

جمیل بن معمر کے غزلیہ اشعار کا نمونہ:

لا لیت ریعان الشباب جدید	ودھرا تولی یا بشین یعود
ویا لیت شعری هل أبتن لیلۃ	بوادی القرى انی اذن لسعید
وهل ألقین فردا بثینۃ مرة	تجود لنا من ودھا ونجود
فقد تلتقی الحاجات من بعد یأسۃ	وقد تطلب الحاجات وهي بعید
علقت الهوی منها ولیدا فلم یزل	الی الیوم ینمی حبھا ویزید
وأفنیف عمري في انتظارنوالها	وأبلیت فیھا الدھر وهو جدید
فما ذکرا لاحباب الا ذکرتھا	ولا البخل الا قلت سوف تجود
إذا قلت ما بی یا بثینۃ قاتلی	من الحب قالت : ثابت ویزید

مع الناس قالت: ذاك منك بعيد

وان قلت ردی بعض عقلی أعش به

ولا حبها فیما یبید

فما أنا مردود بما جئت طالبا

12.6 نقائض

عصر اموی میں وجود میں آنے والی ایک نئی شعری صنف کو ”نقیضہ“ کہتے ہیں اور اس کی جمع ”نقائض“ ہے۔ اس صنف میں شاعر جب کسی خاص بحر اور قافیہ میں قصیدہ پیش کرتا ہے تو مد مقابل کا شاعر اس قصیدہ کا جواب اسی بحر اور قافیہ میں اس طرح دیتا ہے کہ مخالف شاعر کے معانی و مطالب کو الٹ کر اسی کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ اسی لیے اس صنف میں شعرا جھوٹ، تہمت تراشی، افترا پردازی، فحاشی و دیگر غیر اخلاقی امور سے بھی اجتناب نہیں کرتے تھے۔ نقائض کے اہم شعرا جریر، فرزدق اور اخطل ہیں۔

12.6.1 نقائض کی ابتدا

نقائض درحقیقت زمانہ جاہلی سے چلی آرہی ہجو گوئی کی ہی ایک زیادہ واضح تصویر اور معانی و مطالب کے اعتبار سے ایک اور متنوع شکل ہے۔ نقائض کی ابتدا عصر اموی میں ہوئی، اس زمانہ میں ہجو کی اس شکل میں بڑی گندگی اور ابتذال پیدا ہو گیا۔ خلفا و امرا و حکام اس کو روکنے کی بجائے ایسے شاعروں کی پیڑھ ٹھونکتے تھے اور انعام و اکرام اور داد و دہش سے نواز کر اپنے درباری حلقہ میں شامل کر لیتے تھے اور اپنی حکومت اور اپنے خاندان اور اس کے کارہائے نمایاں کا ذکر ان شاعروں کے ذریعہ کراتے تھے اور اس طرح خلافت کے دعووں کو حق بجانب اور اپنی حیثیت کو مضبوط کرتے تھے۔

عصر اموی میں نقائض کی ابتدائی صورت جریر اور غسان سلیمی کے درمیان ہوئی شعری جھڑپ ہے جس میں جریر کو اپنے مخالف شاعر پر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ غسان سلیمی کی مدد کے لیے فرزدق کے قبیلہ کا ایک شاعر بعیث سامنے آتا ہے اور جریر کی ہجو کرتا ہے، جس کے جواب میں جریر بعیث اور اس کے قبیلہ کی عورتوں کی ہجو کرتا ہے۔ معاملہ طول پکڑتا ہے اور بنو مجاشع کی عورتیں فرزدق کے پاس آ کر مدد طلب کرتی ہیں، اس طرح فرزدق اس باہمی منافرت کا حصہ بن جاتا ہے اور ادب میں ایک نئی صنف نقائض اور باہمی ہجو گوئی کا ایک زور دار مقابلہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اخطل نے فرزدق کو جریر پر ترجیح دی اور اس کو برتر و افضل بتایا جس کی وجہ سے جریر نے اخطل کی بھی ہجو کی۔ جریر اور فرزدق کے معاملہ میں لوگوں کے دو جماعتیں بن گئیں، ایک جماعت اور گروہ جریر کی تائید کرتا اور دوسری جماعت فرزدق کی حمایت کرتی تھی۔ ان دونوں شاعروں کے معاملہ میں لوگوں کی دلچسپی اور اہتمام نیز ان کی شاعری کے متعلق فیصلہ کرنے میں اختلاف پر اس سے زیادہ کوئی چیز بھی دلالت نہیں کر سکتی کہ دو بالمقابل لشکر تھوڑی دیر کے لیے لڑنا بند کر کے اس بات کی خواہش کرنے لگیں کہ خارجی ادیبوں میں سے ایک ان دو مہلب کے آدمیوں میں فیصلہ کر دے جو جریر اور فرزدق کے بارے میں جھگڑ رہے تھے۔ ابن سلام نے لکھا ہے کہ مہلب کے لشکر کے دو آدمی جریر اور فرزدق کے بارے میں جھگڑنے لگے حالانکہ فرزدق خوارج کے بالمقابل تھا۔ جب وہ اس کے پاس گئے تو اس نے اپنی جان بچانے کے لیے کہا کہ میں ان دونوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتا، البتہ تمہیں ایک ایسا شخص بتاتا ہوں جو ان دونوں کی ناراضگی کو آسانی برداشت کر لے گا یعنی

”عبید بن ہلال“ جو اس دن قطری بن فہاء کے لشکر میں تھا۔ چنانچہ وہ دونوں اس کے لشکر کے پاس پہنچ کر اسے آواز دی۔ وہ اس خیال سے کہ کوئی اس مقابلہ کے لیے بلا رہا ہے نیزہ گھیٹتے ہوئے نکلا، جب قریب پہنچا تو دونوں نے دریافت کیا: ”فرزدق زیادہ بڑا شاعر ہے یا جریر؟“ اس نے کہا: ”تم پر اور ان دونوں پر خدا کی لعنت ہو۔“ ان دونوں نے کہا: ”ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے سوال کا جواب دے دیں پھر ہم ادھر چلے جائیں گے جدھر آپ چاہتے ہیں۔“ اس نے کہا بڑا شاعر وہ ہے جو کہتا ہے:

ولا حبہا فیما یبید یبید وطوی القیاد مع الطراد بطونہا

طی التجار بحضرموت بردا۔ انھوں نے کہا یہ تو جریر کا شعر ہے، اس نے کہا: ”بس تو وہی ان دونوں میں بڑا شاعر ہے۔“ اغانی میں یہ واقعہ درج ہے کہ ایک شخص نے چار ہزار درہم اور ایک گھوڑا اس شخص کو پیش کر دیا جس نے جریر پر فرزدق کو ترجیح دی تھی۔
نفاض کی علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی حیثیتوں پر ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی نے مفصل روشنی ڈالی ہے۔

12.6.2 نفاض کی قدر و قیمت

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ نقیضہ گوئی بالکل نئی چیز نہ تھی، بلکہ زمانہ جاہلیت میں بھی اس کا وجود تھا۔ لیکن اموی دور میں سیاسی و مذہبی حالات اور ہر طرح کی گروہ بندیوں نے اس میں قبائلی حمیت اور خاندانی و عربی تعصب کو بھی داخل کر دیا، چنانچہ ان کے اثرات پوری طرح نقیضہ گوئی میں نمایاں رہے۔ اس صورتحال سے جہاں ان گروہوں اور جماعتوں نے سیاسی فائدے حاصل کیے وہاں عربی ادب کو بھی بہت فائدہ پہنچا اور اس طرح اس نقیضہ گوئی نے جس نے اس زمانے میں گھناؤنی شکل اختیار کر لی تھی، مختلف حیثیتوں سے بالواسطہ طریقے پر زبان و ادب کو بھی بہت فائدہ پہنچایا اور اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی۔

12.6.2 سیاسی حیثیت

نقیضہ کی قدر و قیمت سیاسی حیثیت سے یوں بڑھ گئی کہ نقیضہ گو شعرا امویوں اور ان کے مخالفوں کے درمیان خلافت کے استحقاق اور عدم استحقاق پر چھڑی جنگ کا نقشہ کھینچ کر ملت اسلامیہ کے دل و دماغ کو موافقت یا مخالفت کے لیے تیار کرتے تھے، اور اگرچہ آخر میں امویوں کو فتح ہوئی اور ان کے مخالف افراد اور جماعتیں یکے بعد دیگرے ختم ہوتی گئیں یا ان کی قدر و قیمت کمزور ہوتی گئی، مگر اس احساس شکست نے قبائلی تعصب کی شکل اختیار کر لی، جو باوجود اسلام کے منع کرنے کے ابھر کر نئے سرے سے سامنے آگئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قبیلہ قیس کے افراد، جنھوں نے خلافت کی جنگ میں عبداللہ بن زبیر کا ساتھ دیا تھا، یمینوں کی جنھوں نے بنو امیہ کا ساتھ دیا تھا، محض قبائلی تعصب کی بنا پر ہر معاملہ میں مخالفت کرتے تھے۔ اور یہی وطیرہ شعرا کا بھی تھا مگر ایک بات ضرور تھی وہ یہ کہ اکثر شعرا قبائلی تعصب رکھنے کے باوجود، عام عربوں کی عظمت اور عربی قومیت کی اہمیت اور اسلامی فتوحات کی روز افزوں وسعت اور خاص طور سے مشرقی علاقوں جیسے ایران، ہندوستان اور چین کی فتوحات کا ذکر اور ان پر فخر کرنے میں بھی اپنا پورا زور قلم صرف کر دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر شعرا عقیدہ کے اعتبار سے نہ اموی تھے نہ علوی اور نہ زبیری، وہ تو اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر پیسہ کمانا اور اپنی حیثیت بنانا چاہتے تھے، اس لیے موقع ملتے ہی چولے بدلتے رہتے تھے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کل تک جو شعرا زبیریوں کے ساتھ تھے ان کے ہارنے کے بعد امویوں کے دھڑے میں شامل ہو گئے، اور اس میں بڑے

سے بڑا شاعر شریک تھا، چنانچہ فرزدق جیسا عظیم شاعر جو شروع میں علوی تھا آخر میں امویوں کا قصیدہ خواں ہو گیا۔ اسی طرح جو بہت غالی عیسائی تھا محض مالی منفعت کی خاطر اموی خلفا کی جو بہر حال اس کے عقیدہ کے خلاف مسلمان تھے، دل کھول کر تعریف کرتا تھا اور اس تعریف میں اصطلاحات اور تعبیرات سب اسلامی استعمال کرتا تھا، دو ایک شعرا البتہ ایسے تھے جنہوں نے اپنی ریت نہیں بدلی، ان میں قابل ذکر کمیت ہے جو آل بیت کا بہت بڑا مداح اور غالی شیعہ تھا۔ اس نے ان کی شان میں بہت ہی خوبصورت مدحیہ قصیدے کہے جو عربی ادب میں ہاشمیات الکمیت کے نام سے مشہور ہیں۔ مگر روایت ہے کہ آخر میں حالات نے اس کو بھی مجبور کر کے بنو امیہ کا مدح خواں بنا دیا، البتہ عمر نابی ربیعہ وہ تھا شاعر ہے جس نے نہ کسی کی مدح کی اور نہ نقیضہ گوئی میں شریک ہوا۔

12.6.1 سماجی حیثیت

اگر ہم اموی دور کی شاعری پر گہری نظر ڈالیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس پر بدوی زندگی اور اس کے معتقدات اور رسم و رواج کی لہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اس عہد کی شاعری میں حسب و نسب پر فخر کے علاوہ عربوں کی زمانہ جاہلی کی جنگوں کا ذکر اور ثاریعنی خون کا بدلہ خون جیسی ریت کا ذکر بالکل جاہلی انداز میں ملے گا، نقیضہ گو شعرا مدنی یا شہری زندگی کو قومی نظر سے بری اور اپنی شان سے گری ہوئی زندگی سمجھتے تھے۔ اخطل نے عیسائی ہونے کے باوجود انصاریوں کی ہجو کی تو ان کے پیشہ کھیتی باڑی پر انہیں عار دلایا۔ جریر آخر عمر تک بنو مجاشع کی ہجو کرتا رہا کہ وہ پیشہ کے لحاظ سے لوہار تھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ لوہاری، بڑھی گیری، کھیتی کسان کی اور دوسرے تمام پیشے رب بدویوں کی نگاہ میں حقیر پیشے تھے، جو غلام کرتے تھے آزاد عرب نہیں۔

اس زمانے میں بھی صدر اسلام کی طرح اسلامی الفاظ اور اسلامی آرا و افکار کو شعرائے نقائص نے استعمال کیا، چنانچہ نہ صرف جریر، فرزدق اور دوسرے مسلمان شعرا کے نقائص میں نماز، روزہ اور حج کا ذکر اور قرآن شریف کی آیات یا ان کی طرف کھلے اشارے ملتے ہیں بلکہ اخطل جیسے عیسائی شاعر کے کلام میں بھی کم از کم اسلامی افکار و آرا صاف اور کھلے الفاظ میں ملتے ہیں، جیسے:

نفسی الفداء امیر المؤمنین إذا
ابدی النواجد یوم عارم ذکرہ
الخائض الغمر، والمیمون طائرہ
خليفة الله، يستسقى به المطر

یعنی امیر المؤمنین پر گھمسان کی جنگ کے موقع پر قربان ہو جاؤں، جو اتنے بہادر ہیں کہ بے مہا با معرکہ میں گھس پڑتے ہیں، جو بڑی تقدیر والے ہیں، اور اللہ کے ایسے خلیفہ ہیں کہ بارش ان سے سیراب ہوتی ہے۔
ان اشعار میں امیر المؤمنین، خلیفۃ اللہ جیسے الفاظ اور ترکیبیں بالکل اسلامی فکر اور اعتقاد پر مبنی ہیں۔

12.6.3 لغوی اور ادبی حیثیت

اسلوب بیان اور الفاظ کی سچ دھج کے نقطہ نظر سے اگر نقیضہ پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان شعرا نے ایسا اسلوب بیان اختیار کیا ہے جس میں موقع محل کے اعتبار سے ایسے خوب صورت، موزوں اور منتخب الفاظ استعمال کیے ہیں جن کے ذریعہ معانی و مطالب کھل کر واضح شکل میں سامنے آجاتے ہیں اور کسی قسم کی لفظی یا معنوی تعقید یا ابہام نہیں رہ جاتا اور خاص و عام نہ صرف اس سے لطف لیتا ہے بلکہ اس انداز بیان کی

داد دیتا ہے اور اس طرح انھوں نے زبان کی صفائی اور پاکیزگی اور اثر اندازی کو پوری طرح نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس کو جلا بخشی۔ اس زمانے میں جب کہ اعاجم (غیر عرب لوگ) کی وجہ سے عربی زبان و بیان میں عجمی الفاظ اور غیر عربی تعبیرات آنے لگیں تھیں، شعرائے نقائض اور خاص طور سے فرزدق نے اس کا اہتمام باقی رکھا کہ خالص عربی الفاظ اور خالص عربی تعبیرات استعمال کرے اور قدیم اسلوب اور مروج و مقبول طرز ادا کو محفوظ رکھے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اگر فرزدق نہ ہوتا تو ایک تہائی اور بعض کے قول کے مطابق دو تہائی زبان ختم ہو جاتی۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان شعرائے نقائض نے الفاظ کے معانی و مطالب کا ان کی موزوں جگہ پر استعمال کر کے اور ان کی شان و شوکت کو محفوظ رکھ کر عربی زبان کو بگڑنے سے بچالیا۔

جیسا کہ اوپر کہیں اشارہ کیا گیا ہے کہ نقائض کے سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ کہ اس نے شعر و ادب میں ایک نئی صنف سخن کا اضافہ کیا تھا جو اس عہد تک عربی شاعری میں اتنی وضاحت اور موثر طریقے سے ابھر کر سامنے نہیں آئی تھی اور وہ ہے ”سیاسی شاعری“۔ نابغہ الذبیانی کے کلام میں ملوک حیرہ و غسان کے سلسلہ میں کچھ سیاسی رنگ کی شاعری ملتی ہے مگر اس زمانے میں شعرائے نقائض نے اس رنگ کو اتنا نکھارا اور عوام و خواص نے اس کو اتنا پسند کیا کہ آگے چل کر اس نے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی جس میں بہت سے نامی گرامی شعرا ابھر کر سامنے آئے جنھوں نے زبان و بیان کو ترقی دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا اور اس میں قدیم رنگ کو برقرار رکھتے ہوئے جدید آرا و افکار اور خیالات و جذبات کو نئے حالات میں نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے اس طرح پیش کیا کہ خالص عربی زبان و بیان کی بالادستی اور اس کا وقار اور اس کی جاذبیت و اثر اندازی بدستور قائم رہی۔ یہ صنف شاعری جس کو ہم نے ”سیاسی شاعری“ کا نام دیا ہے، بڑی شاندار اور جاندار ہے اس میں بہت سے نامور شعرا پیدا ہوئے ہیں جن میں اخطل، فرزدق اور جریر ممتاز قرار دیے جاتے ہیں۔

نقائض کے تین سب سے اہم اور باکمال اور قادر الکلام شعرا ہیں: جریر، فرزدق اور اخطل۔ لیکن نقادوں میں اس بات پر اختلاف تھا کہ ان میں سے کون کس سے بڑا شاعر ہے، چنانچہ ہر ایک اپنے پسندیدہ شاعر کو بڑھاتا تھا اس لیے اعتدال پسند نقادوں نے رائے دی ہے کہ ”اگر بہترین غزل، حسین تشبیب، خوبصورت الفاظ، سبک اسلوب اور مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کے نقطہ نظر سے تینوں کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو جریر کو سب پر فوقیت حاصل ہوگی“ اور اگر بہترین نثر، بھاری بھر کم الفاظ، دقیق اسلوب بیان، پرشکوہ اور گہمبیر اشعار اور گہرے معانی و مطالب کے اعتبار سے نظر ڈالی جائے تو فرزدق ان میں سب سے بڑا شاعر نظر آئے گا۔ اور ”جس کو فصاحت و بلاغت اور بھجو و مدح میں کمال کے ساتھ، شراب و کباب اور یاران مے کدہ کا وصف زیادہ پسندیدہ ہو اسے اخطل کے کلام میں زیادہ لطف آئے گا“۔

علاوہ ازیں اگر تینوں شعرا کے اسالیب بیان کو سامنے رکھ کر مطالعہ کریں تو بقول شوقی ضیف ہمیں نظر آئے گا کہ اخطل کی ساری توجہ الفاظ کی سچ و صحیح اور ان کی ترتیب و تنقیح پر مرکوز رہتی ہے اور اس طرح وہ زمانہ جاہلیت کے شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ کے مکتب فکر کا آدمی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے برخلاف فرزدق الفاظ کے بناؤ سنگھار پر زیادہ زور نہیں دیتا، بلکہ اکثر غیر روایتی انداز کے ساتھ گراوٹ اور ابتداء پر اتر آتا ہے جو نتیجہ ہے اس کی طبیعت کی سختی، خشکی، اکڑ پن اور رعونت و بددماغی کا۔ مگر اس کے ساتھ شعر کی پرکھ، اچھے برے کی پہچان میں اس کی بالغ

نظری کا جواب نہیں، یہاں تک کہ بعض وقت وہ کسی پسندیدہ شعر کا ایسا چربہ کھینچتا تھا کہ نقل کو اصل سے بڑھا دیتا تھا۔ ان باتوں کے علاوہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت جس میں اس کا مقابلہ اس کے معاصرین میں سے کوئی نہیں کر سکتا وہ یہ کہ وہ پرشکوہ اور بھاری بھر کم اور موٹے الفاظ کے تانے بانے سے ایسا مہیب ہیولی تیار کرتا ہے کہ خود بخود گردنیں اس کے آگے جھک جاتی ہیں۔ اب رہا جریر کا انداز بیان تو ہلکے پھلکے سبک اور رسیلے الفاظ کے ذریعہ ساز و آہنگ کا ایسا مرقع تیار کرنے میں اس کا جواب نہیں جس کی موسیقیت اور نغمگی دیر تک کانوں میں رس گھولتی رہتی ہے، اور اثر اندازی کا یہ عالم ہے کہ جرعبائے صبح کی طرح نس نس میں سرایت کرتی جاتی ہے جو اعلیٰ ذوق اور صاف ستھرے مذاق کی غمازیرا کرتا ہے اور یہ دین ہے قرآن کریم اور اس کے معجم نما اسلوب بیان اور اس سے تاثر پذیری کا، کہ جریر طبعاً بڑا نیک، بھلامانس، خوش خصال اور نرم خو ہونے کے ساتھ بڑا دیندار آدمی بھی تھا۔ اس لیے اس کے یہاں سختی، کرختگی اور خشونت نہیں ملتی۔ اشعار پڑھیں تو ایسا لگتا ہے کہ ایک سبک سیر صاف و شفاف بل کھاتی لہراتی ندی لہروں کے ساز پر ایک لاهوتی نغمہ گاتی رواں دواں ہے، جس کی سمیں صدائے بازگشت دل و جان کے لیے فردوس گوش اور نظر و فکر کے لیے جنت نگاہ ہے۔

نقائض کے چند اشعار بطور نمونہ:

فرزدق کہتا ہے:

بیتا دعائمہ أعز واطول
حکم السماء فانه لا ينقل
ومجاشع وأبو الفوارس نهشل
والاکرمون إذا يعد الأول
أبدا إذا عد الفعال الأفضل
والسابعات لدى الوغى نتسربل

ان الذي سمك السماء بني لنا
بیتا بناه لنا المليك وما بني
بیتا زارة محتب بفناء ه
الاکثرون إذا يعد حصاهم
لايحتبي بفناء بيتك مثلهم
حلل الملوك لباسنا في ارضنا

فرزدق کے قصیدہ کے جواب میں جریر کا قصیدہ:

فسقیت آخرهم بكأس الاول
وضغالبعيث جدعت أنف الاخطل
وبني بناء ك في الحضيض الاسفل
حتى اختطفتك يا فرزدق من عل
ويفوق جاهلنا فعال الجهل
فهدمت بيتكم بمثلي يذبل
دنسا مقاعده خبيث المدخل

أعددت للشعراء سما نافعا
لما وضعت على الفرزدق ميسمي
أخزى الذي سمك السماء مجاشعا
اني انصبت من السماء عليكم
احلامنا تزن الجبال رزانة
ولقد بنيت أحس بيت بيتي
بیتا يحمم قينكم بفناء ه

12.7 شعر اموی کی خصوصیات

عصر اموی کے اشعار کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس دور کے شعر قرآنی الفاظ سے معمور اور اسلامی معانی سے لبریز نظر آتے ہیں اور اس کا اثر تمام شعرا میں اور خاص طور پر خوارج اور شیعہ کے شعرا میں پایا جاتا تھا۔

عصر اموی کے شعر کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ اس دور کے اشعار اور قصیدوں کے الفاظ نہایت آسان اور رقیق ہوا کرتے تھے، سوائے رجز کے کیونکہ شعرا اس صنف میں بہت سخت الفاظ استعمال کرتے تھے۔

اغراض و مقاصد کے اعتبار سے اس دور کا اسلوب عصر جاہلی اور عصر اسلامی سے مختلف نہیں تھا، وہی عبارت کا انداز اور وہی الفاظ کی رقت اور نمانوسیت۔ اس عصر میں شاعر اپنے قصیدہ کی ابتدا نسیب، محبوب کے دیار کا ذکر اور اس کے کوچ کرنے کے واقعات سے کرتا تھا۔ اس کے بعد فخر یہ کلام قصیدہ کا اہم جز ہوتا تھا جس کے بعد شاعر قصیدے کے بنیادی موضوع جیسے مدح، ہجو، تعزیت وغیرہ کی جانب ملتفت ہوا کرتا تھا۔

جمیل بیتیۃ کے اشعار بطور نمونہ

لقد لامني فيها اخ ذو قرابة	حبيب اليه في ملامته رشدي
وقال: افق! حتى متي هائم؟	بشنة فيها قد تعيد وقد تبدي
فقلت له: فيها قضى الله ما تری	علي! وهل فيما قضى الله من رد؟
فان یک رسدا حبها او غواية	فقد جئته، ما كان مني على عمد
لقد لج ميثاق من الله بيننا	وليس لمن يوف الله من عهد
فلا وابيها الخیر ما خنت عهدها	ولا لي علم بالذي فعلت بعدي
وما زادوها الواشون الا كرامة	علي، وما زالت مودتها عندي

12.8 اموی دور کے مشہور شعرا

12.8.1 عمر بن ربیعہ (۹۳-۲۳۳ھ/۷۱۲-۶۴۴ء)

12.8.1.1 پیدائش و حالات زندگی

ابوالخطاب عمر بن عبداللہ بن ابی ربیعہ قریشی مخزومی کی پیدائش مدینہ میں اسی رات کو ہوئی جس رات حضرت عمرؓ کا وصال ہوا۔ اسی لیے حضرت عمرؓ کے نام پر اس کا نام اور ان کی کنیت پر اس کی کنیت رکھی گئی۔ لوگ اس کی پیدائش کے حوالہ سے کہا کرتے تھے ”کتنا بڑا حق اٹھ گیا، اور کون سا باطل اس کی جگہ آگیا۔“

عمر بن ابی ربیعہ کا شمار دور اموی کے نامور اور بلند پایہ شعرا میں ہوتا ہے، وہ اپنے باپ عبداللہ کی محبتوں، کرم نوازیوں، ناز و نعمت، مال و دولت اور دنیاوی نعمتوں کے آغوش میں پرورش پا کر جوان ہوا۔ عمر کے والد عبداللہ جو اسلامی خلافت کے مختلف ادوار میں گورنر کے منصب پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ آسودہ حال سردار تھے جس کی وجہ سے عمر بن ابی ربیعہ کی زندگی میں مال و آسائش، آسودگی اور فارغ البالی کے آثار

نمایاں نظر آتے ہیں۔

12.8.1.2 شاعری کی ابتدا

عمر بن ابی ربیعہ کی طبیعت بچپن ہی سے شعر و شاعری اور ہولعب کی جانب مائل تھی۔ نیز معاشی آسودگی اور زندگی کے نشیب و فراز سے بے فکری نے بھی اس کی شاعری کو جلا بخشی۔ بچپن ہی سے شاعری کے آثار اس میں نمودار ہونے لگے تھے اور وہ یکسوئی کے سے شعر و شاعری میں مشغول ہو گیا جس کی وجہ سے چھوٹی عمر میں ہی شاعری کا ملکہ اس میں پختہ ہو گیا۔ شاعری کے مختلف موضوعات پر اس نے طبع آزمائی شروع کی اور مسلسل شاعری کی مشق کرتا رہا اور مشکلات شاعری کو آسان کرنے میں کوشاں رہا، حتیٰ کہ شاعری اس کے سامنے جھک کر اس کی تابع اور مطیع ہو گئی اور جب جریر نے اس کا رائیہ قصیدہ سنا، جس کا مطلع ہے:

امن آل نعم انت غاد فمبکر
غداة غدا، ام رائج فمجر

تو اس نے کہا: ”یہ قریشی تو تک بندی کرتے کرتے اب عمدہ شاعری کرنے لگا ہے“۔ عمر کی یہ غزل واقعی معانی و مطالب، اسلوب نگارش اور الفاظ کے سچ دھج کے نقطہ نظر سے بڑی حسین، مؤثر اور دل آویز ہے۔ اس نے نہ صرف عمر کو قادر الکلام اباجی غزل گو شاعری کی حیثیت سے شہرت دوام بخش دی بلکہ عربی ادب میں محاکاتی اور حقیقی غزل کی ایسی نئی صنف کو جنم دیا جس کے لیے شعرا مستقل طبع آزمائی کرتے رہے تھے لیکن بقول جریر ”محبوبہ کے کھنڈرات میں بھٹک کر رہ گئے“۔

اس غزل کی کامیابی کے بعد عمر کی زبان اور قلم دونوں چل نکلے۔ چنانچہ عمر اب بے روک ٹوک محبت کے نغمے غزل کی زبان میں گاتا اور صرف رمز و اشارہ میں نہیں بلکہ اعلیٰ اور شریف گھرانوں اور مکہ و مدینہ کے معزز اور با حیثیت لوگوں کی لڑکیوں کے نام لے کر علانیہ اظہار عشق کرتا۔ چنانچہ اس زمانہ کی کوئی دوشیزہ یا خوبصورت عورت ایسی نہیں تھی جسے اس نے تشبیب نہ کیا ہو حتیٰ کہ اس نے اشراف قوم کے مستورات کو بھی نہیں چھوڑا جن میں عبدالملک بن مروان کی لڑکی فاطمہ، الولید بن عتبہ بن ابی سفیان کی بیوی لبابہ، عائشہ بنت طلحہ، ہند بنت الحارث المری، ثریا بنت علی بن عبداللہ بن الحارث، زینب بنت موسیٰ الحجی، زینب کی چچا زاد بہن نعم، رملہ بنت عبداللہ بن خلف خزاعیہ، فاطمہ بنت محمد بن اشعث کندی لیلی بنت حارث بکر یہ، شیخ انخوابو الاسود دؤلی کی اہلیہ بھی شامل ہیں۔

12.8.1.3 عورتوں کا شاعر

عمر بن ابی ربیعہ کو عورتوں کا شاعر کہا جاتا ہے۔ اس کے دیوان کا بیشتر حصہ غزل پر مشتمل ہے۔ صاحب اغانی نے ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ سلیمان بن عبدالملک نے عمر بن ابی ربیعہ سے دریافت کیا: ”ہماری مدح سے تمہیں کس چیز نے روکا ہے؟“ اس نے جواب دیا: ”میں آدمیوں کی مدح نہیں کرتا ہوں میں صرف عورتوں کی مدح کرتا ہوں“۔

شاعری میں عمر ابن ابی ربیعہ نے غیر مانوس و نا آشنا طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں عشقیہ مضامین افسانوی انداز میں پیش کرتا تھا جس میں وہ عورتوں کے اوصاف، باہمی گفتگو اور آپسی ہولعب کو خوشنما الفاظ اور پراثر انداز میں پیش کرتا تھا۔ اس نے شاعری کو عورت، عورتوں کی باہمی ملاقات، عورتوں کے محاسن و اوصاف، آپس کی چھیڑ چھاڑ اور دل لگی کے جھوٹے اور سچے واقعات بیان کرنے میں محدود کر دیا

اور وہ ان مضامین کو نہایت خوش نما الفاظ عمدہ وصف، پختہ بندش اور انوکھے پیرایہ میں ادا کرتا ہے۔ اس کے اشعار الفاظ کے اعتبار سے بہت و آسان ہوتے تھے لیکن معانی کے اعتبار سے زیادہ مؤثر نہ ہونے کے باوجود دل پر اثر انداز ہوتے تھے اسی لیے نوجوان اور عوام الناس اس کی شاعری کے دل دادہ ہو گئے اور گانے والیوں اور مے نوشوں میں اس کو بڑی مقبولیت حاصل ہو گئی۔ عوام الناس میں اس کی شاعری خوب گائی اور سنائی جانے لگی حتیٰ کہ غیرت مندوں اور زاہدوں نے اس کے خلاف شور مچا دیا۔ ابن جریج کا قول ہے کہ نوجوان لڑکیوں کے پردہ میں ابن ابی ربیعہ کی شاعری سے زیادہ مضرت رساں کوئی چیز داخل نہیں ہوئی۔ اسی لیے خاندان کے بزرگ اس کے اشعار سے نوجوانوں اور خاص طور سے غیر شادی شدہ لڑکیوں کو بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ روایت ہے کہ ظبیہ نامی ایک باندی عمر کی بعض غزلیں بغل میں دبائے اپنی مالکن فاطمہ بنت عمر بن مصعب کے پاس جا رہی تھی، فاطمہ کے دادا عبداللہ صحن میں بیٹھے تھے جب انھوں نے باندی کے بغل میں کاغذات دیکھے تو بولے کہ یہ کیا ہے؟ باندی نے جواب دیا یہ عمر کے اشعار ہیں۔ تو وہ غصہ میں بولے کہ تیرا ستیا ناس ہو تو عورتوں کے پاس عمر کے اشعار لے کر جا رہی ہے۔ اس کے اشعار تو دل و دماغ کی پنہائیوں میں گھس جاتے ہیں، اور اگر اشعار جادو کا کام کر سکتے ہیں تو یہ صفت اس کے اشعار میں پوری طرح پائی جاتی ہے، تم ان کو لے کر واپس جاؤ، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

اس قصہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عمر کا کلام عورتوں اور مردوں میں کتنا مقبول اور مؤثر تھا اور یہ کہ لڑکیاں اس کو حاصل کرنے کے لیے کتنا اہتمام کرتی تھیں اور بڑے بڑھے ان کو اس کے کلام سے بچانے کی ہر امکانی کوشش کرتے تھے۔

عمر بن ابی ربیعہ شاعری کو ذریعہ بنا کر اپنی شرارت میں اس حد تک سرکش ہو گیا تھا کہ وہ ایام حج میں عمدہ لباس اور زیب و زینت اختیار کر کے حج کرنے والی عورتوں کے پیچھے لگ جاتا، باعزت عورتوں اور شہزادیوں سے شاعری میں اظہار محبت کرنے لگتا، اور طواف و احرام میں مصروف خواتین کے اوصاف بیان کرتا یہاں تک کہ اس کے خوف سے شریف خاندانوں کے عورتوں نے فریضہ حج ادا کرنے میں کمی کر دی تھی۔ اس کی شرارتوں سے تنگ آ کر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسے یمن و حبشہ کے درمیان واقع ایک جزیرہ ”دھلک“ میں جلاوطن کر دیا جہاں بنو امیہ مجرموں کو بھیج کر جلا وطنی کی سزا دیا کرتے تھے۔ پھر جب تک اس نے عشق بازی چھوڑنے کی پختہ قسم نہ کھائی اور خلوص دل سے توبہ نہ کی اسے وہاں سے واپس آنے کی اجازت نہیں ملی۔

12.8.1.4 عمر بن ربیعہ کے اشعار کی فنی تقسیم

عمر کے اشعار جو عمر کی محبت کا اہم مصدر ہیں، تین حصوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں:

عمر کے کلام کی ایک قسم تو ان فنی اشعار کی ہے جنہیں عمر نے اپنے کسی دوست کی یا دوست عورتوں میں سے کسی ایک کی فرمائش پر، یا اپنے معاصر شعرا یا ادبا میں سے کسی کے ذوق شعری کو پورا کرنے کے لیے کہے ہیں۔

دوسری قسم ان اشعار کی ہے جن میں جنسی اور حسی محبت کی چھاپ ہے جس میں عاشق جسمانی حسن کا دلدادہ دکھائی دیتا ہے، اور حسینوں سے صرف لطف اندوزی اور مطلب برآری اس کا مقصد ہوتا ہے۔

عمر کے کلام کی تیسری قسم وہ ہے جو عمر کی حقیقی اور سچی محبت کی آئینہ دار ہے چنانچہ ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ محبت اس کے دل و دماغ، اس کی زبان، اس کی حس اور فکر و نظر سب پر چھائی ہوئی ہے۔ یہ محبت، محبوباؤں کے اختلاف کے ساتھ مختلف رہتی ہے، چنانچہ اگر اس

نے ایک سے زیادہ عورتوں سے اظہار محبت کیا ہے تو اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ وہ محبت کو جانتا ہی نہ تھا بلکہ اس کے برخلاف ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ لڑکیوں کی محبت میں گرفتار ہوئے اور اس کی وجہ سے بڑی قلبی کش مکش میں مبتلا ہوئے۔

12.8.1.4 شاعری کی خصوصیات

عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری میں فصیح الفاظ، آسان معانی بہترین اسلوب، عمدہ پیراہن و دیگر فنی خصوصیات کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری میں بلند افکار اور وسعت خیالی نہیں پائی جاتی ہے کیونکہ اس کی شاعری عشقیہ کلام اور یا وہ گوئی پر زیادہ مشتمل ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اس کی شاعری دل کے اندر پہنچ کر انتہائی رقت طاری کر دیتی ہے کہ اس کی زبان بہت آسان ہے۔ اس کے خوش نما لفظ، عمدہ وصف، پختہ بندش اور مضامین کی زود فہمی میں اسے کمال حاصل تھا۔ جمال کی تعریف اور عورتوں کے وصف میں اس کی شاعری لوگوں کی طبیعتوں سے ہم آہنگ اور ان کی خواہشات کے مطابق ہے۔ وہ اپنے نسب، شباب اور اپنی دولت و آسودگی کے باعث ایسی باتوں کے بیان کرنے میں کامیاب ہو گیا جنہیں کوئی دوسرا بیان کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔ نیز عمر بن ابی ربیعہ میں فریفتگی، دل کو موہ لینے، انسانی نفسیات کو گرویدہ کرنے اور حاجت کی تکمیل کی خوبی موجود تھی، یہ باتیں کسی اور شاعر کے اشعار میں نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جس قدر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ابن ابی ربیعہ کی کے اشعار سے ہوئی ہے کسی اور کے اشعار سے نہیں ہوئی ہے۔

علاوہ ازیں اس کے اشعار میں پایا جانے والا قصہ اور افسانوی اسلوب بھی اسے منفرد بناتا ہے جس میں وہ عورتوں کی گفتگو، اشارات، حرکات اور اوصاف کا ذکر کرتا ہے۔ اس وصف میں وہ امرؤ القیس جیسے بلند پایہ شاعر سے بھی فوقیت لے گیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری میں شعری روایات اور اصول سے زیادہ عورتوں کے ذکر کا اہتمام پایا جاتا ہے۔

عمر بن ابی ربیعہ کو تمام غزل گو شعرا میں یہ امتیاز حاصل تھا کہ اس نے عشق و محبت، اس کے احوال و کیفیات اور دل و دماغ پر اس کے اثرات کا صحیح اور بے لاگ نقشہ کھینچا ہے۔ عورتوں کے حسن و شباب، ان کے انداز و اطوار، ان کی دلداری و دلنوازی اور رنگینی و رعنائی کا بہت حسین اور کیف آور تصویر کشی کی ہے۔ ان کی آپس کی چھیڑ چھاڑ، خود بینی و خود ستائی اور عشوہ و ناز و ادا کے بہت رنگین اور جذبات انگیز قصے بیان کیے ہیں۔ ہجر و فراق کی تپش اور سوز دروں کی حکایت خونچکاں بڑے دلور انداز میں بیان کی ہے۔ دوسری طرف وصال کی جاں فزا، روح پرور اور رنگین اوقات کا بہت والہانہ انداز سے ذکر کیا ہے۔ معاملہ بندی اور نسوانی مکالمہ نگاری میں اس نے وہ کمال فن دکھایا ہے جس کی مثال عربی شاعری میں مشکل سے ملتی ہے۔

عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری میں گہرے افکار اور بلند خیالات کی کمی پائی جاتی ہے اور اس میں کوئی جدت نظر نہیں آتی ہے۔ جذبات کو اس نے شاعری میں جگہ تو دی ہے لیکن وہ بھی سطحی نظر آتے ہیں ان میں بھی کوئی گہرائی نظر نہیں آتی ہے۔ ایک اور اہم چیز جو فنی اعتبار سے اس کی شاعری منزلت کو متاثر کرتی ہے وہ ہے ”تکرار“۔ ایک ہی فکر اور ایک انداز کا بار بار ذکر کرنا شاید اس وجہ سے بھی زیادہ رہا کہ عمر بن ابی ربیعہ کے شعر کا محور عام طور پر صرف عورت ہی ہوا کرتی تھی۔ علاوہ ازیں اس کی اشعار میں کثرت سہولت کی بنا پر فتور بھی طاری ہو جاتا تھا اور بسا اوقات اس سے اشعار میں قواعد کی غلطیاں بھی سرزد ہو جاتی تھیں۔

اس کی شاعری میں رقت، سہولت، لہو و لعب اور موسیقی کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے جسے وہ حالات اور شخصیتوں کے پیش نظر مختلف اور متنوع

شعری بحروں میں پیش کرتا تھا مثلاً بحر خفیف، بحر منسرح، بحر مل، بحر طویل وغیرہ جس کی وجہ سے گانے والوں اور نوجوانوں میں اس کا کلام زیادہ مقبول رہا ہے جن میں بطور خاص ابن سرتج اور غریض شامل ہیں۔ اگر اس کی شاعری کو محبت کی زبان سے تعبیر کیا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔

عمر بن ابی ربیعہ کا شعری دیوان ہے جو ہزاروں اشعار پر مشتمل ہے جو تمام کے تمام غزل ہی میں ہے سوائے چند اشعار کے جن کا موضوع فخر اور وصف ہے۔ اور یہ دیوان لپسک میں ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مصر میں ۱۸۹۳ء اور بیروت میں ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔

12.8.2 اخطل (۹۰-۱۹ھ/۷۰۸-۷۲۰ء)

12.8.2.1 پیدائش اور حالات زندگی

ابو مالک غیاث بن غوث تغلبی اپنی قوم بنی تغلب میں بمقام ”حیرۃ“ میں حضرت عمرؓ کی خلافت میں عیسائی مذہب پر پیدا ہوا۔ اس کا لقب اخطل اور ذوالصلیب تھا۔ مؤخر الذکر لقب نصرانی مذہب اور صلیب کو لٹکانے کی وجہ سے پڑا تھا۔ بچپن ہی میں وہ ماں کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گیا اور سوتیلی ماں کی سوء تربیت نے اسے اخلاقی برائیوں میں مبتلا کر دیا اسی لیے وہ بڑا ہو کر منہ پھٹ، زبان دراز، بدنیت اور شرابی بن گیا۔

12.8.2.2 شاعری کی ابتدا

اخطل کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے بڑی رغبت تھی اور ابتدائی زمانہ ہی سے اس میں شاعری کے آثار نمودار ہونے لگے تھے، چنانچہ اس نے قبیلہ تغلب کے شاعر کعب بن جمیل سے ہجو یہ شاعری میں مقابلہ کیا اور اسے شکست فاش سے دوچار کر کے گنہگاروں کی وادیوں میں دھکیل دیا جس کے باعث اس کا چرچا لوگوں میں ہونے لگا۔ ایک مرتبہ عبدالرحمن بن حسان بن ثابت انصاری نے حضرت معاویہ کی صاحبزادی رملہ کی اپنے اشعار میں تشبیب کی جس سے ناراض ہو کر یزید بن معاویہ نے انصار کی ہجو گوئی کے لیے کعب بن جمیل کو بلایا تو کعب انصار کے انتقام سے ڈر گیا اور اس نے یزید کو اخطل کا نام بتایا اور کہا کہ اخطل کو اس باب میں زیادہ ملکہ حاصل ہے۔ اخطل نے انصار کے خلاف ہجو گوئی کی اور یہی سلسلہ اس کی بلند اقبالی اور شہرت کا ذریعہ بن گیا۔ انصار کے خلاف کہے جانے والے کچھ اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:

وإذا نسبت ابن الفریعة خلته	کالجحش بین حمارة و حمار
خلوا المکارم، لستم من أهلها	وخذوا مساحیکم، بنی النجار
ذهبت قریش بالمکارم کلها	واللؤم تحت عمائم الأنصار

ترجمہ: یعنی اگر تم الفریعة (حضرت حسان کی ماں) کے بیٹے کا حسب نسب معلوم کرنے کی کوشش کرو تو تمہیں وہ ایک گدھے اور ایک گدھی کے بیچ میں ایک گدھے کا بچہ دکھائی دے گا۔ اے بنو نجار بڑائی اور بھلائی کے کاموں کو چھوڑ دو، یہ سب تمہارے بس کی باتیں نہیں ہیں اور اپنے پاٹوں کو سنبھالو۔ بڑائی اور بھلائی کے تمام کاموں کو قریش لے گئے اور کمینگی انصاریوں کے عماموں کے نیچے رہ گئی۔

کہتے ہیں جب اس ہجو یہ قصیدہ کی شہرت ہوئی تو نعمان بن بشیر انصاری، جو حضرت معاویہؓ کے ساتھ جنگوں میں شریک ہو چکے تھے اور حضرت معاویہ نے گورنری اور دوسرے بڑے عہدوں سے بھی نوازا تھا، حضرت معاویہؓ کے پاس آئے اور اپنا عمامہ اتار کر کہا کہ معاویہ دیکھو اس پر کہیں کمینگی دکھائی دے رہی ہے؟ حضرت معاویہؓ اس عجیب سوال سے کچھ گھبرا سے گئے، اور بولے کہ ”آخر قصہ کیا ہے، کچھ تو کہو؟“ اس پر

نعمان نے کہا کہ اخطل نے ہماری ہجو میں اتنی بیہودہ بات کہی ہے کہ ہماری عزت ہمیشہ کے لیے جاتی رہی، اور پھر ان کو وہ اشعار سنائے۔ حضرت معاویہؓ نے کہا کہ ہاں یہ تو بہت بری بات ہے، بولو کیا چاہتے ہو؟ نعمان نے کہا ”اس کی زبان“، حضرت معاویہؓ بولے ”دے دی“ اور اخطل کی زبان کٹوانے کا وعدہ کیا۔ جب یہ خبر اخطل کو پہنچی تو اس کے ہوش جاتے رہے وہ بھاگا ہوا یزید کے پاس آیا، یزید، معاویہ کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ میں اپنی طرف سے اور آپ کی طرف سے بھی اس کی جاں بخشی اور حفاظت کا ذمہ لے چکا ہوں، اب اس کی لاج آپ رکھ لیجیے اور معاف کر دیجیے۔ یہ سن کر حضرت معاویہؓ نرم پڑ گئے اور کچھ نہ کر سکے۔ اور اس واقعہ کے بعد اخطل، یزید کا ہم دم و دم ساز بن گیا اور اس کی ولی عہدی سے کر حکومت تک اس کی محفل راگ و رنگ کا ساتھی اور ندیم رہا اور ان کی شان میں قصیدے کہتا رہا۔ اس طرح بنو امیہ کے پاس اخطل کا مقام و مرتبہ بلند ہوتا گیا اور بنو امیہ اسے اپنی بخششوں سے نوازتے اور احسانات سے مالا مال کرتے تھے۔ عبد الملک بن مروان کے زمانہ میں بھی اس کی قدر و منزلت میں بہت اضافہ ہوا۔ عبد الملک نے اسے ”بنو امیہ کا شاعر“ اور ”میر المؤمنین کا شاعر“ جیسے ذی قدر القابات سے نوازا۔ اس کی بے تکلفی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ وہ اپنی ریشمی عبا پہنے، گلے میں طلائی صلیب ڈالے، ڈاڑھی سے شراب ٹپکاتے ہوئے بلا اجازت۔ عبد الملک بن مروان کے دربار میں داخل ہو جاتا تھا۔

12.8.2.3 اخطل کی شاعری

اخطل اپنی شاعری میں کافی مراجعت اور تبدیلی کیا کرتا تھا، نیز اپنے اشعار کو ناقدین کے پاس پیش کر کے اس میں سے نامناسب اور ردی اشعار کو خارج کر دینا تھا اسی لیے اس کے اشعار حسو اور عیوب سے خالی ہوتے تھے۔ فصیح الفاظ، قوی اسلوب اور عمدہ پیراہن اس کے اشعار کی خصوصیت ہے، اسی طرح وہ اپنی شاعری میں عمدہ مدح کرنے، شراب اور شکار کا وصف بیان کرنے، ہجو میں کم فحش آمیزی کرنے میں بھی ممتاز ہے، نیز اسے اپنے طویل قصائد میں بے ضرورت الفاظ کی بھرتی اور دیگر خامیوں کے نہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی طبیعت میں غور و فکر اور چھان بین کا مادہ زیادہ ہونے کی وجہ سے بھی بہترین شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اخطل شعری میدان میں زہیر بن ابی سلمیٰ، اعشیٰ اور نابغہ ذبیانی سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے اور ان کے علاوہ کسی کو اپنے سے بلند و برتر نہ سمجھتا تھا۔ اس کے اشعار میں ان کے اسلوب کی پیروی کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

12.8.2.4 اخطل کی امتیازی خصوصیات

اخطل نے اس زمانے میں مروج اصناف سخن میں سے تقریباً ہر ایک پر طبع آزمائی کی ہے جیسے مدح، ہجو، فخر اور وصف۔ ان میں سے مدح، ہجو اور شراب و کباب کے وصف میں اس نے فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ مرثیہ میں بھی اس کے دو چار شعر ملتے ہیں کہ اس کا طبعی رجحان اس طرف نہ تھا۔ یزید کے انتقال پر بھی اخطل مرثیہ کے چار شعر سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا جس نے اس کو گمنامی کے گڈھے سے نکال کر ترقی کے بام عروج پر پہنچا دیا تھا۔

اخطل جاہلی شعرا کی ریت کے مطابق اور خاص طور سے زہیر بن ابی سلمیٰ کی طرح اپنے قصیدوں کو نوک پلک سے درست کرنے کا عادی تھا۔ چنانچہ زہیر کی طرح نوے (۹۰) یا سو (۱۰۰) شعر کے ایک مدحیہ قصیدہ میں کتر بیونت اور اصلاح و ترمیم کرتے کرتے کبھی صرف تیس شعر

رہنے دیتا اور باقی سب کاٹ دیتا تھا۔ قصیدہ پر نظر ثانی کرنے میں وہ زہیر ہی کی طرح کبھی کبھی ایک قصیدہ میں پورا ایک سال لگا دیتا، چنانچہ جو قصیدے اس طرح نکھر کر سامنے آتے تھے وہ زبان و بیان اور اسلوب کے اعتبار سے نمونے ہوتے تھے۔ اسی لیے ایک صاحب نظر ناقد نے کہا تھا کہ ”اگر اخطل کو جاہلی دور کا ایک دن بھی مل جاتا تو میں اس کو تمام جاہلی شعرا پر فوقیت دے دیتا“۔ اس کی وجہ صرف جاہلی شعرا کی پیروی ہی نہیں بلکہ بقول ڈاکٹر طہ حسین ”قرآن کا فیض اور اس کا اثر بھی ہے“ کیوں کہ وہ اس کے مدوحین کی زبان ہونے کے علاوہ عربی زبان کا اعلیٰ نمونہ بھی تھا۔

اپنے دونوں ہم عصروں اور حریفوں فرزدق اور جریر کے مقابلہ میں اس کا کلام بہت کم ہے، اس کے صرف سات لمبے قصیدے ملتے ہیں، اس کے برخلاف اس کے حریفوں کا کلام کہیں زیادہ ہے، اسی لیے بعض نقاد اس کا مقابلہ اس کے دونوں حریفوں سے کلام کے مقدار میں نہیں کرتے ہیں کہ اس اعتبار سے اخطل کا درجہ بہت کم ہو جائے گا۔

ہشام بن عبد الملک کو اموی خلفا میں شعر و شاعری کا بڑا پاکیزہ ذوق اور اس میں بڑی گہری ناقدانہ نظر تھی۔ ایک دفعہ اس نے عہد اموی کے تینوں معاصر شعرا کے بارے میں خالد بن صفوان کی رائے پوچھی، تو اس نے اخطل کے بارے میں بڑی نپلی بات کہی: ”أما أحسنهم نعتاً، وأمدحهم بيتاً، وأقلهم فوناً، الذي إذا هجا وضع، وإذا مدح دفع فلا أخطل“۔ یعنی ان سب میں وہ شاعر جو وصف میں اور مدح میں سب سے بہتر اور غلطی کرنے میں سب سے کمتر، جو اگر ہجو کرتا تو گرا کے رکھ دیتا تھا اور مدح کرتا تو آسمان پر پہنچا دیتا تھا، تو وہ اخطل ہے۔

فنی خصوصیات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کے اشعار میں خوش نما الفاظ، آسان معانی اور پختہ اسلوب کے ساتھ اخطل ایک حسی خیال کا شاعر تھا جس میں وہ جذبات اور عاطفہ کے بجائے عقل پر زیادہ اعتماد کرتا تھا اسی لیے اشعار میں طبیعت پر اعتماد کرنے کے بجائے ہر شعر پر بذات خود غور و فکر کر کے اس میں عمدہ تعبیر اور تصویر پیش کرتا تھا۔ نیز اضافی اور لایعنی چیزوں سے بھی اپنے اشعار کو پاک و صاف کرتا تھا جس کی بنا عمدہ اسلوب اور عبارت اس کے کلام کا خاصہ بن گئے تھے جس میں عقل کی حکمرانی اور ذاتیت کا اثر نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں تاریخی اعتبار سے بھی اخطل کے اشعار بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ اخطل نے اشعار میں جاہلیت کے آثار کے ساتھ ساتھ جریر اور فرزدق کے قوموں کے احوال کو بھی بہترین انداز میں بیان کیا ہے۔ نیز اخطل کی شاعری میں عصر اموی کے حالات، سیاسی جماعتوں اور عصبيت کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

12.8.3 فرزدق (110-119ھ/ ۷۲۷-۶۴۰ء)

12.8.3.1 پیدائش اور حالات زندگی

ابو فراس ہمام بن غالب بن صعصعہ تمیمی داری حضرت عمرؓ کی خلافت میں مقام کاظمہ میں پیدا ہوا اور وہیں ابتدائی زندگی گذاری۔ چونکہ اس کا چہرہ زیادہ خوبصورت نہیں تھا اسی لیے اس کا لقب ”فرزدق“ پڑ گیا۔ فرزدق آغوش ادب میں پلا اور فصیح ماحول میں پروان چڑھا، اس کا باپ اسے اشعار پڑھانے اور شاعری سکھانے لگا حتیٰ کہ پندرہ سال کی عمر میں جب اس کی طبیعت شعر و شاعری کے لیے موزوں اور زباں رواں ہو گئی تو وہ اسے حضرت علیؓ کی خدمت میں لے گئے، حضرت علیؓ نے اس کے باپ سے کہا: ”اسے قرآن پڑھاؤ کہ وہ اس کے لیے بہتر ہے“۔ یہ بات

فرزدق کے ذہن میں بڑھاپے تک جمی رہی اور اس نے حفظ قرآن کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اس نے گھر آ کر اپنے آپ کو زنجیر سے باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک قرآن حفظ نہ کر لوں گا اپنے آپ کو نہیں کھولوں گا، چنانچہ اس نے قرآن حفظ کر کے چھوڑا۔

12.8.3.2 شاعری کی ابتدا

فرزدق میں شاعری کے آثار بچپن ہی سے نمودار ہو گئے تھے چنانچہ کہتے ہیں کہ اس کا سب سے پہلا شعر وہ ہے جو اس نے ایک بھیڑیے کے بارے میں کہا تھا جو اس کے قبیلہ کے ایک مینڈھے کو لے بھاگا تھا۔ کہتا ہے:

تلوم علی ان صبح الذئب ضانها فالوی بکبش وھوفی الرعی راع

یعنی وہ اس بات پر ملامت کرتی ہے کہ بھیڑیا اس کے ربوڑ میں صبح سویرے گھس پڑا اور ایک مینڈھے کو لے بھاگا حالانکہ وہ چراہ گاہ میں چر رہا تھا۔

12.8.3.3 فرزدق کا شعری اسلوب

فرزدق جو بہت بہادر اور سخی تھا اسے اپنے آبا و اجداد پر بڑا فخر اور اپنے خاندان پر بڑا ناز تھا۔ اسے اپنے آبا و اجداد کے بلند کارنامے سنانے کا بڑا شوق تھا حتیٰ کہ وہ خلفا کے سامنے بھی ان کو بیان کرنے سے باز نہ رہتا، یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں فخریہ عنصر غالب ہے۔ فرزدق کا فخریہ کلام پر شوکت الفاظ، شاندار اسالیب، غریب کلمات، نیز عربوں کے مشہور واقعات و انساب کے ذکر اور خانہ بدوشوں کے طرز ادا کا بہترین نمونہ نظر آتا ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جن کی وجہ سے فرزدق کی شاعری کو راویوں نے پسند کیا اور نحویوں نے اس ترجیح دی ہے اور کہا ”اگر فرزدق کی شاعری نہ ہوتی تو عربی زبان کا تہائی حصہ تلف ہو جاتا، نیز ناقصوں نے اسے دور اموی کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ چونکہ فرزدق کا کلام بڑا مشکل اور ترکیبیں بڑی گجک اور معانی و مطالب دقیق اور گہرے ہوتے تھے اسی لیے اس کا کلام عوام کو کم اور علما و ادا با و راہرین نحو و لغت کو زیادہ پسند آتا تھا۔ راویوں نے بیان کیا ہے کہ فرزدق نے اپنے کلام میں تقریباً ۴۰ ہزار مشکل اور شاذ و نادر الفاظ استعمال کیے ہیں۔ فرزدق کو بھی اپنی اس مشکل پسندی کا احساس تھا، چنانچہ وہ تمنا کیا کرتا تھا کہ:

ان تکون له رقة جریر لعہره ولجریر صلابتہ لظہره

یعنی کاش کہ میری بیہودہ گوئی کو جریر کے اسلوب کا سبک پن، اور جریر کی پاک گوئی کو میری صلابت میسر آ جاتی تو دونوں کا کلام ہر اعتبار سے شاہکار ہو جاتا کہ ایک کی کمی دوسری پوری کر دیتا۔ فرزدق چٹان سے اپنا کلام تراشتا تھا اور جریر سمندر سے چلو بھر کر شعر کہتا تھا۔ فرزدق کے اسی اسلوب کی وجہ سے زبان و ادب کی پرانی قدروں اور امتیازی خصوصیات کو محفوظ رکھنے میں جو مدد ملی اس کے بارے میں یہ مقولہ عام طور سے علمی و ادبی حلقوں میں مشہور تھا کہ ”لو لا شعر الفرزدق لذهب ثلث اللغة“، یعنی اگر فرزدق کا کلام نہ ہوتا تو تہائی زبان ختم ہو چکی ہوتی۔

تاریخی اعتبار سے بھی فرزدق کی شاعری نہایت اہمیت کی حامل ہے اور اس کے شعر کو تاریخی مصدر شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے عرب کے زمانہ اور قبائل کے محاسن اور مساوی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اسی لیے بعض مؤرخین کہتے ہیں ”اگر فرزدق کی شاعری نہ ہوتی تو عرب کی آدھی تاریخ ضائع ہو جاتی۔“

فرزدق نے عربی شاعری کے متعدد موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ فرزدق کی شاعری میں ہجوگوئی، مدح سرائی اور فخر کا زیادہ غلبہ رہا ہے لیکن فخریہ اشعار میں وہ تمام شعرا پر سبقت لے گیا ہے۔ نیز تشبیب، غزل اور سیاست میں بھی فرزدق نے طبع آزمائی کی ہے۔ علاوہ ازیں فرزدق ہجوگوئی میں بڑا سخت، وصف کرنے میں جدت طراز، مدح میں درمیانہ اور مرثیہ گوئی میں اچھا نہیں تھا۔ فرزدق نے اشعار کے ذریعہ حجاج، عبدالملک، ان کے بیٹے ولید، سلیمان اور ہشام کے علاوہ دوسرے آل مروان اور دیگر حکمرانوں کی مدح سرائی کی۔

12.8.3.4 شاعری کے ادوار

فرزدق کے کلام کے دو دور ہیں۔ ایک کلام تو اس کی جوانی کا ہے اور دوسرا اس کے بڑھاپے کے زمانے کا۔ جوانی کا کلام جو دراصل اس کے کلام کی صحیح تصویر اور مثالی نمونہ ہے، بڑا پرشکوہ، مبالغہ آمیز، ثقیل اور بھاری بھر کم اور بعض اوقات شاذ الفاظ سے بھی بھرا ہوا ہے اور اسلوب بیان خاصا مشکل اور بعض مواقع پر گجک ہے۔ فخر میں اور خاص طور سے اپنے آبا اجداد پر فخر کرنے میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے اور کبھی کبھار تو خلفا اور بادشاہوں کے سامنے بھی اپنے آبا و اجداد کی ایسی تعریف کرتا کہ ان کو بہت برا لگ جاتا تھا اور وہ بجائے انعام و اکرام دینے کے ڈانٹ ڈپٹ اور دربار نکاسی کا انعام دیتے تھے۔

ایک دفعہ سلیمان بن عبدالملک نے فرزدق سے شعر سنانے کی فرمائش کی، فرزدق نے ایک فخریہ قصیدہ پڑھا جس میں حسب عادت اپنے بات غالب کی تعریف کی اور کہا:

سروا یرکبون الريح وهي تلفهم
إذا استوضحو انارا يقولون ليتها
إلى شعب الأكوار ذات الحقائب
وقد خصرت ایدیهم ، نار غالب

ترجمہ: سخت سردیوں کے زمانے میں جب لوگوں کی انگلیاں گلنے لگتی ہیں اور آگ کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں تو بھی ان کے منہ سے یہی نکلتا ہے کاش یہ آگ غالب (فرزدق کے والد) کی آگ ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ جب مصیبتوں اور پریشانیوں اور قحط سالی و خشک سالی سے دنیا تنگ آجاتی ہے تو ہمارے خاندان کو ہی یاد کرتی ہے کیوں کہ ہم لوگ بڑے سخی داتا اور فیاض ہیں۔ یہ سن کر سلیمان کو غصہ بہت آیا لیکن بولا کچھ نہیں۔ دربار میں ایک دوسرا مشہور شاعر نصیب بھی تھا، سلیمان نے اس سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ اس نے سلیمان کی شان میں ایک بہت شاندار قصیدہ پڑھا، جس میں کہتا ہے:

قفوا خبرونی عن سلیمان انی
فعا جوا فاثنوا بالذی أنت اہله
لمعروف من آل ودان طالب
ولو سکتوا أنت علیک الحقائب

ترجمہ: میں نے تمہارے پاس واپس جانے والے قافلوں سے روک کر تمہارے بارے میں پوچھا تو انھوں نے تمہاری حد درجہ تعریف کی۔ اگر وہ چپ رہتے تو ان کے اونٹوں کے پیچھے لدے بھرے ہوئے بولے پڑتے۔ مطلب یہ کہ تم نے ان کو اتنا انعام و اکرام دیا کہ ان کے اونٹ ان انعامات اور بخششوں سے بوجھل ہو رہے تھے۔

قصیدہ سننے کے بعد سلیمان نے غلام سے کہا کہ نصیب کو انعام میں پانچ سو دینار دے دو، اور فرزدق کو اس کے باپ کی آگ میں جھونک دو، فرزدق یہ سن کر یہ شعر پڑھتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا:

خیر الشعر أشرفه رجالا وشر الشعر ماقال العبيد

ترجمہ: بہترین شعروہ ہے جو شریف (آزاد) لوگ کہے اور بدترین شعروہ جو غلام کہے۔

12.8.3.5 شاعری کی خصوصیات

معانی میں جدت اور ندرت فرزدق کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے کیونکہ وہ ایک ہی معنی کو بار بار ذکر نہیں کرتا تھا۔ اس کے برخلاف جریر کے معانی میں تکرار پایا جاتا ہے۔ نیز خیال کی زرخیزی اور عمدگی کا عنصر بھی فرزدق کے اشعار میں بہت زیادہ پایا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں اس کے اشعار میں الفاظ کی کثرت اور فصاحت بھی حد درجہ پائی جاتی ہے۔ مزید برآں پر شوکت اسلوب، مضبوط تراکیب، فصاحت الفاظ، پختہ معانی اس کے کلام کی نمایاں ترین خصوصیات میں شامل ہیں۔

شاعری کا نمونہ: ان اشعار میں اس نے بھیڑیے کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کا ذکر کیا ہے جس میں مذکورہ بالا شاعرانہ صفات پائی

جاتی ہیں:

دعوت لناری موہنا فاتانی	واطلس عسال وما کان صاحباً
واياک في زادي لمشترکان	فلما دنا قلت: ادن دونک انی
علی ضوء نار مرة ودخان	فبت اسوی الزاد بینی وبنہ
وقائم سیفی من یدی بمکان	فقلت له لما تکثر ضاحکا
نکن مثل من یا ذئب یصطحبان	تعش فان واثقتنی لا تخوننی
اخیین کانا ارضعا بلبان	وانت امرؤیا ذئب والغدر کنتما

عبدالملک کے بیٹے ہشام کے بارے میں بھی روایت ہے کہ وہ بھی بہت باذوق اور ناقدانہ نظر کا مالک تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے ایک دن خالد بن صفوان سے اپنے زمانے کے مشہور شعرا جیسے جریر، فرزدق اور اخطل کے بارے میں اس کی رائے پوچھی تو اس نے بڑے بلیغ انداز میں سب کے اسلوب بیان اور امتیازی خصوصیات بیان کر کے ہر ایک کا صحیح مقام و مرتبہ متعین کیا ہے جو پڑھنے کے لائق ہے۔ خالد بن صفوان نے فخر میں فرزدق کو، وصف اور منظر نگاری میں اخطل کو، اور رموز شعری شنواری اور معانی و مطالب کے سبک پن میں جریر کو فوقیت دی ہے۔

12.8.3.6 نقائض

جریر اور فرزدق کے درمیان ہونے والی شعری معرکہ آرائی کی مدت پچاس سال سے بھی زیادہ ہے۔ اس شاعرانہ معرکہ آرائی میں فرزدق نے اپنے قوم و قبیلہ کی عظمت اور بلند قبالی کا شاندار تذکرہ کیا ہے۔ نیز جریر کی ہجو گوئی کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا ہے۔ نقائض فرزدق کا نمونہ:

بیتا دعائمہ عز وأطول	إن الذی سمک السماء بنی لنا
حکم السماء فإنه لا ینقل	بیتا بناہ لنا الملیک وما بنی

ومجاشع و بو الفوارس نهشل
والأكرمون إذا يعد الأول
بدا إذا عدالفعال الأفضل
والسابغات لدى الوغى نتسريل

بيتا زرارة محتب بفاء ه
الأكثرون إذا يعد حصاهم
لايحتبى بفاء بيتك مثلهم
حلل الملوک لباسنا في أرضنا

فرزدق کے قصیدہ کے جواب میں جریر کا قصیدہ:

فسقیت آخرهم بکأس الأول
وضغالبعيت جددت أنف الأخطل
وبنى بناء ك في الحضيض الأسفل
حتى اختطفتك يا فرزدق من عل
ويفوق جاهلنا فعال الجهل
فهدمت بيتكم بمثلي يذبل
دنسا مقاعده خبيث المدخل

أعددت للشعراء سما نافعا
لما وضعت على الفرزدق ميسمى
أخزى الذي سمك السماء مجاشعا
إني انصبت من السماء عليكم
أحلامنا تزن الجبال رزاة
ولقد بنيت أحس بيت يبتني
بيتا يحمم قينكم بفاء ه

فرزدق بسا اوقات بھوگوئی میں تمام انسانی اقدار اور اخلاقی ضابطوں کی پرواہ نہیں کرتا تھا بلکہ پستی اور دنائت کی حد کر دیتا تھا۔ جریر نے اپنی بیوی کے مرنے پر جب اس کا مرثیہ کہا تو بجائے ہمدردی کے انتہائی بیہودہ انداز میں اس مرثیہ کا جواب دیتا ہے۔ جریر نے مرثیہ میں کہا:

ولزرت قبرك، والحبيب يزار

لولا الحياء لهاجنى استعمار

ترجمہ: اگر شرم و حیاء مانع نہ ہوتی تو شدت غم سے میری آنکھیں آنسوؤں کی لڑیاں پر رونے لگتیں اور بے تحاشا تری قبر کی زیارت کے لیے دوڑ پڑتا کہ محبوب کی زیارت بہر حال کی جاتی ہے۔ اس کا جواب فرزدق نے انتہائی بھونڈے پن سے دیا ہے:

خزى علانية عليك وعار

كانت منافقة الحياة، وموتها

ترجمہ: یعنی وہ تو زندگی بھر منافق رہی، اور اس کا مرجانا تیرے لیے اعلانیہ عار اور شرمندگی کا باعث ہے۔

ایک مرتبہ جریر اور فرزدق عبدالملک کے دربار میں جمع ہوئے، فرزدق نے کہا کہ میری بیوی نوار بنت مجاشع کو تین طلاقیں اگر میں ایسا شعر نہ کہہ سکوں جس کا یہ گدھی زادہ (جریر) کبھی نہ توڑ سکے اور نہ اس پر اضافہ کر سکے۔ عبدالملک نے کہا: اچھا سناؤ، فرزدق نے برجستہ کہا:

بنفسك، فانظر كيف أنت مزاوله

فإني أنا الموت الذي هو واقع

من الموت، إن الموت لا شك نائله

وما أجد يا ابن الأتان بوائل

ترجمہ: میں یقیناً وہ موت ہوں جو ایک دن تم کو آئے گی، اب ذرا سوچو، تم اس سے کیسے بچ سکتے ہو؟ اور اے گدھی زادہ موت سے کوئی بچ کر جا نہیں سکتا کہ موت بلاشبہ اس کو دبوچ کر رہے گی۔

شعراں جریر تھوڑی دیر تک سر جھکا کر سوچتا رہا۔ پھر بولا کہ میری بیوی ام حرزہ کو میری طرف سے تین طلاق اگر میں نے ان اشعار کو

توڑ نہ دیا اور ان پر اضافہ نہ کر دیا۔ عبد الملک نے لطف لیتے ہوئے کہا: اچھا سناؤ، آج تم میں سے کسی ایک کی بیوی پر طلاق پڑ کر رہے گی۔ چنانچہ جریر نے یہ شعر پڑھے:

أنا البدر يغشي نور عينيك فالتمس
بكفك يا بن القين هل أنت نائله
أنا الدهر يفني الموت ، والدهر خالد
فجنني بمثل الدهر شيئا يطاوله

ترجمہ: میں چودھویں کا چاند ہوں جس کی روشنی تمہاری آنکھوں کی بینائی پر چھائی ہوئی ہے، اے لوہار زادے ذرا اپنی ہتھیلیوں سے مل کر دیکھو کیا تم اس روشنی کو چھو لو گے؟ میں زمانہ ہوں جو موت کو بھی فنا کر کے رکھ دیتا ہے اور زمانہ ہمیشہ رہے گا، تو میرے پاس کوئی ایسی چیز لا جو زمانہ کا مقابلہ کر سکے۔

یہ سن کر عبد الملک بولا: ”ابو فراس (فرزدق کی کنیت) خدا کی قسم جریر تم سے بڑھ گیا اور تمہاری طلاق پڑ گئی۔

12.8.3.7 شہرہ آفاق قصیدہ میمیہ

فرزدق اہل بیت سے بے انتہا محبت کرتا تھا اگرچہ دنیاوی مال و اسباب کے لیے بنو امیہ کی بھی مدح کی ہے لیکن دل سے وہ اہل بیت کا احترام کرتا تھا اور ان کی عظمت کا اعتقاد رکھتا تھا جس کا اظہار عمر کے آخری حصہ میں ہشام بن عبد الملک کی ولی عہدی کے زمانہ میں ہوا۔ ایک مرتبہ ہشام بن عبد الملک نے کعبہ کے پاس عوام الناس کو حضرت علی زین العابدین بن حسین بن علیؑ کی خدمت کرتے ہوئے، ان کے چہرہ کو بوسہ لیتے ہوئے اور دعا کی درخواست کرتے ہوئے دیکھ کر سوال کیا: یہ کون ہے؟ حالانکہ وہ انھیں جانتا تھا۔ ہشام کا یہ سوال فرزدق پر بہت گراں گذرا، اس نے جواباً درج ذیل شہرہ آفاق اشعار کہے، جس کے بعد ہشام نے اسے قید کروا دیا۔

هذا الذي تعرف البطحاء وطأته
والبيت يعرفه والحل والحرم
هذا ابن خير عباد الله كلهم
هذا التقي النقي الطاهر العلم
وليس قولك: من هذا؟ بضائره
العرب تعرف من انكرت والعجم
هذا بن فاطمة إن كنت تجهله
بجده أنبياء الله قد ختموا

ترجمہ: یہ وہ ہستی ہے جن کے پاؤں کی چاپ تک کو بطحائے مکہ پہنچاتی ہے اور جسے خانہ کعبہ اور حرم و حل سب پہنچاتے ہیں۔ یہ اللہ کے تمام بندوں میں سب سے اچھے بندے کے بیٹے ہیں اور بذات خود بڑے متقی، پاک باطن، پاک باز اور ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ اسی لیے تمہارے اس کہنے سے کہ ”یہ کون ہے“ ان کا کچھ نہیں بگڑتا، اس لیے کہ جس سے تم نے تجاہل برتا ہے انھیں تو عرب و عجم سبھی خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ اگر تم نہیں جانتے ہو سن لو یہ سیدۃ النساء جگر گوشہ رسول فاطمہ بتول کی اولاد ہیں اور ان کے نانا خاتم الانبیا ہیں۔

12.8.4 جریر (۱۱۰-۲۸ھ/۶۲۸-۶۴۰ء)

12.8.4.1 پیدائش اور حالات زندگی

جریر بن عطیہ بن خطمی تمیمی حضرت عثمانؓ کی خلافت میں یمامہ میں پیدا ہوا۔ اس کی کنیت ابو حرزہ اور ابن المرانہ تھیں۔ وہ دیہات میں

ایک تنگدست گھرانہ میں پل کر بڑا ہوا اس لیے جوان ہونے پر اس کی زبان فصیح، ضمیر صحیح اور طبیعت شعر و شاعری کے سانچہ میں ڈھل گئی۔ اس کے اہل قبیلہ بنوخطمی تنگدستی کے باوجود شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ ایک شاعر غسان سلیطی اس کے قبیلہ کی ہجو کر رہا ہے۔ جریر کی غیرت جوش میں آتی ہے اور وہ سخت ترین الفاظ میں اس شاعر کی ہجو کرتا ہے جس کی وجہ سے جریر کی منزلت اپنی قوم میں بڑھ جاتی ہے۔ جریر کا خاندان بڑا غریب تھا، ان کا پیشہ بھیڑ، بکریاں اور گدھے چرانا تھا چنانچہ جریر بھی چرواہے کا کام کرتا تھا۔ جریر نے اپنی عمر کا اکثر حصہ بادیہ یمامہ میں ہی گزارا، مگر جب اس کے اور فرزدق کے درمیان ہجو گوئی، جھڑپوں اور منافرت کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ اپنے خاندان کے لوگوں کے اصرار پر بصرہ آیا اور دس سال تک جم کر یہاں فرزدق کے خلاف زبان و قلم کا معرکہ گرم کیے رہا۔

12.8.4.2 نقائض کی ابتدا

نقائض کی ابتدا جریر اور غسان سلیطی، جو جریر کا چچا زاد بھائی ہوتا تھا، کے درمیان ہوئی شعری جھڑپ سے ہوتی ہے جس میں جریر غسان کی ہجو کرتا ہے۔ اس کے بعد قبیلہ بنو مجاشع کا شاعر بعیث غسان کی مدد کے لیے آتا ہے لیکن جریر ان دونوں کی ہجو کر کے ان پر غالب آجاتا ہے اور بنو مجاشع کے عورتوں کی بھی سخت ترین ہجو کرتا ہے جس کی وجہ سے بنو مجاشع کی عورتیں فرزدق سے مدد طلب کرتی ہیں اور پھر دونوں کے درمیان تاریخی ہجو گوئی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو پچاس سال سے زیادہ عرصہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس ہجو گوئی میں تقریباً اسی شعرا حصہ لیتے ہیں لیکن جریر سوائے اخطل اور فرزدق کے تمام پر غالب آتا ہے۔

جریر و فرزدق کے شعری نقائض کا نمونہ۔ فرزدق کہتا ہے:

إن الذي سمك السماء بنى لنا	بيتا دعائمہ أعز وأطول
بيتا بناه لنا المليك وما بنى	حكم السماء فانه لا ينقل
بيتا زارة محتب بفناء ه	ومجاشع وأبو الفوارس نهشل
الأكثرون إذا يعد حصاهم	والأكرمون إذا يعد الأول
لايحتبي بفناء بيتك مثلهم	أبدأ إذا عدالفعال الأفضل
حلل الملوک لباسنا في أرضنا	والسباغات لدى الوغى نتسربل

فرزدق کے جواب میں جریر کا قصیدہ:

أعددت للشعراء سما نافعا	فسقیت آخرهم بكاس الأول
لما وضعت على الفرزدق ميسمی	وضعا البعیت جدعت أنف الأخطل
أخزى الذي سمك السماء مجاشعا	وبنى بناء ك في الحضيض الأسفل
إني انصبت من السماء عليكم	حتى اختطفتك يا فرزدق من عل
أحلامنا تزن الجبال رزانة	ويفوق جاهلنا فعال الجهل
ولقد بنيت اخس بيت يبتنى	فهدمت بيتكم بمثلي يدبل

بیتا یحکم قینکم بفناء ۵ دنسا مقاعدہ خبیث المدخل

نفاض کے تین سب سے اہم اور باکمال اور قادر الکلام شعرا ہیں: جریر، فرزدق اور اخطل۔ لیکن نقادوں میں اس بات پر اختلاف تھا کہ ان میں سے کون کس سے بڑا شاعر ہے، چنانچہ ہر ایک اپنے پسندیدہ شاعر کو بڑھاتا تھا اس لیے اعتدال پسند نقادوں نے رائے دی ہے کہ ”اگر بہترین غزل، حسین تشبیب، خوبصورت الفاظ، سبک اسلوب اور مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کے نقطہ نظر سے تینوں کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو جریر کو سب پر فوقیت حاصل ہوگی“ اور ”اگر بہترین فخر، بھاری بھر کم الفاظ، دقیق اسلوب بیان، پرشکوہ اور گمبھیر اشعار اور گہرے معانی و مطالب کے اعتبار سے نظر ڈالی جائے تو فرزدق ان میں سب سے بڑا شاعر نظر آئے گا“۔ اور ”جس کو فصاحت و بلاغت اور بجزو مدح میں کمال کے ساتھ، شراب و کباب اور یاران مے کدہ کا وصف زیادہ پسندیدہ ہو اسے اخطل کے کلام میں زیادہ لطف آئے گا“۔

12.8.4.3 شاعری کے موضوعات

جریر نے شعر کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے جس میں غزل، ہجو گوئی، فخر، مرثیہ، مدح سرائی اور سیاسی شاعری شامل ہے۔ ایک دفعہ عبدالملک بن مروان نے ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ کھانے کے بعد اس نے لوگوں سے پوچھا کہ کھانا کیسا رہا؟ تو ایک طرف سے آواز آئی کہ امیر المؤمنین جہاں تک کھانے کے مقدار کا تعلق ہے تو واقعی میں نے اتنا زیادہ اور اتنے انواع و اقسام کے کھانے اب تک نہیں دیکھے، لیکن جہاں تک مزیدار ہونے کا تعلق ہے، تو یقین فرمائیے کہ میں نے اس سے کہیں زیادہ مزیدار کھانا کھایا ہے۔ عبدالملک نے جو نظر اٹھائی تو دیکھا کہ ایک بدوسا منے کھڑا ہے۔ عبدالملک نے اس کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ اچھا تو تم نے اس سے بھی زیادہ مزیدار کھانا کھایا ہے؟ پہلے تو یہ بتاؤ کہ ہو کس قبیلہ کے؟ بدوی نے جواب دیا کہ آپ کے نانیہالی قبیلہ بنی عذرہ کا۔ اس پر عبدالملک نے کہا کہ اس قبیلہ کے لوگ تو شعر و شاعری کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں، تم کو بھی اس سے کچھ دلچسپی ہے؟ بدوی بولا: جی ہاں تھوڑا بہت ہے۔ یہ سن کر عبدالملک نے کہا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ عربوں نے مدح میں سب سے اچھا شعر کون سا کہا ہے؟ بدوی بولا: جریر کا آپ کے بارے میں یہ شعر:

ألستم خیر من ركب المطایا وأندی العالمین بطون راح

ترجمہ: کیا آپ سواری پر بیٹھنے والوں میں سب سے بہتر (ترک و احتشام کے ساتھ) اور جو دو سنا کرنے میں دنیا میں سب سے بڑے داتا نہیں ہیں؟۔ یہ سن کر عبدالملک کی بائچھیں کھل گئیں، اس کے بعد اس نے کہا کہ اچھا ہجو میں سب سے اچھا شعر کون سا ہے؟ بدوی بولا جریر کا یہ شعر جو اس نے راعی الابل النمیری کی ہجو میں کہا تھا:

فغض الطرف أنک من نمیر فلاكعبا بلغت ولا کلابا

ترجمہ: نگاہیں نیچی کر، تو تو قبیلہ نمیر کا فرد ہے، اور اتنا نیچا ہے کہ نہ قبیلہ کعب کو پہنچ سکا اور نہ کلاب کو۔ اب عبدالملک نے کہا کہ اچھا فخر میں سب سے اچھا شعر سناؤ: بدوی نے جواب دیا کہ اس میں بھی جریر کا ہی شعر ہے:

إذا غضبت علیک بنو تمیم حسبت الناس کلهم غضابا

ترجمہ: جب بنو تمیم تم سے خفا ہو جاتے ہیں تو تم کو ایسا لگتا ہے کہ ساری دنیا تم سے خفا ہو گئی ہے۔ ”بہت خوب“ عبدالملک بولا، اچھا غزل کا سب سے اچھا شعر سناؤ۔ بدوی نے فوراً کہا: جریر ہی کا یہ شعر:

إن العيون التي في طرفها حور
قتلنا ثم لم يحيين قتلانا

ترجمہ: ان آنکھوں نے جو شدید سیاہی اور سفیدی سے مل کر کٹاری بن گئی ہیں، ہمیں جان سے مار ڈالا، پھر ہمارے مردوں کو زندہ کرنے کی فکر بھی نہیں کی۔ بدوی کی اس بالغ نظری کو دیکھ کر اور اتنے عمدہ اشعار سن کر عبدالملک باغ باغ ہو گیا اور حکم دیا کہ بدوی کو انعام و اکرام سے نوازا جائے۔

کہتے ہیں اس دعوت میں جریر بھی موجود تھا، اور جب بھی بدوی اس کا شعر پڑھتا وہ فخر سے اپنی گردن اٹھا کر دیکھتا۔ جب خلیفہ نے بدوی کو انعام دینے کا حکم دیا تو جریر بولا کہ میں بھی بدوی کو انعام دیتا ہوں، چنانچہ بدوی اس موقع پر دو گنا انعام لے کر رخصت ہوا۔
نقادوں نے کہا ہے کہ حقیقت نگاری میں جریر کا یہ شعر بے مثال نمونہ ہے:

إني لارجو منك خيرا عاجلا
والنفس مولعة بحب العاجل

ترجمہ: میں تو آپ کی فوری داد و دہش کا متمنی ہوں کہ نفس ہمیشہ فوری مل جانے والی چیزوں کا فریفتہ ہوتا ہے۔

12.8.4.4 امر کی مدح سرائی

جریر آبائی مقام میں شعری کاوشوں کے بعد عزت، شرف و منزلت اور مال و دولت کے حصول کے لیے بصرہ کی جانب رخت سفر باندھ کر حجاج سے جا ملا اور اس کی خوب ستائش کرنے لگا۔ حجاج کے پاس جریر خوب عزت اور قدر و منزلت حاصل کرتا ہے۔ وہ قصائد جو اس نے حجاج کی مدح میں کہے بہت مشہور ہوئے حتیٰ کہ عبدالملک کو اس کی اطلاع پہنچی اور اس نے جریر کا حجاج کے پاس رہنا نامناسب سمجھا۔ حجاج خلیفہ کی نظر پہچان گیا اور شاعر کو اپنے بیٹے محمد کے ہمراہ دمشق روانہ کر دیا، وہاں پہنچ کر جب جریر نے عبدالملک کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت مانگی تو خلیفہ نے اجازت نہ دی اور سخت عتاب و برہمی کے لہجہ میں کہا: ”بس تم حجاج کے لیے ہو“۔ اس کے بعد وہ خلیفہ تک رسائی کے ذرائع پیدا کرنے میں لگا رہا اور لوگوں سے اپنی سفارشیں کراتا رہا حتیٰ کہ اسے عبدالملک کو اپنا وہ قصیدہ سنانے کا موقع مل گیا جس کا مطلع ہے:

إ تصحو أم فؤادك غير صاح
عشية هم صبحك بالروح

جب وہ اس شعر پر پہنچا:

ألستم خير من ركب المطايا
وأندی العالمين بطون راح

تو عبدالملک مسکرایا اور کہا: ”ہم ایسے ہی ہیں اور ایسے ہی رہیں گے“۔ پھر اسے سواوئینیاں اور آٹھ چرواہے انعام میں دیے۔ اس قصیدہ کے سنانے اور اخطل کے مرجانے کی وجہ سے جریر تمام خلفا کی نظر میں بالعموم اور عمر بن عبدالعزیز کی نظر میں بالخصوص تمام شعرا سے زیادہ وقیع اور معزز ہو گیا۔ عبدالملک کے بعد جریر نے ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیز، یزید بن عبدالملک اور ہشام کی خوب مدح اور ستائش کی ہے۔

عبدالملک بن مروان کی شان میں مدحیہ اشعار:

لولا الخليفة والقرآن يقرؤه
ما قام لنا س أحكام ولا جمع
أنت الأمين مین الله لاسرف
فيما وليت والا هيابة ورع
أنت المبارك يهدي الله شيعته
إذا تفرقت الأهواء والشيع

إن البرية ترضى ما ارتضيت لها

إن سرت ساروا وإن قلت أربعو أربعوا

12.8.4.5 جریر کے اشعار کی امتیازی خصوصیات:

جریر ایک فطری شاعر تھا۔ خوب صورت، سہل اور شیریں الفاظ کا انتخاب کر کے حسین قافیوں اور ہلکے ہلکے معانی و مطالب، خوبصورت رمز و کنایہ اور مناسب تشبیہ و استعارہ کے امتزاج سے اپنے کلام کو اتنا دل آویز، مؤثر اور سحر طراز بنا دیتا تھا کہ منہ سے واہ نکل جاتی تھی اور ہر خاص و عام اس سے یکساں لطف لیتا تھا اور وہ خود بھی اپنے فنی کمالات کو دیکھ کر جھوم اٹھتا تھا۔ اس کی وجہ بادیہ کی پرورش تھی جہاں زبان بنی سنوری ہوتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ قرآن و حدیث کا اثر تھا جس سے اس کا اسلوب کلام نکھرا اور چمکا۔ اس کے کمالات کا مظہر اس کے وہ قصیدے ہیں جو اس نے تشبیہ یا عتاب میں کہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں فرزدق بھاری بھر کم اور ثقیل الفاظ استعمال کرتا تھا، معانی و مطالب میں بڑی گہرائی پیدا کرتا اور دقیقہ سنجی سے کام لیتا، اسلوب کلام اور انداز گفتگو بڑا ٹھوس اور گہمیر ہوتا تھا جس کی وجہ سے اس کے کلام سے صرف پڑھا لکھا طبقہ اور خاص ادبی ذوق رکھنے والے علما ہی لطف لیتے تھے۔ اور ظاہر ہے ان کی تعداد تھوڑی ہوتی ہے اسی لیے فرزدق کے کلام کو ہر خاص و عام میں وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو جریر کے کلام کو ہوئی۔

جریر میں نہ تو اخطل کی سی خباثت وے پرستی تھی نہ فرزدق کی سی درشتی و بدکاری۔ وہ پاکیزگی طبع، نزاکت احساس، عفت، صحیح دینداری اور خوش خلقی کی صفات سے مزین تھا جس کا اثر اس کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ حسن اسلوب، شیرینی غزل، تلخی، جھو، خوبی مرثیہ اور شاعری کے جملہ اصناف کو بحسن و کمال ادا کرنے میں وہ ممتاز ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ افق شاعری پر سب سے زیادہ درخشندہ اور شاعریت میں سب سے زیادہ کامل تھا۔

جریر کی نشوونما دیہات میں ہوئی تھی اسی لیے اس کی شاعری خالص دیہاتی اسلامی زندگی کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے الفاظ آسان، معانی فطری اور اسلوب پراثر ہوا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی شاعری عوام اور خواص ہر دو طبقہ میں یکساں مقبول رہی ہے۔ نیز اس کے اشعار میں قرآن اور اسلام کا واضح اثر نظر آتا ہے بطور خاص مدح سرائی اور مرثیہ میں۔ اپنی اہلیہ ام حزرہ کے مرثیہ اشعار بطور نمونہ:

لولا الحیاء لہاجنی استعبار	ولزرت قبرک والحبیب یزار
ولقد نظرت وما تمنع نظرة	فی اللحد حیث تمکن الاحفار
ولہت قلبی إذ علتی کبرۃ	وذوو التمام من بنیک صغار
ولقد اراک کسیت اجمل منظر	و مع الجمال سکینۃ ووقار
وإذ اسریت رایت نارک نورت	وجہا اغر یزینہ الاسفار
کانت مکرمۃ العشیر ولم یکن	یخشی غوائل ام حزرۃ جار
والریح طیبۃ إذا استقبلتہا	والعرض لا دنس ولا خوار
صلی الملائکۃ الذین تخیروا	والصالحون علیک والابرار
وعلیک من صلوات ربک کلما	نصب الحجیح ملبدین وغاروا

لا يلبث القراء ان يتفرقوا ليل يكر عليهم ونهار

ایک مرتبہ فرزدق اور اخطل نے جریر کے اشعار کا مذاکرہ کرنے کے بعد یہ اقرار کیا کہ جریر کی شاعری ان کی شاعری سے زیادہ عوام اور خواص ہر دو طبقہ میں مشہور ہیں۔ جب کہ ان کی شاعری صرف خواص اور ادا کے درمیان ہی مقبول ہے۔

12.9 اکتسابی نتائج

عربی شاعری نے عصر اموی میں بے پناہ ترقی کے منازل طے کیے ہیں۔ نئے نئے موضوعات پر اس عصر کے شعرا نے طبع آزمائی کی، نیز سابق میں موجود بعض موضوعات کو ترقی دے کر اسے نئی شکلیں بھی عطا کیں جس کی اہم مثال غزل ہے، اگرچہ شعر میں غزل کا استعمال کافی قدیم ہے لیکن عصر اموی میں غزل کی ایک منفرد اور ممتاز شناخت وجود میں آئی بلکہ اس میں غزل صریح، غزل عمری اور غزل عذری کے نام سے دو انواع بھی وجود میں آئیں۔ اسی طرح نقائص کے ذریعہ عربی شاعری نے اس عصر کے اہم علمی مآثر کے ساتھ ساتھ تاریخی آثار کو بھی محفوظ کر لیا۔ عراق، شام اور حجاز کے علمی، ادبی اور شعری ماحول نے جو کچھ عربی زبان و ادب کو دیا ہے وہ بھی ناقابل فراموش ہے۔ شعرا کی مذہبی وابستگی، سیاسی تعلق، باہم مقابلہ آرائی نے جہاں ہر شاعر کی ایک مخصوص جماعت تیار کر دی تھی جو اس کی مدد اور مساعادت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ اس طرز عمل نے اختلاف اور تنوع کے ساتھ قبائلی تعصب جسے اسلام نے منع کیا تھا امر کی سرپرستی میں دوبارہ عام ہونے لگا۔ اس کے علاوہ جملہ اصناف شعر میں بھی اس عصر کی شاعری ممتاز سمجھی جاتی ہے۔ نیز شوکت الفاظ، شاندار اسلوب، بہترین بندش، خوبصورت آب و تاب و دیگر اس عصر کی نمایاں ترین خصوصیات میں شامل ہیں۔

دور اموی کی عربی شاعری اپنے موضوعات، اسالیب، اغراض و مقاصد کے حوالہ سے دوسرے تمام زمانوں کی شاعری سے ممتاز اور منفرد سمجھی جاتی ہے۔ عصر اموی نے ایسے قادر الکلام شعرا عربی زبان کو دیے ہیں جنہوں نے عربی شاعری کے مختلف موضوعات جیسے مدح سرائی، ہجو گوئی، مرثیہ، فخر، سیاسی شاعری، مجون اور غزل وغیرہ کو اپنے منفرد انداز اور دلنشین اسلوب کے ذریعہ انفرادیت سے نوازا ہے۔ عمر بن ابی ربیعہ میں بچپن ہی سے شاعری کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ اس نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی لیکن بطور خاص غزل، عورتوں کے محاسن اور اوصاف اور دل لگی کو منفرد اور غیر مانوس طریقہ سے روشناس کرایا حتیٰ کہ اسے عورتوں کا شاعر کہا جانے لگا، نیز اس کی شاعری میں رقت، سہولت، لہو و لعب اور موسیقی کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ اخطل نے بھی مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی اور مدح، فخر، ہجو اور شراب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی عمدہ کلام پیش کیا۔ امر کی مدح سرائی کی بدولت اسے ”بنو امیہ کا شاعر“ اور ”امیر المؤمنین کا شاعر“ جیسے القاب سے نوازا گیا۔ جریر اور فرزدق نے بھی اپنی شاعری میں تقریباً تمام موضوعات کا احاطہ کیا لیکن انہوں نے نقائص کو اپنے عمدہ کلام کے ذریعہ وجود اور دوام بخشا اور اسے اپنے اشعار کے ذریعہ دور اموی کی سب سے ممتاز شعری صنف بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

12.10 نمونے کے امتحانی سوالات

۱۔ عصر اموی میں عربی شاعری اور اس کے اغراض و مقاصد پر جامع نوٹ لکھیے۔

۲۔ نقائص کی نشوونما اور اس کے اہم شعرا پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

- ۳۔ عصر اموی کے شعری مراکز اور ان کی خصوصیات کو مفصل بیان کیجیے۔
- ۴۔ غزل عذری کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔
- ۵۔ سیاسی شعر کے اسباب اور محرکات کا جائزہ لیجیے۔
- ۶۔ شعر اموی کی فنی خصوصیات کو ذکر کیجیے۔
- ۷۔ عصر اموی کے اہم شعرا پر جامع نوٹ لکھیے۔
- ۸۔ عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
- ۹۔ فرزدق کے اسلوب اور شعری موضوعات پر مفصل گفتگو کیجیے۔
- ۱۰۔ جریر کی شاعری کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔
- ۱۱۔ عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری کی فنی خصوصیات کو بیان کیجیے۔
- ۱۲۔ اخطل کی مدح سرائی کا جائزہ لیجیے۔

12.11 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

- ۱۔ الجامع فی تاریخ الأدب العربی، حنا فاخوری، دار الجیل، بیروت۔ لبنان۔
- ۲۔ تاریخ الأدب العربی، أحمد حسن زیات، دار المعرفة، بیروت۔ لبنان۔
- ۳۔ المفصل فی تاریخ الأدب العربی، أحمد أسکندری وأصحابه، دار احیاء العلوم، بیروت۔
- ۴۔ عربی ادب کی تاریخ، ڈاکٹر عبد الحلیم ندوی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔

اکائی 13 عباسی خلافت و حکومت پر ایک طائرانہ نظر

- اکائی کے اجزا
- 13.1 مقصد
 - 13.2 تمہید
 - 13.3 عباسی خلافت و حکومت کا قیام
 - 13.4 عباسی خلافت و حکومت کا دورانیہ اور اس کے ادوار
 - 13.4.1 عباسی خلافت و حکومت کا پہلا دور
 - 13.4.2 عباسی خلافت و حکومت کا دوسرا دور
 - 13.4.3 عباسی خلافت و حکومت کا تیسرا دور
 - 13.4.4 عباسی خلافت و حکومت کا چوتھا دور
 - 13.4.5 عباسی خلافت و حکومت کے زوال کے اسباب و عوامل
 - 13.5 مصر میں عباسی خلافت و حکومت کا احیا
 - 13.5.1 مصر میں عباسی خلافت و حکومت کے خلفا اور ان کا دور اقتدار
 - 13.6 عباسی خلافت و حکومت کے محکمہ جات
 - 13.6.1 عہد عباسی کا عدلیہ
 - 13.6.2 عہد عباسی میں فوج اور پولیس کا نظام
 - 13.6.3 عہد عباسی کا مالی نظام
 - 13.7 عہد عباسی کا نظام تعلیم
 - 13.8 عہد عباسی کا معاشرہ
 - 13.9 عہد عباسی کے اسلامی فرقے
 - 13.9.1 شیعہ

- 13.9.2 خوارج
- 13.9.3 مرجہ
- 13.9.4 معتزلہ
- 13.9.5 دیگر فرقے
- 13.10 عصر عباسی کی علمی سرگرمیاں
- 13.10.1 تحریک ترجمہ
- 13.11 عصر عباسی کی نثر نگاری
- 13.11.1 عہد عباسی کے نثر نگاران کے طبقات
- 13.11.2 نثر نگاری کے اصناف
- 13.12 عصر عباسی کی شاعری
- 13.12.1 عہد عباسی کے شعرا کے طبقات
- 13.12.2 عہد عباسی کے شعرا کی فنی و موضوعاتی تقسیم
- 13.13 عصر عباسی کی تہذیب و تمدن
- 13.13.1 عہد عباسی کا فن تعمیر
- 13.13.2 عہد عباسی میں بسائے جانے والے شہر
- 13.13.2.1 عباسیہ
- 13.13.2.2 بغداد
- 13.13.2.3 کرخ
- 13.13.2.4 مہدیہ/معسکر المہدی/رصافہ
- 13.13.2.5 سامراء
- 13.14 اکتسابی نتائج
- 13.15 نمونے کے امتحانی سوالات
- 13.16 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

اس اکائی کو پڑھ کر طلبہ یہ جان لیں گے کہ عباسی خلافت کا قیام کن حالات اور اسباب کی بنا پر ہوا تھا اور اس کے قیام کی تحریک میں کن کن افراد نے فعال کردار ادا کیا تھا۔ نیز یہ بھی جان لیں گے کہ عہد عباسی کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے؟ عہد عباسی میں اسلامی قلمرو کی حدود اربعہ کیا تھیں اور عباسی خلفا کا مقام و مرتبہ کیا تھا؟ مزید برآں اس عہد میں اسلامی تہذیب و تمدن کو کیوں فروغ حاصل ہوا اور کس طرح اس عہد میں علوم و فنون نے ارتقائی مراحل طے کیے تھے اور ان کے فروغ میں تحریک ترجمہ نے کیا کردار ادا کیا تھا؟ اس عہد میں عربی ادب کی صورت حال کیا تھی اور شاعری و نثر نگاری کا مقام و مرتبہ کیا تھا؟

اسلامی تاریخ میں عباسی خلافت و حکومت کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ کسی اور اسلامی دور کو حاصل نہ ہو سکا۔ پوری اسلامی تاریخ میں اس عہد کے مد مقابل کسی اور عہد اور دور کو نہیں پیش کیا جاسکتا ہے۔ عہد عباسی نے بعد کے اسلامی ادوار پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اسی عہد میں وہ علوم و فنون اوج کمال کو پہنچے جن کی ابتدا عہد اموی میں ہوئی تھی۔ عباسی خلافت و حکومت پانچ سو سال کے عرصہ تک قائم رہی۔ اس عرصہ میں وہ قانون الہی کے مطابق عروج و زوال کے ادوار سے بھی گزرتی رہی حتیٰ کہ اپنے دور انحطاط میں جب وہ محض کٹھ پتلی بن کر رہ گئی تھی، اس وقت بھی کچھ علاقوں جیسے اندلس وغیرہ کو چھوڑ کر مجموعی طور پر اس کی دینی سیادت و مرکزیت کو تسلیم کیا جاتا تھا اور خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور خلافت بغداد سے اپنی وابستگی کا۔ برائے نام ہی سہی۔ اعتراف و اظہار کیا جاتا تھا اور اسے اپنے لیے خیر و شرف سمجھا جاتا تھا۔

اسلامی تاریخ میں مذہبی، ثقافتی، تمدنی اور سیاسی لحاظ سے عہد عباسی کو زریں دور قرار دیا جاتا ہے کہ انھوں نے اسلامی تہذیب و ثقافت کو عالمی تہذیب و ثقافت کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔ اس عہد میں علوم و فنون کو جتنی ترقی ہوئی وہ کسی اور دور میں ممکن نہ ہو سکی لہذا اسلامی علوم و فنون کے ارتقا کو عباسی خلافت و حکومت کا سب سے بڑا امتیاز قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

عباسی خلافت و حکومت کے قیام کے لیے کی جانے والی کوششوں پر جب ایک نظر ڈالی جاتی ہے تو اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی ابتدا ۶۶ھ/۶۸۵ء میں اس وقت ہوئی تھی جب مختار نامی شخص نے محمد بن علی بن ابی طالب معروف بہ محمد بن الحنفیہؓ (وفات: ۸۱ھ/۷۰۰ء) کے نام علم بغاوت بلند کیا تھا۔ بنو عباس کے استحقاق خلافت کی خاطر ہونے والی اس بغاوت نے جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک طاقت کی شکل اختیار کر لی اور اس میں وہ لوگ شامل ہوتے چلے گئے جو کسی نہ کسی وجہ سے اموی خلافت سے ناراض یا بدظن تھے۔

محمد بن الحنفیہ کی وفات کے بعد ان کے پیروکار تین بڑی جماعت میں تقسیم ہو گئے جن میں سے ایک جماعت اور گروہ کی سربراہی ابن الحنفیہؓ کے صاحبزادے ابو ہاشم عبداللہ (وفات: ۹۸ یا ۹۹ھ/۱۶ یا ۱۷ء) کر رہے تھے۔ ان کا شمار ان افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے عباسی خلافت و حکومت کے قیام کے لیے بنیادی اور اہم امور انجام دیے تھے۔ اتفاق سے ابو ہاشم عبداللہ بن الحنفیہؓ کی کوئی اولاد نہ تھی اور ان کی وفات ایک ایسے مقام پر ہوئی تھی جہاں خانوادہ علی بن ابی طالبؓ کا کوئی فرد موجود نہیں تھا اور اہل بیت میں سے صرف حضرت عباسؓ کے پر پوتے

اور اولیس عباسی خلیفہ سفاح و منصور کے والد محترم محمد بن علی بن عبداللہ بن عباسؓ (وفات ۱۲۵ھ/ ۷۴۳ء) وہاں موجود تھے لہذا ابوہاشم عبداللہ بن الحنفیہ کے تبعین کی ایک جماعت نے یہ دعویٰ کیا کہ انھوں نے امامت کو بذریعہ وصیت ان کی جانب منتقل کر دیا تھا۔ آگے چل کر جہاں یہ منتقلی عباسی خلافت و حکومت کے قیام کا سنگ میل ثابت ہوئی وہیں ’خلافت و امامت کا استحقاق حضرت علیؓ کی اولاد سے حضرت عباسؓ کی اولاد میں منتقل ہو گیا‘۔

سیاسی طور پر اموی خلافت کے خاتمہ کے ساتھ عباسی خلافت و حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ عباسی خلافت و حکومت کا پہلا اور بنیادی پتھر ’عباسی تحریک‘ کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا آغاز محمد بن علیؓ (وفات ۱۲۵ھ/ ۷۴۳ء) نے اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملکؓ (وفات: ۹۹ھ/ ۷۱۷ء) کے عہد خلافت میں کیا تھا۔ انھوں نے اپنی تحریک کا آغاز حمیمہ (اردن کے صوبہ معان کے جنوب میں واقع ایک گاؤں، بعض مؤرخین نے اسے شام کا علاقہ قرار دیا ہے) سے کیا تھا جہاں سے مختلف علاقوں کے قافلے گزرتے تھے۔ ان کی منصوبہ بند کوششوں سے اس کے اثرات تھوڑے ہی دنوں میں خراسان تک پہنچ گئے تھے۔ ان کے بیٹے ابراہیم بن محمد (وفات: ۱۳۱ھ/ ۷۴۹ء) کی قیادت میں اس تحریک نے مزید طاقت اور قوت حاصل کر لی تھی۔ ابراہیم بن محمد کے وزیر ابو سلمہ خلیل (وفات: ۱۳۲ھ) اور ابو مسلم خراسانی (وفات: ۱۳۷ھ) نے کوفہ اور عراق میں اس کا جال سا بچھا دیا تھا اور وہ اموی خلافت کے خلاف سب سے بڑی طاقت بن کر ابھری تھی جس نے آخر کار اموی خلافت کا تختہ پلٹ دیا۔ محمد بن علی اور ابراہیم بن محمد کے زمانہ تک عباسی خلافت و حکومت کے لیے راہیں بڑی ہی رازداری کے ساتھ ہموار کی جا رہی تھیں کہ آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کے زمانہ میں یہ راز فاش ہو گیا اور انھوں نے ابراہیم بن محمد کو گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس تحریک میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب ابراہیم بن محمد کی وفات کے بعد عباسی تحریک کی قیادت اور اس کا نظم و نسق اولین عباسی خلیفہ ابو العباس عبداللہ بن محمد ملقب سفاح (وفات ۱۳۶ھ/ ۷۵۴ء) کے ہاتھوں میں آیا۔ انھوں نے خلافت عباسیہ کے قیام کی راہیں ہموار کرنے کے لیے چند افراد کو منتخب کیا تھا جنہیں ’داعی‘ کے لقب سے نوازا گیا تھا۔ ابو العباس عبداللہ بن محمد کے منتخب کردہ افراد مختلف علاقوں میں گھوم گھوم کر مذکورہ تحریک کے اغراض و مقاصد کو کچھ اس طرح بیان کرتے تھے کہ سامعین پر ایک خاص قسم کا جوش و جذبہ پروان چڑھ جاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ انھیں اس تحریک کی مدد و اعانت کرنے پر بھی ابھارتے تھے۔ ان افراد کی مسلسل کوششوں نے خلافت عباسیہ کے قیام کی تمام تر راہیں ہموار کر دیں تھیں۔ ان منتخب افراد میں سے ایک پر جوش داعی کا نام ابو مسلم خراسانی تھا جنھوں نے خلافت عباسیہ کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا تھا، اور ۱۳۲ھ/ ۷۴۹ء میں عراق کے اہم ترین شہر کوفہ پر قبضہ کر کے خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔

13.4 عباسی خلافت و حکومت کا دورانیہ اور اس کے ادوار

عباسی خلافت و حکومت کا دورانیہ پانچ سو سال سے زائد (۱۳۲-۶۵۶ھ/ ۷۵۰-۱۲۵۸ء) عرصہ پر محیط ہے لیکن اس کی اصلی شان و شوکت صرف ابتدائی سو سال تک ہی یعنی خلیفہ متوکل (وفات: ۲۴۶ھ/ ۸۶۱ء) کے عہد تک ہی برقرار رہ سکی تھی۔ بعد کے ادوار میں عباسی خلفاء کی حیثیت دن بدن کم ہوتی چلی گئی تھی حتیٰ کہ آخری عہد میں وہ صرف نام کے خلفاء ہی رہ گئے اور اصل اقتدار دوسروں کے ہاتھوں میں رہا کہ ’’عباسی خلافت و حکومت کی حیثیت محض تبرک اور عباسی خلیفہ کا مرتبہ صرف دعا گو کا رہ گیا تھا‘‘ اور آخر کار ایک مجبور و لاچار خلافت و حکومت کی مانند

اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی اور تاتاریوں/منگولوں کے ایک خانی حکمراں ہلاکو خان کے ہاتھوں ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔
مؤرخین عباسی خلافت و حکومت کو کئی ایک ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ کچھ مؤرخین اسے دو ادوار، کچھ تین ادوار اور کچھ چار ادوار میں
میں تقسیم کرتے ہیں۔ عام طور پر مؤرخین عباسی خلافت و حکومت کو حسب ذیل چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

13.4.1 عباسی خلافت و حکومت کا پہلا دور

☆ ۱۳۲ تا ۲۴۶ھ/۷۵۰ تا ۸۶۱ء: اس عہد میں کل دس خلیفہ ہوئے تھے جنہوں نے صحیح معنوں میں حکمرانی کی تھی اور اقتدار اعلیٰ کے
مالک تھے۔ اسی عہد کو عباسی عہد کا زریں دور قرار دیا جاتا ہے۔ پہلے دور کے خلفا حسب ذیل ہیں:

- ۱- ابوالعباس عبداللہ بن محمد ملقب بہ سفاح (وفات: ۱۳۶ھ/۷۵۴ء)، دور خلافت: ۱۳۲-۱۳۶ھ/۷۴۹-۷۵۳ء۔
- ۲- ابو جعفر عبداللہ بن محمد ملقب بہ منصور (وفات: ۱۵۸ھ/۷۷۵ء)، دور خلافت: ۱۳۶-۱۵۸ھ/۷۵۳-۷۷۴ء۔
- ۳- ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ ملقب بہ مہدی (وفات: ۱۶۹ھ/۷۸۵ء)، دور خلافت: ۱۵۸-۱۶۹ھ/۷۷۵-۷۸۵ء۔
- ۴- ابو محمد موسیٰ بن محمد ملقب بہ ہادی (وفات: ۱۷۰ھ/۷۸۶ء)، دور خلافت: ۱۶۹-۱۷۰ھ/۷۸۵-۷۸۶ء۔
- ۵- ابو جعفر ہارون بن محمد ملقب بہ رشید (وفات: ۱۹۳ھ/۸۰۹ء)، دور خلافت: ۱۷۰-۱۹۳ھ/۷۸۶-۸۰۹ء۔
- ۶- محمد بن ہارون ملقب بہ امین (وفات: ۱۹۸ھ/۸۱۳ء)، دور خلافت: ۱۹۳-۱۹۸ھ/۸۰۹-۸۱۳ء۔
- ۷- ابوالعباس عبداللہ بن ہارون ملقب بہ مامون (وفات: ۲۱۸ھ/۸۳۳ء)، دور خلافت: ۱۹۸-۲۱۸ھ/۸۱۳-۸۳۳ء۔
- ۸- ابوالسحاق قاسم بن ہارون ملقب بہ معتصم باللہ (وفات: ۲۲۷ھ/۸۴۱ء)، دور خلافت: ۲۱۸-۲۲۷ھ/۸۳۳-۸۴۱ء۔
- ۹- ابو جعفر ہارون بن محمد ملقب بہ واثق باللہ (وفات: ۲۳۲ھ/۸۴۴ء)، دور خلافت: ۲۲۷-۲۳۲ھ/۸۴۱-۸۴۶ء۔
- ۱۰- جعفر بن محمد ملقب بہ متوکل علی اللہ (وفات: ۲۴۷ھ/۸۶۱ء)، دور خلافت: ۲۳۲-۲۴۷ھ/۸۴۶-۸۶۱ء۔

13.4.2 عباسی خلافت و حکومت کا دوسرا دور

☆ ۲۴۶ تا ۳۳۲ھ/۸۶۱ تا ۹۴۵ء: اس عہد میں کل گیارہ خلیفہ ہوئے تھے۔ اس عہد میں ترک سالاروں کا بول بولا تھا کہ وہ عباسی
خلفا کے نام پر حکمرانی کرتے تھے اور اپنے من چاہے فیصلے خلیفہ کے نام پر مسلط کرتے تھے تاہم وہ خلفا کی عزت نفس کا خیال رکھتے تھے۔
دوسرے دور کے خلفا حسب ذیل ہیں:

- ۱- محمد بن جعفر ملقب بہ منتصر باللہ (وفات: ۲۴۸ھ)، دور خلافت: ۲۴۷-۲۴۸ھ/۸۶۱-۸۶۲ء۔
- ۲- احمد بن محمد ملقب بہ مستعین باللہ، دور خلافت: ۲۴۸-۲۵۱ھ/۸۶۲-۸۶۵ء۔
- ۳- ابو عبداللہ محمد بن جعفر ملقب بہ معتز باللہ (وفات: ۲۵۵ھ)، دور خلافت: ۲۵۱-۲۵۵ھ/۸۶۵-۸۶۹ء۔
- ۴- ابو عبداللہ بن واثق ملقب بہ مہندی باللہ (وفات: ۲۵۶ھ)، دور خلافت: ۲۵۵-۲۵۶ھ/۸۶۹-۸۷۰ء۔
- ۵- ابوالعباس احمد بن متوکل ملقب بہ معتمد علی اللہ (وفات: ۲۷۹ھ)، دور خلافت: ۲۵۶-۲۷۹ھ/۸۷۰-۸۹۳ء۔

- ۶- ابوالعباس احمد بن موفق ملقب بہ معتضد باللہ (وفات: ۲۸۹ھ)، دور خلافت: ۲۷۹-۲۸۹ھ / ۸۹۳-۹۰۲ء۔
- ۷- ابوعلی علی بن معتضد ملقب بہ متقی باللہ (وفات: ۲۹۵ھ)، دور خلافت: ۲۸۹-۲۹۵ھ / ۹۰۲-۹۰۸ء۔
- ۸- ابوالفضل جعفر بن معتضد ملقب بہ مقتدر باللہ (وفات: ۳۲۰ھ)، دور خلافت: ۲۹۵-۳۲۰ھ / ۹۰۸-۹۳۲ء۔
- ۹- محمد بن معتضد ملقب بہ قاہر باللہ (وفات: ۳۳۹ھ)، دور خلافت: ۳۲۱-۳۲۲ھ / ۹۳۳-۹۳۴ء۔
- ۱۰- ابوالعباس احمد بن مقتدر ملقب بہ راضی باللہ (وفات: ۳۲۹ھ)، دور خلافت: ۳۲۲-۳۲۹ھ / ۹۳۴-۹۴۱ء۔
- ۱۱- ابواسحاق ابراہیم بن مقتدر ملقب بہ متقی باللہ (وفات: ۳۵۷ھ)، دور خلافت: ۳۲۹-۳۳۳ھ / ۹۴۱-۹۴۴ء۔

13.4.3 عباسی خلافت و حکومت کا تیسرا دور

☆ ۳۳۳ تا ۴۴۲ھ / ۹۴۵ تا ۱۰۵۵ء: اس عہد کے خلفا کی مجموعی تعداد صرف پانچ ہے۔ اس عہد میں آل بویہ کے افراد نے خلافت عباسی کی زمام سنبھال رکھی تھی اور دراصل وہی عباسی خلافت و حکومت کی سیاہ و سفید کے مالک تھے کہ ان کی مرضی کے بغیر کوئی بھی مسند خلافت پر متمکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اس عہد میں خلفا کی حیثیت محض کٹھ پتلی کی ہو کر رہ گئی کہ امور حکمرانی میں انھیں کسی قسم کی دخل اندازی کرنے کی اجازت حاصل نہیں تھی۔ تیسرے دور کے خلفا حسب ذیل ہیں:

- ۱- ابوالقاسم عبداللہ بن متقی ملقب بہ مستکفی باللہ (وفات: ۳۳۸ھ)، دور خلافت: ۳۳۳-۳۳۴ھ / ۹۴۴-۹۴۵ء۔
- ۲- ابوالقاسم فضل بن مقتدر ملقب بہ مطیع للہ (وفات: ۳۶۳ھ)، دور خلافت: ۳۳۴-۳۶۳ھ / ۹۴۵-۹۷۴ء۔
- ۳- ابوالفضل عبدالکریم بن مطیع ملقب بہ طائع للہ (وفات: ۳۹۳ھ)، دور خلافت: ۳۶۳-۳۸۱ھ / ۹۷۴-۹۹۱ء۔
- ۴- ابوالعباس احمد بن مقتدر ملقب بہ قادر باللہ (وفات: ۴۲۲ھ)، دور خلافت: ۳۸۱-۴۲۲ھ / ۹۹۱-۱۰۳۱ء۔
- ۵- ابو جعفر عبداللہ بن قادر ملقب بہ قائم بامر اللہ (وفات: ۴۶۷ھ)، دور خلافت: ۴۲۲-۴۶۷ھ / ۱۰۳۱-۱۰۷۴ء۔

13.4.4 عباسی خلافت و حکومت کا چوتھا دور

☆ ۴۴۲ تا ۶۵۶ھ / ۱۰۵۵ تا ۱۲۵۸ء: چوتھے اور آخری دور کے خلفا کی تعداد گیارہ ہے۔ اس زمانہ میں آل سلجوق کو غلبہ حاصل تھا اور وہی عملاً عباسی سلطنت کے کرتا دھرتا بن گئے تھے کہ ان کی چشم ابرو کے اشارے سے خلفا تخت خلافت پر بٹھائے اور اتارے جاتے تھے۔ اس عہد کے خلفا کا حال بھی تیسرے عہد کے خلفا کی طرح تھا۔ چوتھے دور کے خلفا حسب ذیل ہیں:

- ۱- ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن قائل ملقب بہ مقتدی باللہ (وفات: ۴۸۷ھ)، دور خلافت: ۴۶۷-۴۸۷ھ / ۱۰۷۴-۱۰۹۴ء۔
- ۲- ابوالعباس احمد بن مقتدی ملقب بہ مستنظر باللہ (وفات: ۵۱۲ھ)، دور خلافت: ۴۸۷-۵۱۲ھ / ۱۰۹۴-۱۱۱۸ء۔
- ۳- ابو منصور فضل بن مستنظر ملقب بہ مسترشد باللہ (وفات: ۵۲۹ھ)، دور خلافت: ۵۱۲-۵۲۹ھ / ۱۱۱۸-۱۱۳۴ء۔
- ۴- ابو جعفر منصور بن مسترشد ملقب بہ راشد باللہ، دور خلافت: ۵۲۹-۵۳۰ھ / ۱۱۳۴-۱۱۳۵ء۔
- ۵- ابو عبداللہ محمد بن مستنظر ملقب بہ متقی لامر اللہ، دور خلافت: ۵۳۰-۵۵۵ھ / ۱۱۳۵-۱۱۶۰ء۔

- ۶- ابوالمظفر یوسف بن مقبلی ملقب بہ مستعجد باللہ، دور خلافت: ۵۵۵-۵۶۶ھ/۱۱۶۰-۱۱۷۰ء۔
- ۷- ابومحمد حسن بن مستعجد ملقب بہ مستعفی بامر اللہ، دور خلافت: ۵۶۶-۵۷۵ھ/۱۱۷۰-۱۱۷۹ء۔
- ۸- ابوالعباس احمد بن مستعفی ملقب بہ ناصر لدین اللہ، دور خلافت: ۵۷۵-۶۲۲ھ/۱۱۷۹-۱۲۲۵ء۔
- ۹- ابونصر محمد بن ناصر ملقب بہ ظاہر باللہ، دور خلافت: ۶۲۲-۶۲۳ھ/۱۲۲۵-۱۲۲۶ء۔
- ۱۰- ابوجعفر منصور ملقب بہ مستنصر باللہ، دور خلافت: ۶۲۳-۶۲۴ھ/۱۲۲۶-۱۲۲۷ء۔
- ۱۱- ابواحمد عبداللہ بن مستنصر ملقب بہ مستعصم باللہ، دور خلافت: ۶۲۴-۶۵۶ھ/۱۲۲۷-۱۲۵۸ء۔

مذکورہ بالا ادوار میں عباسی تخت خلافت و حکومت پر مجموعی طور ۴۶ خلفا متمکن ہوئے تھے لیکن ان میں سے صرف دس ابتدائی خلفائے صحیح معنوں پر خلیفہ و حاکم ہونے کا کردار ادا کیا تھا اور اپنے آپ کو مقتدر اعلیٰ ثابت کیا تھا۔ بعد کے خلفا و حکمران یا تو ترک امر کے اشاروں پر ناپتے رہے یا آل بویہ و آل سلجوق کا کھلونا بنے رہے۔ پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی صاحب نے عباسی خلفا کے مقام و مرتبہ کو ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے: ”پہلے دور کے خلفا اقتدار اعلیٰ کے مالک تھے اور سچ مچ حکمرانی کرتے تھے۔ دوسرے دور میں ترک امر نے انہیں کٹھ پتلی بنا لیا تھا اور وہ ان کے نام سے حکومت کرتے تھے پھر بھی کسی طرح کا نشان عزت باقی تھا لیکن تیسرے دور میں ان کے نام سے شیعہ امر آل بویہ اور چوتھے دور میں سنی سلجوق امر حکومت کرتے تھے۔“

عباسی خلافت و حکومت کی اہمیت و حیثیت اور اس کی مجموعی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی صاحب نے بہت ہی متوازن تبصرہ کیا ہے جن کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اموی خلافت و حکومت کی طرح عباسی خلافت و حکومت بھی اسلام کی متحدہ حکمرانی کا مظہر نہیں تھی۔ اسلام کے مرکزی علاقوں میں عباسی خلافت کو تسلیم کر لیا گیا تاہم متعدد صوبوں میں یا تو اس کی آئینی حیثیت کو تسلیم ہی نہیں کیا گیا تھا یا کیا گیا تھا تو برائے نام کہ اقتدار اور حکمرانی پر وہاں کے مقامی خاندان ہی قابض رہے جیسے مصر کے سوا پورے افریقہ میں اس خلافت و حکومت کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور وہاں کے مقامی حکمران خاندان ہی وہاں حکمرانی کرتے رہے۔ پورے اندلس میں عباسی خلافت و حکومت کو تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ بہت جلد وہاں اموی خلافت و حکومت پوری شان و شوکت کے ساتھ قائم ہو گئی تھی۔ اسی طرح عباسی خلافت و حکومت کے عین عروج کے زمانے میں ہی مشرقی علاقوں میں آزاد حکمران خاندانوں کا اقتدار قائم ہو گیا تھا جو برائے نام یا صرف برکت کے لیے عباسی خلافت و حکومت کو تسلیم کرتے تھے۔ اسی طرح عباسی خلافت اور اسلامی حکمرانی دو الگ الگ چیزیں بن کر رہ گئیں تھیں تاہم عباسی خلافت کی دستوری اور قانونی صورت اندلس کے سوا ہر جگہ قائم رہی اور اسے ہی صحیح اسلامی خلافت تسلیم کیا جاتا تھا۔

عہد عباسی میں جہاں ایک طرف اسلامی حکومت کا شیرازہ مکھڑا تھا وہیں فتوحات کا سلسلہ بھی بالکل بند ہو گیا تھا اور اسلامی خلافت و حکومت کا دائرہ سمٹتا چلا گیا حتیٰ کہ اموی خلافت و حکومت کے مقابلہ میں عہد عباسی میں اسلامی حکمرانی کا رقبہ آدھے سے بھی کم ہو گیا تھا جس کی بنیادی وجہ عہد عباسی میں بپا ہونے والی مسلسل بغاوتیں اور آزاد حکمران خاندان کا مختلف علاقوں میں غلبہ و تسلط تھا۔

عباسی خلافت و حکومت کے سیاسی طور پر محدود اور اپاہچ ہونے کے باوجود اسی عہد میں اسلامی تہذیب و تمدن کو اوج کمال حاصل ہوا کہ انھوں نے عہد اموی سے ملنے والے علوم و فنون، معاشرہ و معیشت اور تہذیب و تمدن کے سرمایہ کو سجا سنوار کر بام عروج پر پہنچا دیا تھا جس کی وجہ

سے اس عہد کو اسلامی تہذیب کا زریں دور کہا جاتا ہے۔

13.4.5 عباسی خلافت و حکومت کے زوال کے اسباب و عوامل

عباسی خلافت و حکومت پانچ سو سال سے زائد عرصے تک قائم رہی اور قانون الہی کے مطابق عروج و زوال سے گزرتے ہوئے ہلاکوں کے ہاتھوں ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ عباسی خلافت و حکومت کا اصل دور اقتدار تو صرف اس کے ابتدائی سو سال پر محیط ہے جب انھوں نے صحیح معنوں میں حکمرانی کی تھی۔ باقی چار سو سال ان کے نام پر مختلف خانوادے حکمرانی کرتے رہے۔ کسی بھی حکومت کے زوال کا بنیادی سبب تو حکمرانوں کا شمشیر و سناں کی بجائے طاؤس و رباب کے دامن میں پناہ لینا ہوتا ہے تاہم اس کے علاوہ کچھ مادی و ظاہری اسباب بھی ہوتے ہیں جو اس زوال کی رفتار بڑھا دیتے ہیں اور آخر کار وہ حکومت و سلطنت صفحہ ہستی سے ناپید ہو جاتی ہے۔

عباسی خلافت و حکومت کے زوال کے متعدد اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ پروفیسر محمد یونس مظہر صدیقی نے اس کے زوال کے اسباب کسی قدر تفصیل سے بیان کیے جن کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱- عباسی خلافت و حکومت کا بزور طاقت قائم ہونے سے متعدد طاقت ور افراد و خاندان کے دل و دماغ میں حکمرانی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ طاقت کی بنیاد پر حکومت قائم کی جاسکتی ہے۔ اندلس میں اموی حکومت کے قیام کے کامیاب تجربہ نے اس خیال و جذبہ کو مزید ہمیز دی، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ عین عروج و کمال کے دور میں عباسی سلطنت و ریاست کے حصے بخرے ہونے لگے اور عالم اسلام کے متعدد علاقوں میں مستقل سلطنتیں قائم ہوئیں جیسے مغرب میں ادریسی سلطنت، مشرق میں طاہری سلطنت اور صفاری سلطنت۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آزاد حکمرانوں اور سلطنتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا جن میں سے بعض بعض کی سلطنتیں عباسی خلافت کے رقبہ اور طاقت دونوں میں بڑھی ہوئی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ سلطنتیں محض رسمی طور پر عباسی خلافت و حکومت کی بالادستی کو تسلیم کرتی تھیں کہ اس کے بغیر عوام پر مکمل قابو نہیں پایا جاسکتا تھا۔

۲- زوال کا ایک بنیادی سبب جہاد کی روح کا ختم ہو جانا تھا۔ اموی خلافت و سلطنت اپنے اسی جذبہ کی بنا پر فتوحات پر فتوحات حاصل کرتی رہی اور اسلامی قلمرو کا دائرہ مزید سے مزید وسیع ہوتا چلا گیا۔ عباسی خلافت و حکومت میں فتوحات کا سلسلہ تقریباً بند ہو چکا تھا اور اسلامی رقبہ کا دائرہ سکڑنے لگا تھا۔ جہاں کہیں کچھ فتوحات ہوئیں بھی وہاں عباسی خلافت کا اقتدار بہت عرصہ تک باقی نہ رہ سکا اور اسلامی افواج کی واپسی کے بعد مقبوضہ علاقے ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ اس عہد میں ہونے والی کچھ فتوحات ایسی تھیں جو دیگر خاندان کے حکمرانوں کی مرہون منت تھیں، عباسی خلافت کا اس میں کسی بھی قسم کا حصہ نہیں تھا۔

۳- باہمی خانہ جنگی نے بھی عباسی خلافت و حکومت کے زوال میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔

۵- عباسی انتظامیہ کے تمام تر اداروں نے نہ صرف اپنی افادیت کھودی تھی بلکہ وہ خلافت و حکومت کے لیے مضر ثابت ہوئے کہ وہ بد نظمی، استحصال اور خود غرضی کا نمونہ بن گئے تھے۔ وہ تمام ادارے لوٹ مار، رشوت، غبن، بے جا اصراف اور بے ایمانی کا مرکز بن گئے تھے جس کی وجہ سے حکومت کا خزانہ خالی ہوتا چلا گیا اور تمام تر قیاتی کام دھیرے دھیرے بند ہوتے چلے گئے۔

۶- ایرانی اور عرب امرا کی آپسی رسہ کشی اور کھینچ تان نے بھی خلافت و حکومت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

۷- ایرانی اور عرب امرا کی آپسی کشمکش نے ترک امرا کو اقتدار پر قابض ہونے کا موقع فراہم کر دیا جنھوں نے اپنی جہالت، اسلامی

تعلیمات سے بے بہرہ ہونے کے نتیجے میں خلافت کے ادراوں کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے زوال کی رفتار بڑھادی تھی۔

۸- اسلامی تعلیمات و اصولوں سے روگردانی بھی زوال کا ایک سبب قرار دی جاتی ہے۔

۹- ابتدائی دور کو چھوڑ کر عباسی خلافت و حکومت پر متعدد طالع آزمایا خاندان کا غلبہ و تسلط بھی اس کے زوال کا ایک سبب بتایا جاتا ہے۔

۱۰- سنی- شیعہ اختلافات نے جہاں ایک خلافت و حکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا وہیں سنی معاشرہ بھی مختلف قسم کے بحران اور

انتشار کا شکار ہو چکا تھا۔ ان سبب نے مل کر زوال کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔

۱۱- مختلف باطنی تحریکات جیسے قرامطہ، خوارج اور فاطمی وغیرہ نے بھی زوال میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

۱۲- اسلام دشمن اور خلافت کے مخالف عناصر نے خاص طور سے شیعہ عہدیداروں نے ”گھر کا بھیدی لٹکا ڈھانے“ کا کردار ادا کیا اور

اپنے ناممقول تعصبات کے سبب غیر ملکی طاقت- منگول- سے ساز باز، عباسی خلافت و حکومت کی آخری کیل ثابت ہوئی کہ انھوں نے اسے صفحہ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا۔

13.5 مصر میں عباسی خلافت کا احیا

مصر میں عباسی خلافت کا احیا کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب ہلاکوں خان کے ہاتھوں خلافت عباسیہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی تو پورے عالم اسلام ایک قسم کی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ بقول شاہ معین الدین ندوی مرحوم خلافت بغداد کے خاتمہ کے بعد ابونصر محمد بن ناصر ملقب بہ ظاہر باللہ (دور خلافت: ۶۲۲-۶۲۳ھ / ۱۲۲۵-۱۲۲۶ء) کے لڑکے ابوالقاسم احمد ملقب بہ مستنصر باللہ کسی طرح تاتاریوں کی قید سے نکل کر عرب سرداروں کی ایک جماعت کے ساتھ ۶۵۹ھ / ۱۲۶۲ء میں مصر جا پہنچے ہیں۔ اس وقت مصر میں مملوک خاندان کے چوتھے فرمانروا ملک ظاہر بیہرس کا دور اقتدار تھا۔ چونکہ خلافت بغداد کو دنیائے اسلام میں ایک دینی مرکزیت کی حیثیت حاصل تھی، سارے مسلمان عباسی خلفا کو اپنا دینی پیشوا سمجھتے تھے اور ان کو اس خلافت کے خاتمہ کا بڑا غم تھا اور اس کے دوبارہ قیام کی دلی آرزو تھی۔ جس ملک میں عباسی خلافت کا احیا ہوتا اس ملک اور اس کے حکمرانوں کا مقام و مرتبہ بہت بڑھ جاتا۔ ملک ظاہر بیہرس کو یہ موقعہ گھر بیٹھے بیٹھے مل رہا تھا لہذا انھوں نے اس اتفاق سے بھرپور فائدہ اٹھا کر پورے ادب و احترام اور بڑے تڑک و احتشام کے ساتھ مستنصر باللہ کو قاہرہ لے گئے اور ان کے ہاتھوں پر نہ صرف خود بلکہ ارباب حکومت اور عمائدین مصر نے بھی بیعت لی اور مصر میں ان کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر کے عالم اسلام میں عباسی خلافت کی احیا کا عام اعلان ۶۵۹ھ / ۱۲۶۲ء میں کر دیا جاتا ہے۔ اس رسمی کارروائی کے بعد خلیفہ وقت، ملک ظاہر بیہرس کو ایک دربار عام میں عمائدین سلطنت کے سامنے عباسی خلعت سے نواز کر انھیں عالم اسلام سے متعلق خلافت کی تمام تر ذمہ داریوں کو انجام دینے کا فریضہ سونپ دیتے ہیں اور اس حوالہ سے ان کے مختار مطلق ہونے کا فرمان جاری کر دیا جاتا ہے اور یوں مصر میں عباسی خلافت- نام ہی کی سہی- کے احیا کا عمل اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے جس کا دورانیہ تقریباً پونے تین سو سال پر محیط ہے۔

اس طویل دورانیہ میں مصر کے عباسی خلفا کو مذکورہ بالا رسمی کارروائی- بادشاہ وقت کو اپنی طرف سے امور مملکت کا مختار بنا کر خلعت عباسی سے نوازنا- کے علاوہ کسی بھی قسم کا کوئی بھی اختیار حاصل نہیں تھا تاہم کچھ حوصلہ مند خلفا نے خلافت کے وقار کو قائم کرنے کی کوشش کی، کچھ کو

عارضی کامیابی بھی ملی لیکن زیادہ تر کو اس جرأت مند قدم اٹھانے کی پاداش میں خلافت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

13.5.1 مصر میں عباسی خلافت کے خلفا اور ان کا دور اقتدار

مصر میں عباسی خلافت کے تقریباً پونے تین سو سال پر محیط طویل دورانیہ میں حسب ذیل ۱۸ خلفا نے مسند خلافت کو رونق بخشی تھی۔

- ۱- ابوالقاسم احمد بن ظاہر بامر اللہ ملقب بہ مستنصر باللہ (وفات: ۶۶۱ھ)، دور خلافت: ۶۵۹-۶۶۱ھ/۱۲۶۲-۱۲۶۳ء
- ۲- ابوالعباس احمد بن ابوعلی حسن باللہ ملقب بہ حاکم بامر اللہ (وفات: ۷۰۱ھ/۱۳۰۱ء)، دور خلافت: ۶۶۱-۷۰۱ھ/۱۲۶۳-۱۳۰۱ء
- ۳- ابوالریح سلیمان بن حاکم ملقب بہ مستکفی باللہ اول (وفات: ۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء)، دور خلافت: ۷۰۱-۷۴۰ھ/۱۳۰۱-۱۳۳۹ء
- ۴- ابوالسحاق ابراہیم بن محمد بن حاکم ملقب بہ واثق باللہ، دور خلافت: ۷۴۰-۷۴۱ھ/۱۳۳۹-۱۳۴۰ء
- ۵- ابوالعباس احمد بن مستکفی ملقب بہ حاکم بامر اللہ ثانی (وفات: ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء)، دور خلافت: ۷۴۱-۷۴۸ھ/۱۳۳۹-۱۳۴۷ء
- ۶- ابوبکر بن مستکفی ملقب بہ معتضد باللہ اول (وفات: ۷۶۳ھ/۱۳۶۲ء)، دور خلافت: ۷۴۸-۷۶۳ھ/۱۳۴۷-۱۳۶۲ء
- ۷- ابوعبداللہ محمد بن معتضد ملقب بہ متوکل علی اللہ اول (وفات: ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء)، دور خلافت: ۷۶۳-۸۰۸ھ/۱۳۶۲-۱۳۸۳ء
- ۸- ابوجعفر عمر بن معتصم ملقب بہ واثق باللہ (وفات: ۸۸۸ھ/۱۳۸۶ء)، دور خلافت: ۸۰۸-۸۸۸ھ/۱۳۸۳-۱۳۸۶ء
- ۹- زکریا بن معتصم ملقب بہ مستعصم (وفات: ۹۱۰ھ)، دور خلافت: ۸۸۸-۹۱۰ھ/۱۳۸۶-۱۳۸۹ء
- ۱۰- متوکل علی اللہ (وفات: ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء)، [دوسری مرتبہ]، دور خلافت: ۹۱۰-۸۰۸ھ/۱۳۸۹-۱۴۰۵ء
- ۱۱- ابوالفضل عباس بن متوکل ملقب بہ مستعین باللہ (وفات: ۸۳۳ھ/۸۰۸-۸۱۶ھ/۱۴۰۵-۱۴۱۴ء)
- ۱۲- ابوالفتح داؤد بن متوکل ملقب بہ معتضد باللہ (وفات: ۸۴۵ھ/۱۴۴۱ء)، دور خلافت: ۸۱۶-۸۴۵ھ/۱۴۱۴-۱۴۴۱ء
- ۱۳- ابوالریح سلیمان بن معتضد ملقب بہ مستعین باللہ ثانی (وفات: ۸۵۴ھ/۱۴۵۰ء)، دور خلافت: ۸۴۵-۸۵۴ھ/۱۴۴۱-۱۴۵۰ء
- ۱۴- ابوالبقاء حمزہ بن معتضد ملقب بہ قائم بامر اللہ (وفات: ۸۸۳ھ/۱۴۷۸ء)، دور خلافت: ۸۵۴-۸۵۹ھ/۱۴۵۰-۱۴۵۵ء
- ۱۵- ابوالحسن یوسف بن معتضد ملقب بہ مستجد باللہ ثانی (وفات: ۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء)، دور خلافت: ۸۵۹-۸۸۴ھ/۱۴۵۵-۱۴۷۹ء
- ۱۶- عبدالعزیز بن یعقوب ملقب بہ متوکل علی اللہ ثانی (وفات: ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء)، دور خلافت: ۸۸۴-۹۰۳ھ/۱۴۷۹-۱۴۹۷ء
- ۱۷- یعقوب بن عبدالعزیز ملقب بہ مستمسک باللہ (وفات: ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء)، دور خلافت: ۹۰۳-۹۲۰ھ/۱۴۹۷-۱۵۱۴ء
- ۱۸- محمد ملقب بہ متوکل علی اللہ ثالث، دور خلافت: ۹۲۰-۹۲۳ھ/۱۵۱۴-۱۵۱۸ء

13.6 عباسی خلافت کے محکمہ جات

اموی خلافت کے بہت سے محکمے اور شعبے، عباسی خلافت کو بطور وراثت ملے تھے اور کچھ نئے محکمے بھی بنائے گئے تھے۔ عہد اموی سے بطور وراثت منتقل ہونے والے اہم شعبوں میں فوج، ٹیکس، ڈاک کے علاوہ دیوان الرسائل (خطوط و فرامین کا محکمہ) اور دیوان الخاتم (کاغذات پر مہر لگانے، انھیں سر بہر کرنے کا محکمہ) تھے تاہم عہد عباسی میں ان میں بہت تبدیلیاں کی گئیں تھیں اور انھیں زیادہ ترقی

یافتہ بنایا گیا تھا۔

عہد عباسی میں جن محکموں کی اساس و بنیاد پڑی تھی وہ حسب ذیل ہیں:

- دیوان الاذمة: اس ادارہ میں مالیات کے خرچ کا حساب رکھا جاتا تھا۔

- دیوان النفقات: اس سے مراد اخراجات و مصارف کا خاص نگران محکمہ تھا۔ اسے اور دیوان الاذمة کو آج کی زبان میں کنٹولر اینڈ

آڈیٹر جنرل کہا جاسکتا ہے۔

- دیوان المظالم: عوام کی شکایات، خاص طور سے عہدے داروں سے ہونے والی شکایات، کو رفع کرنے کی خاطر اس ادارہ کی بنا

ڈالی گئی تھی۔

- دیوان الصوافی: اس ادارہ کو سرکاری/خليفة کی آراضی اور خاص جاگیروں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے بنایا گیا تھا جسے آج کی زبان

میں رجسٹرار آفس کہا جاسکتا ہے۔

- دیوان العرض: یہ محکمہ فوج کا ایک ذیلی ادارہ تھا جس کی ذمہ داری فوج کی نگرانی اور فوجیوں و سپاہیوں کا معائنہ کرنا تھا۔

- دیوان التوقيع: اس ادارہ کے ذریعہ درخواستوں اور شکایات کے نتیجے میں جاری کیے جانے والے احکامات کو نافذ کیا جاتا تھا۔

- دیوان السور: اس دفتر کے ذریعہ انتہائی راز داری کے کام انجام دیے جاتے تھے اور بہت ہی رازدارانہ فرامین جاری کیے جاتے

تھے۔ اس شعبہ کو آج کی زبان میں سیکرٹ سروس یا خفیہ ایجنسی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

13.6.1 عہد عباسی کا عدلیہ

عہد عباسی کے عدالتی نظام میں خلیفہ وقت ہی سب سے بڑا منصف ہوتا تھا۔ آج کی زبان میں اسے ”چیف جسٹس“ سے تعبیر کیا جاسکتا

ہے۔ وہ ہر قسم کے فیصلے کر سکتا تھا اور اس کے فیصلوں پر کہیں بھی اپیل نہیں کی جاسکتی تھی تاہم خلیفہ سے ہی سے نظر ثانی کی درخواست کی جاسکتی

تھی۔ اعزازی طور پر وزیر کو بھی یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ مقدمات کی سماعت کریں اور اپنے فیصلے سنائیں۔ عام طور پر قاضیوں کے تقرر کا اختیار

خلفا کے پاس ہوتا تھا تاہم کبھی کبھی وزیر بھی یہ فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ اسی طرح مرکزی قاضی خلیفہ کے ماتحت اور صوبائی قاضی گورنر کے

ماتحت اپنے فرائض منصبی انجام دیا کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عباسی عدلیہ مرکزی عدلیہ، صوبائی عدلیہ اور شہری عدلیہ میں

منقسم تھا۔ مرکزی عدلیہ کا قاضی ”قاضی القضاة“ کہلاتا تھا جو مرکزی عدلیہ کا سب سے بڑا قاضی ہوتا تھا۔ اس عہدہ کی شروعات عہد عباسی میں

ہی کی گئی تھی۔ خلیفہ مہدی کے زمانے میں امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کو اس عہدہ پر سب سے پہلے فائز کیا گیا تھا۔ عہد عباسی کے دیگر ناموران قاضی

القضاة میں احمد بن ابی داؤد (وفات ۲۴۰ھ/ ۸۵۴م) اور یحییٰ بن اشم (وفات ۲۴۲ھ/ ۸۵۷ء) کا بھی شمار ہوتا ہے۔

13.6.2 عہد عباسی میں فوج اور پولیس کا نظام

عہد عباسی میں پولیس کا نظام کافی بہتر تھا اور اس کے واجبات وہی تھے جو آج کل کی پولیس انجام دے رہی ہے۔ عہد عباسی کی پولیس

شہری پولیس اور خلیفہ کے ذاتی محافظ میں منقسم تھی۔ اس عہد کی فوج اور اس کے لشکر گاہ کو پانچ حصوں۔ مقدمہ، میمنہ، میسرہ، قلب اور ساقہ یا

مؤخرہ- میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ خلیفہ وقت فوج کا اعلیٰ سربراہ ہوتا تھا اور وہ کبھی کبھی اپنے اس منصب کا عملی استعمال بھی کرتا تھا کہ ہارون رشید، مامون اور معتصم جیسے خلفائے فوجوں کی قیادت کی تھی اور جنگوں میں بنفس نفیس شریک ہوئے تھے۔ خلیفہ کی غیر موجودگی میں فوج کی زمام کار صوبائی امیروں اور گورنروں اور بسا اوقات وزیروں کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ صوبائی امیروں اور گورنروں کے ماتحت رہنے والی فوج بسا اوقات مرکز کے خلاف بغاوت کا علم بھی بلند کر دیا کرتی تھی۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے خلیفہ معتصم کے زمانے سے فوج میں وردی کے استعمال کو رائج کیا گیا تھا۔
عہد عباسی کی فوج کو حسب ذیل زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱- بری فوج اور بحری فوج۔

۲- مستقل فوج اور رضا کار فوج۔ پہلی قسم کی فوج باقاعدہ تنخواہ یافتہ تھی جب کہ دوسری قسم کی فوج رضا کار فوجیوں پر مشتمل ہوتی تھی جن کی خدمات خاص خاص مواقع پر حاصل کی جاتی تھیں اور انھیں مال غنیمت سے حصہ دیا جاتا تھا۔

۳- گرمائی فوج اور سرمائی فوج۔

13.6.3 عہد عباسی کا مالی نظام

عباسی مالی نظام کی اساس و بنیاد عہد اموی کے مالی نظام پر تھی۔ عہد عباسی کے مالی نظام کو زیادہ بہتر بنانے کا سہرا خلیفہ ہارون رشید کے سر بندھتا ہے کہ انھوں نے خلافت و حکومت کے ذرائع آمدنی کو متعین کرنے کے لیے اپنے قاضی القضاة امام ابو یوسف سے ایک کتاب ”کتاب الخراج“ لکھوائی۔ اس کتاب سے عباسی سلطنت کے مالی نظام کو سمجھنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔

عہد عباسی کی آمدنی کے اہم ترین ذرائع صدقات، عشر، مال غنیمت کا خمس (پانچواں حصہ)، جزیہ، خراج و محاصل اور فنی کی آراضیاں تھیں۔ اسی طرح دینیوں، کانوں اور کچھ دیگر واسطوں سے بھی حکومت کو آمدنی ہوتی تھی۔ عہد عباسی کا مالی نظام کتنا مستحکم و مضبوط تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید اور مامون کے زمانے میں مالیہ کی کل رقم بالترتیب ساڑھے چوں کروڑ درہم اور چالیس کروڑ درہم سے زائد تھی۔ عہد عباسی میں مالیہ کی رقم میں حالات کی مناسبت سے اتار چڑھاؤ آتا رہتا تھا۔

13.7 عہد عباسی کا نظام تعلیم

عہد عباسی میں نظام تعلیم کا بنیادی ڈھانچہ وہی برقرار رہا جو عہد اموی سے چلا آ رہا تھا لیکن مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کی آمیزش نے اس نظام تعلیم میں کافی تبدیلیاں پیدا کر دیں تھیں۔ اس عہد میں نظام تعلیم تین مرحلوں- ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم- میں منقسم تھا۔

ابتدائی تعلیم کا آغاز چار برس کی عمر میں گھر سے ہوتا تھا اور اس کی تکمیل مکاتب میں ہوتی تھی، ابتدائی تعلیم بچے اور بچیوں دونوں کے لیے لازمی تھی۔ عام طور پر اسی مرحلہ میں کمزور طبقات کے بچوں کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا اور وہ اپنے مخصوص پیشوں سے وابستہ ہو جاتے تھے۔ اس مرحلہ کی تعلیم میں طلبہ قرآن کا ناظرہ پڑھتے تھے، معمولی حساب و گنتی سیکھتے تھے، قرآن کو حفظ کرتے اور قرأت و تجوید سیکھتے تھے اور حدیث و فقہ اور تاریخ و سیرت کے ابتدائی مرحلوں سے روشناس ہوتے تھے۔

ثانوی تعلیم کے مرحلہ میں بالعموم طلبہ مکاتب کے بڑے اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہو کر زیور تعلیم سے آراستہ ہوتے یا خلفا و اہل ثروت کے بچے یا نجی اساتذہ (المؤدبون) سے تعلیم حاصل کرتے تھے جو انھیں ان کے گھر پر جا کر پڑھایا کرتے تھے جنہیں آج عرف عام میں ٹیوٹر (اتالیق) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تعلیم کے اس مرحلہ میں طلبہ کو قرآن، حدیث، فقہ، سیرت، تاریخ، ریاضی و دیگر علوم کی کسی حد تک فنی تعلیم دی جاتی تھی۔

اعلیٰ تعلیم کے مرحلے میں طلبہ مختلف علوم و فنون کے اہل علم کے علمی حلقوں میں جا کر اپنے علم میں اضافہ کرتے تھے اور اپنی علمی ترقی کو دور کرتے تھے۔ مفسرین و محدثین، علماء، فقہاء، ادباء و شعرا اور دیگر علوم و فنون کے ماہرین کے حلقے پوری عباسی ریاست و مملکت میں پھیلے ہوئے تھے۔ بغداد، سامراء، مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، واسط، دمشق، نیشاپور، حلب، فسطاط، صنعاء اور بیت المقدس جیسے شہروں میں یہ علمی حلقے زیادہ پائے جاتے تھے۔ ان شہروں میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کے مراکز بھی پائے جاتے تھے جہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے گویا افراد اپنے اپنے مزاج اور مذاق کے مطابق تعلیم حاصل کرتے تھے۔ پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی کے بقول بغداد، دمشق، موصل، کوفہ، بصرہ اور حمص وغیرہ میں اعلیٰ تعلیم کے مراکز کی تعداد بیس تک جا پہنچتی ہے جو بیک وقت علم و فضل کی روشنی پھیلا رہے تھے۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ عہد عباسی کے بعض علمی مراکز بعض مخصوص علوم و فنون کے لیے زیادہ مشہور تھے جیسے مدینہ امام مالکؒ کی وجہ سے حدیث کا سب بڑا مرکز تھا، کوفہ و بصرہ نحو کے ساتھ ساتھ فقہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی مشہور و معروف تھے۔ خلیفہ مامون کے زمانے میں بغداد مختلف علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا جہاں مختلف علوم و فنون کی فنی تعلیم دی جاتی تھی۔

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے افراد عام طور سے تمام دینی علوم کے جامع ہوتے تھے۔ عام طور سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے پہلے دینی علوم میں مہارت پیدا کرتے تھے پھر کسی مخصوص فن میں کمال حاصل کرتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں میں سائنسی اور سماجی علوم جیسے تاریخ و سیرت نگاری، جغرافیہ، طب اور کیمیا و طبیعیات وغیرہ، حاصل کرنے والے افراد بھی ہوتے تھے۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے عہد عباسی کے نظام تعلیم کے ہر مرحلہ میں خصوصاً اعلیٰ تعلیم اور تخصص کے مرحلہ میں اساتذہ کے سامنے قرأت یا ان سے سماعت کو کافی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ انھیں ذہن میں مکمل طور پر محفوظ کر لیا جائے لہذا طلبہ کے لیے نہ صرف قرآن بلکہ احادیث و دیگر علوم و فنون کے مسائل کا ازبر ہونا لازمی قرار دیا گیا تھا۔

عہد عباسی میں اعلیٰ تعلیم کے بڑے علمی مراکز میں ”بیت الحکمة“ کا شمار ہوتا ہے۔ خاص طور پر خلیفہ مامون کے زمانہ میں اس مرکز کو سائنسی اور فلسفیانہ علوم و فنون کے حوالے سے مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

عہد عباسی کے چوتھے دور (۶۷۱ تا ۶۷۶ھ / ۱۰۵۵ تا ۱۲۵۸ء) میں پہلی سرکاری یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ یہ فضل سلجوقی عہد کے ایک عظیم دانشور و مفکر وزیر نظام الملک طوسی (وفات: ۴۸۵ھ / ۱۰۹۲ء) کو حاصل ہوا کہ انھوں نے ۴۵۹ھ / ۱۰۶۶ء میں مدرسہ نظامیہ کی بنیاد بغداد میں ڈالی جو بہت جلد ایک بڑے علمی مرکز میں بدل گیا جسے اس وقت کی سب سے بڑی یونیورسٹی قرار دیا جاتا تھا۔ اس مرکز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے امام غزالی (وفات ۵۵۵ھ) جیسی شخصیت کا شمار نہ صرف اس کے ”اولڈ بوائز“ میں ہوتا ہے بلکہ انھوں نے

وہاں تدریسی فرائض بھی انجام دیے تھے۔ یہ علمی مرکز سقوط بغداد کے بعد بھی باقی رہا اور صدیوں تک علم و فضل کے جویان کی تشنگی دور کرتا رہا۔ بعد میں یہ مرکز ”مدرسہ مستنصریہ“ میں مدغم ہو گیا تھا۔

نظام الملک طوسی نے ”مدرسہ نظامیہ“ کے نام سے ہی ایک اور مرکز نیشاپور میں قائم کیا تھا جس کے پرنسپل / وائس چانسلر امام الحرمین عبدالملک جوینی (وفات: ۸۷۸ھ) تھے۔ اس وقت نیشاپور میں مزید چار علمی مراکز پائے جاتے تھے۔

عہد عباسی کی دوسری بڑی یونیورسٹی کا قیام عہد عباسی کے بالکل آخر دور میں ہوا تھا۔ اس یونیورسٹی کو خلیفہ مستنصر نے ۱۲۳۴ء میں قائم کیا تھا جو ان کے نام کی مناسبت سے ”مدرسہ مستنصریہ“ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ عظیم مرکز چودھویں صدی تک برقرار رہنے کے بعد زمانہ کی دست و برد کا شکار ہو گیا۔

خلافتِ عباسی کا آخری اور چوتھا دور اس لحاظ سے ممتاز و منفرد قرار دیا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی کے دیگر ادوار کے مقابلہ میں اس دور انحطاط میں علم و فن کے فروغ کے لیے زیادہ سنجیدہ کوششیں کی گئی تھیں۔ اسی دور میں بقول پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی نظام الملک طوسی کی کوششوں سے بغداد، نیشاپور، طوس کے علاوہ ایران و ترکستان میں متعدد اعلیٰ تعلیم کے بڑے مراکز قائم کیے تھے جنہیں آج کی اصطلاح کے مطابق یونیورسٹیز کہا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے بھی اپنے عہد میں کئی ایک علمی مراکز کی داغ بیل ڈالی تھی۔ مزید یہ کہ ”مدرسہ نظامیہ“ سے متاثر ہو کر عراق، شام، فلسطین، مصر، خراسان، ترکستان میں بہت سے مراکز کی داغ بیل ڈالی گئی تھی جن میں سے بخارا، سمرقند، نساء، رے، تبریز، ترمذ، مرو، بلخ کے علمی مراکز زیادہ اہمیت کے حامل قرار دیے جاتے ہیں۔

13.8 عہد عباسی کا معاشرہ

عہد عباسی کا معاشرہ بنیادی طور پر دو اکائیوں۔ مسلم اور غیر مسلم۔ پر مشتمل تھا جنہیں حسب ذیل زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

- مسلم سماج: مسلم طبقہ عربوں اور غیر عربوں یا موالی پر مشتمل تھا۔
- غیر مسلم سماج: غیر مسلم طبقہ یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں وغیرہ پر مشتمل تھا جنہیں اصطلاحی طور پر ذمی سے موسوم کیا جاتا تھا۔
- نسلی یا علاقائی سماج: نسل یا علاقہ کے اعتبار سے عباسی سماج کو عرب، ایرانی، خراسانی، ترک، بربر اور جاٹ وغیرہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

- اقتصادی سماج: اقتصادی لحاظ سے عباسی معاشرہ کو اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

عہد عباسی کا معاشرہ، عہد اموی کے معاشرہ سے کچھ ملتا جلتا تھا۔ تاہم اس وقت کا عباسی معاشرہ بقول پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی اموی معاشرہ سے چھوٹا تھا کہ پورا اندلس و پرتگال اس معاشرہ سے نکل گیا تھا۔ اسی طرح عہد عباسی کے معاشرہ کے ہر طبقہ کی اندرونی ساخت میں تبدیلی آئی تھی اور ان کے سیاسی، سماجی رتبوں کے ساتھ ساتھ ان کے اقتصادی حالات بھی بدل گئے تھے۔

دینی اعتبار سے عہد عباسی کا معاشرہ صحابہ کرام اور اکثر تابعین کے فیوض و برکات سے بالکل ہی تہی دامن ہو چکا تھا۔ اس عہد کا صرف ابتدائی حصہ ہی تنج تابعین کے وجود باسعادت و برکات سے مستفیض ہو سکا تھا کہ خیر القرون کی تیسری نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ خیر القرون کی

اس کڑی کے خاتمہ کے بعد عباسی سماج و معاشرہ عام مسلم سماج و معاشرہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔

دنوی لحاظ سے بھی اس عہد میں عرب طبقات کی اکثریت کی اپنے اہم و بلند بالا مقام و مرتبہ سے محرومی نے معاشرتی حالات میں کافی ابترا اور افراتفری پیدا کر دی تھی بقول پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی ”اگر اسلامی روایات و اقدار کا لحاظ کیا جاتا تو مسلم عباسی معاشرہ میں اتنی افراتفری نہ مچتی“۔ عباسی عہد کے زریں دور کے نصف اول میں تو کسی حد تک عرب طبقات کی عزت نفس محفوظ رہی لیکن دھیرے دھیرے ان کا سیاسی و سماجی مقام و مرتبہ گرتا چلا گیا اور ان کی اقتصادی حالات بھی بگڑتے چلے گئے تھے کہ پہلے پہل ایرانیوں/خراسانیوں نے ان کی جگہ لے لی تھی اور جب خلیفہ معتصم کے عہد میں ترکوں کو عروج حاصل ہوا اور انھوں نے ایرانیوں کو مناصب حکومت سے بے دخل اور تمام مراعات سے محروم کر دیا لیکن اس تبدیلی سے عرب طبقات کی حالت زار میں کسی بھی قسم کی تبدیلی نہ پیدا ہو سکی۔ اسی لیے اس عہد کے معاشرہ و سماج کو ایرانی و ترکی عناصر کی برتری والا معاشرہ قرار دیا جاتا ہے جس کے رہن سہن، رسم و رواج اور طرز معاشرت پر عربوں کی چھاپ کی بجائے ایرانی و ترکی رنگ و ڈھنگ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے بقول پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی ”بہت سی معاشرتی خرابیاں اور عقائد و افکار کی برائیاں بھی پیدا ہوئیں“۔

عہد عباسی کے سماج و معاشرے میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا سب سے بڑا مظہر حکمران طبقہ تھا کہ عہد اموی میں حکمران خانوادوں نے اپنے دور خلافت و حکومت میں سیاسی اختلاف کے باوجود پورے خانوادہ بنو امیہ کو اپنے ساتھ رکھا اور حکمران خاندانوں کے ساتھ ساتھ دیگر خاندانوں کو بھی اعلیٰ عہدے اور مناصب سے نوازا گیا تھا جس کی وجہ سے اموی خاندان کا شیرازہ منتشر نہ ہو سکا اور وہ باہم متحد و شکر رہے۔ اموی خاندان کے مقابلہ میں عہد عباسی میں صرف بنو ہاشم کے افراد ہی حکومت کے تمام مناصب پر فائز اور تمام مراعات کے حق دار قرار دیے گئے تھے اور بنو ابی طالب، بنو نوفل و بنو مطلب کے افراد کو کسی بھی قسم کا کوئی عہدہ نہیں دیا گیا تھا۔ اس پر مستزاد حضرت علی کے خانوادہ کو بھی سیاسی مقاصد کے پیش نظر دشمن قرار دے دیا گیا تھا جب کہ عباسی خلافت کے لیے راہ ہموار کرنے میں اس خاندان نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ عہد عباسی میں حکمران طبقہ کے ساتھ ساتھ جس طبقے میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی تھی وہ طبقہ موالی تھا لیکن یہ تبدیلیاں پورے طبقہ موالی میں رونما نہیں ہوئیں تھیں بلکہ ان سے مستفید و مستفیض ہونے والے اس طبقہ کے صرف وہ افراد و اشخاص تھے جن کا تعلق دربار خلافت اور حکومت کے گلیاروں سے تھا۔ عام طبقہ موالی کے حالات میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں آئی تھی اور وہ پورے عہد عباسی میں کمتر اور فروتر ہی رہے۔ عام طبقہ موالی کو صرف یہ مالی فائدہ حاصل ہوا تھا کہ انھیں ان علاقوں میں جزیہ کی ادائیگی سے چھٹکارا مل گیا تھا جہاں نو مسلموں پر بھی جزیہ عائد کیا جاتا تھا۔

عہد عباسی کے غیر مسلم طبقات۔ یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں وغیرہ۔ پر ان حالات کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا تھا وہ ہنوز دیگر اسلامی ادوار کی طرح عباسی خلافت و حکومت کے سائے تلے امن و چین کی زندگی گزار رہے تھے جس کے عوض وہ جزیہ اور اپنی پیداواری زمین پر خرچ ادا کرتے تھے۔ ذمی طبقہ کو عہد عباسی میں اپنے مذہبی امور کی ادائیگی، سماجی اقدار و روایت کی پابندی کی آزادی تھی اور انھیں ہر طرح کی سماجی، اقتصادی اور تمدنی آزادی حاصل تھی۔ اس عہد میں اس طبقہ کے کچھ افراد کو کچھ حکومتی مناصب پر بھی فائز کیا گیا تھا۔

عہد عباسی میں غلاموں اور کنیزوں کے مقام و مرتبہ اور ساخت میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر اسلامی دور کی طرح اس

دور میں بھی اپنی اپنی زندگی گزارتے رہے کہ جنگوں میں قیدی بنایا جانا اور بازار میں فروخت کر دیا جانا ان کا مقدر تھا۔ اس عہد میں بس فرق یہ آیا تھا کہ ان کی سماجی قدر و منزلت ان کے آقا کے مطابق طے کی جاتی تھی اور انھیں جاگیروں وغیرہ سے بھی نوازا جاتا تھا۔ اسی طرح کچھ باندیوں کا خلفا کی بیویاں یا ان کی مائیں ہونے کی وجہ سے ایک مقام و مرتبہ حاصل ہو گیا تھا حالانکہ سماج میں ان کے باندی ہونے کی حیثیت برقرار تھی۔ ہر سماج کی طرح عہد عباسی کے سماج کو اعلیٰ، متوسط اور کمزور طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے جن کے اقتصادی حالات، طرز رہائش و رہن سہن اور کھانے پینے کا ڈھنگ، اس طبقہ کی منہ بولتی تصویر قرار دی جاسکتی ہے۔

عہد عباسی کا اعلیٰ طبقہ، خلفا، وزراء، امرا، حکومت کے اعلیٰ و اہم اراکین اور ان کے افراد خانہ پر مشتمل تھا۔ اسی طبقے میں بڑے تاجروں، کاشت کاروں اور صنعت کاروں کا بھی شمار ہوتا تھا۔ اس طبقے کی آمدنی سب سے زیادہ تھی۔ ان کے بعد اس عہد کے متوسط طبقے کا نمبر آتا ہے، یہ طبقہ متوسط آمدنی والوں پر مشتمل تھا جیسے حکومت کے دوسرے درجے کے اراکین، تنخواہ دار علماء و قضاة، درمیانی درجے کے تاجر، کاشت کار اور صنعت کار وغیرہ۔ اقتصادی لحاظ سے سب سے کمزور طبقہ غریبوں کا تھا جو عام فوجی، سپاہی، حکومت کے عام کارکنان، معماران، کاریگروں اور مزدوروں پر مشتمل تھا۔

13.9 عہد عباسی کے اسلامی فرقے

حضرت عثمان بن عفانؓ کے دور خلافت کے وسط تک اسلامی معاشرہ متحد و یکجا رہا حتیٰ کہ نو مسلم یہودی عبداللہ بن سبائے نے اسلامی معاشرہ میں فرقہ بندی کا پہلا بیج بویا جو آگے چل کر ”فرقہ بندیوں“ جیسے تناور درخت میں تبدیل ہو گیا۔ عہد عباسی میں پائے جانے والے اسلامی فرقوں کا مختصر تعارف درج ذیل سطور میں کرایا جا رہا ہے۔

3.9.1 شیعہ

اسلامی فرقوں میں سب سے قدیم اور اہم فرقہ ”شیعی فرقہ“ ہے۔ ابتدائی عہد میں لفظ ”شیعہ“ صرف حامی گروہ اور جماعت کے معنی میں مستعمل ہوتا تھا لیکن بہت جلد اس لفظ نے حضرت علیؓ کے حامیان اور انھیں خلافت کا مستحق سمجھنے والی جماعت کا لقب اختیار کر لیا۔ حضرت علیؓ کی شہادت تک یہ جماعت یکجا و متحد رہی لیکن بعد میں وہ مختلف گروہ میں تقسیم ہو گئی لیکن وہ تمام گروہ اپنے اصولی عقائد پر، معمولی ترمیم اور اختلاف کے ساتھ، قائم و دائم تھے۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امامت کے تصور نے جنم لیا کہ خلافت کے اصلی مستحقین صرف حضرت امام حسنؓ (وفات ۵۰ھ/۶۷۰ء) اور امام حسینؓ (وفات ۶۱ھ/۶۸۱ء) ہیں۔ امام حسنؓ نے جب حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری کا اعلان کیا تو نہ صرف ان پر لعن و طعن کی گئی بلکہ ان کی اولاد کو بھی خلافت کے استحقاق سے محروم کر دیا گیا۔ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت امام زین العابدینؓ (وفات ۹۴ھ/۷۱۳ء) کو حق خلافت کا دعویٰ کرنے کی دعوت دی گئی لیکن انھوں نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے بعد ان کے فرزند محمدؓ کی امامت کو لے کر شیعہ فرقہ مختلف ڈھروں میں تقسیم ہو گیا۔ تقسیم ہونے والے مختلف گروہ میں ”اثنا عشریہ فرقہ“ سب بڑا فرقہ بن کر ابھرا کہ وہ بارہ امام کے قائل تھے۔ اس فرقہ کے بارہویں امام محمد بن حسن عسکری

(وفات ۲۶۱ھ/۷۸۷ء) کو ”امام غائب“ کہا جاتا ہے کہ وہ سامرا کے ایک غار میں غائب ہو گئے تھے۔ انھیں ہی امام مہدی بھی کہا جاتا ہے جن کے ظہور کا انتظار شیعی فرقہ آج بھی کر رہا ہے۔

شیعہ فرقہ وقت کے ساتھ ساتھ گروہ درگروہ تقسیم ہوتا چلا گیا۔ اس تقسیم کی بنیادی وجہ شیعی عقائد کے حوالے سے پیدا ہونے والے اختلافات تھے۔ اس فرقہ کے چار بنیادی فرقے ہیں: کیسانیہ، زیدیہ، امامیہ اور غالیہ۔ یہ چاروں فرقے بھی آگے چل کے مختلف فرقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں جیسے کیسانیہ مختاریہ اور ہاشمیہ وغیرہ میں تقسیم ہو گئے، زیدیہ، جارودیہ اور سلیمانہ وغیرہ میں بٹ گئے، امامیہ سے باقریہ، اسماعیلیہ اور اثنا عشریہ وغیرہ جیسی شیعی جماعتیں پیدا ہوئیں اور غالیہ، سبائیہ اور کالمیہ وغیرہ میں منقسم ہو گئے۔

شیعی فرقوں کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ خلافت کا استحقاق صرف اور صرف حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ کی اولاد کو ہے۔ انھیں اس حق سے محروم کرنے والے غاصب قرار پائیں گے لہذا ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا یا ظاہری طاقت نہ ہو تو ان کی جڑوں کو کاٹنا ضروری ہے۔ اس عقیدے پر شیعی حضرات پورے عہد عباسی میں مکمل طور پر کار پابند رہے کہ کہیں بغاوتوں سے عباسی خلافت کو پریشانیوں میں ڈالتے رہے تو کہیں اس کی جڑوں کو کھودتے رہے جیسا کہ آل بویہ کے طرز عمل سے ثابت ہوتا ہے۔ خلافت عباسی کے زوال میں اس فرقہ کا بہت اہم کردار رہا ہے۔

13.9.2 خوارج

اس سے مراد وہ فرقہ ہے جنہوں نے مسئلہ تکمیل پر حضرت علیؑ کے نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے ان کی جماعت سے نکل گئے تھے۔ مشہور قول کے مطابق حضرت علیؑ کا ساتھ چھوڑنے کی وجہ سے اور اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار کے قول کے مطابق انھیں کوفہ سے باہر نکل جانے کی وجہ سے خوارج کہا جاتا ہے۔ دونوں میں وجہ تسمیہ میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ حضرت علیؑ کا ساتھ چھوڑنے کے بعد کوفہ سے نکل کر ”حروراء“ نامی مقام پر فروکش ہو گئے تھے۔

اس فرقہ کا بنیادی نظریہ اور عقیدہ ”لاحکم إلا للہ“ ہے کہ جس نے بھی اس سے روگردانی کی گویا اس نے اسلامی شعار سے منہ پھیر لیا ہے۔ خوارج کے مطابق چونکہ حضرت علیؑ نے مسئلہ تکمیل میں حضرت معاویہؓ سے صلح کر کے ”لاحکم إلا للہ“ کی خلاف ورزی کی تھی لہذا انھوں نے ان کی بیعت ختم کر کے اپنے لیے ایک نیا امام عبداللہ بن وہب را سبی چنا اور اس کے ہاتھوں پر بیعت کر لی۔ ابتدائی زمانہ میں خوارج نامی یہ فرقہ اپنے عقیدہ ”لاحکم إلا للہ“ کی وجہ سے ”المحکمۃ“ اور ”حروراء“ کے مقام پر بیعت ہونے کی وجہ سے ”الحروریۃ“ کہلایا۔ بعد میں اس فرقہ کے تمام پیروکار ان کو خوارج کا نام دے دیا گیا۔ ایک قول کے مطابق ابتدائی عہد کے خوارج ”شراۃ“ (شاری کی جمع، اپنے آپ کو خدا کی راہ میں بیچنے والے) کے نام سے جانے جاتے تھے۔ اسی طرح وہ اپنے ایک اہم سردار کے نام نجدہ بن عامر حروری کے نام پر ”النجدات“ بھی کہلاتے ہیں۔

شیعی فرقہ کی طرح خوارج کے وجود میں آنے کا سبب بھی سیاسی ہے لیکن آگے چل کر دونوں فرقوں نے دینی فرقے کا روپ اختیار کر لیا اور اسلامی فرقوں کی ایک مستقل اکائی بن گئے۔ بقول پروفیسر محمد سلیم مظهر صدیقی صاحب ”انھوں نے اپنا پورا دینی نظام اور سیاسی ڈھانچہ بنایا جو ان کے مخصوص نظریات و عقائد پر مبنی تھا۔ یہ دینی اور سیاسی نظام مدتوں کی سعی و کوشش اور حکومت وقت کے خلاف ان کی جنگوں کے بعد بنا تھا۔“

خوارج کا یہ فرقہ ابتدائی عہد میں ایک سیاسی طاقت بن کر ابھرا جس نے بہت جلد طاقت و قوت حاصل کر لی وہ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں امن و امان قائم نہ رہنے کا ایک بڑا سبب بن گئے جنھوں نے اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار کے بقول غیر ارادی طور پر حضرت علیؓ کے مقابلے میں حضرت معاویہؓ کی فتح کا سبب بن گئے تھے اور عباسی خلافت و حکومت کے قیام میں بھی مددگار ثابت ہوئے تھے۔ خلافت عباسیہ میں ان کی سیاسی اور فوجی طاقت ختم ہو گئی اور وہ محض ایک دینی فرقہ بن کر رہ گیا تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے عہد عباسی میں وقتاً فوقتاً سر اٹھانے کی کوشش کی تھی تاہم وہ بہت زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

آگے چل کر خوارج کا فرقہ بھی شیعہ فرقہ کی طرح مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ خوارج کا سب سے بڑا فرقہ ازرق تھا جو نافع بن ازرق کے پیروکار تھے۔ دوسرا بڑا فرقہ اباضیہ ہے جو عبداللہ بن اباض کے متبعین تھے۔ یہ فرقہ انتہا پسند ازرقہ سے علیحدہ ہو کر بنا تھا جس کے متبعین آج بھی عمان، طرابلس، مشرقی افریقہ، شمالی افریقہ، جنوبی عرب اور جنوبی جزائر میں پائے جاتے ہیں۔ تیسرا بڑا فرقہ صفریہ ہے۔ یہ فرقہ نافع بن ازرق کے ساتھ ”استعراض“ (مخالفین اور ان کے بال بچوں کے قتل) کے مسئلہ پر اختلاف کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا۔ اس فرقہ کو اباضیہ کے بعض اصولوں۔ جیسے غیر خارجی مسلمان کو مشرک نہ سمجھنا۔ سے بھی اختلاف تھا۔ مشہور قول کے مطابق زیاد بن اصفہر کی وجہ سے یہ فرقہ صفریہ کہلاتا تھا۔ اس کا دوسرا نام زیدیہ بھی ہے۔ خوارج کی اس تیسرے بڑے فرقے کی وجہ تسمیہ کے متعلق اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے کئی اقوال نقل کرتے ہوئے انھیں لغوی بھی قرار دیا ہے اور اس کے اشتقاقی عدم یقین کی وجہ اس کے ابتدائی حالات کا تاریکی میں ہونا قرار دیا ہے۔ مذکورہ بالا تینوں فرقوں کا شمار خوارج کے بڑے اور اہم فرقوں میں ہوتا ہے جن کی متعدد شاخوں کا ذکر کتب ملل و نحل میں ملتا ہے۔

13.9.3 مرجہ

یہ ایک دینی فرقہ تھا جو شیعہ اور خوارج کے سخت رویہ اور بالکل متضاد نظریات کی وجہ سے منظر عام پر آیا تھا کہ شیعہ اور خوارج اپنے اپنے عقائد کے مطابق بہت سے لوگوں کو دائرۃ اسلام سے خارج سمجھتے تھے اور انھیں کافر قرار دیتے تھے۔ یہ دونوں فرقے اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے اور ایک دوسرے کو باطل کا پیروکار مانتے تھے۔ ان کے مقابلے میں مرجہ نامی فرقہ وجود میں آیا جس کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ کوئی بھی شخص اس وقت تک دائرۃ اسلام سے خارج نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ وہ علی الاعلان اپنے اسلام کے چھوڑنے کا اعتراف نہ کرے، محض گناہ کبیرہ کی بنا پر کسی بھی شخص کو کافر نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس فرقہ کا نام لفظ ”ارجاء“ (مؤخر کرنا، امید ہونا) سے مشتق ہے۔

مرجہ، مسلمانوں کی آپسی لڑائی کو برا سمجھتے تھے لیکن وہ کسی کو بھی برا نہیں مانتے تھے اور نہ ہی اس کے اعمال کی بنیاد پر اس کے مؤمن یا کافر ہونے فیصلہ کرتے تھے۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ حق و باطل کا فیصلہ آخرت میں ہوگا اور فیصلہ کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے لہذا اس کے امور میں مداخلت غیر مناسب و غیر ضروری ہے۔

یہ فرقہ مرجہ کے نام سے اس لیے موسوم کیا جاتا ہے کہ وہ کسی کے متعلق فیصلہ کو مؤخر کرنے کے قائل تھے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے ایمان و اسلام کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ ایک دوسری وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ انھیں اللہ کی ذات سے مغفرت و بخشش کی پوری پوری امید تھی کہ وہ مسلسل گناہ کرنے کے بعد بھی بخش دے گا۔

پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی صاحب نے اس فرقہ کے چار مکاتب فکر۔ خوارج کے مرجہ، قدریہ کے مرجہ، جبریہ کے مرجہ اور خالص

مرجہ - کا ذکر کیا ہے اور خالص مرجہ کی ذیلی شاخوں جیسے یونسیہ، عبیدیہ وغیرہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

فرقہ مرجہ کو جماعت اہل سنت سے اس لیے الگ قرار دیا جاتا ہے کہ انھوں نے صرف ایمان کو ہی بخشش کا ذریعہ مانا ہے اور وہ عمل پر زور نہیں دیتے ہیں کہ اگر کسی کی وفات حالت ایمان میں ہو جائے تو اس کی بخشش یقینی ہے چاہے اس نے زندگی بھر کسی بھی قسم کے اچھے اعمال نہ کیے ہوں، نہ ہی فرائض کی ادائیگی کیے ہو بلکہ اس سے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب بھی ہوتا رہا ہو۔ ان کا یہ نظریہ اہل سنت کے نظریہ سے ٹکراتا ہے کہ وہ بھی کبیرہ گناہ کے مرتکب کے کافر ہونے کے قائل نہیں ہیں لیکن وہ اس بات کو مانتے ہیں کہ گناہ کبیرہ و صغیرہ کے مرتکب کی بخشش اور جنت میں داخلہ ان گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد ہی ہوگا، سوائے اس کے کہ اس نے مرنے سے پہلے سچی توبہ کر لی ہو۔ پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی صاحب کے بقول ”نجات کے لیے عمل و فرائض اسلام کو خارج کر کے انھوں نے بے عملی بلکہ بد عملی کا دروازہ کھول دیا۔ وہ ایمان اور اسلام دونوں کے اجتماع کو نہیں سمجھ سکے۔ اہل سنت کا عقیدہ صحیح ہے اور مؤثر بھی کہ ایمان و عمل صالح دونوں دنیا و آخرت دونوں میں سعادت و نجات کے لیے ضروری ہیں“۔

مرجہ فرقہ کے افکار و خیالات کا اثر حکومت وقت پر یہ پڑا تھا کہ ان کی بد عملی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی اور وہ بدستور امامت و قیادت کا استحقاق رکھتے تھے جب کہ ان کے مقابلہ میں خوارج کا کہنا یہ تھا کہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے امامت و قیادت کے منصب پر باقی نہیں رہ سکتے ہیں لہذا جب بھی خلفا کی بد عملیوں اور گناہوں کا ذکر کیا جاتا تو ایک طبقہ مرجہ کے افکار و نظریات کی انھیں معصوم قرار دیتا اور انھیں ان کے حق پر باقی رہنے کا استدلال کرتا تھا۔

13.9.4 معتزلہ

معتزلہ کا شمار بڑے اسلامی فرقوں میں ہوتا ہے۔ یہ فرقہ بھی غیر سیاسی تھا کہ اس کی بنا کی وجہ سیاسی کے بجائے دینی تھی۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کے چار بڑے فرقوں - شیعہ، خوارج، مرجہ اور معتزلہ - میں سے اول الذکر دو فرقے بنیادی طور پر سیاسی گروہ تھے جنھوں نے آگے چل کر دینی فرقہ کا قالب اختیار کر لیا تھا اور مؤخر الذکر دونوں فرقوں کی اساس دین تھا کہ وہ محض دینی نقطہ نظر کے اعتبار سے پروان چڑھے تھے۔ اس فرقہ کا دوسرا نام ”اصحاب عدل و توحید“ بھی ہے۔ بقول پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی صاحب انھیں ”قدریہ“ اور ”عدلیہ“ بھی کہا جاتا ہے

اس فرقہ کا نام لفظ ”اعتزل“ سے ماخوذ ہے جس کے معنی الگ ہو جانا یا جماعت چھوڑ دینا ہے۔ اسے عجیب اتفاق قرار دیا جاسکتا ہے کہ خوارج کے معنی بھی الگ ہو جانے والے یا جماعت چھوڑ دینے والے کے ہیں دونوں کے معنی ایک جیسے ہونے کے باوجود دو الگ الگ فرقے بن جانا ہی ان کے وجود میں آنے کے اصل کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ خوارج سیاسی بنیادوں پر حضرت علیؑ سے الگ ہوئے تھے جب کہ واصل بن عطاء نے دینی نقطہ نظر کی بنا پر اپنا جداگانہ راستہ بنایا تھا۔

یہ فرقہ بھی مرجہ کی طرح مسلمانوں کی خانہ جنگی کے نتیجے میں وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ اس کے وجود میں آنے کا سبب دینی تھا جس میں اس عہد میں فروغ پانے والی فکر اور فلسفہ کی آمیزش ہو چکی تھی۔ اس فرقہ کا ظہور عہد اموی کے اواخر میں ہوا تھا اور عروج و کمال مامون، معتصم اور واثق جیسے عباسی خلفا کے عہد میں ہوا تھا۔ اس فرقے کے بنیادی پانچ اصول - توحید، عدل، وعد و عید، سمع و عقل اور منزلة بن المنزلتین - ہیں

- ان پانچ اصولوں پر معتزلہ کے سارے گروہ متفق ہیں تاہم کچھ عقائد و اصول ایسے بھی ہیں جن میں وہ آپس میں جزوی اختلاف رکھتے ہیں۔ امامت و خلافت کے حوالے سے ان کے مختلف گروہ، مختلف نظریات کے قائل ہیں۔

مذکورہ بالا فرقوں کی طرح اس فرقہ کی بھی کئی شاخیں ہیں جن میں مشہور ترین فرقے واصلیہ (واصل بن عطاء (وفات ۱۳۱ھ/۷۴۸ء) کے پیرو کار)، ہذیلیہ (ابو ہذیل حمدان بن ہذیل علاف (وفات ۲۳۵ھ/۸۴۹ء کے متبعین) اور نظامیہ (ابراہیم بن سیار نظام (وفات ۲۳۱ھ/۸۴۵ء) کی پیروی کرنے والے) ہیں۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا فرقوں میں شیعہ اور معتزلہ کا فرقہ ہی عہد عباسی میں سرگرم رہا۔ باقی دونوں فرقوں - خوارج اور مرجہ - میں سے خوارج کا عہد عباسی کے ابتدائی دور میں ہی تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا اور ان کی سرگرمیاں نہ کے برابر ہو کر رہ گئیں تھیں جب کہ مرجہ فرقہ ایسا تھا جو کسی بھی عہد میں بہت سرگرم نہیں رہا۔ ان دونوں کے مقابلہ میں عہد عباسی میں شیعوں نے اپنی سرگرمیوں کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ حکومت وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے ارباب اقتدار کو مسلسل آزمائش وابتلا میں ڈالے رکھا۔

معتزلہ کا فرقہ اسلامی فرقوں میں اس لحاظ سے بھی منفرد قرار دیا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی میں ہی اسے اصل عروج و کمال حاصل ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے افکار و نظریات کو فروغ دینے کے لیے سیاسی میدان کی بجائے علمی محاذ کو چنا اور اپنے لازوال علمی کارناموں سے اسلامی علوم و فنون کے ذخیرے میں قابل ذکر اور قابل قدر سرمایہ کا اضافہ کیا جن سے آج بھی فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔

13.9.5 دیگر فرقے

مذکورہ بالا چاروں فرقوں کے علاوہ دیگر فرقے بھی اس عہد میں پائے جاتے تھے جیسے جبریہ، قدریہ، صفاتیہ وغیرہ لیکن معاشرے پر ان کے اثرات بہت ہی کم مرتب ہوئے تھے لہذا ان میں سے کچھ ناپید ہو گئے، کچھ ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔

13.10 عصر عباسی کی علمی سرگرمیاں

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم و فنون کو بنیادی طور پر دوزمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا زمرہ ان علوم و فنون پر مشتمل ہے جو عصر عباسی کے علما و فضلا کو اسلاف خصوصاً عہد اموی سے بطور ورثہ ملے تھے۔ دوسرا زمرہ ان علوم و فنون پر مشتمل ہے جن کی بنا عصر عباسی میں رکھی گئی تھی۔ عصر عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم و فنون پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عہد عباسی کے علما کو بطور ورثہ ملنے والے علوم و فنون کی تعداد زیادہ ہے۔

عہد عباسی میں فروغ پانے والے دونوں زمروں کو حسب ذیل علوم و فنون میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

- ☆ اسلامی علوم و فنون جیسے قرآنی علوم، علوم حدیث و فقہ اور ان کے متعلقات۔
- ☆ سائنسی علوم و فنون جیسے کیمیا (کیمسٹری)، طبیعیات (فزکس)، طب (میڈیسن) وغیرہ۔
- ☆ سماجی علوم جیسے تاریخ و جغرافیہ، فلسفہ و منطق وغیرہ اور ان کے متعلقات۔
- ☆ ادبی علوم و فنون جیسے نثر نگاری، شاعری، بلاغت وغیرہ اور ان کے متعلقات۔

مذکورہ علوم و فنون میں سے عہد عباسی میں اسلامی علوم و فنون کا سرمایہ سب سے زیادہ مرتب کیا گیا ہے۔ اسلامی علوم و فنون میں علوم قرآن کو سب سے زیادہ نمایاں مقام و مرتبہ حاصل ہے کہ قرآن کے مختلف پہلوؤں کو علمائے اسلام نے اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا تھا اور حاصل مطالعہ کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا تھا۔ قرآن کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر علمائے اسلام نے قلم نہ اٹھایا ہو۔

قرآن کے بعد حدیث و علوم حدیث کے موضوع پر ایک معتد بہ ذخیرہ علمائے اسلام نے مرتب کیا تھا۔ علم حدیث کے روایتی اور درایتی دونوں پہلوؤں پر سیر حاصل مباحث کیے گئے ہیں۔ حدیث کے ضمن میں اسماء الرجال جیسا علم پروان چڑھا جس کی نظیر آج تک نہ پیش کی جاسکی ہے۔

فقہ اور علوم فقہ پر بھی قابل ذکر سرمایہ مرتب کیا گیا ہے۔ سیرت نبوی کے موضوع پر بھی اہم ترین کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔ تذکرہ و تراجم کے موضوع پر بھی ایک قابل قدر سرمایہ مرتب کیا گیا تھا۔

مذکورہ بالا علوم و فنون کے بطن سے نئی شاخیں پھوٹیں تھیں جن میں اس عہد میں اتنے بال و پر آئے کہ آگے چل کر انہیں ایک مستقل علم و فن کا درجہ حاصل ہو گیا جیسے فن سیرت نبوی کہ اس کے ابتدائی خدو خال ہمیں حدیث میں ملتے ہیں لیکن آگے چل کر وہ ایک مستقل فن بن جاتا ہے۔ اسی طرح فن سیرت نگاری سے فن تاریخ پروان چڑھتا ہے جو آگے چل کر سیرت نبوی سے جدا ہو کر ایک مستقل علم و فن کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ جغرافیہ کے بطن سے سفر نامہ جیسی ادبی صنف پروان چڑھتی ہے۔

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے سماجی علوم و فنون میں تاریخ، جغرافیہ، تصوف، منطق و فلسفہ اور علم کلام جیسے علوم و فنون شامل ہیں۔ ان علوم و فنون پر عہد عباسی کے علمائے ایک گراں قدر سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔ اسی طرح متعدد ادبی علوم و فنون جیسے علم بلاغت، تنقید اور لغت جیسے علوم و فنون پروان چڑھے تھے۔ اس عہد کی نثر نگاری کو عربی ادب کی تاریخ میں سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں قرار دیا جاتا ہے۔ اس عہد کی نثر نگاری کے مقابلہ میں صرف عصر جدید کی نثر نگاری کو بطور نمونہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس عہد کی شاعری، اس کے موضوعات اور اصناف سخن میں بھی نمایاں تبدیلیاں ملتی ہیں۔

13.10.1 تحریک ترجمہ

تحریک ترجمہ عہد عباسی کی سب سے بااثر علمی تحریک تھی جس نے سماج کے ہر طبقے کو متاثر کیا تھا۔ اسی تحریک کے نتیجے میں مختلف علوم و فنون پروان چڑھے تھے اور عرب علماء و فضلا دیگر ممالک کے علمی و ادبی سرمایہ سے واقف ہو سکے تھے۔ تحریک ترجمہ کی وجہ سے ایک ایسا علمی ماحول پروان چڑھا تھا جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ اس کے بعد۔

تحریک ترجمہ کی ابتدا عہد اموی میں خلیفہ خالد بن ولید کے ہاتھوں ہوئی تھی کہ انھوں نے متعدد سائنسی کتب خاص طور پر کیمیا کی کتابوں کا ترجمہ کرایا تھا۔ ان سے پہلے ان کے جد امجد حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ترجمہ نگاری کی کچھ سرگرمیوں کا سراغ ملتا ہے تاہم حقیقی ترجمہ نگاری کی ابتدا خلیفہ خالد بن ولید کے ہاتھوں ہی ہوئی تھی کہ انھیں کے عہد میں پہلی مرتبہ علمی و فنی کتب کا ترجمہ عربی زبان میں کیا تھا۔

عباسی خلافت و حکومت میں فن ترجمہ پر بھرپور توجہ دی گئی بلکہ کچھ زیادہ ہی دی گئی کہ وہ ایک تحریک بن گئی جس کو تیز سے تیز تر کرنے میں عباسی خلفاء، ان کے وزرا، امرا اور دیگر اعیان سلطنت کے ساتھ ساتھ مختلف خانوادوں اور عوام الناس نے بھی نمایاں اور اہم کردار ادا کیا

ہے۔ اس تحریک نے ایک ایسی علمی فضا پروان چڑھا دی تھی جس کی مثال نہیں ملتی ہے۔
عہد عباسی میں تحریک ترجمہ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا دور (۱۳۶-۱۹۳ھ/۷۵۴-۸۰۸ء): اس دور کی ابتدا خلیفہ منصور کے عہد سے ہوتی ہے اور خاتمہ ہارون رشید کے عہد پر ہوتا ہے۔ اس عہد کے اہم مترجمین میں ابن بطریق، جورجیس بن جبرائیل، عبداللہ بن مقفع، یوحنا بن ماسویہ، سلام بن ابرش اور باسیل مطران ہیں۔
دوسرا دور (۱۹۸-۳۰۰ھ/۸۱۴-۹۱۳ء): اس دور کی ابتدا خلیفہ مامون کے دور حکومت سے ہوتی ہے۔ اس دور کے نمایاں مترجمین میں یوحنا بن بطریق، حجاج بن یوسف مطر، قسطا بن لوقا، عبدالمسیح بن ناعمہ حمصی، حنین بن اسحاق، ثابت بن قرہ صابی، حبیش بن حسن کا شمار ہوتا ہے۔ ترجمہ نگاری کا یہ دور تاریخ ترجمہ کا سب سے زریں عہد ہے۔

تیسرا دور (۳۰۱-۴۵۰ھ/۹۱۳-۱۰۵۸ء): تیسرے دور کے قابل ذکر مترجمین میں سنان بن ثابت بن قرہ، یحییٰ بن عدی، ابوعلی بن زرہ، ہلال بن ہلال حمصی، متی بن یونس اور عیسیٰ بن سہر بخت ہیں۔ اس دور میں فلسفیانہ کتابوں کے ترجمے کی بجائے ادبی کتابوں، خاص طور پر فارسی ادب کے ترجمے پر خصوصی توجہ دی گئی تھی کہ فلسفہ کی زیادہ تر اہم اور معرکتہ آرا کتابوں کا ترجمہ ہو چکا تھا۔

عہد عباسی میں یونانی، فارسی، کلدانی، نبطی، سریانی، عبرانی، قبطی، سنسکرت، پہلوی، رومی، لاطینی (قدیم رومی زبان) اور آرامی جیسی زبانوں میں لکھی گئی کتابوں کا عربی ترجمہ کیا گیا۔ ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی کی تحقیق کے مطابق عہد عباسی میں ۵۰۰ سے زائد مترجمین نے مجموعی طور ۱۹ زبانوں کی کتابوں کو عربی کے قالب میں ڈھالا تھا جنہیں موضوعاتی طور ۳۰ علوم و فنون - طب، ہندسہ و حساب، منطق و فلسفہ، فلکیات، زراعت، تاریخ و سیر، موسیقی، نجوم و ہیئت، جغرافیہ، ادیان و مذاہب، تعبیر خواب، سحر اور ادب وغیرہ - میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

عہد عباسی میں ترجمہ کی جانے والی کتب پر کچھ اعتراضات بھی کیے جاتے ہیں جن کا تعلق ترجمہ کی صحت، مترجمین کا ترجمہ پر قادر نہ ہونے کی بنا پر ترجمہ میں خیانت کرنا اور ان کی اکثریت کا غیر مسلم ہونا وغیرہ وغیرہ ہیں لیکن بقول ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی یہ تمام اعتراضات بے سرو پا ہیں اور ان کا حقیقت سے دور دور تک واسطہ نہیں ہے جن کے متعدد منہ بولتے ثبوت مصادر و مراجع میں موجود ہیں۔

عہد عباسی کی تحریک ترجمہ نے علوم و فنون کے فروغ اور تہذیب و ثقافت پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اس تحریک کے نتیجے میں عربوں میں ذہنی اور فکری بیداری پیدا ہوئی تھی اور ان کے سامنے غور و فکر کی ایک وسیع دنیا وا ہو گئی تھی۔ اس بیداری کا سب سے خوبصورت نتیجہ یہ نکلا کہ فارسی، سنسکرت، سریانی اور یونانی زبانوں کے علمی سرمایہ کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا آغاز ہوا تھا جس کا سلسلہ کئی صدیوں تک چلتا رہا۔ مسلم علما و فضلاء نے ان تراجم کی مدد سے مختلف علوم و فنون میں اپنی ایک شناخت بنالی تھی۔

تحریک ترجمہ کے اثرات صرف سائنسی اور سماجی علوم پر مرتب نہیں ہوئے تھے بلکہ اس کے اثرات ادبی علوم و فنون پر بھی مرتب ہوئے تھے۔ فارسی ادب کا اچھا خاصا سرمایہ عربی زبان میں منتقل کیا گیا تھا جس سے متاثر ہو کر عرب ادبا نے ایسا عربی ادب تخلیق کیا تھا جو نئے افکار و میلانات کا ترجمان تھا۔ یہ طرز اسلوب، ایرانی و فارسی طرز بیان و اسلوب سے کافی متاثر تھا جس کے نتیجے میں ایک نیا انداز تحریر سامنے آیا جس کی سحر بیانی کے سبھی معترف ہیں۔ اس طرز تحریر اور اسلوب بیان نے عربی ادب کے مختلف موضوعات میں کافی کشادگی پیدا کر دی تھی۔

تحریک ترجمہ کا ایک نمایاں اثر عربی زبان پر یہ مرتب ہوا تھا کہ اس تحریک نے اس کی بنیادی ماہیت و پہچان ہی بدل کر رکھ دی۔ عہد

عباسی میں پروان چڑھنے والی تحریک ترجمہ سے قبل عربی زبان کی پہچان و شناخت صرف ادبی زبان ہونے کی تھی اور اس کا شمار علمی زبانوں میں نہیں ہوتا تھا۔ تحریک ترجمہ کے نتیجے میں علمی مصطلحات اور فلسفیانہ تعبیرات کی وجہ سے عربی زبان کا دامن کافی وسیع اور کشادہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی محدود شناخت ختم ہو گئی تھی اور اس کا شمار بھی علمی زبانوں میں ہونے لگا تھا۔

13.11 عصر عباسی کی نثر نگاری

عربی نثر نگاری کا جتنا فروغ عصر عباسی میں ہوا اتنا فروغ عصر جدید کو چھوڑ کر کسی اور عہد میں نہ ہو سکا۔ اس کی بنیادی وجوہات میں مختلف علوم و فنون کا ارتقا، مختلف اقوام و ملل اور تہذیب و تمدن کا آپس میں ملاپ وغیرہ شامل ہیں۔ اس صورت حال میں تحریک ترجمہ نے سونے پہ سہاگہ کا کام کیا اور اہل علم و فن نے اپنے افکار و خیالات و نظریات کو پیش کرنے کے لیے نظم کی بجائے نثر کا سہارا لیا کہ ہر مضمون کو شعری قالب میں نہیں ڈھالا جاسکتا تھا۔ اس عہد میں ادبی، سماجی، سیاسی، دینی اور سائنسی علوم و فنون پر مشتمل گراں قدر تصانیف منظر عام پر آئیں جن کے گہرے اثرات اس وقت اور مابعد ادوار پر مرتب ہوئے۔ مذکورہ بالا علوم و فنون پر لکھی جانے والی کتب نے جہاں ایک طرف عربی نثر نگاری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا وہیں عربی زبان کے دامن کو بہت زیادہ وسیع اور اس قابل بنا دیا کہ وہ کسی بھی قسم کے موضوع کا احاطہ کر سکے۔

عہد عباسی میں عربی نثر نگاری اپنے سب سے اہم اور طاقت ور دور میں داخل ہوتی ہے، اس کے موضوعات اور مضامین کا دائرہ کافی وسیع ہو جاتا ہے اور اس کے جلو میں نت نئی خالص ادبی اصناف کا ظہور ہوتا ہے جس کے نتیجے میں اس عہد کی نثر نگاری اوج کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ عہد عباسی میں پروان چڑھنے والی نثر کا مقابلہ و موازنہ صرف عصر جدید میں پروان چڑھنے والی نثر سے کیا جاسکتا ہے۔

عہد عباسی کی نثر نگاری کو فروغ دینے میں جہاں اسلامی علوم و فنون جیسے علوم قرآن و علوم حدیث و علوم فقہ وغیرہ نے نمایاں کردار ادا کیا تھا وہیں سماجی علوم جیسے تاریخ و جغرافیہ، فلسفہ و منطق اور علم کلام وغیرہ نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان علوم و فنون کے شانہ بشانہ زبان و بیان سے تعلق رکھنے والے علوم جیسے علم نحو، علم صرف، علم بلاغت و تنقید اور علم لغت وغیرہ نے بھی عہد عباسی کی نثر نگاری کو پروان چڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ان سب پر مستزاد خالص ادبی اصناف سخن جیسے خطابت، رسائل و توفیعات، مقامات و سفر ناموں وغیرہ نے عہد عباسی کی نثر نگاری میں چار چاند لگا دیے تھے۔ ان سب علوم و فنون کی وجہ سے عربی زبان و ادب کا دامن اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ اس میں ہر قسم کے موضوعات و مضامین سما گئے تھے اور خشک سے خشک مباحث کو عرب نثر نگاران، خوبصورت اور دلکش انداز بیان اور اسلوب میں پیش کرنے لگے تھے۔

یہ عجیب و غریب اتفاق ہے عہد عباسی کی ادبی اور فنی نثر نگاری کا آغاز ایک غیر عرب کی کوششوں اور پہلوی ادب کے عربی ترجمہ سے ہوتا ہے، عبداللہ بن مقفع نے پنج نثر کے پہلوی ترجمہ کو عربی کے قالب میں ڈھال کر کے اسے ’کلیلہ و دمنہ‘ سے موسوم کیا تھا جو عربی نثر کا ایک عمدہ نمونہ اور ماڈل بن گیا تھا۔ اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج بھی اس کے ساحرانہ اسلوب کے اثرات باقی ہیں اور پڑھنے والا اس کے سحر میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ کتاب اپنی نظیر آپ ہے کہ آج تک اس کا بدل نہ پیش کیا جاسکا اور وہ سہل متنع کی ایک ایسی مثال بن گئی جس کی پیروی ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔

عہد عباسی میں خالص نثری ادب کو فروغ دینے اور پروان چڑھانے میں مشہور عباسی ادیب عمرو بن بحر المعروف جاحظ، نے سب سے

اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے خالص ادبی کتب کے ساتھ ساتھ دیگر موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اور گراں قدر کتابیں بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ انھوں نے اپنے طرز بیان و اسلوب سے عربی نثر کا ایک علمی رنگ و آہنگ متعین کر دیا تھا جس میں ادبیت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔

عہد عباسی میں ان دونوں کے علاوہ جن باکمال ادبا نے عربی نثر نگاری کے فروغ میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے ان میں ابو عبیدہ، اصمعی، سہل بن ہارون، ابراہیم صولی، ابن قتیبہ، قدامہ بن جعفر، مبرد، ابن العمید، ابوالفرج اصفہانی، صاحب بن عباد، خوارزمی، بدیع الزماں ہمدانی، ابوالقاسم حریری، قاضی فاضل اور ضیاء الدین ابن اثیر وغیرہ کے نام نامی شامل ہیں۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ عصر عباسی میں پروان چڑھنے والی تہذیب و تمدن، سیاست و معیشت اور معاشرتی انقلاب کے جتنے اثرات شاعری پر مرتب ہوئے، اتنے نثر پر مرتب نہیں ہوئے تھے۔ غالباً اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ عربی شاعری کی ایک روایت موجود تھی اور اس کا ایک معتد بہ حصہ اور سرمایہ موجود تھا۔ شاعری کے مقابلہ میں نثری سرمایہ بہر حال کم تھا اور اس کی کوئی مضبوط روایت بھی نہیں پائی جاتی تھی کہ عہد عباسی میں پروان چڑھنے والی نثر کا موازنہ و مقابلہ ماقبل کی نثر سے کیا جاتا، غالباً اسی لیے کہا جاتا ہے کہ عربی نثر کا بنیادی ارتقا عہد عباسی میں ہی ہوا تھا۔

13.11.1 عہد عباسی کے نثر نگاران کے طبقات

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والی ادبی نثر نگاری کو اسلوب اور طرز بیان کے اعتبار سے چار طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا طبقہ: اس طبقے کا سردار عبداللہ بن مقفع کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس طبقے کے دیگر انشا پردازوں میں یعقوب بن داؤد، جعفر بن یحییٰ، حسن بن سہل، عمرو بن مسعدہ، سہل بن ہارون اور حسن بن وہب وغیرہ ہیں۔ دوسرا طبقہ: اس طبقے کی سربراہی مشہور عباسی ادیب جاحظ کرتے ہیں۔ اس طبقے کے دیگر لوگوں میں ابن قتیبہ، مبرد اور ابوبکر صولی وغیرہ ہیں۔

تیسرا طبقہ: اس طبقے کا امام ابن العمید جیسے ادیب کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس طبقے میں صاحب بن عباد، وزیر مہلمی، خوارزمی، بدیع الزماں ہمدانی، صابی اور ثعالبی جیسے اصحاب قلم شامل ہیں۔

چوتھا طبقہ: چوتھے طبقے کے سردار قاضی فاضل ہیں۔ اس طبقے میں المثل السائر کے مصنف ابن الاثیر، کاتب اصہبانی اور ابوالقاسم حریری وغیرہ ہیں۔

13.11.2 نثر نگاری کے اصناف

عہد عباسی میں فروغ پانے والی نثر نگاری کو ”علمی نثر، فلسفیانہ نثر، تاریخی نثر اور خالص ادبی نثر“ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر کفیل احمد قاسمی صاحب نے خالص ادبی نثر کو قدیم نثر کا تسلسل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ”اس کی بعض صورتیں اتنی نئی اور اچھوتی تھیں کہ عربوں نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا تھا..... خطابت، مناظرے، علوم لسانیہ، تاریخ نویسی، علوم شرعیہ، فلسفہ اور علم کلام کے ساتھ ساتھ دیگر نثری اصناف کے لیے راہیں ہموار ہوئیں چنانچہ دفتری کاروائیاں، انشا و ترسیل کے لیے ترقی کا سبب بنیں تو قصص و حکایات سے لوگوں کی دلچسپی نے نثر کے دائرے میں مزید وسعت پیدا کی۔ نحو و صرف اور بلاغت کی تدوین سے زبان صاف ستھری ہو گئی..... اور خالص ادبی نثر کے بے شمار نمونے سامنے آئے۔ اب

ضرورت اس بات کی محسوس ہوئی کہ معیاری اور غیر معیاری نمونوں کی شناخت ہو لہذا فن تنقید کے اصول و ضوابط کی تدوین ہوئی۔ اس دور کی دیگر نثری اقسام میں مراسلہ نویسی، عہد نامے، وصایا اور توفیقات کو فروغ ہوا دفتری خطوط لکھنے پر انہیں لوگوں کو مامور کیا جاتا تھا جن میں ادب کا ذوق اور بلاغت کا ملکہ ہوتا تھا۔ ان لوگوں کو مختلف علوم و فنون سے واقفیت ہوتی تھی۔ یہ مراسلات ملک کے انتظامی امور، حکام کے تقرر، خلفا کے لیے بیعت، فتوحات جہاد، ملک میں امن و امان اور حکام کو وصیت، لوگوں کو تہنیت یا تعزیت جیسے موضوعات پر مشتمل ہوتی تھیں۔‘

13.12 عصر عباسی کی شاعری

عربی شاعری کے تمام ادوار میں عہد عباسی کی شاعری متعدد اور گونا گوں صفات، امتیازات اور خصوصیات کی وجہ سے منفرد و ممتاز نظر آتی ہے۔ عہد عباسی کو کئی ایک تہذیبوں اور ثقافتوں کا نقطہ اتصال قرار دیا جاتا ہے، اس عہد میں مختلف اقوام و ملل اور ان کی تہذیب و ثقافت ایک دوسرے سے گلے ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

عہد عباسی میں شاعری کے فروغ پانے کا ایک اہم و بنیادی سبب اس کا کسب معاش، عزت و شہرت اور مال و دولت حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن جانا بھی تھا کہ خلفا و امرا اور حکمران طبقہ کے درباروں میں شعرا کی کافی زیادہ پذیرائی کی جاتی تھی اور انھیں بیش قیمت انعامات سے نوازا جاتا تھا گویا انھیں سرکاری سرپرستی حاصل ہو جاتی تھی۔ اس سرکاری سرپرستی کی وجہ سے اس عہد کے شعرا کو دیگر ادوار شاعری کے مقابلہ میں جتنا زیادہ بڑا اور وسیع میدان اس عہد میں ملا وہ کسی اور دور میں میسر نہیں آسکا تھا۔ اسی طرح انھیں خلفا، حکما اور امرا کی خلوتوں میں رہنے کا زیادہ موقع ملتا تھا لہذا وہ مکمل یکسوئی و آزادی کے ساتھ شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہوئے اپنے فکر و فن کو شاعری کے قالب میں ڈھالتے رہتے تھے جس کے نتیجے میں عربی شاعری کا دامن مزید مالا مال ہوا اور وہ عربی زبان و ادب کی تاریخ میں زندہ و جاوید ہو کر رہ گئے۔

عہد عباسی کی شاعری کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسے فروغ دینے میں خالص عرب افراد کے شانہ بشانہ اہل عجم نے بھی نمایاں کردار ادا کیا تھا بلکہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عہد عباسی کی شاعری اہل عجم کی ہی مرہون منت ہے کہ اس عہد کے نمایاں ترین شعرا کا تعلق دیار عجم سے تھا جنہوں نے عربی شاعری کے طرز و اسلوب، مضامین و موضوعات، معانی و خیالات اور اوزان و بحر وغیرہ میں نمایاں تبدیلیاں کرتے ہوئے عربی شاعری کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا تھا اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے شاعری کے عمدہ ترین شہ پاروں اور متعدد گہر بار اور آبدار موتیوں سے عربی شاعری کے دامن کو بھر دیا تھا۔

عصر عباسی کی شاعری، عربی شاعری کے دیگر تمام ادوار سے اس لحاظ سے ممتاز قرار پاتی ہے کہ اس عہد میں قدامت کے طرز اسلوب و بیان سے صرف نظر کرتے ہوئے شعرا نے ایک نیا طرز و اسلوب اختیار کیا تھا کہ وہ محبوبہ کی یاد میں آنسو بہاتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں بلکہ وہ اپنے قصائد کا آغاز اپنے ذوق کی مناسبت سے مختلف رنگ و ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ قدیم اصناف سخن۔ جیسے مدح، مرثیہ اور ہجو وغیرہ۔ کے دائرہ کار میں وسعت کے ساتھ ساتھ چند جدید موضوعات شاعری۔ غزل، غلمان، زہدیات، طردیات، نخریات وغیرہ۔ منظر عام پر آتے ہیں گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی کے موضوعات شاعری میں مجموعی طور پر کافی نمایاں تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے

کہ اس عہد میں بھی قدیم اسلوب و انداز میں شاعری کرنے والے شعرا بھی موجود تھے جن کی شاعری پر جدید ماحول اور حالات و اثرات یا تو مرتب ہی نہیں ہوئے تھے یا برائے نام مرتب ہوئے تھے۔

عصر عباسی کی شاعری میں پیدا ہونے والی مختلف قسم کی تبدیلیوں کا تعلق صرف قصیدہ کی شکل اور مطلع کی تبدیلی سے نہیں تھا بلکہ بحور و قوافی سے بھی تھا، اس عہد کے شعرا نے ان میں تبدیلی کرتے ہوئے شعر کی موسیقیت میں اضافہ کر دیا تھا۔ انھوں نے جدید تہذیب و ثقافت سے استفادہ کرتے ہوئے نئے تجربات کیے جنہیں اتفاق سے دوام حاصل نہ ہو سکا۔ انھوں نے مقطعات، مخمسات اور مسمطات جیسے اسلوب سے عربی شاعری کو روشناس کیا لیکن انہیں عام مقبولیت نہ مل سکی۔ مزید یہ کہ انھوں نے معانی میں جدت پیدا کی، الفاظ اور تراکیب میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں جس نے آگے چل کر علم بدیع کی بنیاد رکھی تھی۔

اس عہد کی شاعری میں ایک نمایاں تبدیلی یہ آئی تھی کہ اس نے غنا اور موسیقیت پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے تھے، بعض شعرا نے صرف ایسے قصیدے لکھے جنہیں گایا جاسکے۔ یہ شعرا کبھی لمبے لمبے قصائد لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کبھی صرف تین تا پانچ اشعار پر مشتمل قصیدے لکھتے ہیں تاکہ ان کی دھن بنانے اور گانے میں آسانی ہو سکے۔ جب کہ بعض شعرا نے درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے غنا اور شعر کو یکجا کر دیا تھا جیسے اسحاق بن ابراہیم موصلی اور ابراہیم بن مہدی وغیرہ۔

لفظیات اور اسلوب کے حوالے سے اس عہد کی شاعری میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں تھیں جیسے نامانوس اور بھاری بھر کم الفاظ کا استعمال کم کیا جانے لگا، بدوی زندگی سے متعلق الفاظ کو بتدریج کم کیا گیا اور عجمی الفاظ کا استعمال کیا جانے لگا۔ شاعری کے اسلوب بیان میں نفاست اور باریکی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ عربی کے خالص محاورے اور وضاحت کلام کا خیال رکھتے ہوئے صنعت بدائع اور اس کی مختلف انواع کو کثرت سے برتا گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ججروں کو بکثرت استعمال کیا گیا اور کچھ نئے اوزان و بحور جیسے مستطیل و ممتد کا اضافہ ہوا۔ شاعری کی اقسام میں جہاں ایک طرف زہدیات، شکاریات (طرديات) اور خمریات کا اضافہ ہوا تو دوسری طرف قوافی میں مسمط اور مزدوج کو فروغ ہوا۔

قصائد کا کھنڈرات کی بجائے محلات و باغات اور شراب وغیرہ سے آغاز، مدح اور ہجو میں مبالغہ آمیزی، تشبیہ و استعارہ کا بکثرت استعمال، قصیدے کے مختلف اجزا میں تناسب و موزونیت کا پایا جانا اور بندش میں ترتیب کی رعایت کا خیال رکھنا وغیرہ کو اس عہد کے اسلوب شاعری میں ہونے والی تبدیلیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عصر عباسی میں ہونے والی ان جدید تبدیلیوں کے باوجود بہت سے شعرا قدیم اسلوب میں ہی اپنی شاعری کے جلوے بکھیر رہے تھے۔ وہ شعرا چونکہ ان ہونے والی تبدیلیوں کو روک نہیں سکتے تھے لہذا انھوں نے قدیم اسلوب کی حفاظت کا بیڑا اٹھا لیا وہ اپنے جیسے شعرا کو اس بات پر آمادہ کرتے تھے کہ وہ قدیم اسلوب کی پیروی کرتے رہیں۔ شاید اسی سے متاثر ہو کر ابن قتیبہ نے بھی اپنی کتاب میں قدیم اسلوب کی حفاظت پر زور دیا تھا۔

13.12.1 عہد عباسی کے شعرا کے طبقات

عہد عباسی کے شعرا کو تین بڑے طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے:

پہلا طبقہ: عہد عباسی کا پہلا طبقہ مخضرم شعرا کا ہے جنہوں نے عہد اموی کا اواخر اور عہد عباسی کا اوّلین دور پایا تھا۔ ایسے شعرا کو اصطلاحی

طور پر ”مخضر میں شعرا“ کہا جاتا ہے۔ انھیں شعرا نے عہد عباسی کی شاعری میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مخضر میں شعرا کو دو زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

☆ پہلا زمرہ ان شعرا پر مشتمل ہے جنھوں نے قدیم اسلوب کی ہی مکمل طور پر پیروی اختیار کر رکھی تھی اور بدوی و روایتی انداز فکر میں اپنی شاعری کے جلوے بکھیر رہے تھے۔ انھوں نے نئے انداز بیان اور اسلوب شاعری کو قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا جیسے مروان بن ابی حفصہ، حسین بن مطیر اور ابن ہرمہ وغیرہ۔ مؤخر الذکر کے بارے میں مشہور ناقد اصمعی کا کہنا ہے کہ اس کی وفات کے ساتھ ہی اصل عربی شاعری کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ آخری شاعر جس کے اشعار سے لغوی استشہاد کیا جاسکتا ہے۔

☆ دوسرا زمرہ ان شعرا پر مشتمل ہے جنھوں نے قدیم کی حفاظت کرتے ہوئے جدید اسلوب کو اختیار کیا اور قدیم و جدید اسلوب کو یکجا کرتے ہوئے اظہار سخن کرنے کا آغاز کیا اور شاعری کے دونوں انداز و اسلوب میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھرپور انداز میں اظہار کیا تھا۔ اس طبقہ کی نمائندگی بشار بن برد اور ابو نواس جیسے شعرا کرتے ہیں۔

دوسرا طبقہ: خالص جدید طرز و اسلوب بیان کے شعرا پر مشتمل ہے جنھوں نے عربی شاعری کو نئے آفاق سے روشناس کرایا اور اسے نئے رنگ و آہنگ سے نوازا تھا۔ ان شعرا کی زندگی کا بیشتر حصہ تیسری صدی میں گذرا تھا اور اصطلاحی طور پر انھیں ”شعرائے مولدین“ (المولدون) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس طبقہ کے نمائندہ شعرا میں ابو تمام اور زبیری وغیرہ کا شمار کیا جاتا ہے۔

تیسرا طبقہ: تیسرا طبقہ ان شعرا پر مشتمل ہے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ چوتھی صدی میں گذرا تھا۔ اصطلاحی طور پر ان شعرا کو ”شعرائے محدثین“ (المحدثون) کہا جاتا ہے جنھوں نے جدید عربی شاعری کے فروغ میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس طبقے کے اہم شعرا میں متنبی اور ابو العلاء معری وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

13.12.2 عہد عباسی کے شعرا کی فنی و موضوعاتی تقسیم

مذکورہ بالا شعرا کے طبقات کو موضوعاتی اور فنی لحاظ سے ”شعراء البداوة“، ”شعراء المجددون“، ”شعراء المحافظون“، ”شعراء المبدعون“، ”شعراء المفتنون“، ”شعراء الصنعة“، اور ”شعراء المذاهب والوجدان والفکر“ کے زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

شعراء المذاهب والوجدان والفکر کا زمرہ شعرا کی ایک بڑی اکائی پر مشتمل ہے جسے ان کے نظریات، خیالات و افکار کے لحاظ سے شعراء العباسیة، شعراء الشیعة، شعراء العشق، شعراء الزهد والحکمة والمواعظ، شعراء علماء اور شعراء الطبع والزندقة میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

شعرا کی مذکورہ بالا فنی و موضوعاتی تقسیم سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد کی شاعری کے کیا کیا رنگ و روپ تھے۔

مذکورہ بالا فنی و موضوعاتی تقسیم کے علاوہ عباسی شعرا کو مجموعی طور پر دو بڑے گروپ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

- پہلا گروپ ان شعرا پر مشتمل ہے جنھوں نے مختلف موضوعات پر اظہار سخن کیا ہے، اس گروپ کے شعرا کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

- دوسرا گروپ ان شعرا کا ہے جنھوں نے صرف مخصوص موضوعات پر شاعری کے نمونے چھوڑے ہیں اور ان کی شاعری صرف کسی ایک

موضوع یا رنگ کے اردگرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے جیسے عباس بن احنف اور ابن داود نے صرف عشقیہ شاعری کے نمونے چھوڑے ہیں ، ابوالعتاہیہ نے صرف زہد اور حکمت کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہے جب کہ ابونواس نے شراب اور اس کے متعلقات کی تصویر کشی اچھوتے انداز و اسلوب میں کچھ اس طرح کی ہے کہ اس کی شاعری کو ”الخمریات“ سے موسوم کر دیا گیا ہے۔

13.13 عصر عباسی کی تہذیب و تمدن

پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی صاحب کے بقول اسلامی تہذیب و تمدن کی بنا عہد نبوی میں ہی پڑ چکی تھی ، خلافت راشدہ میں اس نے کسی قدر ارتقائی مراحل طے کر لیے تھے ، عہد اموی میں ان کی ایک باقاعدہ تنظیم و ترتیب ہوئی اور عباسی خلافت میں وہ اپنے اوج کمال کو پہنچ گئی تھی۔ اسلامی تاریخ کے تمام ادوار میں عصر عباسی کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ کسی اور عہد و عصر کو حاصل نہ ہو سکا۔ اس فضیلت اور برتری کے کئی اسباب ہیں جن میں سے اس کا طویل ترین ہونا ، مختلف تہذیب و تمدن کا ملاپ اور اس کے نتیجے میں اسلامی تہذیب و تمدن کا پروان چڑھنا ، عباسی خلفا کا اسلامی تہذیب و تمدن کو پروان چڑھانے اور علوم و فنون کو فروغ دینے کے تئیں ذاتی طور پر دلچسپی لینا وغیرہ ہیں۔ اس عہد میں اسلامی تہذیب و تمدن اور ثقافت اپنی پوری طاقت اور توانائی کے ساتھ کچھ اس طرح منظر عام پر آتی ہے کہ صدیوں تک صرف اسی تہذیب و تمدن و ثقافت کا بول بالا رہا اور تاریخ انسانی کی تمام ترقی یافتہ تہذیبیں گویا اس کے آگے ماند پڑ گئی تھیں۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے گہرے اثرات مابعد کے ادوار پر مرتب ہوئے تھے کہ اس نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے عباسی تمدن کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے: ”عباسیوں کے علمی کارناموں کی طرح ان کے تمدنی کارنامے بھی بہت ہیں۔ ظاہری نفاست و لطافت اور حسن و دل آویزی کے اعتبار سے ان کا تمدن نہایت بلند تھا اور محاضرات کی مشہور و معروف کتاب ألف لیلة و لیلة میں جو اس کی تصویریں نظر آتی ہیں ، ان کو اگرچہ تاریخی اعتبار و استناد کا درجہ حاصل نہیں ہے اور اس میں بہت سے افسانے اور خرافات بھی شامل ہیں لیکن ان سے قطع نظر خالص تمدنی اور معاشرتی مرفعے بڑی حد تک صحیح ہیں۔“

مولانا مرحوم نے سادہ عرب تہذیب و تمدن میں ہونے والی تبدیلیوں کے اسباب بھی بیان کیے ہیں جن کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا جاسکتا ہے کہ اسلام ایک فطری اور سادگی پسند مذہب ہے جس کا دامن بیجا تمدنی تکلفات سے پاک ہے۔ اسلامی تمدن اپنے اصلی رنگ روپ میں یعنی سادہ مگر پرکار شکل میں خلافت عہد راشدہ تک ہی برقرار رہا۔ سکا کہ فتوحات کی کثرت اور مال و دولت کی فراوانی کے باوجود خلفائے راشدین کی زندگی اور ان کی طرز معاشرت میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہو سکی تھی اور وہ پیوند لگے کپڑوں میں ملبوس رہتے تھے اور زمین پر ہی سو جاتے تھے۔ اسی طرح اس عہد کی عام معاشرت بھی سادگی پسند تھی کہ صحابہ کرام کی موجودگی میں دوسری قوموں سے اختلاط کے اثرات ظاہر نہیں ہونے پائے تھے تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ فتوحات کی وسعت اور مال و دولت کی فراوانی کے اثرات عہد فاروقی سے ہی مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے بعض عمال کی اس حوالے سے باز پرس بھی کی تھی۔

عہد اموی میں جدید تہذیب و ثقافت کے اثرات نمایاں طور پر نظر آنے لگے تھے لیکن چونکہ ان میں عربی عصبیت پوری طرح موجود تھی اور وہ عربوں کی خصوصیات کے تحفظ کے لیے کوشاں بھی رہتے تھے لہذا بیرونی تمدن کا غلبہ نہ ہو سکا اور بعض معاشرتی تکلفات کو چھوڑ کر عربوں کا طرز معاشرت بڑی حد تک برقرار اور باقی رہا مگر تبدیلی و تغیر کا آغاز ہو چکا تھا۔

عہد اموی کے بعد جب بنو عباس نے زمام خلافت و اقتدار کو سنبھالا تو عربی تہذیب کی سادگی کی جگہ ایران و روم کی چمک دمک والی دیدہ زیب تہذیب نے لے لی اور عباسی خلافت، مذہب کے سوا زندگی کے تمام شعبوں میں عجمی رنگ میں رنگ گئی جس کے بنیادی اسباب میں سے مسلمانوں میں مذہبی روح کا کمزور ہونا، عباسی خلافت کے قیام میں اہل عجم کا بنیادی کردار ادا کرنا، عباسی خلافت کے اہم عہدوں پر عجم کا فائز ہونا اور اہل عجم کی قدیم اور شاندار تہذیب سے متاثر ہونا تھا۔ ان اسباب کی وجہ سے عجمی تمدن مکمل طور پر عربوں میں سرایت کر گیا، وہ جسمانی طور پر تو عرب ہی رہے لیکن ان کی روح عجمی ہو کر رہ گئی۔ قرآنی اصول کے مطابق ظاہری طور پر ہر برے پہلو میں بھی کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو بھی پوشیدہ رہتا ہے لہذا یہاں بھی اس شر سے ایک خیر کا پہلو ایسا نکلا جس نے ایک زمانے کو ایک زمانے تک مبہوت و مسحور کر رکھا تھا یعنی جس طرح عرب عجمی تمدن سے متاثر ہوئے تھے اسی طرح عجمی تہذیب بھی عربی تہذیب و ثقافت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور دونوں کی آمیزش سے ایسا دلکش اور بوقلمون تمدن پیدا جو مسلمانوں کا معیاری تمدن قرار پایا جس کی بالا دستی صدیوں تک برقرار رہی اور اس کے سامنے تمام قدیم تہذیبیں اور ثقافتیں ماند پڑ گئیں۔

پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی صاحب نے عصر عباسی کی اسلامی تہذیب و تمدن کے اثرات پر جامع تبصرہ کیا ہے کہ ”ان (عباسی خلفا) ہی کے سبب خالص اسلامی تمدن کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ ہماری اسلامی شناخت، ایمانی تشخص اور ملی امتیاز کے قیام، وجود اور بقا اور تسلسل میں ان کا صدقہ آج بھی جاری ہے۔“

تمدن ایک ایسا جامع لفظ ہے جس میں کسی بھی قوم کے تمام پہلو سما جاتے ہیں۔ یہ لفظ اپنے اندر بہت وسعت اور گیرائی رکھتا ہے کہ اس میں حکومت و سیاست، تہذیب و معاشرت، علوم و فنون، اجتماعی زندگی کے تمام شعبے آجاتے ہیں۔ درج ذیل سطور میں عہد عباسی کے تمدن کے کچھ اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

13.13.1 عہد عباسی کا فن تعمیر

کسی بھی قوم کے تمدن کا ایک بڑا مظہر وہ خوبصورت، پرشکوہ اور بلند و بالا مضبوط عمارتیں ہوتی ہیں جنہیں اس قوم کے باہمت و باذوق افراد نے تعمیر کروایا ہو۔ ان عمارتوں میں جہاں ایک طرف اس قوم کی شوکت و عظمت پنہاں ہوتی ہے وہیں تو دوسری طرف وہ ان کے اعلیٰ و نفیس ذوق و جمال کا منہ بولتا ثبوت ہوتی ہیں۔

عباسی تمدن کا سب سے دل آویز نمونہ بغداد و سامراء و دیگر شہروں کے محلات قرار دیے جاتے ہیں جنہیں مختلف خلفا و امرا جیسے منصور، ہارون رشید، متوکل، واثق اور یحییٰ برکی وغیرہ نے زرخیز کر کے تعمیر کروایا تھا۔ عہد عباسی میں تعمیر کیے جانے والے محلات میں ”قصر الذهب“، ”قصر الخلد“، ”قصر الرصافة“، ”قصر أم حبيب“، ”القصر الهاروني“، ”القصر الجعفري“، ”قصر التاج“، ”قصر دارا لشجرة“، ”قصر الفردوس“، ”قصر یحییٰ“ جیسے محلات کے علاوہ بنو براکمہ اور آل بویہ کے محلات جیسے قصر دارلخلافة / القصر الحسنی وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں جو اپنی اپنی خوبصورتی کی خود ہی مثال تھے۔ عہد عباسی کے محلات کی شان و شوکت اور آرائش و زیبائش کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امرا و وزرا کے محلات پر قصر خلافت کا دھوکہ ہوتا تھا۔ ان محلات کی خوبصورتی و دیدہ زیبی اور حسن و جمال اور دیگر تعمیری خصوصیات کو پڑھ کر آج کا انسان بھی اپنی انگلیاں دانتوں تلے دبالیاتا ہے۔

عہد عباسی میں فن تعمیر اپنے کمال و عروج کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ فن تعمیر کی ترقی کا اندازہ عہد عباسی کے محلات و باغات، سرکاری عمارتوں اور اس عہد میں بسائے جانے والے شہروں سے لگایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر محمد سلیم مظہر صدیقی صاحب نے عہد عباسی کے فن تعمیر کی جن خصوصیات و امتیازات کا ذکر کیا ہے جن کا خلاصہ حسب ذیل سطور میں بیان کیا جا رہا ہے:

۱- عمارتوں کا خوبصورت، وسیع و عریض اور کشادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا مضبوط و مستحکم ہونا۔ یہ عمارتیں بڑے بڑے ہالوں اور کشادہ کمروں پر مشتمل ہوتی تھی جن میں انسانی زندگی کی اہم ضروریات جیسے ہوا، پانی اور روشنی وغیرہ کا مکمل انتظام ہوتا تھا۔

۲- عمارتوں میں باغ بنوانا اور کثرت سے سایہ دار درخت کا لگایا جانا۔

۳- عمارتوں پر محراب، گنبد، قبة، برجیاں اور چھوٹے میناروں کا تعمیر کرنا۔

۴- عمارتوں کی تعمیر میں سنگ سرخ، سنگ سیاہ اور سنگ مرمر کا استعمال عام طور پر کیا جاتا تھا۔ ان کی خوبصورتی کو دوبالا کرنے کے لیے قیمتی پتھروں کا بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

۵- عمارتوں کی دیواریں اور فصیلیں بہت چوڑی ہوتی تھیں کہ اس میں رہنے والے افراد موسم کی سختی سے محفوظ رہ سکیں اور دشمنوں کے لیے بھی وہ لقمہ تر نہ ثابت ہوں۔

۶- عمارتوں میں استحکام اور خوبصورتی کا امتزاج پایا جانا۔

۷- سڑکوں کی تعمیر میں اس بات کا خیال رکھنا کہ وہ سیدھی ہوں اور وہ زاویہ قائمہ پر ایک دوسرے کو کاٹتی ہوں یا ملتی ہوں۔

۸- شہر کے ارد گرد خندق اور اس کے بعد فصیل کا موجود ہونا اور فصیل میں کم از کم چار سمت کے اعتبار سے چار دروازے ہونا۔

13.13.2 عہد عباسی میں بسائے جانے والے شہر

کسی بھی عہد کے تمدن کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاتا ہے کہ اس عہد میں کن کن شہروں کی تاسیس ہوئی تھی اور ان شہروں کا نظم و نسق کیسا تھا۔ شہروں کی تاسیس کا آغاز خلافت راشدہ سے ہی ہو چکا تھا جس کا سلسلہ عہد عباسی میں بھی جاری رہا۔ درج ذیل سطور میں عہد عباسی میں بسائے گئے شہروں کا مختصر ذکر کیا جا رہا ہے۔

13.13.2.1 عباسیہ

پہلے عباسی خلیفہ سفاح نے انبار کے کھنڈروں اور دریائے فرات کے کنارے پر ۱۳۴ھ / ۷۵۲ء میں عباسیہ نامی شہر بسایا تھا اور اسے اپنا دار الخلافہ بنایا تھا۔ اس شہر میں خلیفہ، وزرا اور دیگر امرا و اعیان حکومت کے محلات کے ساتھ ساتھ دیگر عمارتوں جیسے منڈی و مسجد وغیرہ کو تعمیر کیا گیا تھا۔ بازار بسائے گئے تھے اور پل وغیرہ بنائے گئے تھے۔ اسی شہر کو مدینة المنصور بھی کہا جاتا ہے کہ بغداد کی تعمیر سے قبل انھوں نے بھی وہاں قیام فرمایا تھا اور کچھ عمارتیں تعمیر کروائیں تھیں۔

13.13.2.2 بغداد

عہد عباسی میں تعمیر شدہ بغداد کا نام پڑھنے یا سننے سے ہی ذہن میں جو تصور ابھرتا ہے وہ آج کی دنیا کے سب سے ترقی یافتہ شہر کا

تصور ہوتا ہے بلکہ تاریخ کی کتابوں میں جو کچھ اس کے بارے میں مذکور ہے اسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بغداد جیسے ترقی یافتہ شہر کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس تصور کو فروغ دینے میں یقینی طور پر اس کی افسانوی و اساطیری حیثیت کا دخل بھی ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس وقت کا سب سے ترقی یافتہ اور منظم طور پر بسایا ہوا شہر تھا جس کی مثال بعد کی صدیوں میں مشکل سے ملتی ہے۔ بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف ”بغداد کی قسمت میں بابل، سلوقیہ اور مدائن کی جگہ لینا اور ان سب سے بازی لے جانا لکھا تھا“۔

خلیفہ منصور نے اپنے دور خلافت میں ایک نیادار الخلافہ بنانے و بسانے کا جب ارادہ کیا تو مختلف مقامات کا جائزہ لینے کے بعد ان میں سے موزوں ترین مقام ”بغداد“ نامی گاؤں کا انتخاب کیا گیا۔ اس گاؤں کی ”آب و ہوا عمدہ، زمین شاداب اور علاقہ خوبصورت تھا۔ دریائے دجلہ قریب بہتا تھا لہذا پانی اور سبزہ کی فراوانی تھی“۔ گولائی کی شکل والا یہ شہر باقاعدہ ایک نقشہ اور مکمل منصوبہ بندی کے بعد دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر بسایا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف مضبوط و مستحکم فصیل بنائی گئی تھی جس کے ارد گرد ایک چوڑی خندق کھودی گئی تھی۔ فصیل شہر میں چاروں سمت کے اعتبار سے چار دروازے بنائے گئے تھے۔ ان تمام دروازوں کا فاصلہ، خلیفہ کے محل سے یکساں اور برابر تھا۔ بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف ”اپنے بیرونی استحکامات اور اندرونی نقشے کے لحاظ سے یہ شہر ایک بڑا قلعہ معلوم ہوتا ہے“۔

یہ شہر گولائی کی شکل میں بسایا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا مرکزی علاقہ، اپنے مختلف حصوں سے یکساں فاصلہ پر تھا۔ انتظامی امور کے پیش نظر شہر کو دو سڑکوں کے ذریعہ چار برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا جو وسط شہر میں ایک دوسرے سے جا ملتی تھیں۔ یہ سڑکیں نہروں کے کنارے کنارے بنائی گئی تھیں اور ان کی تعمیر کچھ اس انداز سے کی گئی تھی وہ آگے جا کر چاروں طرف سے قصر خلافت سے جا ملتی تھیں۔

بغداد کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ وسطی حصہ میں خلیفہ کا محل ”قصر الذهب“، خاندان خلیفہ کے دیگر افراد کی رہائش گاہیں، جامع مسجد اور سرکاری عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ شہر کے دوسرے حصہ میں امرا و اعیان سلطنت کے محلات و دفاتر بنائے گئے تھے۔ شہر کا تیسرا حصہ عام آبادی پر مشتمل تھا جب کہ چوتھے حصہ میں ہر قسم کے بازار پائے جاتے تھے۔ بغداد کے ہر حصے میں آبادی کے حساب اور وہاں کی ضرورت کے مطابق مساجد تعمیر کی گئیں تھیں۔

عرب مؤرخین کے مطابق ایک بے مثل نقشہ کے اعتبار سے اس شہر کی تعمیر کا آغاز یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۵ھ / ۲ اگست ۷۶۲ء ہوا اور اس کی تکمیل میں تقریباً پانچ سال کا عرصہ لگ گیا کہ ۱۴۹ھ / ۷۶۶ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی تھی۔ اس دورانیہ میں روزانہ ایک لاکھ مزدور، کاریگر اور انجینئر کام کرتے تھے۔ اس شہر کی تعمیر پر آنے والی لاگت اور خرچے کے متعلق مختلف بیانات ملتے ہیں ایک قول کے مطابق اس کی تعمیر پر ایک کروڑ اسی لاکھ دینار خرچ ہوئے تھے تو دوسرے قول کے مطابق دس کروڑ درہم خرچ ہوئے تھے۔ سرکاری دستاویز کے مطابق اس کی تعمیر پر چالیس لاکھ آٹھ سو تراسی درہم خرچ ہوئے تھے۔ بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف یہ رقم قابل قبول نظر آتی ہے۔

خلیفہ منصور کے ہاتھوں بسائے گئے اس شہر نے بہت جلد ایک مقام و مرتبہ حاصل کر لیا جس میں ضروریات کے اعتبار سے وقتاً فوقتاً بہت سی نمایاں تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں جیسے مختلف شفا خانے قائم کیے گئے، حمام، مدارس اور مساجد تعمیر کی گئیں اور پل وغیرہ بنائے گئے۔ پورے عہد عباسی میں دار الخلافہ ہونے کی وجہ سے اس شہر کو مرکزیت حاصل تھی لہذا چاروں طرف اصحاب علم و فضل اس پر ٹوٹے پڑ رہے تھے جن کی وجہ سے وہ اسلامی تہذیب و ثقافت اور تمدن کا سب سے بڑا گہوارہ بن گیا تھا جس کا فیض صدیوں جاری رہا۔ اسی شہر میں بیت الحكمة موجود تھا جس

نے علوم و فنون کی ارتقا میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس شہر میں مختلف قسم کے اصحاب علم و فضل اور ماہرین صنعت و حرفت کی تعداد کا کچھ اندازہ خطیب بغدادی کی کتاب ”تاریخ بغداد“ سے لگایا جاسکتا ہے۔

بغداد اپنے حسن انتظام اور خوبصورتی کی وجہ سے ایک نمونہ و مثال بن گیا تھا حتیٰ کہ دوسرے ملکوں کے فرمانروا جیسے قیصر روم وغیرہ اس کا نقشہ بنوانے اور اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

بغداد کے حسن جمال کی تعریف میں شعر اربط اللسان رہے ہیں اور اسے جنت ارضی قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ قول مبالغہ پر مبنی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عالیشان و بلند و بالا محلات، خوبصورت باغات، سرسبز دیہات، شہر کا حسن انتظام ہر ایک کو اپنی جانب کھینچ لیتا تھا اور وہ اس کی خوبصورتی سے مسحور ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس عہد میں یہ مقولہ مشہور ہو گیا تھا کہ بغداد کے علاوہ ساری دنیا دیہات ہے اور جس نے بغداد نہیں دیکھا اس نے دنیا نہیں دیکھی۔ غالباً اسی مقولے سے متاثر ہو کر لاہور کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔

یہ شہر اپنی تعمیر کے بعد سے لے کر خلافت عباسیہ کے خاتمہ تک اس کا دارالخلافہ رہا اور صدیوں تک اسلامی ثقافت و تہذیب کا سرچشمہ بنا رہا تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس پر بھی دہلی کی طرح ادبار و زوال کے سائے بار بار پڑتے رہے ہیں اور وہ بار بار ابھرتا ڈوبتا رہا ہے لیکن ”کچھ بات ہے کہ ہستی مٹی نہیں ہماری“ کے مصداق وہ آج بھی عراق کی راجدھانی کی شکل میں موجود ہے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے بغداد کی آبادی میں وسعت اور دیگر مسائل کو کے پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے ارد گرد کئی شہر آباد کیے گئے تھے اسی لیے غالباً مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے اسے ایک کی بجائے کئی شہروں کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں بغداد کو ”ام البلاد“ (مختلف شہروں کے وجود میں آنے کا سبب) بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ درج ذیل سطور میں ان شہروں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو بغداد کے ارد گرد بنائے اور بسائے گئے تھے۔

13.13.2.3 کرخ

اس شہر کو بھی خلیفہ منصور نے ۱۵۷ھ/ ۷۷۴ء میں بسایا تھا۔ اس شہر کو بسانے کا بنیادی مقصد بغداد میں موجود بازاروں اور منڈیوں کو وہاں منتقل کرنا تھا۔ یہ پہلے بغداد کا ایک محلہ یا قصبہ تھا لیکن بغداد کی بڑھتی ہوئی آبادی اور تجارتی مرکز بن جانے کی وجہ سے بغداد کی وہاں تاجروں کی ہر وقت آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ یہ عمومی چہل پہل حفاظتی اعتبار سے مناسب نہیں تھی لہذا خلیفہ منصور نے بغداد میں موجود بازاروں اور منڈیوں کو شہر سے باہر ایک نیا شہر بسا کر وہاں منتقل کرنے کا احکامات نافذ فرمائے۔

اس شہر کے تمام بازار بغداد کے بازار کے طرز پر بنائے گئے تھے کہ ہر جنس کا بازار الگ الگ بنایا گیا تھا۔ بازار کے ساتھ ساتھ مساجد، سرکاری عمارتیں اور سڑکیں وغیرہ کی بھی تعمیر کی گئیں تھیں۔ کرخ کا ذکر بار بار بغداد اور عباسی خلافت کے ضمن میں کیا جاتا ہے۔ یہ شہر شیعوں کی زیادہ آبادی والا شہر تھا اور بغداد میں سنیوں کے خلاف پیاہونے والی شورشوں میں وہاں کے باشندوں کا ہاتھ ہوتا تھا۔ یہ شہر بھی کئی بار اجڑا اور بسا ہے اور اس کے بطن گیتی سے متعدد علما و فضلاء نے جنم لیا ہے۔ مزید یہ کہ چوتھی صدی کے نصف اول کے کچھ عباسی خلفا جیسے مقتدر، قاہر اور راضی کے زمانے کے کچھ سکے ملتے ہیں جو کرخ کے دارالضرب میں ڈھالے گئے تھے۔ اسی طرح یہاں کی شراب بھی بہت اچھی

اور عمدہ مانی جاتی تھی جن کا ذکر ابونواس اور ابوالعتاہیہ کے اشعار میں ملتا ہے۔

13.13.2.4 مہدیہ/معسکر المہدیہ/رصافہ

اس شہر کو بھی خلیفہ منصور نے ہی تعمیر کرایا تھا۔ اس شہر کی تعمیر کا آغاز ۱۵۱ھ/۶۸۷ء میں ہوا تھا اور تکمیل ۱۵۷ھ/۷۳۷ء میں ہوئی تھی۔ یہ شہر انھوں نے اپنے بیٹے مہدی کے نام پر دجلہ کے دوسرے کنارے پر بسایا تھا۔ اس شہر کو بسانے کی بنیادی وجہ خلیفہ وقت کی یہ حکمت تھی کی جنگی مصالح کے پیش نظر فوج کو منقسم رکھا جائے۔ اس شہر میں ولی عہد کی عمارت کے علاوہ سرکاری عمارتیں، دیگر ضروری عمارتیں، فوجی بیرکیں اور مسجدیں بھی بنائی گئی تھیں۔ یہ شہر بغداد سے چھوٹا تھا تاہم اس میں شہر کے تمام لوازمات جیسے باغات، نہریں وغیرہ پائے جاتے تھے حتیٰ کہ اس کے اردگرد فصیل و شہر پناہ بھی تعمیر کی گئی تھی اور اس کے چاروں طرف خندق کھودی گئی تھی۔ تاریخ کی کتابوں اس شہر کا ذکر ”معسکر المہدی“ اور رصافہ کے نام سے بھی ملتا ہے۔ مؤخر الذکر کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہارون رشید نے وہاں ”رصافہ“ نام کا ایک محل بنایا تھا۔ اس شہر میں کثرت سے محلات بنائے گئے تھے۔ ہارون رشید کے زمانے میں یہ ایک عظیم شہر بن گیا تھا۔

13.13.2.5 سامراء

بغداد کے شمال میں تیس میل کے فاصلہ پر موجود اس شہر کو خلیفہ معتصم نے ۲۲۳ھ/۸۳۸ء میں دریائے دجلہ کے مشرقی کنارہ پر بسایا تھا لیکن اس کا مکمل عروج عباسی خلافت کے دور اول کے آخری خلیفہ متوکل علی اللہ کے عہد میں ہوا تھا اور اس عہد کے معا بعد اس شہر کا زوال بھی شروع ہو گیا تھا۔

سامراء کے اصل نام کے حوالہ سے اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے کئی اقوال نقل کیے ہیں جیسے ”سام-راہ“، ”سائی-امرا“، ”سا-مرا“۔ مؤخر الذکر دونوں لفاظ کے معنی ”خراج ادا کرنے کی جگہ“ ہے۔ عباسی خلفا کے سکوں پر ”سامراء“ (سَوَّ مِنْ رَأَى) ثبت ہے۔ بہر اصل نام جو بھی ہو وہ عوامی زبان میں بگڑتے بگڑتے ”سامراء“ کے نام سے مشہور و معروف ہو گیا۔ اس شہر کو بسانے کا بنیادی سبب ترک افواج کی کثرت اور کے بیجا رویوں سے جب عوام کو بہت زیادہ شکایتیں ہونے لگیں تو انھوں نے بغداد کے طرز پر ایک نیا شہر بسانے اور وہاں ترک افواج کو منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔

سامراء کے وسط میں خلیفہ اور ان کے خاندان کے افراد کے لیے محلات بنائے گئے تھے۔ ان سے متصل امرا و اعیان حکومت کے محلات اور سرکاری دفاتر تعمیر کیے گئے تھے۔ ہر محلہ کی آبادی الگ الگ افراد پر مشتمل تھی۔ اجناس کے اعتبار سے بازار بنائے گئے تھے۔ آبادی کے لحاظ سے حمام اور مساجد تعمیر کی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ باغات، نہریں وغیرہ بھی اس شہر میں موجود تھے جن سے اس کا حسن دو بالا ہو جاتا تھا۔ اس شہر کی تعمیر کا بنیادی سبب چونکہ ترک افواج کے لیے اقامت گاہیں بنانا تھا لہذا ان کی اقامت گاہیں شہر سے بالکل الگ تعمیر کی گئیں تھیں اور انھیں شہر والوں سے یا شہر والوں کو ان سے ملنے جلنے پر پابندی تھی۔

اس شہر کی اہمیت اور قدر قیمت کا اندازہ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۲۲۱ھ/۸۳۶ تا ۸۸۹ء کے دوران سات عباسی خلفا نے اسے اپنا مسکن بنایا تھا اور اپنے اپنے زمانے میں اس شہر میں نمایاں تبدیلیاں کرتے

ہوئے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیے تھے اور وہاں نئے نئے محلات بنائے تھے۔ تاہم ان کا یہ بیان محل نظر ہے کہ مذکورہ دورانیہ کا اعتبار سات خلیفہ کی تعداد خلیفہ مہدی باللہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ خلیفہ مہدی باللہ کی خلافت کا دورانیہ صرف ایک سال - ۲۵۵ تا ۲۵۶ھ / ۸۶۹ تا ۸۷۰ء ہے۔ ان کے بعد ہونے والے خلیفہ معتمد علی اللہ کا دور خلافت ۲۵۶ تا ۲۷۰ھ / ۸۷۰ تا ۸۹۳ء ہے لہذا اس بات کا امکان ہے کہ ان سے تعداد اور دورانیہ نقل کرنے میں چوک ہو گئی ہو۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ آگے چل مقالہ نگار نے خود ہی وہاں مقیم ہونے آخری خلیفہ کا نام معتمد علی اللہ ذکر کیا ہے۔

یہ شہر عباسی عہد میں پروان چڑھنے والی تہذیب و تمدن کی ایک اہم و نمایاں مثال ہے بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ زمانہ حال میں کی جانے والی کھدائی سے اس کی تعمیر و تزئین کے اہم طرز و طریق سے متعلق خاصی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور اس سے مسلمانوں کی ثقافت کی وہ دل آویز شکل سامنے آتی ہے جو اپنی چمک سے اس وقت کی دنیا کو خیرہ کر رہی تھی۔ سامراء ایک ایسا مرکز تھا جہاں دنیا بھر سے ماہرین فن جمع ہوئے تھے اور انھوں نے بغیر کسی منافست و مسابقت کے اپنے اپنے فن سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا تھا۔ سامراء ایک ایسی کھالی ہے جس میں یونانی، شامی قبلی اور ایرانی ہندی فن ڈالے گئے تھے اور اس اختلاط سے ایک نیا فن پیدا ہوا تھا جس میں کسی کو کسی پر غلبہ پانے کی کوشش کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا ہے۔

13.14 اکتسابی نتائج

اسلامی تاریخ میں عباسی خلافت و حکومت و حکومت کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ کسی اور اسلامی دور کو حاصل نہ ہو سکا۔ اس دور کو مذہبی، ثقافتی، تمدنی اور سیاسی لحاظ سے اسلامی ادوار کا سب سے زریں دور قرار دیا جاتا ہے۔ سیاسی طور پر اموی خلافت کے خاتمے کے ساتھ عباسی خلافت و حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ عباسی خلافت و حکومت کے قیام کا پہلا اور بنیادی پتھر 'عباسی تحریک' کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا آغاز محمد بن علیؑ (وفات ۱۲۵ھ / ۷۴۳ء) نے حمیمہ سے کیا تھا جس نے مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے آخر کار اموی خلافت کا تختہ پلٹ دیا اور ۱۳۲ھ / ۷۴۹ء میں عراق کے اہم ترین شہر کوفہ پر قبضہ کر کے وہاں کی جامع مسجد میں ابوالعباس عبداللہ بن محمد کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔

عباسی خلافت و حکومت کا دورانیہ پانچ سو سال سے زائد (۱۳۲-۶۵۶ھ / ۷۵۰-۱۲۵۸ء) عرصہ پر محیط ہے۔ اس طویل دورانیہ میں مجموعی طور پر ۴۶ خلفاء مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے تھے لیکن ان میں صرف دس خلفائے صحیح معنوں میں اقتدار اعلیٰ سنبھالا تھا اور بعد کے خلفاء ترکوں، آل بویہ اور سلجوقیوں کے اشارے پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عباسی خلافت و حکومت کی اصلی شان و شوکت صرف ابتدائی سو سال تک ہی یعنی خلیفہ متوکل (وفات: ۲۲۶ھ / ۸۶۱ء) کے عہد تک ہی برقرار رہ سکی تھی۔ بعد کے ادوار میں عباسی خلفاء کی حیثیت دن بدن کم ہوتی چلی گئی تھی حتیٰ کہ وہ صرف نام کے خلفاء ہی رہ گئے اور اصل اقتدار دوسروں کے ہاتھوں میں رہا اور آخر کار ایک مجبور و لاچار خلافت و حکومت کی مانند اپنے منطقی انجام کو پہنچ کر ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔

دیگر ادوار اور عہد عباسی کے انتظامیہ کے مابین پایا جانے والا سب سے نمایاں فرق یہ پیدا ہوا تھا اس عہد کے تمام اہم مناصب پر عربوں کی بجائے ایرانیوں اور ترکوں کو سوئپ دیے گئے تھے جس نے عرب طبقات میں ایک خاص قسم کی بے چینی پیدا کر دی۔ اس بے چینی کو عباسی خلافت و حکومت کے زوال کا ایک اہم سبب مانا جاتا ہے۔

عہد عباسی میں انتظامیہ کا اعلیٰ سربراہ خلیفہ وقت ہوتا تھا جو ہر قسم کے فیصلے کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ انتظامی امور کو بہتر طور پر انجام دینے کے لیے عباسی انتظامیہ کو مرکزی، صوبائی اور علاقائی انتظامیہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مرکزی انتظامیہ خلیفہ وقت کی نگرانی میں اپنے امور انجام دیتا تھا، جب کہ صوبائی و علاقائی انتظامیہ کی باگ ڈور گورنرز اور ان کے ذریعہ منتخب کیے گئے افراد کے ہاتھ میں ہوتی تھی تاہم وہ خلیفہ وقت کے سامنے اپنے تمام فیصلوں اور امور کے جوابدہ ہوتے تھے۔

عہد عباسی میں، عہد اموی سے بطور وراثت منتقل ہونے والے اہم شعبوں میں فوج و پولیس، ٹیکس، ڈاک کے علاوہ دیوان الرسائل (خطوط و فرامین کا محکمہ) اور دیوان الخاتم (کاغذات پر مہر لگانے، انھیں سر بہر کرنے کا محکمہ) تھے تاہم عہد عباسی میں ان میں بہت تبدیلیاں کی گئیں تھیں اور انھیں زیادہ ترقی یافتہ بنایا گیا تھا۔

عہد عباسی میں دیوان الأزمۃ، دیوان النفقات، دیوان المظالم، دیوان الصوافی، دیوان العرض، دیوان التوقيع اور دیوان السر جیسے محکموں کی اساس و بنیاد پڑی تھی۔ ان کے علاوہ عدلیہ اور مالیہ کے محکمے تھے۔ یہ تمام محکمے منظم اصول و ضوابط کی بنیادوں پر اپنے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔

عہد عباسی میں تجارتی سرگرمیاں پورے عروج پر پہنچی ہوئی تھیں جنہیں مقامی، ملکی اور غیر ملکی تجارت میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ملکی و غیر ملکی تجارت کے اہم مراکز میں بغداد، کرخ، سامراء، بصرہ، کوفہ، ابلہ، دمشق، حلب، انطاکیہ، حماة، موصل، مکہ، مدینہ، طائف، یمن، بحرین اور صنعاء کے علاوہ مصر و افریقہ کے مختلف شہر تھے۔ عہد عباسی کی تجارت بری اور بحری دونوں راستوں سے کی جاتی تھی اور روم، ہندوستان، چین اور اندلس جیسے ممالک سے مختلف قسم کے سامان تجارت لائے اور منگوائے جاتے تھے اور یہاں کے بازار میں فروخت کیے جاتے تھے۔

عہد عباسی میں زراعت کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔ اس عہد کا زراعتی نظام چار حصوں میں منقسم تھا۔ ایک وہ زمینیں تھیں جن پر کاشت کار خود ہی کھیتی باڑی کرتے تھے اور اس کے سارے منافع کے مالک ہوتے تھے۔ زمین کی دوسری قسم وہ تھی جن کے مالک خود کاشت نہ کر کے اسے بٹائی پر چھوٹے کاشت کاروں کے حوالہ کر دیتے تھے۔ زمین کی تیسری قسم ”خالصہ اراضی“ کہلاتی ہے جو خلفا کے قبضہ میں ہوتی تھیں لیکن اس کے حقیقی مالک مسلمان ہوتے تھے۔ چوتھی قسم کے تحت بنجر زمینیں آتی ہیں کہ جو انھیں آباد کرتا وہی ان کا مالک قرار پاتا تھا۔ عباسی خلفا کی ذاتی دلچسپیوں اور بہترین طرز عمل کی وجہ سے زراعتی نظام بہت اچھا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس عہد کا مالیہ کافی مضبوط ہو گیا تھا۔

عہد عباسی میں گیہوں، چاول، جو، کھجور، دال، سرسوں، کپاس، گنا اور مختلف قسم کی سبزیوں، انگور اور دیگر پھلوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کی بھی کاشت کی جاتی تھی۔

عہد عباسی میں صنعت و حرفت کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔ عہد عباسی میں پروان چڑھنے والی صنعتوں میں کپڑے کی صنعت کو کافی ترقی اور عروج حاصل ہوا تھا کہ مختلف قسم کے اونی، سوتی اور ریشمی کپڑے تیار جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ قالین، خیے اور پردے وغیرہ بھی تیار کیے جاتے تھے۔ اسی طرح مختلف دھاتوں سے برتن سازی، خاص طور سے شیشے سے برتن بنانے کی صنعت کافی ترقی کر لی تھی۔ برتن سازی کے ساتھ زخرف یعنی برتنوں پر گلگاری اور مختلف قسم کے نقش و نگار بنانے کا فن بھی پروان چڑھا تھا۔

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والی دیگر صنعتوں میں لکڑی اور لوہے، زرگری و زیور سازی، روغن گری، عطر سازی، صابن سازی، پھلوں

کی صنعت اور چمڑے کی صنعت نے بھی کافی ترقی کر لی تھی۔

عہد عباسی میں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کی آمیزش نے قدیم نظام تعلیم میں کافی تبدیلیاں پیدا کر دیں تھیں جو تین مرحلوں- ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم- میں منقسم تھا۔

عہد عباسی میں اعلیٰ تعلیم کے بڑے علمی مراکز میں ”بیت الحکمة“ کا شمار ہوتا ہے۔ خاص طور پر خلیفہ مامون کے زمانے میں اس مرکز کو سائنسی اور فلسفیانہ علوم و فنون کے حوالے سے مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

عہد عباسی کے چوتھے دور (۶۵۶ تا ۷۵۵ھ / ۱۰۵۵ تا ۱۲۵۸ء) کو اس کے دیگر ادوار کے مقابلہ میں اس دور میں علم و فن کے فروغ کے لیے زیادہ سنجیدہ کوششیں کی گئی تھیں اور مختلف مقامات بڑے بڑے علمی مراکز قائم کیے گئے تھے۔ اس دور کی خاص بات یہ کہ اس دور میں پہلی سرکاری یونیورسٹی ”مدرسہ نظامیہ“ کا قیام نظام الملک طوسی کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ یہ علمی مرکز سقوط بغداد کے بعد بھی باقی رہا اور صدیوں تک علم و فضل کے جویان کی تشنگی دور کرتا رہا۔ اپنے آخری دور میں یہ مرکز ”مدرسہ مستنصریہ“ میں مدغم ہو گیا تھا۔

عہد عباسی کی دوسری بڑی یونیورسٹی کا قیام عہد عباسی کے بالکل آخر دور میں ہوا تھا۔ اس یونیورسٹی کو خلیفہ مستنصر نے ۱۲۳۳ء میں قائم کیا تھا جو ان کے نام کی مناسبت سے ”مدرسہ مستنصریہ“ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ عظیم مرکز چودھویں صدی تک برقرار رہنے کے بعد زمانے کی دست و برد کا شکار ہو گیا۔

عہد عباسی کا معاشرہ بنیادی طور پر دو اکائیوں- مسلم اور غیر مسلم- پر مشتمل تھا جسے مسلم سماج (عرب و موالی)، غیر مسلم سماج (یہودی اور عیسائی وغیرہ)، نسلی یا علاقائی سماج (ایرانی اور ترک وغیرہ) اور اقتصادی سماج (اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ طبقہ) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

دینی اعتبار سے عہد عباسی کا معاشرہ صحابہ کرام اور اکثر تابعین کے فیوض و برکات سے بالکل ہی تہی دامن ہو چکا تھا۔ اس عہد کا صرف ابتدائی حصہ ہی تاج تابعین کے وجود باسعادت و برکات سے مستفیض ہو سکا تھا۔ ان کے بعد کا عباسی سماج و معاشرہ عام مسلم سماج و معاشرہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔

دنیوی لحاظ سے بھی اس عہد میں عرب طبقات کی اکثریت کی اپنے اہم و بلند بالا مقام و مرتبے سے محرومی نے معاشرتی حالات میں کافی ابترا اور افراتفری پیدا کر دی تھی اور ان کا سیاسی و سماجی مقام و مرتبہ دھیرے دھیرے گرتا چلا گیا اور ان کی اقتصادی حالات بھی بگڑتے چلے گئے تھے۔ اس عہد کے معاشرے و سماج کو ایرانی و ترکی عناصر کی برتری والا معاشرہ قرار دیا جاتا ہے جس کے رہن سہن، رسوم و رواج اور طرز معاشرت پر عربوں کی چھاپ کی بجائے ایرانی و ترکی رنگ و ڈھنگ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

عہد عباسی کا سماج اقتصادی لحاظ سے اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ طبقات پر مشتمل تھا۔ ان طبقات کا رہن سہن، بود باش اور کھانے پینے کا معیار ان کی سماجی اور اقتصادی زندگی کا آئینہ تھا کہ سماج کا ہر طبقہ اپنی آمدنی کے لحاظ سے اپنی زندگی گزارتا تھا۔

عہد عباسی میں پائے جانے والے اہم اسلامی فرقوں میں شیعہ، خوارج، مرجہ اور معتزلہ تھے۔ دیگر فرقوں میں قدریہ، جبریہ وغیرہ بھی پائے جاتے تھے۔ شیعہ اور خوارج کا ظہور سیاسی طور پر ہوا تھا لیکن بعد میں انھوں نے دینی فرقوں کا روپ دھار لیا تھا۔ ان کے مقابلے میں مرجہ اور معتزلہ خالص دینی وجوہات کی بنا پر پیدا ہوئے تھے۔ ان چاروں فرقوں کے اثرات عہد عباسی کی حکومت و سماج پر مرتب ہوئے تھے۔

عصر عباسی اس لحاظ سے بھی ممتاز قرار دیا جاتا ہے کہ اس عہد میں علمی سرگرمیاں اپنے عروج پر نظر آتی ہیں۔ عصر عباسی کی علمی تحریک کا سب سے بڑی خصوصیت یہ قرار دی جاتی ہے کہ اس میں علماء و فضلاء کو ہر قسم کی آزادی تھی لہذا وہ سب اپنے اپنے مذہب اور عقیدے پر عمل کرتے ہوئے علوم و فنون کو فروغ دینے میں مصروف عمل رہا کرتے تھے۔ اس آزادی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف علوم و فنون نے اپنے ارتقائی مراحل کو بہت تیزی سے طے کر لیا اور اپنے اوج کمال کو جا پہنچے۔

عہد عباسی میں فروغ پانے والے علوم و فنون کو اسلامی علوم و فنون (جیسے قرآنی علوم، علوم حدیث و فقہ وغیرہ)، سائنسی علوم و فنون (جیسے کیمیا، طبیعیات اور طب وغیرہ) سماجی علوم (جیسے تاریخ و جغرافیہ، فلسفہ و منطق وغیرہ) اور ادبی علوم و فنون (جیسے نثر نگاری، شاعری، بلاغت وغیرہ) میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام علوم و فنون کے مختلف موضوعات پر اس عہد کے علماء و فضلاء نے گراں قدر تصانیف کا ذخیرہ چھوڑا ہے جن کی فنی عظمت اور علمی معیار کا اعتراف آج بھی کیا جاتا ہے۔ ان کے مقابلے میں ادبا اور شعرا نے لازوال نمونے چھوڑے ہیں جنہوں نے عربی شاعری و نثر کے دامن کو مزید وسیع کر دیا تھا۔

عہد عباسی کی سب سے خاص بات یہ کہ اس عہد میں سائنسی مزاج میں بہت زیادہ ترقی ہوئی تھی اور علمائے عہد عباسی نے ہر موضوع پر غور و فکر کر کے اہم ترین کتب مرتب کیں۔ اس عہد میں سائنسی علوم و فنون نے نمایاں طور پر ارتقائی مراحل طے کیے تھے جس کے گہرے اور دور رس اثرات بعد کی صدیوں پر مرتب ہوئے تھے۔ اس عہد کی سائنسی ترقیوں کو ہی یورپ کی سائنسی ترقیوں کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔

عہد عباسی میں علوم و فنون کے ارتقائی عمل میں تحریک ترجمہ نے سب سے زیادہ اہم اور بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اسی تحریک کے نتیجے میں مختلف علوم و فنون پر روان چڑھے تھے اور عرب علماء و فضلاء دیگر ممالک کے علمی و ادبی سرمایہ سے واقف ہو سکے تھے۔ انہوں نے ترجمہ شدہ کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے مختلف علوم و فنون میں نئے نئے تجربے کیے اور انہیں کامیابی سے ہمکنار بھی کیا۔ تحریک ترجمہ کی وجہ سے ایک ایسا علمی ماحول پروان چڑھا تھا جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ اس کے بعد۔

تحریک ترجمہ کا ایک نمایاں اثر عربی زبان پر یہ مرتب ہوا تھا کہ اس تحریک نے اس کی بنیادی ماہیت و پہچان ہی بدل کر رکھ دی تھی کہ عہد عباسی سے قبل اس کی پہچان و شناخت صرف ادبی زبان ہونے کی تھی اور اس کا شمار علمی زبانوں میں نہیں ہوتا تھا۔ تحریک ترجمہ کے نتیجے میں علمی مصطلحات اور فلسفیانہ تعبیرات کی وجہ سے عربی زبان کا دامن کافی وسیع اور کشادہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی محدود شناخت ختم ہو گئی تھی اور اس کا شمار بھی علمی زبانوں میں ہونے لگا تھا۔

عربی نثر نگاری کا جتنا فروغ عصر عباسی میں ہوا اتنا فروغ عصر جدید کو چھوڑ کر کسی اور عہد میں نہ ہو سکا۔ اس عہد میں عربی نثر نگاری اپنے سب سے اہم اور طاقت ور دور میں داخل ہوتی ہے کہ اس کے موضوعات اور مضامین کا دائرہ کافی وسیع ہو جاتا ہے اور اس کے جلو میں نئی نئی خالص ادبی اصناف کا ظہور ہوتا ہے جس کے نتیجے میں اس عہد کی نثر نگاری اوج کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ اس کی بنیادی وجوہات میں مختلف علوم و فنون کا ارتقا، مختلف اقوام و ملل اور تہذیب و تمدن کا آپس میں ملاپ وغیرہ شامل ہیں۔ اس صورت حال میں تحریک ترجمہ نے ”سونے پہ سہاگہ“ کا کام کیا اور اہل علم و فن نے اپنے افکار و خیالات و نظریات کو پیش کرنے کے لیے نظم کی، بجائے نثر کا سہارا لیا اور ادبی، سماجی، سیاسی، دینی اور

سائنسی علوم و فنون پر مشتمل گراں قدر تصانیف بطور یادگار چھوڑیں ہیں۔ ان کتب نے جہاں ایک طرف عربی نثر نگاری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا وہیں عربی زبان کے دامن کو بہت زیادہ وسیع اور اس قابل بنا دیا کہ وہ کسی بھی قسم کے موضوع کا احاطہ کر سکے۔

عربی شاعری کے تمام ادوار میں عہد عباسی کی شاعری متعدد اور گونا گوں صفات، امتیازات اور خصوصیات کی وجہ سے منفرد و ممتاز نظر آتی ہے۔ عہد عباسی میں شاعری کے فروغ پانے کا ایک اہم و بنیادی سبب اس کا کسب معاش، عزت و شہرت اور مال و دولت حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن جانا ہے کہ سرکاری سرپرستی کی وجہ سے اس عہد کے شعرا کو دیگر ادوار شاعری کے مقابلے میں جتنا زیادہ بڑا اور وسیع میدان اس عہد میں ملا وہ کسی اور دور میں میسر نہیں آسکا تھا۔

عہد عباسی کی شاعری کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسے فروغ دینے میں خالص عرب افراد کے شانہ بشانہ اہل عجم نے بھی نمایاں کردار ادا کیا تھا بلکہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عہد عباسی کی شاعری اہل عجم کی ہی مرہون منت ہے کہ اس عہد کے نمایاں ترین شعرا کا تعلق دیار عجم سے تھا جنہوں نے عربی شاعری کے طرز و اسلوب، مضامین و موضوعات، معانی و خیالات اور اوزان و بحر وغیرہ میں نمایاں تبدیلیاں کرتے ہوئے عربی شاعری کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا تھا۔

عباسی عہد میں عربی شاعری میں نمایاں ترین تبدیلیاں ہوئیں تھیں کہ وہ صحرا و بیابان سے نکل باغات اور محلات کے ارد گرد گھومنے لگی تھی اور نئے موضوعات پر شعرا نے طبع آزمائی کرنی شروع کر دی تھی۔ فلسفیانہ افکار و آرا کے نمایاں اثرات اس عہد کی شاعری پر مرتب ہوئے تھے۔ دیگر ادوار کے مقابلے میں اس عہد کی شاعری اس لحاظ سے ممتاز قرار پاتی ہے کہ اس عہد میں قدما کے طرز اسلوب و بیان سے صرف نظر کرتے ہوئے شعرا نے ایک نیا طرز و اسلوب اختیار کیا تھا۔ وہ اپنے قصائد کا آغاز اپنے اپنے ذوق کی مناسبت سے مختلف رنگ و ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ قدیم اصناف سخن۔ جیسے مدح، مرثیہ اور ہجو وغیرہ۔ کے دائرہ کار میں وسعت کے ساتھ ساتھ چند جدید موضوعات شاعری۔ غزل، غلمان، زہدیات، طردیات، خمریات وغیرہ۔ منظر عام پر آئے تھے۔

عصر عباسی کی شاعری میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا تعلق صرف قصیدہ کی شکل اور مطمح کی تبدیلی سے نہیں تھا بلکہ بحر و قوافی سے بھی تھا کہ شعرا نے ان میں تبدیلی کرتے ہوئے شعر کی موسیقیت میں اضافہ کر دیا تھا۔ مزید یہ کہ انہوں نے معانی میں جدت پیدا کی تھی اور الفاظ اور تراکیب میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں تھیں۔

لفظیات اور اسلوب کے حوالے سے اس عہد کی شاعری میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں تھیں جیسے نامانوس اور بھاری بھر کم الفاظ کا استعمال کم کیا جانے لگا، بدوی زندگی سے متعلق الفاظ کو بتدریج کم کیا گیا اور نجی الفاظ کا استعمال کیا جانے لگا۔ شاعری کے اسلوب بیان میں نفاست اور باریکی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ عربی کے خالص محاورے اور وضاحت کلام کا خیال رکھتے ہوئے صنعت بدائع اور اس کی مختلف انواع کو کثرت سے برتا گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بحروں کو بکثرت استعمال کیا گیا اور کچھ نئے اوزان و بحر جیسے مستطیل و مند کا اضافہ ہوا۔ شاعری کی اقسام میں جہاں ایک طرف زہدیات، طردیات اور خمریات کا اضافہ ہوا تو دوسری طرف قوافی میں مسط اور مزدوج کو فروغ ہوا۔

عہد عباسی کی شاعری اپنے مقاصد، موضوعات، مضامین، خیالات، لفظیات اور اسلوب کے حوالے سے ما قبل کی عربی شاعری سے جداگانہ نظر آتی ہے کہ اس عہد کے تقاضوں کے مطابق اور اس وقت کے ماحول و حالات سے متاثر ہو کر شعرا نے اپنی شاعری کے محور نگاہ کو تبدیل

کر لیا تھا اور ان کی شاعری صحرا کی بے پایاں وسعت، فطری مناظر، کھنڈرات، مٹی کے مکانات اور خیموں کی تصویر کشی کرنے کے بجائے شہری زندگی کی رونق اور لوازمات، محلات و باغات، لہو و لعب، طرب و نشاط اور دوستوں کے ساتھ راگ و رنگ کی محفلوں کی عکاسی کرنے لگی تھی۔ اس عہد کی شاعری قدیم و جدید کا ایک ایسا خوبصورت و حسین سنگم پیش کرتی ہے جس کا نمونہ کسی اور دور میں نہیں ملتا ہے۔

عباسی عہد میں اسلامی تہذیب و تمدن اپنی پوری طاقت اور توانائی کے ساتھ کچھ اس طرح منظر عام پر آتی ہے کہ صدیوں تک صرف اسی کا بول بالا رہا اور تاریخ انسانی کی تمام ترقی یافتہ تہذیبیں گویا اس کے ماند پڑ گئی تھیں۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے گہرے اثرات مابعد کے ادوار پر مرتب ہوئے تھے کہ اس نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

کسی بھی قوم کے تمدن کا ایک بڑا مظہر وہ خوبصورت، پر شکوہ اور بلند و بالا مضبوط عمارتیں ہوتی ہیں جنہیں اس قوم کے باہمت و باذوق افراد نے تعمیر کروایا ہو۔ ان عمارتوں میں جہاں ایک طرف اس قوم کی شوکت و عظمت پنہاں ہوتی ہے وہیں دوسری طرف وہ ان کے اعلیٰ و نفیس ذوق جمال کا منہ بولتا ثبوت ہوتی ہیں۔

عباسی تمدن کا سب سے دل آویز نمونہ بغداد و سامراء و دیگر شہروں کے محلات قرار دیے جاتے ہیں جنہیں مختلف خلفا و امرا جیسے منصور، ہارون رشید، متوکل، واثق اور بیچی برکی وغیرہ نے زرخیز کر کے تعمیر کروایا تھا۔ عہد عباسی کے محلات کی شان و شوکت اور آرائش و زیبائش کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امرا و وزرا کے محلات پر قصر خلافت کا دھوکہ ہوتا تھا۔ ان محلات کی خوبصورتی و دیدہ زیبی اور حسن و جمال اور دیگر تعمیری خصوصیات کو پڑھ کر آج کا انسان بھی اپنی انگلیاں دانتوں تلے دبا لیتا ہے۔

عہد عباسی میں فن تعمیر اپنے کمال و عروج کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ فن تعمیر کی ترقی کا اندازہ عہد عباسی کے محلات و باغات، سرکاری عمارتوں اور اس عہد میں بسائے جانے والے شہروں سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس عہد کے تمدن کی جھلک عباسی باغات میں بھی نظر آتی جو اپنے حسن ترتیب اور نظم و نسق کی بنا پر آج کے جدید ترین پارکوں کے مد مقابل قرار دیے جاسکتے ہیں۔

کسی بھی عہد کے تمدن کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاتا ہے کہ اس عہد میں کن کن شہروں کی تاسیس ہوئی تھی اور ان شہروں کا نظم و نسق کیسا تھا۔ اس عہد میں بسائے جانے والے شہروں میں عباسیہ، بغداد، کرخ، سامراء، مہدیہ یا رصافہ جیسے ترقی یافتہ شہر شامل ہیں۔ عہد عباسی میں بسائے جانے والے شہروں میں سے بغداد نے ایک افسانوی حیثیت اختیار کر لی ہے کہ اس کا نام پڑھنے یا سننے سے ہی ذہن میں جو تصور ابھرتا ہے وہ آج کی دنیا کے سب سے ترقی یافتہ شہر کا تصور ہوتا ہے بلکہ تاریخ کی کتابوں میں جو کچھ اس کے بارے میں مذکور ہے اسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس وقت کا سب سے ترقی یافتہ اور منظم طور پر بسایا ہوا شہر تھا جس کی مثال بعد کی صدیوں میں مشکل سے ملتی ہے۔ بغداد اپنے حسن انتظام اور خوبصورتی کی وجہ سے ایک نمونہ و مثال بن گیا تھا حتیٰ کہ دوسرے ملکوں کے فرمانروا جیسے قیصر روم وغیرہ اس کا نقشہ بنوانے اور اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

عہد عباسی کے تمدن کی جھلک اس عہد کے کھانے پینے، طرز رہائش، عام مکانات و باغات کی تعمیر، صنعت و حرفت، زراعت اور تجارت میں بھی نظر آتی ہے۔

13.15 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

- ۱- عباسی تحریک پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
 - ۲- مصر میں عباسی خلافت کے احیا کے پس منظر کو اجاگر کرتے ہوئے اس پر ایک نوٹ لکھیے۔
 - ۳- عہد عباسی کے انتظامیہ پر سیر حاصل بحث کیجیے۔
 - ۴- عہد عباسی کے اہم اسلامی فرقوں کا جائزہ لیں۔
 - ۴- تحریک ترجمہ اور اس کے اثرات پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
 - ۵- عہد عباسی میں نثر نگاری کے فروغ کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے اس عہد کی نثر نگاری کی اصناف کو بیان کیجیے۔
- درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

- ۱- عباسی خلافت و حکومت کے زوال کے اسباب و عوامل پر روشنی ڈالیے۔
- ۲- عہد عباسی کی تجارت و زراعت پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
- ۳- عہد عباسی کے مختلف محکمہ جات پر سیر حاصل بحث کیجیے۔
- ۴- عہد عباسی کے معاشرہ پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
- ۵- عہد عباسی کی علمی سرگرمیوں کا ایک مکمل جائزہ پیش کریں۔
- ۶- عہد عباسی میں عربی شاعری کے فروغ اور اس کی خصوصیات و اصناف پر ایک نوٹ لکھیے۔

13.16 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

- | | |
|-----------------------------------------------------------|---------------------------------------------------|
| ۱- تاریخ تہذیب اسلامی | پروفیسر محمد سلیم مظہر صدیقی، جلد سوم۔ |
| ۲- تاریخ اسلام | مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، جلد سوم و چہارم۔ |
| ۳- المامون | علامہ شبلی نعمانی۔ |
| ۴- تاریخ الأدب العربی (العصر العباسی الأول والثانی) | شوقی ضیف۔ |
| ۵- الجامع فی تاریخ الأدب العربی | حنانہ فائزوری۔ |
| ۶- تاریخ الأدب العربی | احمد حسن زیات۔ |
| ۷- الأدب فی عصر العباسیین (الجزء الأول والثانی) | محمد زعلول سلام۔ |
| ۸- ضحی الاسلام، جلد سوم | احمد امین۔ |
| ۹- اردو دارۃ المعارف الاسلامیہ، مادہ عباسیہ، مدارس وغیرہ۔ | |

اکائی 14 عہد عباسی میں علوم و فنون کا ارتقا

- اکائی کے اجزا
- 14.1 مقصد
- 14.2 تمہید
- 14.3 عصر عباسی میں فروغ پانے والے علوم و فنون
- 14.4 اسلامی علوم و فنون
- 14.4.1 علوم القرآن
- 14.4.1.1 علم تفسیر
- 14.4.1.2 عہد عباسی میں تفاسیر کی اقسام
- 14.4.1.2.1 تفسیر بالماثور
- 14.4.1.2.2 تفسیر بالرأی
- 14.4.1.2.3 دیگر اقسام تفسیر
- 14.4.1.3 علم قراءت
- 14.4.1.4 علم تجوید القرآن
- 14.4.1.5 علم اسباب النزول
- 14.4.1.6 علم النسخ و المنسوخ
- 14.4.1.7 علم لغات القرآن
- 14.4.2 حدیث اور علوم حدیث
- 14.4.2.1 تدوین احادیث کے ادوار
- 14.4.2.2 عہد عباسی میں مرتب کردہ مجموعہ احادیث
- 14.4.2.2.1 الجامع الصحیح
- 14.4.2.2.2 السنن

المسند/المسانيد 14.4.2.2.3

المصنف 14.4.2.2.4

عهد عباسی کا سرمایہ حدیث 14.4.2.3

علوم الحدیث 14.4.2.4

علم اسماء الرجال/علم رجال الحدیث 14.4.2.5

علم الجرح والتعديل 14.4.2.6

علم مختلف الحدیث 14.4.2.7

علم علل الحدیث 14.4.2.8

مشکل الحدیث 14.4.2.9

علم غریب الحدیث 14.4.2.10

علم النسخ والممنوخ 14.4.2.11

علم موضوعات الحدیث 14.4.2.12

علم اصول الحدیث 14.4.2.13

14.4.3 فقہ اور اصول فقہ

فقہ کی تعریف 14.4.3.1

تدوین فقہ کے ادوار 14.4.3.2

عهد عباسی کا فقہی سرمایہ 14.4.3.3

فقہ حنفی 14.4.3.3.1

فقہ مالکی 14.4.3.3.2

فقہ شافعی 14.4.3.3.3

فقہ حنبلی 14.4.3.3.4

فقہ جعفری 14.4.3.3.5

فقہی علوم 14.4.3.4

علم اصول فقہ 14.4.3.4.1

علم الفرائض/علم المیراث 14.4.3.4.2

سوانحی ادب 14.4.4

سیرت نبوی 14.4.4.1

	سائنسی علوم و فنون	14.5
	14.5.1	کیمیاء (کیمسٹری)
	14.5.2	طبیعیات/طبیعیات (فزکس)
	14.5.3	طب (میڈیسن)
	14.5.4	ریاضی، ہندسہ اور حساب
	14.5.5	علم ہیئت اور نجوم
	14.5.6	علم جغرافیہ
	14.5.7	علم معدنیات (Geology, Minerology)
	14.5.8	علم نباتات/نباتات (Botany)
	14.5.9	علم حیوانات (Zoology)
	سماجی علوم	14.6
	14.6.1	علم تاریخ
	14.6.2	فلسفہ و منطق
	14.6.3	علم کلام
	14.6.4	علم تصوف
	ادبی علوم و فنون	14.7
	14.7.1	نثر نگاری
	14.7.1.1	تثقید اور علم بلاغت
	14.7.1.2	ادب الرحلات
	14.7.1.3	علم لغت
	14.7.1.3.1	تدوین لغت نگاری کے مراحل
	14.7.1.3.2	عربی لغت نگاری کے اسکول
	14.7.2	شاعری
	اکتسابی نتائج	14.8
	14.9	نمونے کے امتحانی سوالات
	14.10	مطالعے کے لیے معاون کتابیں

14.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد عصر عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم و فنون سے متعارف کرانا ہے۔ اس اکائی کو پڑھ کو ہم اس بات سے واقف ہو سکیں گے کہ علوم و فنون کے اعتبار سے عصر عباسی کو تمام اسلامی ادوار میں کیا مقام و مرتبہ حاصل تھا؟ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی اندازہ ہو سکے گا کہ اس عہد میں ہونے والی ترقیاں کتنی ہمہ جہت تھیں کہ انسانی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں تھا جس میں اس عہد کی سرگرمیوں کی وجہ سے نمایاں تبدیلیاں نہ ہوئی ہوں۔

14.2 تمہید

اسلامی تاریخ کے تمام ادوار میں عصر عباسی کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ کسی اور عہد و عصر کو حاصل نہ ہو سکا۔ اس فضیلت اور برتری کے کئی اسباب ہیں، جن میں سے اس کا طویل ترین ہونا، عباسی خلفا کا اسلامی تہذیب و تمدن کو پروان چڑھانے اور علوم و فنون کو فروغ دینے کے تئیں ذاتی طور پر دلچسپی لینا، مختلف تہذیب و تمدن کا ملاپ اور اس کے نتیجے میں پروان چڑھنے والی ایک رنگ برنگ تہذیب کا پروان چڑھنا وغیرہ ہیں۔ اس عہد میں اسلامی تہذیب و تمدن اور ثقافت اپنی پوری طاقت اور توانائی کے ساتھ کچھ اس طرح منظر عام پر آتی ہے کہ صدیوں تک صرف اسی تہذیب و تمدن و ثقافت کا بول بالا رہا اور تاریخ انسانی کی تمام ترقی یافتہ تہذیبیں گویا اس کے ماند پڑ گئی تھیں۔

عصر عباسی میں ہونے والی گونا گوں تبدیلیوں اور ترقیوں میں علوم و فنون کا فروغ پانا بھی شامل ہے۔ جس طرح اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اکثر اسلامی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ دیگر علوم و فنون کی بنا عہد اموی میں رکھی جا چکی تھی، اسی طرح اس حقیقت کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، ان علوم و فنون پر مکمل بال و پر عہد عباسی میں آئے تھے اور اسی عہد میں وہ اپنی پوری تابناکی اور رعنائی کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے تھے اور اسلامی تہذیب و تمدن کو فروغ دینے اور پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

عصر عباسی میں پروان چڑھنے والی علمی تحریک اور اس کے ثمرات سے ایک طویل عرصہ تک فائدہ اٹھایا جاتا رہا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مغربی اور یورپین ممالک کی ترقی میں اس تحریک نے اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ متعدد مغربی مصنفین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مغرب کی ترقی میں عہد عباسی میں پروان چڑھنے والی علمی تحریک کا کافی اور نمایاں حصہ ہے جس نے انھیں اندھیروں سے نکال کر اجالوں سے روشناس کرایا تھا۔

14.3 عصر عباسی میں فروغ پانے والے علوم و فنون

عصر عباسی میں فروغ پانے والے علوم و فنون کی تاریخ پر جب ایک سرسری نگاہ ڈالی جاتی ہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان علوم و فنون کو دو بنیادی زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

☆ وہ علوم و فنون جو عصر عباسی کے علما و فضلا کو اسلاف سے بطور ورثہ ملے تھے۔ ان علوم و فنون کی تعداد زیادہ ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ ان کی ہی اکثریت ہے تو غلط و بیجا نہیں ہوگا۔

☆ وہ علوم و فنون جن کی بناء عصر عباسی میں رکھی گئی تھی۔ مجموعی طور پر ان علوم و فنون کی تعداد کم ہے۔

عہد عباسی میں فروغ پانے والے دونوں زمروں کو حسب ذیل علوم و فنون میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

☆ اسلامی علوم و فنون جیسے قرآنی علوم، علوم حدیث و فقہ اور ان کے متعلقات۔

☆ سائنسی علوم و فنون جیسے کیمیا (کیمسٹری)، طبیعیات/طبیعیات (فزکس)، طب (میڈیسن) وغیرہ۔

☆ سماجی علوم جیسے تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ اور منطق وغیرہ اور ان کے متعلقات۔

☆ ادبی علوم و فنون جیسے نثر نگاری، شاعری، بلاغت وغیرہ اور ان کے متعلقات۔

مذکورہ بالا علوم و فنون کے بطن سے نئی شاخیں پھوٹیں تھیں جن میں اس عہد میں اتنے بال و پر آئے کہ آگے چل کر انہیں ایک مستقل علم و فن کا درجہ حاصل ہو گیا، جیسے فن سیرت نبوی کہ اس کے ابتدائی خد و خال ہمیں حدیث میں ملتے ہیں، لیکن آگے چل کر وہ ایک مستقل فن بن جاتا ہے۔ اسی طرح فن سیرت نگاری سے فن تاریخ پروان چڑھتا ہے جو آگے چل کر سیرت نبوی سے جدا ہو کر ایک مستقل فن کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

عہد عباسی میں علوم و فنون کا ذکر کرنے سے قبل اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ درج ذیل سطور میں صرف ان علما و فضلا کے علمی کارناموں جن کا تعلق سلطنت عباسیہ سے تھا۔ اس بحث میں اندلسی علما اور عہد عباسی کے بعد کے علما کے کارناموں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس بحث میں بہت سے نامور مصنفین کا ذکر موجود نہیں ہے جیسے قاضی عیاض، ابن خلدون، ابن بطوطہ اور ابن جبیر وغیرہ۔

14.4 اسلامی علوم و فنون

فطری طور پر اسلامی علوم و فنون کا ارتقا عہد عباسی میں زیادہ ہوا تھا کہ وہ مختلف علوم و فنون جن کی ابتدا عہد نبوی تا عہد اموی کے دوران ہوئی تھی وہ اپنے ارتقائی مراحل سے گزرتے ہوئے عہد عباسی میں بام عروج پر پہنچ گئے۔ ان علوم و فنون کا ایک مختصر جائزہ حسب ذیل سطور میں پیش کیا جا رہا ہے۔

14.4.1 علوم القرآن

قرآن کریم ایک ابدی اور جامع کتاب ہے جسے زندگی کے تمام معاملات میں بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا تھا۔ قرآن کریم میں ایک مکمل ضابطہ حیات بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں صرف اصول و کلیات ہی بیان کیے گئے جن کی تفصیل اور تشریح احادیث نبویہ میں بیان کی گئی۔ بقول امام شاطبی ”قرآن کریم اختصار کے باوجود جامع ہے اور وہ جامع اسی اعتبار سے ہے کہ اس میں دین کے اصول و کلیات جمع ہو گئے ہیں۔ جب نزول قرآن کی تکمیل ہوگئی تو شریعت مکمل ہوگئی۔“

تقریباً تمام اسلامی علوم و فنون کا منبع قرآن کریم ہی ہے لہذا یہ بات باعث حیرت و استعجاب نہیں ہونا چاہیے کہ قرآن کریم اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بہت کثرت سے لکھا گیا ہے اسلامی علوم و فنون کے اسی مہتمم بالشان حصہ کو علوم القرآن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

علوم قرآنی کی چند شاخوں کی بنیاد صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں ہی ڈالی جا چکی تھی۔ خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفانؓ نے ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے نسخہ قرآن مجید کی نقول سے مصحف کی کاپیاں تیار کروا کر گویا علم رسم القرآن یا علم الرسم العثماني کی بنیاد رکھ دی تھی۔ خلیفہ چہارم حضرت علی بن ابی طالبؓ نے عربی زبان خاص طور سے قرآن مجید کی حفاظت کے لیے ابوالاسود دؤلی کے ذریعہ کچھ قواعد مرتب

کر کے علم اعراب القرآن کی بنا ڈال دی تھی۔ علوم قرآن کے حوالہ سے صحابہ کرامؓ جیسے حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت اور ابی بن کعب وغیرہ کی کوششوں کو تابعین کرامؓ جیسے امام مجاہد، امام عکرمہ، امام قتادہ، امام عطاء بن یسار، امام سعید بن جبیر، امام حسن بصری اور زید بن اسلم وغیرہ اور تبع تابعین کرامؓ نے جیسے حضرت امام مالک بن انس وغیرہ نے اپنے عمل مسلسل سے مزید آگے بڑھایا اور ”علوم القرآن کے سلسلے میں پیشرو مفکرین کا کردار ادا کیا اور اس موضوع پر بنیادی اور اساسی معلومات کا ذخیرہ فراہم کیا“۔ ان حضرات کی کوششوں کے نتیجہ میں علم التفسیر، علم اسباب النزول، علم المکی والمدنی، علم الناسخ والمنسوخ اور علم غریب القرآن و دیگر علوم قرآنی کی بنا پڑی تھی اور ان موضوعات پر اس قدر سے کثرت سے لکھا گیا ہے کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان علوم نے عہد تدوین میں مستقل علوم کا قالب اختیار کیا تھا۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ علوم القرآن کی جدید اور جامع اصطلاح کو اس کے وسیع تر مفہوم میں سب سے پہلے علی بن ابراہیم بن سعید حوفی (م ۴۳۰ھ) نے استعمال کیا تھا اور تیس جلدوں پر مشتمل البرہان فی علوم القرآن مرتب کی تھی۔ علوم القرآن کے موضوع پر مجموعی یا کسی ایک علم قرآن پر متعدد کتب لکھی گئیں ہیں جیسے عبدالرحمن مقدسی (م ۶۶۵ھ) کی المرشد الوجیز فی علوم القرآن العزیز، امام زرکشی (م ۷۴۳ھ) کی البرہان فی علوم القرآن اور امام جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی الاتقان فی علوم القرآن وغیرہ۔ لیکن یہ اور ان جیسی کتب عہد عباسی کے بعد لکھی گئی ہیں لہذا یہاں ان کا تذکرہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ درج ذیل سطور میں قرآنی علوم کی اہم اور بنیادی علوم کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

14.4.1.1 علم تفسیر

عہد تدوین میں علم تفسیر کو دیگر تمام قرآنی علوم پر فوقیت و برتری حاصل ہے کہ اسے تمام علوم قرآنی میں اصل و اساس ہونے کا شرف حاصل ہے۔ قرآن کی تفسیر کا آغاز عہد نبوی سے ہی ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ خود ہی اس سب سے بڑے شارح تھے کہ متعدد احادیث کرام میں قرآن کریم کی آیات کا مفہوم واضح کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ کے بعد قرآن کی تفسیر کا فریضہ صحابہ کرامؓ نے انجام دیا جن میں سچلغائے اربعہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت، ابی بن کعب، ابو موسیٰ اشعری، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہ کا شمار مفسرین صحابہ میں ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا صحابہ کرامؓ میں سے حضرت ابی بن کعب نے سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے عہد میں اپنی تفسیر لکھی تھی۔ یہ تفسیر ناپید ہو چکی ہے تاہم اس کی مرویات کا ایک معتد بہ حصہ کتب تفسیر و احادیث خاص طور سے تفسیر طبری از محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ)، مسند امام احمد بن حنبل اور مستدرک حاکم اور میں محفوظ ہو گیا ہے۔ ان کے بعد حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی اپنی تفسیر لکھی تھی لیکن وہ بھی ناپید ہو چکی ہے تاہم اس کی مرویات کتب تفسیر و احادیث میں بکھری ہوئی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حلقہ درس سے ایک معتد بہ تعداد نے استفادہ کیا تھا جنہوں نے علم تفسیر کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان کے شاگردوں میں سے سعید بن جبیر (م ۹۳ھ) اور ابوالعالیہ نے باقاعدہ اپنی تفسیر لکھی تھیں جن کا شمار اولین اور بنیادی تفسیر میں کیا جاتا ہے لیکن صدافسوس کہ وہ زمانہ کی دست و برد کا شکار ہو چکی ہیں۔ اول الذکر نے مشہور اموی خلیفہ مروان بن عبدالملک کی فرمائش پر

قرآن کی تفسیر لکھی تھی۔ بقول مقالہ نگار دائرۃ المعارف ”عطاء بن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے، وہ درحقیقت یہی تفسیر ہے۔“
 عہد اموی میں مفسرین کا دائرہ بہت بڑھ جاتا ہے تاہم تدوین کا عمل خال خال ہی نظر آتا ہے۔ عہد اموی میں مرتب کی جانے والی
 تفاسیر میں محمد بن کعب قرظی (م ۱۰۸ھ)، عطاء بن ابی رباح (م ۱۱۴ھ) کی تفاسیر بھی شامل ہیں۔ صحابہ کرام اور تابعین کرام سے استفادہ کرتے
 ہوئے اتباع تابعین نے تفسیر کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں جن میں سفیان بن عیینہ، کعب بن جراح، شعبہ بن حجاج، یزید بن ہارون
 اور عبد بن حمید رحمہم اللہ کے نام نامی زیادہ نمایاں اور ممتاز ہیں۔

عہد عباسی کے مشہور مفسرین میں ابن جریج رومی اموی (م ۱۵۰ھ)، مقاتل بن سلیمان (م ۱۵۰ھ)، حسین بن واقد قرظی
 مروزی (م ۱۵۷ھ)، شعبہ بن حجاج (م ۱۶۰ھ)، سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ)، اسماعیل بن ابراہیم اسدی (م ۱۹۴ھ)، سفیان بن عیینہ
 (م ۱۹۸ھ)، کعب بن جراح (م ۱۹۷ھ)، عبدالرزاق (م ۲۱۱ھ)، آدم بن ایاس (م ۲۲۰ھ)، سرج بن یونس بغدادی (م ۲۳۵ھ)، ابن
 راہویہ (م ۲۳۸ھ)، احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)، عمرو بن علی بابلی (م ۲۴۹ھ)، روح بن عبادہ قیسی (م ۲۵۰ھ)، امام دارمی (م ۲۵۵ھ) ابن
 ابی شیبہ بغدادی (م ۲۵۷ھ)، اسماعیل بن یزید قطان (م ۲۶۰ھ)، امام تستری (م ۲۷۳ھ)، یحییٰ بن مخلد (م ۲۷۶ھ) ابو احمد عسّال
 (م ۲۸۲ھ)، بکر بن سہل دمیاطی (م ۲۸۹ھ)، ابراہیم بن معقل نسفی (م ۲۹۵ھ)، محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ)، ابوبکر بن ابی داؤد
 جہتانی (م ۳۱۰ھ)، حسین بن محمد اصفہانی (م ۳۶۹ھ)، ابواللیث سمرقندی (م ۳۷۵ھ)، ابوجعفر ہروی (م ۳۸۱ھ) وغیرہ شامل ہیں۔

14.4.1.2 عہد عباسی میں تفاسیر کی اقسام

عہد عباسی کی کتب تفاسیر کو بنیادی طور پر دو زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

14.4.1.2.1 تفسیر بالماثور

مذکورہ بالا اصطلاح ان تفاسیر کے لیے استعمال کی جاتی ہیں جن میں قرآنی آیات کی تفسیر و تشریح احادیث نبوی، اقوال صحابہ و تابعین کی
 روشنی میں کی گئی ہو۔ تفسیر ماثور کی سب سے اہم تفسیر امام محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) کی ہے۔ اس تفسیر کا نام ”تفسیر جامع البیان عن تاویل
 آی القرآن“ ہے لیکن مصنف کی نسبت سے ”تفسیر طبری“ کے نام سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔ اس تفسیر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا
 جاسکتا ہے کہ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اپنی متعدد خصوصیات کی وجہ سے اس جیسی تفسیر نہیں لکھی گئی ہے۔ بقول علامہ سیوطی ابن جریر محض نقل
 اقوال پر اکتفا نہیں کرتے ہیں؛ بلکہ ان کی توجیہ بھی کرتے ہیں اور ان میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تفسیر کو دیگر
 تفاسیر کے مقابلہ میں فوقیت حاصل ہے۔

تفسیر طبری کے علاوہ اس زمرہ کی مشہور تفاسیر میں ”بحر العلوم“ از ابواللیث نصر بن محمد سمرقندی (م ۳۷۵ھ)، تفسیر ابن عطیہ
 دمشقی (م ۳۸۳ھ)، ”الکشف والبیان عن تفسیر القرآن“ از ابواسحق ثعلبی (م ۴۲۷ھ)، تفسیر ابن ماوردی (م ۴۵۰ھ)، تفسیر امام واحدی
 (م ۴۶۸ھ)، ”معالم التنزیل“ از حسین بن مسعود فراء بغوی (م ۵۱۶ھ)، ”زاد المسیر فی علم التفسیر“ از حافظ ابن الجوزی
 (م ۵۹۷ھ) اور ”موجز التاویل عن معجز التنزیل“ از ابن کامل ہیں۔

14.4.1.2.2 تفسیر بالرائے

اس اصطلاح کا استعمال ان تفاسیر کے لیے کیا جاتا ہے جن میں کسی آیت کی تفسیر و تشریح اپنے قیاس اور رائے کے مطابق کی گئی ہو۔ ان تفاسیر کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں علما کے مختلف اقوال بیان کیے جاتے ہیں۔ جواز اور عدم جواز سے قطع نظر، ان کا جائزہ محض علم و فن کے اعتبار سے لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس نقطہ نظر کی وجہ سے تفسیر کا دامن بہت ہی متنوع اور قسم قسم کی تفاسیر سے مالا مال نظر آتا ہے جس نے اس فن کو آگے بڑھانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ بقول پروفیسر محمد سلیمان مظہر صدیقی: ”تفسیر بالرأی میں مختلف مکاتب فکر کی نمائندگی ملتی ہے۔ ان میں عام مفسرین کرام ہیں اور خاص فنون کے ماہرین بھی جیسے فقہ و تصوف وغیرہ۔ مسلم فرقوں میں شیعہ اور معتزلہ مفسرین کی تفاسیر بھی ہیں۔“

تفسیر بالرائے کے زمرہ میں ”الکشاف“ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ تفسیر محمود بن عمر زنجشیری (م ۵۳۸ھ) کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ تفسیر عقلی انداز پر مرتب کی جانے والی تفاسیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ بقول مقالہ نگار دائرۃ المعارف الاسلامیۃ اردو: اس تفسیر میں بلاغت کے نکات اور اعجاز قرآنی کی مختلف جہات کو سوال و جواب کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس تفسیر میں اسرائیلیات کا ذکر خال خال ہی پایا جاتا ہے۔ لغوی اور نحوی بحثیں قابل قدر ہیں مگر معتزلی طرز فکر کی وجہ سے اس میں تکلف اور تعصب سے کام لیا گیا ہے۔

اس زمرہ کی دوسری اہم تفسیر ”مفاتیح الغیب“ ہے۔ اس تفسیر کے مصنف فخر الدین محمد بن عمر رازی (م ۶۰۶ھ) ہیں۔ یہ تفسیر ”تفسیر کبیر“ کے نام سے زیادہ مشہور و متداول ہے۔ اس کا شمار فلسفیانہ تفاسیر میں بھی ہوتا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ تفسیر بالرائے کے زمرہ میں شامل اکثر تفاسیر جیسے: ”انوار التنزیل و أسرار التاویل“ از قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی (م ۶۸۵ھ) ہیں، ”مدارک التنزیل“ از امام نسفی، عبداللہ بن احمد (۷۱۰ھ) وغیرہ عہد عباسی کے بعد لکھی گئی تھیں۔

14.4.1.2.3 دیگر اقسام تفسیر

عہد عباسی میں کی تفاسیر کی فہرست پر نظر ڈالنے یہ اندازہ ہوتا ہے انھیں شیعہ، صوفیانہ تفاسیر اور فقہی تفاسیر جیسے زممرات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جیسے تفسیر القرآن از امام تستری (۲۷۳ھ)، ”حقائق التفسیر“ از امام سلمی (۴۱۲ھ)، ”لطائف الاشارات“ از امام قشیری (۴۶۵ھ) اور ”عرائس البیان“ از امام ابو محمد روز بہان (۶۰۶ھ) وغیرہ۔

14.4.1.3 علم قراءت

اس علم سے وہ علم مراد ہے ”جس میں قرآنی کلمات کے ادا کی کیفیت اور اس میں جو اختلاف ہے وہ بیان کیا جاتا ہے اور اختلاف قراءت کو اس کے ناقلین کی جانب منسوب کیا جاتا ہے تاکہ قرآن مجید میں لفظ اور لہجے کی تحریف کو راہ پانے کا موقع نہ ملے۔“

قراءت قرآنی کو بنیادی طور پر تین قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے: ۱۔ تحقیق ۲۔ حدیث ۳۔ تدویر۔ پہلی قسم میں قراءت کے حوالہ سے ہر چیز کو مکمل طور پر دھیان دیتے ہوئے بہت دھیرے دھیرے قراءت کی جاتی ہے۔ دوسری قسم میں قراءت کو تیزی اور روانی سے پڑھا جاتا ہے

، جب کہ تیسری قسم میں مذکورہ بالا قراءت کی دونوں قسموں کے مابین توسط اختیار کیا جاتا ہے۔

عہد نبوی سے اس علم کا آغاز ہو چکا تھا۔ مشہور قول کے مطابق اس وقت کے مشہور سات عربی لہجات کے مطابق قرآن کا نزول ہوا تھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو ان لہجات کی تعلیم دی تھی تاہم یہ فن اموی عہد اور عباسی عہد میں جا کر پایہ تکمیل پر پہنچا تھا۔ پروفیسر محمد رضوان علوی کا یہ کہنا کہ ”ان قراءتوں کے پیدا ہونے کی اصل وجہ عربی رسم الخط کی ناقص نوعیت تھی“ بالکل بے بنیاد اور غلط بات ہے کہ قراءتوں کا اختلاف دراصل لہجات کا اختلاف ہے۔

مشہور سبب قراء میں سے تین کا تعلق خالص اموی دور سے تھا۔ اموی دور سے تعلق رکھنے والے قرائے کرام میں امام عبداللہ بن عامر (۲۱-۱۱۸ھ)، امام عبداللہ بن کثیر (۳۵-۱۲۰ھ) اور امام عاصم بن ابی النجود کوفی (۱۲۷ھ) ہیں جن کے شاگردوں نے اس فن کو عہد عباسی میں پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

سبب قراء میں تین قرائے کرام کا تعلق اموی اور عباسی دونوں ادوار سے ہے، انھوں نے اپنی آنکھیں تو اموی دور میں کھولیں لیکن وفات عہد عباسی میں ہوئی تھی۔ دونوں عہد سے تعلق رکھنے والے قرائے کرام میں امام ابو عمرو بن العلاء بصری (۶۸-۱۵۳ھ)، امام حمزہ بن حبیب زیات کوفی (۸۱-۱۵۷ھ) اور امام نافع بن عبدالرحمن مدنی (نحو ۷۰-۱۶۹ھ) شامل ہیں۔

خالص عباسی عہد سے تعلق رکھنے والے قاری، امام علی بن حمزہ کسائی (م ۱۸۹ھ) تھے۔

مذکورہ بالا سبب قراء کی فہرست میں جب امام ابو جعفر یزید بن قعقاع مدنی (م ۱۳۰ھ)، امام ابو محمد یعقوب بن اسحاق حضرمی (م ۲۰۵ھ) اور ابو محمد خلف بن ہشام بن ثعلب بزار بغدادی (م ۲۲۹ھ) کو شامل کر لیا جاتا ہے تو قراء عشرہ کی فہرست مکمل ہو جاتی ہے، جن میں صرف امام ابو جعفر یزید بن قعقاع مدنی (م ۱۳۰ھ) کا تعلق اموی دور سے ہے جب کہ باقی ماندہ دونوں ائمہ قرأت کا تعلق عہد عباسی سے ہے۔ علم قراءت کو پروان چڑھانے میں قراء سبب/قراء عشرہ کے شاگردوں نے اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

فن قراءت پر ایک اہم کتاب کے مؤلف ابو عبید قاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ) کے بقول ”قراءت سبب“ کی اصطلاح کا چلن دوسری صدی سے عام ہوا تھا ورنہ اس سے پہلے بہت سے قراء کا ذکر ملتا ہے جن کی جانب کسی نہ کسی قراءت کو منسوب کیا جاتا ہے۔

عہد عباسی میں اس فن پر قلم اٹھانے والوں میں ابو عبید قاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ)، خلف بن ہشام، ابن مجاہد (م ۳۲۴ھ)، ابن کامل، ابوطاہر، ابوبکر نقاش، ابوبکر محمد بن حسن، ابو معشر عبدالکریم طبری (م ۴۷۸ھ) ابو العلاء حسن بن محمد ہمدانی (۵۶۹ھ) اور علی بن محمد بن عبدالصمد سخاوی (م ۶۴۳ھ) جیسے اہل قلم شامل ہیں۔

عہد عباسی میں فن قرأت کی اہم تصانیف میں ”احتجاج القراءۃ“ از مبرد (م ۲۸۶ھ) ”الاحتجاج فی القراءات“ از ابوبکر ابن مقسم مقری (م ۳۵۴ھ)، اور ”البدیع فی القراءات السبع“ از ابن خالویہ (م ۳۷۰ھ) کا شمار ہوتا ہے۔

14.4.1.4 علم تجوید القرآن

علم قرأت کے ساتھ ساتھ علم تجوید بھی پروان چڑھتا رہا۔ تجوید کے لغوی معنی ”کسی کام کو بہترین طریقے سے انجام دینا ہے“ اور اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ ”دوران تلاوت قرآن کے الفاظ کی بہترین طریقے سے ادائیگی اور صحت مخارج کے ساتھ قرآن کی تلاوت اس طرح کی

جائے کہ حسن و لطف اپنی انتہا کو پہنچ جائیں۔“

علم تجوید فن قرأت کا ثمرہ اور نتیجہ ہے، اس کا دائرہ علم قرأت کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہے۔ اس موضوع پر موسیٰ بن عبید اللہ خاقانی بغدادی (م ۳۲۵ھ) نے پہلی کتاب لکھی تھی۔ علی بن محمد سخاوی (م ۶۳۳ھ) نے بھی اس موضوع پر ”جمال القراء و کمال الاقراء“ نامی کتاب لکھی تھی۔

14.4.1.5 علم اسباب النزول

علم اسباب نزول سے: ”وہ علم مراد ہے جس کے ذریعہ یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ فلاں آیت کب اور کس واقعے کے سلسلے میں نازل ہوئی۔“ امام شاطبی نے اس علم کے فوائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”سبب نزول کے معلوم ہو جانے سے قرآن فہمی میں ہر اشکال کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید کے مطالب و معانی سمجھنے کے لیے یہ علم بہت ناگزیر ہے۔“

مذکورہ علم پر سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد امام عکرمہ (م ۱۰۷ھ) نے قلم اٹھایا تھا۔ امام سیوطی اور حاجی خلیفہ نے امام بخاری کے استاد امام علی بن عبداللہ مدینی (م ۲۳۴ھ) کو اس فن کا اولین مصنف قرار دیا ہے۔ ان کے علاوہ امام علی بن احمد واحدی (۴۲۷ھ) نے ”اسباب النزول“ لکھی تھی۔ اس فن پر لکھی جانے والی اہم کتب عہد عباسی کے بعد لکھی گئیں تھیں۔ مذکورہ بالا مستقل کتب کے علاوہ تفسیر بالماثور کے زمرہ سے تعلق رکھنے والی کتب تفاسیر میں بھی آیات کے اسباب نزول کا ذکر کیا گیا ہے۔

14.4.1.6 علم النسخ و المنسوخ

اس علم سے مراد وہ علم لیا جاتا ہے جس میں کسی آیت کے نسخ یا منسوخ ہونے کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ متقدمین و متأخرین میں سے بعض علما اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کی متعدد یا کچھ آیات منسوخ ہو چکی ہیں۔ انھوں نے اس حوالہ سے اپنے افکار و آرا اور خیالات و نظریات کو قلم بند کیا ہے جس نے آگے چل کر ”علم النسخ و المنسوخ“ کا قالب اختیار کر لیا۔ اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں ”المصنفی بأکف أهل الرسوخ في النسخ و المنسوخ“ از ابن جوزی (م ۵۹۷ھ)، ”ناسخ القرآن و منسوخه“ از ابراہیم حربی، ”ناسخ القرآن و منسوخه“ از ابراہیم کشی، ”ناسخ القرآن و منسوخه“ از ابوالسّمعیل ترمذی، ”ناسخ القرآن و منسوخه“ از جعفر بن مبشر ثقفی، ”ناسخ القرآن و منسوخه“ از عطاء بن مسلم خراسانی، ”ناسخ القرآن و منسوخه“ از کلّبی، ”الناسخ و المنسوخ“ از ابوبکر بردعی، ”الناسخ و المنسوخ“ از ابوبکر حازمی، ”الناسخ و المنسوخ“ از جعد شیبانی، ”الناسخ و المنسوخ“ از ابوالحسن قتی، ”الناسخ و المنسوخ“ از ابن جنبل، ”الناسخ و المنسوخ“ از امام سجستانی وغیرہ شامل ہیں۔

14.4.1.7 علم لغات القرآن

قرآن کریم کے زیر اثر پروان چڑھنے والے علوم میں علم لغت بھی ہے۔ قرآن کے مفردات کے معانی سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے علم لغت جیسا فن وجود میں آیا تھا جس نے آگے چل کر عربی زبان کے مکمل الفاظ کے معانی کو بیان کرنے کا فریضہ انجام دیا تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید کے مشکل اور نادر الفاظ کے معانی و مطالب کا سلسلہ تو عہد نبوی سے شروع ہو چکا تھا کہ

حضرت عبداللہ بن عباس کے بیان کردہ قرآنی الفاظ کے معانی و مطالب کا ذکر تفاسیر و کتب حدیث میں ملتا ہے۔ مذکورہ موضوع پر سب سے پہلے پیشم بن عدی کوفی (م ۲۰۷ھ) نے کتاب لکھی تھی۔ ان کے بعد مشہور نحوی سیبویہ کے استاد ابو زید سعید بن اوس انصاری (م ۲۱۵ھ)، فراء، اصمعی، محمد بن یحییٰ قطیبی وغیرہ نے بھی لغات القرآن کے عنوان سے کتابیں لکھی تھیں۔ ان کے علاوہ مصادر اس موضوع پر کچھ اور کتابوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جیسے ”معانی القرآن“ از یونس بن حبیب (م ۱۸۲ھ)، ”معانی القرآن“ از مؤرخ بن عمرو سدوسی (م ۱۹۵ھ)، ”لغات القرآن“ از محمد بن یحییٰ بصری، ”ما اتفقت الفاظہ واختلفت معانیہ فی القرآن“ از مبرد، ”اما اتفقت ألفاظہ ومعانیہ فی القرآن“ از ابو عمرو دوری، ”مفردات القرآن“ از راغب اصفہانی۔

اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں ان کتابوں کو بھی ایک لحاظ سے شامل کیا جاسکتا ہے جو غریب القرآن کے عنوان سے لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح کتب تفاسیر میں بھی قرآنی الفاظ کے معانی و مفہیم کو بیان کیا گیا ہے۔ عام کتب لغات میں بھی قرآنی الفاظ کے معانی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دیگر علوم قرآنی میں علم حروف القرآن، علم اجزاء القرآن، علم اقسام القرآن، علم مصادر القرآن، علم سجود القرآن، علم ضمائر القرآن، علم الہکی والمدنی جیسے ”المکی والمدنیمن القرآن واختلاف المکی والمدنی فی آیة“ از ابو عبداللہ محمد شریح ابن احمد مقرئ جیسے موضوعات پر بھی عہد عباسی میں کتابیں لکھی گئی تھی۔

علوم القرآن کی بحث کو ختم کرنے سے قبل اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ علوم القرآن میں کچھ علوم ایسے ہیں جن کا تعلق براہ راست قرآن سے تھا جن میں سے بعض کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ علوم القرآن کے علوم کی دوسری قسم ان علوم پر مشتمل ہے جن کا تعلق براہ راست قرآن سے نہیں تھا، لیکن وہ بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ ”قرآن مجید کے زیر اثر ارتقا پذیر ہوئے اور مسلمانوں نے اپنی مخصوص دینی ثقافت، قومی مزاج اور ذہانت و فطانت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ان علوم کو چار چاند لگا دیے مثلاً تاریخ، جغرافیہ اور سیر و سوانح وغیرہ“۔ ان علوم کا ذکر ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

14.4.2 حدیث اور علوم حدیث

علم حدیث کو بنیادی طور پر دو شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: ۱۔ علم روایت ۲۔ علم درایت۔ علم روایت کی ابتدا کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب مروی احادیث نبوی کی تعداد بہت بڑھ گئی اور اس میں ربط و یابس مواد شامل کیا جانے لگا تو حدیث نبوی کی صحت کو جانچنے، پرکھنے اور مختلف فیہ مسائل کو سمجھنے کے لیے کچھ اصول و ضوابط بنائے گئے۔ ان میں سے کچھ اصولوں کا تعلق احادیث کی اسناد سے تھا کہ صرف وہی احادیث قابل اعتبار قرار پائیں گی جس میں سند کا غیر منقطع سلسلہ موجود ہوگا۔ ان اصول و ضوابط کو ”علم روایت“ یا ”علم اسناد“ سے موسوم کیا گیا۔ علم روایت کے بطن سے علم اسماء الرجال جیسا عظیم الشان فن وجود میں آیا جس کی نظیر کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی ہے۔

اصول و قواعد کی دوسری قسم کا تعلق احادیث کے مختلف پہلوؤں سے تھا۔ ان جملہ اصول و ضوابط کو ”علم درایت“ یا ”علم اصول الحدیث“ کا نام دیا گیا۔ علم درایت ایسے قوانین و مباحث کا مجموعہ ہے جس کی روشنی میں راوی کے ثقہ ہونے یا نہ ہونے، صحیح یا کمزور اور مقبول یا

مردود ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے علم درایت، کسی روایت کے مطلب و مضمون کی عقلی تنقید کا نام ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ علوم حدیث کے اکثر علوم جیسے علم الجرح والتعدیل، علم مختلف الحدیث اور علم علل الحدیث وغیرہ کا تعلق علم درایت سے ہی ہے۔

درج ذیل سطور میں حدیث اور علوم حدیث سے متعلق ان علمی کوششوں و کوششوں کا مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے جو عہد عباسی کی مرہون منت ہیں۔

14.4.2.1 تدوین احادیث کے ادوار

اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے حدیث اور اس کے علوم کو سات ادوار میں تقسیم کیا ہے:

۱- عہد صحابہ سے قرن اول تک۔

۲- دوسری صدی ہجری جس میں احادیث کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا تاہم تدوین کا عمل شروع نہیں ہوا تھا۔

۳- تیسری صدی ہجری تا چوتھی صدی کا نصف اول۔ اس عہد میں حدیث سے متعلق کئی علوم سامنے آئے تھے اور علم حدیث ایک خاص فن بن گیا تھا۔

۴- چوتھی صدی کے نصف آخر تا اوائل ساتویں صدی۔ اس مدت میں علوم حدیث نے بہت زیادہ ترقی کر لی تھی اور فن کے معراج پر پہنچ گئے تھے۔ اسی عہد میں ”المحدث الفاصل بین الراوی والواعی“ از امام رامہرمزی (م ۳۶۰ھ)، ”الکفایۃ فی قوانین الروایۃ“

اور ”الجامع لأخلاق الراوی و آداب السامع“ از خطیب بغدادی، احمد بن علی (م ۴۶۳ھ) اور ”معرفة علوم الحدیث“ از امام حاکم نیشاپوری (م ۵۰۵ھ) جیسی اہم کتب مرتب کی گئیں تھیں۔ اول الذکر کتاب کو علم اصول حدیث کی اولین کتاب قرار دیا جاتا ہے۔

۵- پانچویں صدی ہجری سے لے کر دسویں صدی ہجری تک۔ اس عہد میں جرح و تعدیل کا فن بام عروج پر پہنچتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس

عہد کی علمی عطا یاودین میں ابن الصلاح کی ”علوم الحدیث“ معروف بہ مقدمة ابن الصلاح جیسی بلند پایہ کتاب بھی شامل ہے۔

۶- گیارہویں صدی تا تیرہویں صدی۔ اس عہد کو تقلید کا دور کہا جاتا ہے کہ اس میں اجتہاد کا خاتمہ ہو چکا تھا اور قدما کی کتابوں کو

سامنے رکھ کر کتابیں لکھی جا رہی تھیں۔

۷- چودھویں صدی و ما بعد۔ اس عہد میں مشتسر قین اور مغربی علما نے حدیث کی حجیت پر شک و شبہ کا اظہار کیا تھا جس کا کافی و شافی

جواب دیا گیا تھا۔ اس عہد کو درایت کا نیا دور کہا جاسکتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام ادوار میں سے پہلا اور آخری دور مکمل طور پر اور دوسرا اور چھٹا دور جزوی طور پر اس سبق کے دائرہ میں شامل نہیں

ہے۔ حسب ذیل سطور میں باقیماندہ ادوار میں حدیث کے ارتقائی مراحل کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

ان ادوار پر سرسری نظر ڈالنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ حدیث کی تدوین کا آغاز عہد نبوی میں ہی ہو چکا تھا جس کا ایک اہم نمونہ

ڈاکٹر حمید اللہ علیہ الرحمہ کی کوششوں سے منظر عام پر آچکا تھا۔ اولیں مجموعہ احادیث ”صحیفة ہمام بن منبہ“ کے نام سے موسوم کیا جاتا

ہے۔ خلافت راشدہ اور عہد اموی میں تدوین کے عمل کا آغاز ہو چکا تھا تاہم احادیث کے تمام اہم مجموعے عہد عباسی میں ہی مرتب کیے گئے تھے اور انھیں مرتب کرنے میں بہت ہی محنت شاقہ اور دقت نظری سے کام لیا گیا تھا۔

تدوین حدیث کی تاریخ پر سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احادیث کو مرتب اور مدون کرنے کے لیے مختلف طریقہ کار کو بروئے کار لایا گیا تھا جن کا بنیادی مقصد احادیث کی حفاظت تھی۔ احادیث کے ابتدائی مجموعے موضوع و مضمون کی بجائے راویوں کے اعتبار سے مرتب کیے گئے تھے۔ بعد میں انھیں تسہیل و تفہیم کی ضرورتوں کے پیش نظر مضامین و مطالب کے اعتبار سے کیا گیا تھا۔

14.4.2.2 عہد عباسی میں مرتب کردہ مجموعہ احادیث

تقریباً پورے عہد عباسی میں احادیث کے مجموعے مرتب کیے جاتے رہے ہیں اور حدیث کے مختلف پہلوؤں پر اہل قلم اپنی اپنی تصانیف قلم بند کرتے رہے ہیں۔ عہد عباسی کے تمام ادوار میں تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی اس لحاظ سے ممتاز ترین قرار دی جاسکتی ہے کہ اسی صدی میں احادیث کے تمام اہم مجموعوں خصوصاً صحاح ستہ کو مرتب کیا گیا تھا۔ عہد عباسی میں حدیث کے مجموعوں کو مختلف جہات سے مرتب کیا گیا تھا جن کی مناسبت سے انھیں مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے:

14.4.2.2.1 الجامع الصحيح

اس اصطلاح کا اطلاق ان مجموعہ احادیث پر کیا جاتا ہے جن میں صرف ان احادیث کو جمع کیا گیا ہے جو درایت اور روایت کے اصول و معیار پر مکمل اترتی ہیں۔ ان مجموعوں میں جگہ پانے والی احادیث، ظن غالب کی بنا پر صحیح قرار دی جاتی ہیں۔ ایسے مجموعوں کو ”الجامع الصحيح“ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان مجموعوں میں امام ابو عبد اللہ محمد بن اسمعیل بخاری (م ۲۵۶ھ)، امام مسلم بن حجاج قشیری (م ۲۶۱ھ) کے مرتب کردہ مجموعے زیادہ واقع اور اہمیت کے حامل ہیں جنہیں ”الصحيحين“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کہ ان میں ”صرف وہ حدیثیں درج ہیں جو بالکل صحیح تسلیم کی گئی ہیں“۔

صحیحین کے علاوہ دیگر محدثین نے بھی صحیح احادیث کے مجموعے تیار کیے تھے جنہیں ان کے مرتبین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جیسے صحیح ابن خزيمة (م ۳۱۱ھ)، صحیح ابی عوانة (م ۳۱۶ھ) اور صحیح ابن حبان البستی (م ۳۵۴ھ) وغیرہ۔

14.4.2.2.2 السنن

کچھ محدثین نے صحیح احادیث کے ساتھ دوسری اقسام کی احادیث جیسے حسن احادیث وغیرہ کو بھی اپنے اپنے مجموعوں میں جگہ دی تھی جن کا مقام و مرتبہ صحیح حدیث سے کچھ کم اور فروتر ہوتا ہے لیکن انھیں غلط نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایسے مجموعہ احادیث کو ”السنن“ کہا جاتا ہے۔ اس زمرہ میں امام ابو داؤد، سلیمان بن اشعث (م ۲۷۵ھ)، امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی (م ۲۷۹ھ)، امام احمد بن شعیب نسائی (م ۳۰۳ھ) اور امام ابن ماجہ، محمد بن یزید (م ۲۷۳ھ) کی کتب احادیث کو اعتبار کا درجہ حاصل ہے۔

مذکورہ بالا سنن اربعہ، جن کا شمار صحاح ستہ میں کیا جاتا ہے، کے علاوہ دیگر مجموعے بھی سنن کے نام سے مرتب کیے گئے تھے جیسے ”سنن الدارمی“ (م ۲۵۵ھ)، سنن الدار قطنی (م ۳۸۵ھ)، السنن الکبیرة اور السنن الصغیرة از امام بیہقی (م ۴۵۸ھ) وغیرہ۔

14.4.2.2.3 المسند/المسانيد

اس اصطلاح کا استعمال ان مجموعہ احادیث کے لیے کیا جاتا ہے جن میں احادیث اور اقوال نبوی کو راویوں کے اعتبار سے کو جمع کیا گیا تھا۔ احادیث کے ابتدائی مجموعوں کو ”المسند/المسانيد“ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عام طور ان مجموعہ احادیث کو ان کے مرتب کرنے والے سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے مجموعے عہد عباسی سے قبل بھی مرتب کیے جا چکے تھے۔ عہد عباسی کی اہم مسانید میں مسند ابوداؤد طیالسی (م ۲۰۳ھ)، مسند اسد بن موسیٰ اموی (م ۲۱۲ھ)، مسند عبید اللہ بن موسیٰ بغدادی (م ۲۱۳ھ)، مسند مسدد بن مسرہد بصری (م ۲۲۸ھ)، مسند نعیم بن حماد خزاعی مصری (م ۲۲۹ھ)، مسند اسحاق بن راہویہ (م ۲۳۸ھ)، مسند ابن ابی شیبہ (م ۲۳۹ھ)، مسند احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)، مسند احمد بن منیع (م ۲۴۲ھ)، مسند امام بزار (م ۲۹۲ھ)، مسند ابن حبان (م ۳۵۴ھ) اور مسند الخوارزمی از احمد بن محمد برقانی (م ۴۲۵ھ) وغیرہ شامل ہیں۔

14.4.2.2.4 المصنف

مسند کے مقابلہ میں دیگر مجموعہ احادیث کو مصنف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کہ انھیں احادیث کے مضمون کے اعتبار سے ابواب کی شکل میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس قسم کے مجموعہ کو پہلی مرتبہ امام عبدالرزاق صنعانی (م ۲۱۱ھ) نے مرتب کیا تھا جسے ”مصنف عبدالرزاق“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کے بعد ابن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ) نے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جسے علمی دنیا میں ”مصنف ابن ابی شیبہ“ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ امام طحاوی (م ۳۴۰ھ) نے بھی ”المصنف“ کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ صحاح ستہ کا شمار بھی احادیث کے اسی زمرہ احادیث ”مصنف“ میں ہوتا ہے کہ ان میں بھی احادیث کو موضوع کے اعتبار سے مختلف ابواب کے تحت ذکر کیا گیا ہے۔

14.4.2.3 عہد عباسی کا سرمایہ حدیث

عہد عباسی میں حدیث اور اس کے علوم سے متعلق مرتب کی جانے والی کتب و تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے جس کا ان صفحات میں استیعاب نہیں کیا جاسکتا ہے تاہم ضروری اور اہم کتب احادیث کی ایک نامکمل فہرست حسب ذیل درج کی جا رہی ہے:

امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) کی ”کتاب المؤطا“، عبدالرزاق بن ہمام (م ۲۱۱ھ) کی ”الجامع الکبیر“ اور ”المصنف“، امام اسحاق بن راہویہ (م ۲۳۸ھ) کی ”المسند“، ابن ابی شیبہ (م ۲۳۹ھ) کی ”المسند“، امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) کی ”المسند“، کتاب الزہد، اور ”الجرح والتعديل“ وغیرہ، امام محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ) کی ”الجامع الصحیح“ المعروف بصحیح البخاری، ”الأدب المفرد“، ”التاریخ الکبیر“، ”التاریخ الصغیر“ اور ”کتاب الضعفاء“، امام مسلم بن حجاج (م ۲۶۱ھ) کی ”الجامع الصحیح“، ”المسند الکبیر“، ”الجامع“، ”الکنی و الأسماء“، ”أوهام المحدثین“، طبقات التابعین اور ”کتاب العلل“ وغیرہ، امام ابن ماجہ، محمد بن یزید (م ۲۷۳ھ) کی کتاب السنن، امام ابوداؤد، سلیمان بن اشعث (م ۲۷۵ھ) کی کتاب السنن اور کتاب المراسیل، امام محمد بن عیسیٰ ترمذی (م ۲۷۹ھ) کی الجامع الالکبیر (صحیح الترمذی/سنن الترمذی)، الشمائل النبویة اور کتاب العلل وغیرہ، امام ابن خیثمہ (م ۲۷۹ھ) کی تاریخ ابن خیثمہ، امام احمد بن علی نسائی (م ۳۰۳ھ) کی کتاب السنن،

المجتبی اور الضعفاء والمتروکون، امام ابو یعلیٰ، احمد بن علی (م ۳۰۷ھ) کی کتاب المعجم، المسند الكبير اور المسند الصغير، امام ابن خزيمة، محمد بن اسحاق (م ۳۱۱ھ) کی صحیح ابن خزيمة، امام محمد بن احمد طحاوی (م ۳۴۰ھ) کی المصنف، امام محمد بن حبان بسبی (م ۳۵۴ھ) کی صحیح ابن حبان، کتاب الثقات اور کتاب التابعین، امام سلیمان بن احمد طبرانی (م ۳۶۰ھ) کی المعجم الكبير، المعجم الأوسط اور المعجم الصغير، امام احمد بن عبد اللہ عجل (م ۳۶۱ھ) کی کتاب الثقات، امام ابن عدی (م ۳۶۵ھ) کی الكامل، امام علی بن عمر دارقطنی (م ۳۸۵ھ) کی سنن الدر قطنی، ابن شاپین بغدادی، عمر بن احمد (م ۳۸۵ھ) کی کتاب السنة یا المسند، تاریخ أسماء الثقات اور معجم الشيوخ وغيره، ابن منده، محمد بن اسحاق (م ۳۹۵ھ) کی معرفة الصحابة اور فتح الباب في الكنى والألقاب، امام حاکم نیشاپوری (م ۴۰۵ھ) کی المستدرک اور معرفة علوم الحديث، امام احمد بن حسین بیہقی (م ۴۵۸ھ) کی السنن الكبرى، السنن الصغرى، دلائل النبوة، معرفة السنن والآثار اور الجامع المصنف في شعب الايمان وغيره، امام خطیب بغدادی، احمد بن علی (م ۴۶۳ھ) کی الکفاية في أصول الرواية، الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع، الفوائد المنتخبة، شرف أصحاب الحديث، الرحلة في طلب الحديث، الأسماء والألقاب، السابق واللاحق في تباعد ما بين وفاة الراويين عن شيخ واحد اور کتاب المتفق والمفترق، امام ابن ماکولا، علی بن ہبته اللہ (م ۴۷۵ھ) کی الاكمال اور تكملة الاكمال، امام ابن اثیر، مبارک بن محمد (م ۶۰۶ھ) کی جامع الأصول في أحاديث الرسول، النهاية، الشافي في شرح مسند الشافعي، تجريد أسماء الصحابة اور منال الطالب في شرح طوال الغرائب، امام ابن اثیر، علی بن محمد (م ۶۳۰ھ) کی أسد الغابة في معرفة الصحابة، امام ابن الصلاح (م ۶۴۳ھ) کی کتاب مقدمة ابن الصلاح۔

14.4.3 علوم الحديث

قرآن کی طرح حدیث کے بطن سے پروان کچھ علوم پروان چڑھے تھے جنہیں علوم الحديث کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، ان کا تعلق براہ راست حدیث نبوی سے ہی ہے۔ درج ذیل سطور میں اختصار کے ساتھ ان علوم کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔

14.4.3.1 علم اسماء الرجال / علم رجال الحديث

احادیث کی صحت و سقم و ضعف وغیرہ کو جانچنے اور پرکھنے کے کچھ اصول و ضوابط بنائے گئے تھے جن میں سے کچھ کا تعلق ”علم روایت“ سے تھا تو کچھ کا تعلق ”علم درایت“ سے تھا۔ راویوں کے ثقہ ہونے یا نہ ہونے کے لیے چند رہنما اصول مقرر کیے گئے جس کے نتیجے میں اسماء الرجال جیسا فن وجود میں آیا جس کی نظیر آج تک کسی اور مذہب و ملت کے پیروکار پیش نہ کر سکے۔

حدیث نبوی و سیرت نبوی کے جلو میں اسماء الرجال جیسا عظیم الشان علم پروان چڑھا تھا کہ اہل علم حضرات کو اس ضرورت کا احساس ہوا کہ صحت روایت کے لیے راویوں کے حالات زندگی اور ان کی دینی و اخلاقی حیثیت کے متعلق بھی معلومات فراہم کی جائیں تاکہ ان کی مرویات کی درجہ بندی ہو سکے۔ اس احساس ضرورت نے اسماء الرجال جیسے علم کو کچھ اس طرح پروان چڑھایا کہ ہزاروں اشخاص کے حالات زندگی محفوظ ہو گئے۔

اس علم میں راویان احادیث کو بحیثیت ”راوی حدیث“ جائزہ لیا جاتا ہے۔ اسی علم کو فن رجال الحدیث بھی کہا جاتا ہے۔ اس علم کی ذیلی شاخیں بھی ہیں جیسے طبقات رواة، علم جرح و تعدیل وغیرہ۔ ان موضوعات پر علما نے اس قدر لکھا ہے کہ وہ ایک مستقل علم بن گئے تھے۔

اسماء الرجال کا فن خالص مسلمانوں کا ایجاد کردہ ہے۔ اس فن میں راویان احادیث کے اسماء، القاب، مختصر حالات زندگی، اخلاق و اوصاف، روایت حدیث میں ان کے مقام و مرتبہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ راویان احادیث کے حالات زندگی کو اکٹھا کرنے میں اس فن کے ماہرین نے خاصی مشقت اٹھائی تھی۔ ایک ایک راوی کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے وہ قریہ قریہ گئے تھے، مختلف شہروں کی خاک چھانی تھی، حاصل شدہ معلومات کو مختلف اعتبار سے جانچا اور پرکھا تھا جب تب جا کر اسماء الرجال جیسا فن وجود میں آیا اور اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب و تصانیف میں ہزاروں افراد کے حالات زندگی کو محفوظ کر دیا گیا۔ مستشرقین عام طور سے مسلمانوں کے کارناموں کا کھل کا اعتراف نہیں کرتے ہیں؛ لیکن اس فن میں وہ ان کی تندہی اور جانفشانی کا اعتراف کیے نہ رہ سکے کہ اس جیسا فن کسی نے بھی ایجاد نہیں کیا تھا۔ اس ضمن میں مشہور مستشرق اسپرنگر/ شپرنگر کے قول نے سند کا درجہ اختیار کر لیا ہے۔ ان کا قول ہے: ”دنیا میں نہ کوئی قوم ایسی گزری ہے، نہ آج تک موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال جیسا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو“۔

فن اسماء الرجال خالص عہد عباسی کی پیداوار ہے۔ اس فن پر پہلی کتاب ابو سعید یحییٰ بن سعید بن فروخ (م ۱۹۸ھ) کی جانب منسوب کی جاتی ہے۔ سوائے اتفاق سے یہ کتاب محفوظ نہ رہ سکی۔ اس فن پر امام بخاری (م ۲۵۶ھ) کی تاریخ الکبیر، تاریخ الصغیر اور کتاب الضعفاء کا شمار اہم کتابوں میں ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ بطور علم اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔ اس فن میں امام مسلم (م ۲۶۱ھ) کی کتاب کا نام ”کتاب المفردات والوحدان“ ہے۔ انھوں نے طبقات تابعین پر بھی ایک کتاب بطور یادگار چھوڑی ہے۔ امام مسلم کے معاصر احمد بن عبد اللہ علی (م ۲۶۱ھ) نے ”کتاب الجرح والتعدیل“ لکھی۔ امام نسائی (م ۳۰۳ھ) کی ”کتاب الضعفاء والمتروکین“ کا شمار بھی اس فن کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ امام دارقطنی (م ۳۸۵ھ) نے بھی ضعیف راویوں کے حالات پر ایک اہم کتاب بطور یادگار چھوڑی ہے۔

اس فن کی دیگر کتب و تالیفات میں ابن سعد (م ۲۳۰ھ) کی الطبقات الکبریٰ، ابن خیثمہ (م ۲۷۹ھ) کی تاریخ ابن خیثمہ، امام نسائی کی (م ۳۰۳ھ) کی التمییز اور تاریخ الضعفاء، ابن جارود (م ۳۰۷ھ) کی الأحاد فی الصحابة، محمد بن احمد دولابی (م ۳۱۰ھ) کی کتاب الأسماء والکنی، ابن ابی حاتم کی الجرح والتعدیل، عثمان بن السکن (م ۳۵۳ھ) کی کتاب الحروف فی الصحابة، ابن حبان (م ۳۵۴ھ) کی کتاب التابعین، کتاب المراسیل اور کتاب الکنی، امام دارقطنی (م ۳۸۵ھ) کی المختلف والمؤتلف فی أسماء الرجال، احمد بن محمد کلاباذی (م ۳۹۸ھ) کی أسماء رجال صحیح البخاری جس کے مختلف نام مصادر میں ملتے ہیں: الکلام علی رجال البخاری/الإرشاد فی معرفة رجال البخاری/ الهدایة والإرشاد فی معرفة أهل النقة والسداد، عبدالغنی بن سعید ازدی (م ۴۰۹ھ) کی المؤتلف والمختلف فی أسماء نقلة الحدیث اور مشتبہ النسبة، ابن الطحان، یحییٰ بن علی (م ۴۱۶ھ) کی المختلف والمؤتلف، ابن منجویہ، احمد بن علی (م ۴۲۸ھ) کی رجال صحیح مسلم، امام بیہقی (م ۴۵۸ھ) کی کتاب الأسماء والصفات، خطیب بغدادی، احمد بن علی (م ۴۶۳ھ) کی المتفق والمفتروق، المؤتلف تکملة المختلف، ابن ماکولا (م ۴۷۵ھ) کی الإكمال فی المختلف والمؤتلف من أسماء الرجال، محمد بن احمد ابوردی (م ۵۰۷ھ) کی المختلف والمؤتلف، محمد بن طاہر مقدسی (م ۵۰۸ھ) کی

الجمع بين رجال الصحيحين، ابن منده (م ۵۱۱ھ) کی ذکر من عاش من مائة وعشرين سنة من الصحابة، ابن الجوزی (۵۹۷ھ) کی کتاب الضعفاء والمتروکین اور أسماء الضعفاء والواضعین، حافظ عبدالغنی مقدسی (م ۶۰۰ھ) کی الکمال في أسماء الرجال، ابن اثیر جزری، علی بن محمد (م ۶۳۰ھ) کی أسد الغابة في معرفة الصحابة، ابن نجار بغدادی (م ۶۳۳ھ) کی الکمال في معرفة الرجال وغيره شامل ہیں۔

14.4.3.2 علم الجرح والتعديل

علم الجرح والتعديل کا شمار، علم اسماء الرجال کی فروع میں ہوتا ہے جس میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ ”راوی کو کن حالات میں ترک کیا جاتا ہے اور اس کی توثیق و تعدیل کے لیے کیا شرائط ہیں“۔ اس علم کو ”علم معرفة الرجال“ سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس علم کی کسوٹی پر حدیث نبوی کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے اور اس کے مقام و مرتبہ کی تعیین کرتے ہوئے درجہ بندی کی جاتی ہے۔ کشف الظنون کے مؤلف نے اس علم کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ”یہ وہ علم جس میں راویوں کی جرح و تعدیل ایسے مخصوص الفاظ سے کی جاتی ہے جن سے راویان حدیث کے مراتب کا پتہ چلتا ہے۔ یہ علم اسماء الرجال کے فروع میں سے ہے..... اس کا مقصد شریعت اسلامیہ کی حفاظت و صیانت ہے، لوگوں پر طعن و جرح مقصود نہیں“۔

اس فن پر متعدد علمائے قلم اٹھایا ہے اور اس کی جمع و تدوین میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس موضوع پر ایک گراں قدر سرمایہ متقدمین و متاخرین علمائے بطور یادگار چھوڑا ہے جن کا ذکر اسماء الرجال کے تحت کیا جا چکا ہے کہ اس علم کا تعلق بنیادی طور اسی علم سے ہے۔ یہاں صرف اس فن کی چند اہم کتابوں کا ذکر کیا جا رہا ہے:

کتاب الجرح والتعديل از امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)، کتاب الجرح والتعديل از احمد بن عبداللہ عجل (م ۲۶۱ھ)، الجرح والتعديل از ابن ابی حاتم (م ۳۲۷ھ)، کتاب الثقات از ابن حبان بُستی (م ۳۵۴ھ)، کتاب الثقات از عجل (م ۳۶۱ھ)، الکامل في الجرح والتعديل الكامل في معرفة الضعفاء والمتروکین از ابن عدی جرجانی (م ۳۶۵ھ) وغیرہ۔

14.4.3.3 علم مختلف الحديث

اس علم کے ذریعہ ظاہری طور پر ایک دوسرے سے متناقض اور متضاد نظر آنے والی احادیث کے درمیان جمع و تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا ایک کو راجح اور دوسری کو مرجوح قرار دیا جاتا ہے۔ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے بقول ”ایسی روایات کو جن کا تعارض دور ہو سکتا ہے اصطلاح محدثین میں مختلف الحديث کہتے ہیں“۔ اس علم کو علم تطبیق احادیث، اختلاف الحديث، تاویل مختلف الحديث بھی کہا جاتا ہے۔ اس موضوع پر سب سے پہلے امام شافعی (م ۲۰۴ھ) نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ”اختلاف الحديث“ تھا۔

اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں ”اختلاف الحديث“ از علی بن مدینی (م ۲۳۴ھ) ”تاویل مختلف الحديث“ از ابو یحییٰ ساجی (م ۳۰۷ھ)، ”مشکل الآثار“ از محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) اور ”مشکل الآثار“ از طحاوی وغیرہ ہیں۔

14.4.3.4 علم علل الحديث

اس علم میں ان پوشیدہ اور دقیق اسباب و علل سے بحث کی جاتی جن کی بنا پر کسی حدیث کی صحت پر اعتراض کیا جاتا ہے جب کہ ظاہری

طور پر اس حدیث میں کوئی سقم اور کمی نہیں نظر آتی ہے۔ امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام احمد بن حنبل، علی بن مدینی (م ۲۳۴ھ)، زکریا بن یحییٰ ساجی، ابوبکر خلال (م ۳۱۱ھ)، ابن ابی حاتم (م ۳۲۷ھ)، ابن عدی (۳۶۵ھ)، علی بن عمر دارقطنی (م ۳۷۵ھ)، ابوعبداللہ حاکم (م ۴۰۵ھ) اور ابن الجوزی (۵۹۷ھ) جیسے اکابر محدثین نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

14.4.3.5 مشکل الحدیث

عہد عباسی میں قرآن کی طرح حدیث کے مشکل الفاظ کے معانی و مفاہیم کو متعین کرنے کے لیے علما نے کتب لکھیں ہیں جیسے ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) نے صحیحین کے مشکل الفاظ کے معانی و مفاہیم کو ”شرح مشکل الصحیحین“ نامی کتاب میں بیان کیا ہے۔

14.4.3.6 علم غریب الحدیث

جس طرح اہل علم نے قرآن کریم کے غریب اور نامانوس الفاظ کے معانی پر کتابیں لکھی ہیں اسی طرح احادیث کے مشکل اور شاذ و نادر الفاظ پر بھی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ اس علم کے ذریعہ متن حدیث کے ان الفاظ کے معانی و مفاہیم کو متعین کیا جاتا ہے جن کا مطلب قلت استعمال کی وجہ سے واضح اور صاف نہیں ہوتا ہے۔ اس موضوع پر ابوعبیدہ معمر بن شیبہ (م ۲۰۱ھ) نے پہلی کتاب لکھی تھی۔ دوسری کتاب لکھنے کا سہرا نصر بن شمیم مازنی (م ۲۰۴ھ) کے سر بندھتا ہے۔ تیسری کتاب ابوعبیدہ قاسم بن سلام ہروی (م ۲۲۴ھ) نے چالیس سالہ شب و روز کی محنت کے بعد ”غریب الحدیث“ کے نام سے مرتب کی تھی۔

اس موضوع کی پر لکھی جانے والی دیگر کتب میں ”غریب الحدیث“ از ابن قتیبہ دینوری (م ۲۷۶ھ)، ”غریب الحدیث“ از قاسم بن محمد انباری (م ۳۰۴ھ)، ”غریب الحدیث“ از ابن انباری، محمد بن قاسم (م ۳۲۸ھ)، ”التقریب فی علم الغریب“ از قاضی نور الدین محمود بن احمد ہمدانی قیومی (م ۳۳۴ھ)، ”غریب الحدیث“ از ابوسلیمان حمد بن محمد خطابی بستی (م ۳۸۸ھ)، ”الفائق فی غریب الحدیث“ از زنجشیری (م ۵۳۸ھ) ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) کی ”غریب الحدیث“ اور ”النهاية في غريب الحديث“ از ابن اثیر (م ۶۰۶ھ) کا شمار اہم کتب میں ہوتا ہے۔

14.4.3.7 علم النسخ و المنسوخ

جس طرح قرآن کریم میں نسخ و منسوخ آیات پائی جاتی ہیں اسی طرح حدیث شریف میں نسخ و منسوخ احادیث ملتی ہیں لہذا قرآن کے علم النسخ و المنسوخ کی طرح احادیث میں بھی علم النسخ و المنسوخ پایا جاتا ہے۔ اس علم میں ان احادیث سے بحث کی جاتی ہے جن میں جمع و تطبیق یا راجح و مرجوح ہونے کی کوئی شکل نہ پائی جاتی ہو۔ اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں ”الناسخ و المنسوخ“ از امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)، ”نسخ الحدیث و منسوخہ“ از ابوبکر اثرم (م ۲۶۱ھ)، ”نسخ الحدیث و منسوخہ“ از ابن شاہین بغدادی (م ۳۸۵ھ)، ”الاعتبار فی بیان النسخ و المنسوخ من الآثار“ از ابوبکر محمد بن موسیٰ حازمی (م ۵۸۴ھ) اور ”الناسخ و المنسوخ“ از ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) وغیرہ ہیں۔

14.4.3.8 علم موضوعات الحدیث

اس علم سے مراد وہ علم جس کے ذریعہ موضوع اور گڑھی ہوئی احادیث کا پتہ چلتا ہے۔ اس علم کا تعلق درایت سے ہے۔ محدثین عظام

نے واضعین حدیث کو پرکھنے اور جانچنے کے کچھ پیمانے بنائے تھے اور ان کی روشنی میں، سخت محنت اور جانفشانی کے بعد موضوع احادیث کو مستقل کتابوں میں اکٹھا اور یکجا کر دیا ہے۔ اس موضوع پر علامہ ابن جوزی (۵۹۷ھ) نے ”الموضوعات في الأحاديث المرفوعات“ نامی کتاب لکھی تھی۔

14.4.3.9 علم اصول الحدیث

احادیث نبوی کو روایت اور درایت کی روشنی میں جمع کیا گیا ہے۔ درایت سے متعلق اصول کو علم اصول الحدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر غالباً پہلی کتاب امام رامہرمزی (م ۳۶۰ھ) نے لکھی تھی اور اسے ”المحدث الفاصل بين الراوى والواعي“ کے نام سے موسوم کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس موضوع پر سب سے پہلے محمد بن حبان بسٹی (م ۳۵۴ھ) نے قلم اٹھایا تھا اور ”التقاسيم والأنواع“ نامی کتاب مرتب کی، لیکن وہ زمانہ کی دست و برد کا شکار ہو چکی ہے۔

علم اصول حدیث پر لکھی جانے والی دیگر اہم کتب میں امام حاکم نیساپوری (م ۴۰۵ھ) کی ”معرفة علوم الحديث“، أبو نعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ) کی ”طبقات المحدثين والرواة“، خطیب بغدادی، احمد بن علی (م ۴۶۳ھ) کی ”الكفاية اور الجامع لآداب الشيخ والسماع“، ابو حفص عمر بن عبد المجید قرشی (م ۵۸۰ھ) کی ”ما لا يسع المحدث جهله“، عمر بن بدر (م ۵۳۲ھ) کی ”المغنی في علم الحديث“ اور ابن صلاح (۶۳۳ھ) کی ”علوم الحديث“ معروف بہ ”مقدمة ابن الصلاح“ وغیرہ شامل ہیں۔

قرآن کی طرح حدیث نے بھی جغرافیہ، تاریخ، سیرت و سوانح، علم انساب و قبائل کے ساتھ ساتھ مختلف لسانی علوم و فنون کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

14.4.3 فقہ اور اصول فقہ

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ایک مکمل نظام حیات پیش کرتا ہے اور زندگی میں در کر آنے والے تمام مسائل کا صحیح اور قابل عمل حل پیش کرتا ہے۔ عہد نبوی کا معاشرہ بہت ہی پاک و صاف معاشرہ تھا۔ اس عہد میں فقہی مسائل کا تعلق عام طور سے زندگی کے روزمرہ کے معمولات اور عبادات کے مسائل سے تھا۔ عہد خلافت راشدہ تا عہد عباسی تک اسلامی قلمرو کے رقبہ میں بہت زیادہ وسعت اور مختلف اقوام و تہذیب کے ملاپ و ملن کے نتیجے میں نئے مسائل سے اس وقت کے معاشرے دوچار ہوئے تھے، جن کا حل اس وقت کے علما و فقہانے قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کیا تھا۔ ان مختلف ادوار کے علما و فضلاء و فقہانے کی کاوشوں نے ”علم فقہ“ کی شکل اختیار کر لی اور اسلامی علوم و فنون کے دائرہ کو مزید وسیع کر دیا۔

14.4.3.1 فقہ کی تعریف

فقہ کی مشہور تعریف امام ابو حنیفہ کی جانب منسوب کی جاتی ہے ”هو معرفة النفس مالها وما عليها“ (نفس کو اس بات کا علم ہونا کہ اس کے حقوق کیا ہیں اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں)۔ بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ: ”یہ مفہوم ضرورت سے کچھ زیادہ ہی وسیع ہے لہذا علما نے اسے زیادہ قطعی بنانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے ”هو العلم بالاحكام الشرعية العملية

من أدلتها التفصيلية“ (تفصیلی دلائل کے ساتھ عملی شرعی احکام کا علم) اور اس کی غرض وغایت عذاب جہنم سے نجات اور جنت کا حصول ہے اور اس کا شرف دین سے متعلق ہونا اور ثواب کے حصول کا باعث ہونا ہے۔

فقہ کے چار بنیادی مآخذ ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ ان مآخذ میں خلفائے راشدین کا تعامل / تعامل صحابہ (کسی معاملہ میں صحابہؓ کا طرز عمل) کو بھی شامل کیا جاتا ہے، کچھ اصحاب علم نے اس کے مآخذ کے دائرہ کو وسعت دیتے ہوئے اس کے دس مآخذ بتائے ہیں، جن میں مذکورہ مآخذ کے علاوہ مسلمان حکمرانوں کی جانب سے جاری کردہ وہ نظامات (انتظامات) ہیں جو قرآن و سنت کے خلاف نہ تھے اور جن سے فقہانے اپنی برأت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا، ثالثوں کے فیصلے جن سے قرآن و سنت اور اجماع کی نفی نہیں ہوتی ہے، وہ ہدایات جو آپ ﷺ نے صحابہ کرام اور تابعین عظام نے، فقہائے کبار کے مشورے سے مسلمان سلاطین و حکمرانوں نے اپنے گورنرس اور سفرا کے لیے جاری کی تھیں، بین الاقوامی تعلقات کے حوالہ سے ایسی قانون سازی جو قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو اور عرف عام / عادت کو شامل کیا جاتا ہے تاہم ان کی حیثیت ضمنی ہی قرار دی جاتی ہے۔

14.4.3.2 تدوین فقہ کے ادوار

علم فقہ نے مختلف ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ ان ارتقائی مراحل کو چھ ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱- دور نبوی ﷺ۔

۲- دور کبار صحابہ رضی اللہ عنہم۔ یہ دور، خلافت راشدہ تک محیط ہے۔

۳- دور صغار صحابہ و تابعین۔ یہ دور خلافت راشدہ کے بعد شروع ہوتا ہے اور زوال خلافت و حکومت اموی تک پھیلا ہے۔

۴- تدوین فقہ کا بنیادی دور جس میں اس نے ایک مستقل علم کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ یہ زمانہ دوسری صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ تیسری صدی کے اختتام پر ہوتا ہے۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی میں ہی اس فن نے اپنے بال و پر نکالے تھے۔ اسی عہد میں منظم فقہی مسالک کا ظہور ہوا کہ بنیادی چار مکاتب فقہ پر وان چڑھے: حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی۔ اسی عہد میں امام اوزاعی (م ۱۵۷ھ) کا مکتب فقہ بھی پایا جاتا ہے، لیکن وہ رواج نہ پاسکا اور تاریخ فقہ اسلامی کا ایک حصہ بن گیا۔

۵- وہ دور جس میں ائمہ کرام کے اجتہادات اور ان کے بیان کردہ مسائل کا ناقدانہ اور باریک بینی سے مطالعہ کیا گیا۔ اس دور کا خاتمہ بنیادی طور پر ستوط بغداد کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے تاہم یہ دور خلافت عباسی کے خاتمہ کے بعد کچھ عرصہ تک مصر میں قائم ہونے والی حکومتوں تک محیط ہے۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ فقہ کی ابتدا بھی عہد عباسی میں ہوئی اور خاتمہ بھی اسی عہد کے خاتمہ پر ہوتا ہے۔

۶- دور تقلید کی ابتدا اور دور اجتہاد کا خاتمہ۔

مذکورہ بالا ادوار میں سے مکمل چوتھا دور اور پانچویں دور کا اکثر حصہ ہی عہد عباسی سے تعلق رکھتا ہے لہذا باقی ماندہ ادوار سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف عہد عباسی میں پروان چڑھنے اور علم فقہ اور اصول فقہ کے اہم علما اور ان کی کتب کا ذکر درج ذیل سطور میں کیا جا رہا ہے۔

14.4.3.3 عہد عباسی کا فقہی سرمایہ

عہد عباسی میں منظر عام پر آنے والی کتب و تصانیف کا استیعاب تو مشکل ہے تاہم اس فن کی اہم کتابوں کا ذکر حسب ذیل سطور

میں مشہور فقہی مکاتب فکر کے اعتبار سے کیا جا رہا ہے:

14.4.3.3.1 فقہ حنفی

حنفی مکتب فکر کی اہم کتب میں ”مسند الامام أبي حنيفة“ از قاضی ابو یوسف (م ۱۸۲ھ)، اسی کتاب کو بعد میں محمد خوارزمی (م ۶۵۵ھ) جامع مسانید أبي حنيفة کے نام سے مکمل کیا تھا، کتاب الخراج، اختلاف أبي حنيفة وابن أبي ليلى اور کتاب الرد علی سیر الأوزاعي از قاضی ابو یوسف (م ۱۸۲ھ)، کتاب المؤطا، الجامع الصغير، الجامع الصغير، المبسوط، السیر الصغير، السیر الكبير از امام محمد بن حسن شیبانی (م ۱۸۹ھ)، کتاب المجرد لأبي حنيفة ترتيب از حسن بن زياد لولوی (م ۲۰۲ھ)، الإسعاف في أحكام الأوقاف از احمد بن عمر نضاف (م ۲۶۱ھ)، اختلاف الفقهاء از امام طحاوی (م ۳۲۱ھ)، مختصر القدوری از ابوالحسن قدوری (م ۴۲۸ھ)، شرح السیر الكبير از امام نرخی (م ۴۸۳ھ)، البدائع شرح تحفة الفقهاء از ابوبکر بن مسعود (م ۵۸۷ھ)، فتاوی قاضی خان، شرح الجامع الصغير اور شرح الزویات از قاضی حسن بن منصور خان (م ۵۹۲ھ)، کتاب الهدایة از علی بن ابوبکر فرغانی مرغینانی (م ۵۹۳ھ)، شرح الجامع الكبير از امام عبدالمطلب بن الفضل حلبی (م ۶۱۶ھ)، شرح الجامع الكبير اور شرح السیر الكبير از محمد بن احمد بخاری (م ۶۳۷ھ) وغیرہ۔

14.4.3.3.2 فقہ مالکی

مالکی مکتب فکر کی اہم کتب میں ”کتاب المؤطا“ از امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ)، ”القضاء في البنيان“ از عبد اللہ بن عبدالحکم، ”المختصر الكبير، کتاب الوثائق والشروط“ اور ”کتاب آداب القضاة“ از محمد بن عبد اللہ بن عبدالحکم مصری (م ۲۶۸ھ)، ”المبسوط“ از قاضی اسماعیل بن اسحاق، ”الموازية“ از محمد بن ابراہیم بن زیاد مواز اسکندری (م ۲۸۱ھ)، ”الزاهي الشعباني“ از ابن قرطی، محمد بن قاسم (م ۳۵۵ھ) وغیرہ۔

فقہ مالکی کا فروغ زیادہ تر اندلس اور افریقہ میں ہوا تھا، لہذا اس کی اہم اور بنیادی کتابیں انھیں دیار و امصار خاص طور سے اندلس میں لکھی گئیں تھیں۔ اندلس چونکہ اکائی کے دائرہ کار میں شامل نہیں ہے اس لیے وہاں لکھی جانے والی کتابوں کا ذکر یہاں نہیں کیا جا رہا ہے۔

14.4.3.3.3 فقہ شافعی

شافعی اسکول کی اہم کتب میں ”کتاب الأم“ از امام شافعی، الجامع الكبير، الجامع الصغير، مختصر المزني، المنشور، المسائل المعتمدة، کتاب الوثائق اور الترغيب وغيره از امام مزني، اسماعیل بن یحییٰ (م ۲۶۴ھ)، ”کتاب الرباء“ از ابن زیاد نیشاپوری (م ۳۲۴ھ)، الفروع المبتكرة الغربية، أدب القاضي اور الفرائض وغيره از محمد بن احمد حداد (م ۳۴۴ھ)، شرح الرسالة از امام قفال، محمد بن اسماعیل (م ۳۶۵ھ)، شرح مختصر المزني از قاضی ابوطیب طبری (م ۴۵۰ھ)، الحاوی، أدب الدنيا والدين اور الأحكام السلطانية وغيره از علی بن محمد ماوردی (م ۴۵۰ھ)، الشامل اور الكامل از ابونصر صباغ (م ۴۷۷ھ)، نهاية المطلب في دراية المذهب، الشامل في أصول الدين والإرشاد از امام الحرمین جوینی (م ۴۷۸ھ)، کتاب الوجيز، کتاب الوسيط، کتاب البسيط، اختصار

المختصر اور غایۃ الغور وغیرہ از امام غزالی (م ۵۰۵ھ)، شرح الوجیز از امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ)، شرح المحرر اور شرح الوجیز از امام عبدالکریم رافعی (م ۶۲۳ھ) وغیرہ۔

14.4.3.3.4 فقہ حنبلی

حنبلی اسکول کی اہم کتب میں الرسالة از عبدوس بن مالک (م ۲۵۰ھ)، مسائل أحمد بن حنبل از ابو بکر اثرم (م ۲۶۱ھ)، الجامع از ابو بکر خلال (م ۳۱۱ھ)، کتاب السنة از حسن بن علی (م ۳۲۹ھ)، المختصر فی الفقہ از امام عمر بن حسین خرقی (م ۳۳۴ھ)، الخلاف مع الشافعی از عبدالعزیز بن جعفر (م ۳۶۳ھ)، الإرشاد اور شرح الخرقی از ابو علی محمد بن احمد ہاشمی (م ۴۲۸ھ)، رؤوس المسائل، شرح المذاهب اور أدب الفقہ از ابو جعفر بن ابی موسیٰ (م ۴۷۰ھ)، الفنون از علی بن عقیل ظفری (م ۵۱۳ھ)، المجموع فی الفروع از ابو حسین بن فراء بغدادی (م ۵۲۶ھ)، المغنی فی شرح الخرقی از امام ابن قدامہ (م ۶۲۰ھ)، المنتقی، المحرر اور منتهی الغایۃ فی شرح الهدایۃ از امام ابن تیمیہ، عبدالسلام بن عبداللہ (م ۶۵۲ھ) وغیرہ۔

14.4.3.3.5 فقہ جعفری

شیعی فقہی اسکول کی اہم کتب میں الکافی از محمد بن یعقوب کلینی (م ۳۲۹ھ)، من لایحضرہ الفقہ از علی بن حسین قمی (م ۳۸۱ھ) المقنعة از شیخ مفید محمد بن نعمان تلکبری (م ۴۱۳ھ)، الشافی از علی بن حسین موسوی (م ۴۳۶ھ)، کنز الفوائد از محمد بن علی کراچکی (م ۴۴۹ھ)، الناصریات از سید مرتضیٰ، الانتصار، الاستبصار فیما اختلف من الاخبار اور تہذیب الأحکام از طوسی (م ۴۶۰ھ)۔
مذکورہ بالا اہم فقہی مکاتب کے علاوہ بھی دیگر فقہی اسکول عہد عباسی میں موجود تھے، لیکن وہ بہت دیر تک باقی نہ رہ سکے جیسے ابن حزم کا فقہی اسکول، لہذا ان کا ذکر یہاں نہیں کیا جا رہا ہے۔

فقہی مذاہب پر مشتمل کتابوں میں احکام القرآن کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب کا بھی شمار کیا جاسکتا ہے کہ وہ فقہی احکام و مسائل سے بحث کرتی ہیں۔ ان کتابوں کا ذکر قرآنی علوم کے تحت علم احکام القرآن کے تحت کیا جا چکا ہے۔

14.4.3.4 فقہی علوم

14.4.3.4.1 علم اصول فقہ

علم اصول فقہ سے مراد وہ اصول و ضوابط ہیں جن پر فقہ کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ یہ اصول و ضوابط، شریعت اسلامی کے بنیادی مآخذ (قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس) کو صحیح طریقے سے سمجھنے اور ان سے مسائل کے صحیح استنباط کے لیے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے ”قواعد و مباحث کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے ذریعے تفصیلی دلائل سے شریعت کے عملی احکام کا استنباط کیا جاتا ہے“۔

فقہ اور اصول فقہ کی ابتدا اور اس کی ترقی و ترویج کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں وسعت کے ساتھ گونا گوں مسائل جنم لینے لگے اور ان کے حوالہ سے علما کے مختلف فیصلے سامنے آنے لگے جو دھیرے دھیرے فکر و تشویش کا باعث بنتے چلے گئے، اس صورت حال نے انہیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ فقہی احکام کے حوالہ سے کچھ اصول مرتب کر دیں تاکہ کسی بھی معاملہ میں فیصلوں میں کسی حد تک یکسانیت پیدا ہو سکے۔

مصادر سے پتہ چلتا ہے کہ ان اصول و ضوابط کو سب سے پہلے امام ابو یوسفؒ نے (م ۱۸۲ھ) مرتب کیا تھا لیکن وہ زمانہ کے دست و برد کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ان کے بعد امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) نے ”الرسالۃ“ میں انھیں مدون کر دیا تھا، لہذا انھیں ہی اس فن کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اصول فقہ کے میدان میں امام محمد بن محمد ماتریدی (م ۳۳۳ھ) کی ماخذ الشرائع، امام قفال، محمد بن اسماعیل (م ۳۶۵ھ) کی أصول الفقه، امام ابو بکر جصاص (م ۳۷۰ھ) کی اصول الجصاص، امام عبید اللہ بن عمرو بوسی (م ۴۳۰ھ) کی تقویم الأدلۃ، عبد الجبار معتزلی کی کتاب العمدة، ابوالحسین محمد بن طیب بصری معتزلی (م ۴۶۳ھ) کی شرح العمدة، امام الحرمین جوینی (م ۴۷۸ھ) کی کتاب البرہان، امام سرخسی (م ۴۸۳ھ) کی تمہید الفصول فی الأصول، امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کی المستصفی، امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) کی کتاب المحصول اور معالم فی اصول الدین، سیف الدین آمدی (م ۶۳۱ھ) کی أحكام الاحکام، تاج الدین ارموی (م ۶۵۶ھ) کی کتاب ”الحاصل“، ابن حاجب مالکی (م ۶۴۶ھ) کی منتہی السؤل والأمل الی علمی الأصول والجدل، امام بزروی کی اصول البزدوی کا شمار اہم ترین کتب میں ہوتا ہے، جن میں سے بعض کی شروح لکھی گئیں اور خلاصے تیار کیے گئے تھے جو اپنے فنی مباحث کی وجہ سے مشہور و معروف ہیں۔

14.4.3.4.2 علم الفرائض/علم المیراث

اسلام ایک فطری مذہب ہے، جس میں معاشرہ اور خاندان کے ہر فرد کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس کے حقوق و واجبات وغیرہ کو متعین کر دیا گیا ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا گیا۔ انسانی حیات کا ایک اہم باب وراثت بھی ہے۔ اسلام نے اس حوالہ سے بھی احکام و قوانین بتائے ہیں جو نہ صرف کسی کو بھی اس کے ادنیٰ سے ادنیٰ حق محروم کرنے سے روکتے ہیں؛ بلکہ وہ اسلامی نظام وراثت کو دنیا کے تمام تر نظام وراثت سے ممتاز اور منفرد بناتے ہیں۔ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار کے بقول: ”اسلام کا قانون وراثت فطری تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے، عائلی محبت کے رشتوں کو استوار کرتا ہے، فرد کے غیر معتدل احساس فردیت کو معتدل بنا کر سچا اجتماعی شعور پیدا کرتا ہے اور دولت کے غیر منصفانہ ارتکاز کو روکتا ہے۔“

علم میراث کا شمار فقہ اسلامی کے اہم فنون میں ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ فرمان نبوی ”تعلموا الفرائض و علموا الناس فانہا نصف العلم“ سے لگایا جاسکتا ہے۔

علم میراث کے موضوع پر عہد عباسی میں حسب ذیل کتب مرتب کی گئی ہیں:

”کتاب الفرائض“ از حسن بن زیاد لؤلؤی (م ۲۰۴ھ)، ”کتاب الفرائض“ از یزید بن ہارون بن زاذان واسطی (م ۲۰۶ھ) ، ”کتاب الفرائض“ از امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)، ”کتاب جامع الفرائض“ از عبد الحمید بن سہل (تیسری صدی ہجری)، ”الاجوزۃ الرحیبیۃ“ (منظوم) از محمد بن علی رجبی (م ۵۷۷ھ)، ”مفتاح الفرائض فی علم الفرائض“ از محمد بن سعدان عصفیری (م نحو ۶۱۳ھ) وغیرہ۔

14.4.4 سوانحی ادب

اسلامی علوم و فنون میں سیرت و سوانح کا بھی شمار ہوتا ہے۔ جوں جوں علم کا دائرہ وسیع ہوتا رہا توں بعض اصطلاحات بعض علوم

وفنون کے لیے مختص ہوتی چلی گئیں تاہم کبھی کبھی ان کا استعمال دیگر معنوں میں بھی کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سیرت کے لفظ کو عام طور سے سیرت نبوی سے مختص کیا جاتا ہے اور دیگر افراد کی سیرت کے لیے لفظ سوانح کا استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔

سوانحی ادب سے مراد ’وہ تصانیف ہیں جن میں افراد کے حالات و واقعات تفصیل یا اختصار کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ تاریخ میں بھی افراد کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن تاریخ اور سوانح میں فرق یہ کہ تاریخ میں جن افراد کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ اس عصر اور معاشرہ کے پورے تناظر میں پیش کیا جاتا ہے، جب کہ سوانح میں کسی فرد کی زندگی کو اجاگر کیا جاتا ہے، اس فن میں زمانہ کا ذکر ضمنی طور آتا ہے۔‘

سوانحی ادب کو دینی اور غیر دینی زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم میں سیرت رسول ﷺ کے علاوہ صحابہ کرامؓ، راویان احادیثؓ، مفسرینؓ و محدثینؓ اور صوفیہ وغیرہ کے حالات زندگی بیان کیے جاتے ہیں۔ دوسری قسم میں عام اصناف علم فن جیسے شعرا و اطبا وغیرہ کے حالات زندگی بیان کیے جاتے ہیں۔

سوانحی ادب کے سرسری جائزہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس فن کے جلو میں سیرت نبوی، طبقات صحابہ، فن اسماء الرجال، مختلف علوم و فنون کے ماہرین کے تذکرے اور عمومی تذکرے پر مشتمل کتابیں مختلف انداز میں مرتب کی گئیں۔

14.4.4.1 سیرت نگاری

سوانحی ادب میں فن سیرت نبوی کو سب سے بلند پایہ مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ اس فن کا آغاز عہد صحابہ سے بلکہ عہد نبوی سے ہو جاتا ہے کہ بعض صحابہ کی مرویات میں آپ ﷺ کی زندگی کے مختلف واقعات، شمائل وغیرہ کا ذکر ملتا ہے تاہم وہ سلسلہ زبانی روایات تک ہی محدود رہا۔ عہد صحابہ میں کم از کم حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ہفتہ کے سات دنوں میں سے ہر دن کو کسی نہ کسی علم کے درس و تدریس کے لیے مختص کر دیا تھا۔ ان علوم میں ’’علم مغازی‘‘ بھی تھا جس کا وہ ہفتہ میں ایک دن درس دیا کرتے تھے۔

ابتدا میں فن سیرت کو ’’علم مغازی‘‘ سے موسوم کیا جاتا تھا اور اسے احادیث کے مجموعہ میں مرتب کیا گیا تھا، تقریباً حدیث کی ہر کتاب میں ’’کتاب المغازی‘‘ کا باب شامل ہوتا تھا۔ کچھ مواد تقاسیر میں ملتا ہے کہ مفسرین نے متعدد آیات کی تقاسیر میں آپ ﷺ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا تھا، خاص طور سے ان آیات میں جن کا تعلق آپ ﷺ کی ذات گرامی سے تھا۔

تاہم عہد اموی میں یہ علم ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ سیرت کی اولین کتاب ’’مغازی عروہ بن زبیر‘‘ مرتب کی جاتی ہے۔ اس کتاب کے بعد فن سیرت نبوی مسلسل ارتقائی مراحل طے کرتا رہا جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے، تاہم اس کا بنیادی اور عہد زریں ’’عہد عباسی‘‘ ہی قرار پاتا ہے کہ اسی عہد میں سیرت نبوی کی تمام بنیادی اور اہم کتابیں مرتب کی گئیں تھیں۔

اس عہد میں فن سیرت نبوی، فنی معارج کی بلند یوں کو چھوٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اس عہد کے سب سے نمایاں سیرت نگار امام ابن اسحاق (م ۱۵۱ھ) ہیں، جن کی کتاب کوفن سیرت نگاری میں ’’ام الکتاب‘‘ کا درجہ حاصل ہے۔ انھوں نے خلیفہ منصور کی فرمائش پر سیرت کے موضوع پر ایک اہم اور ضخیم کتاب لکھی تھی جو زمانہ کی دست و برد کا شکار ہو گئی۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے سیرت نبوی کا درس دینے کا باقاعدہ اہتمام کیا تھا اور شاگردوں کی ایک معتبر جماعت تیار کر دی تھی جن میں سب سے نمایاں شاگرد ابن ہشام (م ۲۱۸ھ) ہیں، جن کی روایت کردہ

سیرت ”سیرت ابن ہشام“، ابن اسحاق کی مفقود کتاب کا نعم البدل بن گئی ہے۔

عہد عباسی کی کتب سیرت میں مذکورہ بالا دونوں کتب کے علاوہ کتاب المغازی از معمر بن راشد بصری (م ۱۵۷ھ)، کتاب المغازی از ابو معشر نجیح سندھی مدنی (م ۱۷۰ھ)، کتاب المغازی از عبدالملک بن محمد مدنی (م ۱۷۶ھ)، کتاب المغازی از علی بن مجاہد رازی (م ۱۸۳ھ)، کتاب المغازی از یحییٰ بن سعید اموی (م ۱۹۴ھ)، امام واقفی (م ۲۰۷ھ) کی کتاب المغازی، ترکة النبی از حماد بن اسماعیل از دی (م ۲۶۷ھ)، أمہات النبی ﷺ از محمد بن حبیب بغدادی (م ۲۴۵ھ)، سیرة النبی والخلفاء الراشدين از ابو زرعة دمشقی (م ۲۸۰ھ)، مشہور محدث محمد بن عیسیٰ ترمذی (م ۲۷۹ھ) کی الشمائل النبویة والخصائل المصطفویة/کتاب الشمائل، کتاب صفة النبی از ابن شعیب انصاری (م ۳۵۳ھ)، ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ)، کتاب الوفاء بأحوال المصطفی، الروض الأنف از عبدالرحمن سیہلی (م ۵۸۱ھ)، سیرة النبی وأصحابه العشرة از حافظ عبدالغنی مقدسی (م ۶۰۰ھ) اور الاملاء المختصر فی شرح غریب السیر از ابو ذر حنثی (م ۶۰۴ھ) وغیرہ شامل ہیں۔

معلومات کی جانچ

1- علم حدیث کا تعارف کراتے ہوئے اس کے مراحل تدوین کو بیان کیجیے۔

2- عہد عباسی کے سرمایہ فقہ پر روشنی ڈالیے۔

14.5 سائنسی علوم و فنون

خالص سائنسی علوم و فنون کی بنا عہد اموی میں پڑ چکی تھی۔ اس سمت میں پیش رفت کرنے کا سہرا حضرت خالد بن یزید اموی کے سر بندھتا ہے۔ عہد عباسی کے علما نے انہیں کے لگائے ہوئے پودے سے استفادہ کیا، پھر اس میں اپنے تجربات و مشاہدات سے اضافہ کیا اور آخر کار اس منصب پر پہنچ گئے جہاں وہ غیر عربی سرمایہ سے بے نیاز ہو گئے اور معروضی اور حقیقی تجربات کی روشنی میں سائنسی علوم کو پختہ بنیادوں پر قائم کیا تھا۔

قبل اس کے کہ سائنسی علوم پر گفتگو کا آغاز کیا جائے اس بات کی وضاحت بہتر معلوم ہوتی ہے کہ عہد عباسی میں ’اخوان الصفا‘ جیسی علمی تحریک پروان چڑھی تھی جس میں فلسفہ، زندگی کے اسرار و رموز اور اس جیسے دیگر مسائل کو زیر بحث لایا گیا تھا جنہیں ’رسائل اخوان الصفا‘ کے نام سے مرتب کر دیا گیا تھا۔ ان رسائل میں عہد عباسی کی علمی تحریک پر بھی جا بجا روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف علوم و فنون میں عباسی علما و فضلاء کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ اس کتاب میں کئی ایک موضوعات پر بحث کی گئی ہے لہذا اس کا بار بار ذکر کرنے کی بجائے صرف یہیں ذکر کر دیا گیا ہے۔

14.5.1 کیمیا (کیمسٹری)

فن کیمیا کی بنیاد خالد بن یزید اموی نے ڈالی تھی کہ انھیں سائنسی علوم سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ انھوں نے اس فن پر یونانی کتب کا ترجمہ کروایا، خود تجربات کیے اور کتاب الحارات، کتاب الصحیفة الکبیر اور کتاب الصحیفة الصغیر جیسی کتابیں بطور یادگار چھوڑیں ہیں۔

عہد عباسی کے اولین کیمیا داں کا نام جابر بن حیان (م ۲۰۰ھ) ہے جو خالد بن یزید کے شاگرد تھے۔ وہ زندگی بھر مختلف دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کی کوشش میں لگے رہے جس کے نتیجے میں انھیں دھاتوں کے خواص کا علم حاصل ہوتا چلا گیا تھا۔ انھوں نے سائنسی نظریات کے ساتھ ساتھ سائنسی تجربات پر زور دیا ہے۔ اس فن کو پروان چڑھانے میں ان کا کردار کافی اہم ہے۔ انھوں نے مختلف قسم کے تیزاب بنائے تھے، دھاتوں کے پگھلانے اور بھاپ کے ذریعہ کسی چیز کو معدوم کرنے کا کامیاب تجربہ کیا تھا۔ اس موضوع پر سوسے زائد کتابیں ان کی منسوب کی جاتی ہیں جن میں أسرار الكیمياء، أصول الكیمياء، العهد، کتاب الرحمة، کتاب التجميع، الذبیاق الشرقي اور کتاب السبعین زیادہ اہم ہیں۔

عہد عباسی کے ماہرین کیمیا میں مشہور صوفی ذوالنون مصری، ابو بکر رازی، ابن وحشیہ، جنیلاوی، عثمان بن سوید حمسی، راہب اصفن، ابوبکر علی بن محمد خراسانی، محمد بن یزید دبیس، ابوالعباس احمد بن محمد، ابوالبرہیم اسحاق، ابوجعفر محمد بن علی ثلمغانی، یعقوب کندی (م ۲۵۴ھ)، ہمدانی، ابوحیان تو حیدی (م ۴۱۴ھ)، ابن سینا، محمد بن مالک صالحی خوارزمی (م ۴۲۵ھ)، مؤید الدین طغرانی (م ۵۵۳ھ) اور موسیٰ بن ارفع انصاری (م ۵۵۳ھ) وغیرہ شامل ہیں۔

اس فن پر لکھی جانے والی اہم کتب میں سر الأسرار از امام رازی، مقالة وجوب صناعة الكیمياء از فارابی (م ۳۳۹ھ)، عین الصنعة و عون الصناع از محمد بن مالک صالحی خوارزمی (م ۴۲۵ھ)، حقائق الاستشهاد، کتاب الأنوار و المفاتيح، مفاتيح الرحمة اور أنوار الحكمة از مؤید الدین طغرانی، شذور الذهب از ابوالحسن موسیٰ بن ارفع انصاری (م ۵۵۳ھ)، أبطال دعوی المدعين صناعة الذهب والفضة من غیر معادنھا از یعقوب کندی، الجوهر تین العتیقتین از ہمدانی وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

14.5.2 طبیعیات (فزکس)

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم فنون میں طبیعیات کا بھی شمار کیا جاتا ہے، تاہم اس فن کے متعلق معلومات بہت کم دستیاب ہیں جس کی غالباً بنیادی وجہ اس کا ریاضی اور علوم فلکیات و ہندسہ سے گہرا تعلق ہونا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ علم ان علوم سے خلط ملط ہو کر رہ گیا اور اس کی واضح شکل و صورت سامنے نہ آسکی اور ماہرین طبیعیات کی کاوشیں اور کارنامے سب کے سب مذکورہ علوم کے کھاتے میں چلے گئے۔ مسلم ماہرین فن نے طبیعیات کو ”العلم الطبيعي“ کا نام دیا ہے جب کہ فارابی نے اس کے یونانی نام کو معرب کرتے ہوئے اسے ”الفیزیقا“ سے موسوم کیا ہے۔

عہد عباسی میں فن طبیعیات کے ماہرین میں جن شخصیات کا شمار کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں: یعقوب کندی (م ۲۵۷ھ) مؤلف علم البصر، امام ابوبکر ارزی مؤلف ”سبب وقف الأرض في السماء“، امام فارابی، امام ابن سینا، ابوریحان بیرونی، ابوالبرکات بغدادی (م ۵۴۷ھ)، ابن مسکویہ، ابو معشر بلخی اور ابن پشم (م ۴۳۰ھ) ابن پشم مؤلف ”کتاب المناظر“ وغیرہ۔

14.5.3 طب (میڈیسن)

فن طب کو بنیادی طور پر دوزمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے: ۱- عملی طب، ۲- نظریاتی طب۔ عملی طب ہر جگہ اور ہر زمانہ میں موجود رہا ہے،

لیکن اس موضوع پر کوئی سرمایہ موجود نہیں ہے، وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا اور معاشرہ کی ضروریات کو پوری کرتا رہا۔ نظریاتی طب/علمی طب کا آغاز عہد نبوی سے ہوتا ہے، بعض احادیث میں مختلف اشیا کی صفات و فوائد کا ذکر ملتا ہے۔ ان احادیث کو طب نبوی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بعد کے علما جیسے ابن قیم الجوزیہ (م ۷۵۱ھ) نے طب نبوی پر مشتمل تمام روایات کو یکجا کر کے اسے کتابی شکل دے دی۔

اموی دور میں بھی اس فن کے دونوں پہلوؤں (عملی اور نظری) پر کام کیا گیا، خالد بن یزید کی کوششوں سے پہلی مرتبہ یونان کے نظریاتی طب کا تعارف اسلامی دنیا میں کرایا گیا۔ دیگر اموی خلفا - خصوصاً خلیفہ مروان بن حکم - نے بھی اس فن کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ فن طب کا آغاز وارثاً تو یونان و ہند میں ہوا لیکن اس کو ایک خاص منہج دینے اور قالب میں ڈھالنے کا فریضہ عرب اطبانے انجام دیا۔ پتھری نکالنے اور چچک کا علاج مسلم اطبا کی اولیات میں سے ہے۔ انھوں نے یونانی، ایرانی اور ہندوستانی علم طب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت جلد اپنی جداگانہ راہ بنائی۔ انھوں نے قدیم طبی سرمایہ میں پائی جانے والی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ نئے نئے تجربات سے فن طب کا دامن اس قدر وسیع اور مالا کر دیا کہ یورپ میں آج صرف اسی کا بول بالا ہے۔

جدید طب کو فروغ دینے میں مسلمانوں کی کوششوں اور کاوشوں کا دخل ہے، انھوں نے ہی جنوبی اٹلی کے شہر سلرنو میں پہلا میڈیکل کالج کھولا تھا۔ بارہویں صدی میں یورپ کے مختلف شہروں میں جیسے بولونیا، پادوہ اور پیرس میں جدید علوم کے فروغ کے لیے کئی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، جہاں متقدمین کی عربی کتابوں، خاص طور سے بوعلی سینا کی القانون فی الطب، امام رازی کی المنصورہ کے تراجم کی روشنی میں تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیے جاتے تھے۔

عہد عباسی کے مشہور اطبا میں یعقوب کندی (م ۲۵۷ھ) مؤلف طبقات الأطباء، عملی اور نظری طب کے ماہر، چچک کا علاج دریافت کرنے والے اور رے اور بغداد کے شفاخانے کے نگران (ڈین/انچارج) محمد بن زکریا رازی (م ۳۲۰ھ) مؤلف کتاب الحاوی، سر الطب، المرشد، کتاب التفہیم والتشجیر، کتاب الجدری والخصبة اور کتاب الطب الملوکی وغیرہ، مختلف دواؤں کے موجد موفق بن علی ہروی (م ۳۴۰ھ) مؤلف حقائق الأدوية، امراض چشم کے ماہر اور موتیا بند کا آپریشن کرنے والے ابوالقاسم عمار موصلی (م ۳۸۸ھ) مؤلف علاج العین، مشہور فلسفی وطیب ابن مسکویہ (م ۴۲۱ھ) مؤلف کتاب الاشریة اور کتاب البطیخ، شیخ بوعلی بن سینا (م ۴۲۸ھ) مؤلف کتاب القانون فی الطب، کتاب الأدوية القلبية اور کتاب القولنج اور امراض چشم کے ماہر علی بن عیسیٰ (م ۴۴۱ھ) مؤلف تذکرۃ الکحالیین وغیرہ شامل ہیں جن کے تجربات، مشاہدات اور علمی کاوشوں پر جدید علم طب اور میڈیکل سائنس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

14.5.4 ریاضی، ہندسہ اور حساب

مسلم علما وفضلا نے ریاضی، ہندسہ اور حساب اور اس کی مختلف شاخوں کے حوالہ سے اہم کارنامے انجام دیے ہیں جو آگے چل کر یورپ میں پروان چڑھنے والے مذکورہ فنون کے لیے خشت اول ثابت ہوئے تھے۔ بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ: ”الجبر کے لفظ سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے بانی مسلمان ہیں۔ امام خوارزمی کی کتاب ”الجبر والمقابلہ“ کے انگریزی ترجمہ سے اہل یورپ نے کافی استفادہ کیا تھا۔ مشہور مستشرق نالینو (Nalino)، مسلمانوں کو اس فن میں یورپ کا استاد مانتے ہیں۔“

مذکورہ مقالہ نگار مزید لکھتے ہیں: ”فن ہندسہ کے بانی تو اہل ہند ہیں لیکن اس سے یورپ کو روشناس کرانے کا سہرا مسلمانوں کے سر بندھتا ہے۔ انھوں نے اہل ہند کے اس فن سے استفادہ کرتے ہوئے مختلف مشینوں کی ایجاد میں بھی گراں قدر کارنامے انجام دیے تھے جن کی مدد سے وہ بہت سی عظیم الشان جنگوں میں کامیاب و کامران رہے تھے۔“

عہد عباسی میں۔ خاص طور سے عہد مامونی میں۔ فن ریاضی و حساب نے ترقی کے اہم مراحل طے کیے۔ خلیفہ مامون کے زمانے میں خانوادہ بنو شاکر نے اس فن کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اس خاندان کے تمام افراد ریاضی کی تمام شاخوں مثلاً ہندسہ، علم الجیل والحرکات (Mechanics) اور اقلیدس وغیرہ کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف اس علوم کے ماہر تھے بلکہ انھوں نے اس میں عجیب و نادر کتابیں لکھیں جو ”جیل بنوموسی“ کے نام سے مشہور ہیں۔

عباسی دور کے مشہور ریاضی دانوں میں احمد عبداللہ حبش (م ۲۱۴ھ)، بیجلی بن ابی منصور (م ۲۱۴ھ)، حجاج بن یوسف مطر (م ۲۱۴ھ) مؤلف مقدمات اقلیدس، ابوطیب سند بن علی (م ۲۲۴ھ) مؤلف کتاب المنفصلات والمتوصلات، کتاب الحساب الہندی، کتاب الجمع والتفریق، کتاب القواطع، اور کتاب الجبر والمقابلہ، عباس بن سعید جوہری (م ۲۲۹ھ)، خانوادہ بنو شاکر، محمد بن موسیٰ (م ۲۵۳ھ)، احمد بن موسیٰ (م ۲۴۰ھ) اور حسن بن موسیٰ (م ۲۵۴ھ) مؤلف ”کتاب الحیل“، محمد بن موسیٰ خوارزمی (م ۲۳۲ھ) مؤلف ”الجبر والمقابلہ“، ابو محمد عدلی قاینی (م ۳۷۷ھ) مؤلف ”کتاب المساحة“، ابوالوفاء بوزجانی (م ۳۸۸ھ)، ابوریحان بیرونی، محمد بن احمد (م ۴۴۰ھ) مؤلف ”الآثار الباقیة“ و ”القانون المسعودی“، ابوالحسن علی احمد نسوی (م ۴۴۰ھ)، عمر خیام، عمر بن ابراہیم (م ۵۲۶ھ) مؤلف ”المکعبات، الجبر والمقابلہ۔ وغیرہ حضرات بہت اہم ہیں۔

مذکورہ بالا اہم اور باکمال ماہرین فن کے علاوہ نوبخت (م ۱۵۷ھ)، ان کے بیٹے فضل (م ۱۹۷ھ) محمد بن جابر بنانی (م ۳۰۵ھ)، محمد بن احمد خوارزمی (م ۳۶۱ھ)، ابوسہل و بیجن بن رستم (م نحو ۳۹۰ھ) ابوالحسن کوشیار (م ۴۵۹ھ)، مظفر اسفرازی (م ۵۱۵ھ) موجد میزان آرشمیدس، ابوعباس لوکری، ابو فتح کوشک اور ابن رقیقہ (م ۶۳۵ھ) نے بھی فن ریاضی و ہندسہ میں شاندار کارنامے انجام دیے ہیں۔

14.5.5 علم ہیئت اور نجوم

علم ہیئت و نجوم کا شمار بھی ان علوم و فنون میں ہوتا ہے جن سے عرب تحریک ترجمہ کے واسطے سے واقف اور روشناس ہوئے تھے جس کی خشت اول عہد اموی میں ڈالی جا چکی تھی لیکن دیگر علوم کی طرح انھوں نے اس علم میں بھی جلد ہی اپنا لوہا منوالیا اور اہم و بنیادی علمی سرمایہ فراہم کیا۔ لہذا یہ کہنا کہ اس علم کو پروان چڑھانے میں مسلمان علما و فضلا کی کوششوں کا بہت زیادہ دخل ہے تو غلط اور بیجا نہیں ہوگا۔ بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ ”اس فن کو فن کے درجہ تک پہنچانے کا سہرا صرف مسلم علما، خاص طور سے عہد عباسی کے علما کے سر بندھتا ہے۔ انھوں نے اپنے مد مقابل آسمان پر پائے جانے والے ستاروں کی ایک فہرست تیار کی تھی اور جس نام سے ان ستاروں کو موسوم کیا اس میں آج تک تبدیلی نہیں کی جاسکی۔ اس فن میں علمائے یورپ نے اپنا پہلا قدم مشہور نجوم و ہیئت داں فرغانی کی کتاب ”مبادیات علم النجوم“ کی روشنی میں اٹھایا تھا۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ علم ہیئت، علم نجوم، علم ریاضی، ہندسہ اور حساب کا آپس میں بہت ہی گہرا تعلق ہے اور وہ تقریباً ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہیں کی جو ہیئت و نجوم کا ماہر ہوگا وہ ریاضی و ہندسہ یا کم از کم ریاضی کا بھی ماہر ہوگا یہی وجہ ہے عہد عباسی کے بہت سے

علماء وفضلاً مذکورہ بالا تمام فنون میں یکساں قدرت و دست گاہ رکھتے تھے۔

عباسی خلیفہ منصور کو اس علم سے خاصا شغف و دلچسپی تھی جس کے نتیجہ میں اس علم نے ترقی کی کئی منازل طے کر لی تھی۔ دیگر عباسی خلفا جیسے خلیفہ مہدی، خلیفہ ہارون رشید اور خلیفہ مامون کو بھی اس فن سے بہت شغف و دلچسپی تھی لہذا یہ علم دن دو گنی اور رات چو گنی ترقی کرتا چلا گیا۔ عہد عباسی کے ماہرین فلکیات، وینیات و ریاضیات کی فہرست طویل ہے، ان میں سے چند مشہور یہ ہیں: ابراہیم بن جندب (م ۱۵۷ھ) مؤلف علم الحیل (علم میکانک)، یحییٰ بن ابی منصور (م ۲۱۴ھ) مؤلف کتاب الزیج الممتحن، کتاب الارصاد لہ اور مجموعۃ رسائل ابی جماعۃ فی الارصاد، احمد بن کثیر فرغانی (م ۲۲۳ھ) مؤلف ”جوامع علوم النجوم علی بن عیسیٰ اصطرابی (م ۲۲۴ھ)، ثابت بن قرہ حرانی (م ۲۸۸ھ) مؤلف ترکیب الأفلاک، طوابع الکواکب، الہیئۃ، علة الکسوف والخسوف، الرصد اور العمل فی الكرة، ابر بن سنان (م ۲۹۱ھ)، محمد بن جابر بنانی (م ۳۰۵ھ)، محمد بن احمد خوارزمی (م ۳۶۱ھ)، ابو محمد عدلی قانی (م ۳۷۷ھ)، ابو الوفا جوزجانی (م ۳۸۸ھ) مؤلف ”کتاب المنازل“ اور ”کتاب الزیج“، عمر بن خیام (م ۵۲۶ھ)۔

مذکورہ بالا علم ہیئت و نجوم کے ماہرین و اکابرین کے علاوہ فضل بن نوبخت (م ۱۹۷ھ)، موسیٰ بن شاہر (م ۲۱۳ھ)، ان کے بیٹوں۔ محمد، احمد، حسن، شیخ بوعلی ابن سینا (م ۳۷۰ھ)، ابن اعلم علوی (م ۳۷۹ھ)، احمد بن محمد سجستانی (م ۴۳۳ھ)، علی نسوی (م ۴۴۰ھ)، ابوریحان بیرونی، محمد بن احمد (م ۴۴۰ھ) اور مظفر اسفرازی (م ۴۶۰ھ) کا شمار بھی عہد عباسی کے اہم ماہرین فلکیات اور ہیئت دانوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اس موضوع پر گراں قدر کارنامے انجام دیے تھے۔

14.5.6 علم جغرافیہ

علم جغرافیہ کے پروان چڑھنے کا بنیادی سبب تو قرآن کریم ہی ہے، تاہم اس فن کی ترویج میں حدیث نبوی اور سیرت نبوی نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے کہ جن جن مقامات کا ذکر ان میں آیا تھا اس کی تحقیق و تلاش میں عرب جغرافیہ دانوں نے اپنی پوری توانائی صرف کر دی تھی جس کا اندازہ سید سلیمان ندوی کے مذکورہ بالا قول سے لگایا جاسکتا ہے۔

اس علم میں مسلمانوں کی خدمات (خاص طور سے عہد عباسی میں) کا جائزہ لینے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ انہیں دو بنیادی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

☆ عرب کے جغرافیہ پر مشتمل کتب

☆ عرب کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک کے جغرافیہ پر مشتمل تالیفات

مذکورہ بالا دونوں قسم کی تالیفات میں مسلمان جغرافیہ دانوں نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور اپنی اپنی کتابوں میں مختلف انداز سے معلومات کا ذکر کیا ہے۔ اس فن میں ”کتاب النوادر“ از ابو زیاد کلانی کی کتاب کو عربی کی پہلی کتاب قرار دیا جاتا ہے۔ مصنف نے ۲۰۰ھ کے اواخر میں اس کتاب کو تالیف کیا تھا۔

عہد عباسی کے مشہور جغرافیہ دانوں میں ابو یزید بلخی مؤلف صور الأقالیم، ابن خردادبہ (م ۲۸۰ھ) مؤلف المسالک

والممالک، احمد بن فضلان (م ۳۰۹ھ) مؤلف جغرافیا، یعقوبی (۳۱۵ھ) مؤلف کتاب البلدان، ابراہیم بن محمد اصطخری (م ۳۲۶ھ) مؤلف صور الأقالیم اور مسالک الممالک، علی بن حسین مسعودی (م ۳۲۶ھ) مؤلف مروج الذهب ومعادن الجواهر، ابن حوقل، محمد بن علی (م بعد ۳۶۷ھ) مؤلف المسالک والممالک أو صورة الأرض، محمد بن احمد مقدسی بشاری (م نحو ۳۸۰ھ) مؤلف أحسن التقسیم فی معرفة الأقالیم، محمد بن محمد ادربیسی (م ۵۶۰ھ) مؤلف نزهة المشتاق فی ذکر الأمصار والأقطار والبلدان اور روض الانس ونزهة النفس المعروف بالممالک والمسالک، اور یاقوت بن عبد اللہ رومی حموی (م ۶۲۶ھ) مؤلف معجم البلدان اور مرصد الاطلاع علی أسماء الأماكن والبقاع وغيره قابل ذکر ہیں۔

14.5.7 علم معدنیات (Geology, Minerology)

عہد عباسی میں اس فن کا آغاز ارسطو کی کتب کے ترجمے سے ہوتا ہے۔ مسلمان علما نے اس فن میں گراں قدر کارنامے انجام دیے ہیں جس نے آگے چل کر کان کنی اور علم ارضیات جیسے فنون کو پروان چڑھایا تھا۔ اس فن کو علم کیمیا سے یک گونہ تعلق ہے۔ عہد عباسی کے علما نے قیمتی پتھروں کے خواص اور مختلف قسم کی معدنیات کو دریافت کیا تھا اور تجربات کو کتابی شکل میں ”حجریات“ کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ اس میدان کے ماہرین میں جابر بن حیان (م ۲۰۰ھ)، عطارد بن محمد حاسب (م ۲۱۳ھ) ابوطیب سند بن علی (م ۲۲۳ھ)، یعقوب کنڈی (م ۲۵۴ھ)، ابوریحان بیرونی، محمد بن احمد (م ۴۴۰ھ) اور شہاب الدین طفاشی (م ۶۵۱ھ) ہیں۔

مذکورہ بالا ماہرین فن نے اپنے تجربات کی روشنی میں اصلی اور نقلی دھاتوں کی پہچان، قیمتی پتھروں کے اوصاف اور مختلف قسم کی دھاتوں اور معدنیات کے متعلق قیمتی معلومات کو اپنی اپنی کتب میں بیان کیا ہے۔

اس فن کی اہم کتابوں میں کیمان المعادن، کتاب الجوهر الكبير، رسائل في الحجارا جابر بن حیان، الجواهر والأحجار از عطارد بن محمد حاسب، رسالة فیأنواع الجواهر الشمینة اور رسالة فی أنواع الحجارا والجواهر از یعقوب کنڈی، کتاب أزهار الأفكار فی جواهر الأحجار از شہاب الدین طفاشی وغیرہ ہیں۔

اس فن کے نمایاں ماہرین میں ابوریحان بیرونی کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر کئی کتابیں بطور یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے ”الجماہر فی معرفة الجواهر“ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ انھوں نے اٹھارہ قیمتی پتھروں کی قدر ثقات کی تقریباً صحیح حد متعین کی ہے۔ شہاب الدین طفاشی (م ۶۵۱ھ) نے اپنی کتاب ”أزهار الأفكار فی جواهر الأحجار“ میں پچیس قیمتی پتھروں کا مطالعہ کر کے ان کے مآخذ، جغرافیائی کیفیات، خالص ہونے، اس کی قیمت اور طبی اوصاف پر بحث کی ہے۔ طفاشی کی کتاب کا شمار اس فن کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔

14.5.8 علم نباتات (Botany)

یہ علم فن حیاتیات (Biology) کی ایک شاخ ہے جس نے آگے چل کر ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لی۔ اس علم میں نباتات کے

خواص و اوصاف، ان کی اقسام، فوائد و نقصانات وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ اس فن کے ماہرین نے جڑی بوٹیوں کی ہزاروں اقسام دریافت کیں اور ان کے اوصاف و خواص وغیرہ کو اپنی اپنی کتابوں میں اجاگر کیا ہے۔ اس علم نے دو سازی اور رنگ سازی اور علم زراعت (Agronomy) کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

اس فن کی نمایاں تصانیف میں جابر بن حیان (م ۲۰۰ھ) کی کتاب الدود، عبدالملک اصمعی (م ۲۱۳ھ) کی کتاب النبات والأشجار، جاحظ (م ۲۵۵ھ) کی کتاب الزرع والنخل، ابوحنیفہ دینوری (م ۲۸۵ھ) کی کتاب النبات، ابن وحشیہ، احمد بن علی (م بعد ۲۹۱ھ) کی أسرار الطبيعيات في خواص النبات، ابن سینا (م ۳۷۰ھ) کی القانون في الطب، محمد بن احمد تیمی (م نحو ۳۹۰ھ) کی ماهية الرمد وأنواعه وأسبابه وعلاجه اور المرشد الى جواهر الأغذية، موفق بن علی ہروی کی کتاب الابنية عن حقائق الأدوية، علی بن عیسی (م ۴۲۱ھ) کی تذكرة الكحالين اور ابو ریحان بیرونی، محمد بن احمد (م ۴۳۰ھ) کی الصيدلة في الطب، محمد بن محمد دریسی (م ۵۶۰ھ) کی الجامع لصفات أشتات النبات وغیرہ شامل ہیں۔

14.5.9 علم حیوانات (Zoology)

اس علم کو پروان چڑھانے میں عباسی علما اور ماہرین فن نے نمایاں خدمات انجام دیں ہیں۔ یہ علم بھی دراصل فن حیاتیات (Biology) کی ایک شاخ ہے جس نے آگے چل کر ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لی۔ اس فن پر سب سے پہلے جاحظ (م ۲۵۵ھ) نے قلم اٹھایا تھا۔ ان کی کتاب ”کتاب الحيوان“ بقول پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی ”طبعی خصائص سے زیادہ مذہبی اور افسانوی چیزوں پر زور دیتی ہے لیکن وہ اس فن کی اولین کتابوں میں ہے، اس میں بہر حال نظریہ ارتقا، حیوانی نفسیات و جبلت کا اچھا بیان پایا جاتا ہے“۔

اس فن میں نمایاں کردار ادا کرنے والے علما میں ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ (م ۲۰۹ھ) ہیں۔ انھوں نے اس موضوع پر تقریباً سو سے زائد کتابیں بطور یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے نصف کتابیں صرف گھوڑے اور ان کی اقسام، عادات و خصائل اور دیگر متعلقات کو بیان کرتی ہیں اور باقی ماندہ کتابیں دیگر حشرات ارض جیسے اونٹ، بھیڑ، بکری، سانپ، بچھو وغیرہ سے بحث کرتی ہیں۔ ان کی کتابوں میں طبقات الفرس، کتاب الخیل، کتاب الحیات اور کتاب العقارب جیسی کتب شامل ہیں۔

عبدالملک اصمعی (م ۲۱۳ھ) نے بھی اس فن پر قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے کتاب الخیل، کتاب الإبل، کتاب الوحوش، کتاب الشاة جیسی کتب لکھی ہیں۔

مشہور فلسفی کنزی نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے لیکن ان مطالعہ کے محور کا زیادہ حصہ پرندوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اپنے حاصل مطالعہ کو رسالہ فی الطائر الانسی، رسالہ فی تمریح الحمام، رسالہ فی النخل، اور رسالہ فی الحشرات جیسے رسائل میں پیش کیا ہے۔

عہد عباسی کے دیگر علما نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے لیکن انھوں نے اپنے حاصل مطالعہ کو مستقل کتب میں پیش کرنے کی بجائے انھیں منتشر انداز میں نقل کیا ہے جیسے ابن سینا نے کتاب الشفاء میں حیوانات کی نفسیات کو اجاگر کیا ہے اور ابن مسکویہ نے نظریہ ارتقا پر بحث کرتے ہوئے حیوانات کے بارے میں عمدہ بحث کی ہے۔ اسی طرح ابن قتیبہ دینوری نے عیون الأخبار میں اس علم کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

1- عہد عباسی میں علم معدنیات کے فروغ پر روشنی ڈالیے۔

2- عہد عباسی میں علم جغرافیہ کے فروغ پر ایک نوٹ لکھیے۔

14.6 سماجی علوم

14.6.1 علم تاریخ

علم تاریخ کی ابتدا سیرت نبوی سے ہوتی ہے، قرآن میں چند مقامات و واقعات، چند قوموں اور حکومتوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں جن کی تحقیق نے مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ سیرت نبوی کو مدون و مرتب کریں۔ سیرت نبوی کے جلو میں سیرت صحابہ، عام سوانح نگاری اور اسماء الرجال جیسے فنون پروان چڑھے۔ اردو دائرہ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار کے بقول: ”مغازی کی ہر دعزیزی، عام فتوحات کی تاریخ نویسی کا موجب بنی“۔ تاریخ نویسی کی بنیاد عہد اموی میں ڈالی گئی، حضرت معاویہؓ کی فرمائش پر عبید بن شریہ نے ”کتاب الملوک و أخبار الماضیین“ نامی کتاب لکھی، جسے علم تاریخ کی پہلی کتاب بھی قرار دیا جاتا ہے۔ عہد اموی میں اس موضوع پر قلم اٹھانے والوں میں زیاد بن ابیہ، ابوحنیف، عوانہ بن حکم اور وہب بن منبہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان اوائل مؤرخین کی کتابیں زمانہ کی دست و برد کا شکار ہو چکی ہیں بس ان کا ذکر مصادر میں پایا جاتا ہے۔

عہد عباسی میں اس فن کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا کہ اس کی مختلف شکلیں سامنے آئیں بلکہ یہ کہا جائے کہ حقیقی تاریخ نویسی کا آغاز اسی عہد میں ہوا تو بیجا نہیں ہوگا۔ عہد عباسی کے دور اول میں تاریخ نویسی، سیرت نبوی اور مغازی کی شکل میں سامنے آئی تھی جس کی وجہ سے اسے سیرت و مغازی کا دور کہا جاتا ہے۔ اس عہد کی مشہور کتب سیرت و مغازی میں ابن اسحاق (م ۱۵۱ھ)، ابن ہشام (م ۲۱۸ھ)، واقدی (م ۲۰۷ھ) اور ابن سعد (م ۲۳۰ھ) کی کتب سیرت و مغازی شامل ہیں۔ عہد عباسی میں لکھی جانے والی کتب سیرت کا ذکر سوانحی ادب کے تحت کیا جا چکا ہے۔

دوسرے دور میں فتوحات کی کثرت اور اسلامی رقبہ کی وسعت کی وجہ سے تاریخ نویسی نے سیرت و مغازی کی جگہ لے لی اور مؤرخ الذکر فن نے ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لی۔ عہد عباسی کے مشہور مؤرخین میں احمد بن یحییٰ بلاذری (م ۲۷۹ھ)، محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ)، علی بن حسین مسعودی (م ۳۲۶ھ)، احمد بن اسحاق یعقوبی (م ۳۱۵ھ)، ابن مسکویہ، احمد بن محمد (م ۴۲۱ھ)، خطیب بغدادی، احمد بن علی (م ۴۶۳ھ)، ابن عساکر، علی بن حسن (م ۵۷۱ھ)، ابن اثیر، علی بن محمد (م ۶۳۰ھ)، ابن ایاس، حمزہ اصفہانی، ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) اور عبدالرحمن بن محمد ادیبی وغیرہ شامل ہیں۔

محققین کی کتب تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس عہد میں تاریخ نویسی کے دو بنیادی طریقے رائج تھے:

۱- واقعات کو سنین کے اعتبار سے سند کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا۔ اس طرز تالیف میں نہ تو واقعات کی ترتیب میں تسلسل پایا جاتا ہے اور نہ ہی عبارت کا ربط برقرار رہتا ہے۔ اس طرز تالیف کے نمایاں مؤرخین میں محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ)، ابن اثیر، جزیری، علی بن محمد

(۶۳۰ھ) وغیرہ ہیں۔ تاریخ کے لغوی معنی ”وقت کی تعیین“ کے اعتبار سے تاریخ نویسی کا یہ طریقہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، لیکن واقعات اور عبارات میں عدم تسلسل اور ان کے درمیان ربط کے فقدان کی وجہ سے کچھ گراں بھی محسوس ہوتا ہے۔

اس طرز تالیف کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے اس طرز اسلوب کی پیروی کرنے والے مؤرخین کا بنیادی مقصد ”مجرد واقعات نگاری“ تھا کہ جو کچھ پیش آیا ہے اسے من و عن پوری امانت و دیانت کے ساتھ قلم بند کر دیا جائے۔

۲۔ دوسرا طرز تالیف قرآن کے واقعات کو بیان کرنے کے طرز و انداز سے متاثر ہو کر سامنے آیا تھا کہ قرآن میں تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کر کے اس سے کسی نہ کسی نتیجے تک پہنچنا تھا۔ قرآن میں مذکور واقعات سے کسی نتیجے کا اخذ کرنے کو اصول و کلیہ بناتے ہوئے کچھ مؤرخین نے اپنی کتب تاریخ میں واقعات کو ایک تسلسل اور ترتیب سے بیان کرتے ہوئے حکومتوں کے عروج و زوال سے بھی بحث کا آغاز کیا تھا۔ اس طرز تاریخ نویسی میں علی بن حسین مسعودی (م ۳۲۶ھ)، ابن طقطقی، ابن خلدون اور ابن عبری وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرے طرز تالیف کے حوالہ سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ پوری طرح سے قرآن کے واقعات بیان کرنے کے طرز و اسلوب کی پیروی ہے کہ مؤرخ کا صرف یہ کام نہیں ہے کہ گزرے ہوئے واقعات و حوادث کو بیان کر دیا جائے بلکہ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ ان واقعات و حوادث کے درمیان پائے جانے والے ربط کو بھی اجاگر کرے اور ان کی تعلیل و تحلیل بھی کرے اور ان اسباب و علل کی نشان دہی کرے جو قوموں کے عروج و زوال کا سبب و باعث ہو سکتے ہیں۔

دوسرے دور میں تاریخی واقعات میں نقد و تبصرہ کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں، لہذا علی بن حسین مسعودی (م ۳۲۶ھ)، ابن مسکویہ (م ۴۲۱ھ) اور حمزہ بن حسین اصفہانی (م ۴۲۸ھ) کی کتب میں واقعات و حوادث پر تنقیدی اشارات ملتے ہیں۔ یہ تنقیدی اشارات آگے چل کر مکمل اور کھل کر سامنے آتے ہیں، مؤرخ فخری کی کتاب ”الاداب السلطانیة“ میں افراط و کثرت کے ساتھ تنقیدی مواد ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں عباسی خلفا، خاص طور سے ہارون رشید پر سخت تنقید کی ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت کے علما و فضلا کو کس قدر علمی آزادی حاصل تھی۔

عہد عباسی میں عالمی تاریخ نویسی کا رجحان سامنے آتا ہے جس کی وجہ سے اس عہد کی تاریخ نویسی کو عالمی تاریخ نویسی اور مقامی تاریخ نویسی کے دو بنیادی زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم کی کتب و تصنیفات میں ابتدائے آفرینش سے تاحال زمانہ مؤلف تک کی تاریخ بیان کی جاتی ہے جب کہ دوسری قسم کی کتابوں میں کسی مخصوص علاقہ کی تاریخ بیان کی جاتی ہے جس میں اس علاقہ کی تاریخ، وہاں کے تمدن و ثقافت کے ساتھ ساتھ اس علاقہ کے سربراہ اور مشہور اشخاص کے حالات زندگی بھی بیان کیے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے ان میں سے بعض کا شمار جیسے ”تاریخ بغداد“ اور ”تاریخ دمشق“ وغیرہ کا شمار تراجم و تذکرہ کی کتب میں بھی ہوتا ہے۔

عالمی تاریخ نویسی کے زمرہ کی قیادت امام طبری، محمد بن جریر (م ۳۱۰ھ) مؤلف تاریخ الرسل والملوک معروف بہ تاریخ الطبری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان کے علاوہ عالمی تاریخ نویسی کرنے والے مؤرخین میں احمد بن اسحاق یعقوبی (م ۳۱۵ھ) مؤلف تاریخ یعقوبی، علی بن حسین مسعودی (م ۳۲۶ھ) مؤلف مروج الذهب اور التنبیہ والاشراف، ابن مسکویہ، احمد بن محمد (م ۴۲۱ھ) مؤلف تجارب الأمم و تعاقب الہمم، ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) مؤلف کتاب المنظم، ابن اثیر جزیری، علی بن محمد (م ۶۳۰ھ) مؤلف الکامل فی

التاریخ، وغیرہ۔

مقامی تاریخ نویسی میں احمد بن محمد ازرقی (م ۲۵۰ھ) کی تاریخ مکة، ابن شاذان، حسن بن خلف (م ۲۲۶ھ) کی أخبار المدینة، ابن عبدالحکم (۲۵۷ھ) کی تاریخ ولایة مصر، عمر بن شبہ (م ۲۶۳ھ) کی تاریخ البصرة، ابن طاہر طیفور (م ۲۸۰ھ) کی تاریخ بغداد، ابن التجار، محمد بن جعفر (م ۴۰۲ھ) کی تاریخ الکوفة، خطیب بغدادی، احمد بن علی (م ۴۶۳ھ) کی تاریخ بغداد، ابن عساکر، علی بن حسن (م ۵۷۱ھ) کی تاریخ دمشق، ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) کی مکہ و مدینہ کی تاریخ پر مشتمل کتاب مثیر عزم الساکن إلی أشرف الأماكن، کمال الدین حلبی (م ۶۲۰ھ) کی بغیة الطلب فی تاریخ حلب وغیرہ کا شمار اہم کتب و تالیفات میں ہوتا ہے۔

عہد عباسی میں بعض مؤرخین نے اپنی کتابوں میں صرف بلاد و امصار کی فتوحات کی تفصیل یا بلاد و امصار کے عمومی حالات بیان کی ہیں، جیسے فتوح الشام اور فتوح العراق از امام واقدی (م ۲۰۷ھ)، فتح مصر و المغرب و الأندلس از ابن عبدالحکم، عبدالرحمن بن عبداللہ (م ۲۵۷ھ)، فتوح البلدان از بلاذری (م ۲۷۹ھ) اور کتاب البلدان از یعقوبی (م ۳۱۵ھ)، النواحي از ابن ابی عمون (م ۳۲۲ھ) البلدان از قدامہ بن جعفر (م ۳۳۷ھ) وغیرہ۔

14.6.2 فلسفہ و منطق

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم و فنون میں ایک فن ”فن فلسفہ و منطق“ بھی ہے۔ اس فن کے بانی مابانی یونانی علما و فضلا تھے، لیکن مسلمانوں نے ان کی کتب سے استفادہ کرتے ہوئے بہت جلد اس فن میں اپنی جداگانہ راہ متعین کر لی۔

عہد عباسی کے مسلم فلاسفہ کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم ان فلاسفہ پر مشتمل ہے جو یونانی فلسفہ میں پوری طرح ڈوب گئے تھے۔ دوسری قسم ان فلاسفہ پر مشتمل ہے جنہوں نے اسلامی افکار اور یونانی فلسفہ کے درمیان توافقی و تطابقی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

عہد عباسی میں فلسفہ کے دو بنیادی مرکز تھے: ۱۔ جندیسا بوزور ۲۔ حران۔ تیسرے مرکز ”اسکندریہ“ کے اثرات صرف عہد اموی تک ہی پائے جاتے ہیں۔ اس عہد کے مشہور فلاسفہ میں یحییٰ بن ابی منصور (م ۲۱۸ھ)، یعقوب کندی (م ۲۴۸ھ)، محمد بن زکریا رازی (م ۳۲۰ھ) مؤلف الشکوک و المناقصات اور فی السیرة الفاضلة، ابو نصر فارابی (م ۳۳۹ھ) مؤلف المدینة الفاضلة، ابوسلیمان محمد بن طاہر منطقی (م ۳۷۰ھ) مؤلف صوان الحکمة، ابن مسکویہ (م ۴۲۱ھ) مؤلف تہذیب الأخلاق اور الفوز الأصغر، ابن سینا (م ۴۲۸ھ) مؤلف الحاصل و المحصول اور کتاب الاشارات و التنبیہات، ابوالبرکات بغدادی (م ۴۶۰ھ) مؤلف المعبر، امام غزالی (م ۵۰۵ھ) مؤلف تہافتہ الفلاسفہ، امام محمد بن عمر رازی (م ۵۴۳ھ)، شیخ الاشراق شہاب الدین (م ۵۵۶ھ) مؤلف حکمة الاشراق اور مشارع و مطارحات، وغیرہ شامل ہیں۔

عہد عباسی میں تمام مشہور یونانی فلاسفہ جیسے سقراط، افلاطون اور ارسطو کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے، ان کی شرحیں اور خلاصے لکھے گئے، ان کی بنیاد پر مستقل بالذات کتابیں لکھی گئیں جن میں ان کی خامیوں اور غلطیوں کو اجاگر کیا گیا تھا۔

عہد عباسی میں مسلم فلاسفہ نے ”انخوان الصفاء“ کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی جس کے باقاعدہ اجلاس ہوتے تھے جس میں

مباحثے اور مذاکرے ہوا کرتے تھے۔ ان مباحثوں و مذاکروں کو بعد میں کتابی شکل میں مرتب کر لیا جاتا تھا جسے آج کی علمی دنیا میں ”رسائل اخوان الصفا“ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

14.6.3 علم کلام

علم کلام کی بنیاد عہد عباسی میں پڑی تھی جس کی بنیادی وجہ مختلف نظریات و افکار رکھنے والی اقوام و ملل۔ جیسے ایرانی، یونانی، ہندوستانی اقوام و ملل۔ سے مسلمانوں کا میل جول تھا۔ عہد عباسی میں مسلمانوں کا جن اقوام و ملل کے ساتھ اختلاط ہوا تھا ان کے پاس مذہبی اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کا بھی ذخیرہ تھا۔ مسلمان اس ذخیرہ سے متاثر ہوئے اور انھوں نے ان اقوام و ملل کے ساتھ مختلف علمی، فکری اور دینی تبادلہ خیالات کیا جس کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر ایک فکری و علمی دھارا، اسلامی عقائد و افکار کے دھارے میں شامل ہو گیا جس کے دور رس اور گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

تحریک ترجمہ کی وجہ سے یونانی فلسفہ سے عرب روشناس ہوئے اور خلیفہ مامون کے عہد تک یونانی و مجوسی فلسفہ کی بیشتر کتابوں کو عربی زبان کے قالب میں ڈھال دیا گیا تھا جس کی وجہ سے عرب معاشرہ میں فلسفہ کا چلن عالم ہو گیا تھا اور ایک خاصا بڑا طبقہ اسلامی عقائد و عبادات کی تعبیر ان فلسفیانہ افکار کی روشنی میں کرنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نئے رجحان نے جنم لیا، عقائد و افکار کو عقل کی بنیاد پر پرکھا اور جانچا جائے۔ اس رجحان نے مختلف اسلامی فرقوں جیسے خوارج، شیعہ، معتزلہ، جہمیہ، مرجہ اور قدریہ کو پیدا کیا جنھوں نے اپنے اپنے عقائد و افکار کو عقل و نقل دونوں کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مسلم علمائے ان فرقوں کے باطل نظریات کو رد کرنے کے لیے ایک نئے علم کی بنا ڈالی اور اسے ”علم کلام“ سے موسوم کیا۔ علم کلام کو ایک ایسا علم قرار دیا جاتا ہے جو دینیات اور فلسفہ کے بین بین ہے اور علوم و افکار کے دو متضاد نظاموں کو مربوط کرنے میں ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔

علم کلام کے آثار عہد صحابہ ہی سے ملتے ہیں لیکن جدید علم کلام کے سنہری دور کا آغاز امام ابو الحسن اشعری (م ۳۲۴ھ) کی ذات والاصفات سے ہوتا ہے۔ جنھوں نے معتزلی عقائد و افکار کی تردید بہت کامیابی کے ساتھ کی تھی۔ ان کی کتاب ”مقالات الإسلامیین“ کا شمار علم کلام کی بنیادی اور اہم ترین کتب میں کیا جاتا ہے۔ ان کے مکتب فکر کو ”اشاعرہ“ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس مکتب فکر کی نمائندگی کرنے والوں میں عکاشہ کرمانی، ابن گلاب، عبداللہ بن سعید بصری (م نحو ۲۴۰ھ)، حسین بن علی کراہیسی (م ۲۴۵ھ)، خشیش بن اصرم نسائی (م ۲۵۳ھ)، ابوبکر سمرقندی (م ۲۶۸ھ)، ابوسعید دارمی (م ۲۸۲ھ)، ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ)، ابن مجاہد (م ۳۷۰ھ)، ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ)، امام الحرمین جوینی (م ۴۷۸ھ)، امام غزالی (م ۵۰۵ھ)، عمر بن محمد نسفی (م ۵۳۷ھ) وغیرہ کا شمار کیا جاتا ہے۔

علم کلام کے دوسرے مکتب فکر کو ”ماتریدیہ“ سے موسوم کیا جاتا ہے، اس مکتب فکر کے بانی ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی (م ۳۳۳ھ) ہیں۔ انھوں نے علم کلام کے موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں جیسے کتاب التوحید، کتاب المقالات، بیان أوهام المعتزلة، الرد علی القرامطة اور کتاب المجدل وغیرہ۔

مذکورہ بالا دونوں مکاتب فکر کے درمیان اصولی اختلافات بہت ہی کم ہیں۔ جن مسائل میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے ان کا تعلق فروعی مسائل سے ہے۔ ان مکاتب فکر کے درمیان پایا جانے والا بنیادی فرق غالباً ان کا دوا لگ الگ فقہی مسلک کا پیروکار ہونا ہے،

اشعری مکتب فکر کے اکثر نمائندگان کا تعلق فقہ شافعی سے ہے جب کہ ماتریدی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے علما کی اکثریت احناف پر مشتمل ہے۔ امام ابو عذیبہ حسن بن عبدالحسن نے ان دونوں مکاتب کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو اپنی کتاب ”کتاب الروضة البهية فيما وقع بين الأشاعرة والماتریدیة“ میں اجاگر کیا ہے۔ اشعری مکتب فکر، ماتریدی مکتب فکر کے مقابلہ میں زیادہ مشہور و مروج ہے اس کی وجوہات میں سے اس کا ماتریدی مکتب فکر سے پہلے وجود میں آنا اور اشاعرہ کے تصنیفی ذخیرہ کی کثرت وغیرہ ہے۔

علم کلام کی مشہور کتب میں حسین بن علی کراچیسی (م ۲۴۵ھ) کی کتاب المقالات، نحشیش بن اصرم نسائی (م ۲۵۳ھ) کی کتاب الاستقامة، ابوبکر سمرقندی (م ۲۶۸ھ) کی معالم الدین، ابوسعید دارمی (م ۲۸۲ھ) کی نقض علی المریسی الجهمی، ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ) کی کتاب التوحید، کحول نسفی (م ۳۱۸ھ) کی الرد علی اهل البدع والأهواء، امام احمد بن محمد طحاوی (م ۳۲۲ھ) کی بیان السنة والجماعة معروف بہ العقیدة الطحاویة، امام علی بن اسماعیل اشعری (م ۳۲۴ھ) کی مقالات الاسلامیین، الابانة عن أصول الديانة، رسالة في استحسان الخوض في علم الکلام وغیرہ، امام محمد بن محمد ماتریدی (م ۳۳۳ھ) کی کتاب التوحید، شرح الفقه الأكبر، کتاب المقالات في علم الکلام (دوسرا نام: آراء أصحاب المذاهب والفرق)، کتاب أوہام المعتزلة، کتاب الأصول في أصول الدین وغیرہ، شیخ ابن تیمیہ کی عقیدة اهل السنة والفرق الناجية، الرسالة المدنیة في تحقیق المجاز والحقیقة في صفات الله تعالی، الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح، رسالة في القضا والقدر، بغیة المرتاد في الرد علی المتفلسفة والقرامطة والباطنیة، منهاج السنة النبویة في نقض کلام الشیعة والقدریة (دوسرا نام: الرد علی الروافض والإمامیة) وغیرہ، ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ) کی کتاب التمهید، کشف الأسرار اور دقائق الکلام، امام الحرمین جوینی (م ۴۷۸ھ) کی الشامل اور الإرشاد، امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کی محک النظر، معیار العلم، تهافت الفلاسفة، الجام العوام عن علم الکلام اور عقیدة اهل السنة، امام نجم الدین نسفی، عمر بن محمد (م ۵۳۷ھ) کی العقائد النسفیة شامل ہیں،

14.6.4 علم تصوف

تیسری صدی ہجری میں جب تصوف کی تدوین کی ضرورت پیش آئی تو زبان و قلم کا استعمال ایک امر ناگزیر تھا چنانچہ صوفیہ نے خود ہی احوال و واردات کی ترجمانی کے لیے الفاظ کا سہارا لیا اور حال کو قتال میں بدلنے کی کوششوں کا آغاز کیا، اور نتیجہ میں تصوف کے موضوع پر ایک گراں قدر علمی سرمایہ اکٹھا ہو گیا۔

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم و فنون میں علم تصوف کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اس فن کے بڑے بڑے ائمہ اس عہد کی زینت رہے ہیں جنہوں نے اپنے قول و فعل کے ذریعہ اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس فن کا المیہ یہ رہا ہے کہ یہ ہمیشہ افراط و تفریط کا شکار رہا ہے کہ اس کے مؤیدین اس کی تائید میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ بسا اوقات اسلامی تعلیمات و احکامات کو نظر انداز کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں اس فن کے مخالفین کو اس علم میں کوئی بھی اور کسی بھی قسم کی کوئی خیر اور بھلائی نظر نہیں آتی ہے اور وہ اسے محض ایک دکھاوا اور فریب قرار دیتے ہیں۔ دونوں فریق اپنی اپنی انتہا پر نظر آتے ہیں جب کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ تصوف کا

شمار اسلامی علوم و فنون میں ہوتا ہے جس کے دھارے عہد نبوی سے جاملتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ عہد نبوی و عہد صحابہ میں اس کا مدلول دوسرا تھا۔ قبل اس کے کہ عہد عباسی میں تصوف کے حوالہ سے علمی سرگرمیوں کا ذکر کیا جائے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اس عہد میں تصوف کے تین بنیادی مراکز۔ بصرہ، کوفہ اور بغداد۔ تھے جس کی سرزمین سے بڑے بڑے اور اکابر صوفیائے جنم لیا تھا۔ اسی طرح اس فن پر کتابیں مرتب کرنے کا آغاز صوفیاء کے تیسرے طبقہ نے چوتھی صدی ہجری میں کیا تھا۔ اس فن پر اولیں کتابیں ابن ابی دنیا، عبداللہ بن محمد (م ۲۸۱ھ) کے چھوٹے چھوٹے رسائل کو قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح امام جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ) کی طرف کتاب المناجات منسوب کی جاتی ہے۔ تاہم مستقل تصانیف کا آغاز چوتھی صدی ہجری سے ہوتا ہے۔

عہد عباسی میں فن تصوف پر مرتب کی جانے والی مشہور کتب میں ابو محمد خلدی (م ۳۲۸ھ) کی حکایات الأولیاء، ابونصر سراج (م ۳۷۸ھ) کی کتاب اللمع (ص ۱۳۲)، امام ابوبکر محمد کلاباذی (م ۳۸۰ھ) کی کتاب التعرف لمذہب أهل التصوف، امام نیساپوری (م ۴۱۲ھ) کی عیوب النفس، ابوعبدالرحمن سلمی (م ۴۲۱ھ) کی طبقات الصوفیة، ابونعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ) کی حلیۃ الأولیاء، سعید الواعظ (م ۴۵۰ھ) کی ریاض الأنس، امام ابوالقاسم قشیری (م ۴۶۵ھ) کا الرسالة القشیریة، شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ) کی فتوح الغیب، الغنیۃ لطالب طریق الحق/غنیۃ الطالبین، الفیوضات الربانیۃ اور الفتح الربانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، یحییٰ بن حبش (م ۶۳۲ھ) کی عوارف المعارف، حکمة الإشراف، مقامات الصوفیۃ اور معانی مصطلحاتہم۔

ان کے علاوہ ابوسعید اعرابی کی کتاب الوجد، امام محاسبی کی تصانیف، ابراہیم خواص کی کتاب معرفة المعرفة، بایزید بسطامی کی شطحیات، اور اس کی شرح از جنید بغدادی، امام حسین بن منصور حلاج کی کتاب الطواسین کا شمار بھی اس فن کی اہم کتب میں ہوتا ہے اور ذوالنون مصری (م ۲۴۰ھ)، ابو حارث محاسبی، ابراہیم ادہم، بایزید بسطامی کا شمار اس فن کے اکابرین میں ہوتا ہے۔

14.7 ادبی علوم و فنون

عہد عباسی میں دیگر علوم و فنون کی طرح خالص ادبی علوم و فنون کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا تھا جنہیں بنیادی طور دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: ۱۔ شاعری ۲۔ نثر نگاری۔ جس طرح عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے دیگر علوم و فنون نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا تھا اسی طرح خاص ادبی علوم و فنون کے دور رس اور نمایاں اثرات یورپی زبان و ادب پر مرتب ہوئے تھے، مثال کے طور پر دانٹے کی طرہیہ خداوندی (Divina Commedia) میں مسلمانوں کے پروردہ علم کائنات، واقعہ معراج، محی الدین ابن عربی (م ۶۳۸ھ) کی کتابوں، ابوبکر ابن العربی (م ۵۳۳ھ) کے فلسفیانہ خیالات اور مسلمان صوفیہ کے تصور عشق کا عکس جا بجا جھلکتا ہے۔ اسی طرح الف لیلة و لیلة نے مغربی ادب پر خاص اثرات مرتب کیے اور اٹلی و فرانس میں قصہ گوئی کی مختلف قسموں کو پروان چڑھانے اور انہیں فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ درج ذیل سطور میں بہت ہی ایجاز و اختصار کے ساتھ ادبی علوم و فنون کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ ان کی تفصیلات دیگر کتابوں میں بیان کی جا چکی ہیں۔

14.7.1 نثر نگاری

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے ادب کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں شاعری کے مقابلہ میں نثر نگاری کو زیادہ فروغ حاصل ہوا تھا اور اس کے مختلف اصناف و انواع سامنے آئے تھے۔ عربی ادب میں ہونے والی یہ نمایاں تبدیلی تحریک

ترجمہ کے فروغ اور اس کے مرتب ہونے والے اثرات و نتائج کے وجہ سے ممکن ہو سکی تھی کہ عرب ادبا و علما کے سامنے فکر و فن کی ایک نئی دنیا آباد ہو گئی تھی جس کی تعبیر کے لیے نثر ہی سب سے عمدہ اور بہتر ذریعہ تھی کہ اس عہد میں پروان چڑھنے والے موضوعات کے حوالہ سے شاعری کو کہیں نہ کہیں کو اپنی تنگی دامن کا احساس ہوتا تھا۔

عہد عباسی کی نثر نگاری کو فروغ دینے میں جہاں اسلامی علوم فنون جیسے علوم قرآن و علوم حدیث و علوم فقہ وغیرہ نے نمایاں کردار ادا کیا تھا وہیں سماجی علوم جیسے تاریخ و جغرافیہ، فلسفہ و منطق اور علم کلام وغیرہ نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان علوم و فنون کے شانہ بشانہ زبان و بیان سے تعلق رکھنے والے علوم جیسے علم نحو، علم صرف، علم بلاغت، علم لغت وغیرہ نے بھی عہد عباسی کی نثر نگاری کو پروان چڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ان سب پر مستزاد خالص ادبی اصناف سخن جیسے خطابت، رسائل و توفیعات، مقامات و سفر ناموں وغیرہ نے عہد عباسی کی نثر نگاری کو چار چاند لگا دیے تھے۔ ان سب علوم و فنون کی وجہ سے عربی زبان و ادب کا دامن اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ اس میں ہر قسم کے موضوعات و مضامین سما گئے تھے اور خشک سے خشک مباحث کو عرب نثر نگاران، خوبصورت اور دلکش انداز بیان اور اسلوب میں پیش کرنے لگے تھے۔

قبل اس کے عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے خالص ادبی علوم و فنون کا ذکر کیا جائے اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ان ادبی علوم و فنون کو فروغ دینے میں عربوں کے مقابلہ میں غیر عرب اقوام (حضرات موالی) نے زیادہ اہم اور مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ یہ عجیب و غریب اتفاق ہے عہد عباسی کی ادبی اور فنی نثر نگاری کا آغاز ایک غیر عرب کوششوں اور پہلوی ادب کے عربی ترجمہ سے ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مقفع (۱۴۰ھ) نے ”پنج تتر“ کے پہلوی ترجمہ کو عربی کے قالب میں ڈھال کر کے اسے ”کلیلة و دمنة“ موسوم کیا تھا جو عربی نثر کا ایک عمدہ نمونہ اور ماڈل بن گیا تھا۔ اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج بھی اس کے ساحرانہ اسلوب کے اثرات باقی ہیں اور پڑھنے والے اس کے سحر میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ کتاب اپنی نظیر آپ ہے کہ آج تک اس کا بدل نہ پیش کیا جاسکا اور وہ سہل ممتنع کی ایک ایسی مثال بن گئی جس کی پیروی ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔

عہد عباسی میں خالص نثری ادب کو فروغ دینے اور پروان چڑھانے میں مشہور عباسی ادیب جاحظ، عمرو بن بحر (م ۲۵۵ھ) نے سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے خالص ادبی کتب کے ساتھ ساتھ دیگر موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اور گراں قدر کتابیں بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ انھوں نے اپنے طرز بیان و اسلوب سے عربی نثر کا ایک علمی رنگ و آہنگ متعین کر دیا تھا، جس میں ادبیت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے جہاں ایک طرف عربی تنقید کے اہم بنیادی مباحث کو ”البيان والتبيين“ میں اجاگر کیا تو دوسری طرف کتاب الحيوان، کتاب البغال، کتاب التبصر بالتجارة، تنبيه الملوک، الدلائل والاعتبار علی الخلق والتدبر، العراقة والفراسة، الربيع والنخريف، الحنين الی الاوطان، البرصان والعرجان والعميان والحولان وغیرہ جیسی خالص علمی کتابیں لکھیں۔

جاحظ کی اولیات میں اس بات کا شمار بھی کیا جاتا ہے کہ انھوں نے عربی زبان میں طنز و مزاح کی اولین کتاب لکھی تھی اور اسے ”کتاب البخلاء“ سے موسوم کیا تھا۔ یہ کتاب جہاں ایک طرف عباسی سماج و معاشرہ کے ایک پہلو کی منہ بولتی تصویر ہے تو دوسری طرف طنز و مزاح کا ایک اچھوتا اور نادر نمونہ ہے۔ طنز و مزاح کے موضوع پر انھوں نے ”المجد والهزل“ نامی ایک رسالہ بھی لکھا ہے جو ان کے دیگر رسائل کے ساتھ ”مجموع رسائل“ کے نام سے چھپ چکا ہے۔

14.7.1.1 تنقید اور علم بلاغت

عربوں کے اندر تنقیدی شعور فطری طور پر پایا جاتا ہے جس کے ہلکے اور دھندلے نقوش عہد عباسی سے ما قبل دور میں پائے جاتے ہیں لیکن یونان، بطور فن عہد عباسی میں پروان چڑھا تھا اور اس مقام و منزل پر پہنچ گیا تھا کہ جس تک وہ زمانہ ماضی میں کبھی بھی نہ پہنچ سکا تھا۔ یہ بات بلا خوف و تردد کہی جاسکتی ہے کہ عصر جدید کو چھوڑ کر عربی تنقید کبھی بھی اس قدر بلند مقام پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس تنقیدی شعور کو پروان چڑھانے میں فصاحت قرآنی (اعجاز القرآن) کے اسرار و رموز نے کے مطالعہ نے ادبی تنقید کا ایک نیا راستہ کھول دیا تھا جس کے نتیجے میں ادبی تنقید کا ایک قابل ذکر سرمایہ سامنے آتا ہے۔

عہد عباسی میں تنقید کا ایک نیا رنگ سامنے آتا ہے کہ اسی عہد میں پہلی مرتبہ دو شاعروں کے درمیان موازنہ و مقارنہ کرنے کا چلن سامنے آیا جیسے آمدی کی کتاب الموازنة بین ابی تمام و بحتری وغیرہ۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ دو شعرا کے درمیان مقارنہ اور موازنہ کے کچھ نمونے عہد جاہلی میں پائے ہیں؛ لیکن چونکہ وہ نتائج کسی قواعد و ضوابط پر مشتمل نہیں تھے؛ بلکہ صرف عربی الفاظ کے بہتر استعمال اور فیصلہ کرنے والے کے ادبی ذوق پر مشتمل ہوتے تھے لہذا ان کا مقابلہ موازنہ عہد عباسی کے ”ادب مقارن“ سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔

فن تنقید کے موضوع پر قلم اٹھانے والوں میں جاحظ مؤلف البیان والتبيين اور کتاب الحيوان، کے علاوہ محمد بن سلام حنفی (م ۲۳۲ھ) مؤلف طبقات فحول الشعراء، ابن قتیبہ دینوری (م ۲۷۶ھ) مؤلف الشعر والشعراء اور کتاب المعارف، ابو عباس محمد بن یزید مبرد (م ۲۸۶ھ) مؤلف الكامل اور الروضة، ثعلب (م ۲۹۱ھ) مؤلف قواعد الشعر، ابن طباطبا (م ۳۲۲ھ) مؤلف عیار الشعراء، ابوالفرج اصفہانی (م ۳۵۶ھ) مؤلف کتاب الأغاني، ابن معمر (م ۲۹۶ھ) مؤلف کتاب البديع اور طبقات ابن المعتز، ابو احمد یحییٰ بن علیٰ بن محمد (م ۳۰۰ھ) کارسالة في المفاضلة بين العباس والعتابي، محمد بن عمران (م ۳۸۴ھ) مؤلف الموشح، صاحب بن عباد (م ۳۸۵ھ) مؤلف الكشف عن مساوي المتنبي، ابو منصور ثعالبی (م ۴۲۹ھ) مؤلف يتيمة الدهر، ابن سنان خفاجی (م ۴۶۶ھ) مؤلف سر الفصاحة، عبدالقاهر جرجانی (م ۴۷۱ھ) مؤلف دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغة، اسامہ بن منقذ (م ۵۸۴ھ) مؤلف البديع في نقد الشعر، ابن سناء الملک (م ۶۰۸ھ) مؤلف دار الطراز، ابن جبارة علی بن اسماعیل (م ۶۳۲ھ) مؤلف نظم الدرر في نقد الشعر، ضیاء الدین ابن اثیر (م ۶۳۷ھ) مؤلف المثل السائر، وغیرہ جیسے باکمال اشخاص شامل ہیں۔

14.7.1.2 ادب الرحلات

عہد عباسی میں ایک بالکل نئے ادبی فن کا ظہور ہوتا ہے جسے ”ادب الرحلة/الرحلات“ (سفر نامے) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عام طور پر انسان کی فطرت میں جستجو اور نئے نئے جہانوں کی جستجو و تلاش پائی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے کچھ کے اندر ہی یہ داعیہ اتنی شدت اور طاقت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے کہ وہ تمام تر خطرات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے قدم آگے بڑھا دیتے ہیں اور زمین کی مسافتوں کو طے کرنے کا آغاز کر دیتے ہیں اور راستے کی مشکلات و مصائب کو برداشت کرتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی اس جرأت اور بہادری نے نئے جہانوں کو دریافت کیا جن سے اس وقت کی دنیا ناواقف تھی۔

انسان اور سفر کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ مختلف مقاصد کے حصول کے لیے رخت سفر باندھتا رہا ہے۔ ان مسافران

تلاش و جستجو نے اپنے سفر کے حالات کو قلم بند کرنے کا اہتمام بھی کیا تھا جس کے نتیجے میں ”سفرنامہ“ (ادب الرحلة) جیسی صنف کا آغاز ہوتا ہے۔ اس صنف کے آغاز و ارتقا کے دھارے کو بھی ان علوم و فنون سے ملایا جاسکتا ہے جو قرآن کے زیر اثر پروان چڑھے تھے، قرآن میں متعدد مقامات پر کائنات ارضی و سماوی پر غور و خوض کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ {أولم یسیروا فی الأرض} کے ذریعہ رخت سفر باندھنے کی دعوت دی گئی تاکہ کائنات ارضی میں چھپے ہوئے خزانوں اور اس کے اسرار و رموز سے آگاہ ہوا جاسکے۔

قرآن کریم کے اولین مخاطب عرب تھے۔ وہ پہلے ہی سے ملکوں ملکوں اور صحرا بہ صحرا گھومنے پھرنے کے قائل تھے۔ قرآن کریم کی آیات تدبر نے ان کے شوق کو مزید ہمیز دے دی، بس کچھ مقاصد سفر بدل گئے تھے اور نتیجے میں جغرافیہ اور سفرنامے جیسی علمی و ادبی صنف نے جنم لیا۔

”ادب الرحلة“ کی صنف کا آغاز فن جغرافیہ کے جلو میں عہد عباسی سے ہوتا ہے، اس عہد کے مسافروں نے مختلف مقاصد کے پیش نظر بہت کثرت کے ساتھ دنیا کی خاک چھانی تھی اور ماہصل کو کتابی شکل میں مدون کر دیا تھا۔ اس عہد میں سفرناموں کے فروغ پانے کے مختلف اسباب و علل جیسے فریضہ حج کی ادائیگی، زیارت نبوی، تجارت، طلب علم، بادشاہ وقت کی خواہش کے مطابق ممالک و امصار کے حالات سے واقفیت حاصل کرنا اور نئے نئے جہانوں کی سیر وغیرہ پائے جاتے تھے۔

عہد عباسی میں مرتب کیے جانے والوں سفرناموں کو بحری اور بری سفرناموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی بحری سفرناموں میں ”الف لیلة و لیلة“ میں مذکور سند باد بحری کے قصے، بزرگ بن شہریار کی جانب منسوب بحری سفر کے احوال اور جہاز راں ابن ماجد کے آثار علمیہ وغیرہ۔ ابتدائی بری سفرناموں میں سلام ترجمان، ابن وہب قرشی، سلیمان تاجر، ابوزید حسن، احمد بن فضلان، ابودلف مسعد بن مہلہل خزر جی وغیرہ کے سفرنامے شامل ہیں۔ ان بحری و بری سفرناموں میں جغرافیہ دانوں کی مرتب کردہ کتب جغرافیہ بھی شامل ہیں کہ ان میں بھی کسی نہ کسی حد تک ”سفرنامہ“ کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

عہد عباسی میں لکھے جانے والے سفرنامے جہاں ایک طرف ان ممالک و امصار کی جغرافیائی کیفیت بیان کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کی تاریخ، تہذیب و تمدن اور ثقافت اور معاشرہ کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے اس عہد کے سفرناموں کی اہمیت اور مقام و مرتبہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ”انھوں نے دور دراز ممالک کے سفر کیے، تمام دنیا کے عجائبات دریافت کیں..... انھوں نے ایسے سفرنامے مرتب کیے جن سے دنیا کے ان ممالک کے حالات معلوم ہوئے جہاں اہل یورپ کا گزرتک نہ ہوا تھا۔ ابن بطوطہ اور ابن جبیر کے سفرنامے معلومات کے خزانے ہیں۔“

قبل اس کے کہ عربی سفرناموں کا ذکر کیا جائے اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ابتدائی سفرنامے عرب جغرافیہ دانوں کے مرتب کردہ ہیں اور ان میں سفرنامہ کی خصوصیات کے مقابلہ جغرافیائی احوال و کیفیات کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ اسی بنیاد پر ان کتب کا شمار ”سفرنامے“ کے مقابلہ میں جغرافیہ کی کتابوں میں ہوتا ہے تاہم ان کا تعلق ایک ناحیہ سے عربی سفرناموں سے بھی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ”الرحلة و الحالون المسلمون“ کے مصنف ڈاکٹر احمد رمضان احمد نے عربی سفرناموں کو تین زمروں میں تقسیم کیا ہے:

- الرحالة الجغرافیون: اس زمرہ کے تحت انھوں نے اہم اولین جغرافیہ دانوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی کتب میں پائے جانے ”سفرنامے“ کے عناصر کو اجاگر کیا ہے۔ اس زمرہ میں ابن خردادبہ، عبید اللہ بن احمد (نحو ۲۸۰ھ) مؤلف المسالک و الممالک، قدامہ بن

جعفر (م ۳۳۷ھ) مؤلف کتاب الخراج، احمد بن اسحاق معروف بہ یعقوبی (م ۳۱۵ھ) مؤلف کتاب البلدان، ابراہیم بن محمد اصطخری (م ۳۲۶ھ) مؤلف صور الأقالیم، ومسالك الممالک، ابن فقیہ ہمدانی، مؤلف مختصر کتاب البلدان، ابن رستہ، احمد بن عمر مؤلف الأعلاق النفیسة، حسن بن احمد ہمدانی معرف بہ ابن حانک مؤلف صفة جزيرة العرب، علی بن حسین مسعودی (۳۲۶) مؤلف مروج الذهب و معدن الجواهر، ابن حوقل، محمد بن علی (م بعد ۳۶۷ھ) مؤلف المسالك و الممالک أو صورة الأرض، محمد بن احمد مقدسی بشاری (م نحو ۳۸۰ھ) مؤلف أحسن التقسیم فی معرفة الأقالیم، ابوریحان بیرونی، محمد بن احمد (م ۴۲۰ھ) مؤلف تاریخ الهند اور الآثار الباقیة عن القرون الخالیة، محمد بن محمد درلیسی (م ۵۶۰ھ) مؤلف نزهة المشتاق فی ذکر الأمصار و الأقطار و البلدان، اور یاقوت بن عبد اللہ رومی حموی (م ۶۲۶ھ) مؤلف معجم البلدان اور مراد صلا الاطلاع علی أسماء الأماكن و البقاع۔

مذکورہ بالا زمرہ میں ڈاکٹر احمد رمضان احمد نے عہد عباسی سے تعلق رکھنے والے سلام ترجمان، ابن فضلان اور ابودلف کا بھی ذکر کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے ان کے تصانیف ہم تک نہیں پہنچ سکی ہیں۔

ڈاکٹر احمد رمضان احمد نے ان الرحالة الجغرافیون کے علاوہ دیگر جغرافیہ دانوں جیسے عبید اللہ بکری، ابن خلدون، ابوالقداء اسماعیل اور احمد بن یحییٰ فضل اللہ عمری کا بھی ذکر کیا ہے؛ لیکن چونکہ وہ اکائی کے دائرہ میں نہیں آتے ہیں کہ ان میں سے کچھ کا تعلق اندلس سے ہے تو کچھ کا تعلق عہد عباسی کے بعد کے عہد سے ہے۔ مذکورہ زمرہ کے سفر ناموں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر احمد رمضان احمد کی کتاب کا نصف سے زائد حصہ اسی اولین زمرہ پر مشتمل ہے۔

- الرحالة المشاركة: اس زمرہ میں مصنف نے ان حضرات کا ذکر کیا ہے جن کے اسفار کی تفصیل ”سفر نامے“ کے فنی معیار پر پوری اترتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے اکثر نے اپنے سفر ناموں کو مستقل بالذات تصنیف نہیں بنایا ہے۔ اس زمرہ میں مصنف نے اسامہ بن مرشد بن علی بن منقذ (م ۵۸۳ھ)، عبدالکریم بن محمد سمعانی (م ۵۶۲ھ) عمارة بن علی یمنی (م ۵۶۹ھ)، علی بن ابی بکر بن علی ہروی (م ۶۱۱ھ)، عبداللطیف بن یوسف بغدادی (م ۶۲۹ھ)، زکریا بن محمد قزوینی (م ۶۸۲ھ) مؤلف ”آثار البلاد و أخبار العباد“ (وہ آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کے قاضی تھے تاہم وفات عہد عباسی کے بعد ہوئی تھی) کا ذکر کیا ہے اور فن سفر نامہ میں ان کے مقام و مرتبہ کا ذکر کیا ہے۔

مذکورہ بالا زمرہ میں انھوں نے ناصر خسرو کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے اپنا سفر نامہ فارسی میں لکھا تھا جس کا یحییٰ خشاب نے عربی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

- الرحالة المغاربة: اس زمرہ میں مصنف نے ان سفر ناموں کا ذکر کیا ہے جن کے مصنفین کا شمار اندلس کے اہل علم و فضل میں ہوتا ہے جیسے ابن جبیر اور ابن بطوطہ وغیرہ۔ چونکہ اس زمرہ کے افراد مذکور اکائی میں شامل نہیں ہیں لہذا ان کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ”آداب الرحلة“ کی اہم ترین تصانیف کا تعلق اسی زمرہ سے ہے کہ ان کا ذکر اگر ”آداب الرحلة“ سے نکال دیا جائے تو عہد وسطیٰ میں ”آداب الرحلة“ کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ یہاں اس بات کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ عہد عباسی میں پروان چڑھنے والا سفر نامہ، سفر نامہ سے زیادہ جغرافیہ کی تفصیل بیان کرتا ہے بلکہ وہی تصانیف ہی عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے ادب الرحلة کا نمونہ ہیں، کمزور نمونہ ہی سہی۔ عہد عباسی کے ”آداب الرحلة“ کی وہ کتابیں جنھیں جغرافیہ داں حضرات نے مرتب نہیں کیا تھا، وہ

بھی ”ادب الرحلة“ کا مکمل نمونہ نہیں ہیں کہ وہ بھی کتب جغرافیہ کی طرح دیگر موضوعات کی کتب میں ضمناً ذکر کیے گئے ہیں جیسے ابن منذر نے ”کتاب الاعتبار“ میں ”ادب الرحلة“ کے حوالہ سے کچھ نقل کیا ہے لیکن اس کتاب کا بنیادی تعلق سفرنامہ کی بجائے سیرت و تاریخ سے ہے۔

14.7.1.3 علم لغت

یہ علم بھی ان علوم و فنون میں شامل ہے جو قرآن کے زیر اثر پروان چڑھے تھے اور ان کی ترتیب و تہذیب میں احادیث نبویہ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کی ابتدا قرآن وحدیث کے الفاظ کے معانی و مفاہیم کے بیان کرنے سے ہوئی تھی جو آگے چل کر تمام عربی الفاظ کے معانی و مفاہیم کو بیان کرنے پر محیط ہو گیا تھا۔ اس علم کے بالکل ابتدائی نقوش عہد نبوی و صحابہ میں ہی ملتے ہیں تاہم اس وقت کتابوں کی بجائے افراد خصوصاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے رجوع کیا تھا اور مشکل الفاظ کے معانی دریافت کیے جاتے تھے۔ عہد اموی میں لغت نگاری کے کچھ آثار ملتے ہیں، قرآن وحدیث کے الفاظ پر مشتمل کچھ کتابوں کا ذکر مصادر میں پایا جاتا ہے؛ لیکن فی طور پر اس کا ارتقا عہد عباسی میں ہی ہوا تھا، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مشہور لغوی اور علم عروض کے بانی خلیل بن احمد فراہیدی (م ۱۷۰ تا ۱۷۵ھ) کے عہد تک عرب فن لغت سے واقف نہیں تھے۔

فن لغت کے پروان چڑھنے کی بنیادی وجہ اسلامی فتوحات کی وسعت کے نتیجے میں مختلف اقوام و ملل پر مشتمل معاشرہ کا وجود میں آنا تھا۔ مخلوط معاشرہ میں عربی زبان، اپنی اصل سے دور ہوتی چلی جا رہی تھی اور اس کی شکل میں بگاڑ پیدا ہونے لگا تھا، لہذا اصل اور صحیح عربی زبان کے محافظ علما نے اس کی بقا کے لیے کمر کس لی اور دیہات اور بادیہ میں جا کر خالص اور فصیح عربی سیکھنے کا اہتمام کیا۔ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار کے بقول ”عرب کے فصیح بادیہ نشینوں کے ساتھ علمائے لغت کے ربط و اتصال نے پہلے تدوین لغت اور آگے چل کر لغت نویسی کی بنا ڈالی۔ اس طرح عربی زبان ہمیشہ کے لیے آمیزش و اختلاط سے محفوظ ہو گئی..... انھوں نے عربی زبان کے تحفظ کے سلسلے میں جس عرق ریزی اور جانکاہی کا ثبوت دیا ہے، دنیا کی کوئی زبان اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی ہے۔“

لغت (Dictionary) کے لیے عربی میں ”المعجم“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کا اطلاق اس کتاب پر ہوتا جو مفردات لغت کی کثیر تعداد اور ان کے معانی و مطالب پر مشتمل ہو اور اسے حروف ہجایا موضوع کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہو۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی کہ لفظ ”المعجم“ کا استعمال سب سے پہلے امام بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) نے صحیح بخاری کے ایک باب کے عنوان میں غزوہ بدر میں شریک ہونے والے صحابہ کی فہرست کا ذکر کرتے ہوئے کیا تھا۔ بعد ازیں انھوں نے روایت حدیث کا ذکر ”المعجم الکبیر“ اور ”المعجم الصغیر“ میں کیا۔ ان کے علاوہ متعدد علما نے صحابہ کرام، روایت احادیث اور محدثین پر مشتمل کتابوں کو ”المعجم“ کے نام سے موسوم کیا تھا جیسے محدث ابو یعلیٰ احمد بن علی (م ۳۰۷ھ) کی کتاب ”معجم الصحابة“، ابن بنت منیع کی ”المعجم الکبیر“ اور ”المعجم الصغیر“ وغیرہ۔ مؤخر الذکر دونوں کتابیں صحابہ کرام کے اسما پر مشتمل ہیں۔ فن اسماء الرجال کے موضوع پر لکھنے والی متعدد کتب کو ”المعجم“ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ چونکہ ان محدثین نے اپنی کتب کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا تھا، لہذا علمائے لغت نے بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے اپنی کتب کو مؤلف ”المعجم“ سے موسوم کر دیا کہ وہ کتابیں بھی عام طور سے حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کی گئیں تھیں جب کہ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نے اس کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی ہے ”غالبا کسی زبان کی کتاب لغت پر مجسم کا

اطلاق اس لیے کیا جانے لگا کہ اعجام (حروف پر نطقے لگانا) سے التباس دور ہو کر وہ حرف واضح ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ کلمات حروف ہجا ہی سے مرکب ہوتے ہیں۔“

اوپر یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ عربی لغت نویسی کا آغاز عہد نبوی و عہد صحابہ سے ہی ہو چکا تھا۔ عہد اموی میں اس کے ابتدائی نقوش پائے جاتے ہیں تاہم ان تمام ادوار کا جو کچھ سرمایہ بھی ملتا ہے ان کا تعلق عام لغت نگاری کے بجائے قرآن و حدیث کے مشکل الفاظ سے تھا۔ فنی طور پر اس علم لغت کا آغاز خلیل بن احمد فراہیدی کی کتاب ”کتاب العین“ سے ہوتی ہے جسے اصطلاحی طور پر ڈکشنری کہا جاسکتا ہے۔

14.7.1.3.1 تدوین لغت نگاری کے مراحل

عربی لغت نگاری کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کئی تدریجی مراحل سے گزری ہے:

پہلا مرحلہ: اس مرحلہ میں صحابہ کرام آپ ﷺ سے قرآن و حدیث کے مشکل الفاظ کے معنی دریافت کر کے یا تو انھیں زبانی یاد کر لیتے تھے یا انھیں لکھ لیا کرتے تھے۔ تدوین لغت کا یہ پہلا مرحلہ صرف قرآن و حدیث کے مشکل الفاظ مشتمل ہے۔

دوسرا مرحلہ: اس مرحلہ میں صحابہ کرام آپس میں قرآن و حدیث کے مشکل الفاظ کے معنی دریافت کرتے تھے۔ اس مرحلہ کے نمائندہ فرد حضرت عبداللہ بن عباسؓ تھے۔ انھیں اس عہد کی چلتی پھرتی ڈکشنری کہا جاتا تھا کہ وہ قرآن و حدیث کے مشکل الفاظ کے معانی بیان کرتے تھے اور ”مفردات کی تشریح عربی اشعار کی روشنی میں کرتے تھے“۔

تیسرا مرحلہ: اس مرحلہ میں سب سے پہلے مفردات کو بغیر کسی ترتیب کے اکٹھا و جمع کر دیا گیا تھا۔ دوسرے مرحلہ میں مفردات کو معانی و موضوعات کے اعتبار سے جمع کیا گیا۔ اس مرحلہ میں ایک دوسرے سے ملتے ان الفاظ جمع کیا گیا جو شکل اور معنی کے اعتبار سے ایک جیسے تھے جیسے قَدَّ اور قَطَّ (چیرنا اور پھاڑنا بالترتیب)، قَضَمَ اور خَضَمَ (چباننا) وغیرہ۔

اس مرحلہ میں ایک موضوع سے متعلق الفاظ کو جمع کیا گیا تھا جیسے کتاب الإبل، کتاب النبات، کتاب الحشرات، کتاب النخيل وغیرہ۔

چوتھا مرحلہ: اب تک جو کچھ لغوی سرمایہ جمع ہو چکا تھا اس کی روشنی میں عام لغت نویسی کا آغاز ہوا تھا۔ عام لغت نویسی کی ابتدا دوسری صدی ہجری میں خلیل بن احمد فراہیدی کے ہاتھوں سے ہوئی تھی۔ ان کی کتاب ”کتاب العین“ کو اس فن کی اولین کتاب قرار دیا جاتا ہے۔ اس کتاب کو انھوں حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا ہے لیکن اس کی ترتیب میں حروف کے مخارج کو ملحوظ رکھا گیا ہے، یعنی پہلے حلقی حروف، اس کے بعد زبان سے نکلنے والے الفاظ، اس کے بعد دانتوں سے نکلنے والے الفاظ پھر لبو سے نکلنے والے الفاظ۔ حروف حلقی۔ حرف عین۔ سے شروع ہونے کی وجہ سے ہی اس کتاب کو ”کتاب العین“ سے موسوم کیا گیا ہے۔

عہد عباسی کے دیگر مشہور لغت نگاران میں ابو عمرو بن علاء، زَبَّان بن عمار تمیمی (م ۱۵۴ھ) مؤلف النوادر، یونس بن حبیب (م ۱۸۲ھ) مؤلف اللغات اور النوادر، امام کسائی (م ۱۸۹ھ) مؤلف ما تلحن فیہ العامة، مؤرج بن عمرو سدوسی (م ۱۹۵ھ) مؤلف کتاب الأَنْوَاء، نضر بن شَمیل (م ۲۰۳ھ) مؤلف کتاب الصفات، کتاب الأشجار، کتاب الوحوش، کتاب الأنوائی اور المعانی وغیرہ، ابو عمرو اسحاق بن مرار شیبانی (م ۲۰۶ھ) مؤلف کتاب الجیم اور کتاب اللغات، یحییٰ بن زیاد دلیمی (م ۲۰۷ھ) مؤلف البهاء فیما تلحن فیہ العامة، ابو عبیدہ معمر بن شَیْثی (م ۲۰۹ھ) مؤلف ما تلحن فیہ العامة، ابو یزید انصاری، سعید بن اوس (م ۲۱۵ھ) مؤلف النوادر، الهمز،

المطر، الشجر اور خلق الإنسان وغيره، عبدالملك بن قُرَيْبِ اصمعي (م ۲۱۶ھ) مؤلف كتاب الإبل، كتاب الأضداد، كتاب خلق الإنسان اور كتاب الخيل وغيره، ابويعيد قاسم بن سلام هروي (م ۲۲۴ھ) مؤلف الغريب المصنف، ابن الاعرابي كوفي، محمد بن زياد (م ۲۳۱ھ) مؤلف أسماء الخيل و فرسانها اور أسماء البئر وصفاتها، ابو عثمان بكر بن محمد مازني (م ۲۳۸ھ) مؤلف ما تلحن فيه العامة، ابو حاتم سحستاني، سهل بن محمد (م ۲۳۸ھ) مؤلف ما تلحن فيه العامة، كتاب الأضداد اور كتاب الإبل، ابو حنيفة دينوري (م ۲۸۲ھ) مؤلف ما تلحن فيه العامة ابو الهيثم ام كلاب بن حمزة عقيلي حراني (م ۲۹۰ھ) مؤلف ما تلحن فيه العامة، ابن دريد ازدي (م ۳۲۱ھ) مؤلف الجمهرة في اللغة، تقويم اللسان، اللغات اور المقصور والمدود، ابو ابراهيم اسحاق بن ابراهيم فارابي (م ۳۵۰ھ) مؤلف ديوان الأدب، ابو علي قالي، اسماعيل بن قاسم بغدادی (م ۳۵۶ھ) مؤلف البارع، ازهری، ابو منصور محمد بن احمد (م ۳۷۰ھ) مؤلف تهذيب اللغة، صاحب بن عباد (م ۳۸۵ھ) مؤلف المحيط، محمد بن حسن بَزْبَاذ قاني (م ۳۸۶ھ) مؤلف حرف العين في الضاد والطاء من كتاب الروحة، ابن فارس، احمد بن زكريا (م ۳۹۰ھ) مؤلف مقاييس اللغة اور المعجم، اسماعيل بن حماد جوهری (م ۳۹۳ھ) مؤلف الصحاح، ابو هلال عسکری (م ۳۹۵ھ) مؤلف ما تلحن فيه الخاصة، التلخيص، المعجم، الفروق، ابو منصور ثعالبي، عبدالملك بن محمد (م ۴۲۹ھ) کی فقہ اللغة، ابو غالب تمام بن غالب (م ۴۳۶ھ) مؤلف المواعب، محمود بن عمر منجشري (م ۵۳۸ھ) مؤلف أساس البلاغة، حسن بن محمد صانغاني (م ۶۵۰ھ) مؤلف العباب الزاخر، مجمع البحرين، الشوارد في اللغة، الأضداد، ما تفرد به بعض أئمة اللغة اور التكملة وغيره ہیں۔

دیگر مشہور کتب لغات جیسے لسان العرب، القاموس اور تاج العروس وغیرہ عہد عباسی کے بعد مرتب کی گئیں تھیں اس لیے ان کے مؤلفین کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا ہے۔

14.7.2 شاعری

عہد عباسی میں شاعری میں بھی کافی بال و پر آئے تھے جن کا تفصیلی ذکر شاعری پر مشتمل اکائی میں کیا جا چکا ہے۔ تاہم حسب ذیل سطور میں مختصر طور پر عہد عباسی کی شاعری کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

عربی شاعری کے تمام ادوار میں عہد عباسی کی شاعری متعدد اور گونا گوں صفات، امتیازات اور خصوصیات کی وجہ سے منفرد و ممتاز نظر آتی ہے۔ اس عہد میں مختلف اقوام و ملل اور ان کی تہذیب و ثقافت ایک دوسرے سے گلے ملتی ہوئی نظر آتے ہیں۔ اس عہد کے سماجی، ثقافتی اور علمی وادبی ماحول نے ایک ایسی فضا تیار کر دی تھی جس کی مثال پوری اسلامی تاریخ میں نظر نہیں آتی ہے۔ اس عہد کی مخصوص فضا میں عربی شاعری اپنے نئے رنگ و روپ میں پروان چڑھتی ہے اور ایسے بیش بہا نمونے پیش کرتی ہے جس نے عربی شاعری کا دامن کو بہت سارے گہر آبدار سے بھر دیا تھا اور اس کی قدر و قیمت میں گراں قدر اضافہ کر دیا تھا۔

عصر عباسی کی شاعری، عربی شاعری کے دیگر تمام ادوار سے اس لحاظ سے ممتاز قرار پاتی ہے کہ اس عہد میں شعرا، متقدمین شعرا کے طرز اسلوب و بیان سے قطع نظر ایک نیا طرز و اسلوب اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ محبوبہ اور اس کی نشانیوں کی یاد میں آنسو بہاتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں بلکہ وہ اپنے قصائد کا آغاز اپنے اپنے ذوق کی مناسبت سے مختلف رنگ و ڈھنگ سے کرتے ہیں جس میں شہری تمدن اور بود باش

کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

اس عہد کی شاعری میں ایک طرف جہاں قدیم اصناف سخن - جیسے مدح، مرثیہ اور ہجو وغیرہ - کے دائرہ کار میں وسعت پیدا ہوئی تھی وہیں چند جدید موضوعات شاعری - جیسے غزل، غمان، زہد، طریات، خمریات وغیرہ - پر شعرا داد سخن دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی کے موضوعات شاعری میں مجموعی طور سے کافی نمایاں تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ ان تمام تر تبدیلیوں کے باوجود اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں بھی کچھ شعرا ایسے موجود تھے جن کی شاعری پر جدید ماحول اور حالات اثرات یا تو مرتب ہی نہیں ہوئے تھے یا برائے نام مرتب ہوئے تھے اور وہ قدیم اسلوب و انداز میں ہی شاعری کر رہے تھے۔

عہد عباسی کی شاعری پر جب ایک طائرانہ نظر ڈالی جاتی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کی شاعری کو فروغ دینے میں شعرا کے ساتھ ساتھ سماج کے مختلف طبقات جیسے عباسی خلفاء، وزرا، امرا اور وعاہدین سلطنت، نثر نگاران اور علما دین وغیرہ نے نمایاں کردار ادا کیا تھا کہ ایک طرف جہاں عباسی خلفاء، وزرا، امرا اور وعاہدین سلطنت نے شعرا کی سرپرستی کی تھی تو دوسری طرف انھوں نے خود بھی داد سخن حاصل کی تھی اور شاعری کے عمدہ نمونے بطور یادگار چھوڑے تھے۔

عہد عباسی میں شاعری کے فروغ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس عہد میں شاعری کسب معاش، عزت و شہرت اور مال و دولت حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن گئی تھی۔ اسی طرح مملکت عباسیہ میں شاعری کے اہم مرکز بغداد کے علاوہ دیگر مراکز و مقامات بھی پائے تھے جہاں کے امرا اور حکمرانوں کے دربار میں شعر و شاعری کی سرپرستی کی جاتی تھی نتیجہً شعرا کو دیگر ادوار شاعری کے مقابلہ میں زیادہ بڑا اور وسیع میدان ملا اور انھوں نے اپنی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو اچھے انداز و اسلوب میں پیش کیا۔

عہد عباسی کے شعرا کو تین بڑے زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا طبقہ مخضرم شعرا کا ہے جنھوں نے عہد اموی کا اواخر اور عہد عباسی کا اوائل دور پایا تھا۔ انھیں شعرا نے عہد عباسی کی شاعری میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس طبقہ کے اہم نمائندہ شاعر بشار بن برد اور ابو نواس ہیں۔ دوسرا طبقہ شعرا کے مولدین کا ہے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ تیسری صدی میں گذرا تھا۔ انھوں نے اپنے پیش رو شعرا کے کاج کو آگے بڑھاتے ہوئے عربی شاعری کو نئے رنگ و آہنگ سے نوازا تھا۔ اس طبقہ کے نمائندہ شعرا میں ابوتام اور سخری وغیرہ کا شمار کیا جاتا ہے۔ تیسرا طبقہ شعرا کے محدثین کا ہے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ چوتھی صدی میں گذرا تھا۔ انھوں نے بھی عربی شاعری کے فروغ میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس طبقہ کے اہم شعرا میں متنبی اور ابوالعلاء معری وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا شعرا کو موضوعاتی اور فنی لحاظ شعراء البداوة، الشعراء المجددون، الشعراء المفتنون، شعراء الصنعة، الشعراء المحافظون، الشعراء المبدعون اور شعراء المذاهب والوجدان والفکر کے زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

مؤخر الذکر طبقہ شعرا کی ایک بڑی اکائی پر مشتمل ہے جسے ان کے نظریات، خیالات و افکار کے لحاظ سے انھیں شعراء العباسیة (حکومت وقت کے دربار سے منسلک شعرا)، شعراء الشیعة (شیعی نظریات کے حامل شعرا)، شعراء العشق (شعراے غزل)، شعراء الزهد والحکمة والمواعظ (شعراے زہد و حکمت و موعظت)، شعراء علماء (علوم و فنون کو نظم کرنے والے شعرا)، اور شعراء الطبع

14.8 اکتسابی نتائج

تاریخ اسلامی کا سب سے زریں عہد عہد عباسی ہے جس میں گوناگوں قسم کی ترقیاں ہوئیں۔ علوم و فنون نے ارتقائی مراحل طے کیے اور اوج کمال تک پہنچ گئے تھے۔ عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم و فنون کو بنیادی طور پر دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا زمرہ ان علوم و فنون پر مشتمل ہے جو عصر عباسی کے علما و فضلا کو اسلاف خصوصاً عہد اموی سے بطور ورثہ ملے تھے۔ دوسرا زمرہ ان علوم و فنون پر مشتمل ہے جن کی بنا عصر عباسی میں رکھی گئی تھی۔ عصر عباسی میں پروان چڑھنے والے علوم و فنون پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عہد عباسی کے علما کو بطور ورثہ ملنے والے علوم و فنون کی تعداد زیادہ ہے۔

عہد عباسی میں فروغ پانے والے علوم و فنون کو فنی لحاظ سے اسلامی، سائنسی، سماجی اور ادبی علوم و فنون میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان علوم و فنون میں اسلامی علوم و فنون کا سرمایہ سب سے زیادہ ہے۔ اسلامی علوم و فنون میں علوم قرآن کو سب سے زیادہ نمایاں مقام و مرتبہ حاصل ہے، قرآن کے مختلف پہلوؤں کو علمائے اسلام نے اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا تھا اور حاصل مطالعہ کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا تھا۔ قرآن کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر علمائے اسلام نے قلم نہ اٹھایا ہو۔

قرآن کے بعد حدیث و علوم حدیث کے موضوع پر ایک معتد بہ ذخیرہ علمائے اسلام نے مرتب کیا تھا۔ علم حدیث کے روایتی اور درایتی دونوں پہلوؤں پر سیر حاصل مباحث کیے گئے ہیں۔ حدیث کے ضمن میں اسماء الرجال جیسا علم پروان چڑھا جس کی نظیر آج تک نہ پیش کی جاسکی ہے۔

فقہ اور علوم فقہ پر بھی قابل ذکر سرمایہ مرتب کیا گیا ہے۔ سیرت نبوی کے موضوع پر بھی اہم ترین کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔ تذکرہ و تراجم کے موضوع پر بھی ایک قابل قدر سرمایہ مرتب کیا گیا تھا۔

عہد عباسی میں پروان چڑھنے والے سماجی علوم و فنون میں تاریخ، جغرافیہ، تصوف، منطق و فلسفہ اور علم کلام جیسے علوم و فنون شامل ہیں۔ ان علوم و فنون پر عہد عباسی کے علما نے ایک گراں قدر سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔ اسی طرح متعدد ادبی علوم و فنون جیسے علم بلاغت، تنقید اور لغت جیسے علوم و فنون پروان چڑھے تھے۔ اس عہد کی نثر نگاری کو عربی ادب کی تاریخ میں سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں قرار دیا جاتا ہے۔ اس عہد کی نثر نگاری کے مقابلہ میں صرف عصر جدید کی نثر نگاری کو بطور نمونہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس عہد کی شاعری، اس کے موضوعات اور اصناف سخن میں بھی نمایاں تبدیلیاں ملتی ہیں۔

عہد عباسی کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس عہد میں سائنسی مزاج میں بہت زیادہ ترقی ہوئی تھی، علمائے عہد عباسی نے ہر موضوع پر غور و فکر کر کے اہم ترین کتب مرتب کیں۔ اس عہد میں سائنسی علوم و فنون نے نمایاں طور پر ارتقائی مراحل طے کیے تھے، جس کے گہرے اور دور رس اثرات بعد کی صدیوں پر مرتب ہوئے۔ اس عہد کی سائنسی ترقیوں کو ہی یورپ کی سائنس کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام علوم و فنون میں عہد عباسی کے علما و فضلا نے بہت ہی اہم کتب بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ اس عہد کے علما و فضلا کی علمی

کاوشوں اور کوششوں نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا ہے جس کا برملا اعتراف تمام حق پسند اہل علم و دانش کرتے ہیں۔

14.9 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

- 1- علم اعراب و معانی القرآن پر ایک نوٹ لکھیے۔
- 2- عہد عباسی میں مدون کیے جانے والے مجموعہ احادیث کو کن کن زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے؟
- 3- علم اصول فقہ پر ایک نوٹ لکھیے۔
- 4- عہد عباسی میں فن کیمیا کے فروغ پر روشنی ڈالیے۔
- 5- علم ہیئت و نجوم میں عہد عباسی کے علما کی خدمات کا مختصر تعارف کرایے۔
- 6- علم جغرافیہ میں عہد عباسی کے علما و فضلا کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

- 7- فن تفسیر پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔
- 8- فن اسماء الرجال پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔
- 9- فقہ کا تعارف کراتے ہوئے اس کے ادوار تدوین اور مشہور فقہی مکاتب پر روشنی ڈالیے۔
- 10- فن سیرت نبوی کے آغاز و ارتقا کا تفصیل سے جائزہ لیجیے۔
- 11- عہد عباسی میں طب کے فروغ پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔
- 12- عہد عباسی میں فن تاریخ کے فروغ پر ایک نوٹ لکھیے۔
- 13- عہد عباسی کی نثر نگاری کا جائزہ لیجیے۔

14.10 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

- | | |
|------------------------------------------------------------------------------------------------|---------------------------------------------|
| ڈاکٹر شوقی ضیف | - تاریخ الأدب العربي (العصر العباسي الأول) |
| حنافا خوری | - الجامع في تاريخ الأدب العربي |
| احمد حسن زیات | - تاریخ الأدب العربي |
| ڈاکٹر محمد زغلول سلام | - عصر العباسيين (الجزء الأول والجزء الثاني) |
| از پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی، انسٹی ٹیوٹ آف آئی جیکٹیو اسٹڈیز،
نئی دہلی، ۲۰۱۲ء (طبع اول) | - تاریخ تہذیب اسلامی (حصہ سوم: خلافت عباسی) |
| پروفیسر سید احتشام احمد ندوی | - عربی ادب کی تنقیدی تاریخ |
| | - اردو دائرۃ المعارف |

اکائی 15 عصر عباسی میں فنی نثر کا ارتقا

- اکائی کے اجزا
- 15.1 مقصد
- 15.2 تمہید
- 15.3 عہد عباسی کی نثر نگاری
- 15.3.1 عہد عباسی میں نثر نگاری کے فروغ کے اسباب و عوامل اور اس کے امتیازات و خصائص
- 15.3.2 عہد عباسی میں نثر نگاری کے ارتقائی مراحل
- 15.3.3 عہد عباسی کے نثر نگاران کے طبقات
- 15.4 نثر نگاری کے اصناف
- 15.4.1 خطابت
- 15.4.2 توقیعات
- 15.4.3 مراسلات
- 15.4.4 مناظرے
- 15.4.5 مقامات
- 15.4.6 تنقید نگاری
- 15.5 نمائندہ نثر نگار اور نمونہ کلام
- 15.5.1 ابن المقفع (۱۰۶-۱۴۲ھ)
- 15.5.2 سہل بن ہارون (م ۲۱۵ھ)
- 15.5.3 ابراہیم بن عباس بن محمد الصولی (۱۷۶-۲۴۳ھ)
- 15.5.4 جاحظ (۱۵۹-۲۵۵ھ)
- 15.5.5 ابن قتیبہ (۲۱۳-۲۷۶ھ)

ابن العمید (م ۳۶۰ھ)	15.5.6
صاحب بن عباد (۳۲۶-۳۸۵ھ)	15.5.7
بدیع الزماں ہمدانی (۳۵۸-۳۹۸ھ)	15.5.8
قاضی فاضل (۵۲۹-۵۹۶ھ)	15.5.9
ضیاء الدین ابن الاثیر	15.5.10
اکتسابی نتائج	15.6
نمونے کے امتحانی سوالات	15.7
مطالعے کے لیے معاون کتابیں	15.8

15.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھ کر ہم اس بات سے واقف ہو سکیں گے کہ عہد عباسی میں نثر نگاری کے پروان چڑھنے کے کیا اسباب تھے؟ شاعری کے مقابلہ میں نثر نگاری نے کیونکر ترقی کی تھی اور اس کا معیار و مرتبہ کس قدر بلند تھا؟ ساتھ ہی ساتھ اس عہد کے نثر نگاران کے حالات، علمی و ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کے اصناف سخن سے واقف ہوا جاسکے گا۔

15.2 تمہید

عباسیوں اور امویوں کی طویل سیاسی کشمکش بالآخر ۱۳۲ھ میں عباسی حکومت کے قیام پر ختم ہوئی۔ تاریخ ادب عربی کے مختلف ادوار میں عباسی دور (۱۳۲ تا ۶۵۶ھ/۷۵۰ تا ۱۲۵۸ء) عام طور سے اہم دور سمجھا گیا ہے کیونکہ اس زمانہ میں سلطنت عباسیہ کے حدود میں رہنے والے باشندے چاہے وہ کسی قوم اور کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، قابل لحاظ ترقی کی راہ پر گام زن رہے۔ اس دور کی اہم خصوصیت یہ ہے اس کے آغاز میں یونانی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ قدیم ہندوستانی اور ایرانی علوم عربی میں منتقل ہوئے اور عربوں نے انہیں اس طرح اپنایا کہ وہ عربوں کا بیش قیمت ورثہ بن گئے۔ مجموعی طور پر عباسی معاشرہ ایک ترقی یافتہ معاشرہ بن گیا تھا جس میں سماج کی ساری بنیادی ضرورتیں پائی جاتی تھیں۔ ویسے تو عباسی حکومت تیرہویں صدی کے وسط میں بغداد کی تباہی پر ختم ہوئی لیکن مسلم معاشرہ میں اور زبان و ادب وغیرہ میں زوال کے آثار گیارہویں صدی میں شروع ہو چکے تھے۔

ادب چونکہ زندگی کا آئینہ ہوتا ہے لہذا جب انسان کی زندگی اور رہن سہن میں تبدیلی آتی ہے اور سوچنے سمجھنے کے طریقے بدلتے ہیں تو ادب بھی اپنے آپ کو بدلتا رہتا ہے۔ دور جاہلی کے ادب اور اسلامی ادب میں جس طرح سوچنے اور سمجھنے کی تبدیلی کی وجہ سے نمایاں فرق ملتا ہے اسی طرح عباسی دور میں طرز زندگی بدل جانے سے عربی ادب میں بھی نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ چنانچہ عباسی دور کا ادب اسلامی اور اموی دور کے ادب سے جداگانہ نظر آتا ہے۔ اس دور میں ادب میں جو تبدیلیاں آئیں وہ یکا یک نہیں تھیں بلکہ آہستہ آہستہ ان کے اثرات ظاہر ہوئے تھے۔ ابتدا میں کچھ لوگوں نے قدیم طرز پر لکھنے کی کوشش کی لیکن ایرانی اثرات کے دباؤ میں وہ اس پر قائم نہ رہ سکے۔ حتیٰ کہ عباسی دور کے اواخر میں یہ تبدیلی اتنی زیادہ ہو گئی کہ عربی ادب کا ڈھانچہ تو صرف عربی تھا لیکن اس کی اصل روح فارسی تھی۔

15.3 عہد عباسی کی نثر نگاری

نئے طرز زندگی اور مفتوحہ ممالک سے میل جول کا اثر اس زمانہ کی نثر نویسی پر بھی صاف ظاہر ہوتا ہے۔ نثر نے قوت، عمق اور وسعت میں ترقی کی۔ افکار، موضوعات اور اغراض میں حیات جدیدہ کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اس دور کے نثر میں معنی میں وسعت، مضامین میں تنوع اور الفاظ کی زیب و زینت پر زیادہ توجہ دی جانے لگی تھی۔ ادیبوں نے معنوی اور لفظی دونوں طرح کے حسن کا برابر خیال رکھا۔ اس دور کے آغاز ہی سے ادیبوں نے اپنی تحریروں میں طوالت کو فارسی اثر کی وجہ سے اپنانا شروع کر دیا تھا، جب کہ بعض لوگ ایسے بھی تھے، جو اس ڈر سے کہ کہیں جدت پسندی عربی نثر کے لیے نقصان دہ نہ ہو مختصر نویسی کی طرف لوگوں کو بلاتے تھے۔ عباسی دور کا مشہور وزیر اور ادب نواز جعفر بن یحییٰ برکی کہا کرتا تھا ”لو استعظم أن تکون کتبکم کالتوقیعات فافعلوا“ یعنی اگر تمہیں قدرت ہو کہ تمہاری

تحریریں مختصر نوٹ کی طرح ہوں تو تم ایسا ہی کرو۔

اسی نظریہ پر بہت سے لوگوں نے عمل بھی کیا جس کی مثال طاہر بن حسین کے اس مختصر خط سے ملتی ہے جو اس نے خلیفہ مامون کو لکھا تھا: ”کتابی إلى أمير المؤمنين ورأس عيسى بن ماهان بين يديه وخاتمه في يدي وعسكره مصروف تحت أمري والسلام“ (میرا یہ خط امیر المؤمنین کے لیے ہے، عیسیٰ بن ماہان کا سران کے سامنے ہے، اس کی انگشتی میرے قبضہ میں ہے اور اس کا لشکر میرے حکم کے تابع ہے) لیکن اس کے برعکس دوسری طرف ایسے رسائل بھی تھے کہ جن میں طوالت کو اختیار کیا جاتا تھا، بالارادہ بہترین الفاظ لکھے جاتے تھے اور لکھنے والا ان کو مرتب کرنے میں کافی محنت سے کام لیتا تھا۔ جملوں میں موسیقیت کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ عباسی دور کے شروع میں مفتی اور مسجع نثر بھی فطرت سے زیادہ قریب تھی اور اس میں زیادہ تکلف سے کام نہیں لیا جاتا تھا لیکن اسی دور کے آخر میں جب زبان میں فساد پیدا ہو گیا تو مسجع میں زیادہ تکلف اور آورد سے کام لیا جانے لگا۔ زبان کی خامیوں کو مفتی اور مسجع نثر لکھ کر پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اطناب میں حدود کو ختم کر دیا گیا۔ پہلے جو بات دو یا چار جملوں میں پوری ہو جاتی تھی اب اسی کو ادا کرنے کے لیے کئی کئی صفحات رنگین کر دیئے جاتے تھے مگر پھر بھی نفس مطلب پورا نہیں ہوتا تھا۔ اطناب کو اختیار کرنے والا سب سے پہلا شخص عبد الحمید بن یحییٰ لکاتب تھا جو فارسی النسل ہونے کی وجہ سے اپنی اصل زبان کی خصوصیات کو عربی زبان میں لانا چاہتا تھا۔

15.3.1 عہد عباسی میں نثر نگاری کے فروغ کے اسباب و عوامل اور اس کے امتیازات و خصائص

عباسی دور میں مجموعی طور پر نثرنی کی نشوونما میں متعدد عوامل کارگر رہے تھے۔ انشا پردازوں کو پہلے کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ آزادی تھی۔ قرآن کریم اور احادیث سے استفادہ اور استدلال نے ان کی عبارتوں میں نکھار پیدا کر دیا تھا اور اسی کے ساتھ فارسی اثرات سے بھی انھوں نے فائدہ اٹھایا۔ اس دور کی نثر میں عام طور پر تمہیدی کلمات اور مقدمات کا اضافہ ہوا اور منتخب عبارات آغاز اور اختتامیہ کے طور پر استعمال ہوئیں۔ آسان عبارات، واضح اسلوب، منتخب پر شکوہ الفاظ، معنی میں گہرائی اور افکار و خیالات میں ترتیب اس دور کی نمایاں خصوصیات ہیں لہذا ان تمام چیزوں کا مجموعہ ان ادیبوں کی انشا پردازی میں ایک مخصوص انداز پیدا کر دیتا ہے جو ان کو دیگر زمانہ کے ادیبوں سے ممتاز کرتا ہے۔

عباسی دور میں نثر نگاری کی ترقی میں حسب ذیل عوامل و اسباب نے نمایاں کردار ادا کیا ہے:

۱- انشا پردازوں کو غیر معمولی قسم کی آزادی کا حاصل ہونا۔

۲- عربوں کا غیر عربوں کے ساتھ میل جول اور ان قوموں کی تہذیب و تمدن نے عربوں پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے اور اہل

عرب کی عقلوں کو پختہ کرنے اور اسلامی افکار و ثقافت کے نشوونما و فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

۳- عربوں کا ان تمام تہذیب و تمدن سے استفادہ کر کے ان میں سے صالح نافع کو اختیار کرنا۔

۴- ہر طرح کی آزادی نے غیر عرب مسلمانوں کو اس کا اہل بنا دیا تھا کہ وہ حکومت و وقت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب کو حاصل کر لیں۔ ان

لوگوں نے اپنی تہذیب و تمدن کو عربوں میں پھیلایا اور عرب و غیر عرب کی فکری کش مکش کے نتیجے میں عربوں میں فکری بیداری اور عربی

عقل میں پختگی آئی۔

۵- عباسی دور کے سیاسی طور پر مستحکم طویل دورانیہ نے علمی و فکری فضا کو ہموار کیا۔

عہد عباسی کی نثر نگاری کی نمایاں خصوصیات و امتیازات حسب ذیل ہیں:

۱- اس دور میں ادبی نثر، قصص و حکایات، دفتری تحریروں، دینی و سیاسی خطابت پر مشتمل تھا اور ادب نے ہر قسم کے موضوعات اور اغراض پر خامہ فرسائی کی۔

۲- اس دور کی نثر میں تسلسل افکار، علمی گہرائی، فلسفیانہ اور منطقی وسعت کی چھاپ نظر آتی ہے جو دیگر قوموں کے تہذیبی اثرات کی وجہ سے اس دور کے نثر پر پڑی۔

۳- اس دور کی نثر میں بلند خیالی اور وضاحت پائی جاتی ہے۔ ادب نے اعتدال کی راہ اختیار کی اور اپنے احساسات و جذبات کی سچی ترجمانی کی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا حتیٰ کہ عباسی دور کے اواخر میں حکومت کی کمزوری کے ساتھ ساتھ انشا پردازی میں بھی کمزوری پیدا ہو گئی۔ انشا پردازوں نے کچھ انواع بدیع کے زیر اثر اور کچھ فارسی زبان کے بڑھتے ہوئے اثرات کی وجہ سے کلام کو حسین اور خوش نمائند بنانے کی کوشش کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس زبان کا ڈھانچہ تو عربی تھا مگر اس کی اصل روح بدل چکی تھی۔ عبارتوں کو حسین بنانے میں اس قدر غلو کیا کہ الفاظ بھونڈے ہو گئے اور معانی ناقص۔ اگر یہ رجحان خالص عربی نثر کے بجائے خطوط نویسی، وصایا اور عہد ناموں تک محدود رہتا تو بہتر ہوتا مگر یہ اسلوب کتابوں کی تصنیف اور علوم کی تدوین میں استعمال کیا جانے لگا۔

۴- عباسی دور کے آغاز میں عبارتوں میں ایجاز، اطناب اور مساواة کا استعمال مناسب طریقہ پر ہوتا تھا، الفاظ سہل اور شیریں ہوتے تھے اور معانی میں وضاحت کا اہتمام کیا جاتا تھا اور اس کے لیے امثال و حکم، قرآن و حدیث اور اقوال عرب سے استشہاد کیا جاتا تھا۔ لیکن چوتھے دور میں، جس کے سردار قاضی فاضل تھے، اسلوب میں سجع بندی اور بدیع پسندی کے ساتھ تو یہ اور تجنیس میں اس قدر غلو ہوا کہ اس زمانہ میں انشا پردازی محض تکلفات کا مجموعہ بن کر رہ گئی، جس میں الفاظ کی خوبصورتی کا اہتمام ہوتا تھا لیکن مضمون ناقص اور خیال نامکمل ہوا کرتے تھے۔

۵- اس دور میں ایسے ایسے انشا پرداز بھی ہوئے کہ جنھوں نے نثر نویسی میں یگانگت کو باقی رہنے نہیں دیا اور جدا جدا اسالیب کا استعمال ہونے لگا، چنانچہ جاحظ کے دور میں ابن عبد ربہ کے جیسے ابن المقفع کے پیروکار اور ابن العمید کے دور میں شریف رضی جیسے حضرت علی کے اسلوب کا اتباع کرنے والے ملتے ہیں۔ یہ صورت حال عربی نثر میں جدت اور قدامت دونوں رجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔

15.3.2 عہد عباسی میں نثر نگاری کے ارتقائی مراحل

عصر عباسی کا دورانیہ ۱۳۲ تا ۶۵۶ھ/ ۷۵۰ تا ۱۲۵۸ء پر محیط ہے اور اسے اسلامی تاریخ کا عہد زریں قرار دیا جاتا ہے، بقول احمد حسن زیات ”حکومت عباسیہ کا زمانہ اسلام کا وہ زریں عہد ہے جس میں مسلمان تمدن و تہذیب اور عمران و اقدار کے لحاظ سے اس قدر بلند مقام پر پہنچ گئے تھے کہ اس سے قبل یا اس کے بعد پھر کبھی اس بلندی پر نہ پہنچے۔ فنون اسلامیہ اس دور میں پھلے پھولے، آداب عربیہ نے نشوونما پائی۔ غیر ملکی علوم کے ترجمے کیے گئے۔ عقل عربی پک کر تیار ہوئی اور غور و فکر، بحث و تمحیص کے لیے ایک وسیع جولان گاہ پائی۔“ اس دور کے علمی کارناموں کا جائزہ لیتے وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ علم و فن کی وہ کونسی صنف ہے جو اپنے اندر شان انفرادیت نہیں رکھتی ہے، علوم قرآن، علوم حدیث، فقہ، نحو، علم لغت، معانی و بیان، تاریخ نویسی، جغرافیہ، فلسفہ اور طب یہ تمام موضوعات ایسے ہیں کہ جن میں اس دور کی خدمات روز

روشن کی طرح نمایاں ہیں۔ اس دور میں شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نویسی کے معیار کو کسی اعتبار سے کم تر نہیں کہا جاسکتا ہے۔

عبداللہ بن المقفع (۱۴۲ھ)، سہل بن ہارون (۲۱۵ھ)، جاحظ (۲۵۵ھ)، ابن العمید (۳۶۰ھ)، صاحب بن عباد (م ۳۸۵ھ)، قاضی فاضل (م ۵۹۶ھ)، ابو عبیدہ (م ۲۰۹ھ)، اصمعی (م ۲۱۶ھ)، ابن قتیبہ (م ۲۷۶ھ)، ابن رشید (م ۳۵۶ھ)، بدیع الزماں ہمدانی (م ۳۹۸ھ)، ابوالقاسم حریری (م ۵۱۶ھ) اور قدامہ بن جعفر (م ۳۳۷ھ) جیسے لوگوں نے اس صنف کو جلا بخشی اور انھیں لوگوں کی خدمات پر اس عہد کے نثری کارناموں کا شاندار محل تعمیر ہوا۔ اس کے باغ میں نئے نئے پھول کھلے اور اس گلشن کی بہار آج تک قابل رشک شمار کی جاتی ہے۔

عربی نثر کے ارتقا کے سلسلہ میں عصر عباسی اول ۱۳۲ تا ۲۳۲ھ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ نثر کے ارتقا میں دیگر علوم و فنون کے ترجموں سے مدد ملی۔ یونان، ایران اور ہندوستان کی ثقافتوں کا گہرا اثر عربی زبان و ادب پر پڑا اور عربی نثر نے ان اثرات کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ فلسفہ اور دیگر علوم کے مباحث کے لیے گنجائش پیدا ہوئی، غور و فکر کا معیار بلند ہوا اور تراجم کی بدولت دیگر زبانوں کے شاہکار عربی میں منتقل ہوئے جس سے عربی نثر میں ایک نئے رنگ کی آمیزش ہوئی اور اسے نئے فنون سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔

جس طرح سیاسی اور اجتماعی حالات کے اعتبار سے عباسی دور کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے اسی طرح اس دور کے انشا پردازوں کو بھی درج ذیل چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:

- ۱۔ پہلا دور ۱۳۲ تا ۲۳۲ھ، خلافت عباسی کے آغاز سے متوکل کی تخت نشینی تک۔
- ۲۔ دوسرا دور ۲۳۲ تا ۳۳۴ھ، متوکل کی تخت نشینی سے بنو بویہ کی حکومت کے قیام تک۔
- ۳۔ تیسرا دور ۳۳۴ تا ۴۴۷ھ، بنو بویہ کے غلبہ بغداد سے سلاجقہ کی آمد تک۔
- ۴۔ چوتھا دور ۴۴۷ تا ۶۵۶ھ، سلاجقہ کی حکومت سے تاتاریوں کے ہاتھوں تباہی بغداد تک۔

15.3.3 عہد عباسی کے نثر نگاران کے طبقات

عہد عباسی کے نثر نگاران کو حسب ذیل طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے:

پہلا طبقہ: اس طبقہ کا سردار ابن المقفع ہے۔ بقول حسن زیات ”اس کے اسلوب میں نیرنگی عبارت، جملوں کو (چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں) توڑنا، الفاظ میں ہم آہنگی، سہل پسندی، معانی کا زیادہ اہتمام اور سجع بندی سے گریز شامل ہیں“۔ اس طبقہ کے دیگر انشا پردازوں میں یعقوب بن داؤد، جعفر بن یحییٰ، حسن بن سہل، عمرو بن مسعدہ، سہل بن ہارون اور حسن بن وہب ہیں۔ اس طبقہ کے نثر نگاری کی وہی خصوصیات ہیں جو عبداللہ بن المقفع کے نثر کی ہیں۔

دوسرا طبقہ: اس طبقہ کا سردار جاحظ ہے، عبارت کے آسان اور پر شوکت ہونے میں اس کا اسلوب پہلے طبقہ کے اسلوب سے زیادہ مشابہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ مختصر جملے لکھنا، بات سے بات نکالتے چلے جانا (استطراد)، ایک جملہ کو بہت سے مقفلی یا غیر مقفلی فقروں میں توڑنا، الفاظ اور جملوں میں اطناب، قاری کی اکتاہٹ کو دور کرنے کے لیے سنجیدہ اور ٹھوس مضامین میں ظرافت اور ہنسی مذاق کی آمیزش، مضمون کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنا اور مطلب کو کھول کر بیان کرنا، عقل و منطق سے استدلال کے ساتھ ساتھ نقلی و عقلی دلائل سے استشہاد اور ثنائے عبارت میں

دعائیہ جملے لانا شامل ہیں۔ اس طبقہ کے دیگر لوگوں میں ابن قتیبہ (۲۷۶ھ)، مبرد (۲۸۵ھ) اور ابوبکر صولی (۳۳۵ھ) ہیں۔ تیسرا طبقہ: اس طبقہ کا سردار ابن العمید ہے۔ اس کا اسلوب نہایت دل نشین اور طبیعت کو موہ لینے اور وجدان پر قابو پالینے والا ہے۔ کہ وہ بالکل شاعرانہ طریقہ ہے، جس میں وزن کے علاوہ کسی چیز کی کمی نہیں ہے اور یہ طرز ادا اپنی لازمی قیود کی پابندی اور تمام اسالیب پر غالب آنے کی وجہ سے یورپ کے قدیم تقلیدی (مقبول عام) اسلوب سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ اس اسلوب کے لیے چھوٹے چھوٹے مسجع جملے، تجنیس (متشابہ وہم شکل الفاظ) تاریخ اور دیگر علوم کے لطائف کی آمیزش، اثنائے عبارت میں شعروں سے استشہاد، نفس مضمون کی سلامتی و عمدگی کے ساتھ تخیل و تشبیہ میں وسعت، لازمی قیود ہیں۔ اس اسلوب کو اپنانے والوں میں صاحب بن عباد (۳۸۵ھ)، وزیر مہلبی (۳۵۲ھ)، خوارزمی (م ۳۸۳ھ) بدیع الزماں ہمدانی (۳۹۸ھ)، صابی اور ثعلبلی (۴۲۹ھ) ہیں، مقامات اسی طبقہ کے آثار میں ہیں۔

چوتھا طبقہ: چوتھے طبقہ کا سردار قاضی فاضل ہے، اس کے اسلوب کی بنیاد سجع بندی اور بدیع پسندی میں تیسرے طبقہ کے اسلوب کے مطابق ہے لیکن توریہ (لفظی ہیر پھیر)، ابہام اور تجنیس میں اس نے اس قدر غلو کیا کہ اس کے زمانہ میں انشا پردازی محض تصنع و تکلفات کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔ اس طبقہ کی انشا پردازی کے الفاظ نہایت خوبصورت اور خوش نما ہوتے ہیں، لیکن مضمون ناقص اور خیال نامکمل۔ اس طرز کے انشا پردازوں میں المثل السائر مصنف ابن الاثیر (م ۶۳۷ھ)، کاتب اصہبانی (م ۵۶۱ھ) اور ابوالقاسم حریری (۵۱۶ھ) وغیرہ ہیں۔ حسن زیات نے مذکورہ بالا چاروں طبقات میں ہر طبقہ کی خدمات اس عہد کے اعتبار سے اہم اور ممتاز قرار دیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ انشا پردازوں کے اس عقیدہ نے کہ اسلاف سے منقول نثر کو حفظ کر لینا ثقافت و ادب کا لازمہ اور تفوق و برتری کا ذریعہ ہے، قلموں میں یگانگت باقی نہ رہنے دی اور اسالیب کو جدا جدا کر دیا، جس کی وجہ سے ایک ہی زمانہ میں انشا پردازی کے مختلف طریقے ہونے لگے۔ چنانچہ آپ کو جاحظ کے زمانہ میں ابن عبد ربہ جیسے ابن المقفع کے مقلد اور ابن العمید کے زمانہ میں شریف رضی جیسے امام علیؑ کے پیرو ملیں گے۔ لیکن بایں ہمہ تمام ہم عصر انشا پرداز اپنے سیاسی و اجتماعی حالات کے سامنے مجبور ہو جاتے ہیں اور ان کی انشا پردازی میں ایک مخصوص انداز پیدا ہو جاتا ہے جو ان کو دوسرے زمانوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔

15.4 نثر نگاری کے اصناف

عہد عباسی کے نثری ارتقا میں دیگر علوم و فنون کے ترجموں سے مدد ملی اور ارتقا کا یہ عمل نقل و ترجمہ سے مکمل ہوا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مشرق وسطیٰ کی قومیں جب عربوں سے رابطہ میں آئیں تو اپنی ثقافت اور علوم سے عربوں کو متعارف کرایا۔ عربی نثر کی ترقی میں تحریک ترجمہ کا نمایاں اثر پڑا اور ہر عمدہ کتاب کو عربی کے قالب میں ڈھالا گیا۔ اس دور میں لفظی ترجمہ پر زیادہ زور تھا لیکن دوسرے دور میں مترجمین کا میلان سلیس ترجمہ کی جانب ہوا۔ اس دور کے ترجمہ میں فصاحت اور روانی کی وجہ یہ تھی کہ علمائے لغت اور علمائے بیان کی کوششوں سے لوگ فصاحت و بلاغت کی شرطوں سے واقف ہونے لگے تھے؛ لیکن جب اہل عرب کا میل جول دیگر اقوام سے ہوا اور بالخصوص ایرانیوں کے اثرات غالب آنے لگے تو انھوں نے تکلف اور تصنع سے کام لینا شروع کر دیا اور ابجاز کے بجائے ان کی عبارتوں میں اطناب غالب آتا گیا۔ اس اختلاط اور اثر پذیری کے بعد عربی نثر ایک نئے رخ پر چل پڑی اور اس کی متعدد شاخیں وجود میں آئیں مثال کے طور پر علمی نثر، فلسفیانہ نثر، تاریخی نثر اور خالص ادبی نثر جو

ایک طرح سے قدیم نثر کا تسلسل تھی مگر اس کی بعض صورتیں اتنی نئی اور اچھوتی تھیں کہ عربوں نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ اسی کے ساتھ اس نثر نے لغوی اور شرعی علوم کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی، جس کے نتیجے میں ایک بڑا لغوی و دینی سرمایہ وجود میں آ گیا۔ اس عہد کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج بھی بیش تر فنون کے مآخذ اس دور کی تصنیفی یادگار ہیں۔

عہد عباسی میں نثر نگاری کو کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔ خطابت، مناظرے، علوم لسانیہ، تاریخ نویسی، علوم شرعیہ، فلسفہ اور علم کلام کے ساتھ ساتھ دیگر نثری اصناف کے لیے راہیں ہموار ہوئیں چنانچہ دفتری کاروائیاں، انشا و ترسیل کے لیے ترقی کا سبب بنیں تو قصص و حکایات سے لوگوں کی دلچسپی نے نثر کے دائرے میں مزید وسعت پیدا کی۔ نحو و صرف اور بلاغت کی تدوین سے زبان صاف ستھری ہو گئی، تاریخ، جغرافیہ، لغت نویسی، بلاغت و بیان، تصوف، فقہ و اصول فقہ، حدیث و اصول حدیث، فلسفہ، طب، کیمیا، نجوم اور خالص ادبی نثر کے بے شمار نمونے سامنے آئے۔ اب ضرورت اس بات کی محسوس ہوئی کہ معیاری اور غیر معیاری نمونوں کی شناخت ہو لہذا فن تنقید کے اصول و ضوابط کی تدوین ہوئی۔ نقد و نظر کا معیار متعین کرنے میں جاحظ کی البیان و التبيين، قدامہ بن جعفر کی نقد النثر، ابراہیم بن مدبر (م ۸۷۸ھ) کی تصنیف الرسالة العذراء اور اسحاق بن ابراہیم (م ۳۳۷ھ) کی کتاب البرهان فی وجوہ البیان کو اہمیت حاصل ہے۔

اس دور کی دیگر نثری اقسام میں مراسلہ نویسی، عہد نامے، وصایا اور توقعیات کو فروغ ہوا۔ دفتری خطوط لکھنے پر انہیں لوگوں کو مامور کیا جاتا تھا جن میں ادب کا ذوق اور بلاغت کا ملکہ ہوتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں کو مختلف علوم و فنون سے واقفیت ہوتی تھی۔ یہ مراسلات ملک کے انتظامی امور، حکام کے تقرر، خلفا کے لیے بیعت، فتوحات جہاد، ملک میں امن و امان اور حکام کو وصیت، لوگوں کو تہنیت یا تعزیت جیسے موضوعات پر مشتمل ہوتی تھیں۔

علوم و فنون کی یہ تاریخ ساز ترقی خود بخود پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے پس پشت حکمراں طبقہ کی تائید و اعانت شامل تھی۔ خلفا کی دیکھا دیکھی دیگر امرا اور ارباب ثروت بھی علمی مشاغل کی سرپرستی کرتے تھے۔ عباسیوں نے اور ارباب ثروت نے ادب نوازی میں جس کشادہ قلبی کا مظاہرہ کیا تھا اس کی بدولت مختلف علوم و فنون کی تدوین و ارتقا کے لیے راہیں ہموار ہوئیں۔ صاحبان تصنیف کو گراں قدر انعامات سے نوازا جاتا تھا ان کے لیے وظائف خاص تھے اور ملازمتوں میں ان کو ترجیح دی جاتی تھی۔ مدارس، مکاتب، لائبریریاں اور جامعات حکومت کے زیر انتظام قائم ہوئیں ان سب کا ثمرہ یہ تھا کہ تعلیم و تصنیف کو بے حد فروغ ہوا۔

15.4.1 خطابت

اس دور کے اوائل میں بھی سیاسی خطابت کا زور رہا کیونکہ بنو امیہ کی حکومت کو ختم کرنے اور اپنے حق خلافت کو ثابت کرنے کے لیے انہیں ایسے خطیبوں کی ضرورت تھی جو ان کے حق میں فضا ہموار کر سکیں۔ حکومت کو مستحکم کرنے، فوج کو جنگ پر آمادہ کرنے اور وفود کے خیر مقدم کرنے کے لیے خطابت کو قدر و منزلت حاصل تھی۔ عباسی خلفا میں منصور (م ۱۵۸ھ) مہدی (م ۱۶۹ھ)، ہارون رشید (م ۱۹۳ھ) اور مامون (م ۲۱۸ھ) کا شمار عمدہ خطیبوں میں ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ داؤد بن علی (م ۱۳۳ھ)، خالد بن صفوان (تقریباً ۱۳۳ھ) اور شیبیب بن شیبہ (م ۱۷۰ھ) میں خطابت کا بڑا ملکہ موجود تھا۔ جب عباسی حکومت پوری طرح مستحکم ہو گئی تو فن خطابت کی طرف عدم توجہ نے اس فن کو زوال پذیر

کردیا اور اس کی جگہ شاہی فرامین اور مکاتیب نے لے لی، خطبات صرف جمعہ، عیدین اور نکاح کے لیے محدود ہو گئے۔

اموی دور کی طرح عباسی دور میں بھی دینی خطابت اور وعظ گوئی کو ترقی ہوئی۔ واعظوں کی ایک بڑی تعداد بغداد، کوفہ اور بصرہ کے مساجد میں وعظ و نصیحت کا فریضہ انجام دیتی تھی، ان میں زہاد، فقہا، محدثین اور متکلمین ہر طرح کے لوگ تھے۔ یہ لوگ خلفا کی مجلسوں میں بھی وعظ و نصیحت کی خدمت انجام دیتے تھے۔ خلفاء کی مجالس میں وعظ و نصیحت کرنے والوں میں تین لوگوں کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ پہلا شخص خلیفہ منصور کا خطیب عمرو بن عبید معزلی (م ۱۴۴ھ)، دوسرا خلیفہ مہدی کا خطیب صالح بن عبد الجلیل اور تیسرا ہارون رشید کا خطیب ابن السماک (م ۳۴۴ھ) ہے۔

اس دور کے واعظین اپنے خطبوں میں آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ، اقوال صحابہ اور سابق واعظوں کے اقوال سے استشہاد کرتے تھے۔ جاحظ نے اپنی کتاب البیان والنبیین میں واعظین کا ذکر ایک مستقل فصل میں کیا ہے۔ ان واعظین کی وجہ سے نثر کو معنوی لحاظ سے کافی ترقی ہوئی کیونکہ یہ لوگ معنی آفرینی کے ساتھ دقیق نکات، منتخب الفاظ اور حسن اسلوب کے ساتھ کلام پیش کرتے تھے۔ ان واعظوں میں سب سے زیادہ شہرت موسیٰ بن سیار اسواری، صالح مزی، عمرو بن فائد اور قاسم بن یحییٰ ضریر کو حاصل ہوئی۔

15.4.2 توقیعات

توقیعات سے مراد وہ مختصر اور بلیغ نوٹ ہے جو توقع نگار بادشاہ یا وزیروں کے سامنے پیش کرتا تھا۔ خود خلفا اور وزرا بھی یہ نوٹ لکھتے تھے۔ خلفا میں سفاح، منصور اور ابن المعتز اور ان کی توقیعات مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ جعفر بن یحییٰ برکی (م ۸۰۳ھ) فضل بن سہل (م ۲۰۳ھ) احمد بن ابوطاہر طیفور (م ۲۸۰ھ) کو اس صنف میں مہارت حاصل تھی۔ بہت سے لوگ توقع میں کوئی آیت یا شعر بھی لکھ دیا کرتے تھے۔

15.4.3 مراسلات

اس کے علاوہ اخوانیات کے متعلق مراسلت کو بھی بے حد ترقی ہوئی۔ اس قسم کے مراسلت میں ان لوگوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوتی تھی جو، شوق، خوف، مدح، جھو، عتاب، اعتذار، تہنیت یا تعزیت کے مفہوم کے حامل ہوتے تھے۔ اموی دور میں یہ مضامین اشعار کے ذریعہ ادا کیے جاتے تھے لیکن عباسی دور میں نثر کا دائرہ وسیع ہو جانے کے بعد ان مضامین کو نثر میں ادا کرنا ممکن ہو گیا۔ اس قسم کے رسائل میں تعزیت کے موضوع پر رسائل کی کثرت ہے۔ عتاب میں ادیب مہذب انداز میں اپنے غصہ کا اظہار کرتا تھا۔ اس کی بہترین مثال ابن عمید (م ۳۶۰ھ) کے اس رسالہ میں دیکھی جاسکتی ہے جو اس نے ابن بلکا کو رکن الدولہ کی نافرمانی پر لکھا تھا۔ یہ رسائل (خطوط) کبھی تفریحی مجلسوں میں وقت گزاری، کبھی محض ملاقات اور وقت گزاری اور کبھی مبارکباد دینے کے لیے بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ اس دور کے رسائل کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عباسی دور کے ادبا ان تمام اصناف سخن کو اپنے رسائل میں استعمال کرتے تھے جنہیں شعرا نے اختیار کیا تھا حتیٰ کہ فطری مناظر کی عکاسی کے لیے بھی ان کا استعمال ہوا ہے۔

دیوانی مراسلہ نگاروں میں عمارۃ بن حمزہ، مسعدہ بن سعد، یحییٰ برکی، ابراہیم بن عباس صولی، جعفر بن یحییٰ برکی، محمد بن عبد الملک الزیات، سلیمان بن وہب اور حسن بن وہب وغیرہ مشہور ہیں۔

15.4.4 مناظرے

اس دور میں مناظروں کا بھی دور دورہ رہا۔ ابو الہذیل علاف (م ۲۲۷ھ)، نظام (م ۲۲۱ھ)، واصل بن عطا (م ۱۳۱ھ) اور عمرو بن عبید (م ۱۴۳ھ)۔ زیادہ شہرت کے حامل تھے۔ ان متکلمین نے اس زمانہ میں کوئی ایسی چیز نہ چھوڑی جس میں شک و شبہ اور بحث و مباحثہ کی گنجائش نہ ہو۔ جاحظ نے کتاب البیان والتبیین اور کتاب الحیوان میں ان کی فصاحت و بلاغت کو بجز سراہا ہے۔ مناظروں اور بحث و مباحثہ کے معیار کو برقرار رکھنے کی خواہش نے ان لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ علم بلاغت میں مہارت حاصل کریں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ کس طرح ایک متکلم اپنے مخالف کو زور بیان کی وجہ سے اپنی بات منوانے اور اسے ساکت کرنے میں مہارت حاصل کر سکتا ہے اور کس طرح وہ اپنے طرز بیان، منتخب الفاظ اور حسن ادا سے سامعین کو متاثر کر سکتا ہے۔ جاحظ کی کتاب الحیوان کا مطالعہ کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ایسا موضوع نہ ملے گا کہ جس سے انھوں نے تعرض نہ کیا ہو۔ یہ لوگ اپنے شاگردوں کو بھی مناظرے کی مشق کرواتے تھے جس میں وہ ان کی حرکات و سکنات، الفاظ و اقوال، اشارے و اصوات، قیاس و علل اور طریقہ استدلال کو جانچتے تھے اور ان کی خامیوں کی طرف اشارہ بھی کرتے تھے۔ ان متکلمین کے طفیل عربی زبان کے اسلوب میں بقول شوقی ضیف ”اس قدر چمک پیدا ہوئی کہ وہ دقیق معانی کی ادائیگی پر قادر ہوئی اور عباسی طرز اظہار کے بلیغ نمونے تخلیق کیے۔۔۔۔۔ دوسری صدی کے سبھی بڑے ادیب خواہ ان کا تعلق ابن المقفع جیسے مترجم کی جماعت سے ہو یا سہل بن ہارون کے گروہ سے سبھی اسی فصیح و بلیغ اسلوب کا استعمال کرتے تھے یہاں تک کہ یہ اسلوب جاحظ کے پاس آ کر اوج کمال کو پہنچ جاتا ہے۔“

15.4.5 مقامات

”مقامہ“ اس مختصر، دلچسپ اور خوش اسلوب حکایت کو کہتے ہیں کہ جس میں کوئی نصیحت یا لطیفہ ہو۔ یہ لفظ مقام سے ماخوذ ہے جس کے معنی کھڑے ہونے کی جگہ پھر اس کے معنوں میں وسعت پیدا کر کے اسے مجلس اور جگہ کے معنوں میں استعمال کیا گیا۔ بعد میں کثرت استعمال سے مجلس میں پڑھے جانے والے خطبے اور پند و نصائح کو بھی مقامہ یا مجلس کہا جانے لگا جیسے مقامات الخطباء، مقامات القصاص اور مقامات الزہاد۔ حکایت کی یہ صنف عہد عباسی کے وسط میں سامنے آئی اور اس کی ابتدا ابن فارس نے کی پھر اس کے شاگرد بدیع الزماں نے اسے اوج کمال تک پہنچایا۔ مقامہ سے مقصود نہ تو جمال حکایت ہے نہ حسن و عجز اور نہ افادہ علمی بلکہ وہ ایک فنی اور ادبی تحریر ہے جس میں نہ تو تخیل نفسی ہے نہ ہی فنی قصہ نگاری بلکہ مقامات لکھنے والوں کی زیادہ تر توجہ تحسین لفظی اور مسجع و مقفی عبارات لکھنے پر رہی جن کا اولین مقصد اپنے لسانی ملکہ کا اظہار کرنا تھا اور ثانیاً نوجوان ادا کو انشا پرداز کی مشق بہم پہنچانا۔ ابن القفطی کا یہ قول کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ ”انشا پرداز کی مشق اور نظم و نثر کے دوسرے اسالیب سے واقفیت کے سوا مقامات سے کوئی اور شے کی کشید نہیں کی جاسکتی۔“

مقامات کے دور رس اثرات عربی زبان و ادب پر مرتب ہوئے ہیں، ہمدانی کے ”ابلیسی مقامہ“ سے متاثر ہو کر ابن شہید اندلسی اور ابو العلاء معری نے عالم ما بعد الطبعیات کا اپنا سفر نامہ لکھا اور اس عالم کے حالات کو قوت و تخیل کے مدد سے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ مزید برآں یہی صنف آگے چل کر فن قصہ نگاری اور ناول نگاری کی بنیاد بن جاتی ہے۔

15.4.6 تنقید نگاری

عربوں میں تنقیدی شعور فطری طور پر پایا جاتا ہے، جس کے ہلکے اور دھندلے نقوش عہد عباسی سے ما قبل دور میں پائے جاتے ہیں، لیکن یہ فن بطور فن عصر عباسی میں پروان چڑھا تھا اور اس مقام و منزل پر پہنچ گیا تھا جس تک وہ زمانہ قدیم میں کبھی نہیں پہنچ سکا تھا۔ یہ بات بلا خوف و تردد کہی جاسکتی ہے کہ عصر جدید کو چھوڑ کر عربی تنقید کبھی بھی اس قدر بلند مقام پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس تنقیدی شعور کو پروان چڑھانے میں فصاحت قرآنی (اعجاز القرآن) کے اسرار و رموز نے اہم کردار ادا کیا ہے، قرآنی فصاحت و بلاغت کے مطالعے نے ادبی تنقید کا ایک نیا راستہ کھول دیا تھا، جس کے نتیجے میں ادبی تنقید کا ایک قابل ذکر سرمایہ سامنے آتا ہے۔

عہد عباسی میں تنقید کا ایک نیا رنگ سامنے آتا ہے کہ اسی عہد میں پہلی مرتبہ دو شاعروں کے درمیان موازنہ و مقارنہ کرنے کا چلن سامنے آیا جیسے آمدی کی کتاب ”الموازنة بين البحتري وأبي تمام“ وغیرہ۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ دو شعرا کے درمیان مقارنہ و موازنہ کے کچھ نمونے عہد جاہلی میں پائے جاتے ہیں، لیکن چونکہ وہ نتائج کسی قواعد و ضوابط پر مشتمل نہیں تھے، بلکہ صرف عربی الفاظ کے بہتر استعمال اور فیصلہ کرنے والے کے ادبی ذوق پر مشتمل ہوتے تھے، لہذا ان کا مقابلہ و موازنہ عہد عباسی کے ”ادب مقارن“ سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔

فن تنقید پر قلم اٹھانے والوں میں محمد بن سلام حمی (۲۳۲ھ) مؤلف ”طبقات فحول الشعراء“ اور جاحظ (۲۵۵ھ) مؤلف ”البيان والتبيين“ کے علاوہ ابن قتیبہ دینوری (۲۷۶ھ) مؤلف ”الشعر والشعراء“ ابو العباس محمد بن یزید مبرد (۲۸۶ھ) مؤلف ”الکامل“، ثعلب (۲۹۱ھ) مؤلف ”قواعد الشعر“، ابن معتر (۲۹۶ھ) مؤلف ”کتاب البديع“ اور ”طبقات ابن المعتز“، ابن طباطبا (۳۲۲ھ) مؤلف ”عیار الشعراء“، قدامہ بن جعفر (۳۳۷ھ) مؤلف ”نقد الشعر“، ابو الفرج اصفہانی (۳۵۶ھ) مؤلف ”کتاب الأغاني“، حسن بن بشر آمدی (۳۷۰ھ) مؤلف ”کتاب الموازنة بين البحتري وأبي تمام“ یا ”کتاب الموازنة بين الطائيين“، ابو عبید اللہ مرزبانی محمد بن عمران (۳۸۴ھ) مؤلف ”الموشح“، قاضی علی بن عبد العزیز جرجانی مؤلف ”الوساطة بين المتنبي وخصومه“، ابو ہلال عسکری (۳۹۵ھ) مؤلف ”کتاب الصناعتين“، ابن فارس (۳۹۵ھ) مؤلف ”ذم الخطأ في الشعر“، ابو منصور ثعالبی (۴۲۹ھ) مؤلف ”یتیمۃ الدهر“، ابن سنان خفاجی (۴۶۶ھ) مؤلف ”سر الفصاحة“، عبد القاهر جرجانی (۴۷۱ھ) مؤلف ”دلایل الإعجاز“ اور ”أسرار البلاغة“، اسامہ بن منقذ (۵۸۴ھ) مؤلف ”البديع في نقد الشعر“ اور ضیاء الدین ابن الأثیر (۶۳۷ھ) مؤلف ”المثل السائر“ وغیرہ جیسے باکمال اشخاص شامل ہیں۔

15.5 نمائندہ نثر نگار اور نمونہ کلام

عہد عباسی میں نثر نگاران نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور عربی سرمایہ علم و ادب میں کافی اہم، معتبر اور گراں قدر سرمایہ کا اضافہ کیا ہے۔ آئندہ سطور میں اس دور کے نمائندہ نثر نگاروں کی سوانحی جھلک، ان کے اسلوب اور فکری و فنی کاوشوں کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جا رہا ہے۔

15.5.1 ابن المقفع (۱۰۶-۱۴۲ھ)

یہ فارسی الاصل تھا اس کا نام روز بہ تھا، اس کا باپ داؤذ یہ ایران سے بصرہ آ گیا تھا اور ججان بن یوسف کے زمانہ میں لگان وصول کرنے

کے محکمہ میں ملازم تھا۔ کچھ مالی خرد برد کرنے کے جرم میں حجاج نے اسے اتنا مارا کہ اس کا ہاتھ خشک ہو گیا لہذا اسے مقفّع کے لقب سے پکارا جانے لگا اور اس کا بیٹا ابن المقفّع کہلایا۔ باپ تو مجوسی رہا لیکن بیٹے کی تربیت بچپن ہی سے اسلامی طریقہ پر ہوئی اور نوجوانی ہی میں اس نے فارسی اور عربی میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ خلیفہ منصور کے چچا عیسیٰ بن علی کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور اسلامی نام عبداللہ رکھا گیا۔

اس کے قتل کے سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اسے زندیقیت کی وجہ سے قتل کیا گیا، جب کہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کو قرآن کا مقابلہ کرنے اور زندیقوں کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی وجہ سے قتل کیا گیا۔ اسی طرح اس پر الحاد کا الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ محض دنیوی نفع کی خاطر مسلمان ہوا تھا چنانچہ ایک مرتبہ جب مجوسیوں کے آتش کدہ کے پاس سے گذرا تو اس نے یہ دو اشعار پڑھے تھے:

يا بيت عاتكة الذي أتعزل حذر العدى، وبك الفؤاد مؤكل

إني لأمنحك الصدود وإنني قسما إليك، مع الصدود لأميل

(اے عاتکہ کا گھر جس سے میں دشمنوں کے ڈر سے کنارہ کشی کر رہا ہوں مگر میرا دل تیرے ہی حوالہ ہے۔ تجھ سے بظاہر میں بے رخی کا اظہار کر رہا ہوں لیکن اس (بظاہر) اعراض کے (بباطن) میں تیری طرف مائل ہوں)۔

بعض حضرات کا خیال ہے اس کے قتل کی وجہ عیسیٰ بن علی کے بھائی اور منصور کے چچا عبداللہ بن علی کے سلسلہ میں امان نامہ تحریر کرنے میں خلیفہ کے لیے جس طرح کے سخت الفاظ کا استعمال کیا تھا وہی اس کی موت کا سبب بنا۔ خلیفہ کے اشارے پر سفیان بن معاویہ نے جو ابن المقفّع کا دشمن تھا اس کے اعضا و جوارح کاٹ کر دیکتے ہوئے تور کی نذر کر دیا۔ غالب گمان یہ ہے کہ اس کے قتل کی صحیح وجہ یہی ہے۔ یہ واقعہ ۱۴۲ھ، ۱۴۳ یا ۱۴۵ ہجری کا ہے۔ ابن المقفّع کی عمر اس وقت ۳۶ سال تھی۔

ابن المقفّع عربی اور فارسی دونوں زبانوں سے خوب واقف تھا اپنی ذکاوت و ذہانت اور وسعت معلومات کی بنا پر اس دور کی عربی اسلامی، فارسی، ہندی اور یونانی ثقافت کا جامع تھا۔ اصلاح معاشرت کے نقطہ نظر سے جس چیز کو اس نے مفید سمجھا، پہلوی اور دیگر زبانوں سے عربی میں منتقل کر دیا۔ پہلوی زبان سے ترجمہ کی کتابیں اخلاقی تعلیمات کے لیے مشہور ہیں جیسے الأدب الصغیر، الأدب الکبیر، الیتیمہ، رسالۃ الصحابة کا شمار اس کی اہم کتب میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ارسطو کی کتاب المقولات اور ہندی ادب سے ترجمہ شدہ کتاب کلیلۃ و دمنۃ بطور یادگار چھوڑی ہیں۔

ابن المقفّع کا شمار اپنے دور کے عظیم انشا پردازوں میں ہوتا ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے عربی زبان کے اصل مقومات کو باقی رکھتے ہوئے دیگر زبانوں کے تخیل و تصور اور عربی ذوق کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ وہ نہایت ذکی اور دانا شخص تھا۔ اس کا کلام پرشکوہ، سنجیدہ اور انتہائی آسان اسلوب پر مشتمل ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے اس سے بلاغت کے متعلق سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ ”بلاغت کی تعریف یہ ہے کہ جب اسے جاہل سنے تو یہ سمجھے کہ وہ بھی اس طرح کا کلام کہہ سکتا ہے“۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ ”سوقیانہ الفاظ سے دامن بچا کر سہل الفاظ کا استعمال کرو“۔

ابن المقفّع کا اسلوب فصاحت و بلاغت، سہل پسندی اور وضاحت پر قائم ہے۔ اس اسلوب کی خاصیت یہ تھی کہ اس میں الفاظ سے معانی جھلکتے تھے، اس کے یہاں نامانوس اور غریب الفاظ کے استعمال سے اجتناب پایا جاتا ہے، عمدہ الفاظ کا انتخاب، ایجاز و اختصار اس کی تخلیقات

کو ممتاز بناتی ہیں۔ اس کے یہاں قصوں اور کہانیوں کو اہم درجہ حاصل ہے۔ یہ قصے کبھی جانوروں اور کبھی انسانوں کی زبان میں بیان کیے جاتے ہیں۔ قصے کہانی یا ضرب الامثال پیش کرنے کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ وہ باتیں قاری کو ذہن نشین ہو جائیں۔ افہام و تفہیم کے معاملہ میں وہ قاری کو کمی کا احساس نہیں ہونے دیتا ہے۔ لغو اور فضولیات سے پرہیز کرتے ہوئے اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ قاری اس کی باتوں سے متاثر ہو۔

الحادوزندقیقت کے الزامات کے باوجود ابن المقفع لہو و لعب اور برائیوں سے دور رہتا تھا۔ وہ اپنے معاصرین کی توجہ کا مرکز تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے اس سے سوال کیا کہ: ”من أدبک“ (تم کو ادب کس نے سکھایا) اس نے جواب دیا ”نفسی، إذ رأیت من غیري حسناً أتیتہ وإن رأیت قبیحاً أتیتہ“ (مجھے میرے نفس نے ادب سکھایا ہے، جب میں کسی کو اچھا کام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو خود بھی اسے کرتا ہوں اور جب برا کام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اس سے پرہیز کرتا ہوں)۔

فن ترجمہ میں ”کلیلة و دمنة“ اس کا شاہ کار ہے۔ اس ہندی تصنیف کا ترجمہ جس خوش اسلوبی اور مہارت کے ساتھ اس نے کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے، صدیاں گزر گئیں لیکن اس کتاب کی اہمیت اور معنویت ہیں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اس کی نثر کا نمونہ:

”لا تترکن مباشرة جسم امرک، فیعود شأنک صغیراً ولا تلزم نفسک مباشرة الصغیر فیصیر الکبیر ضائعاً۔ واعلم أن رأیک لا یتسع لکل شیء ففرغہ للمہم، وأن لیلک ونہارک لا یتو عبان حاجتک وإن دأبت فیہما وانہ لیس إلى أدائہا سبیل مع حاجة جسدک إلى نصیبہ من الدعة فأحسن قسمتہما بین دعتک وعملک، واعلم إنک ماشغلت من رأیک فی غیر المہم أزرى بالمہم و ماشغلت من لیلک ونہارک فی غیر الحاجة أزرى بک فی الحاجة“

(بڑے کام کی انجام دہی سے گریز نہ کرو ورنہ تمہاری شان کم تر ہو جائے گی اور چھوٹے کام میں برابر نہ لگے رہو ورنہ بڑا کام ضائع ہو جائے گا اور جان لو کہ تمہاری عقل ہر چیز کا احاطہ نہیں کر سکتی، اس لیے اسے اہم کاموں کے لیے خالی رکھو، اور رات و دن تمہاری ضرورت کو محیط نہیں ہو سکتے خواہ تم مسلسل کام کرو، اور ضرورت کی تکمیل کے لیے جسم کو آرام کی بھی حاجت ہوگی، اس لیے رات و دن کے کام اور آرام کی مناسب تقسیم کرلو۔ اور یاد رکھو اگر عقل کو غیر اہم چیزوں میں مشغول رکھو گے تو اس سے اہم چیز کو نقصان پہنچے گا اور جس وقت کو بلا ضرورت گزارو گے ضرورت میں اس کا عیب تم کو لاحق ہوگا)

”ینبغی للعاقل أن لا یغفل عن التماس ما فی نفس أهله و ولده و إخوانه و صدیقہ عند کل أمر و فی کل لحظة و کلمة و عند القيام و القعود و علی کل حال فان ذلک کلہ یشہد علی ما فی القلوب“

مشہور اموی انشا پرداز عبدالحمید یحییٰ کا تب کی صحبت، عباسی دور میں نشوونما، فارسی ادب کا گہرا مطالعہ، ہندی اور یونانی ادب سے واقفیت اور عربی نثر و نظم کے وسیع مطالعہ نے ابن المقفع کے اسلوب کو نکھارنے میں مدد کی اور اس کا اسلوب ”السهل الممتنع“ کہلایا۔ ابن المقفع پہلا ادیب ہے کہ جس نے ایرانی، ہندی اور یونانی حکمت سے عربی زبان و ادب کو آشنا کیا، اخلاقیات اور سیاست کے موضوع پر قلم اٹھایا

اور اس انداز کا سب سے پہلا مترجم ہے۔ اس کا اسلوب جاہظ کی آمد تک مقبول عام رہا۔ افسوس ہے کہ یہ وہی صلاحیتوں والا ادیب صرف چھتیس سال کی عمر میں ہم سے چھین لیا گیا۔

15.5.2 سہل بن ہارون (م ۲۱۵ھ)

یہ بھی ابن المقفع کے مانند فارسی الاصل تھا۔ ابن الندیم کے قول کے مطابق بصرہ، واسط اور ابواز کے درمیان واقع ”دستیان“ میں پیدا ہوا۔ بعض لوگوں نے اس کے گاؤں کا نام ”میان“ لکھا ہے اور بعض کے خیال کے مطابق نیشاپور میں پیدا ہوا۔ تحصیل علم کے لیے بصرہ آیا پھر بغداد پہنچا۔ بیٹی برکی کا تقرب حاصل کر کے انشا و ترسیل کے محکمہ سے وابستہ ہو گیا، خلیفہ ہارون نے اسے ”دار الحکمة“ کانگراں مقرر کیا تھا۔ ۱۸۷ء میں برا مکہ کے زوال کے بعد فضل بن سہل کے ذریعہ مامون تک رسائی حاصل کی، جس کی لڑکی ”بوران“ مامون کے نکاح میں تھی۔ جب مامون نے ”دار الحکمة“ کو ایک بڑی اکیڈمی کی شکل دی تو اسے قبرص سے آنے والی فلسفہ کی کتابوں کے ترجمہ کانگراں بنا دیا۔ اور مامون کے زمانہ میں علما اور متکلمین پر مشتمل جو علمی مجالس منعقد ہوتی تھی اس میں سہل پابندی سے شریک ہوتا تھا۔ دار الحکمة ہی کی ملازمت کے دوران ۲۱۵ھ میں اس کی وفات ہوئی۔

سہل بن ہارون کو نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل تھی اور اپنے زمانہ کے دیگر مروجہ علوم میں دستگاہ تھی۔ وہ اپنے زمانہ میں حکمت و بلاغت کے لیے مشہور تھا۔ جاہظ نے اس کی قادر الکلامی، خطابت، فصاحت و بلاغت اور ادبی مہارت کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ وہ سہل سے ملتا رہتا تھا اور اس نے اس کے نوادرات و لطائف بھی نقل کیے ہیں۔ اس کی اصل شہرت رسائل نگاری کی بنا پر ہوئی۔ اس کے متعدد رسائل کا تذکرہ ملتا ہے جس میں بخل وغیرہ کے بارے میں اس نے خامہ فرسائی کی ہے۔ روایات میں سہل بن ہارون کی ذکاوت و ذہانت اور ظریفانہ مزاج کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کے اسلوب میں اور ”کتاب البخلاء“ میں جاہظ کے اسلوب میں بہت زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ جاہظ کا بیان ہے کہ جب وہ شروع میں کوئی کتاب لکھتا تھا تو لوگ اس کی پذیرائی نہیں کرتے تھے لیکن جب وہ اس سے کم تر درجہ کی کتاب لکھ کر سہل بن ہارون یا دوسرے مشہور مولفین کی طرف منسوب کر دیتا تھا تو لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

سہل بن ہارون کی بیش تر تحریریں ضائع ہو گئی ہیں۔ ”کلیلة و دمنة“ کے طرز پر اس نے دو کتابیں تصنیف کی تھیں۔ ایک کا نام ”ثعالبہ و عفرأء“ اور دوسری کا نام ”النمر و الثعلب“ ہے۔ مسعودی نے اول الذکر کتاب کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ حسن ترتیب کے لحاظ سے کلیلة و دمنة سے فائق ہے۔ جدید دور کے ایک محقق عبدالقادر مہیری کو کتاب ”النمر و الثعلب“ کا ایک نسخہ دستیاب ہوا تھا، انھوں نے تیونس یونیورسٹی کے مجلہ میں اس کتاب کے اقتباسات اور اس پر ایک مقدمہ شائع کیا ہے۔ اس قصہ کا مرکزی کردار تین جانوروں پر مشتمل ہے، ایک لومڑی، دوسرا بھیڑیا اور تیسرا چیتا۔ ان کے مابین پیش آنے والے واقعات کو سہل نے باریک بینی کے ساتھ ترتیب دیا ہے اور اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ بادشاہوں اور حاکموں کو حیوانات کی زبانی نصیحت کی جائے اور عدل و انصاف کی راہ پر چلنے کی ترغیب دی جائے۔ اسی طرح بعض کتابوں میں انسانوں کو مرکزی کردار بنایا گیا ہے مثلاً المخزومی و الہذلیة اور الوافق و العذراء۔

جاہظ نے کتاب البخلاء کے مقدمہ میں سہل کا ایک طویل رسالہ نقل کیا ہے جس میں سخاوت کے مقابلہ میں بخل تعریف کی گئی ہے۔

اس رسالہ میں اس نے کلام نبی ﷺ اور صحابہ و تابعین، قدیم اقوال و امثال سے منقول حکمت کو ذکر کر کے استدلال کیا ہے۔ رسالہ کے مضامین سے اس زمانہ کے کلامی جدل و مناظرہ کا رنگ بھی نمایاں ہوتا ہے۔ جاہظ اور سہل بن ہارون کے اسلوب میں اس قدر مماثلت ہے کہ اگر جاہظ خود اس رسالہ کو سہل کی جانب منسوب نہ کرتا تو اسے جاہظ ہی کی تحریر سمجھا جاتا۔ سہل کے مذکورہ رسالہ سے کچھ نمونے:

”عبتموني حين زعمت اني أقدم المال على العلم، لأن المال يقاد به العلم، وبه تقوم النفوس قبل أن تعرف فضل العلم فهو أصل والأصل أحق بالترتيب من الفرع... وقلتم: كيف تقول هذا وقد قيل لرئيس الحكماء ومقدم الأدياء: أفضل العلماء أم الأغنياء؟ قال: بل العلماء، قيل: فما بال العلماء يأتون باب الأغنياء أكثر مما يأتى الأغنياء أبواب العلماء قال لمعرفة العلماء بفضل الغنى ولجهل الأغنياء بفضل العلم...“

(مال کو علم پر مقدم کرنے کی وجہ سے تم لوگ مجھ سے ناراض ہو مگر درحقیقت مال کے ذریعہ علم کی قیادت اور نفوس کی درستگی ہوتی ہے خواہ وہ علم کی فضیلت سے واقف نہ ہوں اس طرح مال اصل ہے اور اصل ہی کو فضیلت حاصل ہوتی ہے بہ نسبت شاخ کے..... تم یہ کہتے ہو کہ عقل مندوں کے سرداروں اور اادیوں کے پیش رو اشخاص سے سوال کیا گیا کہ: علماء افضل ہیں یا مالدار؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ علماء کہا گیا کہ علماء مالداروں کے دروازوں پر زیادہ جاتے ہیں جب کہ مالدار علماء کے دروازہ پر کم، جواب ملا کہ علماء کو مالداری کی فضیلت معلوم ہے اور مال دار علم کی فضیلت سے ناواقف ہیں.....)

اس کے ایک خط کا نمونہ:

”بسم الله الرحمن الرحيم۔ أصلح الله أمركم، وجمع شملكم و علمكم الخير و جعلكم من أهله، قال الأحنف بن قيس: يامعشر بنى تميم لا تسرعوا إلى الفتننة، فان أسرع الناس ألى القتال أقلهم حياء من الفرار، وقد كانوا يقولون إذا أردت أن ترى العيوب جمة فتأمل عتابا، فإنه إنما يعيب بفضل ما فيه من العيب، وأول العيب أن تعيب مالم يسبب، وما أوردنا بما قلنا إلا هدايتكم وتقويمكم وإصلاح فسادكم، وإبقاء النعمة عليكم، ولنن اخطأنا سبيل إرشادكم، فما أخطأنا سبيل حسن النية فيما بيننا وبينكم...“

(شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ تمہاری اصلاح کرے، تمہارے اندر اتحاد پیدا کرے، تمہیں خیر کی تعلیم دے اور اہل خیر بنائے۔ احنف بن قیس نے بنو تميم سے کہا کہ تم فتنہ کی طرف سبقت مت کرو، جو لوگ کشت و خون کی طرف سبقت کرتے ہیں وہ راہ فرار اختیار کرنے میں کم شرمندگی کا احساس کرتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر لوگوں کی خامیوں کو دیکھنا چاہتے ہو تو عیب جوئی کرنے والے کو دیکھو کیونکہ وہ اپنے عیب کی روشنی میں دوسروں کی عیب جوئی کرتا ہے، سب سے پہلا عیب یہ ہے کہ وہ ایسی چیز کو عیب بتاتا ہے جو عیب نہیں ہے۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس سے تمہاری اصلاح اور تمہاری نعمتوں کا دوام مقصود ہے، ہو سکتا ہے کہ ہم تمہیں صحیح راہ دکھانے میں بھٹک جائیں لیکن تمہارے لیے ہماری نیت میں کھوٹ نہیں ہے.....)

”سہل بن ہارون کی دیگر تحریروں میں فکری ہم آہنگی اور صوتی تنوع بغیر کسی تکلف کے بیک وقت پائی جاتی ہے۔ الفاظ و معانی کے

انتخاب نے اسے صف اول کے ادیبوں میں لاکھڑا کر دیا تھا اور یہ کسی حد تک درست کہا گیا ہے کہ سہل بن ہارون وہ بیچ تھا جس کا درخت جاحظ کی شکل میں منظر عام پر آیا۔“

15.5.3 ابراہیم بن عباس بن محمد صولی (۱۷۶-۲۴۳)

صولی اپنے زمانہ کا مشہور ادیب تھا۔ خراسانی النسل تھا اور اس کا دادا ”اصول“ مجوسی تھا۔ اسی کی طرف نسبت کی وجہ سے وہ صولی کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ حجاج کے جانب سے خراسان میں متعین گورنر یزید بن مہلب کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ اس کے لڑکے عباس کے دو بیٹے تھے بڑا عبداللہ اور چھوٹا ابراہیم۔ ان کی ماں مشہور شاعر عباس بن احنف بن قیس کی بہن تھیں۔ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ علما و شعرا کے حلقہ میں شریک ہوتا تھا جس سے اس کی زبان پختہ ہوئی اور شاعری میں نکھار آیا۔

ابوالقاسم حمزہ بن یوسف نے ”تاریخ جرجان“ میں لکھا ہے کہ ”ابراہیم صولی جرجانی الاصل ہے اور صول جرجان کا ایک علاقہ ہے۔ یہ اپنے زمانہ کا مشہور شاعر اور انشا پرداز تھا۔ ابراہیم اور اس کے بھائی عبداللہ کا تعلق ذوالریاستین فضل بن سہل سے ہوا جس نے ابراہیم کو سرکاری امور کے شعبہ میں ملازمت دے دی اور وہ یہاں مختلف عہدوں پر وفات تک کام کرتا رہا۔ خلیفہ واثق کے زمانہ میں کچھ دنوں کے لیے ابواز کا گورنر بھی رہا۔ اس کی شاعرانہ صلاحیت اور انشا پردازی کا اعتراف معاصرین اور متاخرین نے کیا ہے۔ وہ شعر کہنے کے بعد اس پر مسلسل نظر ثانی کرتا رہتا تھا اور معمولی درمیانہ درجہ کے اشعار کو قلم زد کر دیتا تھا حتیٰ کہ کبھی کبھی ایک یا دو اشعار باقی رہ جاتے تھے۔ اس کی شاعری کے بارے میں مشہور شاعر دعبیل بن علی خزاعی کا کہنا تھا کہ اگر ابراہیم بن عباس شاعری کو ذریعہ بنالیتا تو ہمیں کچھ اور کرنا پڑتا۔ ابن الجراح کا بیان ہے کہ اپنے ہم عصر انشا پردازوں میں سب سے بڑا شاعر تھا، اس کی زبان میں رقت اور شیرینی تھی اور احوال زمانہ کے منظر کشی میں اس کا کوئی مثل نہ تھا۔ اسی طرح انشا پردازی میں وہ عبارت پر توجہ دیتا تھا۔ انتہائی سوچ سمجھ کر ایسے عمدہ الفاظ کا انتخاب کرتا تھا جو دقیق معانی پر مشتمل ہوتے تھے، اس کے جملوں میں باہمی ربط کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ خود اس کا کہنا تھا کہ ”میں نے اپنی تحریروں میں صرف انہیں چیزوں کو پیش کیا ہے جن کی طرف میرا دل مائل ہوا اور جن سے میرے سینہ میں ایک جذبہ موجزن ہوا۔“

خلیفہ متوکل کے زمانہ میں باغی اسماعیل بن اسحق کوشالی آرمینیا میں بغاوت اور آتش زنی کے بعد اس کے قتل کو ایک مکتوب میں جس طرح بیان کرتا ہے وہ اس کی فصاحت و بلاغت کو نمایاں کرتی ہے۔ اس نے دشمنان خدا کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے اور عبارت میں صنعت طباق کا مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے جیسے رضاع کے ساتھ فطام، مز کے ساتھ حلو، ذل کے ساتھ عز اور حسرت کے ساتھ مسرت وغیرہ۔

صولی کے مکتوب میں منظر نگاری کا فن بھی واضح طور پر سامنے آتا ہے مثلاً نافرمانی کو اس نے ایسی ماں قرار دیا ہے جو اپنی اولاد یعنی باغیوں اور سرکشوں کی پرورش کرتی ہے اور نافرمانی اختیار کرنے کے لیے سبز باغ دکھاتی ہے لیکن سب کا انجام برا ہوتا ہے اور اس فتنہ کو اس نے جہنم قرار دیا ہے جس کے بھڑکتے ہوئے شعلے ہر ایک کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں، باغی کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے اور وہ درندوں کی غذا بن جاتا ہے یہ تو دنیا کا معاملہ ہے جب کہ آخرت میں وہ جہنم کا ایندھن بنتا ہے۔

صولی کو مختصر نویسی پر بھی عبور حاصل تھا۔ فارسی اثرات کی وجہ سے انشا پرداز اطباب کی طرف مائل ہو رہے تھے، جو بات پہلے

دو چار جملوں میں کہہ دی جاتی تھی اس کے لیے اب طویل عبارتیں لکھی جانے لگی تھیں۔ عربی زبان نے فارسی کے بہت سے اسالیب کو بھی اختیار کر لیا تھا مثلاً مرسل الیہ کو بڑے بڑے القاب لکھنا، مخاطب سے تکلف اور ادب سے گفتگو کرنا، ایک مطلب کو بہت سے الفاظ اور مترادف جملوں میں ادا کرنا۔ اس خدشہ کا احساس کرتے ہوئے کہ پر نویسی عربی زبان میں فساد اور بگاڑ نہ پیدا کر دے بعض ادیب اور انشا پرداز لوگوں کو مختصر نویسی کی دعوت دیتے تھے۔ اس کو ترجیح دینے کے سلسلہ میں جعفر بن یحییٰ کا قول تھا: ”إذا استطعتم ان نکون کتبکم کالتوقیعات فافعلوا“ (اگر تم اپنے خطوط کو مختصر نوٹ کی طرح لکھ سکتے ہو تو ایسا ہی کرو)۔ صولی کو چونکہ انشا پردازی پر پوری قدرت تھی اس لیے اس نے طویل اور مختصر دونوں طرح کے رسائل میں اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اہل حمص کے ۲۴۰ھ میں متوکل کے خلاف بغاوت کرنے پر جو خط اس نے لکھا ہے اس سے اس کی ایجاز نویسی پر مکمل قدرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

أما بعد فإن امیر المؤمنین یری من حق اللہ علیہ، مما قوم به من اود، و عدل به من زیغ، و لم به من منتشر، استعمال
ثلاث، یقدم بعضهن علی بعض، أو لاهن ما یتقدم به من تنبیه و توقیف، ثم ما یتسطهر به من تحذیر و تحویف ثم
الشی لا یقع جسم الداء بغیرها:

أنا فإن لم تغن عقب بعدها و عیدا، فإن لم یغن أغنت عزائمہ

(امابعد، امیر المؤمنین اپنے اوپر اللہ کا حق سمجھتے ہوئے ٹیڑھے کو سیدھا کرنے، کچی کو درست کرنے اور منتشر کو جمع کرنے میں تین طریقے اختیار کرتا ہے۔ کسی کو پہلے اور کسی کو بعد۔ سب سے پہلے وہ متنبہ اور خبردار کرتا ہے، پھر ڈراتے اور دھمکاتے ہیں اور اس کے بعد مرض کو ختم کرنے کے لیے آخری تدبیر استعمال کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے: پہلے بربادی سے کام لیتا ہے، اس سے فائدہ نہ ہو تو دھمکی دیتا ہے اور اگر یہ بھی کارگر نہ ہو تو اس کا پختہ ارادہ کام دیتا ہے۔

متوکل اس خط سے بہت خوش ہوا اور اپنے وزیر عبداللہ بن یحییٰ بن خاقان کی جانب اشارہ کر کے کہا کہ سن رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ امیر المؤمنین ابراہیم میں ایک خوبی ہے جسے اللہ نے آپ کے لیے چھپا رکھا تھا اور آپ کی حکومت کے لیے ذخیرہ کر رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کسی مکتوب میں عباسی خلفا کے متعلق استعمال ہونے والا یہ پہلا شعر ہے۔ ابن الزیات سے عفو کا طالب ہو کر یہ لکھتا ہے:

”کتبت وقد بلغت المدیة المحزّ و عدت الأیام علی بعد عداوی بک علیها و کان أكثر خوفا فی أن تسکن فی
وقت حرکتها و تکف عند أذاتها، حضرت اصتر علی منها، فکف الصدیق عن نصرتی خوفا منک و بادر إلی
العدو تقربا إلیک“

(میں یہ مکتوب ارسال کر رہا ہوں درآں حالیکہ معاملات دگرگوں ہو چکے ہیں اور آپ کی ناراضگی کے بعد زمانہ میرا دشمن ہو گیا ہے، میرا گمان یہ تھا آپ زمانہ کے حرکت میں آنے کے بعد خاموش ہو جائیں گے اور زمانہ کے تکلیف پہنچاتے وقت ہاتھ روک لیں گے لیکن آپ میرے لیے اس سے زیادہ ضرر رساں ہو گئے، لہذا دوست آپ کے ڈر سے میری مدد سے رک گئے اور دشمن آپ کا قرب حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑے)۔

مسعودی نے ابراہیم کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: ”مثل اصحاب السلطان مثل قوم علوا جلا ثم وقعوا منه، فکان اقرب بهم الی التلف

العبدھم فی الارتقاء“ (بادشاہ کے مصاحبوں کا حال پہاڑ پر چڑھ کر گرنے والوں کی طرح ہے جو زیادہ اوپر جائے گا گرنے میں اسے زیادہ نقصان کا سامنا کرنا ہوگا)۔

اپنے مختصر رسائل میں ابراہیم کو مافی الضمیر ادا کرنے پر قدرت کاملہ حاصل تھی اور اس کے ان رسائل کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی خط کے بجائے صرف امثال و حکم پر مشتمل یہ عبارت ہے جن میں مہارت کے ساتھ اپنے مطمح نظر کی وضاحت کردی گئی ہے۔ وہ جس پایہ کا انشا پرداز تھا اسی پایہ کا شاعر بھی تھا، اپنے مکاتیب میں جگہ جگہ وہ اپنے اشعار کا استعمال کرتا تھا جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ شعر کہنے کے بعد وہ اس میں کاٹ چھانٹ کرتا رہتا تھا اور اکثر اوقات بیش تر حصہ کو قلم زد کر دیا کرتا تھا۔ گھوڑے کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

ولكن الجواد أباهشام وفي العهد مأمون المغيب
بطي عندما استغيث عنه وطلاع عليك مع الخطوب

اپنے بھائی عبداللہ بن عباس صولی کے متعلق کہتا ہے:

ولكن عبد الله لما حوى الغنى	وصار له من بين إخوانه مال
رأى خلته منهم تسدُ بماله	فساهمهم حتى استوت بهم الحال

حسن بن وہب کی مخمور آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہتا ہے:

عيناك قد حكما مبيتك كيف كنت وكيف كانا
ولرب عين قد أرتك مبيت صاحبها عيانا

ابراہیم بن عباس صولی کی تصانیف ابن ندیم کے مطابق درج ذیل ہیں: کتاب دیوان الرسائل، کتاب دیوان الشعر، کتاب

الدولة، کتاب الطبیخ اور کتاب العطر ہیں۔ اس کی وفات ماہ شعبان ۲۴۳ھ میں سامرا میں ہوئی۔

15.5.4 جاحظ (۱۵۹ھ-۲۵۵ھ)

ابو عثمان عمرو بن بحر بن محبوب کنانی کی پیدائش راج قول کے مطابق ۱۵۹ء میں ہوئی۔ اس کی پیدائش کے سال کے متعلق مؤرخین تاریخ ادب عربی کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے لیکن تمام سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ اس کی وفات ۲۵۵ھ میں ہوئی تھی۔ جاحظ بصرہ میں پیدا ہوا اور وہیں نشوونما ہوئی۔ ابتدائی زندگی کے متعلق بہت زیادہ تفصیلات کا علم نہیں ہوتا ہے۔ کتاب الحیوان کے دوسرے حصہ میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ مکتب میں اس زمانہ کے مروجہ علوم حاصل کرنے جاتا تھا۔ پھر مسجد میں علما کے حلقہ درس میں شریک ہونے کے ساتھ ساتھ۔ بصرہ کے ”مرید“ نامی بازار میں فصحاء عرب سے لغت و شعر کا علم حاصل کرنے جایا کرتا تھا۔ تنگدستی کی وجہ سے اسے دریائے سیحون کے پاس مچھلی اور روٹی فروخت کرنی پڑی مگر اس کے باوجود حصول علم میں منہمک رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ”اس کے ہاتھوں میں جو بھی کتاب آتی تھی وہ اسے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالتا تھا۔ ابن ندیم کی روایت کے مطابق وہ کتب فروشوں کی دکانوں کو رات بھر کے لیے کرایہ پر لیتا تھا اور وہاں پوری رات کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتا تھا۔

چونکہ وہ بے ڈول جسم، بد شکل اور ابھری ہوئی بد وضع آنکھوں والا شخص تھا لہذا اس کا لقب ”جاحظ“ پڑ گیا۔ اس کی بد صورتی کے متعلق

بہت سے قصے مشہور ہیں اور بہت سے مواقع پر اس کو اپنی بد صورتی کی وجہ سے خفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی غیر معمولی شہرت اور قابلیت کا چرچا سن کر خلیفہ متوکل نے چاہا کہ اسے اپنے لڑکے کا اتالیق بنائے، چنانچہ جب جاحظ خلیفہ کے یہاں ”سرمن رای“ پہنچا تو اس نے اس کی شکل کو دیکھ کر دس ہزار درہم دے کر واپس کر دیا۔

جاحظ مذہباً معتزلی تھا اور ابراہیم نظام کا شاگرد تھا اور اس سے بہت متاثر تھا۔ معتزلہ کا ایک فرقہ جاحظ کی نسبت سے ”جاحظیہ“ مشہور ہوا۔ نظام کے علاوہ اس نے بشر بن معتمر، ثمامہ بن اسرث اور ابو ہذیل علاف جیسے معتزلیوں کی کتاب الحیوان میں جگہ جگہ تعریف کی ہے۔ اس کے عقائد اور مذہبی خیالات کی جھلکیاں اس کی تصانیف میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔

جاحظ بلاشبہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا ادیب تھا جس کا اسلوب واضح، طرز استدلال مضبوط اور معنی آفرینی کی قوت لامحدود تھی۔ نثر نگاری میں وہ ایک نئے طرز کا موجد بھی تھا اور خاتم بھی۔ معلومات نثر و نظم کے مختلف اصناف پر اس کو عبور حاصل تھا۔ جدت پسندی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کی عبارت فصاحت و بلاغت اور سلاست کی حامل ہے۔ نثر نویسی میں علمی مباحث اور فلسفیانہ خیالات کے اظہار میں اس کا قلم جو جو ہر دکھاتا ہے اس کی مثال دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ ظرافت اور مزاح کے میدان میں اس کی مہارت قابل دید ہے۔ البتہ نظم کے سلسلہ میں بعض حضرات کی رائے ہے کہ وہ عامیانہ درجہ کی ہیں۔ لیکن احمد امین کے بقول ”جاحظ کی تمام نثری تالیفات اگر ہمارے سامنے ہوتیں تو ایک دائرہ معارف کا وجود سامنے آتا۔ اس کے کہے ہوئے محفوظ چند اشعار سے یہ فیصلہ کر لینا کہ اس کی شاعری معمولی درجہ کی تھی بہر حال انصاف نہیں ہے۔“

اس کے یہاں حکایتی نثر کے نمونے بھی ملتے ہیں، جسے ہم افسانہ یا ناول سے مشابہ کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح کی تحریروں میں اس نے بڑی مہارت کے ساتھ شخصیات اور ان کے طبعی احوال و عادات کی عکاسی کی ہے۔ کتاب الحیوان میں ”قاضی اور مکھی“ کی جو حکایت ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح جاحظ کو جسمانی حرکات اور انسانی نفس کے احساسات کی ترجمانی پر قدرت حاصل تھی۔ اس حکایت کے پہلے حصہ میں قاضی عبداللہ ابن سوار کے وقار، سنجیدگی اور نفس پر قدرت کا ذکر ہے۔ حکایت کے دوسرے حصہ میں اس مکھی کا تذکرہ ہے جو قاضی کے جسم پر جگہ جگہ بیٹھ کر اسے پریشان کر رہی تھی اور تیسرے حصہ میں حاضرین کے مشاہدہ کا ذکر ہے کہ قاضی اس چھوٹے سے جانور کی وجہ سے کس طرح اپنی معتاد ہیئت کو چھوڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔

جاحظ نے کوئی ایسا موضوع نہیں چھوڑا جس پر اس نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ اس نے نباتات، اشجار، حیوانات، انسان، زندگی و آخرت، طنز و مزاح، ترکوں اور سوڈانیوں، اساتذہ، غلاموں، باندیوں، عشق و محبت، عورتوں و بچوں، نبیذ و شراب، عباسیوں، زیدیوں، نصاریٰ کی تردید، اثبات نبوت، نظم قرآن، فصاحت و بلاغت، ڈاکوؤں، چوروں اور بخیلوں کے بارے میں کتابیں لکھیں۔ اس نے متعدد چیزوں کی تعریف میں مضامین لکھے اور پھر انہیں چیزوں کی برائی میں کتابیں لکھی ہیں اور کمال یہ ہے کہ دونوں کو پڑھنے کے بعد اس کی تحریروں میں تضاد نظر نہیں آتا ہے۔ اس نے رسالہ فی مدح الكتاب لکھا تو رسالہ فی ذم الكتاب بھی لکھ دیا۔ مغنیہ عورتوں کی تعریف میں جہاں رسالہ فی مدح القیان لکھا تو ان کی برائی میں رسالہ فی ذم القیان لکھ دیا۔ دونوں جگہ اس نے ایسے ایسے دلائل پیش کیے ہیں کہ ان متضاد کتابوں کو پڑھنے کے بعد کسی بھی

جگہ کوئی بات خلاف واقعہ نظر نہیں آتی ہے، یہی اس کا کمال ہے۔

جاہظ کے یہاں لطائف و نوادر کی کثرت ہے اور اس سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری کی دلچسپی نفس مضمون میں برقرار رہے۔ پوری کتاب البخلاء لطائف و نوادر سے بھری ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اس نے معاشرہ کے مختلف لوگوں کے احوال و رجحانات، کھانے پینے کے طور و طریقوں اور سخاوت اور بخل کی فضیلت کو بیان کیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ہم کو جاہظ کے بخیلوں سے نفرت نہیں ہوتی ہے بلکہ ایک طرح کی انسیت کا احساس ہوتا ہے اسی وجہ سے کتاب کے بخیل ”طیاب البخلاء“ کہے جاتے ہیں۔ لطائف و نوادر پر دوسری کتاب ”نوادیر المعلمین“ ہے جس میں معلمین کی حماقتوں اور کم عقلوں کا تذکرہ ہے۔ تیسری کتاب ”النوکی والحمقی“ ہے۔ وہ ظرافت پسندی میں خود اپنی ذات اور شکل کو بھی نشانہ بنا لیتا ہے، چنانچہ اس کا بیان ہے کہ ”مجھے ایک عورت نے جس طرح شرم سار کیا ویسی خفت مجھے کبھی نہیں ہوئی۔ وہ مجھے ایک سنار کے پاس لے گئی اور ”کمثل هذا“ (اس طرح) کہہ کر غائب ہو گئی، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے سنار سے استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ یہ عورت شیطان کی تصویر بنوانا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں نے شیطان کو دیکھا نہیں، اس کی تصویر کیسے بنا سکتا ہوں۔ اب اس نے بطور نمونہ تمہیں لا کر پیش کر دیا۔“

جاہظ نے ”کتاب الحیوان“ لکھ کر ابن الزیات کے سامنے پیش کیا تو اس نے اسے پانچ ہزار دینار عطا کیے۔ قاضی ابن داود نے کتاب ”البيان والتبيين“ پر پانچ ہزار دینار دیا، ابراہیم بن عباس الصولی نے ”کتاب الزرع والنمل“ پر پانچ ہزار دینار عطا کیے، وزیر فتح بن خاقان کے لیے ”فضائل الترك“ نامی رسالہ مرتب کیا تو اس نے حکومت کے خزانہ سے باقاعدہ وظیفہ جاری کروا دیا۔

جاہظ کی کتابوں کے سلسلہ میں ابو عبد اللہ بن حمودز بیدی اندلسی کا کہنا تھا ”رضیت فی الجنة بکتب الجاحظ عو ضاعن نعیمہا“ (میں جنت میں جنت کی نعمتوں کے عوض جاہظ کی کتابوں سے راضی ہو جاؤں گا)۔ یاقوت حموی، ابو عبد الرحمن انباری، ابن العمید، مسعودی، ابو منصور ازہری، ابن قتیبہ اور ابن خلدون وغیرہ قدما میں اور سعد زغلول، احمد امین، شوقی ضیف، احمد حسن زیات، جرجی زیدان وغیرہ جدید دور کے ادبا میں اور گولڈز بیہر، نکلسن، اور ہٹی وغیرہ مستشرقین میں اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

اس کی مولفات کی تعداد دوسو سے زیادہ بتائی جاتی ہے جن میں کتاب الحیوان، کتاب البیان والتبيين، کتاب البخلاء، المحاسن والاضداد، اخلاق الملوک، رسائل الجاحظ اور العجائب والغرائب ادب کی مشہور اور اہم کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ ادب میں اس کا نمایاں اسلوب اور اس کی گراں قدر تصانیف اس کے نام کو باقی رکھنے، اس کے ادب کو مرجع خلائق بنانے اور اس کی تقلید کو قابل فخر بنانے کے لیے کافی ہیں۔

کتاب الحیوان کا آغاز اس عبارت سے کرتا ہے:

”جنبك الله الشبهة وعصمك من الحيرة وجعل بينك وبين المعرفة نسبا وبين الصدق سببا، وحب إليك التثبت وزين في عينك الإنصاف وأذاقك حلاوة التقوى وأشعر قلبك عز الحق وأودع صدرك برد اليقين وطر د عنك ذل اليأس و عرفك مافي الباطل من الذلة ومافي الجهل من القلة“۔

(اللہ تمہیں شک و شبہ سے بچائے اور سرگردانی سے محفوظ رکھے، تمہارے اور علم و معرفت و راست بازی کے درمیان تعلق بنائے، معاملات میں چھان بین کو تمہارے پاس محبوب بنائے، تمہاری نگاہوں میں انصاف کو مزین کرے، دل کو تقویٰ کی شیرینی سے آشنا کرے اور حق کی قدر و منزلت کا تمہارے دل میں احساس پیدا کرے، تمہارے دل کو یقین کا سکون و اطمینان بخشنے، ناامیدی کی ذلت کو دور کرے، باطل کی ذلت اور جہالت کے نقص کا تم کو ادراک بخشنے)

کتاب البخلاء سے نثر کا نمونہ:

”قال: في قولهم بخيل تشييت لإقامة المال في ملكه، وفي قولهم سخي أخبار عن خروج المال من ملكه. و رسم البخيل اسم فيه حفظ و ذم و اسم السخي فيه تضييع و حمد، و المال زاهر نافع مكرم لأهله معز و الحمد، و سخرية...“

(اس نے جواب دیا کہ لوگوں کے ”بخیل“ کہنے میں مال کو اس کی ملکیت میں ثابت کرنا ہے اور سخی کہنے میں اس بات کی اطلاع ہے کہ مال اس کی ملکیت سے نکل گیا۔ بخیل نام حفاظت اور برائی ہے، سخی نام میں بربادی اور تعریف ہے۔ مال نفع بخش اور عزت دینے والا ہوتا ہے جب کہ تعریف ہو اور مذاق ہے)۔

15.5.5 ابن قتیبہ (۲۱۳-۲۷۶ھ)

ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ کوفہ میں پیدا ہوا، عرصہ تک بغداد میں مقیم رہا، دینور میں منصب قضاء پر فائز ہوا تو اس کی نسبت سے دینوری کہلایا۔ مکتب کی تعلیم کے دوران قرآن، حدیث، اشعار، فقہ، نحو کی تعلیم حاصل کی پھر اجداد کی مساجد کے حلقہ درس میں شریک ہو کر لغوی اور شرعی علوم کی تکمیل کی۔ اس کے مشہور اساتذہ میں اصمعی، ابو حاتم، ابو عبید، ابن الاعرابی اور ابو عمر شیبانی وغیرہ ہیں۔ فارسی اور دیگر زبانوں سے جن کتابوں کا ترجمہ ہوا تھا ان سے بھی استفادہ کیا۔ لغت، نحو اور علوم اسلامیہ کا زبردست عالم تھا اور فقہاء کے درمیان اسے زیادہ شہرت حاصل ہوئی، حقیقت نگاری اور صدق روایت میں اپنی نظیر آپ تھا۔ اپنی رائے کے بے باکانہ اظہار میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ وہ پہلا ادیب ہے کہ جس نے ادبی تنقید کی جانب توجہ دی، شاعری پر مبسوط و مدلل بحث کے ساتھ شعرا کے مختلف درجات متعین کیے۔ شاعر کی عظمت کے لیے اس نے زمانہ اور وقت کے اصول کو ہل قرار دیا اور یہ بتایا کہ قدیم شاعر محض قدیم ہونے کی وجہ سے عظیم نہیں قرار دیا جاسکتا اور جدید محض بعد میں آنے کی وجہ سے کم تر نہیں قرار دیا جاسکتا۔ خود تو کسی قدر روایت پرست تھا لیکن اس نے روایت پرستی اور معتدل تجدیدی رجحان کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابن قتیبہ سنی المسلک تھا۔ جاحظ کی تصانیف کا اس نے بغور مطالعہ کیا اور جاحظ کے مسلک اعتزال پر سخت حملے کیے۔ مروجہ علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ادبیانہ حیثیت بھی معروف اور مسلم ہے۔ لغوی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا ادیب تھا جو وسیع المطالعہ تھا، ادب کے تمام علوم پر دستگاہ تھی، شعر اور اخبار عرب کا روای تھا اور اسے مختلف علوم و فنون میں اولیت کا شرف حاصل تھا۔

ابن قتیبہ کا اسلوب عمدہ ہے، الفاظ کے انتخاب میں بلند معانی کا خیال رکھا گیا ہے، عبارتیں واضح اور صاف ہوتی ہیں، تعبیر پر ایسی قدرت ہے کہ وہ جو کہنا چاہتا ہے الفاظ اس کے سامنے دست بستہ نظر آتے ہیں۔ الفاظ کے انتخاب میں ابن قتیبہ جاحظ سے مشابہ نظر آتا ہے۔

بعض مقامات پر اتنی گہری مشابہت ہے کہ اگر یہ نہ بتایا جائے کہ یہ ابن قتیبہ کی عبارت ہے تو فرق کرنا مشکل ہو جائے گا۔ چھوٹے چھوٹے جملے، الفاظ و معانی میں ہم آہنگی اور الفاظ کا باہم ربط وغیرہ ایسی صفات ہیں جو دونوں کے یہاں یکساں طور پر ملتی ہیں۔ جاہظ ایک موضوع پر لکھتے لکھتے درمیان میں دوسرے موضوع کو چھیڑ دیتا ہے (استطراد) لیکن ابن قتیبہ کے یہاں یہ چیز نہیں پائی جاتی ہے بلکہ اس نے اپنی کتاب ”تاویل مختلف الحدیث“ میں استطراد پر نکتہ چینی کی ہے۔

ابن قتیبہ کا جاہظ کے ساتھ موازنہ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ عربی ادب میں جاہظ کا جو مقام ہے ابن قتیبہ کو وہ مقام حاصل نہیں۔ جاہظ اپنی عبارتوں میں معاشرہ کے مختلف طبقات اور انسانی نفسیات کی جس طرح عکاسی کرتا ہے اس طرح کی عکاسی ابن قتیبہ کے یہاں نہیں ملتی ہے۔ تاہم ابن قتیبہ کے لیے یہ فخر کافی ہے کہ عربی نثر کو اس نے ایک عمدہ اور واضح اسلوب دیا اور ایسی تصانیف چھوڑیں جو علوم و فنون کو نئی جہتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ اس کی مندرجہ ذیل تصانیف زیادہ مشہور ہیں:

۱- عیون الاخبار: اس میں دس ابواب ہیں: کتاب السلطان، کتاب الحرب، کتاب السؤد، کتاب الطبائع والاخلاق،

کتاب العلم باخبار العلم والعلماء، کتاب الزهد، کتاب الاخوان، کتاب الحوائج، کتاب الطعا اور کتاب النساء۔

۲- کتاب المعارف: یہ کتاب عام تاریخی کتاب ہے جس کو اس نے زمانہ کے مورخین کے طریقہ پر لکھا ہے۔ اس کتاب میں تاریخ تخلیق عالم، انبیا، انساب عرب، سیرۃ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات، صحابہ، تابعین، قراکرام، راویان اشعار، شرفا اور معذرو لوگوں کے ذکر کے ساتھ نادر واقعات، مختلف مذاہب، عرب و عجم کے بادشاہوں کا تذکرہ ہے۔

۳- کتاب ”الشعر والشعراء“: جسے بعض لوگ طبقات الشعراء، کتاب الشعراء یا اخبار الشعراء کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ ایک کتاب کے مختلف نام ہیں۔ یہ کتاب مشہور شعرا کے حالات اور ان کے نمونہ کلام اور اس پر بحث سے متعلق ہے۔ اس میں دور جاہلیت، صدر اسلام اور مصنف کے زمانہ تک کے مشہور شعرا کا تذکرہ ہے۔ ادب میں اس کا شمار اہمات الکتب میں ہوتا ہے۔

۴- ادب الکاتب: یہ چار حصوں پر مشتمل ہے: کتاب المعرفة، کتاب تقویم اللسان، کتاب تقویم الید اور کتاب الابنیۃ۔ یہ کتاب جہاں ہمیں زبان و ادب کے اسرار و رموز سے روشناس کراتی ہے وہیں تہذیب و ثقافت اور انسان دوستی کی تعلیم دیتی ہے۔ خورشید احمد فارق کے بقول: ”مصنف نے خاص طور پر عربی سے مشتق ہونے والے لفظوں کے صوتی و حرکاتی فرق پر مشتمل معنوی فرق، مختلف ابواب سے مشتق الفاظ کے معنوی اتفاق، مذکر شکل کے مونث الفاظ اور خط و کتابت میں کام آنے والے عام معلوماتی الفاظ اور لسانیات کی بہت سی باریکیوں کا ذکر کیا ہے“۔

۵- الإمامة والسیاسة: یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لے کر امین اور مومن کے زمانہ خلافت تک کی تاریخ ہے جس میں خلافت کی شرطوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ کتاب الشراب والاشربة ہے جس میں حرام اور حلال مشروبات کے سلسلہ میں علما کے اختلاف کا تذکرہ ہے۔ کتاب التسویۃ بین العرب والعجم وتفصیل العرب ہے جو ”شعوبیت“ یعنی عرب دشمنی کی تردید میں ہے۔ اس نے اپنی کتاب عیون الاخبار جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے اور اس کتاب کے ذریعہ شعوبیت کی تحریک کا منہ توڑ جواب دیا ہے۔ تاویل مختلف الحدیث، غریب

الحديث اور اصلاح ابی عبید فی غریب الحدیث ابن قتیبہ کے محدث ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ تاویل مشکل القرآن اور غریب القرآن میں وہ ایک مفسر نظر آتا ہے۔ الاختلاف فی اللفظ والرد علی الجمہیة والمشہة میں وہ ایک فلسفی اور متکلم اور کتاب المعارف میں ایک مورخ نظر آتا ہے۔ یہ ایک شخص ہے جو مختلف جہات میں قیادت کرتے ہوئے علوم و فنون کی نئی راہیں دکھا رہا ہے۔ درج ذیل عبارت میں جاحظ کے کلام کے ساتھ اس کی مشابہت دیکھی جاسکتی ہے۔

”وہذہ عیون الأخبار نظمہا لمغفل التأدب تبصرة، ولأهل العلم تذكرة، ولسائس الناس ومسوسہم مؤدبا، وللملوک مستراحاً، وصنفتها أبو اباء، وقرنت الباب بشكله، الخبر بمثله، والكلمة بأختها، ليسهل علی علمها وعلی المدارس حفظها، وعلی الناشر طلبها، وهی لقاح عقول العلماء ونتاج أفكار الحكماء وزبدة المنخص وحلیة الأدب وثمار طول النظر، والمتخير من كلام البلغاء، ووطن الشعراء وسیر الملوك وأثار السلف“۔

(میں نے عیون الاخبار کی تالیف اس لیے کی کہ ادب سے غافل کی آنکھ کھول دے، اہل علم کے لیے یاد دہانی کرنے والا بنے، حاکم و محکوم کو ادب سکھائے بادشاہوں کے لیے راحت ہو، اسے مختلف ابواب میں مدون کیا ہے۔ تمام ابواب میں مناسبت و واقعات میں ہم آہنگی اور الفاظ میں مماثلت ہے تاکہ سیکھنے والے کو آسانی ہو، قاری اسے یاد کر سکے، خواہش مند حاصل کر سکے، اس میں علما کی عقولوں کا جوہر، دانشوروں کے افکار کا حاصل، دودھ کا مکھن، ادب کا زیور اور طویل غور و فکر کا ثمرہ ہے، اس میں بلیغ لوگوں کے کلام، شاعروں کی سمجھداری، بادشاہوں کی سیرت بادشاہوں کے احوال اور سلف کے آثار کا انتخاب ہے)

الشعراء والشعراء میں وہ یہ کہتا ہے:

”ولم أسلک فیما ذکرته من شعر کل شاعر مختار الہ سبیل من قلّد أو استحسن باستحسان غیرہ، ولا نظرت إلی المتقدم منهم بعین الجلالة لتقدمه، وإلی المتأخر منهم بعین الاحتقار لتأخره بل نظرت بعین العدل علی الفریقین وأعطیت کلاً حظہ ووفرت علیہ حقہ...“۔

(میں نے جن شاعروں اور ان کے اشعار کا انتخاب کیا ہے اس میں محض تقلیدی رنگ نہیں ہے اور نہ ہی دوسروں کے اچھا کہنے سے ان کو اچھا سمجھا ہے۔ نہ ہی میں نے قدیم شاعروں کو ان کی قدامت کی وجہ سے بڑا سمجھا اور نہ بعد میں آنے والوں کو بعد میں آنے کی وجہ سے کم تر سمجھا ہے بلکہ دونوں فریقوں کو انصاف کی نگاہ سے دیکھا اور ہر ایک کو اس کا حق اور پورا پورا حصہ دیا ہے)

ابن قتیبہ عباسی دور کا وہ نابغہ روزگار ہے جس نے مختلف علوم و فنون پر خامہ فرسائی کر کے اپنے بعد آنے والوں کے لیے ایسا نقش تابندہ چھوڑا ہے جو علم و ادب کی دنیا میں مشعل راہ ہے۔ جتنی محنت و جفاکشی سے اس نے علم حاصل کیا تھا اتنی ہی امانت اور دیانت کے ساتھ اپنی انشا پردازی سے عوام کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا۔ دینور سے بغداد واپس آ کر وہ تدریس و تعلیم میں اپنی وفات ۲۷۶ھ تک مصروف رہا تھا۔

15.5.6 ابن العمید (م ۳۶۰ھ)

اس کے سال پیدائش کا تذکرہ کتب مراجع میں نہیں ملتا ہے۔ اس کا نام محمد بن حسین اور کنیت ابوالفضل ہے ابن العمید کے لقب سے مشہور ہوا

رکن الدولہ حسن بن بویہ کا وزیر اور خراسان کے مشہور علما میں سے تھا۔ بنو بویہ کی حکومت ۳۳۴ سے ۴۴۷ھ تک رہی۔ فارس اور خراسان وغیرہ ان کے زیر نگیں تھے۔ بنو بویہ کے پیش تر خلفا علم ادب کے شیدائی تھے۔ اسی طرح ان کے وزرا، گورنر اور قاضی بھی بڑے عالم و ادیب ہوئے جیسے رکن الدولہ صاحب ہمدان و اصفہان کا وزیر ابن العمید، بہاء الدین عضد الدولہ صاحب عراق و اہواز کا وزیر ساہور بن اردشیر، معز الدولہ بن بویہ کا وزیر حسن بن مہلبی، موید الدولہ بن رکن الدین کا وزیر صاحب بن عباد اپنے علم و فضل کے وجہ سے مشہور ہوئے۔

ابن العمید کا باپ سامانیوں کے دربار میں دیوان الرسائل سے وابستہ تھا اور اس نے اپنے لڑکے کو سامانیوں کے بجائے بویہیوں کے دیوان سے وابستہ کیا۔ ابن العمید ترقی کرتے کرتے ۳۲۸ھ میں وزیر بن گیا اور اپنی وفات ۳۶۰ تک اس منصب پر برقرار رہا۔ ادب اور مراسلہ نگاری کے علاوہ فلسفہ اور علم نجوم سے اسے گہری دل چسپی تھی اور اپنے زمانے کے دیگر مزوجہ علوم و فنون میں بھی اسے دسترس حاصل تھی۔ ابن مسکویہ کے بیان کے مطابق لغت، نحو، عروض، بلاغت، مشکلات القرآن، اختلاف الفقہاء، منطق و فلسفہ اور الہیات میں اسے درک حاصل تھا۔ اس کی علمی مہارتوں کے پیش نظر اسے ”استاذ“ کے لقب سے پکارا جانے لگا اور انشا پردازی میں ”جاحظ ثانی“ کہلایا۔ اسی کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ ”انشا پردازی عبد الحمید سے شروع ہوئی اور ابن العمید پر ختم ہوگئی“۔ بقول احمد حسن زیات بغداد شام اور مصر کے شعرا و علما اس کے پاس جوق در جوق مدد مانگنے کے لیے آنے لگے، اس طرح وہ، صاحب بن عباد اور وزیر مہلبی اس زمانہ کی علمی تحریک کی روح اور ادبی دائرہ کے محور بن گئے۔ خود متنبی اپنے عالی مرتبت ہونے کے باوجود اس کی تعظیم کرتا اور اس سے خائف رہتا تھا۔ اس کی شان میں متنبی کے بہت سے مدحیہ قصائد ہیں، جن میں سے وہ قصیدہ بھی جس کا مطلع یہ ہے:

باد هواک صبرت ام لم تصبر و بکاک ان لم یجرد معک أو جری

(تو صبر کرے یا بے صبری سے کام لے بہر حال تیرا عشق آشکارا ہو کر رہے گا اور خواہ تو آنسو بہائے یا نہ بہائے تیرا رونا ظاہر ہو جائے گا) علوم مزوجہ میں مہارت کے ساتھ ساتھ فنون حرب میں بھی اسے قائدانہ مقام حاصل تھا اور اپنی حکومت کے لیے اس نے قابل ذکر کامیابیاں حاصل کیں۔ تمام سوانح نگار اس بات کے معترف ہیں کہ وہ انتہائی فصیح و بلیغ شخص تھا۔ زیر تبصرہ دور میں اس نے انشا پردازی کو ایک ایسا اسلوب عطا کیا کہ آنے والے ادبا اس کی تقلید کرتے رہے۔ اور بلا اختلاف یہ اس دور کے انشا پردازوں کا امام سمجھا جاتا ہے۔ اس کا دور تکلف و باریک بینی کا زمانہ تھا اور اس دور میں سجع کا اہتمام اور اسی کے ساتھ محسنات بدیعیہ مثلاً استعارہ، جناس اور طباق کا استعمال کیا جانے لگا تھا۔ اس کی طبیعت نے ایک ایسے جدید اسلوب وضع کرنے کی طرف رہنمائی کی جس کے فقرے متناسب و موزوں، عبارت خوش نما، نظم و ترتیب میں ندرت اور معانی میں جدت پائی جاتی تھی۔ ابن العمید چونکہ شاعر بھی تھا لہذا اس نے نثر نگاری میں تکلفات، تزئین صنعت گری اور متنوع اسالیب کو داخل کیا۔ اس کی شاعرانہ طبیعت نے نثر کو بھی اتنی نزاکت بخشی کہ دونوں میں صرف وزن کا فرق باقی رہا۔

رکن الدولہ کی نافرمانی کرنے پر ابن بکا کو اس نے جو خط لکھا اس کی چند سطریں بطور اقتباس پیش کی جا رہی ہیں جن سے سجع اور دیگر صنعتوں کے استعمال کے متعلق اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

”وزعمت أنك في طرف من الطاعة بعد أن كنت متوسطها، وإذا كنت كذلك فقد عرفت حالها، و حلبت

شطر يها، فنشدتک الله لما صدقت عما سألتک كيف و جدت ما زلت عنه و كيف تجرد ما صرت إليه؟ ألم تکن

من الأول في ظل ظليل ونسيم عليل وريح لليل وهواء غذي وماء روي ومهاد وطي وكن كنين ومكان مكين
 وحسن حصين، يقيق المتالف ويؤمنك المخاوف ويكنفك من نوائب الزمان ويحفظك من طوارق
 الحدثن، عززت به بعد الذلة وكثرت بعد القلة وارتفعت بعد الضيعة وأيسرت بعد العسرة...“

(تمہارا خیال ہے کہ تم فرمان برداری کے وسط میں چلنے کے بعد اب اس کے ایک کنارے پر آگئے ہو، اگر واقعتاً تمہارا یہی حال ہے تو تم فرماں برداری کی دونوں حالتوں کو جان گئے، اور اس کے نفع نقصان کو پہچان گئے ہو، تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا صحیح جواب دینا۔ تم نے جس چیز کو چھوڑا اسے کیسا پایا اور اس وقت جس حال میں ہوا سے کیسا پاتے ہو؟ کیا پہلی صورت میں تم گھنے سائے، ہوا کے ٹھنڈے اور نمناک جھونکے، سیراب کرنے والے پانی، نرم و آرام بستر، محفوظ و مامون رہائش، بلند و مضبوط قلعہ میں نہ تھے۔ جس کے باعث ذلت سے عزت، قلت سے کثرت، پستی سے بلندی، تنگی سے فراخی اور ناداری سے مالداری پائی.....)۔

ابن العمید کی شاعری میں حسن و جمال غالب ہے۔ اپنے کسی دوست کے سلسلہ میں اس نے حسب ذیل اشعار کہے تھے:

قد ذبت غير حشاشة و ذماء ما بين حَزْ هوى و حَزْ هواء
 لأستفيق من الغرام و لأأرى خلوا من الأشجان و البرحاء

(میں محبت کی سوزش اور ہوا کی تپش کے درمیان گھل گیا ہوں اور اب اس ناتواں روح اور آخری سانسوں کے سوا مجھ میں کچھ باقی نہیں رہا۔ میں عشق و محبت کی مستی سے کبھی ہوش میں نہیں آتا ہوں نہ رنج و غم اور تکلیف نے کوئی جگہ خالی پاتا ہوں)۔
 باوجودیکہ ابن العمید ایک بہت بڑے عہدے پر فائز تھا لیکن اسے اطمینان کی زندگی نصیب نہیں ہوئی۔ قسم قسم کی بیماریاں اس کے ساتھ لگی رہیں تا آنکہ ماہ صفر ۳۶۰ھ میں اس کی وفات ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ آخری عمر میں کردی باغی حسنیہ سے لڑنے کے لیے ایک لشکر کی قیادت کرتے ہوئے نکلا تھا لیکن راستے میں ہی انتقال کر گیا۔ اس کی عمر اس وقت ساٹھ سال سے کچھ زیادہ تھی۔

15.5.7 صاحب بن عباد (۳۲۶-۳۸۵ھ)

ابوالقاسم اسماعیل صاحب بن عباد (کافی الکفاة) صوبہ قزوین و ابہر کے درمیان طالقان نامی گاؤں میں ۳۲۶ھ میں پیدا ہوا۔ ابن فارس لغوی سے بغداد میں علم حاصل کیا پھر اپنے وطن واپس آکر ابوالفضل بن العمید کی شاگردی اور مصاحبت اختیار کی۔ بعد ازاں وہ عضد الدولہ کے بھائی موید الدولہ کا اتالیق مقرر ہوا۔ اس کے ساتھ قیام کرنے، طویل عرصہ تک اس کی صحبت میں رہنے اور اس سے انتہائی تقرب کی بنا پر ”صاحب“ کہلایا۔ کچھ عرصہ بعد موید الدولہ بن بویہ نے اس کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ جب فخر الدولہ اپنے بھائی موید الدولہ کے بعد بادشاہ بنا تو صاحب بن عباد نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا جس پر فخر الدولہ نے کہا ”اس حکومت کی وزارت پر تمہارا ایسا ہی موروثی حق ہے جیسا ہمارا حکومت میں، لہذا ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے حق کی حفاظت کرے“۔ فخر الدولہ کے وزیر کے حیثیت سے وہ اپنی وفات ۳۸۵ھ تک کام کرتا رہا۔

آل سامان کے مشہور حکمران سلطان بن نوح بن منصور نے اس کی شہرت کا حال سن کر اسے اپنے پاس بلانا چاہا تو اس نے معذرت کردی۔ اس نے اپنے نہ آسکنے کی وجوہات لکھیں تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ اسے اپنے کتب خانہ کو منتقل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا کیونکہ اس کے لیے کم از کم چار سو اونٹوں کی ضرورت ہوگی۔ اسے کتابیں جمع کرنے اور علما کی سرپرستی کا شوق تھا۔ وزیر کی حیثیت سے اسے

اتنی شہرت نہیں حاصل ہوئی جتنی ایک زبردست ادیب اور انشا پرداز کی حیثیت سے ہوئی۔ اس کی سیاست و شجاعت قابل ذکر تھی اور بلند مقامی کا یہ عالم تھا کہ جسے اس کے یہاں شرف باریابی حاصل ہو جاتی وہ اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا تھا۔ اس کی مجالس ادیبوں، شاعروں، راویوں اور طالبان علم سے کبھی خالی نہیں رہتی تھی، تمام عمر وہ سب کا مخدوم اور منظور نظر رہا۔ اس کے انتقال پر ”ری“ کے دروازے اس کے ماتم میں بند کر دیے گئے اور لوگ اس کے قصر کے دروازے پر جنازہ کے انتظار میں کھڑے رہے، فخر الدولہ اور دیگر ارکان حکومت غیر سرکاری لباس میں شریک جنازہ تھے، اس کی تدفین اصفہان میں ہوئی۔

رسالہ نگاری میں اس نے اپنے استاذ ابن العمید کی تقلید کی ہے۔ الفاظ کے انتخاب، معانی کے اہتمام، سجع کے التزام اور فقروں میں ربط اس کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ احمد حسن زیات کے قول کے مطابق ”اس کا مرتبہ بدیع کے بعد اور خوارزمی سے پہلے ہے۔ شاعری کرنے میں اسے ذوق سلیم اور شاعری پر کھنے میں اسے صحیح تنقیدی نظر ملی تھی۔ وزارت کی ذمہ داریوں اور ریساہٹھاٹ اسے تصنیف و تالیف سے باز نہ رکھ سکی۔ اس نے لغت میں المحيط کی سات جلدیں، کتاب الامالہ اور الکشف عن مساوی المتنبی وغیرہ تصنیف کیں، مگر اس کی سب سے بڑی اور اہم خدمت ادیبوں کی حوصلہ افزائی، علما کو سرگرم عمل بنانا اور شیع ادب کو فروزاں کرنا ہے۔“

”اس کی سجع بندی کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شیرینی اور حلاوت ہے۔ وہ معاصر انشا پردازوں میں سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ ننگی پر حامل تراکیب کا استعمال کرتا تھا، یوں تو وہ چھوٹے چھوٹے مسجع جملوں کا اہتمام کرتا تھا لیکن اگر جملے طویل ہو جاتے تھے تو وہ اس میں مستعمل الفاظ میں توازن قائم کرنے کی کوشش کرتا تھا..... اس کی سجع بندی کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ اس نے اپنی سجع بندی کو ایسی نثری شاعری کا روپ عطا کیا کہ جس سے قاری اور سامع دونوں محفوظ ہوتے ہیں۔“

اس کے رسائل شائع ہو چکے ہیں اور یہ بیس ابواب پر مشتمل ہیں۔ ان رسائل کو ایک خاص سیاسی و معاشرتی اہمیت حاصل ہے۔ بویہی حکومت سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے یہ رسائل دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں اور ادبی لحاظ سے ان کا مقام اہم ہے جب قاضی ابوبشر اس سے ملنے ”ری“ کے دروازہ پر پہنچا اس نے یہ خط لکھا:

تحدثت الרכاب بسیر أروی الی بلد حططت به خیامی
فکدت أطیر من شوق إلیها بقادمة کقادمة الحمام

(قافلہ نے سیراب ترین شخص کے اس شہر میں آنے کی خبر دی جہاں میرا قیام ہے تو میں فرط شوق سے اس کی طرف اڑ کر پہنچنا چاہتا تھا

کہ جیسے کبوتر اڑتا ہے)۔

آگے چل کر لکھتا ہے:

”أحق ما قبیل أمر القادم، أم ظن کامانی الحالم، لا والله بل هو درک العیان وأنه نیل المنی ستیان، فمرحبا أیها القاضي
براحلتک ورحلک، بل أهلا بک و بکافة أهلک، ویاسرعة ما فاح نسیم مسراک! ووجدنا ریح یوسف من ریاک! فحث
المطی نزل غلتی بسقیاک، وتزح علتی بلقیاک، وقص علی یوم الوصول لنجعلہ عیدا مشرفا، و نتخذہ موسماو معرفا، رد

الغلام، أسرع من رجح الكلام فقد أمرته ان يطير على جناح نسر، وأن يترك الصبا في عقال وأسر“۔

سقى الله دارات مررت بأرضها فأتتك نحوى يا زياد بن عامر
أصائل قرب أرتجى أن أنالها بلقياك قد زحزح من درّ الهواجر

(کیا واقعتاً آنے والے کے متعلق جو خبر ملی ہے وہ درست ہے، یا سونے والے خواب کی طرح محض خیال و گمان ہے، نہیں بخدا یہ آنکھوں دیکھی جیسی بات کی طرح ہے اور دراصل وہ (آنے والا) اور مراد کو پالینا برابر ہیں۔ میں آپ کی سواری اور پالان کو مر جا کہتا ہوں۔ نہیں بلکہ آپ کو اور آپ کے تمام ساتھیوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ کس قدر تیزی سے آپ کے آمد کی خبر پھیلی ہے جس طرح یوسف کی خوشبو مہکی تھی، آپ سواری کو تیز چلائیے اور میری پیاس کو اپنی آمد سے بجھائیے، اپنی آمد سے میری بیماری کا ازالہ فرمائیے اور اپنی آمد کے دن سے باخبر کیجیے تاکہ ہم اس دن کو یوم عید بنا دیں۔ صدائے بازگشت کے پلٹنے سے قبل خادم کو واپس بھیج دیں، میں نے اسے حکم دیا ہے کہ وہ شاہین کے پروں پر سوار ہو کر واپس آئے اور باد صبا کو اپنے پیچھے قید و بند میں چھوڑ آئے۔ اے زیاد بن عامر جن آبادیوں سے تو گذرا اور جن علاقوں نے تجھے میرے طرف رہنمائی کی اللہ ان کو سیراب کرے۔ آپ کی ملاقات کے تصور سے میں جن ٹھنڈی سہ پہر کا منتظر ہوں ان کے تصور ہی نے دو پہر کی تپش کو دور کر دیا ہے۔)

15.5.8 بدیع الزماں ہمدانی (۳۵۸ھ-۳۹۸ھ)

ابو الفضل احمد بن الحسين المعروف به بدیع الزماں، ۳۵۸ھ میں ہمدان میں پیدا ہوا اور وہیں کے مشہور علما سے کسب فیض کیا۔ کتاب المجمعل کے مولف احمد بن فارس کا حلقہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ بدیع الزماں نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں کا علم حاصل کیا۔ ہمدان چھوڑ کر صاحب بن عباد کے متوسلین میں شامل ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد جرجان کے حکمران محمد بن مقصود کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ آخر میں اس نے ہرات میں مستقل طور پر قیام کو پسند کیا اور خوشحالی کی زندگی گذاری۔ لگ بھگ چالیس سال کی عمر میں ۳۹۸ھ میں اس کی وفات ہو گئی۔ اس کی موت کا سبب بیان کرنے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ زہر خورانی اس کی موت کا سبب بنی جب کہ بعض دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کو سکتہ ہوا اور مردہ سمجھ کر اس کو جلد ہی دفن کر دیا گیا، قبر میں ہوش آیا تو اس نے آوازیں دیں جب قبر کھودی گئی تو اس کو ڈاڑھی پکڑے ہوئے مرا ہوا پایا گیا۔

یہ انتہائی ذکی و ذہین شخص تھا۔ ثعالبی کا بیان ہے کہ ”وہ عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے سامنے اگر کوئی ایسا قصیدہ پڑھا جاتا جسے اس نے کبھی سنا نہ ہو اور وہ چاہے پچاس اشعار پر کیوں نہ مشتمل ہو تو وہ اسے ازبر ہو جاتا تھا اور شروع سے آخر تک اس طرح سنا دیتا تھا کہ نہ تو کوئی لفظ ادھر سے ادھر ہوتا اور نہ ہی کسی شعر کے مفہوم میں کوئی خلل پیدا ہوتا۔ اسی طرح غیر معروف کتابوں کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس میں جو کچھ ہوتا انہیں بیعینہ سنا دیتا تھا“۔ صاحب بن عباد اس کی لیاقت سے متاثر تھا، وہ اس کے سامنے فارسی زبان کا شعر پڑھتا تھا اور بدیع الزماں فوراً عربی کے قالب میں اس کو ڈھال دیتا تھا، جس طرح قوت حافظہ میں اسے شہرت تھی اسی طرح بدیہہ گوئی میں وہ ممتاز تھا۔ اس کے خطوط و رسائل کی تعداد تقریباً دو سو تیس ہے۔ ان میں سے بیش تر خطوط ذاتی قسم کے ہیں اور کچھ ادبی مسائل کے بارے میں۔ اس کی نثر نگاری منشور

شاعری کی مانند ہے۔ اس میں تکلف اور آرد نام کو نہیں ہے۔ الفاظ پر شکوہ، حسین معانی، جمال اسلوب اور نزاکت تخیل کا مجموعہ ہے۔ اس نے شاعری بھی کی لیکن اس کی شاعری اس کے نثر کے درجہ تک نہیں پہنچ سکی، بہ یک وقت عمدہ شاعری اور عمدہ نثر نگاری بہت کم ایک شخص میں یکجا ہوتی ہیں۔ بدیع الزماں اپنے اسلوب کی زیبائش و آرائش میں اس قدر آگے جا چکا تھا کہ اس کا اہتمام کرنے والے دیگر لوگ اس کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکے۔ وہ اسلوب کی تزئین کاری کے ساتھ صنائع اور بدائع کا استعمال کر کے جملے کی بندشوں کو اور بہتر بناتا تھا۔ اس کے یہاں مراعاة النظر کا کثرت سے استعمال پایا جاتا ہے مثلاً ایک بچے کی پیدائش پر مبارکباد دیتے ہوئے لکھتا ہے ”حبذا الأصل وفرعه، و بوردک الغیث و صوبہ، و انبع الأرض و نورہ و حید اسماء أطلعت فرقدًا و غابة أبرزت أسدا“ (اصل اور شاخ دونوں قابل تعریف ہیں، بارش اور بادل دونوں قابل مبارکباد ہیں، باغ اور اس کی کلی ثمر آور ہوئی اور قابل تعریف ہے وہ آسمان جس نے فرقد ستارے کو طلوع کیا اسی طرح قابل تعریف ہے وہ جنگل جس نے کسی شیر کو ظاہر کیا)

اس کے رسائل سلاست و بلاغت کا نمونہ ہیں اور ان رسائل کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قصہ نگاری کا جو ہر اس کے اکثر خطوط میں پایا جاتا ہے اور اسی عنصر نے آگے چل کر ایک نئے فن یعنی ”مقامات نویسی“ کی بنیاد ڈالی جو چھوٹی چھوٹی حکایات پر مشتمل ہوتی ہیں جو اس کے ہیر و ابو الفتح اسکندری اور راوی عیسیٰ بن ہشام کے درمیان واقع ہوتی ہیں۔ ناقدین ادب کا خیال ہے کہ اس کے ذہن میں قصہ نگاری کا واضح تصور نہیں تھا بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ ابو الفتح اسکندری اور عیسیٰ بن ہشام کے درمیان مکالمہ کے ذریعہ مسجع ادبی عبارتوں کا ذخیرہ جمع کر دیا جائے جسے نوجوان یاد کریں اور ان کے اندر ادبی ذوق پیدا ہو۔ یہی مقصد اس کے بعد ابو القاسم حریری کے پیش نظر تھا اور اسی کو عمدہ اور بلوغ نثر تصور کیا گیا..... بدیع کے مقامات کا ایک اثر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس کے ”ابلیسی مقامہ“ سے متاثر ہو کر ابن شہید اندلسی اور ابو العلاء معری نے عالم مابعد الطبیعات کا اپنا سفر نامہ لکھا اور اس عالم کے حالات کو قوت متخیلہ کے مدد سے قارئین کے سامنے پیش کیا۔

بدیع الزماں نے چالیس مقامے نیشاپور میں قیام کے دوران املا کرائے، پھر امیر سجستان کے یہاں مہمان رہ کر پانچ مقامات کا اضافہ کیا اور بعد میں کسی اور موقع پر اس نے چھ مقامات کا اضافہ کیا۔ اس کے مقامات کا موضوع جداگانہ نہیں ہے بلکہ سب کا موضوع ایک ہی ہے اور وہ ہے ”ادبی انداز کی گدگری“۔ اس نے اپنے زمانہ میں پائے جانے والے پیشہ ور گدا گرا دیوں کے حیلے اور بہانوں کو ان ”مقامات“ میں یکجا کر دیا ہے۔ اپنے مقامات میں وہ وصف نگاری اور تصویر کشی کا اہتمام کرتا ہے اور جس چیز کی عکاسی کرتا ہے اس کے بارے میں متعدد جملوں کا استعمال کرتا ہے تاکہ نوجوان ادیب اس میں سے اپنی پسند کے جملے کا انتخاب کر سکے۔ ابن القفطی کا یہ قول کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ ”انشا پردازی کی مشق اور نظم و نثر کے مختلف اسالیب سے واقفیت کے سوا مقامات سے کوئی اور شے کی کشید نہیں کی جاسکتی“۔

بقول ڈاکٹر شوقی ضیف ”نادر اور پیچیدہ الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ بدیع الزماں نے اپنے مقامات میں کثرت سے شعر کی تضمین، قرآن کی آیات اور ضرب الامثال کو اپنی عبارتوں میں استعمال کیا ہے، یہ سارے مظاہر تکلف و تصنع کرنے والے ادبا کے یہاں واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ اس نے صنعت تجنیس کو اپنے مقامات میں ایک اہم عنصر بنا کر پیش کیا..... اور اس صنعت میں افراط نے اس کو تجنیس ناقص اور تجنیس معکوس کے استعمال پر مجبور کر دیا..... خلاصہ کلام یہ کہ وہ ایک ایسے مرحلہ کا ادیب تھا جس میں نثر نگاری فن تصنیع یعنی اسلوب کی

ترتیب و آرائش کے اہتمام کے رجحان سے نکل کر اسلوب میں تکلف و تصنع کے اہتمام کے مرحلہ میں داخل ہو رہی تھی.....“۔
اس کی شکر کا نمونہ:

”یعز علی (اطال اللہ بقاء رئیس) ان ینوب فی خدمتہ قلمی عن قدمی ویسعد برویتہ رسولی دون وصولی،
ویردمشروعۃ الانس بہ کتابی، قبل رکابی، ولکن ما الحیلۃ۔ والعوائق جمۃ۔

وعلی ان اسعی ولیس علی ادراک النجاح

وقد حضرت دارہ و قبلت جدارہ وما بی حسب الجدران ولکن شغفاً بالقطان ولا عش الحيطان، ولکن شوقاً
الی السکان۔“

(مجھے یہ بات گراں گذر رہی ہے کہ میرے قدموں کے بجائے میرا قلم رئیس کی خدمت میں میری نیابت کرے، میرے بجائے پیغام
ان کی دید سے مشرف ہو، میرے بجائے میری تحریر ان کی انسیت کے مقام پر اترے لیکن کیا کیا جائے رکاوٹیں ڈھیروں ہیں اور ان تک پہنچنے
کی کوئی تدبیر نہیں (شاعر) کہتا ہے میرے لیے کوشش کرنا ضروری ہے اس کوشش میں کامیابی کا حصول ضروری نہیں۔ میں ان کے دولت خانہ پر
حاضر ہوا اس کی دیواروں کو بوسہ دیا دراصل مجھے دیواروں سے الفت نہیں بلکہ مکینوں کی محبت اور شوق میں ایسا کیا ہے)۔

المقامات المضریہ کی عبارت ملاحظہ ہو:

”یا غلام الخوان فقد طال الزمان، والقصاع فقد طال المصاع، والطعام، فقد كثر الکلام۔ فأتی الغلام
بالخوان، قلبه التاجر علی المکان ونقره بالبنان و عجمه بالاسنان، وقال: عمر اللہ بغداد فما أجد متاعها
وأظرف صناعتها تأمل بالله هذا الخوان وانظر الی عرض متنه وخفة وزنه وصلابة عوده وحسن شكله، فقلت:
هذا الشكل فمتی الاكل؟ فقال: الان۔“

(اے غلام خوان لاؤ کافی وقت گذر گیا، برتن لاؤ کافی بحث و مباحثہ ہو گیا، کھانا حاضر کرو باتیں بہت ہو گئیں۔ پس غلام ایک خوان
لے آیا، اس تاجر نے اسی جگہ اسے الٹ پلٹ کیا، انگلیوں سے بجایا اور دانتوں سے اس کو دبایا اور کہنے لگا کہ اللہ بغداد کو آباد رکھے وہاں کا سامان
کتنا عمدہ ہے اور وہاں کے کاریگر کتنے بہترین ہیں، بخدا اس خوان کو دیکھو، اس کی وسعت، اس کے وزن کا ہلکا پن، بکٹری کی مضبوطی اور خوبصورتی
کو دیکھو، میں نے کہا کہ یہ شکل و صورت تو ٹھیک ہے کھانا کب (نصیب) ہوگا؟ اس نے جواب دیا: بس ابھی)۔
۴ شعرا کا نمونہ:

إسمع نصيحة ناصح جمع النصيحتہ والمقہ
إياك وإحذر أن تكون من الثقات علی ثقہ

(خیر خواہ کی نصیحت سنو جس نے خیر خواہی اور نصیحت کو اکٹھا کر دیا ہے اور خبردار قابل بھروسہ لوگوں پر بھی بھروسہ کرنے سے بچتے رہنا)
ابوالقاسم ناصر الدولہ سخاوت سے متعلق اشعار:

وكان أمطار الربيع الی ندى كفيك نَعزى

یا ایہا الملک الذی بعساکر الآمال یغزی
 خلقت یداک علی العدی سیفا وللعافین کنزا
 لازلت یاکنف الامیر لنامن الاحداث حرزا

(ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فصل بہار کی بارشیں آپ کے ہاتھوں کی سخاوت کی طرف منسوب ہیں۔ اے وہ بادشاہ کہ جس پر آرزوں کے لشکر سے چڑھائی کی جاتی ہے آپ کے ہاتھ دشمنوں کے لیے تلوار مانگنے والوں کے لیے خزانہ ہیں، اے بادشاہ! تو ہمیشہ ہمارے لیے ہمیشہ حوادث زمانہ سے بچاؤ کا سبب بنا رہے)۔

اس کی باقیات میں ”مقامات“ کے علاوہ ایک دیوان شعر اور مجموعہ رسائل ہیں جو بے حد مقبول ہوئے۔ ان رسائل میں مدح، شکر، معذرت خواہی، تعزیت، ہجو، عتاب طلب جو اور شفقت کی امید جیسے موضوعات شامل ہیں۔ کچھ رسائل حکام، وزراء، شیوخ، ادبا اور اہل عیال کے نام سے بھی ہیں۔

15.5.9 قاضی فاضل (۵۲۹-۵۹۶ھ)

قاضی فاضل کا شمار عباسی دور کے چوتھے طبقہ کے سردار کے طور پر ہوتا ہے، ابن العمید کے زمانہ سے صنایع و بدائع، سنج بندی اور مضمون میں زیبائش و آرائش کا سلسلہ شروع ہوا تھا، قاضی فاضل کا دور آتے آتے اس میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا۔ قاضی فاضل نے مندرجہ بالا عناصر کے علاوہ توریہ اور تجنیس کا بے حد استعمال رائج کیا۔ یہ اسلوب ابن خلدون (م-۸۰۸ھ) کی آمد تک مقبول عام رہا یہاں تک ابن خلدون کا اثر اور نئے زمانہ کے تقاضوں نے اس اسلوب کا بڑی حد تک خاتمہ کر دیا۔

ابوعلی عبدلرحیم بیسانی عسقلانی کی ولادت ۵۲۹ھ میں عسقلان میں ہوئی۔ ان کے والد چونکہ فاطمیوں کے زمانہ میں بیسان کا قاضی تھے لہذا اس نسبت سے انھیں بیسانی بھی کہا جاتا ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد بہاء الدین علی سے حاصل کی، رسائل نگاری اور دفتری انشاء میں مہارت حاصل کرنے کے لیے مصر آیا اور اسکندریہ کے قاضی ابن حدید کے دفتر میں ملازم ہو گیا۔ موفق بن خلال اور ابن قادوس کی شاگردی میں رہا۔ جلد ہی وہ اپنے فضل و کمال کی وجہ سے مشہور ہو گیا، قاہرہ میں ملک ظافر کے دفتر میں ملازمت حاصل کی۔ حکومت ایوبیہ کے قیام کے بعد صلاح الدین بن ایوب نے اسے وزیر بنا لیا پھر صلاح الدین کے لڑکے ”عزیز“ اور اس کے بھائی ”ملک افضل“ کا وزیر رہا۔ مسالک الابصار کے مصنف ابن فضل اللہ عمری کے قول کے مطابق ”قاضی فاضل، صلاح الدین کی حکومت کا انشا پرداز، وزیر، حاکم اور مشیر سب کچھ تھا، وہی اس کے وفود تیار کرتا تھا.....“۔

اس کے عہدے کا تقاضا یہ تھا کہ وہ مختلف صوبوں کے انشا پردازوں سے راہ و رسم رکھے اور وہاں سے حاصل شدہ اطلاعات کو بادشاہ تک پہنچائے، مصر شام اور عراق کی انشا پردازی کے طریقوں سے واقفیت نے اسے ایک نئے طرز کے ایجاد کرنے پر ترغیب دی۔ اس کے یہاں تکلف و تصنع کے عناصر کا خاص اہتمام ہے، اس کے جملے طویل ہوا کرتے تھے تاکہ وہ صنعت تجنیس اور مراعاة النظر کا استعمال کر سکے۔ کہا جاتا ہے کہ کثرت سے توریہ کی صنعت تحریک اسی کے زمانہ سے رائج ہوئی۔ قاضی فاضل کو جو ادبی و فنی مہارت حاصل تھی اس میں

اس تکلف و تصنع والے اسلوب میں مضمون اور عبارتوں میں نقل کا احساس نہیں ہوتا تھا لیکن بعد میں آنے والے انشا پردازوں کی محض تقلید نے شکل بگاڑ دی۔ اس کا ڈھانچہ تو عربی تھا مگر اس میں عربی روح کا فقدان نظر آتا تھا۔ قاضی فاضل ایوبی دور کا فصیح و بلیغ ادیب ہے۔ جن اصطلاحات کو وہ اپنی تحریروں میں استعمال کرتا تھا وہی بعد میں آنے والے سبھی مصری ادبا کے فن کی اساس و بنیاد ہیں یہاں تک کہ نویری نے یہ کہہ دیا کہ قاضی فاضل کے بعد جتنے فاضل آئے سب کے سب فاضل (زائد) تھے۔

نمونہ کلام:

”الحمد لله الذي صدق وعده وأورثه الارض وحده، و جدد علاه و اعلى جده و اسعد نجهه و انجح سعده و وعده نجمه و انجم وعده و اورده و اصفى ورده“۔

اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ قاضی فاضل تجنیس تام اور تجنیس غیر تام کا استعمال کرتا ہے۔ یہی وہ انداز ہے کہ ابن العمید کی تقلید کرنے والوں کی آخری صف میں حریری نے اختیار کیا تھا اور یہی طریقہ آگے چل کر فاضلیہ طریقہ کہلایا جس میں قصداً بدلیج کا استعمال، صنعت میں مبالغہ، لفظی زیبائش و آرائش پر زیادہ زور اور معانی پر کم توجہ ہوتی ہے۔

اپنے بھائی عبدالکریم جو میر علم الدین الخاس کی ایداء رسانی کا سبب بنا تھا، کے نام ایک دوسرے خط میں لکھتا ہے:

”و بالله أقسم لئن لم تدا و ما جرحت و تستدرک ما فعلت و تمح ما أثبت و تستانف ضد القبيح الذي كتبت به و شافهت، و تعتذر بالجميل فيما قاطعت الله به و بارزت، ليكونن الحديث منى بغير الكتب و لا زيلن السبب الذي قدرت به على مضرة الاصحاب، و ما اشد معرفتى بان الطباع لا تتغير و بانك ستحوجنى بعد هذا الكتاب الى ما لا يتاخر و بالجمله فاستدرک بفعلک لا بايمانک لى و تنصلک الی...“۔

(خدا کی قسم اگر تم نے اس زخم کا علاج نہ کیا جو تم نے لگایا ہے، اس فعل کو درست نہ کیا جو تم سے صادر ہوا ہے، اس چیز کو نہ مٹایا جس کو تم نے ثابت کیا ہے، اس برائی سے جو تم نے کی ہے اور جس کے بارے میں میں نے تم کو لکھا ہے اور گفتگو کی ہے اور حسن معذرت کا اظہار نہ کیا اس بارے میں جس میں تم نے حقوق اللہ کو ختم کیا ہے تو اب گفتگو میری طرف سے خط کے بغیر ہوگی اور میں لازمی طور پر اس سبب کو ختم کر دوں گا جس کی بنا پر تم دوسروں کو نقصان پہنچانے پر قادر ہوئے ہو۔ مجھے پکا یقین ہے فطرتیں نہیں بدلتی ہیں اور تم اس خط کے بعد مجھے کسی تاخیر سے زیر بار نہ کرو گے، حاصل کلام یہ کہ تم اپنے عمل سے درستگی کرو نہ کہ میرے ساتھ وفاداری کا اظہار کر کے اور میرے پاس اپنی برأت کا اظہار کر کے۔ ۵۹۶ھ میں قاہرہ میں اس کی وفات ہوئی۔

15.5.10 ضیاء الدین ابن الاثیر

ضیاء الدین ابوالفتح نصر اللہ بن محمد شیبانی شمالی عراق کے ابن عمر نامی جزیرہ میں پیدا ہوا۔ اس کا گھرانہ علوم شرعیہ اور علوم لغویہ کے لیے مشہور تھا۔ اس کا بڑا بھائی مجد الدین ابوالسعادات مبارک بن محمد (م ۶۰۶ھ) قرآن و حدیث اور عربی نحو و صرف میں ماہر تھا۔ اس کی تصانیف میں ”جامع الاصول فی احادیث الرسول“ ”النهاية في غريب الحديث“ اور کتاب ”الانصاف في الجمع بين الكشف والكشاف“ زیادہ مشہور ہیں۔ دوسرا بھائی عز الدین ابوالحسن علی بن محمد (م ۶۳۰ھ) ہے اس کی مشہور ترین کتابوں میں ”الکامل في التاريخ“، ”اسد الغابة“

في معرفة الصحابة“ اور سمعانی کی کتاب الانساب کا خلاصہ ”لباب لب الباب في معرفة الانساب“ ہیں۔

ابتدائی تعلیم و تربیت اور حفظ قرآن کے بعد ضیاء الدین اپنے والد کے ساتھ ۵۷۹ھ میں موصل آ گیا جہاں علما کی مجالس میں شریک ہو کر اس نے علوم اسلامیہ، علوم لغویہ اور علوم بلاغیہ کا درس لیا۔ درسیات کی تکمیل کے بعد ۵۷۸ھ میں وہ قاضی فاضل کی وساطت سے صلاح الدین ایوبی تک پہنچا اور تقریباً چار ماہ تک اس کے پاس رہا۔ صلاح الدین کے لڑکے نور الدین نے اپنے والد سے ضیاء الدین کو حاصل کر کے اسے اپنا وزیر و مشیر بنا لیا۔ صلاح الدین کی وفات کے بعد دمشق کی حکومت نور الدین کو ملی تو اس نے ضیاء الدین کو وہاں کے انتظامی امور کی ذمہ داری دے دی۔ دمشق والوں کے ساتھ اس کا جو سلوک رہا اس کی وجہ سے لوگ اس کے قتل کے درپے ہو گئے اور نور الدین کے ہاتھ سے دمشق نکل گیا تو ضیاء الدین ایک مقفل صندوق میں چھپ کر بڑی مشکل سے مصر پہنچا اور اس وقت تک روپوش رہا جب تک نور الدین مصر کا سلطان نہ بن گیا۔ نور الدین ایک سال تک مصر میں رہا۔ جب اسے دریائے فرات کے قریب ”سُمیاط“ کا حاکم بنا دیا گیا تو ضیاء الدین بھی اس کے ساتھ وہاں آ گیا۔ یہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد ۶۰۷ھ میں حاکم حلب سلطان ظاہر کے پاس چلا گیا۔ پھر وہاں سے ۶۱۱ھ میں اربل اور سخار کا سفر اختیار کیا لیکن یہاں سکون نہ ملا تو ۶۱۸ھ میں ناصر الدین محمود حاکم موصل کے دیوان انشاء کا صدر نشین بنا۔ ۶۳۷ھ میں بعض اہم کام کی انجام دہی کے لیے ناصر الدین محمود نے اسے بغداد بھیجا جہاں اسی سال اس کی وفات ہو گئی۔

ضیاء الدین کو اپنی تحریروں کے عمدہ اسلوب کی وجہ سے اپنے ہم عصروں پر سبقت حاصل تھی۔ وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز کے طور پر مشہور ہوا۔

اس کی تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ ”المثل السائر في ادب الكاتب والشاعر“: محسنات لفظیہ، محسنات بدیعیہ اور محسنات معنویہ میں نہایت مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اپنی کتاب میں اس نے ان امور کی نشان دہی کی ہے جن کی انشا پردازوں کو ضرورت ہوتی ہے مثلاً لغوی و بلاغی علوم، اشعار عرب، امثال عرب، قرآن وحدیث سے استشہاد، احکام خلافت و ریاست اور اس سے متعلق فقہی امور و مسائل۔

۲۔ ”الوشی المرقوم في حل المنظوم“: اس کتاب میں ضیاء الدین نے دو فصلوں میں اس بات کو بیان کیا ہے کہ رسائل نویسی میں آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے کس طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ ”المعانی المختار في صناعة الانشاء“۔

۴۔ ایک مجموعہ اشعار اس نے ترتیب دیا ہے جس میں ابو تمام، بختری، دیک الجن اور متنبی کے اشعار ہیں۔

۵۔ ”دیوان الترسل“: اس کے رسائل کا مجموعہ کئی جلدوں میں ہے۔ ”المثل السائر“ میں خود اس نے ذکر کیا ہے کہ میرے رسائل کئی جلدوں میں ہیں۔

۶۔ ”المختار من دیوان الترسل“: ایک جلد میں ہے۔

۷۔ ”الجامع الكبير في صناعة المنظوم والمنثور“: اس کتاب کے مخطوطے کے دو نسخے دار لکتب المصریة میں محفوظ ہیں۔

۸۔ ایک مخطوطہ ۱۲۰۵ھ کا ہے اور دوسرا ۱۳۱۴ھ کا۔

مندرجہ بالا تمام کتابوں سے ہمیں شاہی فرامین نویسی میں ضیاء الدین کے خصوصیات کا علم ہوتا ہے۔ اس کی توجہ سنج، صورت بیانہ اور محسنات بدلیج پر نمایاں ہیں۔ وہ قرآن و حدیث کے اقتباسات اور اشعار کو نثر کے قالب میں ڈھالتا ہے اور اپنی تحریروں سے اس کی مثالیں پیش کرتا ہے۔

ایک مکتوب میں آیات قرانیہ سے اقتباس کر کے جنگ کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے:

”و عقد العجاج شققا فان عقد، و ارانا كيف رفع السماء بغير عمد غير انها سماء بنيت بسنابك الجياد، وزينت بنجوم الصعاد، ففيها مايو عد من المنيا لا مايو عد من الارزاق ومنها تقذف شياطين الحرب لا شياطين الاستراق“۔
(غبار نے شفق بنا کر ہمیں دکھایا کہ بغیر ستون کس طرح آسمان بلند ہے، البتہ یہ آسمان گھوڑوں کی کھروں سے بنایا گیا ہے، اور اسے نیزوں کے ستاروں سے مزین کیا گیا ہے، اس میں موت کے وعدے ہیں، رزق کے نہیں، ان سے جنگ کر کے شیاطین کو مارا جاتا ہے، کان لگا کر سننے والوں کو نہیں)۔

اس کے ایک خط کا نمونہ جو اس نے الملک الافضل (نور الدین) کی طرف سے اس کے چچا الملک العادل کو لکھا تھا:

”ندمت على أمر مضى لم يشر به نصيح ولم يجمع قواه نظام رب وثوق يقود الى الندم، وتود ديد عوالى التهم، وقد يدل اللحم على صاحبه، ويطمع في جانبه، ولو لا ذلك لمارستلين عودى ففجم، واستضعف ركنى فهدم، ولا شكوما اشكوه الا الى عمى، وصنوبى الذي نفره نفري، وهو الذي قلب فواقى على وترى، وعلمنى التظلم من الايام وأرانى ضوء النهار بعين الا ظلام، ولقد أضاع فى احسانه وخالف فى قطع رحمة سنة الله وكتابه، وجعل ايامى منه كيوم البعث الذي يتناكر الناس فى انسابه وأسبابه“۔

ضیاء الدین ابن الاثیر کے ہم عصر مؤرخوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے زمانہ وزارت میں حکومت کے کارندوں سے بھی اچھی طرح پیش نہیں آتا تھا اور حکومت کے معاملات میں اس کی وجہ سے خرابی پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے وہ الملک الافضل اور اس کے بھائی الملک العزیز کے درمیان نزاع کا سبب تھا۔ جب بھی الملک الافضل اپنے بھائی سے صلح صفائی کرنا چاہتا تھا، ابن الاثیر آڑے آ کر دونوں میں منافرت کو مزید بڑھاتا تھا۔ پھر اس نے اپنے محسن قاضی فاضل کو جس نے اسے بادشاہ سے ملایا تھا اپنے سلوک سے سخت ناراض کر دیا تھا اور دمشق سے مصر بھجوانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ بہر حال اس طبقہ کے ادیبوں میں تو ریہ اور تجنیس کے غلو نے انشا پردازی کو تکلفات اور تصنع کا مجموعہ بنا دیا۔ یہ اسلوب تحریر اگر رسائل نویسی، شاہی فرامین اور عہد ناموں تک محدود رہتا تھا تو ٹھیک تھا لیکن بعد میں آنے والوں نے تو کتابوں کی تصنیف اور علوم کی تدوین میں اسی اسلوب کو اپنالیا مثلاً ”ناریخ العتبی“ اور ”الفتح القدسی“ وغیرہ۔ جہاں تک ابن الاثیر کا مرتبہ ہے تو بجا طور پر وہ عمدہ اور ماہر انشا پردازوں میں تھا۔ عراق میں اس کے بعد اس درجہ کا کوئی دوسرا رسائل نگار نہیں پیدا ہوا۔

15.6 اکتسابی نتائج

بلاشبہ عباسی دور علوم و فنون کی ترقی کا سنہرا دور تھا۔ اس دور کی اہمیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ بیش تر فنون کے ماخذ اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ترجمہ کے ذریعہ دیگر علوم عربی زبان میں منتقل ہوئے۔ طب، کیمیا، علم نجوم، فلسفہ، ادب، تفسیر، علم حدیث، فقہی ادب، تاریخی ادب،

ریاضی، ہندسہ، موسیقی، علم کلام، ہیئت اور فلکیات پر تصانیف کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ اس عہد کو اسلام کا زریں عہد کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا بقول احمد حسن زیات ”مسلمان تمدن و تہذیب اور عمران و اقتدار کے لحاظ سے اس قدر بلند مقام پر پہنچ گئے تھے کہ اس سے قبل یا اس کے بعد پھر کبھی اس بلندی پر نہ پہنچے۔ فنون اسلامیہ اس دور میں پھلے پھولے، آداب عربیہ نے نشوونما پائی، غیر ملکی علوم کے ترجمے ہوئے، عقل عربی پختہ ہوئی اور اس نے غور و فکر، بحث و تمحیص کے لیے ایک وسیع جولان گاہ پائی..... تا آنکہ ہلاکوخاں نے ۶۵۶ھ میں اس حکومت کا تختہ الٹ دیا اور حکومت کے زوال کے ساتھ اس کے تمدن و ادب میں بھی انحطاط ہوتا گیا اور بالآخر حکومت کے خاتمہ پر ان کے آداب و تمدن کا بھی خاتمہ ہو گیا“۔

عہد عباسی میں عربی نثر نگاری کو کافی فروغ ہوا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ علوم و فنون کے دائرہ میں وسعت کا پیدا ہونا تھا کہ علمی موضوعات کا احاطہ شعری قالب میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسی وجہ سے اس عہد میں جتنی ترقی نثر کی ہوئی اتنی ترقی عربی ادب کی تاریخ میں عصر جدید کو چھوڑ کر کسی اور عہد میں نہیں ہوئی تھی۔ اس عہد میں جہاں ایک طرف نثر میں خالص ادبی موضوعات جیسے سفر نامے اور تنقید وغیرہ پروان چڑھے تو دوسری طرف لسانی علوم جیسے نحو و لغت جیسے علوم و فنون نے ترقی کے منازل طے کیے۔ ان علوم و فنون کے ساتھ سماجی علوم جیسے تاریخ و جغرافیہ، سائنسی علوم جیسے کیمیا اور طبیعیات وغیرہ کے موضوع پر عہد عباسی کے علماء نے گراں قدر تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کتب نے جہاں ایک طرف عربی نثر نگاری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا وہیں عربی زبان کے دامن کو اس قدر وسیع کر دیا کہ اس میں کسی بھی قسم کے موضوع کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔

15.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

- ۱- عہد عباسی میں نثر نگاری کے ارتقائی مراحل پر روشنی ڈالیے۔
- ۲- عہد عباسی میں فن خطابت کے ارتقاء پر ایک نوٹ لکھیے۔
- ۳- عہد عباسی میں نثر نگاری کے فروغ کے اسباب و عوامل اور اس کے امتیازات و خصائص بیان کیجیے۔
- ۴- عہد عباسی کے نثر نگاران کے کتنے طبقات پائے جاتے تھے؟
- ۵- عہد عباسی کے اصناف نثر جائزہ لیجیے۔

15.8 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

- | | |
|------------------------------|--------------------------------------|
| ڈاکٹر شوقی ضیف | - تاریخ الأدب العربی (العصر العباسی) |
| حنافا خوری | - الجامع فی تاریخ الأدب العربی |
| احمد حسن زیات | - تاریخ الأدب العربی |
| احمد امین | - ضحی الاسلام، جلد سوم |
| شوقی ضیف ترجمہ شمس کمال انجم | - عربی نثر فی تاریخ |
| مقتدی حسن ازہری | - تاریخ ادب عربی حصہ سوم |

اکائی 16 عصر عباسی میں شاعری

- اکائی کے اجزا
- 16.1 مقصد
 - 16.2 تمہید
 - 16.3 عصر عباسی کی شاعری
 - 16.3.1 عہد عباسی کے شعرا کا اصطلاحی لقب
 - 16.3.2 عہد عباسی میں شاعری کے مراکز
 - 16.4 عصر عباسی کی شاعری کے موضوعات
 - 16.5 عصر عباسی کے شعرا کی موضوعاتی تقسیم
 - 16.6 عصر عباسی کی شاعری کے امتیازات و خصوصیات
 - 16.7 عصر عباسی کی شاعری کے ممتاز شعرا
 - 16.7.1 بشار بن برد
 - 16.7.1.1 شاعری
 - 16.7.2 ابونواس
 - 16.7.2.1 شاعری
 - 16.7.3 ابوالعتمہیہ
 - 16.7.3.1 شاعری
 - 16.7.4 ابوتمام
 - 16.7.4.1 کتاب الحماسة
 - 16.7.4.2 شاعری
 - 16.7.5 بختری

- 16.7.5.1 شاعری
- 16.7.6 متنبی
- 16.7.6.1 شاعری کا آغاز
- 16.7.7 ابوالعلاء معری
- 16.7.7.1 تصانیف
- 16.7.7.2 شاعری
- 16.8 اکتسابی نتائج
- 16.9 نمونے کے امتحانی سوالات
- 16.10 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

16.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھ کر ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ عہد عباسی میں عربی شاعری کا کیا مقام و مرتبہ تھا۔ اس عہد کی شاعری میں کیا نمایاں تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ کن کن اصناف سخن پر شعراء ادو تحسین وصول کر رہے تھے اور عہد عباسی کی شاعری کے نمایاں امتیازات اور خصائص کیا تھیں۔ اس عہد کے شعراء میں کن شعرا کو زیادہ مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی اور ان کی شہرت کے اسباب کیا تھے۔

16.2 تمہید

عصر عباسی، تاریخ ادب عربی کا زریں دور ہے۔ اس عہد میں عربی شاعری میں نمایاں ترین تبدیلیاں ہوئیں۔ شاعری صحرا و بیابان سے نکل باغات اور محلات کے ارد گرد گھومنے لگی۔ نئے نئے موضوعات پر شعرا نے طبع آزمائی کرنی شروع کر دی۔ فلسفیانہ افکار و آرا کے نمایاں اثرات شاعری پر مرتب ہوئے بلکہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم شاعری کے بجائے کوئی فلسفہ کی کتاب پڑھ رہے ہیں۔

16.3 عصر عباسی کی شاعری

عصر اموی میں شاعری اپنے قدیم اسلوب پر گامزن رہی تاہم اس کے موضوعات میں تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے جیسے غزل نے بحیثیت صنف اسی عہد میں اپنے بال و پر نکالے، سیاسی شاعری کے خد و خال نمایاں ہونے لگے تھے لیکن اسلوب میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی بلکہ اس عہد کے بڑے بڑے شعرا قدیم اسلوب کی پیروی کو ہی اعلیٰ شاعری کا پیمانہ سمجھتے تھے۔ قدیم جاہلی شاعری کی اتباع اور پیروی ہی معیار و مرتبہ کی کسوٹی قرار دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اولین ناقدین نے عصر عباسی کی ابتدائی شاعری کو قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

عہد عباسی کی شاعری کے فروغ اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کی اہم وجہ یہ تھی کہ انشا پردازوں کے مقابلہ میں شعرا کو خلفاء، حکما اور امرا کی خلوتوں میں رہنے کا زیادہ موقع ملا تھا کہ وہ اپنی مبالغہ آمیز مدحیہ شاعری سے ان کے دربار کا اہم حصہ بن جاتے تھے۔ عباسی شعرا نے شاعری کے میدان میں مکمل یکسوئی کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے اس کے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور مختلف قسم کے شہ پاروں سے عربی شاعری کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ انھیں اپنی صلاحیتوں کے اظہار و بیان کا جتنا موقع اس عہد میں ملا وہ کسی اور دور میں میسر نہیں آسکا لہذا وہ مکمل آزادی کے ساتھ اپنے فکر و فن کو شاعری کے قالب میں ڈھالنے لگے

عصر اموی کے اواخر اور عہد عباسی کے ابتدائی دور میں جب تحریک موالی کا آغاز ہوا اور انھوں نے قدیم طرز سے ہٹ کر ایک نئے انداز میں شاعری کا آغاز کیا تو اس عہد کے علما اور ناقدین ادب نے ان کے طرز کو ناپسندیدہ قرار دیا جس کی وجہ سے وہ قدیم جاہلی اسلوب کی پیروی کرنے پر مجبور ہو گئے لیکن انھوں نے غیر محسوس انداز میں اسلوب میں تبدیلی کا آغاز کر دیا تھا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے عربی شاعری کی ماہیت اور موضوعات کو تبدیل کر دیا تھا۔

عہد عباسی کے ابتدائی دور کے شعراء میں کچھ شعراء ایسے بھی ہیں جنہیں عہد اموی کا آخری زمانہ ملا۔ ایسے شعرا کو تین زمروں میں تقسیم کیا

جاتا ہے:

پہلا زمرہ ان شعراء پر مشتمل ہے جنہوں نے قدیم اسلوب کو ہی مکمل طور پر اختیار کر لیا تھا اور روایتی انداز میں اپنی شاعری کے جلوے

بکھیرتے رہے تھے۔ انھوں نے نئے انداز بیان اور اسلوب شاعری کو قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا جیسے مروان بن ابی حفصہ (182-105ھ) 798-723ء)۔ مروان بن حفصہ نے خاص طور سے اموی اسلوب شاعری کو اپنایا۔ اسے شاعری کے میدان میں جریر و فرزدق کے مکتب شاعری کا نمائندہ شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کی طرح وہ اپنے قصائد کی سال بھر نوک و پلک درست کرتا رہتا تھا اور مکمل طور پر مطمئن ہونے کے بعد ہی اسے لوگوں کے سامنے پیش کرتا تھا۔

دوسرا زمرہ ان شعرا پر مشتمل ہے جنھوں نے اپنی شاعری کو بدوی انداز فکر میں پیش کیا جیسے ابن ہرملہ (176-80ھ) اور حسین بن مطیر (وفات 170ھ / 786ء) وغیرہ۔ اول الذکر کے بارے میں مشہور ناقد اصمعی کا قول ہے کہ اس کی وفات کے ساتھ ہی اصل عربی شاعری کا خاتمہ ہو گیا۔ ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ آخری شاعر ہیں جن کے اشعار سے لغوی استشہاد کیا جاسکتا ہے۔

تیسرا زمرہ ان شعرا پر مشتمل ہے جنھوں نے قدیم کی حفاظت کرتے ہوئے جدید اسلوب کو اختیار کیا اور اپنی شاعری میں قدیم و جدید اسلوب کو یکجا کر دیا جیسے بشار بن برد اور ابونواس وغیرہ۔ شعرا کی اس جماعت نے شاعری کے دونوں انداز و اسلوب میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھرپور انداز میں اظہار کیا۔

عہد عباسی کے ابتدائی دور کے ان شعرا کے خاتمہ کے بعد شعرا کی ایک نئی جماعت منظر عام پر آئی جو خالص جدید طرز و اسلوب کے ذریعے عربی شاعری کے نئے آفاق سے دنیا کو روشناس کرائی۔

جدید طرز اسلوب کے قائل شعرا میں کچھ جیسے بشار اور ابونواس نے اعتدال کا دامن تھامے رکھا اور قدیم اسلوب کی افادیت کے ساتھ ساتھ جدید طرز نگارش کو بھی ضروری سمجھا جب کہ کچھ نے غلو کی راہ اختیار کرتے ہوئے قدیم اسلوب کو بالکل ہی ترک کرنے اور صرف جدید اسلوب اختیار کرنے پر زور دیا۔

عصر عباسی کی شاعری میں ہونے والی یہ تبدیلی صرف قصیدہ کی شکل اور مطلع کی تبدیلی ہی نہیں تھی بلکہ اس طرز اسلوب کے متبعین شعرا نے بجز و توانی میں بھی تبدیلی کرتے ہوئے اس کی موسیقیت میں اضافہ کر دیا۔ انھوں نے جدید تہذیب و ثقافت سے استفادہ کرتے ہوئے نئے تجربات کیے جنہیں اتفاق سے دوام حاصل نہ ہو سکا۔ انھوں نے مقطعات، محسنات اور مسمطات جیسے اسلوب سے عربی شاعری کو روشناس کیا۔ مزید یہ کہ انھوں نے معانی میں جدت پیدا کی، الفاظ اور تراکیب میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں جس نے آگے چل کر علم بدیع کی بنیاد رکھ دی۔

عہد عباسی کی شاعری اپنے مقاصد، موضوعات، مضامین، خیالات، لفظیات اور اسلوب کے حوالہ سے ماقبل کی عربی شاعری سے جداگانہ نظر آتی ہے۔ اس عہد کی شاعری کے اہم مقاصد عصبیت اور نسبی مفاخرت کے ساتھ ساتھ اپنی پسند کی سیاسی، دینی اور مذہبی نقطہ نظر کو فروغ دینا اور کسب معاش کا اہم ذریعہ بنانا وغیرہ ہیں۔ اس عہد کی شاعری کے موضوعات میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں تھیں جن کا تفصیلی ذکر آگے کیا جائے گا۔

لفظیات اور اسلوب کے حوالہ سے اس عہد کی شاعری میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں تھیں جیسے نامانوس اور بھاری بھر کم الفاظ کا استعمال کم کیا جانے لگا، بدوی زندگی سے متعلق الفاظ کا استعمال بتدریج کم کیا ہونے لگا، عجمی الفاظ کا استعمال کیا جانے لگا۔ شاعری کے اسلوب بیان میں نفاست اور باریکی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ عربی کے خالص محاورے اور وضاحت کلام کا خیال رکھتے ہوئے صنعت بدائع اور اس کی مختلف

انواع کو کثرت سے برتا گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بحروں کو بکثرت استعمال کیا گیا۔ دیگر نئے اوزان و بحر جیسے مستطیل و منند کا اضافہ ہوا۔ شاعری کی اقسام میں جہاں ایک طرف موشح، زجل، دوبیت، موالیا کا اضافہ ہوا تو دوسری طرف توانی میں مسمط اور مزدوج کو فروغ ہوا۔

قصائد کی ابتدا کھنڈرات کے بجائے محلات و باغات اور شراب وغیرہ سے کرنا، مدح اور ہجو میں مبالغہ آمیزی، تشبیہ و استعارہ کا بکثرت استعمال، قصیدہ کے مختلف اجزا میں تناسب و موزونیت کا پایا جانا اور بندش میں ترتیب کی رعایت کا خیال رکھنا وغیرہ کو اس عہد کے اسلوب شاعری میں ہونے والی تبدیلیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

عصر عباسی میں شاعری کو فروغ دینے میں جہاں خالص عرب افراد نے اپنا اپنا کردار بخوبی انجام دیا تھا وہیں اس کو فروغ دینے اور پروان چڑھانے میں اہل عجم نے بھی نمایاں کردار ادا کیا تھا بلکہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عہد عباسی کی شاعری اہل عجم کی ہی مرہون منت ہے کہ اس عہد کے نمایاں ترین شعرا کا تعلق دیار عجم سے تھا اور انھوں نے عربی شاعری کے طرز و اسلوب، مضامین و موضوعات، معانی و خیالات اور اوزان و بحر وغیرہ میں نمایاں تبدیلیاں کرتے ہوئے عربی شاعری کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا تھا اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے شاعری کے عمدہ ترین شہ پاروں سے عربی شاعری کے دامن کو بھر دیا تھا۔

16.3.1 عہد عباسی کے شعرا کا اصطلاحی لقب

عہد عباسی کے شعرا کو ”الشعراء المولدون“ اور ”الشعراء المحدثون“ کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے۔ اول الذکر اصطلاح و لقب سے مراد وہ شعرا لیے جاتے ہیں جنھوں نے عباسی خلافت کا ابتدائی زمانہ پایا تھا۔ شعرائے مولدین کا لقب عام طور سے دوسری صدی ہجری کے شعرا کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ثانی الذکر اصطلاح و لقب کا اطلاق عام طور پر ان شعرا پر کیا جاتا ہے جن کی ولادت تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد ہوئی تھی اور انھوں نے طبقہ مولدین کے بعد شاعری کے رنگ و آہنگ میں نمایاں تبدیلیاں کی تھیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ بعض ناقدین ادب و فنوں مصطلحات میں کسی قسم کا فرق نہیں کرتے ہیں جیسے ابن المعتز نے اپنے زمانہ تک یعنی تیسری صدی کے جملہ عباسی شعرا کو ”شعراء محدثین“ قرار دیا ہے۔ اسی طرح دیگر ناقدین ادب تمام عباسی شعرا کو ”شعراء مولدین“ میں شمار کرتے ہیں۔

ان دونوں طبقوں یعنی ”الشعراء المولدون“ اور ”الشعراء المحدثون“ کے لیے عام طور ”الشعراء المبدعون“ کی اصطلاح کا استعمال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے شاعری کے اسلوب اور اس کی مختلف اصناف میں نئے رنگوں کا اضافہ کیا تھا۔ اس طبقہ کا سرخیل بشار بن برد کو قرار دیا جاتا ہے کہ اسے ”الشعراء المولدون“ اور ”الشعراء المحدثون“ دونوں طبقات میں شمار کیا جاتا ہے۔

16.3.2 عہد عباسی میں شاعری کے مراکز

عہد عباسی کی شاعری کے حوالہ سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں شاعری کے مختلف مراکز تھے۔ ابتدائی سو سال میں صرف بغداد ہی شاعروں کی آماجگاہ تھا اور وہیں کی فضاؤں میں مسحور کن شاعری کے نغمے گونج رہے تھے لیکن جوں جوں

مرکزی خلافت میں کمزوری آتی گئی توں توں عربی شاعری کو مختلف پناہ گاہیں ملتی گئیں اور اس کے مختلف مراکز سامنے آتے چلے گئے اور وہ بغداد سے نکل کر ایران، شام، مصر اور مغرب میں اپنے جلوے بکھیرنے لگی۔ مرکزی خلافت کے عہد انتشار میں عربی شاعری کو بنو بویہ اور آل حمدان جیسے قدرداداں میسر آگئے تھے جنہوں نے شعرا کو دل کھول کر انعامات و اکرامات سے نوازا جس کی وجہ سے عربی شاعری دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی۔ عہد انتشار میں امرا، رؤسا اور حکما، عباسی خلفا کی نیابت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ان کا دربار اور نجی مجلسیں شعرا کی آماجگاہ بن گئیں تھیں جہاں ان پر داد و دہش کی بارش کی جاتی تھی اور انہیں گراں قدر انعامات و اکرامات سے نوازا جاتا تھا۔ ثعالبی نے اپنی کتاب ”یتیمۃ الدھر“ میں شعرا کی ایک طویل فہرست دی ہے جس پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سیاسی انتشار نے عربی شاعری کے فروغ میں کس قدر اہم کردار ادا کیا تھا۔

16.4 عصر عباسی کی شاعری کے موضوعات

عصر عباسی میں شاعری اپنے نئے پیراہن میں نظر آتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ قدیم و جدید کا ایک ایسا خوبصورت و حسین سنگم پیش کرتی ہے جس کا نمونہ کسی اور دور میں نہیں ملتا ہے۔ قدیم موضوعات کے ساتھ ساتھ جدید موضوعات پر بھی اظہار سخن کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس عہد کے قدیم موضوعات میں مدح، رثا، ہجو، وصف نگاری، فخر و مباہات، عتاب کے موضوعات پر زیادہ شعری سرمایہ ملتا ہے۔ حالات کے تقاضے اور ماحول کی تبدیلی کے نتیجے میں ان قدیم اصناف سخن میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلیاں پیدا ہوئیں تھیں۔

شاعر اپنے زمانے کے تقاضوں اور ماحول اور حالات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے۔ کسی بھی ماحول میں ہونے والی نئی تبدیلیاں شعرا پر اثر انداز ہوتی ہیں اور وہ ان سے بالواسطہ یا بلا واسطہ متاثر ہو کر ان کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس اصول و ضابطہ سے عباسی عہد کے شعرا بھی بے نیاز نہیں رہے اور انہوں نے حالات سے متاثر ہو کر کچھ نئے موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا جیسے زہد و تصوف اور غزل و غلمان وغیرہ۔ ان نئے موضوعات میں سیاسی شاعری، مذہبی شاعری وغیرہ کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے کہ وہ کبھی مدح کے ضمن میں، کبھی ہجو کی شکل میں اور کبھی موازنہ و مقابلہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان جدید موضوعات کے بالمقابل عباسی شعرا نے قدیم موضوعات اور مروجہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے تاہم ان کے اس فضل و برتری کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ انہوں نے ان قدیم موضوعات میں سے بعض موضوعات کے دائرہ کو مزید وسعت بخشی تھی جیسے وصف نگاری میں عام طور پر صحرا و بیابان، جانور، محبوبہ اور ان جیسے موضوعات کو مد نظر رکھا جاتا تھا لیکن عہد عباسی میں وصف نگاری کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا کہ عالی شان محلات اور اس کے لوازمات کو شعری قالب میں ڈھالا جانے لگا، شراب اور گانے کی مجلسوں کا نقشہ لفظوں میں کھینچا جانے لگا، مغنیوں اور مغنیات کا سراپا بیان کیا جانے لگا، شراب اور اس کے برتن، ساقی اور دیگر لوازمات کی تصویر کشی الفاظ کی مدد سے کی جانے لگی۔ دل فریب اور خوش منظر باغات، میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کا نقشہ الفاظ میں کچھ اس طرح کھینچا جانے لگا کہ پڑھنے والا خود کو وہیں پاتا۔

عصر عباسی کی مدحیہ شاعری میں ایک نمایاں تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ مدحیہ قصائد کے روپ میں سیاسی اور مذہبی شاعری کی جانے لگی تھی کہ شعرا اپنے اپنے سیاسی، دینی اور مذہبی رجحانات کو مدحیہ قصائد میں پیش کر کے خلیفہ وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور کافی

حد تک اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے کہ اس کے نتیجے میں انہیں انعامات و اکرامات سے نوازا دیا جاتا تھا۔

عصر عباسی کی ہجو یہ اور رثائیہ شاعری کا حال بھی تقریباً عصر اموی کی مدحیہ شاعری کی طرح تھا کہ شعرا اپنے قصائد میں خلیفہ وقت، امراء دربار اور صاحب اثر و رسوخ حضرات کی چشم ابرو کا خیال رکھنے لگے تھے تاکہ وہ ان سے خوش رہیں اور انہیں داد و دہش اور مال و دولت سے نوازدیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ عصر عباسی میں ہجو کے مقابلہ میں مرثیہ کا دامن زیادہ وسیع ہوا تھا کہ اس کی ایک بالکل نئی شکل ”رثاء المدین“ (شہروں کے نوے) کا ظہور ہوا جس نے آگے چل کر ایک صنف کی حیثیت اختیار کر لی تھی، خاص طور سے فارسی شاعری میں۔ مرثیہ کی اس مخصوص قسم میں متعدد شہروں کی بربادی و بیابانی پر نوحہ پڑھا گیا خاص طور سے بغداد کی بربادی کا ذکر اتنے مؤثر انداز میں کیا گیا ہے اسے پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے اور آنکھیں پر نم ہو جاتی ہیں۔

عصر عباسی کی شاعری کے بالکل نئے موضوعات میں سے ایک طرف زہدیہ اور صوفیانہ شاعری کا آغاز ہوتا ہے تو دوسری طرف غزل، غلمان اور وصف شراب جیسے موضوعات بھی پروان چڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان جیسے موضوعات میں فسق و فجور، فحاشی اور بدکاری کا اعتراف بر ملا کیا جانے لگا۔ شاعری کے یہ دونوں رنگ بالکل متضاد کیفیت کے حامل ہونے کے باوجود عصر عباسی کے سماجی، ثقافتی ماحول کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔

اس عہد کی شاعری کے بالکل نئے موضوعات میں ”الطردیات“ (شکاریات) کا بھی شمار ہوتا ہے جس میں شکار کے سفر کا نقشہ کھینچا جاتا ہے، شکار کرنے کے مختلف طریقوں کو الفاظ کا جامہ پہنایا جاتا ہے۔ شکاری جانوروں اور شکار کیے جانے والے جانوروں کے اوصاف کو الفاظ کے قالب میں یوں ڈھال دیا جاتا ہے کہ قاری خود کو اس کا ایک جز سمجھنے لگتا ہے۔

مختصر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی کے تقاضوں کے مطابق اور اس وقت کے ماحول و حالات سے متاثر ہو کر شعرا نے اپنی شاعری کے محور نگاہ کو تبدیل کر لیا تھا اور ان کی شاعری صحرا کی بے پایاں وسعت، فطری مناظر، کھنڈرات، مٹی کے مکانات اور خیموں کی تصویر کشی کرنے کے بجائے شہری زندگی کی رونق اور لوازمات، محلات و باغات، لہو و طرب اور دوستوں کے ساتھ راگ و رنگ کی محفلوں کی عکاسی کرنے لگی تھی۔ شاعری کے قدیم موضوعات جیسے مدح و فخر وغیرہ میں کچھ نئے موضوعات جیسے زہدیہ شاعری اور وصف غلمان وغیرہ کا اضافہ ہوا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مزاح اور ظرافت کے کچھ نمونے بھی اس عہد میں ملتے ہیں۔

16.5 عصر عباسی کے شعرا کی موضوعاتی تقسیم

عصر عباسی کا زمانہ پانچ سو سال سے زائد عرصہ پر محیط ہے۔ اس عرصہ میں نہ صرف قدیم اصناف سخن پر داد و تحسین کے حصول کے ساتھ ساتھ ان میں نئی تبدیلیاں کی گئیں بلکہ کچھ بالکل نئے اور جدید موضوعات کو شاعری کا موضوع بنایا گیا۔ عصر عباسی میں عربی شاعری اپنے نئے رنگ و روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے اور اپنے حسن و جمال کے جلوے بکھیرتے ہوئے نظر آتی ہے جس کی وجہ سے عہد عباسی کے شعرا کو حسب ذیل مختلف جماعتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

☆ شعراء البداوة: اس طبقہ سے مراد وہ شعرا ہیں جو جزیرہ عرب خاص طور سے نجد و حجاز سے تعلق رکھتے تھے لیکن بصرہ، کوفہ اور

بغداد میں جا بسے تھے۔ ان شہروں میں بود و باش اختیار کرنے کے باوجود ان کی زندگی بدویانہ طرز پر گذرتی تھی اور اپنی شاعری میں مانوس بدوی الفاظ اور تعبیرات وغیرہ کا استعمال کرتے تھے۔ اس طبقہ کے مشہور شعرا میں ابن میادہ، ابن ہر مہ اور حسین بن مطیر کا شمار ہوتا ہے۔

☆ الشعراء المجددون: اس طبقہ میں ان شعرا کا شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے عربی شاعری کے ظاہری خدوخال اور طرز و اسلوب میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کی تھیں جن کی وجہ سے عربی شاعری کا ایک نیا رنگ و آہنگ سامنے آیا۔ اس طبقہ کے مشہور شعرا میں بشار بن برد اور ابونواس کا شمار ہوتا ہے۔

☆ الشعراء المفتنون: اس طبقہ کے مشہور شعرا میں ابوالشیخ، ابراہیم موصلی، اسحاق بن ابراہیم موصلی، ربیعۃ الرقی، الشیخ سلمیٰ، حسین بن ضحاک کا شمار ہوتا ہے۔

☆ شعراء الصنعة: اس طبقہ کے ممتاز شعرا میں مسلم بن ولید ملقب بہ صریح الغوانی، ابوتام، ابن المعتز جیسے شعرا شامل ہیں۔
☆ الشعراء المحافظون: اس طبقہ سے مراد وہ شعرا لیے جاتے ہیں جنہوں نے قدیم اسلوب شاعری کو زندگی بھر برتا اور اپنی شاعری کو زمانہ اور ماحول سے مکمل طور محفوظ رکھا۔ اس طبقہ کا نمائندہ شاعر صرف سخری کو قرار دیا جاتا ہے۔

☆ الشعراء المبدعون: اس طبقہ کے اہم شعرا میں ابن الرومی جیسے شعرا شامل ہیں۔
☆ شعراء المذاهب والوجدان والفکر: شعرا کا یہ طبقہ مختلف رجحانات و میلانات کو اپنی شاعری میں پیش کرتا ہے۔ دراصل یہ طبقہ، مختلف خیالات، رجحانات و میلانات رکھنے والے شعرا کی ایک بڑی اکائی ہے جسے حسب ذیل طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے:
☆ شعراء العباسیة: اس طبقہ سے وہ شعرا مراد لیے جاتے ہیں جو حکومت عباسیہ کے مختلف مناصب پر فائز تھے جیسے مروان بن حفصہ، علی بن جبلة اور علی بن جہم۔

☆ شعراء الشبعة: اس طبقہ میں وہ شعرا شامل کیے جاتے ہیں جو آل بیت میں سے حضرت علی اور ان کی اولاد کو خلافت و حکومت کا مستحق اور آل عباس کو ان کا حق غصب کرنے والا سمجھتے تھے جیسے سید حمیری اور دعبیل بن علی خزاعی۔
☆ شعراء العشق: عشق و محبت کے مارے ہوئے شعرا میں عباس بن احنف، عکاشہ العجمی، ابوبکر محمد بن داؤد اصفہانی کا نام لیا جاتا ہے جنہوں نے اپنی شاعری میں صرف عشق و محبت کے نغمے گائے ہیں۔

☆ شعراء الزهد والحکمة والمواعظ: عصر عباسی میں پروان چڑھنے والی اس جدید صنف کے نمائندہ شعرا میں صالح بن عبدالقدوس، احمد بن معذل، ابوالعتاہیہ، ابونواس اور محمود وراق کا شمار ہوتا ہے۔

☆ شعراء علماء عصر عباسی کی فضاؤں میں شاعری یوں رچ بس گئی تھی کہ اس زمانہ کے جید علماء بھی اس کی زلف کے پرستار نظر آتے ہیں۔ اس عہد کے جن علماء و فضلاء نے اس میدان میں اپنے نمونے بطور یادگار چھوڑے ہیں ان میں عتابی، ابوالعباس ناشی اکبر، ابن داؤد ظاہری اور یحییٰ بن علی بن یحییٰ منجم کا بطور خاص ذکر کیا جاسکتا ہے۔

☆ شعراء الطبع والزندقة: اس طبقہ کی نمائندگی کرنے والے شعرا میں مطیع بن ایاس، والہ بن حباب اور یحییٰ بن زیاد جیسے شعرا شامل ہیں۔ ان شعرا نے ساری زندگی صرف فسق و فجور اور اخلاق و کردار کو خراب کرنے والے موضوعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا۔ اسی

طبقہ میں ابوالعناہیہ اور ابونواس کا شمار بھی کیا جاتا ہے لیکن چونکہ انھوں نے آخری زندگی میں توبہ کر لی تھی اس لیے خواتیم کا اعتبار کرتے ہوئے ان کا ذکر اس طبقہ کی بجائے دیگر طبقات میں کیا جاتا ہے۔

شعرا کی مذکورہ بالا موضوعاتی تقسیم سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد کی شاعری کے کیا رنگ و روپ تھے۔ اسی طرح یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عربی شاعری کے دیگر ادوار کی طرح اس عہد میں شعرا کا ایک مخصوص طبقہ نہیں تھا جو صرف شاعری کرتا تھا بلکہ اس عہد کے شعرا میں شعرا کے مخصوص طبقہ کے ساتھ سماج کے مختلف طبقات جیسے عباسی خلفاء، امراء، وزرا وغیرہ بھی اپنے اپنے جذبات و خیالات کو شعری قالب میں ڈھال رہے تھے لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ عصر عباسی کی شاعری کو فروغ دینے میں سماج کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس عہد کی شاعری کو فروغ دینے میں عباسی خلفاء میں سے ہارون رشید، مامون، مہدی اور واثق نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے شانہ بہ شانہ عباسی وزرا۔ جیسے قاضی احمد بن داؤد۔ اور دیگر امرا و قائدین و عمائدین سلطنت۔ جیسے ابودلف عجل۔ بھی چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

16.6 عصر عباسی کی شاعری کے امتیازات و خصوصیات

عہد عباسی کی شاعری دیگر ادوار کی شاعری سے مختلف حیثیتوں سے ممتاز و منفرد نظر آتی ہے۔ اس عہد کی شاعری کے امتیازات و خصائص کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

- ☆ عربی۔ عجمی عصبيت کا فروغ جسے شعوبیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔
- ☆ شاعری میں سیاسی، مذہبی اور دینی عناصر کا شامل ہونا۔
- ☆ مدح، ہجو اور مرثیہ کے آفاق میں وسعت پیدا ہونا، خاص طور ”رثاء الممدن“ (شہروں کے نوحے) کا ظہور۔
- ☆ عربی شاعری کے مروجہ اصناف جیسے مدح، وصف، ہجو اور مرثیہ وغیرہ میں نمایاں تبدیلیاں جیسے مدح و ہجو میں مبالغہ آمیزی اور وصف کے موضوعات میں تبدیلی جیسے کھنڈرات کی بجائے باغات و محلات وغیرہ کی تصویر کشی۔
- ☆ فحاشی و بدگوئی کی ابتدا۔
- ☆ غزل حقیقی کے ساتھ ساتھ غزل غلمان / امرد پرستی کا آغاز۔
- ☆ شاعری میں فلسفیانہ افکار و خیالات اور حکمت و دانائی کی آمیزش کی ابتدا۔
- ☆ مختلف نئی اصناف کا ظہور جیسے خمریات، زہدیات، طردیات اور غزل غلمان / امرد پرستی وغیرہ۔
- ☆ حکایتوں کو نظم کے قالب میں پیش کرنا۔
- ☆ علمی اور دینی مباحث کو شعری قالب میں ڈھالنا۔
- ☆ شاعری کے موضوعات و مضامین، افکار و خیالات و معانی اور اسلوب میں تبدیلی۔
- ☆ خیالات اور تصورات کے اظہار میں تخیل (Imagination) کا سہارا لینا۔
- ☆ بدائع و صنائع کا کثرت سے استعمال۔

☆ مروجہ بحروں میں چھوٹی بحروں کا بکثرت استعمال اور کچھ نئی بحروں - جیسے مستطیل اور ممتد - اور توانی - جیسے مسط اور مزدوج - کے استعمال کرنے کا آغاز۔

☆ غیر مانوس اور بھاری بھرم الفاظ کے استعمال سے اجتناب۔

☆ بدویانہ زندگی کے بجائے شہری زندگی کی تصویر کشی۔

☆ قصیدہ کے اجزا میں تناسب اور موزونیت کے ساتھ ساتھ افکار و خیالات میں ربط کا پایا جانا۔

☆ شاعری کا کسب معاش کا اہم ذریعہ بنا۔

16.7 عصر عباسی کے ممتاز شعرا

16.7.1 بشار بن برد

عصر عباسی کے مشہور ترین شعرا میں بشار بن برد کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے وطن اصلی کے تین مؤرخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق وہ مشرقی ایران کے رہنے والا تھے۔ دوسرے قول کے مطابق ان کا خاندان طخارستان اور تیسرے قول کے مطابق خراسان کے رہنے والے تھے۔ مہلب بن ابی صفرہ نے ان کے والد کو ایک مہم کے دوران گرفتار کر کے بصرہ منتقل کر دیا تھا جہاں وہ ایتھیں بنانے کا کام کرتے تھے۔ بنو عقیل بن کعب کی ایک معزز عورت نے انہیں آزاد کر دیا۔ ان کی صحیح تاریخ ولادت کا بیان کہیں نہیں ملتا ہے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ ان کی ولادت 95ھ/714ء یا 96ھ/715ء میں بمقام بصرہ ہوئی تھی۔ ابتدائی زندگی اور بچپن کے حالات کا ذکر مصادر میں نہیں ملتا۔ موجودہ معلومات کے مطابق وہ بنو عقیل کے آزاد کردہ غلام (مولی) تھے اور ان سے ایک عرصہ تک وابستہ رہے۔ وہیں عربی زبان سیکھی جس کی صحت و فصاحت پر وہ زندگی بھر ناز کرتے رہے۔ وہ حد درجہ تک بد صورت و بد شکل اور نابینا ہونے کے باوجود صاحب اقتدار حضرات کے منظور نظر تھے کہ انھیں اپنی تعلیم اور فقرے بازیوں سے کسی کو بھی مرعوب کرنے کا ڈھنگ اچھی طرح سے آتا تھا۔

بشار بن برد کے اندر شاعری کا فطری مادہ پایا جاتا تھا کہ صرف دس سال کی عمر میں انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ بصرہ کے علمی و ادبی ماحول نے ان کی خداداد شاعرانہ صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ بصرہ ”مرید“ (کاروان سرائے) اس وقت نوجوان اور ابھرتے ہوئے فنکاروں کی نہ صرف آماجگاہ بنا ہوا تھا بلکہ اس نے ایک ”دبستان“ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ”مرید“ کی علمی و ادبی فضا میں وہ پروان چڑھا اور اس وقت کی شعری روایات میں اپنے آپ کو ڈھال کر عربی شعر و ادب کے ذخیرہ میں عمدہ اور بہتر اشعار کا اضافہ کیا۔

اموی دور کے ان کے مدد و حین میں سے ابن ہبیرہ، مسلم بن قتیبہ اور اموی خلافت کے آخری جانشین مروان وغیرہ شامل ہیں۔ عباسی خلافت و حکومت کے قیام کے وقت وہ صرف سینتیس (37) برس کے تھے۔ عصر عباسی میں ان کے مدد و حین میں بصرہ اور دیگر مقامات کے گورنرز - جیسے سلیمان عسبی اور اس کے بیٹے، عقبہ بن سلم اور اس کے بیٹے نافع - کا شمار ہوتا ہے۔

بشار بن برد، خلیفہ منصور کا منظور نظر شاعر تھا۔ شاعر کا خلیفہ وقت سے کیا تعلق تھا اس کا اندازہ اس کیا جاسکتا ہے کہ وہ ان کے قافلہ حج میں شامل تھے۔ انھوں نے خلیفہ منصور کی مدح میں کئی ایک قصائد لکھے ہیں لیکن آگے چل کر ان کے تعلقات خلیفہ سے کافی کشیدہ ہو گئے

تھے۔ خلیفہ منصور کے علاوہ انھوں نے خلیفہ مہدی کی شان میں بھی قصائد کہے ہیں لیکن ایک سازش کے نتیجہ میں وہ خلیفہ کی نگاہوں میں معتوب قرار پاتے ہیں اور انھیں قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ان کا خاندان چونکہ مشرقی ایران کا رہنے والا تھا لہذا ان کے اندر شعوبیت کے میلانات پائے جاتے تھے۔ اپنے اسی شعوبی میلانات کی وجہ سے وہ قدیم ایران کی شان و شوکت اور عظمت کا ذکر اپنی شاعری میں جا بجا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے بعض افکار و خیالات میں الحاد کا شائبہ پایا جاتا ہے۔

بشار بن برد کی وفات 168ھ/784ء میں ہوئی۔ متفقہ رائے کے مطابق وفات کے وقت ان کی عمر ستر سال سے متجاوز تھی۔ صفدی کے مطابق وفات کے وقت ان کی عمر 99 سال تھی، جب کہ ایک دوسرے قول کے مطابق وفات کے وقت وہ اپنی عمر کے ساتویں دہائی میں تھے۔ مؤخر الذکر قول کی تردید خود ان کے اشعار سے ہوتی ہے:

و حسبک أني منذ ستين حجة
أكيد عفاريت العدى وأكاد

عہد عباسی کے دیگر شعرا کے مقابلہ میں بشار بن برد اس لحاظ سے ممتاز و برتر قرار دیے جاسکتے ہیں کہ وہ قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مقرر و خطیب، انشا پرداز اور ناقد بھی تھے لیکن بحیثیت شاعر انھیں زیادہ شہرت و مقبولیت ملی تھی۔ وہ نہایت زود گو شاعر تھے۔ خود ان کے اپنے قول کے مطابق انھوں نے 12 ہزار قصائد کہے تھے لیکن بد قسمتی سے وہ سب کے سب محفوظ نہ رہ سکے۔ چونکہ وہ نابینا تھا لہذا اپنا کلام پیش کرنے کے لیے انھیں راویوں پر اعتماد اور بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ ان کے چار مشہور راوی بیان کیے جاتے ہیں جن میں خلف الاحمر کا نام بھی شامل ہے۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خلف الاحمر نے بھی ان کا دیوان جمع کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جس کے نتیجہ میں ان کی شاعری کا اکثر حصہ ناپید ہو گیا۔

تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں مرتب کیے جانے والے شعری مجموعوں اور تراجم کی کتابوں میں ہی ان کے کلام کا ایک مختصر حصہ محفوظ ہو سکا ہے جیسے احمد بن طاہر طیفور کا مرتب کردہ انتخاب ”اختیار شعر بشار“ میں ان کی شاعری کا صرف ایک حصہ ہی محفوظ ہو سکا ہے۔ فصاحت و بلاغت اور مضامین کے تنوع کے باوجود ان کے دیوان کا باقی ماندہ حصہ بھی کافی عرصہ تک غیر مطبوعہ رہا اس کے علاوہ ”خالد بین“ کے منتخب کردہ ان کے دیوان کو 1935ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے استاد بدرالدین علوی نے اپنی تحقیق کے ساتھ شائع کیا تھا۔ خالد بین کے منتخب کردہ دیوان کا نام ”المختار من شعر بشار“ ہے جس کی شرح اسمعیل بن احمد تحیبی نے لکھی ہے۔ عصر حاضر میں جناب محمد طاہر بن عاشور نے ان کا دیوان مرتب کیا ہے جسے وزارت الثقافة الجزائریہ، الجزائر نے 1607ء میں شائع کیا ہے۔

16.7.1.1 شاعری

بشار بن برد کی شاعری میں عہد اموی کے خاتمے اور عہد عباسی کے آغاز کے وقت پائے جانے والے شاعرانہ مذاق و ماحول کے نمایاں اثرات ملتے ہیں کہ ایک طرف وہ قدیم شعرا کی تتبع کرتے ہوئے اپنے رسمی قصیدے کہتے ہیں جس میں تشبیب، گریز، مدح اور مقصد کے عناصر پائے جاتے ہیں تو دوسری طرف وہ جدید ماحول اور حالات سے متاثر ہوتے ہوئے قدیم شعرا کے اسلوب کو خیر آباد کہتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں اور ایک نئے رنگ و آہنگ کے شاعر بن کر ابھرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ عہد عباسی کی جدید شاعری کے بانی اور مولدین شعرا کے امام قرار پاتے ہیں۔

دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے وسط کی عبوری شاعری میں، بشار بن برد کی اہمیت اور مقام و مرتبہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے جہاں قدیم روایات دم توڑتی ہوئی اور جدید روایات منظر عام پر جلوہ گر ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بشار بن برد کی نمایاں خصوصیت، بدوی عرب شاعروں کی وہ روایات ہیں جو انہیں ورثے میں ملی تھیں اور انہوں نے ایک زمانہ تک اس کی حفاظت اور پیروی بھی کی تھی لیکن ماحول و حالات کی تبدیلی سے متاثر ہوتے ہوئے انہوں نے دھیرے دھیرے ان روایات کو خیر آباد کہہ کر نئی روایات کی طرح رکھی جس کی وجہ سے انہیں عہد عباسی کے شعرا میں نہ صرف ایک نمایاں مقام و مرتبہ حاصل ہوا بلکہ انہیں عہد عباسی کی جدید شاعری کا بانی و مبنی بھی قرار دیا گیا۔

ان کی شاعری کے اہم موضوعات میں مدح، مرثیہ اور ہجو شامل ہیں تاہم بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف ان کے مرثیوں نے انہیں شہرت دوام بخش دی ہے۔ بشار بن برد کی شاعری میں مختلف اصناف سخن کے نمونے ملتے ہیں۔ انہوں نے خمریات کے موضوع پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن ان پر عاشقانہ رنگ زیادہ غالب ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنی حقیقی اور فرضی محبوباؤں کے ساتھ اپنے عشق کا ذکر بھی کیا ہے۔ انہوں نے اپنی عشقیہ شاعری میں زبان و بیان کے استعمال میں کافی جرأت سے کام لیتے ہوئے انہیں اس طرح شعری قالب میں ڈھالا ہے کہ پڑھنے والا کافی لطف اندوز ہوتا ہے۔

بشار کے کلام میں بلند قسم کی فکری نظموں کے نمونے بھی ملتے ہیں جن میں وہ اپنے سوقیانہ پن سے پرہیز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور بسا اوقات بڑی بصیرت افروز باتوں کو شعری قالب میں ڈھال دیتے ہیں جو ان کی شاعری میں حکمت کے موتیوں کی طرح جا بجا بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان کی شاعری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک طرف جہاں خواص میں ان کے اشعار کی دھوم مچی ہوئی تھی کہ متعدد ناقدین ادب - جیسے ابو عبیدہ، اصمعی، خلف الاحمر، جاحظ وغیرہ - نے انہیں اپنے عہد کا نمایاں ترین شاعر قرار دیا ہے وہیں عوام میں بھی خصوصاً نوجوانوں اور عورتوں میں بہت زیادہ مقبول تھے اور میلوں ٹھیلوں میں ان کا قصائد ترنم کے ساتھ گا کر پڑھے جاتے تھے۔

بشار بن برد کے شاعرانہ کمالات اور عربی شاعری میں اس مقام و مرتبہ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے بعد آنے والی نسل کے کئی ایک شعرا کو اپنے طرز بیان اور شاعرانہ اسلوب سے بہت زیادہ متاثر کیا تھا جن میں سے نمایاں طور پر ابونواس، ابو العتاہیہ، عباس بن احنف اور سلم الخاسر کے نام گنائے جاسکتے ہیں۔

16.7.2 ابونواس

ابونواس کا شمار عہد عباسی کے ممتاز ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے مقام و مرتبہ کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ انہیں عظیم جاہلی شاعر امرؤ القیس کا مد مقابل قرار دیا جاتا ہے کہ جو مقام متقدمین شعرا (الشعراء المتقدمون) میں امرؤ القیس کو حاصل تھا وہی مقام ابونواس کا جدید شعرا (الشعراء المحدثون) کے درمیان تھا۔ اگر ان کا کوئی مد مقابل قرار دیا جاسکتا ہے وہ بشار بن برد ہیں۔ بعض مؤرخین ادب - جیسے کلثوم العتبی - نے انہیں امرؤ القیس سے بھی بڑا شاعر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر وہ عہد جاہلیت میں ہوتا تو اس کے مقابلہ میں کسی اور کو پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ابونواس کا نام حسن بن ہانی ہے۔ ان کی ولادت اہواز اور نشوونما بصرہ میں ہوئی تھی۔ ان کی تاریخ ولادت میں کافی اختلاف پایا جاتا

ہے۔ مختلف کتابوں میں ان کی مختلف تاریخ پیدائش درج کی گئی ہیں جن کے مطابق ان کی پیدائش 130 تا 146ھ/747 تا 763ء کے درمیان ہوئی۔ ان تاریخوں میں ڈاکٹر شوقی ضیف نے سنہ 139 ہجری کو راج قرار دیا ہے تو پروفیسر محمد زغلول سلام کے مطابق سنہ 141 ہجری راج قول ہے۔ احمد حسن زیات اور حنا فاخوری نے اس کی تاریخ پیدائش 145ھ/762ء قرار دی ہے تو الاعلام کے مؤلف زرکلی نے 146ھ/763ء نقل کی ہے۔ تاریخ ولادت کی طرح ان کے والدین کے بارے میں متضاد اقوال ملتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق ان کے والد عربی النسل تھے اور والدہ فارسی النسل۔ دوسرے قول کے مطابق ان کے والدین فارسی النسل تھے۔ شوقی ضیف اور حنا فاخوری نے اسی قول کو راج قرار دیا ہے۔

ابونواس کے والد کی وفات ان کی پیدائش کے کچھ عرصہ کے بعد ہی ہو گئی تھی کہ ان کی والدہ جب اسے لے کر بصرہ منتقل ہوئیں تو وہ محض دو سال کے تھے۔ بصرہ میں ہی وہ پروان چڑھے۔ ان کی والدہ نے اپنی تمام تر پریشانیوں کے باوجود ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابونواس کو بھی پڑھنے لکھنے کا شوق و ذوق تھا لہذا وہ آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ مساجد میں لگنے والے علمی حلقوں میں شریک ہونے لگا جہاں ان کی ذہانت و ذکاوت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے استاد یعقوب حضرمی نے انہیں بصرہ کا سب سے بڑا عالم قرار دیا تھا (اذہب فأنت أقرأ أهل البصرة)۔

ابونواس میں شاعری کی فطری صلاحیت موجود تھی لہذا انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں ہی مشق سخن کا آغاز کر دیا تھا۔ ضرورت معاش نے انہیں ایک کتاب کی دکان پر نوکری کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسی دکان پر اتفاق سے والہ بن حباب کی اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی جس سے وہ خود بھی ملنے کا مشتاق تھا۔ اس ملاقات میں والہ نے ان کے اندر پوشیدہ جوہر کو بھانپ لیا تھا لہذا اس نے اسے اپنے ساتھ کوفہ چلنے کو کہا۔ والہ کی یہ پیشکش اس کے ذوق کے عین مطابق تھی۔ اسے تو گویا اس کا گوہر مقصود مل گیا لہذا وہ فوراً تیار ہو گیا۔ والہ نے اس کے جوہر شاعری کو جلا بخش دی لیکن وہ اپنے استاد کی شخصیت کے بد اثرات سے بھی محفوظ نہ رہ سکا کہ ان میں جو بے راہ روی، بے دینی، مذہب کا مذاق اڑانے کی عادت اور دیگر بری عادتیں پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب والہ اور اس کے ہم نشینوں کی ہم نشینی کا نتیجہ ہیں۔

تکمیل علم اور شاعری کے ایک مقام و مرتبہ پر پہنچنے کے بعد وہ اس وقت کے ادبی مرکز بغداد کے لیے عازم سفر ہوئے۔ انہیں اس بات کی امید تھی کہ وہ اپنے مدحیہ قصائد سے دربار خلافت میں ایک مقام حاصل کر لیں گے لیکن ان کی یہ امید کامل طور پر پوری نہ ہو سکی۔ تاہم ہرمثہ بن اعین کی کوششوں سے ان کی رسائی ہارون رشید کے دربار میں ہوئی اور انہیں انعام و اکرام سے بھی نوازا گیا لیکن ان کی بے راہ روی اور بے باکی ان کی ترقی کے لیے سب سے بڑا روڑا بن گئی کہ ہارون رشید نے بے راہ روی سے باز آنے کے لیے انہیں بار بار تنبیہ کی حتیٰ کہ قید خانہ میں بھی ڈال دیا لیکن وہ اپنی عادتوں سے باز نہیں آئے۔ ہارون رشید انہیں بار بار سزا دیتے تھے اور وہ بار بار معافی کا طلب گار ہوتے تھے۔ ہارون رشید انہیں اس امید پر معاف کر دیتے کہ شاید وہ سدھر جائے لیکن وہ موقع ملتے ہی اپنی سابقہ روش اختیار کر لیتے تھے۔

ہارون رشید کے دربار سے زیادہ پذیرائی انہیں آل برا مکہ کے یہاں ملی۔ ان کی ہی کوششوں سے ہارون رشید انہیں بار بار معاف کر دیا کرتے تھے لیکن جب آل برا مکہ پر زوال آیا تو انہیں بھی بغداد چھوڑنا پڑا۔ بغداد سے نکل کر انھوں نے فسطاط (مصر) میں قیام کیا اور محکمہ خراج کے نگران خطیب بن عبد الحمید کی شان میں مدحیہ قصائد کہے اور انعامات و اعزازات کے مستحق قرار پائے لیکن بے حیائی کے میلان نے انہیں وہاں بے چین کر رکھا تھا لہذا جلد ہی وہ بغداد لوٹ آئے۔ جب وہ بغداد پہنچے تو خلیفہ ہارون رشید کا انتقال ہو چکا تھا اور خلافت کا تاج الامین کے

سرپرست ہوا تھا۔ انھوں نے الامین کی مدح سرائی کی۔ الامین کو اس کی ادا بھاگنی اور وہ نے انھیں اپنا ہم پیالہ وہم نوالہ بنا لیا۔ یہ زمانہ ان کی زندگی کا سب سے زیادہ آرام و آسائش کا زمانہ تھا اور وہ اپنی شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے تھے۔

ابونواس کی تاریخ وفات میں تاریخ ولادت کی طرح کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ راجح قول کے مطابق ان کی وفات 198ھ/813ء یا 199ھ/814ء میں ہوئی تھی۔ اس سے قبل ذکر کی جانے والی تمام تاریخیں غیر مستند قرار دی جاتی ہیں کہ اس کے دیوان میں عباسی خلیفہ امین کا مرثیہ بھی شامل ہے جن کی وفات 198ھ میں ہوئی تھی۔ خلیفہ امین کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی ابونواس کی وفات ہوئی تھی۔

16.7.2.1 شاعری

ابونواس کی شاعری عہد عباسی کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی و ثقافتی حالات و واقعات کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ان کی شاعری میں گویا عصر عباسی کا سماج چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے جنہوں نے عربی شاعری کے تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ ان کا کلام فصاحت و بلاغت سے بھرپور ہوتا تھا، الفاظ اور ان کے نئے معانی پیدا کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا، ان کے کلام میں عیوب و نقائص کا تقریباً فقدان پایا جاتا تھا۔

ابونواس کی شاعری کے امتیازات میں سے ایک نمایاں امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے عربی شاعری کو بدوی خدوخال سے نکال کر ”شہری“ قالب میں پیش کیا۔ ان کی شاعری کے فضل کا اعتراف کرتے ہوئے جاحظ نے لکھا ہے کہ مجھے ان سے زیادہ لغت کے بارے میں جاننے والا نہیں ملا اور نہ ہی میں ان سے زیادہ فصیح شخص سے واقف ہوں۔ امام شافعی علیہ الرحمہ بھی ان کے علم و فضل کا اعتراف کرنے والوں میں شامل ہیں۔ امام شافعی علیہ الرحمہ کا قول ہے کہ اگر ابونواس میں بے حیائی نہ ہوتی تو میں ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر لیتا۔

ابونواس نے عربی شاعری کی تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی شاعری کا سب نمایاں پہلو ”الخمریات“ (وصف شراب) ہے۔ شراب کے وصف میں انھیں کمال و مہارت حاصل تھی۔ اسی کمال و مہارت کی بدولت عربی شاعری کے اصناف و انواع میں ایک نئی صنف ”خمریات“ کا اضافہ ممکن ہو سکا۔ خمریات میں ان کے ماہرانہ اسلوب بیان کا اندازہ اس مثل سے کیا جاسکتا ہے ”لو سمعہ الحسنان لہاجر الیہا و عکفا علیہا“۔

ان کی شاعری کا دوسرا اہم پہلو ”غزل الغلمان“ (امر دپرستی) ہے۔ ابونواس کو اس صنف سخن کا بھی بانی قرار دیا جاتا ہے۔ ابونواس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی میں صرف ایک عورت سے محبت کی تھی۔ امر دپرستی کے موضوع پر کہے جانے والے اشعار میں وہ اپنی دل لگی کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔ اس صنف نے جہاں ایک طرف غلط روایات کی بنیاد رکھی وہیں دوسری طرف اس سے ابونواس کی قادر الکلامی کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

ان کی شاعری کا تیسرا اہم پہلو ”الطردیات“ (شکاریات) ہے۔ شکاریات ان کے دیوان کا ایک حصہ ہے۔ عربی شاعری میں اس صنف کو سب سے پہلے متعارف کرانے والے ابونواس ہی ہیں۔ اس صنف سخن میں وہ شکاری کتوں، بازوں اور گھوڑوں کے ذکر ساتھ ساتھ ان جانوروں کا ذکر بھی کرتے ہیں جن کا اس زمانہ میں شکار کیا جاتا تھا۔ انھوں نے اپنے اشعار میں شکاریات کی جزئیات تک کو بہت ہی عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے جس کی اہمیت تشبیہات کی وجہ سے دوچند ہو جاتی ہے۔

ان کی شاعری کا چوتھا ہم پہلو ”الزهدیات“ (زاهدانہ شاعری) ہے۔ زندگی کے آخری حصہ میں انھوں نے اس بات کو بہت شدت سے محسوس کیا کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی فسق و فجور، معصیت اور شعائر اسلام کا مذاق اڑانے میں گذاردی۔ اس احساس نے ان کے اندر ایک شرمندگی سی پیدا کر دی اور وہ اپنے رب سے توبہ کرنے اور اس کی طرف متوجہ ہو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ انھوں نے اپنے حال دل کو اشعار کے قالب میں ڈھال دیا جسے بعد میں ”زهدیات“ سے موسوم کر دیا گیا۔ چونکہ صنف زهدیات کا بانی ابوالعتاہیہ کو قرار دیا جاتا ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر شاعری کے عمدہ نمونے چھوڑے ہیں۔ اردو دائرۃ المعارف کی روایت کے مطابق جب ابونواس نے اس صنف سخن پر طبع آزمائی کرنے کا آغاز کیا تو ابوالعتاہیہ کو غالباً ایسا محسوس ہوا کہ اس کی برتری ختم ہو جائے گی لہذا اس نے ابونواس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اس میدان میں طبع آزمائی نہ کرے لیکن انھوں نے ابوالعتاہیہ کی بات نہیں مانی اور اس صنف سخن پر طبع آزمائی کرتے رہے حتیٰ کہ انھوں نے اس موضوع پر ایک خاطر خواہ سرمایہ بطور یادگار چھوڑ دیا۔

16.7.3 ابوالعتاہیہ

ابوالعتاہیہ کا شمار عہد عباسی کے زودگو شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا پورا نام ابواسحاق اسماعیل بن قاسم بن سوید بن کیسان ہے لیکن متعدد شعرا کی طرح وہ بھی اپنی کنیت سے ہی مشہور و معروف ہے۔ ان کی ولادت 130ھ/847ء میں بمقام کوفہ۔ ایک قول کے مطابق عین التمر۔ میں ہوئی۔ ان کے خاندان اور حالات زندگی کے متعلق معلومات نہ کے برابر ملتی ہے۔ ان کا خاندان قبیلہ عنزہ بن ربیعہ کا موالی تھا اور حقیر اور معمولی خدمات انجام دیا کرتا تھا۔ ابوالعتاہیہ نے اپنی نوجوانی کا آغاز گلی کوچوں میں مٹی کے برتن فروخت کرتے ہوئے کیا تھا جس کی وجہ سے ان کے دل میں زندگی کے تعلق سے بڑی تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ ارباب حکومت کے خلاف ان کے دل میں کافی نفرت پائی جاتی ہے جس کا اظہار انھوں نے اپنی شاعری میں جا بجا کیا ہے۔

ان کی جوانی کے ابتدائی ایام والہ بن حباب کے اردگرد رہنے والے آوارہ گرد اور آوارہ مزاج شعرا کی صحبت میں گزرے تھے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے اپنی غزلیات اور زهدیات کی وجہ سے اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ ان کی شہرت میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب انھوں نے خلیفہ مہدی کی شان میں ایک قصیدہ کہا۔ یہ قصیدہ غیر رسمی انداز میں تھا۔ اس کے باوجود خلیفہ کو پسند آیا تھا اور انھوں نے اسے اپنے مقربین میں شامل کر لیا تاہم وہ جلد ہی ان کی نظروں میں معتوب بھی ہو گئے کہ انھوں نے عنزہ نامی کنیز سے اپنی محبت اور التفات کا اظہار برسر عام کرنا شروع کر دیا لیکن اسے اپنی طرف ملتفت کرنے میں ناکام رہے۔ انھوں نے اپنی محبت میں ناکامی کا ذمہ دار خلیفہ مہدی کو ٹھہرایا جس کی وجہ سے خلیفہ نے انھیں سزا دینے کے ساتھ ساتھ جلا وطن بھی کر دیا تھا۔ ان کی جلا وطنی خلیفہ مہدی کی وفات تک جاری رہی۔

خلیفہ ہادی کے زمانہ میں وہ بغداد واپس آئے اور خلیفہ کی مبالغہ آمیز انداز میں مدح کرنی شروع کر دی جس کی وجہ سے ہارون رشید ان سے ناراض ہو گئے اور ان کے دوست ابراہیم موصلی کے ساتھ قید میں ڈال دیا لیکن بعد میں اپنے غزلیہ کلام سے انھوں نے خلیفہ کا دل موہ لیا اور ان کے مقربین میں شامل ہو گئے۔ ابوالعتاہیہ نے جب غزلیہ کلام چھوڑ کر زہد شاعری کا آغاز کیا تو خلیفہ کو ان کی یہ روش پسند نہیں آئی اور انھیں دوبارہ قید میں ڈال دیا لیکن فضل بن ربیع کی سفارش پر انھیں چھوڑ دیا۔

ابوالعتاہیہ ایک زودگو شاعر تھا جس کی وجہ سے ان کا مکمل دیوان مرتب نہ ہو سکا تاہم ابن عبدالبر نے ان کے زاهدانہ اشعار کو مدون

و مرتب کر دیا تھا۔

ابوالعتاہیہ کی وفات کے تعلق سے مؤرخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ مشہور قول کے مطابق ان کی وفات 210ھ/825ء میں ہوئی تھی۔ دیگر تاریخوں میں 211ھ/826ء، 166ھ، 213ھ/ بیان کی جاتی ہیں۔ مؤخر الذکر روایت کی تائید ابوالعتاہیہ کے دوست مخارق کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

16.7.3.1 شاعری

ابوالعتاہیہ میں بشار بن برد کی طرح شاعری کی خداداد صلاحیت تھی تاہم افلاس اور معاشی تنگی کی وجہ انھیں اس بات کا موقعہ نہیں ملا کہ وہ منتقدین کی شاعری اور لسانیات کا درس لیتا۔ ان کی یہ محرومی ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی تازگی کا سبب بن گئی تھی۔ وہ شاعری کو کسب معاش کا ذریعہ سمجھتے تھے جس کے ذریعہ خوشحالی اور آسودگی حاصل کی جاسکتی تھی۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزلیہ شاعری سے کیا اور کافی شہرت حاصل کر لی۔ عمر کے آخری حصہ میں انھوں نے غزلیہ شاعری چھوڑ کر زہدیہ شاعری کا آغاز کر دیا اور اس میدان میں اس قدر نام پیدا کر لیا کہ جب بھی زہدیہ شاعری کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس میں سب سے پہلے انھیں کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا یہ رنگ عربی شاعری میں ایک نئی صنف کے آغاز کا سبب بن گیا جسے عربی شاعری کی تاریخ میں ”زہدیات“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تاہم ان کے زاہدانہ اشعار کے بارے میں ناقدین کا خیال ہے کہ ان کے زاہدانہ اشعار بناوٹی ہیں جن میں خلوص کی مقدار کم پائی جاتی ہے۔

اردو دائرۃ المعارف کے مقالہ نگار کے بقول ”بحیثیت شاعر ابوالعتاہیہ کی حیرت انگیز کامیابی کا راز ان کی زبان کی سادگی، قادر الکلام سہولت ادا اور بے ساختہ گوئی میں مضمر ہے“۔ وہ عام طور سے اپنے قصیدوں میں سادہ زبان اور چھوٹی چھوٹی بحروں کا استعمال کیا کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے انھیں اس عہد کے مشہور موسیقی کارا براہیم موصلی کی صحبت نصیب ہوئی جنھوں نے ان کے اشعار کو موسیقی کے سانچے میں ڈھال دیا جس کی وجہ سے ان کی شہرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

16.7.4 ابوتمام

عہد عباسی کے مشہور شعرا میں ابوتمام کا شمار بھی کیا جاتا ہے تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انھیں ان کی شاعری کی بجائے ان کے مرتب کردہ منتخب اشعار نے شہرت دوام بخشی تھی جسے دنیائے ادب میں ”کتاب الحماسۃ“ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ابوتمام کا پورا نام حبیب بن اوس طائی ہے۔ ان کی ولادت دمشق اور طبریہ کے درمیان واقع ایک قصبہ ”جاسم“ میں ہوئی۔ ان کی تاریخ ولادت میں معمولی سا اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان کے بیٹے تمام کی روایت کے مطابق ان کی ولادت 188ھ/804ء میں ہوئی تھی۔ دوسری روایت کے مطابق جو خود ابوتمام سے ماخوذ ہے، ان کی ولادت 190ھ/806ء میں ہوئی تھی۔

ابوتمام اپنا سلسلہ نسب قبیلہ طلی سے جوڑتے ہیں جب کہ بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ ان کا تعلق قبیلہ طلی سے نہیں تھا بلکہ انھوں نے مذکورہ قبیلہ سے اپنا حسب و نسب ثابت کرنے کے لیے جھوٹا نسب نامہ گھڑا تھا جس کی وجہ سے متعدد ہجو یہ قصائد میں ان کا مذاق اڑایا گیا تھا، تاہم یہ بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی ہے کہ ان کا تعلق اس قبیلہ سے تھا کہ نہیں۔ مصادر عربی ادب میں انھیں قبیلہ طلی کی طرف منسوب کرتے ہوئے

”الطائي“ اور ”الطائي الأكبر“ کہا گیا ہے۔ اسی طرح ان پر اس بات کا الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ ان کے والد مسلمان نہیں بلکہ عیسائی تھے جن کا نام ثادوس یا تدوس تھا اور وہ دمشق میں ایک شراب کی دوکان کے مالک تھے۔ بعد ازیں ابوتمام نے ان کا نام اوس رکھ دیا تھا۔ اس حوالہ سے بھی مؤرخین ادب عربی ابھی تک کسی حتمی رائے پر نہیں پہنچے ہیں۔

ابوتمام کی ابتدائی زندگی کے متعلق معلومات نہ کے برابر ملتی ہیں۔ مروجہ معلومات کے مطابق وہ کسی وقت دمشق سے مصر منتقل ہو گئے تھے اور جامع عمرو بن عاص میں سقہ گیری کرنے لگے تھے۔ اس مسجد میں سقائی کا انھیں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ وہاں کے علمی وادبی حلقوں سے مستفیض ہوتے رہے حتیٰ کہ وہ خود بھی ایک عالم اور شاعر بن گئے۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے سب سے پہلے مصر کے ایک بڑے عہدہ دار۔ محصل۔ عیاش بن لہیعہ کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھا تھا مگر انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور انھیں خالی ہاتھ لوٹنا پڑا نتیجتاً انھوں نے اس کی شان میں ایک ہجو یہ قصیدہ لکھ دیا اور اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔

مصر میں ناکامی کا سامنا کرنے کے بعد انھوں نے شام میں اپنی قسمت کو آزما لیا لیکن یہاں بھی انھیں مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ شام میں انھوں نے سب سے پہلے ابوالمغیث موسیٰ بن ابراہیم رافقی کی شان میں مدحیہ قصائد کہے لیکن اس کی جانب سے سردمہری اور عدم التفات کی وجہ سے حسب معمول اس کی شان میں بھی ہجو یہ قصائد کہے۔ اس کے بعد انھوں نے مامون کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن قسمت ان پر ابھی تک مہربان نہیں ہوئی تھی لہذا اس دربار سے بھی انھیں بے نیل و مرام واپس آنا پڑا۔ مامون کے دربار میں ان کی ناکامی کی بنیادی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ انھوں نے بدوی لباس پہن کر اپنا قصیدہ پڑھا تھا۔ خلیفہ کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی کہ ایک دیہاتی، شہری طرز پر قصیدہ کہے۔

ابوتمام کا نصیب خلیفہ معتصم کے عہد میں جاگتا ہے کہ انھیں کے عہد میں ابوتمام کو قبول تام اور شہرت و عزت ملی تھی۔ خلیفہ معتصم کے دربار میں وہ قاضی القضاة احمد بن داؤد کے توسط سے پہنچے تھے۔ خلیفہ وقت نے اپنے دربار میں رسائی کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ ان کے ساتھ کوئی خوش الحان روای یا قاری بھی ہو کیونکہ ابوتمام کی آواز بہت کرخت تھی جو سننے والوں کو بہت گراں گزرتی تھی۔

خلیفہ معتصم کے دربار سے وابستگی کے بعد ان کی عزت و شہرت کا دور شروع ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ اس عہد کے سب سے نامور قصیدہ گو شاعر قرار پاتے ہیں۔ انھوں نے خلیفہ معتصم کے علاوہ دیگر اکابر امراء، رؤسا اور حکما جیسے قاضی القضاة احمد بن داؤد، خلیفہ معتصم کے سپہ سالار ابوسعید محمد بن یوسف مروزی، ان کا بیٹا یوسف، ابو دلف قاسم عجمی، بغداد کے کوتوال اسحاق بن ابراہیم مصعبی اور حسن بن وہب وغیرہ کی شان میں بھی قصائد کہے تھے۔

ابوتمام کے حوالہ سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ امرا اور والیان حکومت کی شان میں قصائد کہنے کے لیے ان کے صوبوں کا سفر کرتے تھے۔ ان اسفار میں سے مشہور سفر، سفر نیشاپور ہے جہاں کے والی کا نام عبداللہ بن طاہر تھا۔ انعام و اکرام کے حوالہ سے والی نیشاپور ابوتمام کے معیار پر کھرا نہ اتر سکا اور نہ ہی وہاں کا سرد موسم انھیں راس آ یا لہذا انھوں نے بہت جلد وہاں سے واپسی کے لیے رخت سفر باندھ لیا لیکن شدید برفباری کی وجہ سے انھیں ہمدان میں رکننا پڑا۔ ارشاد خداوندی کے مطابق ہر شر میں خیر کا پہلو شامل رہتا ہے لہذا وہاں ان کا رکننا جو ان کے لیے شدید کوفت کا باعث تھا، دائمی شہرت کا سبب بن گیا اور وہ عمدہ ترین مجموعہ انتخاب منظر عام پر آیا جو علمی وادبی دنیا میں ”کتاب الحماسة“ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ کتاب الحماسة ابوتمام کا وہ لازوال کارنامہ ہے جس نے انھیں شہرت دوام بخش دی ہے۔ اس

انتخاب کی عمدگی اور خوبصورتی پر تمام ناقدین و مؤرخین ادب متفق ہیں۔ اس انتخاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے ابوتمام کے شاعرانہ کمالات و امتیازات کو پس پشت ڈال دیا کہ جب کبھی بھی ابوتمام کا ذکر ہوتا ہے تو ذہن میں جو خیال سب سے پہلے ابھرتا ہے وہ ان کی شاعری کے بجائے ان کے انتخاب کا ہوتا ہے۔

کتاب الحماسة کے علاوہ بھی انھوں نے دیگر مجموعہ انتخاب مرتب کیا تھا جن میں کتاب الحماسة الصغریٰ یا کتاب الوحشیات اور اختیار الشعراء الفحول وغیرہ شامل ہیں لیکن انھیں کتاب الحماسة کی طرح شہرت نصیب نہ ہو سکی۔

ابوتمام کی وفات 231ھ/845ء میں ہوئی تھی جب کہ دیگر مؤرخین کے نزدیک ان کی وفات 2 محرم 232ھ/29 اگست 846ء میں ہوئی تھی۔

16.7.4.1 شاعری

ابوتمام کا شمار عصر عباسی کے ممتاز ترین شعرا میں ہوتا ہے تاہم ان کی شاعری اور اس کے معیار و مرتبہ کے متعلق ناقدین ادب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابوتمام کا شمار بھی ان چند عرب شعرا میں ہوتا ہے جن کے کلام کی قدر و قیمت اور معیار و مرتبہ کے تعین کا آغاز ان کی زندگی میں ہی کیا جا چکا تھا جس کا سلسلہ ان کی وفات کے بعد مدتوں تک چلتا رہا۔ ایک گروپ کے مطابق ان کی شاعری کا اکثر حصہ غیر معیاری ہے۔ عصر عباسی کے ہی ایک شاعر دعبیل کے مطابق ابوتمام کے کلام کا ایک تہائی حصہ سرقہ پر مبنی ہے، ایک تہائی حصہ خراب ہے اور ایک تہائی حصہ اچھا ہے۔ اس رائے کے بالمقابل ان کے شاگرد رشید بختری کی رائے یہ ہے کہ استاد کا بہترین کلام شاگرد کے بہترین کلام سے بہتر، اور شاگرد کا برا کلام، استاد کے برے کلام سے بدتر ہے۔

ابوتمام کے مداحین میں بختری (م 284ھ/898-897ء) علی بن جہم (م 249ھ)، ابوبکر محمد صولی مؤلف ”أخبار أبي تمام“، عمرو ذوقی (م 421ھ) اور شریف مرتضیٰ جیسے افراد شامل ہیں تو ان کے مخالفین اور ناقدین کی فہرست میں دعبیل، احمد بن عبید اللہ قطر بلی اور مرزوبانی (م 384ء) وغیرہ شامل ہیں۔ ان دونوں گروپ کے مقابل ایک گروہ ایسا بھی ہے جس نے ابوتمام کی شاعری کا معروضی انداز میں مطالعہ کیا ہے اور اس کے محاسن و معائب کو اجاگر کیا ہے۔ اس گروپ میں مشہور ناقد آمدی (وفات 381ھ) کا نام بطور خاص لیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کا موضوع اور محور ابوتمام کی شاعری کو بنایا تھا اور اپنے مطالعہ کا حاصل ”الموازنة بين الطائين أبي تمام والبحتري“ کے نام سے پیش کیا تھا۔ آمدی کے علاوہ قاضی ابوالحسن علی جرجانی (م 366ھ/977-976ء) نے بھی اپنی کتاب ”الوساطة بين المتنبي وخصومه“ میں ابوتمام کی شاعری کے محاسن و معائب بیان کیے ہیں۔

ابوتمام کا شمار مبدعین شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں صنائع شعری کا وافر حصہ پایا جاتا ہے جسے ان کی شاعری کا بنیادی وصف بھی قرار دیا جاتا ہے اور اسی پر ان کی شہرت مبنی ہے۔ ان کی شاعری کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں فلسفیانہ افکار و آرا کو پیش کر کے اس میں گہرائی اور گیرائی پیدا کی تھی جس سے اس وقت تک کی عربی شاعری کا دامن خالی تھا۔ سید احتشام احمد ندوی نے ان کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے: ”ابوتمام کے یہاں یونانی فلسفہ کی عظمت اور گہرائی ہے، فکر کی بلندی ہے، تخیل کی رعنائی ہے مگر یہ کیفیت بختری کے یہاں مفقود ہے۔ پہلی بار ابوتمام نے شاعری کو فلسفے سے رنگین بنایا ہے، اس کے نئے نئے آفاق دکھائے ہیں۔ ابوتمام نے

عربی شاعری کے بدویانہ انداز کو چھوڑ دیا ہے اور اپنا نیا اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس نے فلسفے کے ذریعہ شاعری میں گہرائی پیدا کی ہے جس سے عربی شاعری کا دامن خالی تھا۔“

ابوتمام کی شاعری کی اہمیت و قدر و قیمت کا اندازہ ان کے دیوان کی ترتیب و تدوین سے کیا جاسکتا ہے کہ صولی نے ان کے دیوان کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا تھا تو علی بن حمزہ اصفہانی نے اسے مضامین و موضوعات کے لحاظ سے مرتب کیا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ دیگر افراد۔ جیسے سگری۔ نے بھی اس کے اشعار کی روایت کی ہے۔

ابوتمام کی شاعری کس قدر پیچیدہ اور مشکل تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے دیوان کی متعدد شروح لکھی گئی ہیں جن کا ذکر حاجی خلیفہ اور اسماعیل پاشا نے اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے جیسے صولی، مرزوقی، تبریزی اور مُستوفی وغیرہ کی شرحیں جن میں سے کچھ طبع ہو چکی ہیں اور کچھ ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

16.7.5 بختری

بختری کا پورا نام ابو عبیدہ ولید بن عبید اللہ طائی ہے لیکن شعر و ادب کی دنیا میں وہ صرف بختری کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ اس نسبت کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس کا تعلق قبیلہ بنو طئی کی ایک شاخ ”خانوادہ بختری“ سے تھا۔ پروفیسر سید احتشام احمد کے قول کے مطابق بختری ان کے دادا کا نام ہے۔ اسی نسبت سے وہ بختری کہلاتے ہیں۔ ان کی پیدائش 166ھ/821ء میں بمقام منجج میں ہوئی تھی۔ بعض روایات کے مطابق ان کی پیدائش حُرْدُفْنہ کے نواح میں ہوئی تھی۔

بختری کی ابتدائی زندگی پردہِ خفا میں ملفوف ہے۔ مصادر سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اپنی سر زمین اور قبیلہ سے رشتہ کو ہمیشہ برقرار رکھا اور اسے کبھی بھی ٹوٹے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی مدحیہ شاعری کا محور و مرکز ان کا اپنا قبیلہ تھا۔ قبیلہ کی مدحیہ شاعری کا دور 226-223ھ/841-838ء پر یعنی تقریباً تین سال پر محیط ہے۔ قبیلہ کی تعریف و توصیف کے دوران ہی اسے اپنا اولین مربی۔ ابو سعید یوسف بن محمد معروف بہ ثغری۔ ملا جو اتفاق سے ایک طائی سپہ سالار تھا۔ اسی کے گھر پر اس کی ملاقات ابوتمام سے ہوئی اور وہ ان کی خداداد شاعرانہ صلاحیتوں کو بھانپ کر انھیں مزید اجاگر کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ابوتمام کی سفارش پر ہی معرۃ العمان کے مشاہیر نے انھیں اپنا ثنا خواں بنایا تھا اور چار ہزار درہم اس کا وظیفہ مقرر کیا تھا لیکن اس عہد کی شاعری کا کوئی بھی حصہ سوئے اتفاق سے محفوظ نہ رہ سکا۔

معرۃ العمان کے مشاہیر کے بعد ابوتمام کی ہی کوششوں سے انھیں عراق کے والی مالک بن طوق کے دربار میں رسائی ملی، وہاں سے وہ اپنے استاد کی معیت میں بغداد پہنچے جہاں انھوں نے مشاہیر فضلًا خصوصًا ابن الاعرابی کے حلقہٴ درس سے کسب فیض کیا۔ ساتھ ہی ساتھ دربارِ خلافت میں حاضری کے آداب سیکھنے پر بھی اپنی توجہ مبذول کی تاکہ وہاں تک رسائی آسان ہو سکے۔ دربارِ خلافت میں باریابی کے لیے انھوں نے عباسی امرا اور اصحابِ اثر و رسوخ کی مدحِ سرائی کی لیکن اپنی کوششوں کے باوجود وہ دربارِ خلافت میں براہِ راست باریابی حاصل نہ کر سکے۔ جن عباسی امرا اور اصحابِ اثر و رسوخ کی شان میں انھوں نے مدحیہ قصائد لکھے تھے ان میں ابن زیات اور ابوہشمل قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر کے دربار میں جب انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی تو وہ مؤخر الذکر کی مدحِ سرائی میں مصروف ہو گئے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ ابوہشمل کے خاندان ”بنو حمید“ کا تعلق قبیلہ بنو طئی سے ہی تھا۔ ابوہشمل کی مدحِ خوانی کے بعد انھوں نے بغداد سے 230ھ/844ء میں رخت سفر باندھ لیا اور

موصول جانچنے اور اپنے اولیوں مرثیہ سالار ثغری کے دربار سے دوبارہ وابستہ ہو گئے جو اس وقت موصل میں قیام پذیر تھے۔

خلیفہ متوکل کے مسند خلافت پر براجمان ہونے کے بعد وہ دوبارہ بغداد جا پہنچتے ہیں اور ابن نجم کی سفارش پر ان کی رسائی فتح بن خاقان کے دربار میں ہو جاتی ہے اور فتح بن خاقان کی سفارش پر انھیں دربار خلافت میں باریابی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے اور ان کی زندگی کے سب سے تابناک اور خوش گوار دور کا آغاز ہوتا ہے۔ دربار خلافت سے منسلک رہتے ہوئے بختری نے مختلف امرا اور عمائدین سلطنت کی شان میں مدحیہ قصائد کہے ہیں تاہم ان کے اوقات کا معتد بہ حصہ دربار خلافت میں ہی گذرتا تھا۔ انھوں نے جن امرا کی مدح سرائی کی ہے ان میں سب سے نمایاں نام وزیر فتح بن خاقان کا ہے۔ ان کے طویل تعلقات میں کبھی کبھی سردمہری آ جاتی تھی تاہم مجموعی طور پر ان کے تعلقات بہت بہتر رہے اور انھوں نے فتح بن خاقان کی شاعری میں کئی ایک مدحیہ قصائد کہے۔ ان دونوں کے بہتر اور خوشگوار تعلقات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بختری نے اپنے منتخب کردہ مجموعہ اشعار ”کتاب الحماسۃ“ کو فتح بن خاقان کے نام معنون کیا تھا۔ فتح بن خاقان کے علاوہ انھوں نے دوسرے وزیر احمد بن خصیب کی شان میں بھی مدحیہ قصائد کہے ہیں لیکن ان کی افتاد طبع کے پیش نظر ان پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ انہیں کے اکسانے پر خلیفہ مستعین باللہ نے اسے قتل کر دیا تھا۔

بختری کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جو وقت کے حساب سے اپنی وفاداریاں بدلتے رہتے ہیں اور خلفا کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا اولیوں فرض منصبی سمجھتے ہیں چاہے وہ ان کے ذاتی افکار و خیالات سے متضاد ہی کیوں نہ ہو۔ اس خصوصیت کی بنا پر بختری کو دربار خلافت میں کافی اثر و رسوخ حاصل تھا اور خلفا کے ساتھ ان کے تعلقات نہ صرف بے تکلفانہ تھے بلکہ انھیں اس پر کافی اعتماد بھی تھا۔ وہ ہر حال میں سرکاری حکمت عملی کی تائید کرتے تھے جس کی وجہ سے خلفا کی نگاہوں میں ان کا مقام و مرتبہ بہت زیادہ بڑھ جاتا تھا۔ سرکاری پالیسی کی وہ ہر حال میں تائید کرتے تھے جس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کا ذہنی میلان اور رجحان شیعیت کی طرف تھا لیکن اپنے فطری میلانات و رجحانات کو ایک طرف رکھتے ہوئے وہ زندگی بھر عباسیوں کے فضائل اور ان کے حقوق کا برملا اور برسر عام اعلان کرتے رہے۔

دربار خلافت سے اس طویل وابستگی کے زمانے میں کبھی کبھار عدم وابستگی کا وقفہ بھی آتا رہا ہے لیکن اس کی مدت بہت تھوڑی اور مقدار بہت کم ہے۔ اس طویل مدت میں ان پر کئی ایک الزامات بھی عائد کیے گئے ہیں جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ متوکل علی اللہ اور ان کے وزیر فتح بن خاقان کے قتل میں کسی نہ کسی حد تک ان کا بھی ہاتھ تھا اور اسی وجہ سے وہ ان کے قتل کے بعد اپنے وطن بئج میں جا بسے تھے لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ خلیفہ متوکل علی اللہ کے جانشین خلیفہ مستنصر باللہ کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھ کر دربار خلافت میں اپنی دوبارہ آمد کا اندارج کچھ اس طرح سے کراتے ہیں کہ ان پر عائد کردہ الزام بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

دربار خلافت سے وابستگی کے خاتمہ کے بعد انھوں نے بغداد کو خیر آباد کہہ دیا اور کچھ عرصہ تک وہ حمارویہ بن طولون کے دربار سے منسلک رہے لیکن زندگی کے آخری مراحل میں وطن کی محبت اور کشش نے انھیں ایک بار پھر بئج کو مسکن بنانے اور قیام پذیر ہونے پر کچھ اس طرح ابھارا کہ وہ امرا و حکمرانوں کے درباروں کو چھوڑ کر وہاں جا بسے اور زندگی کی آخری سانس تک وہیں قیام پذیر رہے یہاں تک کہ سنہ 284ھ/897-898ء میں ایک طویل بیماری کے بعد ان کی وفات ہو گئی۔ بختری کے دیوان کی ایک شرح عہد عباسی کے مشہور شاعر ابو العلاء

معری نے ”عبث الولید“ کے نام سے لکھی تھی۔

بختری نے اپنے دیوان کے علاوہ دیگر علمی و ادبی سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے جیسے انھوں نے بھی اپنے استاد کی پیروی کرتے ہوئے نہ صرف منتخب اشعار کا مجموعہ تیار کیا تھا بلکہ اس کا نام بھی ”کتاب الحماسة“ ہی رکھا تھا لیکن اسے وہ شہرت و مقبولیت نہ مل سکی جو ابوتام کی ”کتاب الحماسة“ کو ملی تھی۔ بختری نے اپنی ”کتاب الحماسة“ میں اشعار کو ان کے مطالب کے اعتبار سے مرتب کیا تھا جب کہ ابوتام نے اپنی ”کتاب الحماسة“ کو اصناف کے اعتبار سے مرتب کیا تھا۔ غالباً اس کی عدم مقبولیت کا ایک سبب اس کی ترتیب بھی ہے۔

”کتاب الحماسة“ کے علاوہ بختری کی جانب ایک اور کتاب ”معانی الشعر“ یا ”معانی الشعراء“ کو منسوب کیا جاتا ہے جو زمانہ کے دست و برد کا شکار ہو چکی ہے۔

16.7.5.1 شاعری

بختری کا شمار عصر عباسی کے اہم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ ان کی شاعری کے امتیازات و خصوصیات کا ذکر کیا جائے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابوتام کی طرح بختری کو بھی اس لحاظ سے خوش قسمت شاعر قرار دیا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری کی قدر و قیمت کا تعین اور اس کا مطالعہ ان کی زندگی میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ یہ مطالعہ ان دونوں کے مابین موازنہ پر مشتمل ہے گویا استاد اور شاگرد دونوں اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ ان کی شاعری کے مطالعہ کا آغاز ان کی زندگی میں ہی ہو چکا تھا۔ ان دونوں کے مقام و مرتبہ کے تعین میں ناقدین ادب کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے جس کی کسی قدر تفصیل ابوتام کے ترجمہ میں بیان کی جا چکی ہے۔ یہاں صرف اس بات کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ استاد و شاگرد کے مقام و مرتبہ کو عصر عباسی کے مشہور ناقدین جیسے آمدی (وفات 381ھ) اور قاضی ابوالحسن علی جرجانی (وفات 366ھ / 977-976ء) نے بالترتیب اپنی اپنی کتابوں میں ”الموازنة بين الطائين أبي تمام والبحتري“ اور ”الوساطة بين المتنبي و خصومه“ ان کی شاعری کے محاسن و معائب بیان کیا ہے۔

بختری کی شاعری کے مختلف ادوار ہیں۔ اولین دور میں وہ صرف فخریہ شاعری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن جونہی دربار خلافت/ دربار امراء و عمائدین سلطنت سے منسلک ہوتے ہیں ان کی شاعری قصیدہ خوانی پر سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے مدحیہ قصائد کو قدیم عرب شعرا کی پیروی اور تتبع کرتے ہوئے انھیں تشبیب سے گریز کرتے ہوئے اصل موضوع میں تقسیم کیا ہے۔ تاہم انھوں نے اپنے آخری زمانہ کی شاعری میں اس اسلوب کو ترک کر دیا تھا اور وہ اپنے مدوحین کی رسمی تصویریں کھینچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے قصائد کی ایک خاص بات محلات شاہی کے اوصاف و خصوصیات کو الفاظ کے قالب میں پیش کرنا ہے جس کی وجہ سے ان کے قصائد کے اسلوب بیان میں ایک خاص قسم کا نکھار اور زور پیدا ہو گیا ہے۔ بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف اس کا بنیادی سبب شاعرانہ تصویر کشی اور جزئیات کا وہ نفس شعور ہے جس میں بختری کا کوئی حریف نہیں پایا جاتا ہے۔ اس کے وصف میں کوئی جدت نہیں پائی جاتی ہے لیکن سہل اور سادہ الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے وہ اپنے اشعار میں ایک تزئین اور آہنگ پیدا کر دیتے ہیں جو انھیں دیگر شعرا سے ممتاز اور منفرد بنا دیتا ہے۔

مدح اور وصف کے علاوہ عربی شاعری کے دیگر اصناف سخن میں سے انھوں نے مرثیہ اور ہجو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مرثیہ میں بھی

انہیں کمال حاصل تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین شعرا کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں لیکن ہجو کے میدان میں انہیں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں ہے کہ ہجو یہ اشعار، ان کی مدح کا ایک ضمنی حصہ ہوتے تھے۔ ان کے ہجو یہ اشعار ان شخصیات کے متعلق ہیں جنہوں نے ان کی ناقدری کرتے ہوئے انہیں انعامات و اکرامات سے نہیں نوازا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے بستر مرگ پر انہوں نے اپنے بیٹے کو وصیت کی کی تھی کہ ان کے دیوان سے ہجو یہ اشعار کو نکال دیا جائے۔

16.7.6 متنبی

عصر عباسی کے چند نمایاں ترین شعرا میں متنبی کا شمار ہوتا ہے۔ عربی شاعری میں متنبی کو وہی مقام و مرتبہ حاصل ہے جو اردو شاعری میں اقبال و غالب کو حاصل ہے۔ متنبی کا پورا نام ابوالطیب احمد بن حسین جعفی کنڈی ہے لیکن دنیائے ادب میں ”متنبی“ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ متنبی کی پیدائش کوفہ کے ایک محلہ ”کنده“ میں 303ھ/915ء میں ہوئی تھی۔ خاندانی حالات اچھے نہیں تھے۔ غربت کے سائے میں بچپن کا کچھ حصہ وہیں گزرا اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ بچپن سے ہی ان کی ذہانت و ذکاوت اور قوی حافظہ کے چرچے عام ہونے لگے تھے اور شاعرانہ مذاق اور مزاج کے مظاہر سامنے آنے لگے تھے۔ قرامطہ کی لوٹ مار اور ظلم و زیادتی کی وجہ سے ان کے خاندان کو ہجرت پر مجبور ہونا پڑا اور تقریباً دو سال تک انہیں ”سماوہ“ کے مقام پر قیام کرنا پڑا۔ ہر شہر میں خیر کا پہلو شامل ہوتا ہے۔ متنبی کے خاندان کی یہ در بدری ان کے لیے رحمت بن گئی کہ انہیں بدوی عربوں کے ساتھ ایک عرصہ تک وقت گزارنے کا موقع ملا جس نے ان کو عربی زبان کا وسیع علم حاصل کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ اس خوش بختی پر وہ تاحیات نازاں و فرحان رہے۔

متنبی کی زندگی میں بہت اتار چڑھاؤ آئے ہیں کبھی کامیابی اس کے قدم چومتی ہے تو کبھی ناکامی اس کے ہاتھ لگتی ہے۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی معمولی معمولی کامیابیوں سے مطمئن نظر نہیں آتے ہیں اور انہیں اپنے اس نظریہ سے رجوع کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے ایک بلند اور اہم مقام حاصل کر لیں گے۔ لہذا ایک زمانے میں وہ شاعری کو خیر آباد کہہ کر باغی اور سرکش افراد کے ساتھ جاملتے ہیں۔ یہاں بھی ناکامی ان کی راہ دیکھ رہی ہوتی ہے اور قید و بندان کا مقدر ٹھہرتا ہے۔ دو سال کی قید و بند سے چھٹکارا معافی کے بعد ملتا ہے اور انہیں اپنے پرانے نظریہ پر دوبارہ واپس آنا پڑتا ہے کہ اپنا مقصد زندگی شاعری کے ذریعہ ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اسی بغاوت اور گمراہی کے دور میں ان پر یہ الزام بھی لگ جاتا ہے کہ انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ یہ الزام حالانکہ غلط ہے جس کے شواہد ان کے دیوان میں بھی موجود ہیں لیکن اسی الزام نے ہی انہیں دوام بخش دیا کہ وہ اپنے اصل نام کی بجائے ”متنبی“ کے نام سے مشہور و معروف ہو گئے۔

بغاوت کے بعد جب انہوں نے شاعری کو دوبارہ ذریعہ معاش بنایا تب بھی انہیں خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی۔ وہ برسوں در بدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے یہاں تک کہ انہیں سیف الدولہ کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ بغاوت کے بعد کا ان کی شاعری کا دور 325 تا نصف 329ھ/937-940ء پر مشتمل ہے۔ اس دوران انہوں نے انطاکیہ، دمشق اور حلب وغیرہ کے امرا کی مدح سرائی کیا تھا لیکن بدلے میں انہیں خاطر خواہ معاوضہ نہیں ملا تھا تاہم ان کی شہرت کا آغاز ہو گیا تھا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے حاکم دمشق امیر بدر بن عمار خرنی جیسے افراد کی مدح سرائی بھی کی تھی۔ متنبی ان کے دربار سے تقریباً ڈیڑھ برس منسلک رہے اور وہاں کی درباری سازشوں کا شکار ہو گئے۔ انہیں وہاں سے راہ فرار

اختیار کرنی پڑی اور بادیۃ الشام میں پناہ لینی پڑی۔ اس دوران ان کے دل دماغ میں دوبارہ بغاوت کا جذبہ بیدار ہونے لگا لیکن اتفاق سے امیر بدرخشنی کو کسی کام سے عراق کوچ کرنا پڑا اور وہ اپنی کمین گاہ سے نکل دوبارہ شعر و سخن کے کام میں مصروف ہو گئے۔

زندگی کے آخری دور میں منتہی کو سیف الدولہ جیسا مربی ملا جن کے دربار سے وابستہ ہونے کے بعد گویا انھیں اپنی منزل مقصود مل گئی کہ انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں شعر و سخن کے ذریعہ جس مقام کو حاصل کرنے کا خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر سیف الدولہ کے دربار سے وابستگی کی صورت میں سامنے آئی۔ وہ اس دربار سے تقریباً نو برس منسلک رہے۔ یہی دوران ان کی زندگی کا کامیاب ترین دور ہے جس میں انھیں عزت، شہرت، دولت اور ایک اعلیٰ مقام و مرتبہ ملا تھا۔

یہاں اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ منتہی اتنے عرصہ تک کسی کے بھی دربار سے منسلک نہیں رہا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انھوں نے سیف الدولہ کے دربار میں جتنا عرصہ گزارا تھا اس کا چوتھائی حصہ بھی وہ کسی امیر کے ساتھ نہ گزار سکے۔ اس طویل رفاقت میں جتنا منتہی کی خوش بختی کا دخل ہے اس سے کہیں زیادہ سیف الدولہ کی نظر کرم، حسن اخلاق اور داد و دہش کا دخل ہے کہ انھوں نے منتہی کے مخالفین کی باتوں کو ایک عرصہ تک قابل اعتنا نہیں سمجھا لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا توں توں مسلسل شکایتوں اور ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں سیف الدولہ کے منتہی کے تئیں خیالات میں تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا کہ دونوں ایک دوسرے سے بدگمان ہو گئے۔ یہ بدگمانی اتنی بڑھی کہ منتہی کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان کے حوالہ سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ لہذا وہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان بچانے کی خاطر مصر کے شہر فسطاط میں پناہ لینے کو مجبور ہو گئے اور وہاں کے امیر کافور اخشیدی کے دربار سے منسلک ہو گئے جنھوں نے انھیں صیدا کا حاکم بنانے کا وعدہ کیا تھا لیکن انھوں نے اپنے وعدہ کو پورا نہیں کیا تو منتہی کا دل ان سے کھٹا ہو گیا اور وہ کافور اخشیدی کے ساتھ نباہ نہ کر سکے اور بہت جلد ان کی سخت جھوکر کے وہاں سے بھاگ نکلے اور سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے عراق جا پہنچے اور بغداد میں قیام پذیر ہو گئے۔ دوران قیام انھوں نے وزیر مہلبی کے دربار سے منسلک ہونے اور ان کی نگاہ کرم کو حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس دربار سے وابستہ کچھ مصاحبین۔ جن میں ابن الحجاج اور کتاب الاغانی کے مصنف ابوالفرج اصفہانی جیسے لوگوں کا نام بھی شامل ہے۔ کی وجہ سے ناکام ہو گئے۔

وزیر مہلبی کے دربار سے وابستگی کی کوشش کی ناکامی کے بعد انھیں ارجان نامی علاقہ کے بویہی وزیر ابن العمید کی سرپرستی حاصل ہو گئی اور ان کی مدح میں منتہی نے چند قصائد بھی کہے لیکن جلد ہی وہ شیراز منتقل ہو گئے کہ وہاں کے سلطان عضد الدولہ نے ان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ کچھ دن وہ ان کے دربار سے وابستہ رہے اور ان کی مدح میں متعدد قصائد کہے۔ نامعلوم اسباب کی بنا پر انھوں نے کچھ دنوں بعد شیراز کو الوداع کہہ دیا اور بغداد کا رخت سفر باندھ لیا لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے ہی دیر العاقول نامی مقام پر لٹیروں نے ان پر حملہ کر انھیں اور ان کے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کا سارامال و متاع لوٹ لیا۔ اس حادثہ میں ان کے دیوان کے مسودے بھی ضائع ہو گئے۔

16.7.6.1 شاعری کا آغاز

”ساوہ“ سے واپسی کے بعد منتہی نے شاعری کی طرف مزید توجہ دینی شروع کر دی۔ اس زمانہ کے چلن اور رواج کے مطابق وہ بھی شاعری کو ذرائع آمدنی کا ایک اہم ذریعہ سمجھتے تھے۔ لہذا انھوں نے بھی سکہ رائج الوقت کے مطابق ابوالفضل کوفی کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ لکھ کر ان کی

خدمت میں پیش کر دیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ متنبی کے مذہبی اور فلسفیانہ نظریات و خیالات پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا تھا۔
 متنبی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ دنیا کو اپنی فطری شاعرانہ صلاحیتوں سے زیر کر لیں گے لیکن ان کی خوش فہمی، خوش فہمی ہی رہی اور
 حقیقت کا روپ اختیار نہ کر سکی حتیٰ کہ وہ سیف الدولہ کے دربار سے منسلک ہو گئے جہاں انھیں اپنا گوہر مقصود مل گیا۔ سیف الدولہ کے دربار میں
 پہنچنے سے پہلے وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو نمایاں کرنے اور اسے ذریعہ اکتساب بنانے کے لیے ادھر ادھر کے چکر کاٹتے رہے۔ سب سے پہلے
 وہ کوفہ سے رخت سفر باندھ کر بغداد کے لیے روانہ ہوئے جہاں انھوں نے اپنے وطن محمد بن عبید اللہ علوی کی مدح سرائی کی۔ بعد ازیں وہ شام
 روانہ ہوئے جہاں وہ تقریباً دو سال تک قیام پذیر رہے اور ایک غنائی شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ قیام شام کے دوران انھوں نے تو منجی
 شیوخ، طرابلس الشام اور لاذقیہ کے امرا کی شان میں بھی کچھ قصائد کہے تھے۔ بقول مقالہ نگار دائرۃ المعارف ”اس زمانے کا کلام بجلت میں لکھا
 ہوا معلوم ہوتا ہے اور خوبی کے لحاظ سے اوسط درجے کا ہے لیکن اس میں بھی اس کے حقیقی ذہانت کے آثار نمایاں ہیں۔ ایک مرثیہ اور بعض فی
 البدیہ اشعار کے سوا باقی سب نوکلاسیکی رنگ کے قصائد ہیں اور ان میں ابوتمام اور البحتری کا اثر غالب ہے۔“

متنبی کی شاعری کا دوسرا مرحلہ، اس شاعری کو قرار دیا جاتا ہے جو انھوں نے اپنی بغاوت کے دوران کی تھی۔ اس بغاوت کا منفی پہلو یہ
 ہے کہ انھیں قید و بند سے گذرنا پڑا۔ لیکن اس کا مثبت پہلو یہ ہے اس نے انھیں ”متنبی“ کے نام سے شہرت دوام بخش دی۔ اس دوران کی شاعری
 میں خیالات میں بہت بے ساختگی پائی جاتی ہے بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف ”ابوالطیب کا وہ کلام جو بغاوت کے دوران میں
 (بہذا) یا اس سے ذرا پہلے کا ہے خیالات کی بے ساختگی اور آمد کے اعتبار سے نمایاں اور ممتاز نظر آتا ہے۔ وہ نظم کی اشکال میں بلا تکلف تصرفات
 کرتا ہے۔ اس کا اسلوب بیان پر زور ہے اور یہ اسلوب اس کے سابقہ انداز کے اس کے شخصی کردار کا آئینہ ہے۔“

بغاوت کے بعد کی شاعری کو ان کی شاعری کا تیسرا دور قرار دیا جاتا ہے۔ اس دور کے اہم ممدوحین میں حاکم دمشق امیر بدر بن عمار خرنشلی شامل
 ہیں۔ وہ تقریباً ڈیڑھ برس تک خرنشلی کے دربار سے وابستہ اور ان کی مدح میں کئی ایک قصائد کو قلم بند کیے۔ اس دور کی شاعری میں کوئی نمایاں بات نظر نہیں
 آتی سوائے اس کے کہ ان کی شاعری میں ارتقا کا ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ یہی تسلسل انھیں ان کی شاعری کے دوسرے دور سے ممتاز بناتا ہے۔

متنبی کی شاعری کا چوتھا دور سیف الدولہ کے دربار سے وابستگی یعنی نصف 329ھ/940ء سے شروع ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ
 337ھ/948ء پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد کے زمانہ سے لے کر اپنی وفات تک کے عرصے میں انھوں نے اپنے چوتھے دور کے طرز پر ہی شاعری
 کی۔ سیف الدولہ سے وابستگی کے بعد متنبی نے جو قصائد کہے تھے وہ ان کی شاعری کا اوج کمال ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں بہترین انداز
 و اسلوب میں سیف الدولہ کے جنگی معرکوں کی تصویر کشی کی ہے جس سے ایک طرف ان کی قوت مشاہدہ اور ان کی باریک بینی کا اندازہ ہوتا ہے تو
 دوسری طرف الفاظ کے استعمال اور اسلوب بیان پر قادر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

متنبی نے سیف الدولہ کے دربار سے اپنے تعلقات کے خاتمہ کے بعد فسطاط کے والی کافور انشیدی کے دامن میں پناہ لی تھی اور ان
 کی شان میں قصائد کہے تھے لیکن ان قصائد کی زبان اور اسلوب بیان سے لگتا ہے کہ وہ بدرجہ مجبوری کافور انشیدی کی تعریف کر رہا ہے کہ ان کا
 دل ابھی تک سیف الدولہ کے دربار میں اٹکا ہوا ہے۔ کافور انشیدی کی شان میں کہے گئے بعض قصائد سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کی
 تعریف میں نہیں بلکہ ان کی ہجو میں کہے گئے ہیں۔ کافور سے جب اس کا نباہ نہ ہو سکا تو انھوں نے ان کی سخت ہجو کی اور فسطاط سے بھاگ نکلے

اور بویہی وزیر ابن العمید اور شیراز کے حاکم عضد الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور ان کی تعریف میں چند قصائد کہے۔

منتہی کا شمار ان عرب شعرا میں ہوتا ہے جن کے اندر انا، پندار، اپنی ذات کو نمایاں کرنے کا جذبہ، دوسروں سے برتر ہونے کا نغمہ پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منتہی اپنے اشعار میں مختلف مواقع پر اپنی ذات و شخصیت کو بہت زیادہ نمایاں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے دل و دماغ میں یہ خیال سما یا ہوا تھا کہ وہ ذہنی طور پر نہ صرف اپنے معاصرین بلکہ متقدمین اور متاخرین سے بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں جس نے ان کے اندر خود نمائی اور پندار کو پیدا کر دیا تھا۔

عربی شاعری پر منتہی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں کہ ”عربی کے سب عرب قصیدہ گو شعرا مختلف اسباب سے الممتنہبی سے اثر پذیر ہوئے ہیں“۔ ان کے دیوان کی متعدد شرحیں لکھی گئیں جو تا ہنوز متداول ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں ان کے فکر و فن کا مطالعہ آج بھی کیا جا رہا ہے۔ ان کی شخصیت اور فن پر سب سے وقیع کتاب مع الممتنہبی محمود شاہ کی ہے جو ان کے دسیوں سال کے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ ان کی کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسے نوبل پرائز کے بعد سب سے وقیع انعام ”فیصل ایوارڈ“ سے نوازا گیا ہے۔

16.7.7 ابو العلاء معری

عصر عباسی کے نابغہ روزگار شعرا میں ابو العلاء معری کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ان کا نام احمد بن عبد اللہ بن سلیمان ہے لیکن وہ اپنی کنیت اور نسبت سے زیادہ مشہور و معروف ہوئے۔ ان کی پیدائش 363ھ/973ء میں معرۃ النعمان کے مقام پر ہوئی۔ مقام پیدائش سے نسبت کی وجہ سے ”معری“ کہلایا۔ چار برس کی عمر میں انھیں چچک ہو گیا جس کی وجہ سے ان کی بصارت ضائع ہو گئی۔ اس حادثہ نے ان کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے اور وہ شدید احساس کمتری کا شکار ہو گئے۔ انھوں نے اپنے آپ کو سب سے الگ تھلگ کر لیا لیکن اس حادثہ کا مثبت پہلو یہ نکلا کہ وہ زبردست حافظے اور یادداشت کے مالک بن گئے جن کے نمایاں اثرات ان کی تصانیف میں نظر آتے ہیں۔

ابو العلاء معری نے ابتدائی تعلیم و تربیت معرۃ النعمان میں اپنے والد سے حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے حلب چلے گئے۔ حلب کے اساتذہ میں محمد بن عبد اللہ اور یحییٰ بن مسعر کا شمار ہوتا ہے۔ اول الذکر سے انھوں نے ادب اور لسانیات کا درس لیا تو مؤخر الذکر سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ مزید علم حاصل کرنے کے لیے انھوں نے انطاکیہ کا رخ کیا اور وہاں کے کتب خانوں سے اپنی علمی پیاس بجھانے کے بعد طرابلس روانہ ہو گئے اور وہاں سے انطاکیہ کے لیے دوبارہ رخت سفر باندھا اور عیسائی علما سے استفادہ کرتے ہوئے دین مسیحی سے متعلق بہت ساری معلومات حاصل کی۔ بیس سال کی عمر میں ان کا یہ علمی سفر تمام ہوا اور وہ معرۃ النعمان واپس آ گئے۔ اس علمی سفر کے دوران ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف چودہ سال تھی۔

معرۃ النعمان میں ان کا گزر بسر ایک وقف سے حاصل ہونے والے وظیفے سے ہوتا تھا۔ یہ وظیفہ تیس دینار سالانہ پر مشتمل تھا جس کا نصف حصہ وہ اپنے ملازم کو دے دیا کرتے تھے۔ معرۃ النعمان کے قیام کے دوران انھوں نے کسی کے سامنے بھی زانوئے تلمذتہ نہیں کیا۔ معرۃ النعمان میں اچھا خاصا عرصہ گزارنے کے بعد 398ھ/1008ء میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے بغداد روانہ ہوئے۔ یہاں انھوں نے صرف عبدالسلام بصری سے تعلیم حاصل کی اور زیادہ تر وقت وہاں کی لائبریریوں میں گزارا۔ اسی سفر کے دوران انھوں نے اپنی منظوم

کتاب ”سقط الزند“ کی شرح ”ضوء السقط“ کے نام سے لکھی۔ بغداد میں ایک سال سات مہینے گزار کر رمضان 400ھ / اپریل-مئی 1010ء میں واپس معرۃ النعمان آگئے۔ بغداد کا یہ سفر ان کی زندگی کا ایک اہم پڑاؤ ہے۔ اس سفر کی خوش گوار یادیں ان کے دل و دماغ پر ثبت ہو کر رہ گئیں تھیں جس کا اندازہ ان کے اس قصیدہ سے کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے وہاں سے رخت سفر باندھتے ہوئے لکھا تھا۔ بغداد سے ان کی واپسی کے بنیادی اسباب ان کی ناداری و افلاس اور والدہ کی علالت کو بتایا جاتا ہے۔ دوران سفر ہی ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس حادثہ نے انھیں مزید گوشہ نشین کر دیا اور وہ اپنے آپ کو اس بھری دنیا میں اکیلا سمجھنے لگے تھے۔ بصارت سے محرومی اور تنہائی کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو ”رہین المحبسین“ کہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھیں کبھی مکمل تنہائی نصیب نہیں ہوئی کہ ان سے شعر گوئی اور ادب کا فن حاصل کرنے کے لیے عالم اسلام کے مختلف مقامات سے افراد آتے جاتے رہتے تھے۔ بغداد کا یہ سفر ان کی زندگی کا غالباً آخری سفر تھا کہ انھوں نے اپنی باقی زندگی معرۃ النعمان میں ہی گذاری تھی۔

ابوالعلاء معری نے عصر عباسی کا وہ عہد پایا تھا جو شدید کشمکش اور انتشار کا تھا۔ اس کی شان و شوکت میں گہن لگ چکا تھا۔ عباسی خلفا صرف نام کے حکمراں رہ گئے تھے کہ عملاً سارا اقتدار آل بویہ کے ہاتھ میں تھا جن کی مرضی کے بغیر خلفا کوئی بھی فیصلہ نہیں لے سکتے تھے۔ اسی انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک قول کے مطابق 417-419ھ / 1026-1028ء کے درمیان جب صالح بن مرداس نے معرۃ النعمان کا محاصرہ کیا تو اہل شہر نے انھیں ہی صالح بن مرداس کے پاس سفارش کے لیے بھیجا تھا۔ صالح بن مرداس نے ان کی گفتگو سے متاثر ہو کر اپنا محاصرہ اٹھا لیا اور شہر کی ذمہ داریاں بھی انھیں کے حوالہ کر دی تھی۔ اس روایت کی صحت کے حوالہ سے کوئی بھی حتمی بات نہیں کی جاسکتی ہے۔

عمر کے آخری پڑاؤ میں بھی ان کی ذہنی صلاحیتوں میں کوئی کمی نہیں پائی جاتی تھی کہ اس دوران لکھے گئے رسائل، معانی اور ادب کے لحاظ سے ان رسائل سے بہتر ہیں جو انھوں نے پہلے لکھے تھے۔

ایک طویل عمر گزارنے کے بعد ابوالعلاء معری کی وفات 13 ربیع الاول 449ھ / 16 مئی 1057ء میں ہوئی۔ ان کی وفات پر ستر سے زائد شعرا نے مرثیے لکھے۔

16.7.7.1 تصانیف

ابوالعلاء معری کا شمار عصر عباسی کے ان افراد میں کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنا علمی ورثہ نظم و نثر دونوں میں چھوڑا تھا۔ ابوالعلاء معری کو عہد عباسی کے شعرا میں اس لحاظ سے ممتاز و منفرد قرار دیا جاتا ہے کہ وہ ایک باکمال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب قلم بھی تھے۔ ان کی مجموعی تصانیف کی تعداد 73 بتائی جاتی ہے جن میں سے اکثر زمانہ کی دست و برد کا شکار ہو چکی ہیں۔ یہ کتابیں انھوں نے ابوالحسن علی بن عبداللہ اصفہانی کو املا کرائی تھیں۔ ان کی باقی ماندہ کتابوں میں سقط الزند، اس کی شرح ضوء السقط، الدر عیات اور اللزومیات یا لزوم مالا یلزم منظوم ہیں۔

سقط الزند ان کی جوانی کے کلام پر مشتمل ہے جس میں قصائد، مراثی اور دوسرے اصناف سخن پر مشتمل اشعار موجود ہیں۔ اسی دیوان میں ان کا وہ مرثیہ بھی موجود ہے جو انھوں نے اپنے والد کی وفات پر چودہ سال کی عمر میں کہا تھا۔ اسی طرح اس میں چند نامعلوم اشخاص کے قصائد بھی پائے جاتے ہیں جن کے متعلق ناقدین ادب کا کہنا ہے کہ انھوں نے مشقیہ طور پر ان قصائد کو نظم کیا تھا۔

غالباً معری عہد عباسی کے اکلوتے شاعر ہیں جنہوں نے خود ہی اپنے دیوان کی شرح لکھی۔ معری نے سقط الزند کی شرح ضواء السقط کے نام سے لکھی تھی۔

الدرعیات کو معری نے ایک مستقل تصنیف قرار دیا ہے حالانکہ وہ سقط الزند کے آخر میں بھی مع شرح موجود ہے۔ اس شعری مجموعہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں معری نے اپنے ان تمام اشعار کو جمع کر دیا ہے جو انہوں نے ”درع“ (زرہ) کی تعریف و توصیف میں کہے۔ اللزومیات / لزوم مالا یلزم کو معری کی اہم تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس دیوان کے ہر شعر میں صنعت لزوم مالا یلزم کا التزام کیا گیا ہے یعنی ہر بیت کے قافیہ میں دو حرف روی آئے ہیں۔ اس دیوان پر شاعری سے زیادہ فلسفہ کی کسی کتاب کا شانہ پایا جاتا ہے کہ اس میں شاعر نے فلسفیانہ موضوعات جیسے زمان و مکان، مادہ و روح اور ذات باری وغیرہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی منشور کتابوں میں کتاب الفصول والغايات، رسائل ابی العلاء (رسالة الغفران، رسالة الملائكة، رسالة الشياطين، رسالة الاغريض وغیرہ)، ملقی السبیل فی الوعظ والزهد، شرح دیوان الحماسة، عبث الولید (عصر عباسی کے مشہور شاعر بختری کے دیوان کی شرح) وغیرہ شامل ہیں۔

شاعری 16.7.7.2

ابوالعلاء معری نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے دیوان میں مدحیہ قصائد، مرثیہ اور دیگر اصناف سخن کے نمونے ملتے ہیں۔ بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف ”اس کا جوانی کا کلام بلحاظ موضوع تو سادہ ہے لیکن بلحاظ اسلوب پر تکلف۔ بعد کے کلام میں نادر کلمات زیادہ ملتے ہیں اور اس اعتبار سے دیکھیے تو دور جاہلیت کے اشعار اور ان میں زیادہ فرق نہیں ہے..... مدحیہ قصائد میں مثنوی کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ مرثیوں میں وہ اپنے دکھ اور مصائب کا حال بیان کرتا ہے لیکن چونکہ اسے یوم آخرت پر ایمان نہیں تھا یا اس کے بارے میں شکوک و شبہات تھے، اس لیے یہ دکھ اور درد اور بھی بڑھ جاتا ہے“۔ اللزومیات / لزوم مالا یلزم میں وہ ایک ”بے باک مفکر اور بلند اخلاق معلم“ کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ اس دیوان میں ان کی شاعری کا ایک خاص رنگ نظر آتا ہے کہ وہ اس میں ایک شاعر سے زیادہ ایک فلسفی معلوم ہوتے ہیں۔ اس دیوان میں انہوں نے فلسفیانہ موضوعات کو بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ الدرعیات سے فن و صف نگاری میں ان کے مقام و مرتبہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے صرف زرہ (درع) کے وصف میں کہے جانے والے متعدد اشعار کو جمع کر دیا ہے۔

16.8 اکتسابی نتائج

عربی شاعری کے تمام ادوار میں عہد عباسی کی شاعری متعدد اور گونا گوں صفات، امتیازات اور خصوصیات کی وجہ سے منفرد و ممتاز نظر آتی ہے۔ عہد عباسی کو کئی ایک تہذیبوں اور ثقافتوں کا نقطۂ اتصال قرار دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ایک خاص قسم کی تہذیب و ثقافت کو فروغ حاصل ہوا تھا جس میں اسلامی تہذیب و تمدن اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز نظر آتی ہے۔ عہد عباسی کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور علمی وادبی ماحول نے ایک ایسی فضا تیار کر دی تھی جو کسی اور اسلامی دور میں نظر نہیں آتی ہے۔ اسی مخصوص فضا میں عربی شاعری اپنے نئے رنگ و روپ میں پروان چڑھتی ہے اور ایسے بیش بہا نمونے پیش کرتی ہے جس سے عربی شاعری کا دامن مزید وسیع ہو جاتا ہے اور اس کی قدر و قیمت میں

گراں قدر اضافہ ہوتا ہے۔

عصر عباسی کی شاعری، عربی شاعری کے دیگر تمام ادوار سے اس لحاظ سے ممتاز قرار پاتی ہے کہ اس عہد میں قدامت کے طرز اسلوب و بیان سے صرف نظر کرتے ہوئے شعرانے ایک نیا طرز و اسلوب اختیار کیا تھا کہ وہ محبوبہ کی یاد میں آنسو بہاتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں بلکہ وہ اپنے قصائد کا آغاز اپنے ذوق کی مناسبت سے مختلف رنگ و ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ قدیم اصناف سخن۔ جیسے مدح، مرثیہ اور ہجو وغیرہ۔ کے دائرہ کار میں وسعت کے ساتھ ساتھ شاعری کے چند جدید موضوعات۔ غزل، غمان، زہدیات، طردیات اور خمریات وغیرہ۔ منظر عام پر آتے ہیں گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی کے موضوعات شاعری میں مجموعی طور پر کافی نمایاں تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں بھی قدیم اسلوب و انداز میں شاعری کرنے والے شعرا موجود تھے جن کی شاعری پر جدید ماحول اور حالات کے اثرات مرتب ہی نہیں ہوئے تھے یا برائے نام مرتب ہوئے تھے۔

عہد عباسی کی شاعری پر جب ایک طائرانہ نظر ڈالی جاتی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کی شاعری کو فروغ دینے میں شعرا کے ساتھ ساتھ سماج کے مختلف طبقات جیسے عباسی خلفاء، وزرا، امرا اور وعما ندین سلطنت، بشرنگاران اور علمائے دین وغیرہ نے نمایاں کردار ادا کیا تھا کہ ایک طرف جہاں عباسی خلفاء، وزرا، امرا اور وعما ندین سلطنت نے شعرا کی سرپرستی کی تھی تو دوسری طرف انھوں نے خود بھی داد سخن حاصل کی تھی اور شاعری کے عمدہ نمونے بطور یادگار چھوڑے تھے۔

عہد عباسی میں شاعری کے بہت زیادہ فروغ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس عہد میں شاعری کسب معاش، عزت و شہرت اور مال و دولت حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن گئی تھی۔ اسی طرح مملکت عباسیہ میں شاعری کے اہم مراکز میں بغداد کے علاوہ دیگر مقامات بھی پائے جاتے تھے جہاں کے امرا اور حکمرانوں کے دربار میں شعر و شاعری کی سرپرستی کی جاتی تھی نتیجتاً شعرا کو دیگر ادوار شاعری کے مقابلہ میں زیادہ بڑا اور وسیع میدان ملا اور انھوں نے اپنی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو اچھے انداز و اسلوب میں پیش کیا۔

عہد عباسی کے شعرا کو تین بڑے زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا طبقہ ان شعرا کا ہے جنھوں نے عہد اموی کا آخری اور عہد عباسی کا اولین دور پایا تھا۔ ان شعرا نے عہد عباسی کی شاعری میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس طبقہ کے اہم نمائندہ شاعر بشار بن برد اور ابو نواس ہیں۔ دوسرا طبقہ شعرا نے مولدین کا ہے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ تیسری صدی میں گزرا تھا۔ انھوں نے اپنے پیش رو شعرا کے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے عربی شاعری کو نئے رنگ و آہنگ سے نوازا تھا۔ اس طبقہ کے نمائندہ شعرا میں ابو تمام اور بختری وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ تیسرا طبقہ شعرا نے محدثین کا ہے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ چوتھی صدی میں گزرا تھا۔ انھوں نے بھی عربی شاعری کے فروغ میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس طبقہ کے اہم شعرا میں متنبی اور ابوالعلاء معری وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا شعرا کو موضوعاتی اور فنی لحاظ سے شعراء البداوة، الشعراء المجددون، الشعراء المفتنون، شعراء الصنعة، الشعراء المحافظون، الشعراء المبدعون اور شعراء المذاهب والوجدان والفکر کے زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

مؤخر الذکر طبقہ شعرا کی ایک بڑی اکائی پر مشتمل ہے جسے ان کے نظریات، خیالات و افکار کے لحاظ سے شعراء العباسیہ، شعراء

الشيعة، شعراء العشق، شعراء الزهد والحكمة والمواعظ، شعراء علمائ اور شعراء الطبع والزندقة میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

16.9 نمونے کے امتحانی سوالات

- 1 عصر عباسی کی شاعری کے امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔
- 2 عصر عباسی میں صنف سخن ”زہدیات“ پر روشنی ڈالیے۔
- 3 عصر عباسی کی شاعری کے موضوعات پر مدلل بحث کیجیے۔
- 4 مشہور عباسی شعرا کا ذکر کرتے ہوئے کسی ایک کی حالات زندگی تحریر کیجیے۔
- 5 متنبی کی شاعری کے امتیازی خصوصیات لکھیے۔
- 6 عصر عباسی کی شاعری میں زہدیات، نمریات اور طردیات کو بیان کیجیے۔

16.10 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

- 1- تاریخ الأدب العربي (العصر العباسي الأول) شوقی ضیف
- 2- تاریخ الأدب العربي (العصر العباسي الثاني) شوقی ضیف
- 3- الجامع في تاريخ الأدب العربي حنا فاختوری
- 4- تاریخ الأدب العربي احمد حسن زیات
- 5- الأدب في عصر العباسيين (الجزء الأول والثاني) محمد زعلول سلام
- 6- عربی ادب کی تنقیدی تاریخ پروفیسر سید احتشام احمد ندوی
- 7- اردو دائرۃ المعارف

Maulana Azad National Urdu Universtiy

M.A. Arabic Ist Semester Examination 2020-21

Paper-3: History of Arabic Literature -1

Time: 3Hrs

Marks: 70

اشتملت هذه الورقة على ثلاثة أجزاء، تلزم الإجابة من كل جزء وفق التعليمات۔

الجزء الأول (1 x 10 = 10)

اختر الجواب الصحيح من بين الخيارات فيما يلي من الأسئلة۔

- 1- حدد الزوج الخطأ:
(a) كتاب الإشارات والتنبهات۔۔۔۔۔ أبو البركات البغدادي
(b) فتوح الشام۔۔۔۔۔ الإمام الواقدي
(c) ذم الخطأ في الشعر۔۔۔۔۔ ابن الفارس
(d) طبقات ابن المعتز۔۔۔۔۔ أبو الفرج الأصفهاني
- 2- فيلسوف متكلم صوفي، من مؤلفاته: مقاصد الفلاسفة، الاقتصاد في الاعتقاد:
(a) الإمام الغزالي
(b) ابن قتيبة الدينوري
(c) ابن رشد
(d) ابن حزم
- 3- ”أبو الظلم“ لقب للشاعر:
(a) لبيد بن الربيع
(b) عمرو بن الكلثوم
(c) حارث بن حلزة
(d) طرفة بن العبد
- 4- ”دلائل الإعجاز“ و”أسرار البلاغة“ كتابان من تأليف:
(a) ابن المعتز
(b) ضياء الدين ابن الأثير
(c) عبد القادر الجرجاني
(d) أسامة بن منقذ
- 5- من أسس مدينة ”كرخ“ في سنة 174 هـ:
(a) أبو جعفر المنصور
(b) المهدي
(c) المعتصم بالله
(d) ابن المعتز
- 6- أبو فراس همام بن غالب هو شاعر أموي الملقب بـ۔

(a) الأخطل
(b) جرير
(c) الفرزدق
(d) الكميت

7_ حدد الزوج الصحيح من المذكورين أدناه:

(اقرأ الشفرة من اليسار)

(1) الفقه الحنفي
(2) الفقه المالكي
(3) الفقه الشافعي
(4) الفقه الحنبلي

(I) كتاب الأم، الجامع الكبير، مختصر المزني

(II) الجامع الصغير، السير الصغير، المبسوط

(III) الرسالة، الجامع، كتاب السنة

(IV) المختصر الكبير، كتاب الوثائق والشرائط، كتاب المؤطا

(A) (1-I, 2-II, 3-III, 4-IV)

(B) (1-II, 2-IV, 3-I, 4-III)

(C) (1-IV, 2-I, 3-III, 4,II)

(D) (1-III, 2-IV, 3-I, 4-II)

8_ رتب الشعراء المذكورين أدناه حسب تواريخ وفاتهم:

(اقرأ الشفرة من اليسار)

(a) زهير بن أبي سلمى
(b) عمرو بن كلثوم
(c) إمرؤ القيس
(d) نابغة الذبياني

A _ a, b, c, d

B _ c, b, d, a

C _ a, c, b, d

D _ a, d, b, c

9_ ظهر فن جديد في العصر العباسي باسم:

(a) أدب الرحلات
(b) النقائض

(c) الأمثال
(d) الخطابة

10_ كعب بن مالك ينتمي إلى قبيلة

- (a) بني قريش
(b) بني هاشم
(c) بني سعد
(d) بني خزرج

الجزء الثاني (6 x 5 = 30)

أجب عن خمسة أسئلة مما يلي، ولكل سؤال ست علامات -

- 1- اكتب عن مراحل تدوين القرآن والحديث النبوي الشريف مفصلاً -
- 2- ماهي العناصر المميزة لفن الخطابة في العصر الجاهلي والإسلامي -
- 3- أكتب عن الشاعر "أمية بن أبي الصلت" وميزاته الشعرية -
- 4- اكتب مفصلاً عن حركة الترجمة في العصر العباسي -
- 5- سلط أضواءً بسيطة حول اللهجات العربية القديمة -
- 6- ماهي الموضوعات الشعرية في العصر العباسي؟
- 7- ماهي الأغراض الشعرية في العصر الأموي؟
- 8- اكتب عن "قاضي الفاضل" وجهوده في الأدب العربي -

الجزء الثالث (10 x 3 = 30)

أجب عن ثلاثة أسئلة فقط، ولكل سؤال عشر علامات -

- 1- اذكر الخصائص الفنية لعلمين اثنين من الأعلام العباسيين المذكورين أدناه -
1- أبو العتاهية 2- المتنبي 3- بشار ابن البرد 4- البحتري
- 2- ماذا تعرف عن أصحاب المجمعرات والصعاليك؟ اكتب مفصلاً -
- 3- ماذا تعرف عن تطور فن أسماء الرجال؟ اكتب مفصلاً -
- 4- اكتب عن تطور فن الرسائل والوصايا في العصر الأموي؟
- 5- اكتب نبذة عن الأصناف النثرية في العصر العباسي -

Notes

Notes